مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورۃ الانعام —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۃ الانعام

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان (سورۂ الانعام)
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25 بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	نومبر 2016ء
مطبع	....	باقر یونس پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ ویاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق' دل بند و راہ مصطفیؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۴۷ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست

رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات **سورۃ الانعام**
مطالب القرآن فی دروس الفرقان

ٹریننگ نکل چکی ہے۔
26-10-16
بدھ والے دن

پہلا باب **سورۃ الانعام** (آیات 1 تا 15)

مجوسیوں یا پارسیوں کے پیدا کردہ خیر وشر کے گورکھ دھندہ میں الجھے ہوئے مذہبی عقیدے کی بنیاد ____ 37
یزداں اور اہرمن کی باہمی کشمکش کی طویل داستان کا ذکر ____ 38
ایران کے پارسیوں کے ہاں رات دن آتش کدوں کو آگ سے روشن رکھنے کی وجہ جواز ____ 39
قرآن حکیم کی تو ابتدا ہی لفظ حمد سے ہوتی ہے کہ جس نے پوری کائنات کو اپنے دامنِ خیر میں لیا ہوا ہے ____ 39
روشنی ہو یا تاریکی یہ تو کروں کی باہمی گردش کا نتیجہ ہے لہٰذا دو مستقل بالذات قوتوں کا وجود چہ معنی ____ 40
انسانی تخلیق پر غور وفکر کرنے کی ضرورت اور اس کی تاکید ____ 41
شیعہ حضرات کے ہاں ''الکافی'' میں حدیث طین کا ذکر ____ 41
قرآن حکیم کی روشنی میں انسانی تخلیق کو سمجھنے کا طریق بڑا واضح ہے ____ 41
سوال خواہ انسانی کی زندگی کا ہو یا قوموں کے عروج وزوال کا اس کے لیے تو قدرت نے قوانین مقرر کر رکھے ہیں ____ 42
ہمارے ہاں ''جل جلالہ'' کے الفاظ کے استعمال کی نوعیت یعنی جہاں کسی قاعدہ قانون کا خیال نہ رکھا گیا ہو ____ 42
یورپ کی مادہ پرستی کی بنیاد پر ثنویت کی تباہ کاریوں کا نتیجہ ____ 43
کائنات کے اندر خدا کا قانون لیکن انسانوں کی دنیا میں انسان کا اپنا قانون ____ 43
دو الٰہ کے پیدا کردہ تصورات کی تباہ کاریوں کا نتیجہ ____ 44
پاکستان کے تصور کی بنیاد ہی یہ تھی کہ یہاں ارض وسما کے ایک ''الٰہ'' کی حکومت ہوگی ____ 44
تحریک طلوع اسلام کی پوری تاریخ اسی ثنویت کو ختم کرنے کی شاہد تھی اور ہے ____ 45
اگر الٰہ السمآء کی طرح الارض پر خدا کی حکمرانی نہیں تو یہ مغربی جمہوریت سب سے بڑا شرک ہے ____ 45
نوع انسانی کی حد تک تنہا عقل صدیوں سے زندگی کے حقائق کو سمجھنے سے قاصر ہے ____ 45
انسانوں کے بنائے ہوئے قانون اور مکافات عمل کی نتیجہ خیزی میں ایک بنیادی فرق ہے ____ 46
قرآنی معاشرے میں کسی انسان پر دوسرا سپاہی کھڑا کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی ____ 46
ضرورت صرف انسان کے سرکش جذبات کو مسلمان کرنے کی ہے ____ 47
قدرت کی طرف سے ملنے والے قوانین کی نتیجہ خیزی کے لیے کائنات کا ذرہ ذرہ اپنی شہادت آپ ہے ____ 47
کائنات کا ایک ایک ذرہ اپنے اندر معجزاتی دنیا لیے ہوئے ہے

جوحق پہ مبنی ہے ______ 47

دین خداوندی کے تحت مکافات عمل کے نتائج کسی کے تسلیم

کرنے یا نہ کرنے پر منحصر نہیں ______ 48

تاریخ نتائج مرتب کرنے میں لمبا وقت لیتی ہے ______ 49

قوموں کے عروج وزوال کی ساری داستان ان کی تاریخ

میں ہی مضمر ہوتی ہے ______ 49

تباہ وبرباد ہونے والی قوم کی جگہ دوسری آنے والی قوم

پہلی قوم سے بہتر ہوتی ہے ______ 50

تباہی سے برباد ہونے والی قوم کی عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں 50

قرآن حکیم نے مکافات عمل کے نتائج کو ملکوتی قوتیں کہا ہے 51

فرشتوں کو دیکھنے کے مطالبہ کی بجائے غوروفکر اور دلیل وبراہین

سے بات کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہوگی ______ 51

معجزوں کی طلب انسانی عقل کو مفلوج کر دیتی ہے اور انسان

پھر تکذیب کے جال میں ہی پھنس کر رہ جاتا ہے ______ 52

تکذیب دین کے سلسلہ میں انسان کی چابکدستی کی ایک مثال 53

رحمت کے سلسلہ میں قادرِ مطلق ہونے کے باوجود اصول

پرستی کی انتہاء ______ 54

لفظ رحمت کے سلسلہ میں پایا جانے والا غلط تاثر ______ 55

خودساختہ عقائد کی گرفت کی اذیت ناکیوں کا وہ جہنم جس

میں صدیوں سے انسان گرفتار ہے ______ 55

اس جہنم سے نکلنے کا علاج ______ 55

شفاعت کے عقیدے کی وضاحت کے سلسلہ میں ایک

حدیث کا بیان ______ 56

رحمت کا بنیادی مفہوم اور رحمِ مادر میں بچے کی پرورش کی

نوعیت جو بڑی حیران کن واقعہ ہوئی ہے ______ 56

رحمانیت کے سلسلہ میں پیدا ہونے والا ایک اہم سوال اور

قیامت کے وجود کی حقیقت ______ 57

رحمتِ خداوندی کے راستے سے انسان خود ہی محروم ہوتا ہے 58

خداتعالیٰ کی رحمت حاصل کرنے کا بہترین طریق رزق

کے سرچشموں کو کھلا رکھنے میں تھا ______ 58

کائنات کا تو ایک ایک ذرہ عدم سے ظہور پذیر ہوا ہے

اس لیے خدا کی ایک صفت ''فاطر'' ہے ______ 59

خدا کی صفت مستغنی کا تو یہ عالم ہے کہ اس نے کائنات کا ایک

ایک ذرہ حضرت انسان کو تحفہ میں دے رکھا ہے ______ 60

خدا کے نام پر پارسل وصول کرنے والوں کے نظام کی کیفیت 60

ہر نبی کا اعلانِ عام کہ میں تم سے کسی معاوضے کا طلب گار نہیں 61

قرآن حکیم کے پیش کردہ نظام حیات پر پورے کا

پورا عمل کرنا ہوگا ______ 61

شفارش کروانے والوں کے لیے نبی اکرم کی طرف سے

قرآن حکیم کا فرمان ______ 61

ہمارے ہاں سب سے بڑی گالی جو متصور کی جاتی ہے ______ 62

دوسرا باب **سورۃ الانعام** (آیات 16 تا 26)

آج دنیا میں ہر مملکت اخلاقیات کا تو سبق دیتی ہے لیکن

انصاف کا ترازو کہیں نظر نہیں آتا ______ 63

دنیائے انسانیت کی عظیم ترین قابل صد احترام ہستی

نبی اکرم ﷺ کا وہ اعلان جو ہر شخص کے لیے مشعل راہ ہے ______ 64

مکافاتِ عمل کے نتائج کا سلسلہ جہانِ فردا تک جاری رہتا ہے 64

نجات کے عقیدے کے موجودہ غلط تصور کی جگہ لفظ

فوز کی اہمیت ______ 65

نقصان پہنچنے کے سلسلہ میں ایک غلط فہمی کا ازالہ اور

تصریف آیات کی اہمیت ____ 66
ہر مصیبت انسان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوتی ہے
جس کی بنیادی وجہ انسانوں کا خود ساختہ نظام ہے ____ 66
''خدا کرتا ہے'' کے بنیادی معنی خدائی قانون کے ہیں ____ 67
آخرکار پورے کے پورے غلط نظام کو بدلنا پڑے گا
کیونکہ خدا کا یہی غیر متبدل اصول ہے ____ 67
لفظ قدیر، قادر اور قدرت کا بنیادی مفہوم ____ 68
لفظ القاہر، قہار، جبار کا لغوی مفہوم ____ 68
قانون کو نافذ کرنے والی قوت قہار کی بنیادی خصوصیات
لفظ جبار میں مضمر ہیں ____ 69
مغرب کی جمہوریت کا خاصہ انسانوں کی انسانوں پر حکومت کرنا
ہے اور قرآن حکیم نے اسے فرعونیت سے تعبیر کیا ہے ____ 70
خارجی کائنات ہو یا انسانی دنیا حکومت کا حق صرف خدا
ہی کو حاصل ہے ____ 70
عبد کی حقیقت اور لا الہ الا اللہ کا صحیح مفہوم ____ 71
خدا کا آخری رسول ﷺ بھی خدا ہی کا عبد ہے حق حکومت
کا حق اس کو بھی نہیں ____ 71
پوری کائنات میں غلبہ صرف ذات خداوندی کو ہے۔
کسی دوسرے پر غلبہ جمانے کی کوشش نہ کی جائے ____ 72
قرآن حکیم کا ایجاز ''قاہرہ'' کے ساتھ ''حکیم'' کے لفظ کا
استعمال کیوں اور کیسے؟ ____ 72
کلمۂ شہادت کی روح جو ایک عظیم حقیقت کو اپنے اندر
لیے ہوئے ہے ____ 73
خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ صرف ایک ہی وحی ہے
جسے قرآن حکیم میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے ____ 74
قرآن حکیم وہ غیر متبدل آئین ہے جس کی خلاف ورزی
بغاوت تصور کی جائے گی ____ 74
ختم نبوت کا مقصد ہی یہ تھا کہ نبی اکرم پر کی گئی وحی کو ہمیشہ
کے لیے محفوظ کر دیا جائے ____ 75
بغاوت کا جرم انسان کے تمام اعمال کو برباد کر دیتا ہے ____ 75
کوئی مملکت دوسری مملکت کے آئین کو اپنے آئین کا
حصہ نہیں بناتی ____ 76
اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ کی حقیقی لم ____ 77
ہر نبی کا اعلان توحید پر مبنی تھا تاکہ کوئی شخص دوسرے کا
غلام نہ رہے ____ 77
ذہنی سطح تک حق بات کو تسلیم کرنے کے باوجود یہ خودکشی کیوں؟ 77
زندگی کے مختلف شعبوں میں مذہبی پیشوائیت کے کردار کا ذکر 78
اسلامی حکومت کی شناخت......اس میں کوئی شخص محکوم ہوگا
اور نہ ہی محتاج ____ 79
اسلامی حکومت میں مذہبی اجارہ داری کا کوئی وجود نہیں ہوتا __ 79
ایک نکاح اور تین مختلف فیصلے نتیجہ زندگی اجیرن ____ 79
شریعت کے نام پر پیش کردہ فتوے جو ذاتی سوچ اور
تصورات پر مبنی ہوں، قرآن حکیم انہیں ظلم قرار دیتا ہے ____ 80
خدا کے فیصلوں کو کھلے بندوں منسوخ کرنے کا اعلان
ظلم عظیم ہے ____ 80
ایک قدم اور آگے خدا سے براہِ راست پوچھ لینے کا دعویٰ ___ 81
ظہورِ نتائج کی تصور کشی کا منظر ____ 81
اپنا کیا ہوا جرم خود اپنے ہی سامنے ____ 82
منافقین کی ذہنی کیفیت اور سوچ ____ 82
کسی کی بات تسلیم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس

کی بات کو دل و دماغ سے قبول کریں ______ 83
اسلام اور قرآن اور شریعت وغیرہ کا اس قدر چرچا ہونے
کے باوجود ہماری یہ ناگفتہ بہ حالت کیوں ______ 83
آخر نوجوان نسل کو وحی کی اہمیت سے بے خبر رکھنے کی
ذمہ داری کس پر ہے؟ ______ 84
خالص قرآنِ حکیم کی تعلیم کو عام کرنے پر ایک ہزار علماء کی
طرف سے علامہ غلام احمد پرویزؒ پر کفر کا فتویٰ ______ 84

تیسرا باب **سورۃ الانعام** (آیات 27 تا 34)

معاشرے کا ایک ایسا گروہ جس کو اپنے نقصان کا خود
ہی اندازہ نہیں ______ 86
بغیر کسی اجر کے ہر نبی کی دعوت تو صرف خدا کی محکومیت
اختیار کرنے کے متعلق تھی ______ 87
خدا تعالیٰ کے قانون میں اصلاح کی خاطر ایک مہلت
کے وقفے کے علاوہ زندگی کی اہمیت ______ 87
وحی کی روشنی کے بغیر عہد طفولیت میں انسانی سوچ کا معیار
اور ہندوؤں کے دھرم کی تاریخ ______ 88
انسانی زندگی کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی وضاحت ______ 89
کرۂ ارض پر انسانی زندگی کے لیے صرف ایک چانس ہے ______ 90
انسانی زندگی میں ظاہریت پر مبنی معتبری کو قدم قدم پر قائم
رکھنا ایک بہت بڑا عذاب ہوتا ہے ______ 90
جہنم کے دردناک عذاب کی وجہ جواز اور اس کی کیفیت ______ 91
قرآن حکیم کی روشنی میں انسان کی نفسیاتی کیفیت کا تجربہ ______ 92
قندیلِ آسمانی کی روشنی میں زندگی کے دو نظریوں کی تفصیل ______ 92
اگر کسی انسان کا آخرت پر ایمان نہیں تو پھر اس کا قرآن
پر ایمان کچھ معنی نہیں رکھتا ______ 93
انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں فرق کی وضاحت ______ 93
یہ پوری کی پوری کائنات انسان کے اعمال کو محفوظ کرنے
اور اس کا نتیجہ مرتب میں ہر آن مصروف کار ہے ______ 94
انسانی اعمال کے سلسلہ میں انسانی جذبات اور
پھر آرزوؤں کا عمل دخل ______ 94
ترکِ آرزو کے بعد آرزو کے ترک کرنے کو بھی ترک کرنا ہوگا 94
بدھا اور تصوف کے تصورات کے بعد قرآن حکیم کی راہنمائی
جو عقل انسانی کو صراط مستقیم کی نعمت سے سرفراز کرتی ہے ______ 95
انسان کے سرکش جذبات قوموں کی عقل کو موءوف کر
دیتے ہیں ______ 95
صرف آخرت پر ایمان ہی انسانیت کو تمام تر تباہیوں سے
محفوظ رکھ سکتا ہے ______ 96
آج گردشِ زمانہ اہل مغرب کو موت کے بعد کی زندگی کے
متعلق سوچنے پر مجبور کر رہی ہے ______ 96
قرآن حکیم زندگی کے حقائق کو بڑے محاکاتی انداز میں
پیش کرتا ہے ______ 97
اقبال کے الفاظ میں جہنم میں گرفتار تباہ حال قوم کی
حالتِ زار کو بیان کرنے کا محاکاتی انداز ______ 97
کہاں قرآن حکیم اور اقبال کا محاکاتی انداز اور کہاں
ہمارے ہاں کی یہ تفسیریں ______ 98
قرآن حکیم کے نزدیک کائنات اور انسان کا باہمی تعلق
اور اس کا مقصد ______ 98
انسانی زندگی اور طبعی زندگی کے باہمی رشتے کے
بنیادی فرق کی وضاحت ______ 99
قرآنی لفظ 'لعب' کے لغوی مفہوم کو سمجھنے کے لیے بھنور میں

پھنسی کشتی کی مثال 99
بھنور میں الجھی ہوئی اس کشتی کو انسانیت کی منزل مقصود
آخر کس طرح حاصل ہوگی؟ 100
لفظ ''لھو'' کے مفہوم کو سمجھنے کی ایک واضح مثال اور ''تکاثر''
کی کیفیت کا ذکر جس کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی 100
انسانیت کی غم خوار ہستی نبی اکرم ﷺ کے متعلق
قرآن حکیم کا ارشاد 101
سیرتِ نبوی کا وہ عظیم ترین معجزہ جو آپ ﷺ کے
اسوۂ حسنہ سے متعلق ہے 102
سیرت رسول ﷺ کے متعلق ابوسفیان جیسے دشمن کی حق گوئی 102
دشمنوں کی طرف سے مخالفت نبی اکرم ﷺ کی نہ تھی بلکہ یہ
سب کچھ قوانین خداوندی کے خلاف تھی نظام کے خلاف تھی 103
آزاد قوم کے نزدیک محکوم قوم کا مقام 103
مفاد پرست طبقوں کی سرگشت جنہوں نے ہمیشہ حق کی
مخالفت کی ہے 104
حق کی خاطر استقامت کے ساتھ جم کر کھڑے ہونے کا نتیجہ
'سرفرازی کے ساتھ ایک دوسرے نظام کی شکل میں نکلتا ہے 104
تاریخ کو بدلنا تو انسان کے اپنے اختیار میں ہے لہٰذا یہ
چیز نظام سے وابستہ ہوتی ہے 105
قرآن حکیم میں تاریخی داستانوں کو بیان کرنے کا مقصد
اصولِ زندگی کو بیان کرنا ہے 105

چوتھا باب **سورۃ الانعام** (آیات 35 تا 38)

علامہ پرویز کے نزدیک انگریزی میں کتاب لکھنے کا مقصد
اور پھر اس پر یورپ والوں کا تبصرہ 107
مذہب کے مقابلے میں دین کے پیش کردہ تصور کی اہمیت 108
قرآن حکیم مافوق الفطرت کی بجائے زندگی کے
غیر متبدل اصولوں کو دلیل و براہین سے پیش کرتا ہے 108
آج ہماری مجلسوں میں اسلام کے نام پر پیش کی جانے
والی تعلیم کی نوعیت 109
نبوت کے بعد نبی اکرمؐ کی عملی جدوجہد کو معجزات کی
شکل میں پیش کرنے کا نتیجہ 110
نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد 110
مخالفت کے سلسلہ میں حضور کے کبیدہ خاطر ہونے پر
قرآن حکیم کا فرمان اور سابقہ انبیاء کا ذکر 110
قرآن حکیم کو سمجھنے کے سلسلہ میں تصریفِ آیات کی اہمیت اور
مافوق الفطرت مطالبات کی نوعیت اور ہمارے ہاں کی کرامتیں 111
خدا تعالیٰ کی ذات انسانی خواہشات کے پیشِ نظر اپنے
قوانین کو کبھی نہیں بدلتی 112
مذہب کی بنیاد ہمیشہ کرامات پر استوار ہوتی ہے
جب کہ قرآن حکیم کا یہ انداز نہیں ہے 112
حیوانوں سے انسانوں کی زندگی کو تمیز کرنے کا طریق 113
مذہب اور دین میں بنیادی فرق عقل و شعور پر دلالت کرتا ہے 114
کیا ہر بچہ اسلام کا تصور لیے پیدا ہوتا ہے 114
قرآن حکیم معجزہ کی بناء 'کرامت کے زور پر' عقل کو
موؤف نہیں کرتا 115
ہمارے ہاں کے تراجم میں خدا کی اجازت کے غلط
مفہوم کا نتیجہ 116
عقل و فکر سے کام نہ لینے والے کے ہاں معاملہ مشتبہ
ہو جاتا ہے 116
معجزے طلب کرنے والوں کو قرآن حکیم کا جواب 116

قرآن حکیم نے عقل وفکر سے کام نہ لینے والوں کو اندھا
کہا ہے بہرہ کہا ہے مردہ کہا ہے ____ 117
مُردوں کے سلسلہ میں حضرت ابراہیم کا مطالبہ اور
خدا تعالیٰ کا جواب ____ 118
رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس طبیبِ مشفق کی طرح
حساس نرم خو، حریص اور کردار کی بلند ترین سطح پر ارجمند ہے _ 119
اے خالقِ کائنات تو مجھے وہ طریق تو بتا کہ یہ مردہ قوم زندگی
کی نعمتوں سے کس طرح سرفراز ہوگی ____ 119
قرآن حکیم کے نزدیک تباہ حال قوم مردہ صفت قوم کو
از سرِ نو زندگی کی نعمتوں سے سرفراز کرنے کا طریق ____ 120
بات کسی کو تعمیری نکتہ نظر سے اپنے ساتھ مانوس کرنے یا
سدھانے کی ہے ____ 120
خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کی دل جوئی کی ایک
عظیم مثال اور پھر حجۃ الوداع کا ذکر ____ 120
نبی اکرم کی زندگی کے آخری ایام میں ایک حسین آرزو کا
اظہار اور پھر اس کا جواب ____ 121
نبی اکرم ﷺ کی آرزو کہاں خدا تعالیٰ کا جواب کہاں اور
پھر حضرت صاحب کا رتبہ کیا کہیے؟ ____ 122
ہر عمل کا نتیجہ خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ظہور
پذیر ہوتا ہے ____ 122
قرآن حکیم کا ترجمہ کسی زبان میں کیا وہ تو عربی زبان
میں بھی نہیں ہوسکتا ____ 123
انبیائے اکرام سے خدا کے احکام معجزوں کے زور پر تسلیم
کروانے کی بجائے دلیل وبراہین پیش کرتے ہیں ____ 123
صرف مالی مفاد کی خاطر غلط بات کو منوانے کے سلسلہ میں
وکیلانہ حربوں کا سہارا ____ 124
سچ تو یہ ہے کہ باری تعالیٰ اپنے اصول کو کبھی نظر انداز
کرتا ہی نہیں ____ 124
خالق کائنات نے سوائے انسان کے ہر چیز کو مجبور پیدا کیا ہے 125
لفظ ''سبح'' کے معنی تسبیح پھیرنے کی بجائے ہر آن قوانین
خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے ____ 125
ڈارون کی Evolution تھیوری کی وضاحت اور
قرآن حکیم کا اعجاز ایک فرق کے ساتھ ____ 126
خواہ پوری کائنات کا معاملہ کیوں نہ ہو خدا اپنے قانون کو
کسی صورت نہیں بدلتا ____ 127
انسان کسی راستے کے تعین کی حد تک تو با اختیار ہے لیکن
منزل کا رخ بدلنے کے معاملے میں اختیار سے محروم ____ 128

پانچواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 39 تا 47)

یوم پاکستان پر مبارک باد کی بجائے یوم الفرقان کا بنیادی مقصد 129
علامہ اقبال اور قائد کے تصور پاکستان کا مقصد اور اس کی
عملی شہادت ____ 130
جشن آزادی کا دن منانے کی شرط اور اس کے خدوخال __ 131
14 اگست 1947ء کی اہمیت کے علاوہ چھ ستمبر کے
واقعہ کی قدر ومنزلت ____ 131
قرآن حکیم میں انسان کی راہنمائی کے سلسلہ میں
کائناتی حقائق کا ذکر ____ 132
قرآنی حقائق کی عظمت کو سمجھنے اور جاننے کا طریق ____ 132
Species کے متعلق قرآن حکیم کے پیش کردہ حقائق __ 133
ڈارون کی Theory of Evolution کے علاوہ ابن مسکویہ
کی کتاب فوز الاصغر کے انکشافات اور قرآن حکیم کا بنیادی موضوع 133

کائنات کی ہر شے اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح سے واقف ہے ___ 134
متقی کی تعریف یعنی زندگی کے راستوں پر دیکھ بھال کر کھلی
آنکھوں سے سفر کرنے والا ___ 135
اختیار وارادہ رکھنے کی بنا پر انسان کی کوئی فطرت نہیں ہوتی اور
یہی اس کا شرف ہے ___ 135
من یشاء کے غلط تراجم نے انسانی سوچ کو تباہ کر رکھا ہے ___ 136
خدا کے قانون مشیت کی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ وہاں متضاد
خیالی نہیں ہے ___ 136
قرآن حکیم کو ترجموں کی بجائے 'مفہوم القرآن سے سمجھیے'
پرویزؒ کی اپیل ___ 137
لفظ رجس کا لغوی مفہوم ___ 137
دنیا بھر کے مصائب والآم کی بنیادی وجہ قوانین خداوندی
سے انحراف ہے ___ 139
قرآن حکیم انسانیت کی حد تک حکومت کے تصور کی بجائے
کچھ غیر متبدل قوانین پیش کرتا ہے ___ 139
پی آئی اے کو حادثات سے بچانے کے لیے مذہب
پرست طبقے کی ایک تجویز ___ 140
ہمارے ہاں کے قرآنی تراجم نے فکر قرآنی کو تباہ کر دیا ہے ___ 140
بار بار کی وارننگ کے باوجود مفاد پرستی انسان کے دل کو
احساس کی نعمت سے محروم کر دیتی ہے ___ 141
جب برائی بذاتِ خود مزین بن کر دکھلائی دے تو پھر اس کا
نتیجہ ہر سو تباہی ہوتا ہے ___ 142
تقسیم سے پہلے کی حالت اور تقسیم کے بعد کی کیفیت اور بالآخر
اس قسم کی فراوانی کے متعلق قرآن حکیم کا فیصلہ ___ 142
1965ء کی جنگ کے بعد دن بدن مایوسی کی کیفیت قرآن
حکیم کے الفاظ میں ذلت آمیز عذاب ___ 143
تاریخ انسانیت قرآن حکیم کے آئینہ میں ___ 144
افرادی شکل میں تو قوم باقی رہتی ہے لیکن وہ اپنے تشخص
سے محروم ہو جاتی ہے ___ 144
ظلم کے ختم ہونے پر خدا کی حمد مظلوموں کی زبان سے
ادا کی جاتی ہے ___ 144
رزق کا لفظ صرف روٹی تک محدود نہیں اور نہ ہی غلامی کا
لفظ بیڑیوں تک محدود ہے ___ 146
تقلید پرستی کی انتہا' سخت گرمی کے موسم میں کوٹ اور ٹائی
کے کیا معنی؟ ___ 146
آج کے معاشرے میں پائی جانے والی سوچ اور پھر
قرآن حکیم کا ارشاد ___ 147
انسانی تاریخ کا ایک قابل غور پہلو قومیں بھوک سے نہیں
اقدارِ خداوندی کو فراموش کرنے سے مرتی ہیں ___ 148
قوموں کی ہلاکت قرآنی نظامِ ربوبیت کو پس پشت
ڈالنے کی وجہ سے ہوتی ہے ___ 148
انسان کی تمام جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں خدا کی عطا کردہ ہیں
جن کا ایک خاص مقصد ہے ___ 149
آخر اسلام کے نام پر قائم حکومت میں ظلم کا راج کیوں؟ ___ 150
اس ظلم وستم کا علاج صرف اس ایک سجدہ میں ہے جو
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات ___ 150
یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ ___ 151

چھٹا باب: **سورۃ الانعام** (آیت 52)

مذہب تو خالصتاً انفرادیت کا نام ہے جب کہ دین

اجتماعیت کی ترغیب دیتا ہے ______ 152
قرآن حکیم نے نبی اکرم ﷺ کو المزمل کے الفاظ سے
نوازا یعنی ہم آہنگ افراد کو اکٹھا کرنے والی شخصیت ______ 153
رسول اکرم ﷺ کی جماعت میں شامل ہونے والوں میں مترفین
کے بجائے نچلے طبقہ کے لوگوں نے شمولیت اختیار کی تھی ______ 153
اوپر کے طبقہ کی وہ پست ذہنیت جو حضرت نوح کے دور
یعنی 6 ہزار سال سے چلی آ رہی ہے ______ 154
نبی اکرم ﷺ کی سب سے زیادہ مخالفت خوشحال گھرانوں
کی طرف سے ہوئی تھی ______ 154
عقل و فکر کو دولت کے ترازو میں نہیں تولا جاتا ______ 155
کفار کی الزام تراشی کے برعکس نبی اکرم ﷺ کا اپنی شخصیت
کے متعلق اظہارِ خیال ______ 155
نبی اکرم ﷺ کا مشن انسان کو کسی طبقاتی تفریق کے ترازو
میں تولنا نہیں ______ 156
ذاتی مفاد سے بالاتر خالصتاً ایمان جیسی متاع گراں کی
قدر و قیمت سے سرفراز ہونے والوں کا مقامِ بلند ______ 158
نبی اکرم ﷺ اور صحابہ اکرامؓ کی باہمی رفاقت کو ہر لمحہ
قائم دائم رکھنے کی قرآنی تاکید ______ 158
نبوت ﷺ اور صحابہ اکرامؓ کے باہمی مومنانہ تعلقات کے
ثمر نے زمین و آسمان کی قدر و قیمت کو بدل کر رکھ دیا ______ 159
نصرتِ خداوندی کے ساتھ جماعت مومنین کی کفایت کا ذکر
جسے لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے ______ 160
جنگ بدر میں رسول اکرم ﷺ کی طرف سے تیر اندازی کو
خدا تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر لیا ______ 160
مومن کی زندگی کے خدوخال باہمی قلبی رفاقت جسے
دو بادلوں کا ملاپ ہوتا ہے ______ 160
زندگی میں دو دلوں کا آپس میں گھل مل جانا، باہمی رفاقت کی
یہ انتہا بہت بڑی متاع ہے ______ 161
اسلام میں ایمان کا اشتراک ہی قومیت کا مدار ہے
جس کی بنیاد پر پھر ذرے چٹان بن جاتے ہیں ______ 161
کسی پروگرام کے تحت جماعت کا بن جانا عملِ تزمیل کا
رہین منت ہوتا ہے ______ 162
جماعت کا امیر ہونا کئی قسم کی ذمہ داریوں کو اپنے اوپر
فرض قرار دینا ہے ______ 162
نبی اکرم ﷺ کے تحفظ کی خاطر صحابہؓ اکرام کا کردار ______ 163
قرآنی آیات کا ترجمہ کرنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے پھول کی
پتیوں کو ہاتھوں میں مسل دیا جائے ______ 163
نبوت کے آخری تاج دار ﷺ اور آپ کے ہم سفر رفیقوں
کی رفاقت دلوں کو گرما دینے والی تصویر کشی ______ 164
قصہ آدم کی وہ کہانی جو قرآن حکیم نے تمثیلی اور حکیمانہ انداز
میں بیان کی ہے اس کا تعارف ______ 164
انسانی اعمال کا سارا دار و مدار اس کے اپنے خیالات
و تصورات پر منطبق ہوتا ہے ______ 165
قانون خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے نتیجہ میں
چہروں کی بشاشت سکون قلب کی ترجمانی کو واضح کر دیتی ہے 165
قرآنِ حکیم تو ایک سجدے اور دوسرے سجدے کے بنیادی
فرق کو واضح کرتا ہے ______ 166
انسان کی نیک عملی کا پھل بڑا ہی مسرور کن ہوتا ہے ______ 166
کائنات کے ذرے ذرے میں غیر محسوس طور پر ہر آن رونما
ہونے والے تغیر کی نوعیت حیران کن ہے ______ 167

قرآنی معاشرے میں جماعتِ مومنین کی سوچ کو بڑی
مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جاتا ہے 167
نظامِ خداوندی کا ہر شعبہ نہایت مستحکم بنیادوں پر استوار ہوتا ہے
اور اس نظام کی نسبت کسی نبی سے نہیں ہوتی 167
دین صرف خدا تعالیٰ کی ذات کے لیے ہی مخصوص ہے لہٰذا
اسی بنا پر اسے دین اللہ کہتے ہیں 168
قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ صحابہ اکرام جنہوں نے ہجرت کی اور
جنہوں نے انہیں پناہ دی وہ سب کے سب مومن حقا ہے 169
آج کرہ ارض پر مسلمانوں کی موجودگی جس قسم کی نعمتوں سے
سرفراز ہیں یہ انہیں مومنین حقا ہی کا صدقہ ہے 170
آپ ﷺ کی زندگی کے بعد تاریخ کے پیش کردہ وہ اوراق
جنہوں نے تمام حقائق کو مسخ کر دیا 171
خدا کے حضور نبی اکرم ﷺ روزِ قیامت اپنے صحابہ کے
متعلق شکایت کریں گے معاذ اللہ 172
ہمارے ہاں موجودہ معتبر روایات اور واقعات کی
تاریخی حیثیت 172
قرآن حکیم کی شہادت کے علی الرغم جو کچھ بھی ہو اس کی
قدر و منزلت کو کسی ترازو میں نہیں تولا جا سکتا 173
نبی اکرم ﷺ نے قرآنی نظام کی تشکیل کی خاطر ایک
جماعت کی تشکیل کرنا تھی 174
قوموں کی تعمیر و تخریب میں تاریخ کا بڑا دخل ہوتا ہے 174
جس کسی قوم کا تاریخی حافظہ کمزور ہو جائے وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے 175
قرآن حکیم کی شہادت کے برعکس ہمیں کوئی چیز قبول نہیں
لہٰذا ہمیں اپنی ہسٹری کو Re-write کرنا ہوگا 175

ساتواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 48 تا 59)

ظلم و استبداد کی کہانی قرآن حکیم کی زبانی 177
انبیائے اکرام کے مبعوث ہونے کا مقصد انسانیت کو
خوف وحزن سے نجات دلانا تھا 178
قرآنی نظام حکومت کا عملی ثبوت' خوف وحزن سے نجات ہے 179
آج کے دور میں رسل و رسائل کی کیفیت اور ان کی اہمیت 180
خدا کی طرف سے آنے والا کوئی رسول یا نبی فوق البشر نہ تھا
کہ جو عقل و فکر کی بجائے معجزات کا سہارا حاصل کرتا 181
خدا کا نبی سب سے پہلے وحی پر ایمان لاتا اور عمل کرتا ہے 181
احادیث کے مجموعوں کی روشنی میں قرآن حکیم کی تفسیروں
کی کیفیت 182
روایات کو پرکھنے کا معیار تو صرف قرآن حکیم ہے 183
وضعی روایات کے تحت قرآنی آیات کو منسوخ تصور
کرنے کا عقیدہ 183
ایک غلط روایت کے سہارے مودودی صاحب کی
اصول پرستی کی ایک مثال 183
نبی اکرم ﷺ کی اصول پرستی (معاذ اللہ) بیان ہو رہی ہے 184
جھوٹ کے سلسلہ میں ایک اور مثال 184
نبی اکرم ﷺ کی طرف سے پیش کی جانے والی تعلیم اور
آپ کے منصب کی وضاحت
186
خدا کا نبی معجزوں سے عقل کو ماؤف کرنے کی بجائے انسانی
فکر و تدبر کو وحی کی روشنی سے متعارف کرتا ہے 186
دولت، قوت اور وسائل کے بل بوتے پر طبقاتی تقسیم 187
گاؤں کے اندر ملازم یا مزارع کی حیثیت غلام جیسی

تصور کی جاتی ہے ________ 187
عرب میں جنگ کی حد تک قبائلی بنیاد پر تفریق کی نوعیت __ 188
وحی کی روشنی میں رسول اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ کی رفعت _ 188
خدا کی بارگاہ میں انسانی اعمال کے بالمقابل قبیلوں کی
نسبت یا دولت کے ڈھیر کو نہیں تولا جاتا ________ 189
دنیا کی تباہی کی سب سے بڑی وجہ طبقاتی تقسیم ہے ____ 189
انسانی معاشرے میں فتنہ وفساد کی اصل وجہ نیز ایک بنیادی
اصول کی وضاحت یعنی کسی عمل میں ارادے کا دخل ____ 190
قرآنی معاشرے میں عزت وذلت کے معیار کے پیمانے _ 190
قرآنی معیار کے مطابق زاندہ درگاہ وہ ہے جو ارادے سے
سرکشی پر اتر آئے ________ 191
رسولِ ہاشمی ﷺ نسبی اعتبار سے بلند ترین مقام پر فائز تھے _ 191
ذہنی تفاوت کو مٹانے کا بہترین انداز فرمانِ رسول ﷺ
کی روشنی میں ________ 192
انسانی ذات پر اپنے ماحول کے مطابق وارد ہونے
والے نفسیاتی اثرات ________ 192
قرآن حکیم میں ماحولیاتی اثرات کے مطابق سزاؤں کا تعین 192
معاشرتی آداب کے پیش نظر مختلف اشاروں اور جذبات کا ذکر 193
خدا تعالیٰ کی صفت اللہ الصمد کے مروجہ تراجم انسان کو
حقیقت تک پہنچنے ہی نہیں دیتے ________ 193
خدا تعالیٰ کی ذات اپنے اوپر خود پابندی عائد کرتی ہے
دیکھیے لفظ رحمت اور توکل کا لغوی مفہوم ________ 194
باز آفرینی کی گنجائش کے لیے اگر خدا کی طرف سے رحمت
کا عمل شاملِ حال نہ ہوتا تو پھر کسی کی زندگی ثمر بار نہ ہوتی _ 195
ذاتِ خداوندی اپنے جذبات کی تسکین کی خاطر دوسروں
کو اپنا محکوم نہیں بناتی ________ 196
بیج بونے اور پھر فصل کاٹنے کے درمیان مہلت کا وقفہ
خدا کا غیر متبدل اصول ہے ________ 197
نبی اکرم ﷺ کو نتائج کے حصول کی خاطر تیرہ سال کا
طویل سفر طے کرنا پڑا ________ 197
علم غیب کی نوعیت اور اس کا مفہوم ________ 198
کائنات کی خشکی اور تری میں بکھری ہوئی ان پستیوں اور بلندیوں
کے پرشکوہ دامنوں کے اندر ظاہر اور باطن ہزاروں قسم کے خزانے
اور پھر ایک ایک ذرے کی خصوصیات اور ان کی لحہ بہ لحہ بدلتی ہوئی
شکل وصورت اور حرکات وسکنات کی کیفیت علم اس خالقِ کائنات
کے دستِ قدرت کے علم میں روزِ اول سے محفوظ ہے ____ 199
علم غیب سے علم مشہود تک پہنچنے کا طریق اور قرآن حکیم کو
قرآنِ مبین بنانے کا مقصد ________ 199
خدا تعالیٰ رات کے وقت انسان کو وفات دیتا ہے کا مفہوم _ 200
نیند کی حالت میں انسان کے نفس کو روکنے اور موت کی حالت
میں نفس کو روکنے میں فرق ________ 200
قرآنِ حکیم انسانی زندگی اور نفس میں فرق پیدا کرتا ہے __ 201
زندگی کے اعمال کی ذمہ داری انسانی نفس پر ہوتی ہے
جو آگے چلتا ہے ________ 202

آٹھواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 60 تا 70)

اپنی ذات کا اقرار کیے بغیر خدا تعالیٰ پر ایمان کوئی معنی نہیں رکھتا 204
نفس انسانی جو محسوسات کی دنیا سے ماوارا ہے اس کی ماہیت
کو سمجھنے یا سمجھانے کا طریق ________ 204
اعمالِ انسانی کی نتیجہ خیزی کا ہی دوسرا نام مکافات عمل ہے _ 205
انسان میں ''شعورِ خویش'' کی یا ''میں کی'' آگہی کی کیفیت _ 205

نبوت سے پہلے آپ ﷺ نے کسی آسمانی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا، لفظ تلاوت کا لفظ صرف آسمانی کتابوں کے لیے استعمال ہوتا ہے ____ 207
جس شے کو نبید کے عالم میں روک لیا جاتا ہے اسے قدرت موت کے عالم میں بھی اپنے پاس کسی خاص وقت کے لیے محفوظ کر لیتی ہے ____ 208
قدرت کے ہاں تو انسان کے ایک ایک لمحہ کا عمل محفوظ ہے ____ 208
قدرت انسان کے مادی جسم کو محفوظ کرنے کی بجائے اس کے اعمال کو محفوظ کرتی ہے ____ 209
انسانی جسم تو ہر آن بدلتا ہے لیکن اس کا نفس اور اس کے اعمال کبھی نہیں بدلتے ____ 209
قوموں کی تعمیر کا انحصار سنگ وخشت کی بجائے مائنڈ کی نشو ونما پر منحصر ہوتا ہے ____ 210
مرنے کے بعد کی زندگی پر اٹھائے جانے والے اعتراض پر قرآن حکیم کا جواب ____ 211
مرنے کے بعد زمین انسان کا سب کچھ نہیں کھا جاتی بلکہ خدا کے ہاں نفس انسانی کو محفوظ کر لیا جاتا ہے ____ 211
انسان کی میموری یا یادداشت اس کے مادی جسم سے الگ اس کی ذات کا فعل ہے ____ 212
زندگی میں یا اس کے بعد سب سے بڑا جہنم یہ ہے کہ آپ کا باطن نکھر اور ابھر کر دوسروں کے سامنے آجائے ____ 212
انسانی اعمال کو محفوظ کرنے والی قوتوں کا تعلق عالم امر سے ہوتا ہے ____ 213
عالم امر کے متعلق کوئی انسان کچھ نہیں جانتا ____ 213
انسان کے ہر ہر عمل کی گواہی اس کے جسم کا ایک ایک انگ خود دے گا ____ 214
خدا پر ایمان کی ساری بنیاد حیات آخرت اور مکافات عمل پر ہے ____ 214
صدر اوّل کے مسلمانوں میں اور ہم میں بنیادی فرق اپنے اپنے اعمال کی جواب دہی کے احساس کا ہے ____ 214
پختہ کرداری کے بارے خلفائے راشدینؓ کے دور میں اسوۂ حسنہ کی ایک مثال اور حضرت عمر فاروقؓ کا بیوی سے مطالبہ ____ 215
خدا دیکھتا ہے یعنی خیالات واعمال کی جوابدہی کا احساس ہی دین کا اصل علم ہے ____ 215
انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ساتھ ہی ساتھ انسانی ذات پر ایک نقش مرتب کرتا ہے ____ 216
ظہورِ نتائج کے وقت انسان کی کیفیت بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی کی طرح ہوتی ہے ____ 217
مرادیں پورا کروانے کی خاطر دردر کی ٹھوکریں کھانے کی سعی لاحاصل ____ 217
غلط اعمال کا نتیجہ اور عذاب کی مختلف شکلیں ____ 219
قرآن حکیم نے شعبہ سوشیالوجی کے پیش نظر قوموں پر عذاب کی مختلف وجوہات بیان کی ہیں ____ 219
حضرت صالح کی قوم کو درست کرنے کے سلسلہ میں دارالسلطنت کے نوسر غنوں کو گرفت میں لانے کی ہدایت ____ 219
قوموں کی سوچ لیکچروں اور وعظوں سے نہیں بلکہ خود اپنی مثال قائم کرنے سے بدلتی ہے ____ 219
قوموں کی تباہی کا ایک دوسرا موثر حربہ فرعونی سیاست کو اپناتے ہوئے انہیں پارٹیوں اور گروہوں میں تقسیم کرنا ہے ____ 220
مذہبی فرقے ہوں یا سیاسی پارٹیوں کی فرعونی چال یہ

دونوں انسانیت کے قاتل ہیں ____ 221

قرآن حکیم اپنے احکامات کو کھول کھول کر واضح انداز میں بار بار بیان کرتا ہے ____ 221

ظہورِ نتائج کے لیے ایک وقت کا تعین ہوتا ہے جس سے پہلے مہلت کا وقفہ ہوتا ہے ____ 221

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے الفاظ کے مادوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے ____ 222

قانونِ مکافاتِ عمل ایک پروسیس کے تحت بتدریج ظہور پذیر ہوتا ہے ____ 222

خدا کا قانون تو مجرم کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوتا ہے 223

انسان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بڑی سنجیدگی کا طلب گار ہے 223

کسی معاشرے میں اندازِ گفتگو کا معیار اور اس سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد ____ 224

زندگی کے اہم مسائل کو نظر انداز کرنے والی محفلوں میں شریک ہونے کا نتیجہ ____ 224

لفظ تقویٰ کا مفہوم انسان کو لاحاصل محفلوں سے محفوظ رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے ____ 224

قرآنی تعلیم کے پیشِ نظر لفظ متقی کے سلسلہ میں ایک اٹھنے والے اعتراض کا جواب ____ 225

زندگی کے ہر ہر موڑ پر خود کو خاردار جھاڑیوں سے بچا کر رکھنے والا ____ 225

کلبوں کی زندگی میں اخلاقی جرأت کا فقدان اور اس کا علاج کیا؟ ____ 226

اس قدر تباہی و بربادی میں نہ الجھنے کے باوجود قرآن سے نصیحت کرنے کی تاکید ____ 226

غلط معاشرے میں سامانِ زیست کی فراوانی بھی تباہی کا موجب بن جاتی ہیں ____ 227

جہنم ہو یا جنت اس کے آثار تو یہیں سے شروع ہو جاتے ہیں 227

نواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 71 تا 79)

ارشادِ خداوندی ہے کہ دوسروں کے لیے راہنمائی کا فریضہ آخری وقت تک جاری رہنا چاہیے ____ 229

معاشرتی زندگی میں عملی تعاون کے علاوہ خود کو کسی کے سامنے پست مقام پر لے جانا انسانیت کی تذلیل ہے ____ 230

دعا کا حقیقی مفہوم مانگنے کا نہیں بلکہ پکارنے کا ہے ____ 230

کسی کو تعاون کی خاطر اپنے لیے بلانے اور حضرت صاحب کو پکارنے میں ایک بنیادی فرق، دوسروں کو خدا بنانا ہے ____ 231

قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ تقلید پرستی انسانی عقل و فکر کو مفلوج کر دیتی ہے ____ 232

قرآن حکیم کا منشور، ہماری حالتِ زار اور اس کا علاج ____ 232

جنابِ تم نے بنایا حضور تم نے بنایا دراصل یہ سارا کھیل انسان کے اپنے جذبات کا ہے ____ 233

جذباتی سوچ یا جذباتی گفتگو کا نتیجہ ہمیشہ ناکامی اور شرمندگی کی شکل میں ہی نکلتا ہے ____ 233

لفظ ھوا کا لغوی مفہوم ____ 234

انسانی جذبات کی قدر و منزلت ان کا مقام نیز ان کا استعمال اور پھر دنیائے تصوف کا کردار ____ 234

فالج زدہ پیر دوسروں کا علاج تعویذوں سے اور اپنا ڈاکٹر کے انجکشنوں سے ____ 235

قندیلِ آسمانی کے بغیر لق و دق صحرا میں کرہ ارض پر قومِ مسلم کی تباہی و بربادی کی صورت گری ____ 236

کاش جہنمی ماحول کے تدارک کے لیے ہم صراطِ مستقیم سے آگہی دلوا سکتے ________ 237
الھدیٰ کی تعلیم سے فائدہ اُٹھائے جانے کا طریق ربوبیت عالمینی کی ذمہ داری کو قبول کرنا ہے ________ 237
حضرت عمر فاروقؓ کا احساسِ ذمہ داری کہ جب تم اپنی ضرورت کے لیے خدا کو پکارتے ہو تو یہ تو میری شکایت ہو جاتی ہے _ 238
قوموں کی مفقود الحالی انہیں قبر پرستی کا گرویدہ بنا دیتی ہے _ 239
مملکت پاکستان میں شدت کے ساتھ قبر پرستی کی آبیاری کی وجہ جواز ________ 239
مملکت کے ہر شعبہ میں قانون کی پاسداری یا حکمرانی کا دوسرا نام نظام صلوٰۃ ہے ________ 240
دین کے برعکس مذہب کی دنیا میں مختلف آستانوں پر سجدہ ریز ہونے کا نتیجہ قرآنی مرکز سے دوری ہے ________ 240
کائنات کے بالحق ہونے کا تصور ________ 240
کائنات کا وجود کس طرح ظہور پذیر ہوا عقل انسانی اس حقیقت کو جاننے سے قاصر ہے ________ 241
خدا تعالیٰ کی قوت اور اقتدار کو اس کے قائم کیے گئے نظام کے نتائج سے ہی اُخذ کیا جا سکتا ہے ________ 241
قرآنِ حکیم کا عطا کردہ نظامِ حیات انسانیت کے پیکر میں زندگی بن کر فارم کی شکل اختیار کر جاتا ہے ________ 242
قرآن حکیم کی روشنی میں علامہ اقبال ملتِ اسلامیہ کی اس خام فکر کے پیکروں میں ''نفخ فی صور'' چاہتا تھا ________ 242
نفخ فی صور کی پوشیدہ توانائیوں کے مشہود ہونے پر نہ جانے یہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی ________ 243
جسم انسانی کی شکل میں خاک کے ذروں کے اس معراج کمال کے بعد معراج انسانیت کے لیے تو ابھی سیکڑوں منازل اور باقی ہیں 243
حضرت ابراہیم کی شخصیت جسے قرآن حکیم نے انسانیت کے لیے اسوہ قرار دیا ہے ________ 244
رامائن کے کارنامہ کی اہمیت اور رام کے مقام بلند کی وجہ ___ 244
فرعون کے مقابلے میں ہامان کے مقام کی نوعیت ________ 245
ملت اسلامیہ کے ذہنوں پر تیرہ سو سال سے سلفِ صالحین کی حکومت برسرِ اقتدار ہے ________ 245
اولاد کے سلسلہ میں والدین کی ذمہ داری ________ 245
بخاری شریف کی ایک وضعی حدیث جو حضرت ابراہیم کے متعلق ہے ________ 246
قرآن حکیم کی روشنی میں اطاعت صرف خدا کے احکامات کی ہے اس کے علاوہ ہر قسم کی اطاعت شرک ہے ________ 246
لفظ ایمان کا مفہوم اس کی ماہیت، اس کے لوازمات اور پھر اس کے لیے کائناتی قوانین کی شہادت ________ 248
کاش اگر سائنٹسٹوں کے سامنے خود ساختہ مذہب کی بجائے خدا کا دین پیش کیا ہوتا ________ 248
یقین محکم حاصل کرنے کے لیے کائناتی نظام کا بصیرت افروز مطالعہ کرنا اشد ضروری ہے ________ 248
ہماری ویدۂ کور نے مقام نبوت کو واعظ کی محدود چار دیواری میں مقید کر رکھا ہے ________ 249
تصریف آیات کے قرآنی فارمولے کے برعکس روایات کی رو سے قرآن حکیم کو سمجھنے کا نتیجہ اور اس کی اصل حقیقت ___ 249
حضرت ابراہیم کا اپنی قوم سے خطاب ________ 250
حضرت ابراہیم کے اسوہ حسنہ کے متعلق قرآن حکیم کی طرف سے دی گئی شہادت ________ 251

دسواں باب: سورة الانعام (آیات 79 تا 90)

تعمیرِ ملت کی بنیاد ہمیشہ قوم کی اجتماعی سوچ پر استوار ہوتی ہے 252
شرک کے سلسلہ میں ہم نے اپنے آپ کو خود فریبی میں مبتلا کر رکھا ہے ____ 253
حضرت ابراہیم کے نزدیک توحید کی عملی وضاحت اور ہیگل کا فلسفہ حیات ____ 253
زندگی کے ابتدائی دور میں عقل انسانی کی کیفیت اور یہ سلسلہ کائنات ____ 254
خوف وحزن کے عالم میں یہ قندیل آسمانی کا احسانِ عظیم تھا جس نے انسان کو اس کے حقیقی مقام سے آگاہ کیا ____ 255
کائنات کی ہر شے انسان کے تابع تسخیر کر دی گئی ہے ____ 255
حسبِ سالقہ وحی کے آئینہ نے مقامِ انسانیت کو روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا کہ ہر انسانی بچہ واجب التکریم ہے ____ 256
قرآنِ حکیم اپنے حقائق کو بیان کرتے ہوئے اربابِ فکر ونظر کے لیے ایک حقیقت کشا انداز اختیار کرتا ہے ____ 256
ہمارے ہاں کے غلط تراجم قرآنی حقائق کی شکل وصورت کو زنگ آلود کر دیتے ہیں ____ 257
لفظ افل یا فان کا لغوی مفہوم تغیر پذیر ہونا ہے ____ 257
کائنات کے ذرے ذرے میں ہر آن ایک تغیر واقع ہو رہا ہے 258
انسان میں ایک چیز ایسی بھی ہے جو تغیر پذیر نہیں ہوتی، قرآن حکیم نے اسے نفس کہا ہے ____ 258
مادیت سے ہٹ کر نظریات زندگی میں کلمات اللہ کے تحت اِلاّ کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا 259
ایمان لانے کا تمام تر دارومدار خدا کی طرف سے ملنے والے غیر متبدل اصولوں کو تسلیم کرنے پر موقوف ہے ____ 260
دل ونگاہ کی ہم آہنگی کے بغیر ایمان ایمان ہی نہیں کہلاتا ____ 260
خدا تعالیٰ اجتماعی طور پر احکام خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی تاکید کرتا ہے ____ 261
خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد نبی اکرم ﷺ کا اگلا قدم ہم آہنگ افراد کی بنیاد پر جماعت کی تشکیل ____ 261
سب سے بڑا ظلم، شرک ہے جو انسان کو انسانیت کے مقام سے گرا دیتا ہے ____ 262
انسانی مدارج کی بنیاد انسان کے کریکٹر سے مشروط ہوتی ہے 262
تیرہ سو سال سے بے ہنگم مسائل میں الجھی ہوئی ملتِ اسلامیہ کی حالت زار ____ 263
شرک کا عمل انسان کے دل ودماغ پر غلامی وپستی اور خوف کے گہرے بادل مسلط کر دیتا ہے ____ 263
علامہ اقبال کے نزدیک شرک کا ماحصل اور لفظ تقویٰ کا مفہوم 264
مذکورہ تراجم اور قرآن حکیم کی آیات کے حقیقی مفہوم کی واضح اور دو ٹوک مثال ____ 265
عبدِ مومن قلبی اور ذہنی طور پر ہمیشہ مطمئن ہوتا ہے ____ 266
پرویزؒ کے نزدیک نوجوان نسل کے لیے کالج کا وہ خواب جو پورا نہ ہو سکا ____ 267
کائنات کی ہر شے انسان کے سامنے ساجد ہے لہٰذا اسے اسی مقام پر رکھنا ہوگا ____ 267
خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں حضرت ابراہیم کا اپنی قوم کے بارے میں ایک سوال اور پھر خدا تعالیٰ کا جواب ____ 268
خدا کے حضور درجات کی بلندی ہمیشہ عمل سے مشروط ہوتی ہے 269
مقام نبوت کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ کے احوالِ زندگی ____ 269
نبوت کا دارومدار وراثت کا رہینِ منت نہیں ہوتا اور نہ ہی

اس کا تعلق کسب و ہنر سے ہوتا ہے 269
مقامِ نبوت سیرت و کردار کے آئینہ میں 270
شرک کے مرض میں مبتلا مریض کا علاج اور اس کا انجام 271
نبوت کا مقصد وحی کے عطا کردہ نظامِ حیات کی عملی تشکیل ہے 272
دیکھنا یہ ہے کہ اب ذکر للعالمین کی نظام حیات کو عملی شکل
دینے کی سعادت کس کے حصے آتی ہے 272
ہم نے صدیوں سے قرآن حکیم کے احکام کو بیچنا شروع
کر رکھا ہے 272
آخر کار انسان کو وحی کی طرف سے عطا کردہ ضابطۂ حیات
تسلیم کرنا ہی پڑے گا 273

گیارھواں باب **سورۃ الانعام** (آیات 91 تا 92)

مذہب کی پوری تاریخ ہمیشہ مافوق الفطرت زاویہ نگاہ کی
حامل رہی ہے 274
مذہب کے مقابلے میں دین میں خدا کا تصور بالکل الگ
نوعیت کا حامل ہے 274
سورج کی روشنی پوری نوع انسانی کے لیے ہے جو چاہے
اس سے استفادہ کرے 275
خدا کے متعلق صحیح اندازہ اس کے مقرر کردہ قوانین کے
ذریعے ہی ہوسکتا ہے 277
قوانین فطرت سے ہٹ کر کسی رسول کو کوئی مافوق الفطرت
چیز عطا نہیں کی گئی تھی 277
ایک اہم قرآنی آیت جس پر غور و فکر سے خدا کے صحیح تصور
کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے 277
لفظ بدیع کے متعلق محدود انسانی سوچ، تصورات،
قیاس و گمان اور وہم سے ہی بالاتر ہے 278
عالمِ عدم سے عالم خلق کی تخلیق اور پھر اس کے لیے
قدرت کے غیر متبدل اصولوں کی اہمیت 279
عالم عدم کو ماورائے فطرت کہنا درست نہیں 279
لفظ امر اور خلق کی بنیادی خصوصیت اور اس کا مفہوم 280
عدم سے وجود میں آنے والی اس کائنات میں ہر آن نت نئے
اضافے ہوتے رہتے ہیں 280
ذات خداوندی کے متعلق غلط تصورات عقل انسانی کو
حقیقت کی طرف آنے ہی نہیں دیتے 282
خدا کا کوئی رسول مافوق البشر خصوصیات کا حامل نہ تھا 282
قوانین فطرت سے ماوارا کوئی نبی نہ تو اچنبھے کی بات کہتا ہے
اور نہ ہی عملی طور پر کچھ ایسا کرتا ہے 282
مذہب کی دنیا میں حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کے متعلق
نظریاتی فرق کی نوعیت کیوں؟ 283
قرآنی تعلیم کے برعکس بشر اور فوق البشر کے ضمن میں
مسلمانوں کی عجوبہ سازی کی دو تین مثالیں 283
انسانوں کی کتب فروشی کی سوچ نے آسمانی کتابوں کو
ورق ورق کر دیا 284
ہمارے ہاں قرآن حکیم کے محفوظ نسخہ کیمیا کو ورق ورق کرنے
کی ناکام کوشش قرآنی آیات کو منسوخ کرنے کا اعلان 284
تورات کے پرانے نسخہ کی بازیابی کا قصہ 285
قرآنِ حکیم کی آیات کو منسوخ قرار دینے کی سازش کا نتیجہ
دراصل Date of expiry کے مترادف تھا 285
مذہبی پیشوائیت کے مناظروں کو قرآنِ حکیم نے لعب
قرار دیا ہے 286
لفظ برکت اور مبارک کا حقیقی مفہوم ثبات اور تغیر کے

حسین امتزاج سے نشو و نما دینے والا ______ 286
کتاب مبارکہ کے برعکس مذہبی دنیا کی خود ساختہ شریعت
نے قوم مسلم پر صدیوں سے جمود طاری کر رکھا ہے ______ 287
سابقہ آسمانی کتابوں کی تصدیق کا حقیقی مفہوم ______ 288
موجودہ انجیل میں سوائے ایک قانون کے کوئی قانون موجود
نہیں جب کہ اسے بھی ختم کر دیا گیا ہے ______ 288
قانون پر عمل پیرائی کے لیے جذبۂ صادقہ کی اہمیت اور
جہد مسلسل لازم ہے ______ 289
نبی اکرم ﷺ کے عہد میں قائم کیے گئے نظامِ حیات کی کیفیت 289
ہر چیز آخرت پر ہی موقوف نہیں ہوتی بلکہ زندگی خود بھی
گناہوں کی سزا دیتی ہے ______ 290
عملی طور پر قرآنی نظام کی ابتدا تو مکہ میں ہی کر دی گئی تھی ___ 290
مملکت اسلامیہ میں ایمان والوں کے لیے بنیادی شرط ____ 291
انسانی زندگی کے دو الگ الگ پہلو الگ الگ تصورات
اور اصولِ حیات ______ 291
خدا کا تصور آخرت کے تصور کو تسلیم کیے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتا 292
قرآن حکیم کی تعلیم کے مطابق تصور حیات کا بدلنا ہی
آخرت پر ایمان لانے کا ثبوت ہے ______ 292
ہمارے ہاں صلوٰۃ کے محدود تر جمے نے قرآنی نظام حیات
کے تصور کو ہی ختم کر دیا ______ 293
قرآنِ حکیم کا نظام صلوٰۃ پوجا پاٹ یا پرستش سے بہت بلند ہے 294
میری انفرادی نماز میں بھی نظام صلوٰۃ کے قیام کی آرزو کو زندہ
کرنے کا مقصد ہمیشہ میرے پیش نظر رہتا ہے پرویزؒ ____ 295

بارھواں باب **سورۃ الانعام** (آیت 93)

قرآنِ حکیم کے خلاف ایک گہری سازش کہ اس کے کچھ حصے
کو تو منسوخ کر دیا جبکہ باقی کو ثواب کے لیے مختص کر دیا ___ 297
قرآنِ حکیم کے خلاف کی گئی سازش کی ابتدا دو چار فرضی
ناموں کو نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر دیا گیا ______ 298
زوالِ امت کے اہم اسباب ______ 299
سازش کرنے والوں کی پہلی کیٹیگری ______ 299
کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی پوری انسانیت کے لیے
کوئی غیر متبدل اصول دینے کی مجاز نہیں ہو سکتی ______ 301
قرآن حکیم کی روشنی میں کیے گئے استنباط کو ہمیشگی کا درجہ
حاصل نہیں ہو سکتا ______ 301
قرآنِ حکیم کے غیر متبدل اصولوں کے برعکس مملکت کے
قوانین میں تبدیلی کا امکان ہر وقت ممکن ہوگا ______ 302
مذہبی پیشوائیت کی پہلی کیٹیگری کا عمل دخل یہودیوں کی
شریعت تالمود کی بنیاد پر صحف موسوی کی پانچ کتب کی تالیف 302
قرآن حکیم کی سند کے بغیر اُمت مسلمہ کی سوچ کا معیار ___ 303
ختم نبوت کے بعد تو وحی کے نزول کا دعویٰ ہی باطل ہے ___ 303
وحی کی بنیادی خصوصیات اور عقلِ انسانی کے تجرباتی
علم میں فرق ______ 303
الہام اور کشف کے متعلق وضع کردہ عقیدہ جو وحی کی
مہر کو توڑنے کے مترادف ہے ______ 304
وحی کی مہر کو توڑنے والوں کا مرتبہ مقربِ بارگاہِ الٰہی قرار پایا ___ 305
تصوف کے خدوخال کی وضاحت کے سلسلہ میں علامہ پرویزؒ
کے دل و دماغ میں کالج کے حسین خواب کی اہمیت ____ 305
تصوف کی ساری بنیاد اس پر ہے کہ جس مقام سے نبی لیتے ہیں
اسی مقام سے انسان کامل صاحبِ زمان، غوث قطب لیتے ہیں 305
یہ ہے تعلیم ان حضرات کی، جن کا مقامِ اربابِ شریعت سے

بلند تصور کیا جاتا ہے ____ 306
قرآن حکیم نے اپنے ہاں احبار و رہبان دونوں شعبوں کا
ذکر بالتفصیل کر رکھا ہے ____ 307
تیسری کیٹیگری فلاسفروں کی خصوصیات کا ذکر ____ 307
وجدان کی خصوصیات اور اس کا عملی مظاہرہ ____ 307
وحی کسی شکل میں بھی وجدان کا پرتو نہیں ہوسکتی ____ 308
Conscious اور Unconscious یعنی شعوری
اور غیر شعوری نفس کا قابلِ غور تجزیہ ____ 308
خدا کا نبی خدا کے دیئے ہوئے نور سے دیکھتا ہے ____ 309
دنیا میں سب سے زیادہ آزاد اور عظیم قوم وہ ہے جو کسی
انسان کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتی ____ 310
ہر کسی کو اپنی بات منوانے کے لیے کتاب اللہ سے ثبوت
پیش کرنا ہوگا ____ 310
وحی کی راہنمائی سے ہٹ کر اپنے نفس یا Ego کی
کارفرمائیوں کی اقسام ____ 311
موت کے وقت پھر فرشتے پوچھیں گے کہ بتاؤ کہاں ہے
تمہاری وہ انانیت جس کا تمہیں اتنا غرور تھا ____ 312
ظہورِ نتائج کے وقت انسان کے Conscious Mind
کی کیفیت کہ جب تمام حقائق سامنے آ جائیں گے ____ 312
قرآن حکیم قدم قدم پر انسانی سائیکولوجی کے نئے نئے
گوشے بیان کرتا ہے ____ 313
غلط اعمال کے نتائج انسان کو غیر شعوری طور پر سانپ کی
طرح ڈستے رہتے ہیں ____ 313
توبہ یا استغفار کا نفسیاتی پہلو اور پھر اعترافِ حقیقت میں
مثبت انداز کا ثمر ____ 314
عزم راسخ کی اہمیت اور اس کے حصول کا طریق ____ 314
تنہائی کا اعتراف جرم انسان کو بری محفل کی ذلت سے
بچالیتا ہے ____ 315
اپنی کمزوری کا اعتراف نہ کرنا اور ہر بات کو معاشرے کا
جرم قرار دینا' ابلیسیت کی چال ہے ____ 316
ڈرامے کے اہتمام نے زاویہ نگاہ ہی بدل دیا ____ 317
قرآن حکیم کی تعلیم تو یہ ہے کہ ہر فرد اپنے لیے خود ذمہ دار ہے 317

تیرہواں باب: **سورۃ الانعام** (آیت94)

انسانی زندگی کا اہم مسئلہ میرٹ کی بنیاد کا مہیا کرنا ہے
اضافی تصورات کا نہیں ____ 318
خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں تنہا پیش ہونے کا حقیقی مفہوم ____ 318
انسانی زندگی کے سب سے بڑے جہنم کی نوعیت ____ 319
قرآن حکیم کے نزدیک ہر انسان کی ذات ایک انفرادی
حیثیت کی حامل ہے' جسے آگے جانا ہے ____ 319
قرآن حکیم نے کرہ ارض پر انسانی پیدائش کو خلق جدید کہہ کر
پکارا ہے جو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہوتی ہے ____ 320
قرآن حکیم پیدائش کے اعتبار سے کسی اضافی چیزوں کو
اہمیت نہیں دیتا ____ 321
قانون مکافات عمل کسی اضافی چیز کو کسی ترازو میں نہیں تولتا ____ 321
ایصالِ ثواب کا عقیدہ ایک سازش کے تحت دوسروں سے
مستعار لیا گیا' تصور ہے ____ 322
کفارہ اور پھر کفارے کی بگڑی ہوئی شکل صدقہ دینے
کے تصور کی اصلیت ____ 322
انسانیت کے اندر یہ ذاتیں اور...... قطعی طور پر اضافی
چیزیں ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ____ 323

عمل انسانی کی برومندی کے ساتھ ساتھ انسانی ذات کی حقیقت
اوراس کی اہمیت اورزیادہ نکھر کرسامنے آتی جائے گی ____ 323
ذات برادری کی اندھیری رات نے ملتِ اسلامیہ کوصدیوں
سے نفسیاتی تقلید پرستی کی تباہ کن بیماری میں مبتلا کررکھا ہے _ 324
قرآن حکیم کی روشنی میں ذات برادری کے اضافی تصورات
سے پیدا ہونے والے ضمیر کے بوجھ کا یقینی علاج ______ 324
تحت شعور میں چھپی ہوئی اضطراری کیفیات کے نتائج
اوران کا علاج ______ 325
ہرفرد کواس کے انفرادی عمل اور کردار سے جاننا اور دیکھنا ہوگا 326
غیرقرآنی معاشرے کی تصویرکشی اوراس کا علاج ______ 327
صاحب حیثیت افراد کے علاوہ برسراقتدار لوگوں کے کردار
کے معاشرے پراثرات اورقرآنی راہنمائی ______ 327
مادیت کی بنیاد پر مارکس ازم کے سوشلسٹ فلسفے کے تحت
معاشرے میں جرائم کی بھرمار کی بنیادی وجہ ______ 328
فلاسفروں کی طرف سے سمگلر کے کریکٹر کی تمام ذمہ داری
معاشرے پرڈال دی جاتی ہے ______ 328
جہنم میں قوم کے لیڈر، رہنما اور عوام آمنے سامنے ایک دوسرے
کومجرم قرار دیں گے ______ 329
جہنم کے اس منظرنامے کے متعلق قرآن حکیم کا ایک
بصیرت افروز فیصلہ ______ 329
جہنم کی وہ محسوس شکل جس میں ملتِ اسلامیہ کی موجودہ
حالتِ زار کی عکاسی کی گئی ہے ______ 331
تہذیب فرنگ جوایک ہجوم کی شکل میں عرصہ سے ہمارے ہاں وارد
ہورہی ہے اس کا انداز اس کے اثرات اور قرآن حکیم کا فیصلہ 331
ملت اسلامیہ کی بربادی میں ہمارا زاویہ نگاہ اور
قرآن حکیم کا ارشاد ______ 332
قرآن حکیم میں ابلیس کا خدا کے ساتھ مکالمہ انسان کو اپنی
اصلاح کی ترغیب دیتا ہے ______ 333
غلط اعمال کو نگاہوں میں حسین بنا کر پیش کرنے کے ابلیسی
خاصے کی وضاحت اور علاج ______ 333
مومن کے لیے عزم راسخ کا ملکہ ہی تو ایک گوہر تابدار ہے _ 334
خدا کے پاس اکیلے جانے کا مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان کی
کوئی اضافی چیز اس کے ساتھ نہیں جائے گی ______ 335
انسانی ذات کی تعمیر انسان کے اپنے اعمال سے ہوتی ہے
اضافی چیزوں سے نہیں ______ 335
دراصل زندگی کا مقصد اضافی چیزوں کے محاسبے کی بجائے
انسانی ذات کا محاسبہ ہے ______ 336
نبی اکرمؐ نے تو اپنی بیٹی سے کہہ دیا تھا کہ روز محشر تم یہ نہ سمجھنا
کہ میں آپ کی بیٹی ہوں ______ 336
انسان کی تمام نفسیاتی پریشانیوں کی بنیادی وجہ اس کا اپنا
میرٹ ہوتا ہے ______ 337
کیا لعل و گوہر انسانی ذات سے زیادہ قیمتی ہیں؟ ______ 338
ذات کی پختگی کے برعکس قدم قدم پر جھوٹی انا کے تفاخر کی
حفاظت کی فکر بڑی اذیت ناک ہوتی ہے ______ 338
انسانی دنیا میں قرآنی معاشرے کی خصوصیات ______ 339
تمدنی لحاظ سے اضافی طور پر باپ بیٹے کا بھائی بہن کا رشتہ
بھی تو بعد کی معلومات پر ہی استوار ہوتا ہے ______ 339
ایک اچھے انسانی معاشرے کی بنیاد صرف میرٹ
پراستوار ہوتی ہے ______ 340
قرآن حکیم کا فلسفہ حیات انفرادی ذمہ داری اور مرنے کے

بعد کی زندگی کا برحق ہونا ___ 340

چودہواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 95 تا 103)

عقلِ انسانی کے لیے ہزاروں سال پیشتر مادی دنیا میں ہر آن موت سے زندگی اور زندگی سے موت کا انکشاف ___ 342
خدا پر ایمان لانے کی اہمیت انسانی ذات پر ایمان لانے سے مشروط ہے ___ 342
انسانی ذات کے علاوہ وہ تمام چیزیں جسے انسان ''میری'' کہتا ہے یہ سب کی سب یہیں رہ جائیں گی ___ 343
عبد کی زندگی کی ماہیت کو محسوس طور پر نہیں دکھایا جا سکتا ___ 343
انسان کو زمین میں دفن کر دینے کے بعد بیج کی مانند زندگی کی نمود کی قرآنی مثال ___ 344
عربی زبان میں موت کا لفظ کسی چیز کے ساکن ہو جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے ___ 345
موت کے بعد زندگی صرف محرکات کی طلب گار رہتی ہے ___ 345
اہل علم کے نزدیک مادی دنیا میں زندگی کی ابتداء ایک حیران کن مسئلہ ہے ___ 346
زندگی تو ایک تسلسل ہے جس کے تحت مردہ سے زندہ اور زندہ میں سے مردہ کا عمل ہر آن جاری ہے ___ 347
جسم انسانی کا ایک ایک ذرہ ہر آن موت و حیات کے عمل سے دوچار ہے ___ 347
زندگی اور موت کے محرکات کے بارے عام سطح پر ایک کسان کو سمجھانے کا قرآنی طریق ___ 348
فکر قرآنی کی تعلیم تو بادِ نسیم کی طرح شفاف اور صدا بہار پھول کی مانند ہے ___ 349
حق کو حق ثابت کرنے کے لیے قرآن حکیم کے روشن اور
عقل و بصیرت پر مبنی دلائل ___ 349
سورج کے طلوع ہونے اور غروب ہونے میں ''وقت'' کی حکمت پوشیدہ ہے ___ 350
سفر کے دوران صحرا میں رات کی تاریکی کے اندر ستاروں کی گواہی جو کبھی دھوکہ نہیں دیتے ___ 351
صحرا نشینوں کو وحی کی راہنمائی سے آگاہ کرنے کا قرآنی انداز 352
قصہ آدم کی پیدائش کا ___ 353
انسانی زندگی کی ابتدا ایک جرثومہ حیات سے ہوتی ہے ___ 353
انسانی زندگی کی ابتدا فردِ واحد سے نہیں بلکہ نفس واحدہ سے ہوئی ___ 354
ایک منزل سے دوسری منزل کا ارتقا ___ 354
لفظ مستقر اور مستودع کا قرآنی اور لغوی مفہوم ___ 355
حقائق کے برعکس لفظ امانت کا مروجہ تراجم حیران کن تصور ___ 355
انسان کی ارتقائی منازل پر غور و فکر کرنے کے سلسلہ میں ''لقوم یعلمون'' کے الفاظ کا استعمال معنی خیز ہے ___ 356
زمین مردہ میں مستور زندگی کے آثار کی وضاحت ___ 356
لفظ دابۃ کا وہ لغوی مفہوم جس سے تمام انسان محروم ہیں ___ 357
زمین کے نمکیات، پانی، سورج کی گرمی اور ہوا ان تمام کا باہمی ربط خشخاش کے دانے کے برابر بیج کو تناور درخت کی شکل عطا کر دیتا ہے ___ 357
انسانی ذات کے لیے جسم انسانی کی مثال اس غنچے کی سی ہے کہ اس کے ختم ہونے میں ذات انسانی کے ثمر بار ہونے کا راز مضمر ہے 358
کائنات کے ایک ایک ذرے کو کنٹرول کرنے کے لیے بتیس کروڑ دیوتاؤں کا تصور ___ 359
اگر ایک قادرِ مطلق کی بجائے دو ہوتے تو کائناتی نظام میں

اس قدر حسن وخوبی دیکھی ہی نہ جاتی ___________ 359
خدائے علیم کو نہ تو کسی نے جنا اور نہ ہی اس نے کسی کو جنا ___ 360
خدا کی ذات ہی وہ ذات ہے جو پوری کائنات کو کسی Cause
کے بغیر وجود میں لائی ہے ___________ 361
سائنس کی ساری عمارت ہی Cause&Effect پر
استوار ہوتی ہے ________________ 361
قوانین فطرت کی تشکیل کے بعد خدا نے خود کو بھی ان کا
پابند کر لیا ________________ 361
ہم نے زمین پر بادشاہ کو خدا کا ایسا سایہ بنا دیا کہ جس کی
شخصیت ہر قسم کے قانون سے بالاتر قرار پائی _______ 362
ہمارے ہاں تو خدا کا تصور بھی وہی ہے جو ہم نے بادشاہوں
کے متعلق قائم کر رکھا ہے ___________ 362
خدا کا جو تصور قرآن حکیم پیش کرتا ہے وہ منزہ شکل میں
صرف قندیل آسمانی میں محفوظ ہے _________ 363
قرآن حکیم نے تو اپنی ابتدا رب کے لفظ سے کی ہے اور اس
پروگرام کی تکمیل کے لیے ایک نظام دیا ہے ________ 364
خدا کو ماننے کا مقصد خدا کے دیئے گئے نظام حیات کو عملاً
متشکل کرنا ہے ________________ 364
ہر اذان میں کلمہ شہادت کی با آواز بلند پکار ایک عظیم نعرہ ہے 364
صحیفہ فطرت پر عقل انسانی کی پرواز اور خدا کے قانون پر
بھروسے کا نتیجہ ________________ 365
پندرھواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 104 تا 111)
خدا تعالیٰ اپنی خدائی کا صحیح تصور قدم قدم پر صحیفۂ فطرت
کے مختلف گوشوں کو ابھار کر پیش کرتا ہے _________ 366
خدا پر وہی ایمان قابلِ قبول ہے جس کی تائید قرآن خود کرے 367
انسان کا محدود ذہن تو خدا کی ذات کا تصور بھی نہیں کر سکتا _ 367
لفظ درکات اور درک کا لغوی قرآنی مفہوم اور عربی زبان
کی انفرادیت ________________ 368
ذاتِ خداوندی کو انسانی آنکھ درکات کی حد تک بھی نہیں
دیکھ سکتی جب کہ خدا تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہوتا ہے ______ 370
انسان کا ذاتِ خداوندی سے باہمی رابطے کا طریق صرف
قرآن حکیم سے ہی ممکن ہے، باقی سب باطل ہے ______ 370
انسان کے لیے اختیار و ارادے کی صلاحیت اور وحی کی
روشنی کی اہمیت ________________ 371
قرآن حکیم نے زندگی کے اصولوں کی وضاحت کے لیے
تصریف آیات کے اصول کو اپنایا ہے اس میں بڑی حکمت ہے 372
لفظ درس کا بنیادی مفہوم اور قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق ____ 373
قرآن حکیم کی وضاحت خود خدا کے ذمہ تھی لیکن کن کے
لیے اور کس طرح ________________ 374
قیامت تک کے لیے ایک محفوظ مکمل اور آسان نسخے کے ساتھ
دوسرے نسخے کا استعمال ہی تو شرک ہے __________ 375
نظریہ پاکستان کا بنیادی مقصد اور کوئی عملی شکل دینے کا طریق 376
ولوشاء اللہ کے غلط مفہوم کا نتیجہ خدا تعالیٰ پر تہمت ہے ____ 376
لوشاء اللہ کے سلسلے میں بظاہر قرآن حکیم میں تضاد محسوس
کرنے والوں کے لیے علامہ پرویز کی ایک کوشش کا ذکر ___ 377
ہزار برس سے تقدیر جیسے الجھے ہوئے اہم مسئلہ کے حل کے
سلسلہ میں علامہ غلام احمدؒ کی سعی و کاوش کی تفصیل ______ 378
لفظ ولوشآء کا قرآنی اور لغوی مفہوم ___________ 379
رسول خداؐ کی ذمہ داری دوسروں تک پیغام پہنچانا ہے کسی
سے حکماً کسی چیز کا منوانا نہیں ________________ 380

دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانے کا طریق انہیں گالیاں
دینے میں نہیں ہے ______________ 380
اس قسم کے ناگفتہ بہ حالات میں محفوظ رہنے کا قرآنی طریق'
جہالت کو ختم کرنے میں ہے ______________ 381
قرآنِ حکیم کے نزدیک کسی کی عقیدت کا معیار بذاتِ خود
ایک قابلِ غور مسئلہ ہے ______________ 381
قرآن حکیم باہمی طور پر مباحثہ یا مناظرہ کرنے کی بجائے'
دلائل کی بنا پر عمل کی دعوت دیتا ہے ______________ 382
خدا کا دین تو آج بھی اپنی جگہ سچا ہے البتہ ہم ہی سچے نہیں ہیں 382
ملتِ اسلامیہ کے لیے لازم ہے کہ وہ آج ایک بار پھر وحی کے
عطا کردہ خالص بیج کو اپنے ہاں دوبارہ کاشت کرے ____ 383
اقبال کے الفاظ میں حقیقی علاج اس کا وہی ہے کہ آب نشاط
انگیز ہے ساقی ______________ 383
پستی کی انتہا ہم قرآن حکیم میں سے نبی اکرم ﷺ کے بال نکال
رہے ہیں جب کہ قرآن حکیم نے حقائق سے آگاہ کیا ہے _ 384
قرآن حکیم کتاب فطرت ہے اور اس کا ایک ایک لفظ اپنی
اپنی جگہ ایک عظیم معجزہ ہے ______________ 385
قدرت کی یہ پوری کی پوری کائنات ایک ایسا عظیم معجزہ جس
نے عقلِ انسانی کو جلا تو بخشی لیکن اسے سلب نہیں کیا ____ 385
قدرت کا انسان کو عقل و شعور جیسا لازوال تحفہ عطا کرنے کے
بعد اسے واپس لینا شان ربوبیت کے خلاف ہے ______ 386
تباہی کے واضح آثار دیکھنے کے باوجود سبق حاصل نہ کرنے
والوں کا انجام انسانیت کی سطح سے محروم ہونا ہے ______ 386
سولہواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 111 تا 115)
معجزات کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی دوٹوک وضاحت کے
باوجود ہماری تقلید پرستی کی نوعیت ______________ 388
نبی اکرم ﷺ کے متعلق معجزات کا منسوب کردہ مسلمہ تصور _ 389
کسی چیز پر کھلی آنکھوں کے ساتھ دل و جان کی پوری رضا
مندی کے ساتھ بغیر لالچ اور بغیر کسی جبر کے تسلیم کرنا ہی ایمان
کی بنیادی شرط ہے ______________ 390
صدر اوّل کے عرب قبائل کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد
اور پھر ہماری حالت ______________ 391
ہم صرف مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے کی نسبت سے
ایک قومی مسلمان ہیں جب کہ ایمان تو ہمیں ابھی لانا ہے _ 392
قرآن حکیم کے معیار کے مطابق معجزات کو دیکھ کر ایمان لانا'
کوئی معنی نہیں رکھتا ______________ 393
ہمارے قرآنی تراجم نے نوجوان نسل کو اسلام سے بیگانہ کر دیا 394
علامہ غلام احمد پرویزؒ کی آدھی عمر اپنی روائتی تراجم اور تفسیروں
میں الجھی رہی ______________ 395
قرآن حکیم پر ایمان لانا ہو تو پہلے خدا تعالیٰ کے قانون مشیت
کو سمجھنا ہوگا ______________ 395
نبی اکرم ﷺ کی ایک مقدس آرزو اور قرآن حکیم کا جواب
کہ خدا کسی انسان کی آزادی کو سلب نہیں کرنا چاہتا ____ 396
اختیار ارادے کی صلاحیت کے بغیر انسان پھر انسانوں
کے زمرے میں آتا ______________ 396
ایک اور الجھاؤ کہ ''خدا کے حکم کے بغیر کوئی شخص ایمان
نہیں لا سکتا'' ______________ 397
قرآن حکیم کا خاصا یہ ہے کہ اپنے الفاظ کی تشریح خود کرتا ہے 397
قرآن حکیم کے ان حقائق کے برعکس ہمارا مروجہ لٹریچر ___ 398
قرآن حکیم کے آئینہ میں جن وانس کا حقیقی تصور اور لفظ جن

کا لغوی مفہوم ____ 398
دین کی آڑ میں مذہب کا پرچار اور پیٹ کے دوزخ کا علاج 400
دین میں حکم خداوندی کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہوتا
اسی کا نام قرآنی حکومت الٰہیہ ہے ____ 400
مذہبی پیشوائیت کا انداز، حکمرانی جو خدا کے نام پر کی جاتی ہے 401
مختلف خود ساختہ تفسیروں کی تعبیرات کا نتیجہ اور اس کے
برعکس قرآن حکیم کا دعویٰ ____ 401
جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی
تو کافر ہیں ____ 402
قرآن حکیم کے بدترین دشمن ملوکیت قارونیت ہامانیت کی
چابک دستیوں کی وضاحت ____ 403
مذہبی پیشوائیت کی طرف سے باہمی طور پر تحریک طلوع
اسلام کی مخالفت کا انداز ____ 403
کتاب اللہ کی روشنی میں خدا تعالیٰ کا پروگرام اور اس کے
ساتھ ہونے والے سلوک کی حیثیت ____ 404
کتاب اللہ کے متعلق جناب مودودی صاحبؒ کا ایک انوکھا
فرمان اور قرآن حکیم کا واضح ارشاد ____ 405
قرآن حکیم کو سمجھنے میں دو مختلف مدارج کے لوگ اور
قرآن حکیم کی طرف سے راہنمائی کی کیفیت ____ 405
نبی اکرم ﷺ کے سر پر ختم نبوت کا تاج سجانے کا ثبوت،
کتاب اللہ کی تکمیل ہی تو ہے ____ 406
نبوت کی مہر کو توڑنے کی ناکام کوشش ____ 406
وحی کے متعلق یہ عقیدہ کہ اس کا 9/10 حصہ قرآن سے
باہر ہے، حکم خداوندی کے ساتھ عداوت ہے ____ 407

سترہواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 116 تا 120)

انسانی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ باہمی طور پر ہر قسم کے
تمدنی اور معاشرتی اصولوں کا متعین کرنا ہے ____ 409
عقل انسانی کا طویل سفر مختلف راہوں سے گزرتا ہوا
جمہوریت تک پہنچا ____ 410
جمہوریت کے خدوخال اور اس کا نتیجہ ____ 410
ہم نے اس بے لگام مغربی جمہوریت کو اسلامی جمہوریت
قرار دے دیا، جو سراسر شرک پر مبنی ہے ____ 411
انسانی زندگی کے غیر متبدل عملی اصولوں کے لیے
اقتدارِ مطلق صرف خالقِ کائنات کو حاصل ہے ____ 411
وقت کے تقاضوں کے تحت غیر متبدل اصولوں کے نفاذ
کی خاطر جزئیات کا تعین باہمی مشاورت سے کیا جائے گا ____ 412
اسلامی مملکت قرآن حکیم کے مطابق ہماری آزادی اور
پابندی کی حدود کا نفاذ کرتی ہے ____ 412
قرآنی حکومت اور مغربی جمہوریت کا تقابلی جائزہ ____ 413
قرآن حکیم کے نزدیک سوال اکثریت یا اقلیت کا نہیں
بلکہ قرآنی اصول کا ہے ____ 413
نبی اکرم ﷺ کی وفات پر حضرت ابوبکرؓ کا ایک عظیم اعلان ____ 414
چودہ سو سال پیشتر اعلان عام کہ حکومت فرد کی ہو یا افراد کی،
حکومت صرف قندیل آسمانی کی قبول ہوگی ____ 414
حق ہمیشہ حق ہوتا ہے وہ کسی کا محتاج نہیں ہوتا خواہ اس کو ایک
بھی تائید کرنے والا نہ ہو ____ 415
حق کے لیے بنیادی اصول یہ ہے کہ کسی کو دوسرے پر حکومت
کرنے کا حق حاصل نہیں ہوسکتا اور یہی حقیقی آزادی ہے ____ 416
سوائے خدا کی ذات کے، کوئی بھی انسان کے ابدی تقاضوں

سے واقف نہیں ہوسکتا ______ 416
ہندو ہونے کی تعریف گائے کا گوشت نہ کھانے تک محدود ہے 417
عدالت میں ایک سوال پر غالب کا ایک دلچسپ جواب ___ 417
حرام کیا ہے اور حلال کیا' مسلمانوں میں ایک ایسی چیز جسے
قرآن حکیم نے حرام قرار دیا ہے لیکن ہمارے ہاں وہ حلال
مقدس ہے ______ 417
قرآن حکیم نے حلال کے ساتھ طیب کا لفظ بھی شامل کیا ہے 418
انسان کا خدا کے ساتھ تعلق صرف اس کی کتاب کے ذریعے
ہی ہے ______ 418
بسم اللہ کا حقیقی مفہوم اور لفظ رحیمیت کی بنیادی خصوصیت ___ 419
جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ اکبر کے الفاظ دہرانا اپنی Ego
کی سطح کو خدا کے تابع رکھنا ہے ______ 419
مومن کی ہر آن نئی شان ______ 420
خدائے رحیم کی طرف سے انسان کے جسم اور اس کی ذات
کی نشوونما کے انتظامات ______ 420
خدا تعالیٰ کی صفت رحمانیت عظیم خصوصیات کی حامل ہے ___ 421
خورد و نوش کے سلسلہ میں حلال و حرام چیزوں کی وضاحت
کے باوجود ہمارے ہاں کی فہرستوں کی نوعیت کا انجام ___ 421
حضرت عیسیٰ کی طرف سے ہیکل کی سیڑھیوں پر دیئے جانے
والے خطاب کی نوعیت ______ 423
انسان کی تمدنی زندگی کا تمام تر دارومدار قانون کے احترام
میں ہی مضمر ہے ______ 425
شریعت اور طریقت دو مختلف اصطلاحیں ہیں اور ان کی ساری بنیاد
دین کی بجائے مذہب پر ہے نیز قرآن حکیم اور تلوار کا باہمی تعلق 425
ہمارے ہاں دیندار طبقے کی زبوں حالی ______ 427
ہمارے ہاں کے خطبے اور تقریر میں فرق ______ 427
قرآن حکیم کے مطابق نیکی کی تعریف دین کا ماحصل اور
اس کا عملی مظاہرہ ______ 428
ظواہر اور باطن کی عملی تفسیر اور علامہ اقبال کی نگاہ بصیرت ___ 428
ظاہر اور باطن کا قرآنی مفہوم اور اس کی اہمیت ______ 429

اٹھارواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 121 تا 127)

ہر وہ حلال چیز جو خدا تعالیٰ کی بجائے کسی شخصیت کے ساتھ
منسوب ہو وہ حرام ہو جاتی ہے ______ 431
کسی شخصیت کے نام پر منسوب حرام چیز کے وہ نفسیاتی
اثرات جو ذات انسانی پر بڑا گہرا اثر چھوڑتے ہیں ___ 432
ظواہر پر اہل شریعت اور اہل طریقت کا طرزِ زندگی ___ 433
باطن کا حرام ظواہر کے حلال سے' حلال نہیں ہو جاتا ___ 434
ذبح کرنے سے پہلے اللہ کا نام نہ لینے کی صورت میں
قوانین خداوندی کی جامعیت ______ 434
ہمارے ہاں حرام چیز کو حلال کرنے کا خود ساختہ طریق ___ 435
ہر لحہ ہر آن قوانین خداوندی کی یاد انسانی ذات پر ایک
گہرا اثر مرتب کرتی ہے ______ 435
منافقت کی پہچان خدا کو مانتے ہوئے' اسے نہ ماننا ___ 436
حلال اور حرام میں فرق ڈاکٹر نہیں بتاتا خدا کا قانون بتاتا ہے 437
انسانی زندگی کا رشتہ جسم اور ایمان دونوں سے مرتب ہوتا ہے
جب کہ مقصود بالذات ایمان ہی ہے ______ 438
جسم اور ذات کی باہمی حرمت کی بنا پر قرآن حکیم ان ہر دو کی
موت و حیات کو دو مختلف پیمانوں میں تقسیم کرتا ہے ___ 438
مذہب میں ہر شخص کا ایک انفرادی فریضہ ہوتا ہے جبکہ دین میں
ہر کام اجتماعی طور پر شمع قرآنی کی روشنی میں سرانجام پاتا ہے 439

علامہ اقبال کا قرآن فہمی کے سلسلہ میں علامہ پرویزؒ کی ایک تاریخی مشورہ ______ 440
کوئی فرد یا قوم جب خود ہی تاریکیوں سے نہ نکلنا چاہے تو چمگادڑ کی طرح پھر اندھی ہو جاتی ہے ______ 441
جب کسی قوم کے لیے تاریکی نعمت قرار پا جائے تو پھر اس کا کیا علاج ______ 441
کسی قوم کی سب سے بڑی خوش بختی یہ ہے کہ اسے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے شروع میں ہی قندیل آسمانی کی راہنمائی میسر آ جائے ______ 441
قوموں کی تباہی ہمیشہ سرغنوں کے ہاتھوں ہوتی ہے جو ہر چھوٹی بڑی سازشوں میں ملوث ہوتے ہیں اور پھر ان سے نکلنا نہیں چاہتے ______ 442
اس قسم کی سازشیں کرنے والوں کا نتیجہ عقل و شعور سے محرومی ہوتا ہے ______ 442
شرابی کا نشہ اترنے کی حالت میں اس کے ہاتھوں ہونے والے نقصان کا قصہ ______ 443
لفظ تحل کا لغوی اور قرآنی مفہوم اور ذہنی طور پر خناس کی کیفیت ______ 443
بے بسی کے عالم میں 10 لاکھ مربع میل تک حکومت کا قیام رسالت کا ہی صدقہ تھا ______ 444
نبی اکرم ﷺ کی وفات کے فوری بعد حضرت ابوبکرؓ کی زبانی ملتِ اسلامیہ کے لیے قرآن کا اعلان عظیم ______ 445
نبوت کے ختم ہونے پر رسالت تو ختم نہیں ہوتی ______ 445
وسعت نظر اور کشادہ قلبی شعبہ رسالت کی پاسداری کا بنیادی ستون ہے ______ 446
تنگ نظری کے برعکس وسعتِ قلب ایک ایسا کھلا میدان ہے جس میں پوری انسانیت سما سکتی ہے ______ 447
قرآنِ حکیم کا فرعون کے متعلق ارشاد کہ وہ بڑا ہی تنگ نظر واقع ہوا تھا ______ 448
غلط راستے پر چلنے والے کی نفسیاتی کیفیت ______ 448
اپنے پست جذبات کے تحت وحی کی صاف اور شفاف تعلیم کو رجس کر دینا یا گدلا دینا ______ 448
ساری قوم کے مقابلے میں اس "کچولا کچولنے" والے کی حالت ______ 449
ذکر کا قرآنی مفہوم، اس کی اہمیت اور اس کی عملی وضاحت ___ 449
ہر قسم کی تباہی سے بچنے کے لیے ذکر کے مفہوم کو سامنے رکھنا ہوگا ______ 450
خدا کو اپنا ولی بنانے کا معیار اور ہمارے ٹی وی پروگراموں کی نوعیت ______ 450
فطرت نے جس کو پیدا کرنا تھا وہ پیدا کر دیا اور اپنی راہنمائی کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ______ 451
اب کسی آنے والے کا تصور مذہب کا پیدا کردہ ہے، دین کا نہیں دین تو ہر لحاظ سے مکمل ہو چکا ہے ______ 451
ختم نبوت کے بعد کسی آنے والے کا تصور خود فریبی کے سوا کچھ اور نہیں ______ 452

انیسواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 128 تا 135)

قوموں میں پیدا ہونے والے انقلابات کے سلسلہ میں مکافاتِ عمل کا ذکر ______ 453
حقیقی انقلاب میں بڑے بڑوں کے چہرے بے نقاب ہو جائیں گے ______ 453

دیہاتی اور شہری آبادی کے لیے جن وانس کے نام پر
قرآن حکیم کی دو مختلف اصطلاحات کی وضاحت ______ 454
الیکشن کے زمانے میں لیڈروں کا دیہاتی آبادی کے
ساتھ رابطے کا مقصد ______ 455
قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں دنیا اور آخرت کی ہر دو جہنمیوں
کا ذکر کیا ہے ______ 457
آج کی دنیا میں تو ہر کسی کو انصاف کی تلاش ہے جب کہ ایک
ظالم دوسرے ظالم کو قتل کرنے میں مصرف دکھائی دیتا ہے _ 457
قرآنِ حکیم کا انداز یہ ہے کہ وہ انسان کو ظلم کے انجام سے
پہلے آگاہ کر دیتا ہے ______ 458
ظہورِ نتائج کے وقت انسان کی حالت ______ 458
ہر آنے والا دور میں مکافاتِ عمل کے اثرات بڑی تیزی
کے ساتھ وارد ہوں گے ______ 459
قرآنِ حکیم نے مفاد عاجلہ کی اصطلاح حیات الدنیا کے
معنی میں استعمال کرتے ہوئے اقدار خداوندی کی اہمیت کو
بھی واضح کیا ہے ______ 459
زندگی کے حسن کو قائم رکھنے کے لیے اگر قانون بنانا ضروری
ہے تو اس سے آگاہ کرنا بھی ضروری ہے ______ 460
UNO کے چارٹر میں دیے گئے حقوقِ انسانیت کا 75%
حصہ تقریباً قرآن حکیم کے اصولوں کا ترجمان ہے ______ 461
ختم نبوت کا اعلان دراصل انسانیت کی بلوغت کا اعلان تھا _ 461
درجات کا تعین حسب اور نسب کی بجائے اعمال کی بنیاد پر
ہوگا نہ کہ اقرباء نوازی پر ______ 462
ذاتوں اور گوتوں کا پہلو اب ایک نیا رنگ اختیار کر رہا ہے _ 463
دوسروں کا فیصلہ کرنے والے کے لیے چند ایک بنیادی
خصوصیات کا ہونا لازم ہے ______ 463
خدا تعالیٰ کی طرف سے ظالم کی کھیتی کٹ جانے پر الحمد اللہ کے
الفاظ کا استعمال اور خدا تعالیٰ کے عدل وانصاف کے خدوخال 464
ایک قوم کی جگہ کسی دوسری قوم کو لانے کی وجہ جواز ______ 465
آخر کار تباہ حال قوم کا ذکر افسانوی رنگ اختیار کر جاتا ہے
اور سپین میں مسلمانوں کی حکومت کا انجام تو ہمارے سامنے ہے 465
قرآنِ حکیم کے نزدیک سریع الحساب اور مہلت کے
وقفے کا باہمی تعلق ______ 466
کوئی قوم ہو یا کوئی فرد اس کے ہر عمل کا نتیجہ غیر محسوس طور
پر اس وقت مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے ______ 467
ظہورِ نتائج اور مہلت کا وقفہ ختم ہو چکنے کے بعد کیا پوچھا
جائے گا اور کیا کچھ کہا جائے گا ______ 467
جب تباہی محسوس شکل میں سامنے آ جائے تو اس وقت
ندامت کچھ کام نہیں آتی ______ 468
مکافاتِ عمل کے نتیجہ میں تباہی اور بربادی کی شکل وصورت _ 468
1972ء کے کنونشن میں علامہ پرویز کے خطاب کے
عنوان کا ذکر یعنی "پاکستان کے متعلق خدائی فیصلہ" ______ 469
جہادِ اصغر اور جہادِ اکبر کے سلسلہ میں ایک وضعی روایت
اور اس کی حقیقت ______ 469
جہاد کے سلسلہ میں ہونے والی ایک سازش کا ذکر ______ 470
معاشرے میں دولت کا کسی ایک جگہ رک جانا انسانی جسم
کے اندر خون کی گردش کا رک جانا ہے، جس کا نتیجہ فالج ہوتا ہے 471
دولت کے سلسلہ میں قرآن حکیم نے انفاق کا لفظ استعمال کیا
ہے، جس کے معنی کھلا رکھنے کے ہیں ______ 471
بخل کا لفظ انفاق کے مقابلے میں آیا ہے کنجوسی کے لیے نہیں 471

قرآنی آیات کی رو سے بخل برتنے والی قوم کا انجام ____ 472

پوری نوع انسانی کی بربادی کی بنیادی وجہ کیپٹل ازم ہے جس نے انسانوں کو کئی قسم کی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا کر رکھا ہے 472

مشرقی اور مغربی رقبوں کی تقسیم میں ڈھاکہ کا انجام ____ 473

ان ناگفتہ بہ حالات کے باوجود قرآن حکیم کی روشنی میں علامہ اقبال کا پیغام ____ 474

نبی اکرم ﷺ کی زبانی قرآن حکیم کا اعلان ____ 476

بیسواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 136 تا 150)

انسانی زندگی کی کامیابی اور آزادی کا نشان یہ ہے کہ اسے کوئی خوف ہو نہ حزن ____ 478

ابتدائی دور میں انسان کی عملی سطح اور کائناتی حوادثات کا ذہن پر اثر اور اس کا نتیجہ ____ 478

کائنات کے ذریعے انسان کے لیے راہنمائی اور خوف وحزن کا علاج ____ 479

خارجی کائنات کے علاوہ انسان کی معاشرتی زندگی کے متعلق راہنمائی ____ 480

اہل یورپ کی زندگی کی کیفیت۔ یہاں سے مریخ کو کنٹرول کرنے والا اپنے ہمسائے کو کنٹرول نہیں کر سکتا ____ 480

انسان کی تیسری کیٹیگری یعنی قران کا نظریہ رکھنے والی قوم اور خدا کے تصور کی ضرورت ____ 481

بتیس کروڑ دیوی دیوتاؤں کا تصور رکھنے والی قوم کی حالت اور قرآن کے نزدیک شرک کی تعریف ____ 481

خارجی کائنات میں خوف وحزن کی ساری بنیاد اس شرک پر ہے جس کو Cause& Effect کے تحت سمجھا جا سکتا ہے ____ 481

انسان کے سامنے اس کی زندگی عام طور پر نظروں سے اوجھل ہی رہتی ہے ____ 482

ہر انسان اپنے منہ پر کالک خود ہی ملتا ہے جس کی بنیادی وجہ حقائق سے انکاری اور توہم پرستی ہے ____ 482

بیعت رضوان کے سلسلہ میں درخت کو مقدس سمجھے جانے کے خطرے کے پیش نظر درخت کو کاٹ دینے کا حکم ____ 484

ہمارے ہاں آج کے دور میں بڑے بڑے مہذب تعلیم یافتہ حضرات کی حالتِ زار ____ 484

قوم کو حضرت صاحب کے اس غلط تصور نے ان گنت نفسیاتی بیماریوں میں الجھا رکھا ہے ____ 485

آج ہم قدم قدم پر مختلف قسم کے خوف وحزن کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں ____ 486

1965ء کی جنگ کے مجاہدین کی قربانیوں نے ہمیں ہندوؤں کی غلامی سے بچایا تھا ____ 486

یورپ کے مقابلے میں ہمارے مصائب کی بنیادی وجہ جہالت پر مبنی شرک ہے ____ 487

خدا کے نام پر، حضرت صاحب کے نام پر کیے جانے والے کاروبار کی نوعیت ____ 487

قرآنی تعلیم کے برعکس مختلف اعتقادات کی پختگی کا نتیجہ بچوں کو ذبح کرنے تک جا پہنچتا ہے ____ 488

کوئی شخص اپنے پیر کی سواری پر سواری بھی نہیں کر سکتا اور کوئی عورت نیاز کی چیز نہیں کھا سکتی ____ 489

خود فریبیوں کی بنا پر توہم پرستی اپنے اندر کئی پہلوؤں کو جنم دیتی ہے ____ 489

خدا تعالیٰ کا نظام ربوبیت تو پوری نوع انسانی کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے ____ 490

ہم نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے جو حقیقت پر مبنی نہیں ____ 490
خدا تعالیٰ کو انسانوں سے اپنا حق مانگنے کی ضرورت نہیں یہ تو سب کچھ ان انسانوں کے لیے ہے جن کو اس کی ضرورت ہوتی ہے 491
لفظ اسراف کا لغوی قرآنی مفہوم جو بڑا معنی خیز اور بصیرت افروز ہے ____ 491
قدرت کی طرف سے پیدا کردہ نعمائے خداوندی کا مقصد انسانوں کی ضروریات پورا کرنا تھا نہ کہ سامان تعیش فراہم کرنا 492
دورِ جہالت کی وہ چند ایک رسومات جن کا ذکر قرآن حکیم نے اپنے ہاں کیا ہے ____ 492
قرآن حکیم کی طرف سے خود ساختہ قوانین کی تردید ____ 493
قرآن حکیم کا اعلان یہ ہے کہ بجز چار چیزوں کے کوئی شے بھی حرام نہیں ہے ____ 493
اربابِ رشد و ہدایت کی طرف سے حرام و حلال کی لسٹوں کا ذکر ____ 494
حرام و حلال کے متعلق کچھ علما کی بحث پر مہاراجہ کرشن پرشاد کا ان سے استفسار؟ ____ 494
حرام چیزوں کے بارے میں ایک سوچنے والی بات ____ 495
جاگیرداری سطح کے تحت کرہ ارض پر انسانوں کی کھینچی ہوئی لکیروں نے حلال کو حرام قرار دے رکھا ہے ____ 496
جو چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا ____ 497
مذہب کے گرویدہ ذہن کے پاس ظن و قیاس تو ہوتا ہے لیکن دلیل و براہین نہیں ہوتا ____ 497

اکیسواں باب: **سورۃ الانعام** (آیت 151)

مذہبی پیشوائیت کی خود ساختہ شریعت کے خدوخال ____ 499
قرآن حکیم کی وہ دو جامع الاحکام آیات جن میں انسان کے مقام کو بڑی وضاحت سے متعین کیا گیا ہے ____ 499
تمدنی زندگی کی اہمیت، اور اس کے اختیار کردہ نظام ہائے زندگی کے عملی نتائج ____ 500
دین خدا کے برعکس مذہب کی دنیا میں انسان ہمیشہ سوچ کے مختلف جالوں میں پھنسا رہتا ہے ____ 501
دین خداوندی کے میں شرک کی نوعیت ____ 502
تمدنی لحاظ سے انسانی زندگی میں حیوانی عوامل کے علاوہ باہمی جبلت کے تقاضوں میں فرق ____ 502
والدین کی اطاعت کا تصور ایک غیر قرآنی تصور ہے ____ 503
آرام و سکون کی زندگی کے لیے خیال و تصورات کی یک رنگی بنیادی شرط ہے ____ 503
مفلسی کی وجہ سے بچوں کو قتل نہ کرنے کا حقیقی مفہوم کسی کو حقیر و ذلیل نہ کرنا ہے ____ 503
اولاد کو تعلیم و تربیت سے محروم رکھنا سب سے بڑا قتل ہے، ظلم ہے ____ 504
اجتماعی طور پر معاشرے کی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کرنے کا عملی طریق، صرف قرآن کے معاشی نظام میں مضمر ہے 505
ہمارے ہاں قرآن حکیم کے غلط تراجم نے حقائق کو الجھا رکھا ہے ____ 505
رزق کے سلسلہ میں خدا نے اپنا وعدہ پورا کرنے کا جو طریق بیان کیا ہے، یہ اس سے پورا ہوگا ____ 506
ملوکیت کے پیدا کردہ تصورِ خدا نے نظام ربوبیت کی اصل کو نظروں سے اوجھل کر ڈالا ہے ____ 506
خدا کے راستے کی طرف جانے والوں کے لیے روک بن کر

کھڑے ہو جانے والوں کا کردار اور ان کی نشان دہی ____ 507
دو بھائیوں کے مابین مکان کی تقسیم اور رزق کے
حصول کا معاملہ ____ 507
عربوں کی مہمان نوازی کی نوعیت اور ایرانی ملوکیت کے
اثرات قرآنی لٹریچر پر ____ 508
ہزار سال سے قرآنِ حکیم کی واضح روشن اور آسان تعلیم
سے لاتعلقی کی کیفیت ____ 508
قرآن حکیم کے معاشی نظام کی وضاحت نیز مومن
اور کافر میں فرق ____ 509
قرآنِ حکیم کے پیش کردہ حقائق پر غور و فکر کرنے
کی ضرورت ہے ____ 510
نظام سرمایہ داری کے ایجنٹ قرآنی حقائق کو سامنے
آنے ہی نہیں دیتے ____ 510
قرآنی نظام کے پہلے سربراہ نبی اکرم ﷺ خود تھے جن کے
ہاتھ پہ صحابہ کرامؓ نے بیعت کی تھی۔ ____ 511
رسول کے ہاتھ پہ بیعت کرنا خدا تعالیٰ کے قوانین کو عملاً
تسلیم کرنا ہوتا ہے ____ 511
خدا کے ساتھ کیے گئے معاہدہ نظامِ حیات کو توڑنے
کا نتیجہ جہنم ہے ____ 512
انسانی نظام میں عورت کی گھریلو زندگی کی ذمہ داری لیکن مالی
طور پر مرد کی محتاجی اور محکومی! نتیجہ زندگی بھر کا خوف و حزن ____ 512
قرآن حکیم میں بیان کردہ قصہ آدم کے تمثیلی بیان میں
مرد و زن کے لیے برابر کے حقوق کا ذکر ____ 513
جنتی زندگی کی بنیادی خصوصیات ____ 513
انسانوں کے لیے خدا کی ذمہ داری قرآنی اصولوں کی
اطاعت سے مشروط ہے ____ 514
حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق خدا کے ساتھ کیے گئے
معاہدہ سے انحراف کا نتیجہ ____ 514
تمدنی زندگی کی ابتدا گھر کے چھوٹے سے یونٹ سے
کی جاتی ہے ____ 515
انسانی زندگی کو پرائیویٹ کریکٹر اور پبلک کریکٹر کی دو اصطلاح
میں تقسیم کرنا یورپ کی تقلید ہے ____ 515
ظاہر اور باطن کی یک رنگی ہی کامیابی کی صورت گری ہے ____ 515
قوموں کے تمدن پر جنسیاتی اختلاط کے متعلق یورپ کے
ایک نامور محقق ڈاکٹر انون کی تحقیق ____ 516
مکافات عمل کا قانون ہر ظاہر اور باطن کے لیے بڑا باریک
بین واقعہ ہوا ہے ____ 516
عباسیوں کے دور میں شہنشاہ ہارون رشید کے ہاں تین
ہزار لونڈیوں کا ذکر ____ 517
قرآن حکیم کے نزدیک انسانی زندگی کی قیمت ____ 517
قرآنی معاشرے کی بنیادی خصوصیات ____ 517
انسانی معاشرے کی تباہی و بربادی کے لیے سب سے
زیادہ خطرناک چیز احترام آدمیت کا مفقود ہونا ہے ____ 518
خدا کا ہر قانون انسانیت کی نشوونما کے لیے حکمت
پر مبنی ہوتا ہے ____ 518
بائیسواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 152 تا 153)
مذکورہ سورت الانعام کی آیات نمبر 152 اور 153 کی
اہمیت کے پیش نظر چند ایک اہم نقات کا ذکر ____ 519
دین خداوندی کے بالمقابل نظام سرمایہ داری کا طریق کار ____ 520
ماپ تول کے سلسلہ میں انصاف کا ایک لفظ اپنے اندر

پورا اقتصادی نظام لیے ہوئے ہے ____ 521
نظام سرمایہ داری کے خدوخال اور اس کے ذرائع ____ 521
نظام سرمایہ داری انسانی صلاحیتوں کو خریدکر ان کی آزادی کو
سلب کردیتا ہے ____ 522
لفظ مطفف کا لغوی مفہوم ____ 522
قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے عربی زبان کی اہمیت اور اس کی
وسعت کو سمجھنا پڑے گا ____ 523
نظامِ سرمایہ داری کی بدعملی کی خصوصیات اور اس کا نتیجہ ____ 523
نظامِ تطفیف کے چند ایک پہلو ____ 523
ہمارے ہاں قرآن حکیم کی تفاسیر نظام سرمایہ داری کے دور
کی لکھی ہوئی ہیں ____ 524
قرآن حکیم انسانیت کے راستوں کی تمام رکاوٹوں کو ختم
کرتے ہوئے انقلاب کی نوید دیتا ہے ____ 524
قرآن حکیم نے انسان کی تمدنی زندگی کا ابتدائی نقشہ قصہ آدم
کے تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے ____ 525
تمدنی زندگی میں انسان کی مفاد پرستیوں کے علاج کا ذکر ____ 526
نظامِ عدل کے خوشگوار نتائج کا ذکر ____ 527
قرآنی حقائق کو بیان کرنے کا انتہائی بلاغت سے بھرپور
اعانت کا انداز ____ 527
ایمائیت کے انداز میں حضرت شعیبؑ کا قوم سے خطاب ____ 528
صلوٰۃ کے عمل کو اگر صرف نماز کی شکل میں ادا کردیا جائے
تو اس پر کسی کافر کو بھی اعتراض نہیں ہوتا ____ 529
قرآنی صلوٰۃ کا تعلق تو قرآن حکیم کے اقتصادی نظام
سے بھی ہے ____ 529
عملی زندگی میں خدا کی طرف سے عائد کردہ پابندی زندگی
کو روبہ عمل کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے ____ 530
قانون کی پابندی انسانی صلاحیتوں کو توانائی عطا کرنے
کا ذریعہ ہے ____ 531
زندگی کے حسن کو برقرار رکھنے کے لیے ہر آن عدل کو ملحوظ
رکھنے کی تاکید ____ 532
عدل ایک ایسا درمیانی نقطہ ہے جو زندگی کے سرکل کا حسن
بگڑنے نہیں دیتا جب کہ امت مسلمہ کا یہی فریضہ تھا ____ 532
نظامِ عدل کے بنیادی تقاضے اور مسئلہ شہادت کی اہمیت
اور اس کے خدوخال ____ 532
خدا کے ساتھ معاہدہ کرنے اور مسلمان کہلانے کی
بنیادی شرط کی وضاحت ____ 534
عرب کے ایک سردار کے استفسار پر قرآنی نظام کی
سرفراویوں کے ثبوت کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ایک
عملی شہادت ____ 534
قرآنی تصور کے برعکس ہمارے ہاں جہادِ صغیر اور جہادِ کبیر
کے متعلق پایا جانے والا تصور ____ 535
خداتعالیٰ کی ذات اپنے وعدہ سے کبھی انحراف نہیں کرتی ____ 536
خدا کے ساتھ کیا گیا سودا ہمیشہ فوزِ عظیم کے نتائج کا
حامل ہوتا ہے ____ 536
صراطِ مستقیم کامیابیوں کا وہ راستہ جو سیدھا بھی ہے ہموار
بھی متوازن بھی اور آگے سے ابھرا ہوا بھی ____ 537
خداتعالیٰ کی طرف سے پوری انسانیت کے لیے تو ایک ہی
راستہ صراطِ مستقیم تجویز کیا گیا ہے ____ 538
حضرت عمر فاروقؓ کی طرف سے تقویٰ کا متعین کردہ مفہوم ____ 539

تیئسواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 154 تا 159)
وحی کے ذریعے زندگی کے غیر متبدل اصول روزِ اول سے
ہی متعین ہیں ________ 540
لفظ تفصیل کا حقیقی مفہوم کسی چیز کے مختلف اجزا ہوتے ہیں
جن سے وہ چیز مرتب ہوتی ہے ________ 541
قرآن حکیم میں ان تفصیلات کو ڈھونڈا جا رہا ہے جو اس
میں نہیں ہیں ________ 541
قرآن حکیم نے زندگی کے بنیادی اصول دیئے ہیں
جزئیات کا تعین نہیں کیا' یہ نظام کا فریضہ تھا ________ 542
اہل قرآن کی بنیادی غلطی اور اس کا حل ________ 542
خدا سے ملاقات کا مفہوم خدا کے قوانین کو عملی شکل دے
کر ان کے نتائج کو سامنے لانا ہے ________ 543
اہل شریعت کی اور اہل طریقت کی خدا سے لِقا کی نوعیت ___ 544
عربی زبان کے مادوں کا مفہوم سمجھے بغیر قرآن حکیم
سمجھ نہیں آ سکتا ________ 544
عربی زبان کی خصوصیت ________ 544
لفظ طیب اور خبیث میں فرق ________ 545
علامہ پرویزؒ کی عمر بھر کی جگرسوزی کا ماحصل
''لغت القرآن'' کی اہمیت ________ 546
فرقوں کی موجودگی میں ایک اُمت کا تصور تو کیا ہی نہیں جا سکتا 546
رحمِ مادر میں بچے کی نشوونما نظامِ ربوبیت کا مکمل تصور ہے 546
خدا کی طرف سے راہنمائی کا بنیادی اصول ________ 547
آج انسانیت کی راہنمائی کے لیے قرآن حکیم کو
عالمگیریت کا مقام حاصل ہے ________ 547
قرآن حکیم کی موجودگی کے باوجود ہماری یہ حالت زار کیوں؟ 548
غلط معاشرے میں تباہی کی بنیادی وجہ اجتماعی اور انفرادی
طور پر رنگ نسل' اور زبان کی بنیاد پر وطن کی تقسیم ہے ____ 548
ہم نے 1965ء کی جنگ سے بھی کوئی سبق حاصل نہ کیا ___ 549
قرآن حکیم کے متعلق ہماری کوتاہ نظری کی کیفیت ________ 549
حقائق سے کھلے بندوں انکار کے مقابلے میں تکذیب......
ناقابل معافی جرم ہے ________ 550
تکذیب دین کرنے والوں کی نشاندہی اور کچھ نمازیوں کی عملی
زندگی کا ذکر ________ 550
پاکستان کی تشکیل کے فوری بعد ریلوے سٹیشن کے پلیٹ
فارموں پر قبلے کا رخ متعین کرنے کے نشانات کا عمل ___ 551
وراثتِ کتاب کا عذابِ خداوندی سے بچاؤ کا طریق ___ 551
ظہورِ نتائج کے وقت جب مہلت کا وقفہ ہی ختم ہو جائے تو
پھر تلافی نہیں ہو سکتی ________ 552
کسی شخص کا زبانی کلامی ایمان کچھ کام نہیں دے گا ____ 552
عمل کیے بغیر کسی اچھے فارمولے کو دہرائے چلے جانا صحت
کے اصولوں کے منافی ہے ________ 553
قیامت سے پہلے قبر میں قیامت کے ماجرے کی نوعیت ___ 554
زندگی کی چلتی گاڑی میں جمود کا نام جحیم ہے ________ 554
امام مہدی کے آنے کے انتظار کے تصور کی کہانی اور
ایک مولوی صاحب کا فرمان ________ 554
دین خداوندی کا عطا کردہ نظام حیات انسان کو زندگی
گزارنے کے آداب سے آگہی بخشتا ہے ________ 555
امت واحدہ کے بنیادی خدوخال اور ہماری سوچ ____ 555
قرآن حکیم کے فرمان کے برعکس 72 فرقوں کے متعلق ایک
خودساختہ حدیث کا ذکر ________ 556
رسول کی نسبت سے امت کا وجود قائم ہوتا ہے ________ 556
رسول کی ذات کا کسی فرقے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ____ 556

قرآن حکیم کے الفاظ میں انسانوں کو صرف کلامِ الٰہی کا اتباع کرنے کا حکم ہے 557
مختلف فرقوں کے نزدیک کسی قول کو حجت قرار دینے کی نوعیت 557
اہل فقہ کے نزدیک حجت کا معیار 558
کیا کوئی حدیث قرآن حکیم کی آیت کو منسوخ بھی کر سکتی ہے؟ 558
قرآنی حقائق کو تسلیم کرنے کے سلسلہ میں عقل وشعور کا معیار 559
قومی یا ملکی سطح پر ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ایک اجتماعی نظام کا ہونا لازم ہے 559
ایک ہزار علماء کی طرف سے پرویزؒ کے خلاف کفر کا فتویٰ اور آخر کار کتاب وسنت کے متعلق ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا تحریری اقرار 560
حقیقت کا اقرار کرنے کے باوجود متواتر انکاری کی رٹ 560
1951ء میں 33 علمائے دین کی طرف سے 22 نکات کا پہلا نکتہ کہ قانون کو کتاب وسنت کے مطابق بنایا جائے 561
فقہ حنفی کے نفاذ کی تجویز اور شیعہ حضرات کی طرف سے مکمل انکار 561
ہمارے ان ناگفتہ حالات کو سدھارنے کا کوئی طریق بھی ہے؟ 561
باہمی اختلاف تو تب پیدا ہوتا جب کسی بات میں الجھاؤ ہو 562
منافقت کرنے والوں کا عمل اور پھر اس کا نتیجہ 563
فیملی پلاننگ کے سلسلہ میں شریعت کے نام پر مبہم اور متضاد کیفیت کا اظہار 563
امت واحدہ کے تصور کی خاطر غیر مبہم اور واضح تر انداز میں قرآن حکیم کو بنیاد بنانا ہوگا 563
قرآن حکیم اور ختم نبوت کے بعد کسی آنے والے کا تصور ختم نبوت کی مہر کو توڑنے کے مترادف ہے 564

چوبیسواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 160 تا آخر)

مامور من اللہ کی حقیقت نیز فرقہ واریت کے وجود کی بنیادی وجہ اور اس کا علاج 565
فرقے کی بنیاد ہمیشہ شخصیت پرستی پر استوار ہوتی ہے 565
قرآن حکیم نے نبی اکرم ﷺ کی دو حیثیتوں کو الگ الگ بیان کیا ہے حضرت زید کا واقعہ قابل غور ہے 566
نبی اکرم ﷺ نے کسی انسان کی شخصی آزادی کو سلب نہیں کیا 567
قیامت تک سند اور حجت صرف خدا کی کتاب ہوگی اور کسی دوسرے کا سمجھا ہوا قرآن کسی کے لیے حجت نہیں ہو سکے گا 568
امت میں وحدت پیدا کرنے کے لیے نظام مملکت کا ہونا صرف ضروری ہی نہیں بلکہ لازم ہے 568
نبی اکرم ﷺ کی یہ سنت سب سے بڑی سنت ہے کہ زندگی کے معاملات قرآن حکیم کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے کیے جائیں 569
قرآن حکیم کے خلاف کہی ہوئی بات پر اعتراض کرنے کا حق 569
امام ابوحنیفہؒ کا ایک سنہری قول کہ دین قرآن حکیم اور عقل انسانی کا نام ہے 570
نبی اکرم ﷺ کا ہر قول وحی ہے' امام شافعی کا فرمان نیز یہ کہ وحی کی دو قسمیں ہیں 570
اقوال رسول جمع کرنے کا عمل اور ان کی نوعیت 571
امام بخاری کے بعد امام مسلم کا جمع شدہ مجموعہ اور ان صحاح ستہ کے علاوہ شیعہ حضرات کی الگ جلدیں 571
امام ابوحنیفہؒ کا ایک سنہری قول اور ایک اہم واقعہ 571
امام ابوحنیفہؒ کی حکومت کی طرف سے ذمہ داری کا تعین اور فرقوں کو ختم کرنے کا طریق 572
امام ابوحنیفہؒ کے بعد شخصیتوں کے زمانہ کا ذکر کفر کے فتویٰ'

بغداد کی تباہی کا قصہ اور پھر اجتہاد کا خاتمہ ______ 573
قرآنی آیات کو منسوخ قرار دیا جانے لگا ______ 573
مختلف فقہ کے مختلف آئمہ ترمذی، مالکی، شافعی، حنبلی،
اور حنفی وغیرہ ______ 573
مامور من اللہ کا تصور ختم نبوت کی مہر کو توڑنے کے مترادف ہے 574
شیعہ حضرات کے سلسلہ امامت اور مامور من اللہ کے تصور کے
متعلق علامہ پرویزؒ کی طرف سے ضروری وضاحت اور معلومات 574
صوفیوں کی طرف سے کشف اور الہام کا تصور اور بیعت کے
عمل کا نتیجہ ______ 575
طریقت کے علاوہ شریعت میں بھی مامور من اللہ کا تصور اور
شخصیت پرستی کی نوعیت ______ 575
مامور من اللہ کے متعلق یہ بھی ہے کہ وہ کوئی غلطی نہیں کر سکتے 576
خدا تعالیٰ کی صفت رحیمی کو مبذول کرانے کے لیے گناہ کا
عمل کرنا ضروری ہے، مسلم ______ 576
دین میں شخصیت پرستی ایک خطرناک موذی مرض ہے ____ 576
دین اور تفرقہ تو دو متضاد چیزیں ہیں تفرقہ کی بنیاد اس شخصیت
پرستی پر ہے جو وراثتاً چلی آرہی ہے ______ 577
اپنے نسلی اور خاندانی عقائد کو طلاق دینا بڑی جرأت کا کام ہے 577
نوع انسانی کا تیرہ سو سال کا طویل سفر قدم بقدم قرآن کی
جانب اٹھ رہا ہے ______ 578
دین کو قبول کرنے کے لیے قریش جیسی جرأت کی حامل
قوم کا ہونا ضروری ہے ______ 578
قرآن حکیم نے ہر حسنہ عمل کی مثال ثمر بار کھیتی سے دی ہے _ 579
تمدنی زندگی میں جرم کی سزا کی نوعیت عدل کے مطابق
قرار پاتی ہے ______ 579
U.N.O کے چارٹر میں نسلی تعصبات کی بنا پر باہمی تفریقات
کی حالت کا نتیجہ اور اس کا حل ______ 580
قرآنِ حکیم نے ملتِ ابراہیمی کے لیے قندیل آسمانی میں
حنیفاً کا لفظ استعمال کیا ہے ______ 580
میری نماز اور میری قربانیوں سے مراد اور جامعیت پر مبنی مفہوم
نیز قرآنی فرائض کی ادائیگی کے لیے جزئیات کی وضاحت _ 581
خُدا کے لیے یا فی سبیل اللہ قرآن حکیم کی یہ عظیم اصطلاح بڑی
غور طلب ہے ______ 582
انسانی آرزو کے تصور کے متعلق بدھ کی تعلیم اور ہمارے
ہاں تصوف کا نظریہ اور اس کا نتیجہ؟ ______ 582
دل بے مدعا کا نظریہ کیونکر ثمر بار ہوگا علامہ اقبال کا سوال __ 582
دراصل بات بے مدعا کی نہیں بلکہ صحیح مدعا کو پیش نظر رکھنے کی
ہے، جذبہ محرکہ کی ہے ______ 583
خودغرضی، قوموں کی موت کا سب سے بڑا سبب ہوتا ہے __ 584
قرآنی تعلیم نے انسانی زندگی کی کامیابی کے لیے ایک
جذبہ محرکہ عطا کیا ہے ______ 584
رسول اکرم ﷺ کی زبان سے ایک بامقصد زندگی کا اعلان _ 585
انسانی ذات کا جوہر ہر شخص کو ایک خام مال کی شکل میں ملتا ہے
اور زندگی کا مقصد اس کی نشوونما کرنا ہے ______ 585
ہندو مذہب میں بتیس کروڑ دیوتا کے تصور کی بنا پر تنگ نظری
اور متضاد فکری کی کیفیت عام ہے ______ 586
ہر انسانی ذات انفرادیت کی خصوصیات کی بنا پر اپنے کیے کی
خود ذمہ دار ہوگی اور کوئی کسی کی جگہ جواب دہ نہ ہوگا ____ 586
قرآن حکیم کے لفظ کسبت اور اکتسبت میں ایک معنی خیز فرق 587
انسانی اعمال کے سلسلہ میں ظہورِ نتائج کا ذکر ______ 588
نظام قدرت انسانی اعمال کے نتائج ساتھ کے ساتھ
بینک اکاؤنٹ کی طرح مرتب کرتا چلا جاتا ہے لفظ
سریع العقاب کے یہی معنی ہیں ______ 588
انسان اگر اپنی کوتاہی کا احساس کر لے تو قدرت
پھر اس کو مایوس نہیں ہونے دیتی ______ 589

پہلا باب **سورۃ الانعام** (آیات 1 تا15)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1971ء کی 18 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام سے ہوتا ہے (6:1)۔

مجوسیوں یا پارسیوں کے پیدا کردہ خیر و شر کے گورکھ دھندہ میں الجھے ہوئے مذہبی عقیدے کی بنیاد

سورۃ مائدہ میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہود اور نصاریٰ کے مشرکانہ عقائد کے متعلق گفتگو ہوئی تھی اور انہیں بتایا گیا تھا کہ ان کے یہ عقائد اور نظریاتِ حیات کس طرح اس تعلیم کے خلاف ہیں جو خدا کی طرف سے ان کے انبیائے کرامؑ کو دی گئی تھی۔ گویا دین میں انہوں نے تحریف کی، دین کو مذہب کی سطح پہ لے آئے اور ہر قسم کے باطل عقائد اور نظریات اپنے ہاں رائج کر لیے اور افترا یہ تھا کہ اسے پھر منسوب کرتے گئے وہ خدا کی طرف اور اپنے رسولوں کی طرف۔ اُس زمانے میں تیسرا مذہبی گروہ ایران کے مجوسیوں کا تھا۔ آج تو ان مجوسیوں کی اہمیت ہمارے سامنے نہیں آ رہی۔ ان کے باقی ماندہ افراد پارسیوں کی شکل میں ہندوستان میں موجود تھے۔ اب پاکستان میں بہت کم تعداد میں۔ لیکن انہیں بھی وہ خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔ وہ ایک تجارتی کمیونٹی سے بن کے رہ گئے ہیں۔ لیکن ایک زمانہ تھا کہ

مجوسیت دنیا کے افکار ونظریات پر چھائی ہوئی تھی۔ ویسے بھی یہ ایران کی بہت بڑی کمیونٹی تھی اور ان کی فکر ونظر ایک خاص اہمیت کی حامل تھی۔ عقیدہ ان کا یہ تھا اور یہ وہ چٹان ہے کہ جس پر پہنچ کر اچھے اچھے دانشوروں کی کشتیاں بھی ٹوٹتی ہیں: وہ مسئلہ ہے وخیر وشر کا' نیکی اور بدی کا۔ یہ سوال بڑا اہم ہے جسے سینٹ تھامس اکویناس نے Enigma کی شکل میں پیش کیا ہوا ہے کہ اگر شر کا وجود خدا کی مرضی سے ہے تو خدا خیرِ مطلق نہیں ہوسکتا اور اگر شر کا وجود اس کی مرضی کے خلاف ہے تو وہ قادر مطلق نہیں ہوسکتا۔ آپ دیکھتے ہیں کس قسم کا یہ عجیب و غریب گورکھ دھندہ ہے جس میں ذہنِ انسانی کو الجھا دیا جاتا ہے۔ اسے ایک مذہبی عقیدے کی حیثیت مجوسیوں نے دی تھی۔

یزداں اور اہرمن کی باہمی کشمکش کی طویل داستان کا ذکر

یونان میں یا عیسائیوں کے ہاں بھی یہ مسئلہ محض فلسفے کا ایک نظریہ بن کے رہ گیا تھا لیکن اسے مذہب کی بنیاد مجوسیوں نے قرار دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کا حل یہ سوچا کہ خدا کی طرف تو شر کو منسوب نہیں کیا جاسکتا اور شر کے وجود سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ تو اس کے حل کی شکل یہ ہے کہ خیر تو خدا کی طرف سے ہو اور اس کے مقابلے میں ایک اور خدا بنایا جائے جو شر کا وجود ہو۔ چنانچہ انہوں نے دو مستقل بالذات ہستیوں کو تسلیم کیا: ایک خدا کہ جو منبع خیر ہے اسے وہ یزداں کہتے تھے اور دوسرا اہرمن جسے شیطان کہا جاتا ہے جو سرچشمۂ شر ہے۔ دونوں مستقل بالذات' بڑی قوتوں کے حامل۔ اور اگر اس عقیدے کی رو سے بغور دیکھا جائے تو اہرمن یزداں سے کہیں زیادہ طاقتور کہ تاریخ انسانیت تو بتاتی ہے کہ شر کا عام دور دورہ رہا ہے' عام طور پر یہی غالب رہا ہے۔ اور یہ تو یونہی کبھی کبھی اس قسم کی چمک سی پیدا ہوجاتی ہے جس میں خیر کا وجود بھی آپ کو کسی جگہ غالب نظر آتا ہے ورنہ تاریخ انسانیت تو یہی بتا رہی ہے کہ شر کا ہی غلبہ زیادہ رہا۔ لہٰذا ان کے عقیدے کے مطابق اہرمن کی قہرمانی جو تھی وہ تو عام رہی وسعت کے اعتبار سے بھی زمان کے اعتبار سے بھی۔ اور یزداں بیچارے کی (معاذ اللہ) کبھی کبھی باری آئی اور وہ بھی کبھی چھوٹے سے خطے میں تھوڑے سے وقت کے لیے۔ اور پھر وہی شر کی تاریکیاں چھا گئیں۔ چنانچہ ان کے عقیدے کے مطابق خیر کا جو سرچشمہ تھا جسے یزداں کہا گیا اسے وہ روشنی سے تعبیر کرتے تھے اور شر کے سرچشمہ کو جسے اہرمن کہا جاتا تھا تاریکی سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کے ہاں روشنی اور تاریکی دو مستقل بالذات قوتوں کا نام تھا اور یہ دو الگ الگ ان کے معبود تھے' ان کے خدا تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان مجوسیوں کے ہاں اس نور کی جہت سے مستقل طور پر آگ روشن رکھتے تھے۔

ایران کے پارسیوں کے ہاں رات دن آتش کدوں کو آگ سے روشن رکھنے کی وجہ جواز

ایران کے مجوسیوں کو تو نہیں دیکھا پارسیوں کو تو دیکھا ہے۔ ان کے آتش کدہ میں اور ان کے معبد کا نام ہی آتش کدہ ہوتا ہے۔ ان کے آتش کدہ میں آگ روشن رہتی ہے دن رات سارا سال ہمیشہ کے لیے۔ اور اگر کبھی کسی آتش کدہ میں آگ بجھ جائے تو وہ سب

سے بڑا گناہ ان کے ہاں ہوتا ہے' بہت بڑا جرم ۔اوراس کے لیے انہیں ایران میں جہاں ان کا مرکزی آتش کدہ ہے وہاں سے جا کے چنگاری لانا پڑتی ہےاوراسے دوبارہ روشن کیا جاتا ہے۔یعنی روشنی کے اعتبار سے وہ آگ کی شکل میں پرستش کرتے ہیں۔آگ کی پرستش کرتے تھےحرارت کی جہت سے نہیں' روشنی کی جہت سے۔اوراس کے مقابلے میں تاریکی کو وہ اہرمن کی مملکت قرار دیتے تھےاوراسے شر کا پیکر تصور کرتے تھے۔دو مستقل بالذات قوتیں جو آپس میں ہمیشہ ٹکراتی چلی آرہی ہیں روشنی اور تاریکی۔یہ مسئلۂ خیر وشر تو ایسا نہیں کہ جسے میں اس مقام پہ آپ کے سامنے پیش کروں یا اسے حل کروں۔آگے آئیں گی یہ چیزیں۔حل کیے بغیر تو یہ چھوڑا ہی نہیں جاسکتا۔لیکن درحقیقت یہ فی الذات ایک مسئلہ نہیں بلکہ جسے آپ تقدیر کہتے ہیں یہ اس وسیع نظریے کا گوشہ ہے چھوٹا سا۔اس لیے جب اس پہ گفتگو ہوگی تو اس میں ضمناً پھر خیر وشر بھی آئے گا۔

قرآن حکیم کی تو ابتدا ہی لفظ حمد سے ہوتی ہے کہ جس نے پوری کائنات کو اپنے دامنِ خیر میں لیا ہوا ہے

دنیا کا مشکل تریں مسئلہ جسے قرآن نے سہل تریں انداز میں حل کیا ہے۔عجیب وغریب چیز ہے عزیزانِ من! یہ چیز۔تو قرآن نے تو بالکل سیدھی سی بات کہی کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ (6:1) جسے عام ترجمے میں قابل حمد وستائش کہتے ہیں۔حمدیت ہے خدا کے لیے۔پہلے ہی لفظ الحمد میں وہ کہہ گیا کہ یہ سوال نہیں ہے کہ خدا شر کو پیدا کرتا ہے اس لیے کہ جو شر کا خالق ہو اس کو فروغ دے اس کو پرورش دے وہ باعثِ وجۂ حمدیت کس طرح سے ہوسکتا ہے۔شیطان کی حمد تو کوئی بھی نہیں کرتا تو پہلے ہی لفظ میں یہ چیز بتادی کہ اس کی طرف یہ نسبت نہیں کی جاسکتی۔وہ تو وجۂ حمدیت ہے۔اور دوسری جگہ کہا ہے کہ بِيَدِكَ الْخَيْرُ (3:26) تیرے ہاتھ سے تو ہمیشہ خیر ہی کی نمود ہوتی ہے وہ سرچشمۂ خیر ہے اور اسی لیے وہ باعثِ حمد وستائش ہے اور الحمد ہے' پورے طور پر ساری حمدیت جو ہے وہ اس کے لیے ہے وہ اس لیے کہ وہ خیر کا سرچشمہ ہے۔اس میں آسمانی کرّوں کو اور زمین کو پیدا کیا۔اب غور کیجیے کس قدر آسان اور سہل اور مختصر سے طریق پہ بات سمجھاتا ہے اور ہوتی کتنی Scientific ہے۔کہ یہ فضائے آسمانی میں یہ کرے اس کے پیدا کردہ ہیں زمین بھی اسی کی پیدا کردہ ہے۔

روشنی ہو یا تاریکی یہ تو کرّوں کی باہمی گردش کا نتیجہ ہے لہٰذا دو مستقل بالذات قوتوں کا وجود چہ معنی

یہاں تک تو ان مجوسیوں کو بھی انکار نہیں تھا کہ کائنات کا خالق خدا ہی ہے۔اور آگے یہ کہا کہ جسے تم تاریکی اور روشنی کہتے ہو یہ تو انہی کروں کی گردش کا نتیجہ ہے۔یعنی تخلیقِ ارض وسما کے ساتھ ہی کہا کہ وَ جَعَلَ (6:1)' پہلے ہے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (6:1)' خَلَقَ (6:1) اور جَعَلَ (6:1) میں دیکھئے کتنا لطیف فرق ہے یہاں۔اس نے تاریکی اور روشنی کو پیدا کرنے والی

بات نہیں کی ہے۔ پیدا تو کیا ہے اس نے اس کائنات کو جو فضا میں کروں کی شکل میں پھیلی ہوئی ہے انہیں میں سے ایک کرہ ہے جسے ارض کہا جاتا ہے۔ اور یہ ان کروں کی باہمی گردش کا نتیجہ ہے جس سے روشنی اور تاریکی وجود میں آ جاتی ہے۔ **جَعَلَ** (6:1) بنایا ہے اس کو' ان کروں کی تخلیق کا نتیجہ ہے یہ جسے تم روشنی اور تاریکی کہتے ہو۔ تو روشنی اور تاریکی کا تو خود کوئی وجود ہی نہ رہا۔ یہ تو ان کی گردشیں ہیں زمین کی اور سورج کی باہمی گردش ان کے رخ ان کے تناسب' جس کی وجہ سے کبھی تاریکی آ جاتی ہے اس پہ' سایہ ہوتا ہے وہ' اور کبھی روشنی آ جاتی ہے۔ **جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ** (6:1) کہا: یہ ہے حقیقت اس کی جسے تم نے مستقل بالذات دو قوتیں تسلیم کر رکھا ہے ان کی تو حقیقت اتنی ہے کہ ان کروں کی باہمی گردش سے کبھی روشنی آ جاتی ہے تمہارے ہاں کبھی تاریکی پیدا ہوتی ہے۔ جب تمہارے ہاں روشنی ہوتی ہے تمہاری ہی زمین کے دوسرے حصے کے اندر تاریکی ہوتی ہے۔ اور ان کروں میں ایسے ہیں جہاں کوئی تاریکی ہوتی ہی نہیں' کئی تو ایسے ہیں جہاں روشنی کی ایک کرن تک نہیں پڑتی۔ یہ تو ارض و سما کی تخلیق کا ایک فطری نتیجہ ہے جو **جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ** (6:1) کی شکل میں تمہارے سامنے آ رہا ہے بس اس کی حیثیت اتنی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کس قدر سائنٹفک دلیل سے بات کو صاف کر کے رکھ دیتا ہے۔ کہتا ہے کیفیت تو ان کی صرف اتنی ہے۔ لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ **ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ** (6:1) یہ ایسی چیز جو یوں سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس کا وجود یہ ہے لیکن ان لوگوں کو دیکھئے جو اسی Basis کے اوپر اسی بنیاد کے اوپر خدا کا ہمسر ایک دوسرا خدا بنا لیتے ہیں۔ تو کہا دیکھو تو سہی! یہ کس قدر کم سمجھی کی دلیل ہے کہ ایسی چیز جو یونہی Scientifically سمجھ میں آ سکتی ہے کہ یہ تاریکی کیوں ہے یہ روشنی کیا ہے اس کی بنیادوں کے اوپر خدا کا ہمسر تراش لینا کتنی بڑی حماقت ہے۔ ایک فقرے میں ایک ٹکڑے میں ایک دلیل میں کاٹ کے رکھ دیا ان کی اس ثنویت کو۔ اسے ثنویت (Dualism) کہتے ہیں دو خدا ماننے: اہرمن اور یزداں' تاریکی اور روشنی کا خدا۔ اور کہا یہ تو ذرا آسانی سے سمجھ میں آ جانے والی بات ہے تاریکی اور روشنی۔ ذرا ایک کرہ یہاں بنا لیجیے۔ یہ بچے کو سمجھانے کے لیے آپ دیکھا کرتے ہیں کہ ایک کرہ بنایا ہوا ہوتا ہے پلاسٹر کا' اس کے سامنے موم بتی جلا دیتے ہیں اور کرہ گردش کرتا ہے اور نظر آ جاتا ہے کہ تاریکی کیا ہے اور روشنی کیا ہے۔ کہنے لگے یہ تو ایسی چیز ہے۔ لیکن تم نے کبھی اس سے آگے چل کے بھی غور کیا ہے۔

انسانی تخلیق پر غور و فکر کرنے کی ضرورت اور اس کی تاکید

اپنے آپ پہ غور کیجیے **هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ** (6:2) ذرا انسانی تخلیق کے اوپر تو غور کرو۔ انسانی تخلیق کی ابتداء Inorganic Matter سے ہوئی اس مادے سے ہوئی جس کے اندر زندگی کی کوئی نمود نہیں تھی۔ اسے قرآن نے طین کہہ کر پکارا ہے' تراب بھی کہا جاتا ہے' مٹی جسے عام طور پہ کہتے ہیں' بے جان مادہ۔ وہاں سے تمہاری تخلیق کی ابتداء ہوئی۔

شیعہ حضرات کے ہاں ''الکافی'' میں حدیث طین کا ذکر

ضمناً بعض اوقات لفظ آ جاتے ہیں سامنے' ہم روز استعمال کرتے ہیں ان چیزوں کو کہ یہ بڑا بدطینت واقع ہوا ہے بڑا نیک طینت واقع ہوا ہے۔ یہ لفظ اسی طین سے ہے۔ یہ بری مٹی کا ہے یہ اچھی مٹی کا ہے۔ اور یہ جو تفریق ہے یہ اصل میں شیعہ حضرات کی جو کتاب ہے حدیثوں کا مجموعہ الکافی' اس میں حدیثِ طین آتی ہے یہ انسانوں کی تخلیق کے سلسلے میں کہ اللہ تعالیٰ نے اچھی مٹی لی اس پہ اچھا پانی ڈالا تو اس سے نیک لوگ پیدا ہوئے اور خراب مٹی ہوئی اس پہ کڑوا سا پانی ڈالا تو اس سے برے لوگ پیدا ہوئے۔ تو وہ نیک اور برا جو ہے اس کی نسبت طین سے کی' اسے کہتے ہی حدیثِ طین ہیں۔ اس طرح سے ہی انسانوں کے اندر تفریق پیدا ہوئی اور تفریق کی بنیاد وہ طین رکھی گئی' مٹی رکھی گئی۔ اسی جہت سے یہ بات آگے چلی۔ تو پھر ہمارے ہاں یہ لفظ بنے نیک طینت اور بدطینت۔ پھر نیک فطرت اور بدفطرت بھی ہمارے ہاں کہنے لگ گئے۔ ضمناً میں نے کہا کہ الفاظ کس طرح سے عام ہو جاتے ہیں جن کے متعلق کبھی کھڑے ہو کے ہم سوچتے نہیں کہ یہ لفظ آیا کہاں سے' بنا کیسے' مفہوم اس کا کیسا ہے۔ تو طین کی جہت سے یہ کہا جاتا ہے۔

قرآن حکیم کی روشنی میں انسانی تخلیق کو سمجھنے کا طریق بڑا واضح ہے

قرآن حکیم نے یہ کہا ہے کہ انسان کی تخلیق کا آغاز ایسے مادے سے جس میں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے' Inorganic تھا' وہاں سے ہم نے اس کی ابتداء کی۔ قرآنِ کریم کے دیگر مقامات میں جو تخلیقِ انسانی کے متعلق آیات آئی ہیں ان کو اکٹھا کر لیا جائے' سامنے رکھ لیا جائے تو اس میں آپ دیکھیں گے کہ جسے Evolution کی تھیوری کہتے ہیں' ارتقاء کا نظریہ کہتے ہیں کہ اس جامد مادہ سے جس میں زندگی کی نمود نہیں تھی کس طرح سے زندگی' حیات ارتقائی منازل طے کرتی مختلف وادیوں میں سے گذرتی مختلف شکلیں اختیار کرتی مختلف پیکر بدلتی بالآخر انسان کی فارم میں اور اس کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس سے پیشتر جب میں نے آدم اور انسان کا ذکر شروع میں کیا ہے تو اس مقام پہ میں نے قرآن کے نظریۂ ارتقاء کے متعلق تفصیل سے بات کی تھی۔ یہاں یہ کہہ کے ہم گذر جاتے ہیں کہ خود انسان کو دیکھئے کہ اس کی تخلیق غیر ذی حیات مادہ سے ہوئی۔ ثُمَّ قَضٰٓی اَجَلًا (6:2) اور پھر اس کے لیے اس زمین پر رہنے کے لیے ایک مدت ہے' اس مدت تک کے لیے اس زمین میں رہتا ہے۔

سوال خواہ انسانی کی زندگی کا ہو یا قوموں کے عروج و زوال کا اس کے لیے تو قدرت نے قوانین مقرر کر رکھے ہیں

یہ مدت انسانی زندگی یا انفرادی زندگی کے لیے ہی نہیں ہے قوموں کی زندگی کے لیے بھی یہی قوانین مقرر ہیں جس کے مطابق

(اور یہ چیز بڑی غور طلب ہے جو میں کہنے لگا ہوں) یہ نہیں ہے کہ پہلے سے مدت مقرر ہو کے یہاں آ جاتی ہے۔ فردکی زندگی میں جسے عمر کہتے ہیں، قوموں کی زندگی میں جسے قوموں کے عروج اور فروغ کا زمانہ کہتے ہیں، پھر زوال آتا ہے، پھر ان کی تباہی ہوتی ہے۔ تو یہ جو مدتیں ہیں ایسا نہیں کہ یہ پہلے سے مقرر ہوتی ہیں ہر ایک کی عمر یہاں بدلی نہیں جاتی۔ بلکہ اسکے لیے خدا کی طرف سے قانون مقرر ہے ان قوانین کے مطابق فرد یا اقوام جتنی معیاد اپنے لیے چاہیں خود مقرر کر سکتے ہیں۔ آگے چل کے آئیں گے یہ مقام جہاں قرآن کی یہ آیات آئیں گی جسے ہم کہتے ہیں کہ صاحب! عمر انسان کی گھٹ بڑھ سکتی ہے یا نہیں۔ اس کے لیے تو قوانین مقرر ہیں ان قوانین کی رو سے انسان خود متعین کرتا ہے یہ پہلے سے متعین شدہ چیز نہیں ہوتی یاد رکھئے!۔ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنۡدَهٗ (6:2) یہ ہے وہ بات۔ یہ قانون جو ہیں جن کی رو سے مقرر ہوتی ہے معیاد کسی کی، یہ خدا کے ہاں ہیں، اس نے اس کے لیے قوانین بنا دیے ہیں۔

ہمارے ہاں ''جل جلالہ'' کے الفاظ کے استعمال کی نوعیت یعنی جہاں کسی قاعدہ قانون کا خیال نہ رکھا گیا ہو

سب سے بڑا تمہارے ہاں شر کا مسئلہ تو یہی تھا کہ! اچھا بھلا چلتا ہوا انسان گرا اور مر گیا۔ قوموں کے عروج وزوال کے متعلق یہ سوال آتا ہے کہ کتنی شان وشوکت اور سطوت اور دولت کی مالک تھی فلاں قوم اور اس کے بعد آج دیکھئے اسکا کیا حشر ہوتا ہے۔ اور اسکے بعد پھر بغیر سوچے وَ تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ (3:26) کہہ دیتے ہیں بغیر سوچے سمجھے یہ تو اس کی مرضی کے اوپر ہے جسے چاہے ذلیل کر دے جسے چاہے عزت دے دے۔ یعنی نہ کوئی قاعدہ مقرر، نہ کوئی قانون، نہ کوئی ضابطہ جسے چاہے اس نے گرا دیا جسے چاہے اس نے اوپر اٹھا دیا۔ تیری شان جل جلالہ اسکے بعد ہوتا ہے۔ وہ نظم آپ نے سنی ہوگی: تیری شان جل جللہ۔ یہ جل جلالہ بے ساختہ نکلتا ہے زبان سے، جہاں کوئی چیز ایسی آئے حیرت انگیز سی کہ جہاں یہ نظر آئے کہ اس کے لیے قاعدہ قانون مقرر کوئی نہیں ہے یونہی ہوگئی ہے کسی طرح سے اوہ! جلہ جلالہ۔ کس طرح تصورات بدلتے ہیں اور کس طرح سے یہ الفاظ دوسرے معنی کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنۡدَهٗ (6:2) یہ قوانین جن کے تابع یہ معیادیں مقرر ہوتی ہیں انسان خود کرتے ہیں اقوام خود کرتی ہیں اصل شے قانون ہے، یہ چیز جو ہم نے بنائی ہے یہ ہمارے پاس ہے وہاں سے یہ قانون بن کے آتا ہے۔ یہ قانون تمہارا بنایا ہوا نہیں۔ قانون کے مطابق چلنے کا اختیار تمہیں دیا گیا ہے اس کے مطابق چلو، اس کے خلاف چلو مدتیں متعین خود ہو جائیں گی۔ تم خود کرو گے یہ سارا کچھ۔ دیکھئے خیر وشر کا مسئلہ ضمناً کیسے حل ہوتا چلا جاتا ہے۔ ثُمَّ اَنۡتُمۡ تَمۡتَرُوۡنَ (6:2) اور ان کی کیفیت یہ کہ ہم نے تو یوں کیا ہوا ہے یہ تمہاری اپنی غلط نگہی ہے جو اس قسم کے غلط خیالات وتصورات ونظریات کو کہیں سے لے لیتے ہو اور پھر اس صاف سیدھے سے مسئلے میں بھی جھگڑے نکالنے شروع کر دیتے ہو۔ وَ هُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ فِی الۡاَرۡضِ (6:3) دیکھئے ثنویت کو اس نے کیسے ختم کیا ہے۔

یورپ کی مادہ پرستی کی بنیاد پر ثنویت کی تباہ کاریوں کا نتیجہ

ثنویت کا ایک اور پہلو ہے وہ مجوسیوں کا نہیں وہ یورپ کی مادہ پرستی ہے۔ یورپ کے سائنٹسٹ سے اگر یہ پوچھئے کہ باہر کی خارجی کائنات Physical Universe ہے' تو وہ آپ کو بتائے گا کہ اس میں ایسے بندھے ہوئے محکم قوانین رائج ہیں جن کے متعلق ہم حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ یہ کس طرح سے کارفرما ہے۔ ایک ذرے سے لے کر یہ عظیم الشان محیر العقول کارگہ' کائنات قوانین کی زنجیروں میں بندھی ہوئی چلی جارہی ہے کسی کو ذرا مجالِ سرتابی نہیں۔ وہاں کا بڑے سے بڑا سائنٹسٹ وہ یہی ثابت کرتا رہتا ہے ساری عمر: اتنا بڑا قانون ہے۔ وہ اس کا نام خدا رکھے یا نہ رکھے لیکن بہر حال اس قوت کو وہ تسلیم کرتا ہے کہ کوئی قوت ہے جو اس قدر محیر العقول سلسلۂ کائنات کو قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔ لیکن وہی سائنٹسٹ اور ان کے وہی دانشور جب انسانوں کی دنیا میں آتے ہیں تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یہاں یہ بات نہیں کہ خدا کا بنایا ہوا قانون ہم پہ بھی نافذ ہو' یہاں قوانین ہم اپنے لیے آپ بنائیں گے۔ یعنی پوری خارجی کائنات میں تو وہ بنے ہوئے قوانین جو ان کے بنائے ہوئے نہیں ہیں کائنات میں کسی شے کا خود بنایا ہوا قانون اس کے اوپر رائج نہیں ہوتا۔ یہ قانون پانی نے نہیں بنایا تھا کہ نشیب کی طرف بہے گا۔ یہ آگ نے نہیں بنایا تھا کہ وہ حرارت بخشے گی۔ یہ بنے ہوئے قانون ہیں جو ان کے اوپر نافذ ہیں۔ لیکن انسان کہتا ہے کہ یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن انسانوں کی دنیا میں یہ بات نہیں ہے۔ یعنی یہاں یہ Exception ہے کہ یہ اپنے لیے خود قانون بنائیں گے۔

کائنات کے اندر خدا کا قانون لیکن انسانوں کی دنیا میں انسان کا اپنا قانون

یہ دوسری ثنویت آ گئی Dualism آ گئی دوسری قسم کی کہ خارجی کائنات میں تو خدا کے بنائے ہوئے قوانین چلیں گے لیکن انسانوں کی دنیا میں ہم خود اپنے قوانین بنائیں گے۔ قرآن نے اس کو بڑے لطیف انداز میں بیان کیا ہے کہ یہ **اله السمآء** کو تو مانتے ہیں کہ خارجی کائنات کے اندر تو الٰہ وہ ہے' الٰہ الارض نہیں مانتے وہ۔ اپنی دنیا میں اسے الٰہ نہیں مانتے۔ الٰہ کے معنی ہیں وہ برتر قوت کہ جس کے تابع باقی چلیں' قانون دینے والی۔ الٰہ السمآء کو مانتے ہیں الٰہ الارض کو نہیں مانتے۔ قرآن کے کئی مقامات میں یہ چیز آئی ہے۔ اور اس نے کہا یہ ہے کہ ان سے پوچھو کہ اتنے عظیم وسیع وعریض سلسلۂ کائنات میں تمہاری حیثیت کیا ہے جو یہاں اتنے سے ٹکڑے میں Exception ہو جائے۔ اس کی الوہیت باقی کائنات کے اندر تو اس طرح سے چلے کہ کسی کو ذرا مجالِ سرتابی نہ ہو اور تمہاری اتنی سی یہ کائنات جو اس وسیع وعریض سلسلے میں ایک ذرے کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی اسے کیا خصوصیت حاصل ہے کہ اس کا دائرۂ قانون یہاں نافذ نہ ہو یہاں آ کے وہ عاجز ہو جائے اور یہاں کارفرمائی تمہاری ہو۔

دوالٰہ کے پیدا کردہ تصورات کی تباہ کاریوں کا نتیجہ

قرآن نے کہا ہے یہ دوالٰہ ماننے کی بات ہے۔ایک قسم کے دوالٰہ مجوسی مانتے تھےاور دوسری قسم کے دوالٰہ تم مان رہے ہواور یہ اس سے بھی زیادہ خطرناک بات ہےاس لیے کہ اس کا اثر تو ذہنی اور اعتقادی اور نظری تھا۔اسکا اثر تو عملی پڑ رہا ہےتمہاری دنیا پہ اور تم دیکھتے ہو کیسے تباہ ہو رہے ہو اس عقیدے کے تابع کہ انسانوں کی زندگی کے اندر تمدنی زندگی ان کی' معاشی زندگی ان کی' سیاسی زندگی ان کی' ارضی زندگی جسے قرآن نے کہا ہےاس کے لیے قوانین خدا کے نہیں تمہارے خود ساختہ ہیں۔اور عزیزانِ من! یہ جس قدر جہنم بنا ہوا ہے سارے کا سارا یہ کرۂ ارض ہمارا' وہ اس لیے ہے کہ انہوں نے الٰہ الارض اسے نہیں مانا ہوا۔خود قوانین بناتے ہیں اور اس کے بعد جو ان کا حشر ہوتا ہے ہمارے سامنے ہے۔

پاکستان کے تصور کی بنیاد ہی یہ تھی کہ یہاں ارض وسما کے ایک ''الٰہ'' کی حکومت ہوگی

ضمناً میں عرض کردوں کہ یہ جو ہمارا مطالبہ تھا اپنے کے لیے الگ مملکت لینے کا' اس کی بنیاد یہ تھی کہ ہم الٰہ السمآء اور الٰہ الارض ایک ہی ہستی کو مانتے تھے۔اسے کہتے ہیں پاکستان کی آئیڈیالوجی یا نظریۂ پاکستان۔ساری دنیا والے اسے الٰہ السماء تو مانتے ہیں الٰہ الارض نہیں کوئی مانتا۔ Democracy کہتے ہی اسے ہیں عزیزانِ من! کہ ارض میں ہم اپنے قوانین چلائیں گے۔وہ ذرا سا مہذب کہلانے کے لیے کہا کہ پرانے زمانے میں بادشاہ ہوتا تھے وہ اپنی مرضی چلاتے تھے پھر ہمارے دور میں سیاسی رقابتوں کی بناء پہ کہا کہ! یہ ڈکٹیٹر ہیں جو اپنی مرضی چلاتے ہیں۔فرق کیا پڑتا ہے؟۔ہم جمہوریت پسند ہیں جی!! آپ کیا کرتے ہیں؟ ہم اپنی مرضی چلاتے ہیں۔یعنی ایک فرد نے اپنی مرضی چلا لی تو کیا' یہ افراد کے ایک گروہ نے اکٹھے ہو کے جو اکثریت حاصل کر لی اس اکثریت نے اس اقلیت کے اوپر اپنے قوانین نافذ کر دیے یہ ڈکٹیٹرشپ اور ملوکیت نہیں تو اور کیا ہے۔خوب کہتا تھا وہ شخص۔

؎ ذہنِ استبداد جمہوری تماشہ

تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری۔وہی ذہنِ استبداد۔بس یہاں ایک گروپ جو Majority حاصل کر لیتا ہےاس کے اوپر بھی کچھ لیڈرز ہوتے ہیں وہی افراد ہوتے ہیں۔وہ کسی نہ کسی طرح سے اس کو Maneuver کر لیتے ہیں کہ ان کے ساتھ ذرا زیادہ آراء آ جائیں' زیادہ ووٹس حاصل ہو جائیں۔اب اسے یہ قوت یہ اختیار یہ اقتدار دیدینا کہ تم جس قسم کے قانون بناؤ وہ ماننے پڑیں گے باقی ساری انسانیت کو' یہ اسے الٰہ بنا دینا نہیں تو اور کیا ہے۔

تحریک طلوع اسلام کی پوری تاریخ اسی ثنویت کو ختم کرنے کی شاہد تھی اور ہے

عزیزانِ من! یہ تھا مسئلہ انڈیا میں ہمارے سامنے۔ آج ہماری بدقسمتی سے ہماری میں اپنے آپ کو اس لیے شامل کرتا ہوں کہ ہماری اگلی جنریشن کو تو معلوم ہی نہیں کہ وہاں کیا ہو رہا تھا اور مسئلہ کیا تھا۔ ہم تو ان میں تھے عزیزانِ من! اور جسے ہم کے بعداب میں کہونگا میں نے تو دس سال تک اسی Issue کے اوپر Fight کیا ہے یہ چیز میں نے طلوعِ اسلام میں دی کہ یہ درحقیقت یورپ کی ثنویت انڈیا کے اندر رائج کرنا چاہتے ہیں۔ اور مسلمان اس ثنویت کو نہیں مانتا یہ توحید پرست ہے اس کے لیے جو الہ السمآء ہے وہی الہ الارض ہوگا۔ اور وہ انڈیا کے اندر ممکن نہیں ہے لہٰذا ہم الگ ایک خطۂ زمین لینا چاہتے ہیں جہاں الہ السمآء اور الہ الارض ایک خدا کی ذات ہو۔ یہ تھی بنیاد مطالبۂ پاکستان کی' یہ ہے نظریۂ پاکستان عزیزانِ من!۔ اس کے لیے ہم نے اس خطۂ ارض کو حاصل کیا تھا ہم اس ثنویت کو اس شرک کو مٹانا چاہتے تھے' ہم توحید کو رائج کرنا چاہتے تھے کہ الہ السمآء کی کارفرمائی الارض میں بھی ہو۔ وہی چیز جو ہر نبی کہتا چلا آ رہا تھا اور جس کی ایک بچی کھچی سی شکل خود حضرتِ عیسٰیؑ کی اس تعلیم میں بھی ہے کہ جیسی تیری مرضی آسمانوں پہ چل رہی ہے ویسی تیری مرضی اس زمین پہ بھی چلے گی۔

اگر الہ السمآء کی طرح الارض پر خدا کی حکمرانی نہیں تو یہ مغربی جمہوریت سب سے بڑا شرک ہے

دیکھتے ہیں کتنے خوبصورت الفاظ ہیں۔ یہ تھا جس کو قرآن نے الہ السمآء اور الہ الارض کہا ہے۔ یہ شرک تھا جس کو مٹانے کے لیے الگ خطۂ زمین کی ضرورت تھی وہاں ممکن ہی نہیں تھا کہ ہم اس توحید کے مطابق زندگی بسر کر سکتے۔ دنیا میں کسی جگہ ممکن نہیں تھا۔ جسے آج بہترین اندازِ حکومت جمہوریت قرار دیا جاتا ہے عزیزانِ من! بدترین شرک کی شکل ہے وہ دنیا میں۔ آسمانوں کی دنیا میں خدا کی بادشاہت' انسانوں کی دنیا کے اندر انسانوں کے گروہ کی بادشاہت۔ ایک کی ہو یا گروہ کی ہو شرک تو وہی ہے۔ مجوسیوں نے مقابل میں ایک خدا بنایا تھا۔ ہندوؤں نے تو بتیس کروڑ دیوتا بنائے تھے' یہ جمہوریت تھی ڈکٹیٹرشپ کے مقابلے میں۔ یہ کونسی توحید تھی؟

نوعِ انسانی کی حد تک تنہا عقل صدیوں سے زندگی کے حقائق کو سمجھنے سے قاصر ہے

وَ هُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ فِی الْاَرْضِ (6:3) آپ دیکھتے ہیں خیر و شر کا مسئلہ سامنے آیا تھا Dualism اور ثنویت کا تصور سامنے آیا تھا' کس طرح سے صاف کرتا چلا جاتا ہے۔ مجوسیوں کی ثنویت ہی نہیں اس ثنویت کو بھی سامنے لایا ہے۔ پھر اس نے کہا کہ اپنی دنیا میں انسانوں کے قوانین بنالو' اچھے سے اچھے قانون رائج کردو' تو کیا کرو گے؟ یہ جو ظاہر شکلیں ہیں انسانوں کے اعمال کی' افعال کی' انہی کے اوپر رائج ہوگا تمہارے ہاں کا قانون۔ چوری کی نیت کرنے والا تمہارے قانون کی رو سے مجرم قرار ہی نہیں پاتا' جب

کہ چوری کرنے والا مجرم قرار پاتا ہے۔ سال بھر ایک شخص آ کے بیٹھا رہے اس نیت سے کہ یہاں سے کچھ چراؤنگا اور موقع اس کو نہ ملے' چلا جائے کوئی جرم نہیں ہے۔

انسانوں کے بنائے ہوئے قانون اور مکافات عمل کی نتیجہ خیزی میں ایک بنیادی فرق ہے

کہا یہ دوسری چیز ہے تمہارے الہ الارض ہونے کی۔ حالانکہ اصل بنیاد سرچشمہ جرائم کا انسان کی نیت' ارادہ اور قلب ہے جسے آپ کہتے ہیں' یہ تو خیالات ہیں اس کے۔ پختہ کرتے چلے جایئے اس کے اندر' جب موقعہ ملے گا اس کا ارتکاب کرے گا۔ اور اگر ان خیالات کے اوپر کنٹرول ہو تو پھر تو جرائم وجود میں آ ہی نہیں سکتے۔ کہا تمہارے ہاں ایک تو یہ نقص کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین دوسرے انسانوں کے اوپر نافذ۔ کس نے حق دیا ہے ایک انسان کو کہ اپنی مرضی دوسرے انسان پہ بطور حکم چلائے۔ یہ بہت بڑا شرک ہے سب سے بدترین قسم ہے۔ اور پھر تمہارا نظام جب اس طرح سے بنے گا تو وہ صرف ظاہر کے اعمال کے اوپر نافذ ہوگا۔ دیکھئے کہاں بات لاتا ہے۔ وَ هُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ فِی الْاَرْضِ (6:3) پہلے وہ ثنویت' شرک اسے مٹایا۔ اور کہا پھر خدا کی اگر بادشاہت زمین میں بھی تم قائم کرو نتیجہ ہوگا یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ وَ یَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ (6:3) وہ ہے جو جانتا ہے کہ دلوں میں تمہارے کیا گذر رہی ہے' باہر وہ بات کیسے آ رہی ہے' تم کرتے کیا ہو۔ کہتا ہے یہ ہے اس کی خدائی' اس کی الوہیت کو اگر تم اپنے ارض میں نافذ کرو تو پہلی چیز یہ کہ تکریمِ انسانیت حاصل ہو جائے گی' کسی انسان کو حق حاصل نہیں رہے گا کہ دوسرے انسان سے اپنا قانون منوائے اور جرائم اس طرح سے ختم ہو جائیں کہ اس کی نگاہ قلوب پر بھی ہے' دلوں پر ہے' ارادے اور نیت کے سرچشمے کے اوپر ہے۔ وہ ایسا نظام دیتا ہے کہ جو اس سرچشمے کی اصلاح کر دیتا ہے اور جب اس کی اصلاح ہو جائے' باہر کی اصلاح خود بخود ہو جاتی ہے۔

نوعِ دیگر بن جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسماں دیگر شود

قرآنی معاشرے میں کسی انسان پر دوسرا سپاہی کھڑا کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی

آج جو یہ جرائم اتنے عام ہو رہے ہیں' ان کے روکنے کا ذریعہ کیا ہے؟ پولیس بڑھاتے چلے جایئے۔ کتنی بڑھاتے چلے جائیں گے۔ اتنی تو آپ کی آبادی نہیں جتنی امریکہ میں پولیس انہوں نے بڑھا دی ہوئی ہے۔ چلے جا رہے ہیں۔ ایک ایک آدمی کے سر پہ ایک ایک سپاہی کھڑا کر دو اور سپاہی کے سر پہ کسے کھڑا کرو گے جی۔ آپ کے ہاں یہی ہوتا ہے نا' نیچے والے کرپٹ ہو جاتے ہیں Anti Corruption اور انٹی کرپشن والے جب کرپٹ ہوتے ہیں اس کے بعد پھر ایک اور اوپر۔ ہو کیا رہا ہے یہ۔ جرائم رک نہیں سکتے۔

جرائم کا سرچشمہ انسان کا قلب جسے کہا جاتا ہے نیت ذہنیت نفس کی' اس کی سائیکولوجی بدلنے کی ضرورت ہے۔

ضرورت صرف انسان کے سرکش جذبات کو مسلمان کرنے کی ہے

عزیزانِ من! اس کے ارادے کے سرچشموں کے بدلنے کی ضرورت ہے۔ کہتا ہے ہم ایسا دیں گے ضابطہ تمہیں کہ جس میں شر کے چشمے بدل جائیں گے۔

قدرت کی طرف سے ملنے والے قوانین کی نتیجہ خیزی کے لیے کائنات کا ذرہ ذرہ اپنی شہادت آپ ہے

یہ کوئی اہرمن نہیں ہے کوئی ابلیس باہر نہیں ہے کوئی شیطان باہر نہیں ہے جو یہ کچھ کرتا ہے۔ وہ تمہارے قلب کے اندر ہے' تمہارے خون کے ذروں کے اندر اس نے حلول کیا ہوا ہے۔ ہم تمہارے خون کی صفائی کر دیں گے۔ پھوڑے پھنسیاں نکلیں گے نہیں' سیدھی سی بات ہے۔ وہ کہتا ہے یہ ہے الہ الارض ہونا! دیکھ رہے ہیں ذرا سی بات شروع کہاں سے کرتا ہے اور کس طرح سے ان مسائلِ حیات کو حل کرتا چلا جاتا ہے۔ کہتا ہے اب اس کے لیے جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کے لیے دلیل چاہیئے' کوئی شہادت چاہیے۔ کہتا ہے دلائل اور شہادات تو بکھری پڑی ہیں۔ جہاں کہیں بھی تم کھڑے ہو جاؤ گے' کائنات میں تم دیکھو گے ہمارا قانون کس حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ اس حسن و خوبی سے کہ ایک ذرا سا دانہ مٹی کے اندر ملا دیا جاتا ہے جو بظاہر نظر آتا ہے کہ ضائع ہو گیا۔ اس دانے کے اندر پورے کا پورا تناور درخت' اس کے پتے' شاخیں' ڈالیاں' تنے' اس کے برگ و بار' اس کے اندر وقت کے اوپر پھول آنا' پھولوں کے بعد اس کے اندر پھل آنا' پھل کا ذائقہ ہو' یہ شکل ہو' یہ رنگ ہو۔ سارا کا سارا اس ننھے سے رائی کے دانے کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے۔ شہادتیں چاہتے ہو! بکھری پڑی ہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ وَ مَا تَاْتِیۡهِمۡ مِّنۡ اٰیَةٍ مِّنۡ اٰیٰتِ رَبِّهِمۡ اِلَّا کَانُوۡا عَنۡهَا مُعۡرِضِیۡنَ (6:4) تم آنکھوں کے اوپر ٹھیکریاں باندھ کے گذر جاتے ہو ان شہادتوں سے اور پھر آ کے کہتے ہو کہ صاحب! ہمیں شہادت دو اس کی' ثبوت دو اس کا جو تم کہتے ہو۔ او ثبوت تو راستے میں بکھرے پڑے تھے لیکن تم دیکھنا ہی نہ چاہو ان کو تو ہم کیا کریں۔ آگے بات آتی ہے۔

کائنات کا ایک ایک ذرہ اپنے اندر معجزاتی دنیا لیے ہوئے ہے جو حق پہ مبنی ہے

تم یہ ثبوت معجزوں اور کرامات کی شکل میں مانتے ہو۔ یہ بکھرے ہوئے معجزے جو ایک ایک پتی اور ایک ایک شاخ میں ہماری اپنی زبان سے بول رہے ہیں کہ کتنا بڑا معجزہ ہے یہ' اس پہ تو آنکھیں بند کر آتے ہیں اور یہاں آ کے تمہیں یہ کہتے ہیں کہ معجزہ دکھایئے۔ فَقَدۡ کَذَّبُوۡا بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمۡ (6:5) کہتا ہے یہ وجہ ہے کہ Reality اور حقیقت ثابتہ ان کے سامنے آ گئی اس قرآن کی شکل میں۔ اس کی تکذیب کر رہے ہیں اسے جھٹلا رہے ہیں کہ یہ جھوٹا ہے۔ کائنات کے ذرے ذرے کے اوپر اگر یہ غور کریں تو وہاں نظر آئے

کہ یہ حق ہے۔اور وہی حق انسانوں کی زندگی کے اندر آئے تو کہیں جھوٹا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ اس سے ان کے اپنے مفاد پہ زد پڑتی ہے ان چیزوں سے۔فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَ هُمْ (6:5) لیکن کہاں ان کی اس تکذیب سے ہوتا کیا ہے' کیا سچا قانون اپنے نتائج بدل دیتا ہے اس لیے کہ کسی دوسروں نے کہہ دیا ہے کہ نہیں صاحب! یہ غلط ہے۔یعنی کیا یہ بات ہے کہ جو شخص کہے کہ سنکھیا مہلک ہے وہ سنکھیا کھائے تو ہلاک ہو جائے اور اگر ایک شخص کہے کہ نہیں' سنکھیا مہلک نہیں ہے اور وہ کھائے اور سنکھیا مہلک نہ ہو۔یعنی سنکھیا تو اس کا محتاج ہی نہیں ہے کہ جو اسے سچ مانے' اس پہ تو اپنا اثر کرے' جو اسے جھوٹ مانے اس کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو جائے کہ نہیں' آپ سچے ہیں۔سوال ہی نہیں ہے۔تم اسے مانو' تم اسے نہ مانو' وہ تو اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہے گا۔

دین خداوندی کے تحت مکافات عمل کے نتائج کسی کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے پر منحصر نہیں

یہ دین جسے قانونِ مکافات کہتے ہیں یہ اس کا محتاج نہیں ہے کہ تم مانو گے تو یہ اپنا نتیجہ نکالے گا۔تم نہ مانو' کہتے چلے جاؤ' سنکھیا مہلک نہیں ہوتا' ٹھیک ہے کہتے چلے جاؤ۔کب پتہ چلے گا؟ کہتا ہے ذرا کھاؤ' ذرا پھانک لو' گھنٹے بھر کے بعد پھر آپ سے پوچھیں گے۔ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (6:5) تم ان سے کہتے ہو کہ سنکھیا مہلک ہے' یہ مذاق اڑاتے ہیں تمہارا! مت ماری گئی ہے تمہاری' پاگل ہو گیا ہے' کیسا اچھا صاف شفاف مصری کی طرح پیسی ہوئی چیز' یہ مہلک ہے۔کہتا ہے کوئی بات نہیں! پھانک کے دیکھ لو اور پھر دیکھنا چند ہی منٹوں کے بعد کہ جس چیز کا تم مذاق اڑاتے تھے' ہنسی اڑاتے تھے' وہ کیسے سچ ہو کے ثابت ہو جاتی ہے۔قانون کی شہادت اس پہ عمل کر کے دکھانے والی بات ہے۔اور اسی لیے آپ جو دعوے کر رہے ہیں دنیا کے سامنے شہادت بن کے اس لیے نہیں پیش کر رہے ہے کہ آپ ان دعوؤں کو عمل میں لا کر ان کے نتائج دنیا کے سامنے نہیں رکھ رہے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جس نظریے کی بناء پہ آپ نے پاکستان لیا تھا آج آنے والی اگلی نسل اس کو نہیں مان رہی' منکر ہو رہی ہے' جھٹلا رہی ہے۔اور وہ کہہ رہی ہے! کہ اگر یہی چیز تھی جو تم کہتے ہو تو تم سے کیوں نہ ہوا۔بالکل ٹھیک کہتے ہیں وہ۔بھول ان کی یہ ہے کہ کسی نظریے کی سچے یا غلط ہونے کی دلیل یہ نہیں ہے کہ یہاں اس پہ عمل ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا۔سچا نظریہ حق پہ مبنی ہوتا ہے خواہ ایک آدمی بھی اس پہ عمل نہ کرے۔سچ بولنا اچھی بات ہے۔ساری دنیا میں ایک شخص بھی ایسا نہ ہو جو سچ بولے' سچ بولنا پھر بھی اچھی بات ہوتی ہے۔اسے کہتے ہیں مستقل قدر۔یہ نہیں ہے کہ دنیا سچ بولنے لگ جائے تو سچ اچھی بات اور جھوٹ بولنے لگ جائے تو پھر جھوٹ اچھی بات۔

تاریخ نتائج مرتب کرنے میں لمبا وقت لیتی ہے

یہ آپ کے ہاں کی Democracy ہوتی ہے۔جب وہ الہ الارض ہوتا ہے تو اس میں یہ بات نہیں ہوتی۔سنکھیا سنکھیا ہے'

پانی ممدِ حیات ہے۔ گالیاں دیتے چلے جاؤ پانی کو' پیتے چلے جایئے ممدِ حیات ہوگا۔ قصیدے پڑھتے چلے جائے سنکھیے کی شان میں' پھانکتے چلے جایئے قاتل نظر آئے گا آپ کو۔ اَلَمۡ یَرَوۡا کَمۡ اَھۡلَکۡنَا مِنۡ (6:6) شہادت مانگتے ہو کہتا ہے آؤ تمہیں شہادت دیں اَلَمۡ یَرَوۡا کَمۡ اَھۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِھِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ مَّکَّنّٰھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مَا لَمۡ نُمَکِّنۡ لَّکُمۡ (6:6) کہتا ہے شہادتیں مانگتے ہو۔ تاریخ کی شہادت تو تمہاری اپنی زندگی میں لمبا وقت لے گی۔ ایک قوم ایک نظریہ اختیار کرتی ہے غلط نظریہ' اس کے تباہ کن نتائج صدیوں میں جا کے کہیں باہر آتے ہیں۔ یا تیزی سے بھی آئیں گے تو دو چار نسلیں تو بہرحال وہ لے ہی لے گی۔ اس لیے مغالطہ لگتا ہے انسان کو کہ نہیں صاحب! دیکھئے ساری دنیا آج جتنے لوگ رشوت لیتے ہیں' حرام کی کمائی کما رہے ہیں' پھلتے ہیں' پھولتے ہیں' عیش اڑا رہے ہیں' مزے کر رہے ہیں' تم کہتے ہو کہ یہ ہلاکت آفریں ہے۔ ان کو تو فروغ حاصل ہو رہا ہے!! اس لیے کہ وہ فوری نتائج دیکھتے ہیں۔ قرآن اس کے لیے کہتا کیا ہے کہ اس کو چھوڑو' تاریخ کو دیکھو انسانیت کی' وہ تو ایک ایک قوم کی صدیوں کی سرگذشت ہے۔ وہاں دیکھو کہ جس قوم نے سنکھیا کھایا تھا اس کا انجام کیا ہوا تھا۔ وہ تو جھوٹی بات ہو نہیں سکتی' جو انہوں نے کیا تھا وہ تاریخ میں موجود ہے جو ہوا تھا اس کی شہادت موجود ہے۔ اور شہادت ایسی ہے اَلَمۡ یَرَوۡا (6:6) والی بات ہے۔ وہ کہتا ہے ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات سے تم دن رات گذرتے ہو' ان کی ٹھیکریوں کے اوپر ان کی ہلاکت کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں۔ اس سے بڑی ٹھوس شہادت اور کونسی ہو سکتی ہے۔

قوموں کے عروج وزوال کی ساری داستان ان کی تاریخ میں ہی مضمر ہوتی ہے

قرآن اسی لیے تاریخ کو بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ اَلَمۡ یَرَوۡا (6:6) کیا بات ہے!! کیا انہوں نے دیکھا نہیں ہے کہ اس سے پیشتر جن اقوام نے ان اقدار کو جھٹلایا اور کہا کہ نہیں صاحب! یہ سب مذاق ہے ان کا انجام کیا ہوا۔ کہا تاریخ سے پوچھو! یہ نہیں کہ وہ شروع سے ہی مفلس' قلاش' بے کس' بے بس' کمزور' ناتواں' محتاج' غلام تھے۔ ان قوموں کو بڑا تمکن حاصل تھا' بڑا عروج حاصل تھا' بڑی قدرت حاصل تھی' سلطنت ان کی بڑی مضبوط تھی۔ ایران کی سلطنت' روما کی سلطنت' چین کی سلطنت دنیا کی بڑی بڑی بادشاہتیں' یہ تمہارے گردوپیش جو قومیں ہیں قومِ عاد اور ثمود اور یہ تمام۔ اتنا تمکن حاصل تھا وہ اپنی قوم مخاطب سے کہتا ہے تمہیں بھی وہ بات حاصل نہیں ہوئی۔ اتنا بڑا تمکن حاصل تھا۔ وَ اَرۡسَلۡنَا السَّمَآءَ عَلَیۡھِمۡ مِّدۡرَارًا ۪ وَّ جَعَلۡنَا الۡاَنۡھٰرَ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِھِمۡ (6:6) وہ کہتا ہے کیفیت یہ تھی کہ رزق کی فراوانیاں' دودھ کی نہریں بہہ رہی تھیں' آسمان سے بارشیں ہوتی تھیں' زمین میں نہریں چلتی تھیں۔ یہ معیشت کی فراوانی' اس قدر تمکن حاصل تو اس کے بعد تو تم کہو گے کہ بھئی ٹھیک ہے اس قوم کو تو زوال نہیں آسکتا' یہ تو تباہ نہیں ہو سکتی۔ کہتا ہے یہ سارا کچھ ہونے کے بعد پھر یہ کھنڈرات بتا رہے ہیں فَاَھۡلَکۡنٰھُمۡ بِذُنُوۡبِھِمۡ (6:6) ان کے جرائم کے نتیجے سے تباہی ان پہ آئی' ورنہ جس قوم کو قوت اور سطوت اتنی حاصل ہو' رزق کی اتنی فراوانیاں ہوں اس کو تو ابدالآباد تک اسی طرح رہنا چاہیے۔ کونسی ایسی بات تھی

جس کی وجہ سے وہ تباہ ہوئیں۔ وہ تباہ ہوئیں کہ

ع ان کی تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی

ان کا نظام باطل تھا' انہوں نے سنکھیے کو ممدِ حیات سمجھ رکھا تھا' غلط نظامِ زندگی رائج کر رکھا تھا' انسان انسان کا محکوم تھا' انسان انسان کا محتاج تھا۔ بس یہ بنیادی غلطی تھی اس نظام کی جس کی بناء پر ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔

تباہ و برباد ہونے والی قوم کی جگہ دوسری آنے والی قوم پہلی قوم سے بہتر ہوتی ہے

وَ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ(6:6) اوران کے بعد دوسری قوم آ گئی۔ قرآن نے دوسرے مقام پہ کہا ہے کہ تم بھی ایسا کرو گے تو تمہاری جگہ دوسری قوم آ ئے گی۔ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (47:38) تو یاد رکھو وہ تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔ یعنی تمہارے ہی جیسی دوسری قوم لانا ہو تو تمہیں ہم کیوں تباہ کریں۔ وہ تو بہتر قوم ہوتی ہے نا جو دوسرے کی جگہ لیتی ہے۔ کہا واقعی ان کے یہ مطالبے کہ صاحب معجزات کوئی دکھایئے جس سے ہم ایمان لائیں گے۔ قرآن عجیب وغریب چیز پیش کرتا ہے۔ کہتا ہے ہم دلائل کی رو سے ایک چیز پیش کرتے ہیں' فکرِ انسانی کو اپیل کرتے ہیں' ہم تمہیں بالغ انسان سمجھتے ہیں اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ وہی بچپن کی باتیں صاحب کہ اس بچے کو دلیل و برہان سے نہیں سمجھایا جاتا۔ فکر کی رو سے اس کو نہیں سمجھایا' ایک خوف ہے اس کو' یونہی رسی کا سانپ بنا کے اس کو یوں یوں کیجیے پھر۔ کہا تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم یہ مطالبے ہم سے کرتے ہو۔ مطالبے تمہارے یہ ہیں وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (6:7) ان کا ثبوت پیش کر رہا ہے یہ کہتے ہیں کہ نہیں! بس اس قسم کی کتاب ہونی چاہیے جو آسمان سے لکھی لکھائی چلی آ رہی ہو' اتر رہی ہو۔ پھر یہ ان کے سامنے آ جائے تو یہ اس کو چھو کے دیکھ لیں کہ ہاں یہ ہے من بھر کی۔ اس کو پکڑ بھی لیں اس کو چھو بھی لیں' کہنے لگے اسکے بعد کیا؟

تباہی سے برباد ہونے والی قوم کی عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں

جب یہ دیکھیں گے کہ جو کچھ یہ کتاب کہتی ہے ان سے ان کے مفاد پہ زد پڑتی ہے تو کہیں گے کہ صاحب' یہ نگاہ کا فریب ہے' دھوکہ ہے۔ مداریوں کی طرح کچھ اس نے کر کے دکھا دیا۔ کہتا ہے یہ مداریوں کے کھیل جو تم دیکھتے ہو بالکل تمہاری سمجھ میں نہیں آتے۔ لیکن اس کے بعد آپ یہ کہہ دیتے ہو کہ صاحب ناٹک ہے کچھ' بات سمجھ میں نہیں آئی لیکن ہے کچھ انوکھی سی بات۔ کہتا ہے اس کے بعد تو یہ کہیں گے۔ تو یہ تو اس قسم کا بچپن ہے جو مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہم بھی اس بچپن کے اوپر اتر آئیں کہ اچھا آپ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! آسمان سے کتاب نازل ہوتی ہے تو تعلیم نازل نہ ہو یہ کتاب بنی بنائی نازل ہو۔ بنی بنائی کتاب آ گئی اور یہ کہہ کے چل

دیں کہ صاحب! اس شخص نے ہماری نگاہ بندی کر دی ہے یہ مسمرزم ہے جس کی وجہ سے یہ کر رہا ہے' تو معاملہ ختم ہو گیا۔ سوال یہ نہیں ہے۔ ہم اس سطح پہ نہیں اترتے۔

قرآن حکیم نے مکافات عمل کے نتائج کو ملکوتی قوتیں کہا ہے

وَ قَالُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ مَلَکٌ (6:8) کہتے ہیں کہ یہ کہتا ہے کہ مجھ پر فرشتہ نازل ہوتا ہے۔ یہ نازل ہوتا ہے یہ تعلیم دیتا ہے تو وہ مَلَک ایسا کیوں نہیں کہ جو ہمیں نظر آئے' ایسے کیوں نہیں فرشتے اترتے۔ کہا پہلی بات تو ان کو یہ سمجھایئے کہ جسے یہ فرشتہ کہہ رہے ہیں نا اس قسم کے فرشتے قوموں میں اس وقت آیا کرتے ہیں جب وہ تباہ ہوا کرتی ہیں۔ وَ لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَکًا لَّقُضِیَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا یُنْظَرُوْنَ (6:8) خدا کا قانونِ مکافات جب اپنے نتائج مرتب کرتا ہے تو اسے ملکوتی قوتیں کہا جاتا ہے' پھر وہ فیصلہ ہی کر دیا کرتا ہے۔ اس کے بعد مہلت نہیں ملا کرتی۔ اول تو ان سے یہ کہہ دیجیے کہ یونہی نہ ان فرشتوں کے متعلق مطالبے کیا کریں انہیں پتہ نہیں ہے کہ خدا کا قانونِ مکافات (مَلَکٌ (6:8) کے معنی ہوتا ہے صاحبِ قوت) گرفت میں لینے والا ہے۔ گرفت میں لینے والا جب اس کا قانون آیا کرتا ہے تو پھر قومیں تباہ ہو جایا کرتی ہیں۔ یونہی مذاق مذاق میں ایسی چیز نہ مان لو کہ وہ آ جائے تو ہم مانیں گے۔

فرشتوں کو دیکھنے کے مطالبہ کی بجائے غور و فکر اور دلیل و براہین سے بات کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہوگی

وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَکًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَیْهِمْ مَّا یَلْبِسُوْنَ (6:9) اور جیسا یہ کہتے ہیں کہ فرشتہ آئے' ہم سامنے دیکھیں انسان کی شکل میں تو کہا کہ اگر انسان کی شکل میں ان کے سامنے فرشتہ آ جائے تو یہ یہ کہیں گے کہ یہ تو انسان ہے کیسے پتہ چلے یہ فرشتہ ہے۔ کہنے لگے وہی التباس پھر رہے گا۔ التباس دور کرنا ہے تو فکر اور دلیل سے دور کرو' سمجھ سوچ سے کام لو جو التباس باقی نہ رہے۔ کتنی عجیب چیز قرآن نے کہی ہے۔ اس قسم کی باتوں سے پھر ہزار رخنے نکلتے ہیں' ہزار قسم کے شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب فکری طور پہ انسان کا ذہن مطمئن ہو جاتا ہے پھر کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ قرآن کا انداز یہ ہے اپنے دعوے کو پیش کرنے کا' وہ انسان کے قلب و دماغ کو مطمئن کرتا ہے' نگاہ بندیاں نہیں کرتا۔ کہا کہ یہ بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جس پیغامبر نے بھی آن کے کوئی ایسی بات کہی کہ جو ان کے مفاد کے خلاف جاتی تھی' انہوں نے اس کا مذاق اڑایا۔

معجزوں کی طلب انسانی عقل کو مفلوج کر دیتی ہے اور انسان پھر تکذیب کے جال میں ہی پھنس کر رہ جاتا ہے

وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِکَ فَحَاقَ بِالَّذِیْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا کَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ (6:10) ان قوموں نے ان کا مذاق اڑایا' اپنی غلط روش پر چلتی چلی گئیں۔ اور بالآخر ہوا یہ کہ جن چیزوں کا وہ مذاق اڑاتے تھے انہوں نے آ کے ان کو گھیر لیا اور

اس طرح سے وہ تباہ ہوگئیں۔ کہا پھر دلیل اس کی' قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ (6:11) دلیل یہ ہے۔ کوئی اس قسم کے معجزے نہ مانگو۔ جاؤ چلو پھرو دنیا میں۔ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (6:11) کیا لفظ آیا ہے یہاں۔ جاؤ چلو پھرو' ان کھنڈرات کی ٹھیکریوں سے پوچھو' تاریخ کے شواہد سے مطالبہ کرو اور پھر دیکھو وہ قومیں (مُكَذِّبِيْنَ (6:11) آیا ہے) جن کے پیغامبر یہ کہتے تھے کہ سنکھیا ہلاکت آفریں ہے' وہ کہتے تھے کہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ کہا کہ دیکھو جن قوموں نے یہ کہا کہ سچ پیش کیا گیا اور انہوں نے اس کی تکذیب کی۔ ایسا بھی ہوا کہ مان بھی لیا کہ ہاں واقعی سنکھیا مہلک ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود سنکھیا پھانکتے گئے' یہ تکذیب ہوتی ہے۔ آج ہم میں سے ہر شخص یہ کہتا ہے کہ! رشوت بڑی بری چیز ہے' حرام کی کمائی بڑی بری چیز ہے' دیانتداری ہی اچھی چیز ہے۔ کوئی شخص نہیں عمل اس کے اوپر کر رہا' اسے تکذیب کہتے ہیں۔ ایک چیز کا زبان سے اقرار کرنا عمل سے اس کو جھٹلانا' وہ کہتا ہے کہ زبان سے اقرار کرنا کچھ معنی نہیں دیتا۔ یہ جو تکذیبِ عملی تم کرتے ہو' عمل کے معنی ہیں کہ نہیں! یہ غلط کہتا ہے۔ مثلاً گھر میں بھی کسی بچے کو یہ بتایا جائے' سمجھایا جائے کہ یہ اچھی چیز نہیں ہے' آج کل امرود مت کھائیے' اس سے ہیضہ ہو جاتا ہے۔ سامنے مان لے گا' چپکے سے ادھر ذرا جاتا ہے' جھٹ سے کھا لیتا ہے۔ یہ تکذیب ہے۔ اس نے اس بات کو سچ نہیں مانا جو آپ نے کہا۔ آپ کے رعب میں آ کے' احترام کی وجہ سے سامنے چپ کر رہا' دل میں کہا کہ یہ بکتا ہے۔ جونہی نگاہ اُدھر ہوئی' وہی کچھ کیا۔ قوموں میں یہ کچھ ہوتا ہے۔ جرائم جب عام ہوتے ہیں جیسا ہمارے ہاں ہو رہا ہے کہ کوئی شخص یہ جرآت نہیں کر رہا کہنے کی کہ بددیانتی اچھی چیز نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا بددیانت ہے' رشوت خور بھی یہی کہے گا کہ صاحب بری چیز ہے۔ کہے گا کیسے؟ کہے گا کہ صاحب! دیکھئے آج کل حالت یہ ہوگئی ہے کہ رشوت کے بغیر یہاں کام ہی نہیں چل رہا۔ یعنی خود وہاں بیٹھا ہوا یہ کام کر رہا ہے۔ کہا ایسے رہا ہے جیسے دوسرے یہ سب کچھ کرتے ہیں' میں نہیں کرتا اور اس کے بعد آپ ہی سے معاملہ کرے گا اس کا۔ یہ تکذیب ہے۔ یہ انکار نہیں' یہ کفر نہیں۔ کفر تو دھڑلے سے یہ بات کہنے کی ہے کہ نہیں! یہ بات غلط ہے' جو میں کہتا ہوں یہ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے کبھی کبھی ایسے گروہ آتے ہیں ڈاکوؤں کے گروہ' وہ جو ٹھگ ہوتے تھے انڈیا میں ان کے گروہ۔ انہوں نے اپنا ایمان یہ بنایا تھا کہ جس طریقے سے کسی کا مال لے لیا جائے بالکل ٹھیک ہے۔ کالی دیوی کی پوجا کرتے تھے وہ کہتے تھے دیوی کہتی ہے ہلاک کر کے کسی کو آؤ سب سے بڑی نیکی یہ ہے۔ چلئے! ایک غلط بات سہی' دھڑلے سے کہتے تو تھے' ہم سے تو اچھے تھے۔ کم بخت برائی کو برائی تو کہتے تھے۔ تکذیب یہ ہے کہ برائی کو آپ کہتے رہیں کہ برائی ہے اور کرتے چلے جائیں اس کو پھر۔ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (6:11) اف! یہاں ڈر آ جاتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ چلو پھرو اور دیکھو مکذبین کا کیا انجام ہوا' اپنا انجام سامنے آ جاتا ہے عزیزانِ من!۔

؎ حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

کسی کو نہیں چھوڑتی۔ ابھی ایک آتی ہے سامنے کہ کسی کو نہیں چھوڑتی۔

تکذیب دین کے سلسلہ میں انسان کی چابکدستی کی ایک مثال

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (6:12) ان سے پوچھو یہ جوان باتوں سے بھی انکار کرتے ہیں' ان سے بھی پوچھو کہ کائنات کے اندر پھر یہ کس کی کارفرمائی ہے' کس کی حکومت چل رہی ہے۔ اس قوم سے بھی پوچھو یہ بھی کہیں گے کہ Sovereignty in the Entire Universe belongs to Allah ' پہلا فقرہ ان کے ہاں بھی یہ ہوتا ہے۔ Entire Universe میں تو یہ کہیں گے اور اس کے بعد اسی Constitution میں آگے یہ بات آئے گی کہ پھر ہمارے ہاں Sovereign Power کیا ہوگی' یہ اس کی حکومت بس وہ کائنات میں ہی رہی؟؟۔ وہ جو دو بھائیوں میں جائیداد کا جھگڑا تھا ایک ہی مکان باپ چھوڑ گیا تھا انہوں نے کہا کہ صاحب' اس کو بانٹیں۔ تو بڑے بھائی نے کہا کہ جھگڑے کرنے کی بات نہیں ہے بات سیدھی سی ہے بانٹ لینا چاہیے۔

آں صحنِ خانہ تا لبِ بام از من

یہ چھوٹا سا پندرہ بیس فٹ کا زیادہ سے زیادہ کمرہ یہ صحن سے لے کے وہاں چھت تک میری۔

اور اب بامِ خانہ تابہ ثریا از تو

چھت سے لے کے آسمان تک' یہ ساری تیری ملکیت ہے۔

ہم نے بھی یہی کیا ہے کہ یہ بامِ خانہ سے لے کے ثریا تک خدا کی بادشاہت ''ایہہ کوٹھا جیہڑا ایناں اے' ساڈا ایہدے اچ اوہدا کوئی دخل نئیں''۔ یہ بن رہی ہے Constitution ۔ Sovereignty in the Entire Universe belongs to Allah ۔ بالکل ٹھیک ہے۔ بگڑتا کیا ہے۔ اب اس کے بعد یہ کہ Final power in the state کس کے پاس ہوگی' یہ کوٹھا چھوٹا سا۔ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ قُلْ لِّلّٰهِ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6:12) کہتا ہے دیکھو ذرا Universe میں جا کے کس کی ملوکیت ہے اور وہاں پھر کیا کارفرمائی ہے۔ کہا اس کی ملکیت' اس کی ملوکیت جس نے اپنے آپ کو پر رحمت کو لازم قرار دے رکھا ہے۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے!! كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6:12)

رحمت کے سلسلہ میں قادرِ مطلق ہونے کے باوجود اصول پرستی کی انتہاء

كَتَبَ یا كُتِبَ قرآن میں وہاں آتا ہے جہاں کوئی چیز کسی کے اوپر فرض قرار دی جائے' واجب قرار دی جائے' لازم قرار دی جائے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (2:183)' كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ (2:216)۔ خدا انسانوں کے اوپر یہ چیزیں واجب قرار دے

رہا ہے فرض قرار دے رہا ہے' اس کو تو حق حاصل ہے۔ لیکن اندازہ لگائیے اس خدا کا' اتنا بڑا قادر مطلق ہونے کے بعد یہ کہتا ہے کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہٖ اس نے اپنے آپ پہ بھی کچھ واجب قرار دیا ہوا ہے۔ اللہ اکبر۔ اس سے خدا کی قدرتِ کاملہ پہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجبور وہ ہوتا ہے جو کسی دوسرے کے حکم کو مجبوراً مانے۔ اور جو خود اپنے اوپر ایک چیز وارد کرلے کہ میں ایسا کرونگا اسے تو اصول پرست کہتے ہیں اسے مجبور نہیں کہتے۔ تھانے والے کسی کو حکم دیدیں کہ تین میل روز چل کے تھانے میں آ کے حاضری دیا کرو' یہ شخص تو مجبور ہے۔ اور جو شخص یہ فیصلہ کرے کہ مجھے اٹھ کے تاروں کی چھاؤں میں تین میل سیر کرنا ہوگا تا کہ میری صحت اچھی رہے' اسے آپ مجبور نہیں کہتے۔ اور یہ اسی طرح سے کرے تو ہر دیکھنے والا کہتا ہے بڑا عجیب شخص ہے' میں اسے چار برس سے دیکھ رہا ہوں ایک دن اس نے ناغہ نہیں کیا۔ خدا نے جب یہ کہا ہے کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6:12) اس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم قرار دیا ہے' واجب قرار دیا ہے۔ اس سے اس کے قادر مطلق ہونے پر فرق نہیں پڑتا۔ خود عائد کی ہے اس نے اپنے اوپر ایک پابندی' دوسرے کی عائد کردہ نہیں ہے لیکن فرق ملاحظہ فرماؤ ! انسانوں پہ بھی اس نے یہ چیز عائد کی کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (2:183) تم پہ روزے فرض قرار دیے گئے ہیں۔ Majority ان لوگوں کی ہے جو اس کو مانتے ہی نہیں ہیں۔ پہلے تو انسانوں میں غیر مسلم اس کو مانتے ہی نہیں ہیں۔ مسلمانوں میں سے بھی کتنے ہیں جو اس کو مانتے نہیں اور روزوں کا تو چھوڑ دیجیے کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ (2:216) بھی تو ہے' جنگ فرض کی گئی ہے۔ کتنے سولجر ہیں ہمارے اندر۔ وہ تو ہم نے الگ کر کے رکھ دیے کہ تمہارا کام ہے۔ یعنی میں کہہ رہا ہوں کہ خدا نے جو واجب کیا ہے انسانوں کے اوپر اس میں انسان کو تو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو اس کے مطابق عمل کرے اور چاہے اس کے مطابق عمل نہ کرے۔ اس وجوہ کے باوجود انسان صاحبِ اختیار ہے اس میں۔ اور جب خدا نے اپنے متعلق کہا ہے کہ ہم نے اپنے اوپر رحمت واجب کی تو وہ اس باب میں وہ کہتا ہے ہم کبھی اس کے خلاف نہیں کریں گے۔ کیا بات ہے!! مزہ آیا نا رب ہون دا۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (33:62)' لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (13:31) ہم کبھی اس کے خلاف نہیں کرتے جو کہہ دیتے ہیں۔ تو انسان تو پھر بھی یعنی الگ بات ہے کہ اس اختیار میں ہلاکت ہے اس کی۔ لیکن کچھ بھی ہے اختیار باقی رکھا ہے اس نے اس کا۔ اور اپنے قادرِ مطلق ہونے کے باوجود' وہ چاہے تو ایک ثانیہ کے اندر اس کے خلاف کردے جو کچھ وہ کہہ رہا ہے کہ غلط بات ہے۔ یہ بے اصولا پن ہوگا اور خدا بے اصولا پن نہیں کرسکتا۔ ہم نے جو اپنے اوپر وارد کیا ہے کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ وہ کہتا ہے اگر ہمارے رنگ میں اپنے آپ کو رنگنا چاہتے ہو تو کم از کم اتنا تو کرو کہ اپنے اصول میں تو پختہ رہو۔ ہم کتنے پختہ ہیں اپنے اصولوں میں' اسے توڑ سکنے کی قدرت رکھنے کے باوجود کبھی نہیں توڑتے۔ کیا بات اپنے اوپر لازم قرار دیدی؟

لفظ رحمت کے سلسلہ میں پایا جانے والا غلط تاثر

رحمت۔اب یہ لفظِ رحمت جو آیا تو اس کا غلط مفہوم لیا ہم نے Chiristianity سے' رحم God is mercy' چل بھئی۔انہیں تو مجبوری تھی' وہ مجبوری کیا تھی؟ وہی مجبوری جو میں مثال میں کہا کرتا ہوں کہ پہلے اندر بیٹھ کے کنڈی لگالی پھر رونا شروع کر دیا کہ باہر کیسے نکالئے گا۔پھر انتظار کرتے رہے کہ' باہروں کوئی آئے کہاڑا لے کے تے اے جیہڑا دروازہ اے اینوں وڈھے' اوئے اندر بیٹھا ہویا توں کنڈی کھول'۔کہ جی نہیں! ہم تو روئے جائیں گے۔

خودساختہ عقائد کی گرفت کی اذیت ناکیوں کا وہ جہنم جس میں صدیوں سے انسان گرفتار ہے

پہلے یہ عقیدہ پیدا کیا کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولیں ماں باپ کا گناہ اپنی پشت پہ لے کے پیدا ہوتا ہے اور وہ گناہ دھل سکتا نہیں ہے' اعمال سے بھی نہیں دھل سکتا۔اس قسم کی نہ مٹنے والی سیاہی' مٹ ہی نہیں سکتی' اعمال سے نہیں مٹ سکتی۔یعنی خود کنڈی لگالی خود ہی یہ نظریہ وضع کر لیا۔اس کی حقیقت کچھ نہیں۔پہلے تو یہ وضع کر لیا ہم سارے گنہگار' رو رہے ہیں' جہنم میں چلے جائیں گے۔ارے اب کیا کیا جائے کسی طرح سے نکالا بھی جائے۔کہنے لگے کہ پھر انسانوں کی اس حالت پر خدا کو ترس آ گیا۔یعنی خود ہی اس نے یہ پیدا کیے بچے اس طرح گناہوں کا بوجھ لا دلا دکے۔اور جب وہ سامنے آئے تو انہوں نے دیکھا کہ''اوئے اپنے اپنے بچونگڑے ایہڈا ایہڈا بوجھ سراں تے' ہائے ہائے ہائے'' بڑا ترس آیا۔''یعنی آپ ہی لدی ٹرا جانڈیا اے آپ ای رون ڈیا اے''۔

اس جہنم سے نکلنے کا علاج

اندازہ لگائیے عزیزانِ من! دنیا کیا نظریات اور عقائد رکھ رہی ہے۔مذاق ہے صاحب۔انہی کی اصطلاح میں میں بات کر رہا ہوں کہ اس کو دیکھ کے خدا جو تھا بہت مغموم بیٹھا ہوا تھا۔بیٹا باہر سے آیا اس نے کہا ابا جی! کی گل اے آج بڑے امسوسے ہوئے ہو'۔معاف رکھئے گا وہی عیسائیت کی بات تھی نا تو پنجابی میں ہی آ جاتی ہے۔کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا بیٹا! کیا بات کروں یہ دیکھتے ہو کیا ہوا ہے انسانوں کو' یہ سارے جہنم کے اندر چلے جائیں گے۔میں تو رو رہا ہوں دیکھ نہیں سکتا اس چیز کو' کیا کیا جائے؟۔وہ خدا بھی کہہ رہا ہے کیا کیا جائے۔باپ بیٹا مشورہ کر رہے ہیں۔بیٹا تھا بڑا سعادت مند۔معاذ اللہ معاذ اللہ! یہ ان کی' میں نے کہا ہے Inverted Commas میں گفتگو کر رہا ہوں میں۔اس نے کہا کہ ابا جی! واقعی بات تو بڑی مشکل کی آپ تو پھنس گئے بڑی مصیبت میں اور آپ کو تو پریشان میں دیکھ نہیں سکتا۔سعادت مند بیٹا ہوں میں اس کے متعلق کوئی خدمت کروں۔کہنے لگے تم کیا کر سکتے ہو بیٹا!؟ کہنے لگے نہیں! میں سوچ سکتا ہوں۔آپ ایسا کیجیے مجھے دنیا میں بھیج دیجیے اور میں صلیب پہ اپنی جان دیدونگا اور کہہ دیجیے کہ میرا خون کفارہ بن

جائے گا انسانوں کے گناہوں کا۔"کیسا بگلا پکڑیا اے"۔بھیج دیا اس نے' صلیب پہ دیدی جان اور وہ کفارہ جو تھا وہ ادا کر دیا۔تو یہ اعمال کے بدلے میں نجات نہیں ہے نا' کس بدلے میں ہے؟ رحم آ گیا خدا کو۔یہ ہے Christianity کا عقیدہ God is mercy اس کے یہ معنی ہیں۔واضح الفاظ میں کہہ دیا پولوس نے کہ تم اعمال کے بدلے میں جنت میں نہیں جا سکتے' تم صرف کفارے پر ایمان لانے سے جنت میں جا سکتے ہو۔اسی کو ہم نے ذرا سا Twist کر کے بدلاً الفاظ دوسرے استعمال کیے۔یہ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6:12) وہی رحم ہم نے اس کا ترجمہ کیا' خدا نے تو اپنے اوپر رحم فرض کیا ہوا ہے۔اس کی شکل اب وہ کفارے کی تو نہیں حضرتِ مسیحؑ کے صلیب پہ جان دینے کی' یہ کیسے ہوگی؟

شفاعت کے عقیدے کی وضاحت کے سلسلہ میں ایک حدیث کا بیان

یہ ہوگی شفاعت کی شکل میں حساب کتاب کر کے جتنے بھی ہیں سب کو دوزخ میں بھیج دیا جائے گا۔اب خدا کی رحمت' اس کا رحم Mercy آئے گی اور اس کے لیے شکل یہ ہوگی کہ خدا کے مقرب اور رسول خدا کے ہاں سفارش کریں گے۔کہیں گے یہ بات کہ دیکھئے تو سہی یہ بندے"ویکھ سکدا ایں توں ایناں نوں ایس طراں سڑدا بلدا"۔یہ بات میں خود نہیں کہہ رہا عزیزانِ من! آپ کے ہاں کی ایک روایت ہے اس کے لیے' جسے حدیث کہتے ہیں نبی اکرم ﷺ کی کہ ایک عورت نے یہ پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں تو روز روتی رہتی ہوں' ڈرتی رہتی ہوں جب جہنم کے شعلوں کا سنتی ہوں' خدا اس میں ڈال دے گا' کیا حال ہوگا اس کا۔آپ ﷺ نے کہا کہ سنو تو سہی! تمہارا بچہ ہے کوئی؟ اس نے کہا جی! یہ میرا بچہ ہے۔کہنے لگے آپ ﷺ کہ تم کبھی یہ گوارا کرو گی کہ اس بچے کو لے کے تندور میں ڈال دو؟ کہنے لگی جی توبہ توبہ میں تو کبھی بھی نہیں کر سکتی۔کہنے ﷺ لگے تم اپنے ایک بچے کو تندور میں نہیں ڈال سکتی اور خدا اپنی اتنی مخلوق کو جہنم میں ڈال دے گا۔God is mercy۔ماں کیوں نہیں تندور میں بچے کو ڈالتی؟ رحم ہے۔خدا کیوں نہیں ان کو جہنم میں دیکھ سکے گا؟ رحم ہے۔سند اس کی؟ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6:12)۔

رحمت کا بنیادی مفہوم اور رحمِ مادر میں بچے کی پرورش کی نوعیت جو بڑی حیران کن واقعہ ہوئی ہے

رحم کے معنی Mercy نہیں ہیں۔یہ تو وہی چیز ہے جو رحم ہے۔بچہ کس حالت میں جنین کس حالت میں رحمِ مادر میں ہوتا ہے؟ کوئی ذریعہ روٹی پہنچانے کا تو ایک طرف رہا' سانس لینے کا کوئی ذریعہ وہاں نہیں ہوتا' ہوا نہیں پہنچ سکتی براہِ راست۔اور وہاں وہ نا صرف یہ کہ اسے آکسیجن اور غذا ملتی ہے' پورا جسم بنتا ہے' گوشت پوست خون ہڈیاں۔اور یہ ساری چیزیں اس کی بنتی ہیں۔پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہو کیا رہا ہے۔اس طرح سے سامانِ نشو ونما دینا جیسے رحمِ مادر میں جنین کو دی جاتی ہے اسے عربی میں رحمت کہتے ہیں۔کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ

الرَّحْمَةَ (6:12) مخلوق کو پیدا کر دینا اور اس کے لیے سامانِ نشو ونما سامانِ رزق بہم نہ پہنچانا یہ ُمی نہ سزد خدائے را' ہماری شانِ خالقیت سے بعید تھا کہ ہم یہ کچھ کرتے۔ یعنی بچے کی پیدائش کا طریق یہ کہنا کہ وہ رحمِ مادر کے اندر وہ جنین جو ہے وہ پیدا ہو' زندگی ملے بڑھے پھولے پھلے اس طرح سے پھر ایک طفل مکمل شکل میں باہر آئے۔ یہ طریقہ مقرر کرے اگر خدا اور رحمِ مادر کے اندر یہ سامان بہم نہ پہنچائے' سوچئے تو سہی!۔ یہ کیوں سامان بہم پہنچ رہا ہے' اس طرح سے؟ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6:12) بیج کو منوں مٹی کے نیچے دبا دیا جائے' رائی کے ذرے کے برابر وہ بیج ہے۔ جس قدر اس میں Potentialities (امکانات) ہوتے ہیں کچھ بننے کے' سارا کچھ وہاں اندر ملتا چلا جاتا ہے اس کو۔ کوئی آنکھ سمجھ نہیں سکتی یہ پودا بڑھتا کیسے ہے؟

رحمانیت کے سلسلہ میں پیدا ہونے والا ایک اہم سوال اور قیامت کے وجود کی حقیقت

کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6:12) تو یہ ہے۔ اب سوال یہ رہا کہ جو تمہارے دل میں یہ آتا ہے وہ آ گئی خیر وشر کی ساری بات کہ بِيَدِكَ الْخَيْرُ (3:26) اس کے ہاتھ میں تو خیر ہی خیر ہے۔ اس لیے کہ اس نے تو اپنے اوپر رحمت کو واجب قرار دے رکھا ہے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک ایک دن میں کتنے لوگ مر جاتے ہیں۔ کہتا ہے یہ مرتے اس لیے ہیں کہ تم الہ الارض اسے نہیں مانتے۔ جب انسانی زندگی آتی ہے ہماری رحمت کے قانون کو ایک طرف رکھ دیتے ہو اپنے ہاتھ میں رزق لے لیتے ہو نتیجہ اس کا یہ ہے جو کچھ تمہارے سامنے ہے۔ ہم کر سکتے تھے کہ یہاں بھی تمہارے ہاتھوں کو روک لیتے۔ پھر یہ بات بھی خدا کو بجتی نہیں جسے آپ کہتے ہیں زیب نہیں دیتی۔ ہم نے تم سے یہ کہا تھا کہ ہم نے انسان کو صاحبِ اختیار پیدا کیا ہے اور جب ہم نے یہ کہہ دیا تو ہمارے اس وعدے کا تقاضا یہ ہے کہ پھر ہم انسان کے اختیار کو سلب نہ کریں۔ بچہ جوان ہو گیا سمجھا دیا آزاد ہو گیا۔ اس کے بعد یہ چیز کہ اپنی زندگی آپ بسر کرے ٹھیک ہے۔ اپنے اختیار سے۔ تو وہ کہتا ہے وہ غلطی کرنا جو ہوتا ہے اس میں بھی ایک لذت ہوتی ہے' جبر سے نیکی کرانا بھی کوئی شرفِ انسانیت نہیں ہے۔ یہ تمہاری دنیا کے اندر یہ الٰہیت یا الوہیت ہمارے قوانین کو جب نہیں رہتی' تم اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری رحمت سے بھی محروم ہو جاتے ہو جو اس وقت کارفرما تھی جب تمہارا ہاتھ وہاں نہیں تھا۔ رحمِ مادر میں بھی جب انسان کا ہاتھ جنین تک پہنچ جاتا ہے کسی نہ کسی شکل میں' وہاں اس کا گلا گھٹ جاتا ہے۔ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6:12) ہماری تو یہ صورت ہے۔ لیکن تم اپنی دنیا میں چونکہ اس رحمت کو عام نہیں ہونے دیتے اس لیے یہ سب کچھ ہوتا ہے اور اس کا یہ نتیجہ ہے کہ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ (6:12) میں نے عرض کیا ہے کئی دفعہ کہ قیامت' مرنے کے بعد کی زندگی' آخرت' اس پہ ہمارا ایمان ہے۔ اس ایمان کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا انسان ایمان کی طرف' بنیادی چیز ہے ایمان بالآخرت۔ لیکن قیامت کے معنی صرف مرنے کے بعد کی قیامت ہی نہیں ہے۔ اس زندگی میں بھی اس دنیا میں بھی جہاں خدا کے قانونِ مکافات کا نتیجہ کس شکل میں سامنے آتا ہے وہ بھی

قیامت ہے فرد کی شکل میں بھی' اقوام کی شکل میں بھی۔

رحمتِ خداوندی کے راستے سے انسان خود ہی محروم ہوتا ہے

انہیں کہا گیا کہ تم نے یہ روش اختیار کر رکھی ہے کہ اس کی جو رحمت اس طرح سے عام ہو رہی تھی اس کے راستے میں بند لگا رہے ہو۔ کیا بات تھی!! وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) ۔ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ (107:1) یہی تکذیب آئی تھی۔ کیا تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا کبھی کہ دین کا اقرار زبان سے تو اس طرح سے کرتے ہیں کہ پاکستان حاصل ہی اس لیے کیا گیا تھا اس کی بنیاد ہی اس پر تھی Constitution سے سب سے اوپر سرِ فہرست یہ بات آئے گی ہر شخص اقرار بھی اس کا کرے گا خدا کی خدائی' اس کی ملکوتیت یہ سب چیزوں کا اقرار۔ عملاً یہ چیز کہ اس کی رحمت کے راستے میں اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ (107:1) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پہ غور کیا ہے کہ جو دین کا اقرار تو کرتے ہیں عملاً انکار کرتے ہیں۔ کہا یہ کونسے لوگ ہیں؟ کہتا ہے یہ وہ لوگ ہیں فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ (107:4-5-6) جنہوں نے سمجھ لیا ہے کہ دین نمازیں پڑھنے کا صرف نام ہے اس سے آگے نہیں۔ اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں کہ یہ کاہے کے لیے تھی۔ دین کے ان ظواہر کے اوپر تو اس طرح عمل کرتے ہیں کہ زبان سے اقرار ہو رہا ہے اس قسم کی رسوم جتنی بھی ہیں ان کی ادائیگی بھی نہایت التزام سے ہو رہی ہے۔ لیکن وہ جو اس نے کہا تھا کہ رحمت ہم نے اپنے اوپر واجب قرار دی اس کے لیے وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) سامانِ رزق جو بہتے ہوئے پانی کی طرح رواں رہنا چاہیے تھا کہ ہر گھر کے سامنے سے گذرے کہ جس کو جتنی ضرورت ہے لیتا چلا جائے اس میں بند لگا کے بیٹھ جاتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی رحمت حاصل کرنے کا بہترین طریق رزق کے سرچشموں کو کھلا رکھنے میں تھا

ہماری رحمت کی تو کشادا اور روانی کا یہ عالم تھا کہ رحمِ مادر میں جنین کو بھی یوں روٹی دیتے ہیں۔ اب تمہاری کیفیت یہ ہے اس کے بعد کہ جب تمہارے ہاتھ میں یہ رزق کے سرچشمے آتے ہیں تو وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) ان کے آگے بند لگا کے بیٹھ جاتے ہو' ہمیں ملے اسے نہ ملے۔ کہتا ہے یہ ہے کیفیت۔ کون ہیں لوگ؟ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (6:12) کہتا ہے باتیں تو بڑی جلدی سمجھ میں آ جانے والی ہیں کچھ مشکل نہیں ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں کہ جو اس کے باوجود اس کو سچا نہیں مانتے اس کے اوپر عمل نہیں کرتے اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (6:12) وہ لوگ جو خود اپنی تباہی آپ مول لینا چاہتے ہیں۔ جو خود تباہ ہونا چاہتا ہے اسے عزیزانِ من! ہلاکت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ ایک شخص جو جا رہا ہو دریا کے کنارے سے ذرا آگے' آپ دہائی دیں گے کہ ایک قدم آگے نہ اٹھانا' پانی بہت گہرا ہے' ڈوب جاؤ گے۔ جو خودکشی کرنے کے لیے جا رہا ہو دریا میں' کہنا تو ایک طرف رہا آپ اس کو پکڑنے کو دوڑیں گے تو وہ آگے چھلانگ لگا دے گا جا کے۔ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (6:12) جنہوں نے خودکشی کی ٹھان رکھی ہے وہ اس پہ نہیں

آ ئیں گے۔ افراد کی طرح قومیں بھی خودکشی کرتی ہیں' جانتی ہیں یہ سب کچھ' اس کے باوجود اس چیز کی طرف نہیں آ تیں۔ کہا یہ ہے وہ خدا جس کے متعلق عقیدہ یہ وضع کر رکھا تھا کہ شر اس نے پیدا کیوں کیا۔ یہ شر پیدا کیا ہے اس نے؟ یہ اس کا شر پیدا کردہ نہیں ہے۔ جب اس کے نظام کے اندر تم بند اپنے لگا دیتے ہو' اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہو جب اس کا نظام اپنی ارضی زندگی کا' وہاں سے یہ شر پھوٹتا ہے وہاں سے ہی شر پیدا ہوتا ہے۔ یہ نور و ظلمت تاریکیاں اور روشنیاں باہر کی دنیا میں تو خارجی کائنات کا' یہ ایک قانونِ فطرت کا عمل ہے۔ تمہاری زندگی کے اندر جسے ہم تاریکی اور نور کہہ سکتے ہیں خوشحالیاں اور غربتیں' برائیاں اور اچھائیاں یہ اس لیے آتی ہیں کہ تم ہماری رحمت کے راستے میں خود بند لگا کے بیٹھ جاتے ہو اس لیے یہ سب کچھ آتا ہے۔ اُس کی طرف سے یہ نہیں ہوتا۔ کیا حسین شعر ہے:

میرے ساقی نے عطا کی مے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

کہا پھر آ جاؤ وہی **وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ** (6:1) جو ہم نے کہا تھا کہ تاریکیاں اور نور کیسے پیدا ہو۔ **وَ لَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ** (6:13) دن اور رات بھی تو تمہارے سامنے ہیں اس میں تو کوئی چیز ایسی نہیں کہ کوئی خیر کی بات ہے کوئی شر کی بات ہے۔ شر والے دنوں میں بھی شر بکھیرتے پھرتے ہیں خیر والے راتوں میں بھی خیر کرتے پھرتے ہیں۔ یہ تو سارا کچھ اس کے قانونِ قدرت کے ماتحت ہوتا ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو **وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ**(6:13) سنتا ہے جانتا ہے اس کی یہ کیفیت ہے۔ ظلمات اور نور کہا کہ یہ ہمارے کائنات کے اندر کروں کی گردش جو ہے اس کا نتیجہ ہے' لیل و نہار اسی کا دوسرا نام ہے۔

کائنات کا تو ایک ایک ذرہ عدم سے ظہور پذیر ہوا ہے اس لیے خدا کی ایک صفت ''فاطر'' ہے

تمہاری تخلیق ایک غیر جاندار مادہ سے اس کی ابتداء ہوئی۔ دیکھتے جا رہے ہو خدا کی کارفرمائیاں' اس کی رحمت سامانِ ربوبیت اس انداز سے دیتا ہوا چلا جاتا ہے۔ کہتا ہے اور سننا چاہتے ہو خدا کے متعلق۔ تمہارے متعلق تو ہم نے کہا کہ بے جان مادہ سے پیدا کیا۔ یہ بے جان مادہ کہاں سے آ گیا۔ اب تو یہ بحثیں پرانی ہو گئیں۔ ہمارے بچپن کے زمانے میں ہم بھی کیا کرتے تھے یہ آریا سماج جو ہیں نا ان کی طرف سے یہ بحث ہوا کرتی تھی؟ مادہ ایک اصطلاح ہوتی تھی۔ وہ کہتے تھے یہ مادہ قدیم ہے' مسلمان کہتے تھے کہ یہ حادث ہے۔ تو یہ مادے کو قدیم ماننے والے تھے Matter کو۔ یعنی یہاں تک تو جو قرآن نے کہا کہ ہم نے مٹی سے پیدا کیا تو آگے بات آتی ہے کہ اس کے یہ معنی ہوئے کہ مٹی ابدی طور پہ موجود تھی اگر موجود تھی تو اسی سے پیدا کیا۔ **قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا** (6:14) ان سے کہو کہ کیا میں خدا کو چھوڑ کے کسی اور کو اپنا سرپرست بنا لوں۔ کون ہے وہ؟ **فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (6:14) اور چلا گیا ایک قدم آگے۔ تمہاری تخلیق مٹی سے' یہ کائنات جس میں مٹی یا مادہ ہے یہ کہاں سے آیا؟ وہ فاطر ہے سماوات اور ارض کا۔ یہاں خالق نہیں کہا عزیزانِ من!۔

اور یہ زبان ہے عربی کی صاحب! پہلے بھی میں کہہ چکا ہوں خلق کا معنی ہوتا ہے صحیح صحیح ترکیب دے کے کسی چیز میں Proportion کے مطابق نئی چیز بنا دینا پہلی چیزوں کو ساتھ لے کے۔ انسان خالق ہے۔ فاطر کہتے ہیں کہ وہ کہ جو عدم سے وجود میں کسی شے کو پہلی دفعہ لایا' پہلے کچھ نہ ہو اور وہ پیدا کر دے۔ کہا یہ چیز صرف ہمارے لیے ہے کوئی اور ایسا نہیں کر سکتا۔ تو یہ جو تمہارے دل میں خیال پیدا ہوا کہ! انسان کو تو بنایا مٹی سے تو مٹی کہاں سے آ گئی۔ تو کہا اس ساری کائنات کے ہم خالق ہی نہیں فاطر بھی ہم ہیں پہلی دفعہ وجود میں لانے والے Non Existence سے Existence کے اندر یہ چیز کرنے والے۔

خدا کی صفت مستغنی کا تو یہ عالم ہے کہ اس نے کائنات کا ایک ایک ذرہ حضرت انسان کو تحفہ میں دے رکھا ہے

یہ کسی اور کو حق حاصل نہیں ہے۔ وہ خدا جس نے یہ چیز کی' کچھ نہیں تھا یہ سارا کچھ پیدا کر دیا۔ تمہاری زندگی تمہاری تمدنی زندگی جو ہے کیا اس کے اندر یہ نظام ہوگا جیسا تمہارے ہاں کا نظام ہے کہ جو بظاہر کسی کو کچھ دیتا بھی ہے سب سے پہلے اپنے لیے اس کے اندر رکھ لیتا ہے۔ کہتا ہے یہ صرف خدا کی ذات ہو سکتی ہے اتنی مستغنی کہ جسے اپنی پرورش کے لیے اپنی ہستی کے لیے اپنی زندگی کے لیے احتیاج نہ ہو رزق کی' سامانِ زندگی کی ضرورت نہ ہو۔ اس لیے کہا کہ جو فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (6:14) ہے اسے کیا ضرورت ہے کہ تم سے لے کے کچھ کھائے۔ وَهُوَ يُطْعِمُ وَ لَا يُطْعَمُ (6:14) دیکھا! یہ عربی زبان ہے ع کی ایک زیر اور زبر سے بات کہاں چلی گئی۔ وَهُوَ يُطْعِمُ (6:14) ساری کائنات کو وہ رزق دیتا ہے اسے کیا ضرورت ہے کہ ''تسی اللہ دے ناں دیاں روٹیاں او ہنوں پہنچاؤ'' وہ تمہارے رزق کا محتاج ہی نہیں ہے۔

خدا کے نام پر پارسل وصول کرنے والوں کے نظام کی کیفیت

کہتا ہے یہ جو ہمارے لیے تم سے پارسل وصول کرتے ہیں' یہ اس قسم کے پوسٹ ماسٹر' ہم نے کبھی نہیں ان سے کہا ہمیں ضرورت ہی نہیں ہے ان چیزوں کی۔ رسیدیں کاٹ کاٹ کے تو ہمارے نام کی دیتے ہیں' سارے پارسل خود ہضم کر لیتے ہیں۔ لہٰذا یہ نظام جس میں ہمارے نام سے تم سے کچھ لے کے اپنے لیے وہ رکھ لیں' ہمارا نظام نہیں ہے هُوَ يُطْعِمُ وَ لَا يُطْعَمُ (6:14) اور نبی اکرم ﷺ پھر فرماتے ہیں کہ سن لیا تم نے! میں کس خدا کی طرف دعوت تمہیں دیتا ہوں۔ دعوت ہی نہیں دیتا قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ (6:14) مجھے تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ یہی نہیں کہ میں یہ کہتا چلا جاؤں' مجھے حکم دیا ہے سب سے پہلے میں اس کے سامنے جھکوں۔ اسی کی بات عزیزانِ من! اثر پیدا کرتی ہے کہ جو کہے' سب سے پہلے اس کے اوپر خود عمل کر کے دکھائے۔ سب سے پہلے میں اس کے اوپر عمل کرتا ہوں۔

ہر نبی کا اعلانِ عام کہ میں تم سے کسی معاوضے کا طلب گار نہیں

پہلا اعلان ہر رسول کا یہ ہوتا تھا جب وہ کہتا تھا کہ وَ اعۡبُدُوا اللّٰہَ اللہ کی محکومیت اختیار کرو اسی سانس میں کہتا تھا مَآ اَسۡئَلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ (25:57) میں اس کے معاوضے میں اپنے لیے کچھ نہیں مانگتا تم سے۔ پہلی چیز تو یہی بڑی ہو جاتی ہے کہ یہ اپنے لیے کچھ نہیں مانگتا اس لیے یہ بے لوث ہے۔ پہلی بات تو یہ ہوگئی کہ یہ بے لوث ہے۔ اور اگلی چیز یہ کہ میں خود سب سے پہلے اس پہ عمل کر کے تمہیں دکھاتا ہوں۔ جو یہ کہے گا کہ یہ پانی حیات بخش چیز ہے اس میں کوئی زہر نہیں ملی ہوئی پی لو زندگی مل جائے گی۔ آپ کو پتہ ہے ایسا کرنے والے پہلے اٹھا کے خود پی لیتے ہیں۔ دیکھا! میں نے پیا ہے۔ پھر وہ بھی پی لیتا ہے اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ جو کہتا ہے اس میں زہر نہیں ملی ہوئی' سچا ہے۔ اگر زہر ملی ہوتی تو خود کیوں پیتا۔ اور اگر یہ کہہ دے کہ پہلے تم پیو' آپ کیوں نہیں پیتے؟ مجھے پیاس نہیں ہے' شبہ پڑ جاتا ہے کہ اس میں کچھ بات ہے ضرور۔ کیا بات ہے قرآن کتنا سہل سا ہے۔

قرآن حکیم کے پیش کردہ نظام حیات پر پورے کا پورا عمل کرنا ہوگا

اُمِرۡتُ اَنۡ اَکُوۡنَ اَوَّلَ مَنۡ اَسۡلَمَ وَ لَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ (6:14) اور یہ بھی نہیں ہے کہ کچھ خدا کی باتیں مان لوں کچھ اپنی باتیں کچھ تمہاری باتیں' کچھ اس کی باتیں' سوال ہی نہیں ہے۔ اس طرح سے تو کوئی بھی نسخہ نتیجہ پیدا نہیں کرتا' کچھ یہاں سے لے لیجیے کچھ ایلو پیتھک کی دوائیاں کچھ یونانی کی دو چار پڑیاں ہومیو پیتھک والے سے لے لیا ''فیر اک تعویذ وی نال کرا لیا'' شرک ہے۔ یوں کام نہیں چلتا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر میں نہ مانوں اس کو' ہمارے ذہن میں تو یہ ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ شفیع المذنبین کہ پوری کی پوری امت گناہگار جو ہوگی جہنم میں بھیجی گئی' آپ ﷺ کے ایک لفظ کہنے سے ان سب کی نجات ہو جائے گی' کوئی عذاب ان پہ نہیں ہوگا۔ اتنی بڑی حضور ﷺ کی شان' اتنی بڑی حضور ﷺ کی پوزیشن۔ پتہ ہے کہ جن کے متعلق ہم یہ سمجھ رہے ہیں وہ اپنے متعلق قرآن کے الفاظ میں کیا کہہ رہے ہیں۔

شفارش کروانے والوں کے لیے نبی اکرم کی طرف سے قرآن حکیم کا فرمان

یہ ایسی آیہ جلیلہ ہے کہ اسے نمایاں حروف میں لکھ کر ہمیں اپنے درو دیوار پر لگانا چاہیے۔ قُلۡ وہ ذاتِ گرامی ﷺ فرما رہی ہے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ اتنی عظیم الشان ہستی' سنو کیا کہہ رہی ہے اپنے متعلق۔ قُلۡ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ (6:15) کہا تم تو ایک طرف رہے میں بھی اگر اس کے کسی حکم اور قانون کی خلاف ورزی کروں تو ڈرتا ہوں اس کے عذاب سے کہ نہیں بخشا جاؤں گا۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔ عیسائیت کی بنیاد کٹ گئی۔ عقیدہ یہ کہ خدا کا ایک پیغمبر اپنی جان دے کر ساری کائنات کو گناہگاروں کو پھر بخشوا لیتا ہے' کٹ گئی جڑ اس عقیدے کی کہ جتنے جی چاہے جرائم کرتے چلے جائیے' رسول اللہ ﷺ کی

شفاعت جسے حاصل ہوگئی بس وہ بخشا گیا۔

ہمارے ہاں سب سے بڑی گالی جو متصور کی جاتی ہے

سب سے بڑی گالی ہمارے ہاں یہ ہے کہ خدا کرے تم رسول ﷺ کی شفاعت سے محروم رہ جاؤ قیامت کے دن۔ میں نے کہا تھا کہ سینٹ پال کی انجیل میں یہ چیز ہے کہ نجات اعمال سے نہیں ہوسکتی، حضرتِ عیسیٰؑ کے کفارے پہ ایمان رکھنے سے ہوسکتی ہے۔ آپ حیران ہونگے آپ کے ہاں یہ حدیث، یہ روایت ہے، میں حدیث نہیں کہا کرتا کہ ذہن میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، روایت کہتے تو یہ بھی ہیں کہ یہ حضور ﷺ کا فرمان ہے۔ آپ کے ہاں روایت ہے کہ نجات اعمال سے نہیں ہوتی شفاعت پر ایمان لانے سے ہوتی ہے۔ وہی عیسائیت کا لفظ بہ لفظ تصور اور جس کے متعلق آپ یہ کہہ رہے ہیں شفاعت کا وہ اعلان کر رہا ہے پہلا ان اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ (6:14) کہ میں سب سے پہلے اس کے سامنے جھکتا ہوں۔ اور اس کے بعد کہہ رہا ہے اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (6:15) میں ڈرتا ہوں کانپ جاتا ہوں کہ میں نے بھی اگر اس کے قانون کی خلاف ورزی کی تو اوروں کو خلاف ورزی کرنے والوں کو بچانا تو ایک طرف رہا میں بھی نہیں بچ سکتا۔ عدل تو کہتے ہی اسی کو ہیں عزیزانِ من! قانون ہوتا ہی یہ ہے کہ فرد اور فرد میں فرق کوئی نہ رہے۔ اگر رعایتیں ہونی شروع ہوجائیں تو پھر وہ قانون اور عدل نہیں رہتا۔ ہم سورۃ الانعام کی آیت 15 تک آ گئے عزیزانِ من! 16 ویں آیت سے اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

دوسرا باب **سورۃ الانعام** (آیات 16 تا 26)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1971ء کی 25 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی 16 ویں آیت سے ہو رہا ہے۔

آج دنیا میں ہر مملکت اخلاقیات کا تو سبق دیتی ہے لیکن انصاف کا ترازو کہیں نظر نہیں آتا

تسلسل کی غرض سے سابقہ آیت کو پھر سے سامنے لانا ضروری ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے قرآنِ کریم کی ساری تعلیم کا نقطۂ ماسکہ' محور' مرکز' بنیاد' اساس خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے۔ انسان کے ہر کام کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے اس کے سامنے آتا ہے۔ اور قانون وہی قانون کہلا سکتا ہے یا اسی کا نام عدل ہو سکتا ہے جس میں قانون کے متعلق کسی کی رو رعایت نہ کی جائے' شخصیتوں کا اس میں کوئی سوال نہ آئے۔ دنیا میں قانون تو بڑے بڑے اچھے بنتے ہیں۔ اور عام طور پر آپ دیکھیں گے' مختلف اقوامِ عالم میں جو قوانین'

مملکتی قوانین رائج ہیں، بیشتر وہ اخلاقیات پر مبنی ہوتے ہیں: چوری نہ کرو، فریب نہ دو، دھوکہ نہ دو، جھوٹ نہ بولو یہ تمام چیزیں ان میں ہوتی ہیں۔ لیکن جب عدل کا معاملہ آتا ہے یعنی قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کا تو اس میں بہت سے عناصر ایسے آجاتے ہیں کہ فیصلہ قانون کے مطابق نہیں ہوتا۔ اور ان میں شخصیتوں میں تمیز جو ہے یہ بڑی نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ قرآنِ کریم نے بتانا یہ تھا کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل میں شخصیتوں کی کوئی رعایت نہیں کی جاتی۔ اور اسے سمجھانے کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر نمایاں، درخشندہ اور کوئی دلیل ہو نہیں سکتی تھی۔

دنیائے انسانیت کی عظیم ترین قابل صد احترام ہستی نبی اکرم ﷺ کا وہ اعلان جو ہر شخص کے لیے مشعل راہ ہے

کہ وہ شخصیت وہ عظیم ہستی ﷺ جس پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جو ہمارے ایمان کی رو سے اس کائنات میں تمام انسانوں میں افضل ترین ہستی ہے۔ اس ہستی ﷺ کے متعلق یہ اعلان کرایا اور اعلان بھی کرایا ہے جیسے خود حضور نبی اکرم ﷺ یہ اعلان فرما رہے ہوں۔ ان سے کہا کہ قُلْ ان سے کہہ دو اِنِّیٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (6:15) کہ اور تو اور اگر میں بھی خدا کے قانون کی خلاف ورزی کروں تو اس کی سزا سے نہیں بچ سکتا، میں بھی ڈرتا ہوں اس کی سزا سے۔ تو اب اس کے بعد باقی جتنے لوگ ہیں ان کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی۔ جب خود حضورِ نبی اکرم ﷺ یہ فرما دیں کہ میں بھی ڈرتا ہوں اس سے کہ اگر میں بھی اس قانون کی خلاف ورزی کرونگا تو میں بھی سزا سے نہیں بچ سکتا تو اب اس کے بعد اور کون ہے کہ جو یہ کہہ سکے کہ نہیں صاحب! میں تو سزا سے بچ سکونگا۔ اور جیسا میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا اسی سے وہ عظیم چیز بھی سامنے ہمارے آجاتی ہے جو ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور ﷺ کی امت ہے آپ ﷺ خدا کے محبوب ہیں اور خدا کے محبوب کی یہ محبوب امت ہے یہ کتنے ہی گناہ کیوں نہ کریں حضور ﷺ کی شفاعت ہوگی اور اس شفاعت سے آپ ﷺ ان گنہگاروں کو دوزخ کے عذاب سے بچا لیں گے بلکہ جو دوزخ میں جا چکے ہونگے ان کو بھی وہاں سے نکلوا لیں گے۔ بات یہ سامنے آتی ہے کہ جو شخصیت یہ اعلان کر رہی ہو کہ میں بھی اگر خدا کے قانون کی خلاف ورزی کروں تو اس کے عذاب سے نہیں بچ سکتا، جو خود نہیں بچ سکتا وہ دوسروں کو کس طرح سے بچا سکے گا۔ بڑا عظیم اعلان ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا اور خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی محکمیت اور اس کے اٹل ہونے پر۔ قُلْ اِنِّیٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (6:15) اور وہ یومِ عظیم جو ہے۔

مکافاتِ عمل کے نتائج کا سلسلہ جہانِ فردا تک جاری رہتا ہے

یاد رکھئے یہ یومِ عظیم کسی خاص دن کا نام نہیں ہے جب بھی انسان کے کسی عمل کے نتائج اس کے سامنے آتے ہیں وہی گھڑی

اس کے لیے قیامت کی گھڑی ہوتی ہے اس فرق کے ساتھ کہ یہ گھڑی اس زندگی میں بھی سامنے آ سکتی ہے اور مرنے کے بعد بھی۔ کیونکہ قرآن کی رو سے زندگی کا سلسلہ اس سانس کے ساتھ ہی وابستہ نہیں کہ یہ منقطع ہوا تو زندگی ختم ہوئی' زندگی مسلسل آگے چلتی ہے۔ اور وہ اسی مقصد کے لیے آگے چلتی ہے کہ قانون مکافات عمل کی رو سے جو نتائج مرتب ہونے ہیں وہ اگر اس زندگی میں مرتب نہیں ہوئے تو اس سے آگے مسلسل زندگی چلتی ہے اس سے فرق کچھ نہیں پڑتا' اس کے بعد سامنے آ جائیں گے۔ تو انسان کے اعمال کے نتائج خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی' ایک فرد کے ہوں یا ایک قوم کے' ایک نظام کے' ایک مملکت کے اس کے اعمال کے نتائج جب سامنے آتے ہیں تو اسے کہا جاتا ہے جسے آپ یومِ مکافات کہتے ہیں روزِ مکافات کہتے ہیں۔ وہ اس زندگی میں بھی آ سکتا ہے اسکے بعد کی زندگی میں بھی آ سکتا ہے۔ تو اس لیے یہ چیز کہی کہ میں بھی اس سے خائف ہوں۔ اور یہ جو یوم ہے اس کی سختی کے متعلق کہ جب انسان کی تباہی یا اس کے اعمال کے تباہ کن نتیجے سامنے آئیں تو کہا مَنۡ یُّصۡرَفۡ عَنۡهُ یَوۡمَئِذٍ فَقَدۡ رَحِمَهٗ ؕ وَ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡمُبِیۡنُ (6:16) کہا کہ جو میں نے کہا ہے کہ میں بھی ڈرتا ہوں اس وقت سے جب نتائج سامنے آئیں کسی کے غلط اعمال کے۔ تو کہا ہے کہ وہ وقت تو بڑا ہی سخت وقت ہوتا ہے۔ جو اس سے بچ جائے یا بچا لیا جائے سمجھ لیجیے کہ وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے یعنی بچ کیسے جائے؟ یہ نہیں ہے کہ اس نے قانون شکنی کی ہے غلط اعمال کیے ہیں اور اس کے نتائج سامنے نہ آئیں۔ بچ جائے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس قسم کی قانون شکنی کرے ہی نہیں۔ تو جس کی زندگی اس قسم کی گذرے کہا کہ وہ بہت ہی صاحبِ نصیب ہے اس کی زندگی کامیابیوں کی زندگی ہے۔ وَ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡمُبِیۡنُ (6:16) یہ بہت بڑی Acheivement ہے جو اس نے کی۔

نجات کے عقیدے کے موجودہ غلط تصور کی جگہ لفظ فوز کی اہمیت

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے قرآنی نجات کا عقیدہ یہی نہیں ہے کہ وہ عذاب سے بچ جائے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے' وہی بات جسے As you were کہتے ہیں صبح تندرست تھا انسان' پھر اسے بخار ہوا بخار میں دوائی دی' دوائی کے بعد بخار اتر گیا تو اس نے اس سے کمایا تو کچھ نہیں حاصل تو کچھ نہیں کیا Acheivement تو کوئی نہیں ہے اس کی' یہ تو پھر ویسا ہو جانا ہے جیسے پہلے تھا۔ تو اس قسم کی گردش جس میں ساری سعی و کاوش اس قدر یہ جہانِ عمل' اس قدر قانونِ مکافات اور ان تمام کا ماحصل یہ کہ انسان جیسا پہلے تھا ویسا ہی پھر ہو جائے' کھیل بچوں کا ہوا۔ می نہ سزد خدائے را۔ اسی لیے قرآن کا نظریہ نجات یہ نہیں ہے کہ انسان اس سے بچ جائے بلکہ نظریہ یہ ہے کہ وہ Acheivement اس کی ہو اس نے کچھ کمایا ہو اس نے کچھ حاصل کیا ہوتا کہ وہ زندگی کی اگلی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو سکے۔ اسی کو قرآن فوز کہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نجات کی بجائے فوز کا لفظ عام طور پہ استعمال کرتا ہے۔ اس کے معنی کچھ Acheivements ہوتی ہیں کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے۔

نقصان پہنچنے کے سلسلہ میں ایک غلط فہمی کا ازالہ اور تصریف آیات کی اہمیت

اس قانون کے متعلق کہا کہ وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗۤ اِلَّا ہُوَ ؕ وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡکَ بِخَیۡرٍ فَہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (6:17) عام ترجمے کے اعتبار سے یعنی عام ترجمہ تو یہ ہوگا اور ہر جگہ آپ دیکھیں گے قرآن کے نسخوں میں کہ اگر اللہ تجھے کوئی نقصان پہنچائے تو اسکے سوا کوئی ازالہ کرنے والا نہیں ہے۔ اس سے فوراً ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ وہ تو خدا نقصان پہنچا رہا ہے مصیبت اس کی طرف سے آ رہی ہے اس کی طرف سے مصیبت آئے تو اس سے چھٹکارا کرانے والا کوئی نہیں ہے۔ تو آپ نے دیکھا کہ اتنے سے ترجمے سے بات کہاں جا پہنچتی ہے کہ ساری مصیبتیں آتی اس کی طرف سے ہیں انسان تو بیچارہ بے بس ہے' مجبور ہے۔ اور جب اس کی طرف سے مصیبت آتی ہے تو کہا کہ فَلَا کَاشِفَ لَہٗۤ اِلَّا ہُوَ (6:17) وہی اس کو دور کر سکتا ہے۔ نہ مصیبت کے لانے میں انسان صاحبِ اختیار ہے نہ اس کے دور کرنے میں اسے کسی قسم کا اختیار ہے۔ یہ ہوتا ہے قرآن کی آیتوں کو الگ الگ لینے سے۔ اور جتنے بھی ہمارے ہاں غلط عقائد اور غلط مفاہیم ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو یہ کہ قرآن کے الفاظ اور اصطلاحات کے مفہوم ہم نے صحیح متعین نہیں کیے۔ اور وہ بھی قرآن سے متعین کیے جاتے ہیں یاد رکھئے!۔ اور دوسرے یہ کہ قرآنِ کریم نے جو اپنے سمجھانے کا طریقہ بتایا ہے تصریفِ آیات کہ ایک موضوع کے متعلق جو آیت آپ کے سامنے ہو' سارے قرآن میں دیکھئے اس کے متعلق کیا لکھا ہے' وہ کہتا ہے کہ پھر بات صحیح سمجھ میں آئے گی۔ اگر ایک فقرہ چن کے کہیں سے آپ نے لے لیا اور اسی سے سمجھ لیا کہ قرآن کا مفہوم یہ ہے تو وہ کہتا ہے کبھی صحیح مفہوم سامنے نہیں آ سکتا۔ جیسا کہ ابھی یہ آیت میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے۔ وہ انسان کو بالکل مجبورِ محض بنا دیتا ہے اس میں۔ مصیبت اور نقصان بھی اسی کی طرف سے آتا ہے لہٰذا ان حالات میں انسان کیا کرے' سوائے اس کے کہ گڑگڑائے' روئے' فریاد کرے اور اس کے بس کی بات نہیں ہے۔

ہر مصیبت انسان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوتی ہے جس کی بنیادی وجہ انسانوں کا خود ساختہ نظام ہے

اگر اس کے ساتھ ایک اور آیت ملا لی جائے تو بات صاف ہو جاتی ہے واضح ہو جاتی ہے۔ وَمَاۤ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ (42:30) جو مصیبت بھی تمہیں یہاں آتی ہے' تمہارے اوپر آتی ہے' وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا عزیزانِ من! کہ یہ آیت سامنے رکھئے آپ دیکھتے ہیں بات کتنی صاف ہو جاتی ہے۔ وَمَاۤ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ (42:30) یاد رکھو! جو مصیبت بھی تمہیں آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ اب یہ جو ہے اَصَابَکُمۡ (42:30) اور اَیۡدِیۡکُمۡ (42:30) یہاں واحد کا صیغہ نہیں ہے ایک فرد کی بات نہیں کر رہا قرآن۔ اجتماعی صورت ہے اس لیے صیغے بھی یہاں جمع کے ہیں۔ یہ ہے نظام کے متعلق۔ جو مصائب بھی تم پہ آتے ہیں' وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے لائے ہوتے

ہیں۔ بس دیکھنا یہ ہوگا تمہیں کھڑے ہو کر کہ کہاں وہ نقص واقع ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ خدا کی طرف سے مصیبتیں نہیں ہوتیں۔ می نہ سزد خدائے را کہ ہمیں یہاں دنیا میں بھیج دیا اور ہمارا تو اس میں اختیار بھی نہیں تھا یہاں آنے کا' ہم سے پوچھا بھی نہیں گیا' چوائس بھی نہیں دی گئی' کوئی آپشن بھی نہیں دی گئی۔ یہاں بھیجا گیا اور بھیجنے کے بعد پھر بعد میں ہمارے پیچھے پیچھے مصیبتوں کا ایک طوفان بھیجنا شروع کر دیا۔ کیا ہے خدا وہ۔ کہا غلط ہے یہ۔ وَمَآ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ (42:30).

''خدا کرتا ہے'' کے بنیادی معنی خدائی قانون کے ہیں

کہا بات اتنی ہوتی ہے کہ جب تم غلط نظام قائم کرتے ہو' غلط کام کرتے ہو' غلط روش اختیار کرتے ہو' تو ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل اس کے نتیجے میں ایک مصیبت تمہارے لیے پیدا کرتا ہے۔ یہ قانون ہے ہمارا۔ اور جب تم اس روش کو صحیح کر لیتے ہو' درست کر لیتے ہو تو ہمارا قانون ہے کہ پھر اس کے نتائج خوشگوار ہوتے ہیں۔ لہٰذا جہاں خدا کہتا ہے کہ ہم یہ کرتے ہیں' قرآن کے بیشمار مقامات میں یہ چیز ہے کہ جہاں کہا جائے خدا یہ کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل یہ کرتا ہے۔ اگر یہ کر لیا جائے کہ جو مصیبت بھی تم پہ آتی ہے تمہارے اپنے اعمال کی وجہ سے آتی ہے جس کے نتیجے ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق مرتب ہوتے ہیں' بات صاف ہو جاتی ہے۔ سارا مسئلہ تقدیر کا حل ہو جاتا ہے۔ یہ الجھاؤ ڈالا گیا ہے کہ ان آلام میں جو پھنسے ہوئے ہیں ان کی نگاہ غلط نظام کی طرف اٹھنے نہ پائے۔ خدا کو موردِ الزام قرار دیدیا جائے ''اللہ ڈاہڈا ہو یا فیر'' اور ویسے بھی وہ تو کہیں ہاتھ میں بھی نہیں آتا سوائے اس کے کہ گڑگڑائے' روئے انسان کیا کر سکتا ہے۔

آخر کار پورے کے پورے غلط نظام کو بدلنا پڑے گا کیونکہ خدا کا یہی غیر متبدل اصول ہے

یاد رکھئے! وَمَآ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ (42:30) سب تمہاری اپنی ہاتھوں کی لائی ہوئی چیز ہوتی ہے۔ ایک فرد کی حیثیت سے' نظام کی طرف سے اجتماعی طور پر معاشرے کی طرف سے۔ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ (6:17) اور اس کے بعد اگر تم یہ چاہو کہ جو غلط نظام کی وجہ سے مصیبتیں تم پہ یا غلط اعمال کی وجہ سے آئی ہوئی ہیں ان کو کسی طرح غلط اعمال کے طریقوں سے ہی کسی طرح سے ٹھیک کر لو جیسا کہ ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ ایک نظام غلط ہے اس کی وجہ سے مصیبتیں آتی ہیں اس میں جس قدر بھی سوچا جاتا ہے اس نظام کو علیٰ حالہٖ رکھ کے سوچا جاتا ہے کہ اس میں سے کس طرح سے وہ حل نکل آئے کس طرح سے وہ مصیبتیں دور ہو جائیں اسی نظام سے۔ یعنی یہ چیز غلط ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نظام کو علیٰ حالہٖ رکھ کے جس کے نتیجے میں یہ کچھ ہو رہا ہے تم یہ چاہو کہ یہ مصیبتیں یہ ٹل جائیں' ان تکلیفوں کا حل مل جائے' بالکل نہیں! فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ (6:17) جس قانون نے یہ چیز پیدا کی ہے اسی قانون کی رو سے یہ رفع

ہوگی۔ آگ میں انگلی دی ہے تو یہ جلے گی اس سے درد ہوگا اور سخت تکلیف ہوگی۔ کوئی اور طریقہ نہیں سوائے اس کے کہ خدا کا قانون جو ہے کہ جہاں انگلی جل جائے فلاں قسم کی دوائی اس کے اوپر لگاؤ کہتا ہے اس سے یہ رفع ہوگی۔ غلط نظام کے نتیجے میں آتا ہے صحیح نظام کرنے سے رفع ہوتا ہے۔ اس طرح سے یہ رفع ہوگی۔ وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡکَ بِخَیۡرٍ فَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (6:17)

لفظ قدیرؑ قادر اور قدرت کا بنیادی مفہوم

یہ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (6:17) کا ترجمہ: وہ ہر بات پر قادر ہے جی۔ تقدیر کا مسئلہ جیسے میں نے کہا ہے بڑا اہم ہے' اس پہ میں بہت کچھ آج کل کر رہا ہوں۔ خیر۔ وہاں یہ چیزیں آئیں گی کہ یہ قدیر کیا ہے کیوں یہ صیغہ اس طرح سے قدیر کا استعمال ہو رہا ہے قادر کا کیوں نہیں ہو رہا۔ اس کے معنی ہیں پیمانے مقرر کرنے والا' اندازے مقرر کرنے والا۔ قرآنِ کریم میں قانون کا لفظ نہیں آیا' عربی زبان میں اس زمانے میں قانون کا لفظ استعمال نہیں ہوا کرتا تھا۔ یہ الفاظ استعمال ہوتے تھے ان کے ہاں' یہ جسے قدرت کہا جاتا ہے جسے قادر کہا جاتا ہے' جسے قدیر کہا جاتا ہے' اس کے معنی ہوتا ہے اندازے اور پیمانے دینے والا۔ پیمانے اور اندازے کیا ہیں اس کے؟ سنکھیے کے دس قطرے مرنے والے کو ایک نئی زندگی دیدیتے ہیں اور اس کے پچاس یا سو قطرے اچھے بھلے زندہ کو مار دیتے ہیں۔ یہ کیا فرق ہے دونوں میں؟ سنکھیا تو وہی ہے پیمانے کا فرق ہے۔ اس پیمانے کے مطابق ممدِ حیات ہے اُس پیمانے کے مطابق ہلاکت آفریں ہے۔ اس نے ہر چیز کے پیمانے مقرر کر رکھے ہوئے ہیں۔ اور قدیر کے معنی ہیں' مسلسل پیمانے مقرر کیے جانے والا۔ نت نئے اضافے وہ کہتا ہے کائنات میں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور جب نت نئے اضافے ہوتے ہیں تو اس کے مطابق ان چیزوں کے لیے قوانین بھی بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ عربی زبان جاننے والے جانیں گے اس چیز کو کہ قدیر وہ ہوتا ہے جس کے عمل کے اندر ایک تسلسل ہو' دوام ہو' چلا جا رہا ہو۔ وہ کہتا ہے ان تمام چیزوں کے لیے اس نے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں' اندازے مقرر کر رکھے ہیں۔ انہی کا ترجمہ آج کی زبان میں قانون کیا جاتا ہے' سب کچھ اس کے مطابق ہوتا ہے۔

لفظ القاہر' قہار، جبار کا لغوی مفہوم

اب یہیں وہ لفظ آ گیا۔ وَ هُوَ الۡقَاهِرُ فَوۡقَ عِبَادِهٖ (6:18) چلئے! پھر قَاهِرُ کا لفظ آ گیا قھار کا لفظ ہے صاحب۔ اور جونہی یہ لفظ آیا اور یہاں سے وہ قہر ہے ناہمارے ہاں۔ اور قہر جب آتا ہے تو عذاب کی شدت ہوتی ہے اس میں' خدا کا قہر ہے اور جب قہر یہ چیز ہے انتہائی استبداد' ظلم تو قَاهِرُ (6:18) تو ہوا پھر وہ ایسا کرنے والا اور قہار تو پھر اس سے بھی زیادہ' بہت زیادہ شدت سے۔ تو خدا قَـاهِرُ (6:18) ہے قہر ہے' یہ کیا ہوا؟ الفاظ تو عربی زبان کے' سمجھا ہم نے اپنی اردو میں ان کو۔ یعنی جیسا ہمارے ہاں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے قہر کا معنی ہوتا ہے کسی کے اوپر غلبہ۔ غلبہ کس قسم کا ہے؟ یہ جبار اور قہار خدا کی دو صفتیں آتی ہیں۔ جبار بھی ہمارے ہاں جو

استعمال ہوتا ہے جبر اور قہر تو دونوں مرادف الفاظ ہوتے ہیں جبار اور قہار یہ دو الفاظ انہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں لیکن یہ ہیں کیا؟ قانون جب اٹل ہو تو کوئی اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔ قانون قانون اس وقت ہوتا ہے جب اس کے پیچھے قوتِ نافذہ ہو اس کو Enforce کرنے والی قوت ہو۔ اور Enforce کرنے والی قوت اتنی بڑی ہونی چاہیے کہ جن کے اوپر وہ Enforce کر رہا ہے وہ قوت ان کے اوپر غالب آ جائے۔ جب Enforce کرنے والی قوت کمزور پڑتی ہے تو بغاوت ہوتی ہے نا۔ اس نے کہا کہ تمہارے نظام کے اندر یہ چیزیں ہوتی ہیں' ہوسکتی ہیں کہ جو قانون شکن ہوتا ہے' اس سے سرکشی برتتا ہے' قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے'۔ وہ قوت ہونی چاہیے کہ جو اس کے اوپر گرفت کرے اور پھر اس کے اس جرم کی سزا دے۔ لیکن اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ وہ قوت ڈھیلی پڑ جاتی ہے' قوت کمزور ہو جاتی ہے' یہ اُس سزا سے بچ جاتا ہے۔ جونہی قوتِ نافذہ کمزور ہوئی قانون کی گرفت ڈھیلی پڑی' عدل ختم ہوا۔ نتائج اس کے مطابق مرتب نہیں ہوتے۔

قانون کو نافذ کرنے والی قوت قہار کی بنیادی خصوصیات لفظ جبار میں مضمر ہیں

قانون کے قانون ہونے کے لیے ضرورت ہے کہ قانون کو نافذ کرنے والی قوت قاہر ہو اس کی گرفت سخت ہو۔ اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌ (85:12) لیکن یہ سب کچھ ہو کس مقصد کے لئے' کاہے کے لیے یہ سب کچھ ہو؟ یہ خود لفظ جبار بتا دیتا ہے! جبیر کہتے ہیں عربی زبان میں جبائر جس کی جمع ہے۔ اب تو یہ ہڈی ٹوٹتی ہے کہیں تو اس کے اوپر وہ پلاسٹر لگا دیتے ہیں' اس سے ذرا پہلے ہم نے دیکھا ہے اپنے ہاں اور آپ لوگوں نے بھی دیکھا ہوگا آج بھی یہ کچھ کرتے ہیں' وہ لکڑیاں نیچے اور اوپر ان کو رکھتے ہیں اور پھر کس کے باندھ دیتے ہیں اس کو تاکہ یہ ہڈیاں اپنے اپنے مقام میں رہیں اِدھر اُدھر ذرا نہ ہلے تاکہ ٹوٹی ہوئی ہڈی پھر سے جڑ جائے۔ یہ جو وہ لکڑی کی تختیاں ہوتی ہیں ان کو عربی زبان میں جبائر کہتے ہیں اور یہ جو کس کے باندھنے والا ہے اس کو جابر یا جبار کہا جاتا ہے۔ تمہاری ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو اس طرح سے جوڑنے والا یہ ہے جو خدا کی صفت جبار آپ کے سامنے آتی ہے۔ اس میں سختی کی ضرورت ہوتی ہے پوچھئے نہیں مریض اس وقت کیسے چلا رہا ہوتا ہے۔ اب تو وہ بے ہوش کر دیا جاتا ہے کہ جس سے احساس نہیں ہوتا درد کا ورنہ ٹوٹی ہوئی ہڈی کو اس طرح سے باندھنے میں جو ہوتا ہے' ہوتا تو ہے وہ ضرور لیکن وہ جوڑنے والا جبر نہیں کر رہا ہوتا (ہمارے معنوں میں)۔ ایک تو یہ ہے جی کہ اس کی قوت اتنی ہونی چاہیے کہ وہ اس طرح سے اس کو پکڑ لے' یہ تو اس کا قہر ہوا صاحب قوت۔ اور پھر اس کے بعد یہ ہے کہ اس کو وہ کس کے اس طرح سے باندھے کہ ہڈی اِدھر اُدھر نہ ہو سکے یہ ہوا اس کا جبر۔ اور یہ ہے خدا کو قہار اور جبار جسے آپ کہتے ہیں۔ وَ ھُوَ الۡقَاھِرُ فَوۡقَ عِبَادِہٖ (6:18) عجیب چیز یہاں قرآن کہہ گیا ہے۔ انسانوں کے اوپر غلبہ اور اقتدار' قاہر ہونا صرف خدا کے لیے ہے۔ عِبَادِہٖ (6:18) کیا بات ہے صاحب قرآن کی!!۔ یہ اس کے محکوم ہیں۔ جس کا کوئی محکوم ہوتا ہے وہ حاکم ہے جس کو غلبے کا حق حاصل

ہوتا ہے اس کے اوپر اس قوت کا' قانون نافذ کرنے کا اپنی رعایا پہ۔ یوں کہیے جیسے ہم کہتے ہیں کہ یہ ہماری رعایا ہے صرف' اس لیے ان کے اوپر ہمارا ہی غلبہ رہنا چاہیے۔

مغرب کی جمہوریت کا خاصہ انسانوں کی انسانوں پر حکومت کرنا ہے اور قرآن حکیم نے اسے فرعونیت سے تعبیر کیا ہے

ایک مملکت کی رعایا کے اوپر دوسری مملکت کا کسی صورت میں کوئی غلبہ نہیں ہوتا۔ اگر کوئی غلبہ اُدھر سے جتائے تو یہ تو ہمسری ہے' اسے شرک کہا جاتا ہے قرآن کی اصطلاح میں۔ کہا یہ ہے کہ یہ تمام انسان یاد رکھو! ہماری رعایا ہیں ہماری مملکت میں رہتے ہیں کسی اور کو حق حاصل نہیں کہ ان کے اوپر بالا دستی کسی قسم کی جتائے۔ اور یہی وجہ ہے قرآن نے کہا ہے کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم مغلوب اور مقہور بنائے' مجبور بنائے۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے خواہ وہ ایک فرد ہو جیسا کہ ملوکیت اور ڈکٹیٹر شپ میں ہوتا ہے یا وہ افراد کی ایک جماعت ہو جیسا کہ مغرب کی جمہوریت میں ہوتا ہے کہ جس نے بھی اکاون ووٹس کسی طرح سے حاصل کر لیے اس کو Constitutionaly حق مل جاتا ہے کہ وہ 49 کے اوپر اپنے فیصلوں کو نافذ کرے۔ قرآن کہتا ہے یہ بالکل غلط ہے۔ اور یہ وجہ ہے کہ ایسا انسانی نظام جس میں کوئی انسان دوسرے انسانوں سے اپنا حکم یا اپنا قانون منوائے اس کو اس نے جن معنوں میں ہم قہار کا لفظ استعمال کرتے ہیں جابر' ستمگار' مستبد۔ قرآن نے اس معنی میں یہ لفظ استعمال کیا ہے جب کوئی انسان دوسرے انسانوں کے اوپر زبردستی کرے۔ چنانچہ فرعون کے متعلق اس نے یہ کہا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے اس کے دستِ تظلم سے نکلنے کی کوشش کی' صاحبِ ضربِ کلیم نے یہ کوشش کی کہ اس کو آزادی ملے تو فرعون نے اپنے لوگوں سے کہا کہ یہ کسی طرح یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں' ہماری گرفت سے بچنا چاہتے ہیں وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ (7:127) دیکھئے وہی فوق کا لفظ یہاں بھی آیا ہے ہم ان کے حاکم ہیں ہمارا غلبہ ہے ان کے اوپر۔ اور قرآن نے اس کو جرمِ عظیم کہا ہے فرعون کا کہ وہ ہماری رعایا پہ ہمارے بندوں پر اپنی حکومت جتاتا تھا۔

خارجی کائنات ہو یا انسانی دنیا حکومت کا حق صرف خدا ہی کو حاصل ہے

قرآن کے سیاسی نظام کی رو سے کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ کسی انسان کے اوپر اپنا فیصلہ نافذ کرے۔ صرف قرآن کا آئین اور دستور انسان اس کے تابع رہیں گے' انسانوں کے فیصلوں کے تابع نہیں۔ جونہی انسان نے فیصلہ اپنا نافذ کیا' اس پہ غلبہ کیا' اس کو مغلوب کیا' قرآن نے اس کو قاہر کہا ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ یہ سب سے بڑا جرم تھا فرعون کا جس کی وجہ سے حضرتِ موسیٰؑ کو بھیجا گیا کہ جاؤ۔ اور اسی لیے یہی الفاظ ہیں وہاں' وہاں جا کے فرعون سے کہا تھا کہ اَنْ اَدُّوْۤا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ (44:18) عجیب الفاظ ہیں!! خدا کے

بندوں کو اس کی رعایا کو میرے سپرد کر دے تا کہ میں اسے خدا کی زمین کی طرف لے جاؤں۔ عباد اللہ۔ آپ نے دیکھا کہ یہ جو عباد اللہ کہنے والی بات ہے یا عبد اللہ کہنے والی بات ہے یہ کتنی عظیم حقیقت ہے جو قرآن بتا گیا ہے۔ کوئی انسان کسی دوسرے کا محکوم اور عبد نہیں ہو سکتا، یہ صرف خدا کے عبد ہو سکتے ہیں۔ اور پھر یہ کتنی بڑی حقیقت ہے عزیزانِ من! جسے ہم دن میں چوبیس مرتبہ باوضو خانہ خدا کے حضور کھڑے ہو کر قبلے کی طرف منہ کر کے یہ کہتے ہیں کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) ہم صرف تیری محکومی اختیار کرتے ہیں کسی اور کی محکومی اختیار نہیں کرتے۔ کتنا بڑا انقلابی اعلان ہے۔

عبد کی حقیقت اور لا الہ الا اللہ کا صحیح مفہوم

عزیزانِ من! یہ جو کیا جاتا ہے چوبیس مرتبہ دن میں اس طرح سے جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے باوضو ہو کر قبلہ رو ہو کر مسجد کے اندر خدا کے سامنے یہ اعلان کرنا کہ تیرے سوا کسی اور کی محکومی ہم نہیں اختیار اور قبول کرتے۔ یہ ہوئی عبدیت۔ کیا کیا گیا ہمارے ساتھ پھر؟ اتنی بڑی انقلابی قوم دنیا میں، بات تو بڑی آسان تھی کرنے کی۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں۔ عبادت بھی خیر عبد سے ہی تھا اور اس کے معنی ہو گیا پرستش، معبود کے معنی ہو گیا جس کی پرستش کی جائے۔ ہم صرف تیری پرستش کرتے ہیں۔ بس ٹھیک ہے کسی کا کچھ بگڑتا ہی نہیں ہے، یہ جتنے قاہر اور جابر نظام ہیں، پھر راوی عیش لکھتا ہے۔ پرستش کیے جاؤ، پوجا پاٹ اس کی کیے جاؤ، محکوم ہمارے رہو۔ جس عظیم انقلابی قوم نے یہ اعلان کیا تھا کہ ہم تیرے ہی محکوم ہوتے ہیں اور یہ اعلان جو تھا عوام سے ہی نہیں کرایا گیا تھا۔ پھر وہیں ہم آ گئے جہاں سے یہ آیت ہمارے سامنے آئی تھی۔ وہ سب سے برگزیدہ ہستی کہ جو بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر، خود اس نے یہ چیز کہہ دی۔ اندازہ لگایئے! یہ جو آپ کے ہاں کلمہ ہے کلمہ شہادت یا یہ کلمہ ہی کتنا بڑا انقلابی اعلان ہے نعرہ ہے انقلاب کا۔ اَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ میں اعلان کرتا ہوں اس چیز کا، شہادت دیتا ہوں، گواہی دیتا ہوں۔ لوگو! گواہ رہو اس بات کے کہ میرا اعلان یہ ہے۔

خدا کا آخری رسول ﷺ بھی خدا ہی کا عبد ہے حق حکومت کا حق اس کو بھی نہیں

اب یہاں الٰہ آ گیا صاحب، الٰہ کا ترجمہ تو ہم نے کر دیا معبود کہ خدا کے سوا معبود کوئی نہیں ہے۔ الٰہ کے معنی حاکم کے ہیں صاحبِ اقتدار کے ہیں۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ صاحبِ اقتدار دنیا میں کوئی نہیں ہے خدا کے سوا، وَحۡدَہٗ صرف وہ ایک ہے، لَا شَرِیۡکَ لَہٗ کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں۔ کتنا بڑا اعلان ہے۔ اب ذہن میں آیا کہ! اتنی بڑی عظیم ہستی رسول ﷺ کی کہ جس نے آ کے یہ اعلانات تمہیں سکھائے ہیں۔ کہا اور تو اور رہا وَاَشۡھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ اور یاد رکھو! میں اس کا بھی اعلان کرتا ہوں کہ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ یہ بہت بڑی ایک ہستی ہمارے ہاں ہے، کم از کم اسے تو یہ حق حاصل ہونا چاہیے۔ دنیا کی ہر مذہب پرست قوم نے

یہ کیا تھا اور کچھ نہیں تو اپنے بانی مذہب کو تو الوہیت کے اندر شریک کر لیا تھا۔ یہاں جڑ کاٹ کے رکھ دی اس چیز کی ایک سانس میں یہ دونوں اعلان: صاحبِ اقتدار صرف خدا کی ذات وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ اور دنیا کی عظیم ترین ہستی کہ ہو سکتا تھا کہ ہم اس کو اس میں شریک کر لیتے' اس کے متعلق بھی میں خود اعلان کرتا ہوں کہ وہ خود خدا کا عبد ہے' ایمان ہمارا یہ ہے کہ اس کا پیغامبر ہے۔ اور یہ چیز ہے **هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ** (6:18)۔

پوری کائنات میں غلبہ صرف ذات خداوندی کو ہے۔ کسی دوسرے پر غلبہ جمانے کی کوشش نہ کی جائے

قہاریت صرف خدا کو زیب دیتی ہے وہی حاکم ہو سکتا ہے' اسی کا غلبہ ہو سکتا ہے' کسی اور انسان کا نہیں ہے۔ یہاں دوسرے پر کسی کی بالا دستی کب چلتی ہے؟ جب کوئی شخص تنہا رہ جاتا ہے۔ جس کے ساتھ جتھہ ہوتا ہے' دوسرا ذرا سوچ سمجھ کے ہاتھ ڈالتا ہے' بہت بڑی برادری ہے' بہت بڑا جتھہ ہے اور آج کی اصطلاح میں بہت بڑی پارٹی ہے۔ دیکھا آپ نے کہ یہ کتنی بڑی چیز ہو جاتی ہے۔ اس کو تو قوت ہوتی ہے اور جو تنہا رہ جاتا ہے اس پہ ہر شخص ہاتھ ڈالتا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ آپ کو کیا تلقین کی گئی **فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ** (93:9) جو تنہا رہ گئے کہیں معاشرے میں' یاد رکھو! کبھی اس کے اوپر غلبہ اپنا مت جتاؤ۔ جو تنہا نہیں ہے اس پہ تو تم بھی نہیں جتاؤ گے' پتہ ہے ''بھتاڑ سیک دین گے''۔ یہاں تمہیں جرأت ہو سکتی ہے کہ یہ تنہا ہے وہاں ضرورت پیش ہے یہ کہنے کی **فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ** (93:9) جو اکیلا رہ جائے دنیا کے اندر۔ یاد رکھئے! عربی زبان کے اندر اکیلے رہ جانے والے کو یتیم کہتے ہیں۔ یہ شاعری میں تو یہ چیز ہم استعمال کرتے ہیں حقائق کی اور عملی دنیا کے اندر یہ معنی نہیں لاتے۔ جو تنہا رہ جائے کبھی اس کے اوپر دست درازی اختیار نہ کرو۔

قرآن حکیم کا ایجاز ''قاہر'' کے ساتھ ''حکیم'' کے لفظ کا استعمال کیوں اور کیسے؟

وہی خدا کی صفتِ قہاریت انسانوں کے اوپر جب آئے گی تو یہی چیز ظلم اور استبداد ہو جائے گا۔ خدا کے ہاں جب یہ چیز آئے گی تو یہ چیز اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کی طرف توجہ دلانے والی ہوگی اور قرآن تو عزیزانِ من! قرآن ہے' یہاں **وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ** (6:18) کہا تو ہو سکتا تھا نا کہ اکیلا یہی لفظ ذہن میں آتا تو تھوڑا سا یہ آجاتا کہ قاہر ہے۔ کہا **وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ** (6:18) حکیم تو قاہر نہیں ہو سکتا (ہمارے معنوں کے اندر) دو متضاد چیزیں ہیں۔ وہ ظالم اور مستبد جابر قاہر جو ہے اس میں دانش اور دلیل اور برہان اور حکمت کا تعلق کیا۔ وہ تو سرتاپا ان تمام چیزوں کو توڑ کے جبر و جور کر رہا ہوتا ہے۔ تو کہا کہ قاہر کے معنی یہ نہ لے لیجیے گا کہ وہ ڈکٹیٹر شپ کا ایک استبداد ہے جس نے جکڑا ہوا ہے۔ قانون ہے ہمارا اور قانون حکمت پر مبنی ہے اس کی ہم دلیل دیتے ہیں سمجھاتے ہیں Logical ہے وہ ہمارا قانون جو ہے' وہ بتاتا ہے کہ اس قسم کا Cause ہو تو اس کا Effect کیا ہوتا ہے' اس قسم کا عمل ہو تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ اسے عزیزانِ من! حکمت کہتے ہیں۔ یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ قانون بھی اس نے نازل کیا اور حکمت بھی اس نے نازل کی اس کے معنی

ہیں کہ وہ قانون صرف یہ نہیں' نافذ کر دیا کہ کل سے یہ ہوگا۔ وہ پہلے یہ بتاتا ہے کہ یہ ہم کیوں کہتے ہیں کہ کل ایسا ہونا چاہیے۔ جب کسی قانون کے ساتھ اس کی کیوں سمجھا دی جائے اور پھر وہ کیوں بھی کسی ایک شخص کے ذاتی دماغ کی افتاد نہ ہو بلکہ الخبیر کی ہو' وہ اس لیے کہ ہمیں ساری معلومات ہیں' بہت باخبر ہیں' ہم جانتے ہیں' ہم انسانوں کی ضروریات کو' معاشرے کی ضروریات کو۔ اس سے باخبر ہیں حکمت پرمبنی قانون ہے۔ لیکن قانون کو صاحبِ قوت ہونا بڑا ضروری ہے وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ (6:18) اتنے اعلانات کے بعد کہا کہ میں نے ابھی کہا تھا کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ یہ شہادت ہے۔

کلمۂ شہادت کی روح جو ایک عظیم حقیقت کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے

شہادت کا لفظ آیا اب اس کو کلمۂ شہادت کہتے ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ اس کے استعمال کا یا اعلان کا' ہمارے ہاں ایک ہی موقع ہوتا ہے کلمۂ شہادت اور پیچھے سے کوئی نہیں آواز دے سکتا۔ وہ اگلا جو ہے جو جنازے کا کندھا بدلتا ہے' ہمارے ہاں اب یہ لفظ وہیں استعمال ہوتا ہے۔ بہرحال۔ قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً (6:19) کہا جو کچھ یہ کہا جا رہا ہے اس کے لیے شہادت درکار ہے تم کو۔ کونسی شہادت سب سے بڑی ہو سکتی ہے اکبر قُلِ اللّٰهُ شَهِيْدٌۢ بَيْنِىْ وَ بَيْنَكُمْ (6:19) اپنی طرف سے میں نہیں کوئی شہادت پیش کرتا' اسی کا قانون' اسی نے اس قانون کی حکمت بتائی' وہی اس کی شہادت دیتا ہے صاحب۔ قانون بنانے والا ایک Witness کی حیثیت سے بھی تمہارے سامنے کھڑا ہے' شہادت بھی دیتا ہے اس چیز کی کیوں قانون بنایا۔ اس قانون نے کیا کیا نتائج پیدا کیے تم Question کر سکتے ہو وہ بتائے گا۔ اب یہ شہادت کہاں سے آئے گی۔ اللہ میاں تو عرش پہ ہیں کبھی دیکھے بھی نہیں جا سکتے تو یہ تو سمن بھی Serve نہیں ہونگے ان کے اوپر (آج کی اصطلاح میں عرض کر رہا ہوں) تو یہ شہادت کس طرح سے یہاں آئے گی۔ بڑی لطیف چیزیں قرآن بتا رہا ہے عزیزانِ من!۔ وہ جو پہلا سوال ہمارے ہاں پیدا ہوا کرتا ہے کہ Sovereignty belongs to Allah اقتدارِ اعلیٰ خدا کو حاصل ہے۔ کہنے والوں کو بھی یہ پتہ ہے کہ شاعری کر دی ہے۔ نہ خدا سامنے آئے نہ کبھی وہ Sovereign تسلیم ہو۔ یہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یا 786 کی طرح اوپر لکھ دیجیے اور نیچے پھر اس آئین میں' قانون میں' دستور میں جہاں بھی یہ چیز کہ وہ People کا فیصلہ جو ہوگا' Majority کی رو سے جمہوریت ہوگی۔ ان کا فیصلہ قانون بنے گا اور Sovereignty belongs to the people کہیں آ جائے گا یہ سارا کچھ نیچے یہ لکھا ہوا ہوگا' اوپر 786 ہوگا یہ Sovereignty belongs to Allah۔ تو اس لیے کہ کہا جائے گا کہ وہ تو ہے ہی نہیں یہاں۔ ٹھیک ہے۔ ارے یہ کیوں لکھ دیا؟ اس لیے کہ یہ حکومت کو اسلامی حکومت بنانا ہے' اس لیے یہ لکھ دیا اوپر اس کے۔ یہ بات نہیں ہے۔ قرآن ہے' خدا ہے' وہ اس قسم کی باتیں نہیں کرتا۔ یہ جسے آپ اقتدارِ اعلیٰ یا

People کے Sovereignty کہتے ہیں آخر میں Reduce کس چیز پہ آ کے ہو جاتی ہے۔خواہ وہ دنیاوی نظام کی رو سے People کے لیے ہو' Majority کے Rule کے لیے ہو' ڈکٹیٹر ہو' ایک فرد ہو' Presidential System جسے آپ کہتے ہیں وہ ایک Constitution بناتا ہے ۔ اس کی Sovereignty جو ہے اس حد تک ہے کہ ایک Constitution بناتا ہے Constitutioning Authority جو ہے' Constitution ہوتا ہے وہ Sovereignty ۔اس کا اقتدارِ مطلق اس Constitution کے اندر آ جاتا ہے یہی ہے نظام دنیا کا۔اس نے کیا کہا؟ اس نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے اقتدارِ اعلیٰ' اقتدارِ مطلق جو ہے' یہ خدا کی ہے لیکن کیسے ہوگا؟ سنئے عزیزانِ من! جھوم جایئے قُلِ اللّٰهُ شَهِيْدٌۢ بَيْنِىْ وَ بَيْنَكُمْ (6:19) تو کیسے یہ چیز آئے گی وَ اُوْحِىَ اِلَىَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ (6:19) یہ قرآن جو میری طرف اس نے وحی کر کے دیدیا ہے۔اس نے کہا ہے ہم ہیں Sovereign Authority اور ہماری Sovereign Authority ہمارے بنائے ہوئے اس Constitution کی رو سے Exercise ہوگی۔قرآن دیدیا۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ صرف ایک ہی وحی ہے جسے قرآن حکیم میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے

دیکھتے ہیں کہاں آتا ہے وَ اُوْحِىَ اِلَىَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ (6:19) یاد رکھئے! یہاں یہ چیز بھی ثابت ہوگئی کہ وحی صرف قرآن کے اندر ہے قرآن سے باہر کہیں وحی نہیں ہے۔ یہ آپ کے سارے کے عقائد جتنے بھی ہیں کہ وحی دو قسم کی ہوتی ہے کچھ قرآن میں ہے کچھ قرآن کے باہر ہے بلکہ وہ تو یہاں تک ہے کہ 1/9 حصہ قرآن میں ہے 9/10 حصہ باہر ہے۔کہتا ہے وَ اُوْحِىَ اِلَىَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ (6:19) یہ وحی ہے' قرآن ہی ہے جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے یہی ہے اس کا Constitution یہی ہے اس کا دستور اسی کی رو سے اس کی Sovereignty جو عمل میں آئے گی۔ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ (6:19) یہی ہے وہ قرآن۔ دیکھئے پھر اس کو قرآن نے مقید کر دیا لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ (6:19) یہی وہ Constitution ہے خدا کا عطا کردہ جس کی رو سے میں تمہیں قانون شکنی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا ہوں۔

قرآن حکیم وہ غیر متبدل آئین ہے جس کی خلاف ورزی بغاوت تصور کی جائے گی

کاہے کے لیے یہ Constitution بنتا ہے یہاں؟ اس کی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی' Constitution کی خلاف ورزی بغاوت ہوگی۔اس کے تحت بنائے ہوئے قوانین کی خلاف ورزی جرم ہوگی۔ مقصد ہی یہ ہوتا ہے تا کہ آگاہ کر دیا جائے کہ تم

نے کن حدود کے اندر رہنا ہے۔ تمہاری آزادی اور پابندی کن حدود سے گھری ہوئی ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو میں نے دہرائے جو قائدِ اعظمؒ نے 1941ء میں یہ بتانے کے لیے کہ اسلامی مملکت کسے کہتے ہیں، حیدر آباد دکن میں استعمال کیے۔ ہماری آزادی کے معنی یہ ہیں کہ آزادی اور پابندی خدا کی حاکمیت کے اندر گھری ہوئی ہے جس کی عملی تنفیذ کا ذریعہ اس کی کتاب قرآنِ کریم ہے۔ لہٰذا جسے ہم قرآن کا Constitution یا کسی مملکت کا Constitution کہتے ہیں وہ ہوتا کیا ہے؟ وہ کچھ حدود مقرر کرتا ہے کہ اس حدود کے اندر رہتے ہوئے تمہیں آزادی حاصل ہے اس حدود سے تجاوز کرو گے، بغاوت ہو جائے گی۔ اسی لیے خدا نے قرآن کے متعلق بھی حدود اللہ کہا ہے۔ حدود ہیں، وہ Boundry Lines ہیں ان کے اندر رہتے ہوئے تم آزاد ہو ان سے تجاوز نہیں کر سکتے، Unconstitutional ہو جائے گا آج کی اصطلاح میں۔ یہاں لفظ ہے لِاُنۡذِرَكُمۡ بِهٖ (6:19) تاکہ میں تمہیں آگاہ کر دوں Warn کر دوں تمہیں کہ یہی ہیں وہ حدود ان سے باہر نہیں جا سکتے ان کے اندر رہنا ہوگا۔ لِاُنۡذِرَكُمۡ (6:19) تاکہ میں تمہیں آگاہ کر دوں۔ اب اس سے تو نظر آتا تھا کہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے جو مخاطب قوم تھی اس کے متعلق یہ بات کہی گئی ہے، ٹھیک ہے انہیں آپ ﷺ نے آگاہ کر دیا انہوں نے سن لیا بات ختم ہوئی۔ آج جو کہا کرتے ہیں کہ تیرہ سو سال پہلے یہ ٹھیک چلتا تھا اس زمانے کی بات ہے آج کے لیے تو یہ بات نہیں ہے۔

ختمِ نبوت کا مقصد ہی یہ تھا کہ نبی اکرم پر کی گئی وحی کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جائے

یہ خدا کا کلام ہے وہ تمہارے ان اعتراضات سے واقف تھا۔ لِاُنۡذِرَكُمۡ بِهٖ وَ مَنۡۢ بَلَغَ (6:19) اور قیامت تک جس تک یہ پہنچے، ان سب کے لیے یہی Constitution ہے۔ آپ دیکھتے ہیں ختمِ نبوت ﷺ کی مہر کس طرح سے واضح طور پہ سامنے آ جاتی ہے۔ وہی مخاطب نہیں، وہی خاص دور نہیں، خاص زمانے تک صرف یہ نہیں کہ Constitution enforce رہے گا، بالکل نہیں۔ تمہارے لیے بھی و من بلغ قیامت تک جہاں جہاں جس تک یہ پہنچے گا۔ اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ وہ اس کو Accept کریں گے تو ان کے لیے یہ Constitution بنے گا خدا کا۔ اَئِنَّكُمۡ لَتَشۡهَدُوۡنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخۡرٰى (6:19) تو کیا تم یہ کہتے ہو کہ نہیں یہ صرف خالص خدا ہی نہیں، اسی کا ہی قانون نہیں، اس کا آئین نہیں، اس کے ساتھ اور بھی کچھ اِس میں سے لے لیا جائے کچھ اُس میں سے لے لیا جائے اور ملا کے بنا لیا جائے۔ کہتا ہے یہی تو شرک ہے۔ کسی Constitution میں دنیا کی کسی دوسری مملکت کی Constitution کا ایک ٹکڑا بھی نہیں ملایا جا سکتا۔

بغاوت کا جرم انسان کے تمام اعمال کو برباد کر دیتا ہے

اطاعت جو ہے وہ توحید چاہتی ہے۔ کسی مملکت کے ہاں جس کے اندر تم رہتے ہو، جس کی تم رعایا بنو گے۔ یہ جو چیز ہے کہ کچھ یہاں کی کچھ وہاں کی۔ دہرا دوں میرے سامنے ہی تو ہے وہ آیت۔ کہ جتنا ہم کرتے ہیں بہر حال اس کا تو ثواب مل ہی جائے گا یہ چیز تو ہو

ہی جائے گی۔ بات سمجھنے کے لیے میں پوچھتا یہ ہوں کہ جس پر بغاوت کا جرم عائد ہو جائے پھر وہ یہ کہہ کے چھوٹ جایا کرتا ہے کہ میں نے تو بڑے چندے دیے تھے آپ کے ہسپتال بنانے کے لیے' ڈپٹی کمشنر کے فنڈ میں یہ کچھ دیا' میں نے تو کبھی بھی Keep to the left کا قانون جو ہے اس کو توڑا نہیں ہے؟ کوئی اس کی نہیں سنائی ہوگی **اُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ** جو جرم بغاوت ہے' اس کے بعد یہ جس کو آپ اعمالِ حسنہ کہتے چلے آ رہے ہیں' کوئی قیمت ان کی نہیں رہتی پھر۔ خدا کی حاکمیت یا اس کے آئین کی بالا دستی سے انکار بغاوت ہے۔ اس کے بعد یہ کہتے ہو کہ جو کافروں کے نیک اعمال ہیں' ان کا بھی تو بدلہ ہونا چاہیے۔ بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ آپ اپنے ہاں یہ سوچیے کہ کسی مملکت کے آئین سے سرکشی برتنا اس سے انکار کر دینا اس کے بعد اس مملکت کے اندر رہتے ہوئے کتنے ہی امن پسند شہری آپ کیوں نہ رہیں ساری عمر' کوئی آپ کو اس کا کریڈٹ ملتا ہے؟ قطعاً نہیں ملتا۔ بنیادی چیز ہے۔

کوئی مملکت دوسری مملکت کے آئین کو اپنے آئین کا حصہ نہیں بناتی

اور اگر یہ چیز ہو جائے کہ ہم انکار تو نہیں کرتے کچھ اس کا حصہ لے لیتے ہیں اور یہ جو دوسری چیز ہے اس میں ہم یہ ساتھ ہی تو ہے ہمارے ہاں بھارت اس کا آئین بڑا اچھا آئین ہے بڑے اچھے قانون ہیں کچھ ہم وہاں سے لے لیتے ہیں اپنے ہاں۔ ایک فرد اگر یہ کہے کہ اتنے حصے تک تو میں نے آپ کی اطاعت کی تھی اور اتنا حصہ میں نے وہاں سے لیا تھا تو کیا یہ چیز ہوگی پھر کہ جتنا حصہ تم نے یہاں لیا اس کا تو ثواب مل جائے جتنا دوسرا لیا اسکا نہ ملے؟ سنئے! **اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَ تَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ** (2:85) آئین پہ عمل نہیں بلکہ مجھے آئین سازی کے سلسلے میں کہنا چاہیے کہ تو آپ لے لیں قرآن سے اور کچھ حصہ جو ہے اس کو چھوڑ کر کہیں اور سے لے لیں کہ یہ چیز وہاں سے ہم لیتے ہیں۔ سنئے کیا کہتا ہے کہ کیا تم یہ کرنا چاہتے ہو اور توقع یہ رکھتے ہو کہ پھر اتنے حصے کا تو تمہیں ضرور بدلا ثواب مل جائے گا۔ **فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ** (2:85) جو تم میں سے ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا' کیا نتیجہ ہوگا **اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا** (2:85) اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت اور رسوائی تمہارے ہاتھ میں ہوگی **وَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ**(2:85) یومِ مکافات میں پھر اس سے بھی زیادہ سزا میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں شرک کہتے ہیں۔ وہ جو ہم نے سمجھ لیا کہ وہ بت پرستی ہے اور مطمئن ہو گیا مسلمان کہ ہم بت پرست تو نہیں ہیں ہم تو مشرک نہیں ہیں۔ یہ ہے شرک: کچھ حصہ اس میں سے لیا کچھ حصہ جہاں سے اچھا نظر آیا' اچھا کیا جہاں مفید مطلب نظر آیا اسے لے لیا اور ذہن میں یہ کہہ دیا کہ ٹھیک ہے صاحب! یہاں سے بھی تو لے لیا ہے۔ **فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا** (2:85) اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ عملی دنیا میں عزیزانِ من! ایسا کر کے آپ دکھایئے کچھ حصہ آئین کا یہاں کا عمل کیجیے کچھ کسی دوسری مملکت کا کچھ قانون یہاں کے کچھ دوسرے کسی مملکت کے' کبھی نہیں بچ سکتے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ حقیقی لم

اَءِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی (6:19) کیا تم یہ گواہی دیتے ہو کہ خدا کے ساتھ اور بھی صاحبِ اقتدار ہیں ایک سے زیادہ مانتے ہو کسی کی اپنی مملکت کے اندر۔ Sovereignty قُلْ لَّآ اَشْهَدُ (6:19) کہا نہیں! میں تو اس کی نہیں گواہی دے سکتا میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا اس معاملے میں۔ یہ یہاں سے ہی ہے اَشْهَدُ کہ جہاں سے ہے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِیْکَ لَهٗ اس پہ مبنی ہے میں اعلان کرتا ہوں۔ کتنا انقلابی اعلان ہے عزیزانِ من! مسجد میں کھڑے ہو کے نہیں' مینارِ بلند کے اوپر جا کے ساری دنیا میں یہ اعلان کرنا کہ خدا کے سوا کسی اور کی Sovereignty کے ہم قائل نہیں ہیں' اسی کی حاکمیت ہم مانتے ہیں' کسی انسان کی حاکمیت ہم نہیں مانتے۔ وحدہ صرف اس کی لا شریک لہ اس میں کسی اور کو ہم شریک نہیں کرتے۔ قُلْ لَّآ اَشْهَدُ ج قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (6:19) اعلان کرو وہی الٰہ ہے صرف اسی کو اتھارٹی حاصل ہے' اسی کی حاکمیت ہے واحد اکیلے کی۔ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (6:19) تم جو اس کے ساتھ اور کی حاکمیت کو' اور حاکموں کو شریک کرتے ہو' میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ کہا یہ ہے ہمارا اعلان' یہ ہے بنیاد ہمارے دستور کی' اس کی ہم شہادت دینے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جتنے بھی انبیائے کرامؑ خدا کی طرف سے آتے رہے ان کا یہی پیغام ہوتا تھا۔

ہر نبی کا اعلان توحید پر مبنی تھا تا کہ کوئی شخص دوسرے کا غلام نہ رہے

آپ قرآنِ کریم میں دیکھئے انبیائے سابقہؑ کے تذکارِ جلیلہ جہاں جہاں آئیں گے' ہر رسول کے متعلق یہ ہے۔ ہم نے قومِ نوحؑ کی طرف نوحؑ کو بھیجا اس نے آ کے یہ کہا اُعْبُدُوا اللّٰهَ (4:36) پہلی بات وہ رسول یہی کہتا ہے صرف ایک خدا کی حاکمیت اختیار کرو۔ یہ انقلابی پروگرام آتا اس لیے تھا عزیزانِ من! کہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی اور محکومی سے نجات دلائے۔ اس لیے اس کا اعلان ہوتا تھا اُعْبُدُوا اور اگلی چیز یہ ہوتی تھی کہ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (25:57) اس میں میرا کوئی ذاتی فائدہ نہیں یہ میرا پروفیشن نہیں ہے میں اس کے بدلے میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ دوسرے کے Sincere ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کا اس میں اپنا کوئی ذاتی مفاد نہ ہو۔ دیکھا ایک سانس میں ہی قرآن کتنی حقیقت کو بیان کر جاتا ہے۔ ہر نبی آ کے یہ اعلان کرتا تھا اُعْبُدُوا اللّٰهَ (4:36)۔

ذہنی سطح تک حق بات کو تسلیم کرنے کے باوجود یہ خودکشی کیوں؟

اس لیے کہا کہ یہ جو اہلِ کتاب ہیں انہیں بھی اس کا علم ہے کہ ان کے انبیاء نے بھی ان سے یہی کہا تھا۔ اس لیے جب قرآن اس تعلیم کو دہراتا ہے تو یہ اچھی طرح سے پہچانتے ہیں۔ اس کو کہ بات یہ صحیح ہے یہ ہے ہی خدا کی طرف سے۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ

يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ (6:20) اچھی طرح پہچانتے ہیں جیسے باپ اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے ماں باپ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ صحیح تعلیم یہی ہے۔ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (6:20) اور پھر یہ جو ایمان اس کے باوجود اس پہ نہیں لاتے ہیں تو کیا بات ہے؟ اپنے آپ کو تباہ کرنے پہ تلے بیٹھے ہیں۔

زندگی کے مختلف شعبوں میں مذہبی پیشوائیت کے کردار کا ذکر

خودکشی کرنے والا اس لیے جاہل نہیں ہوتا کہ سنکھیا مار دے گا' اس کو تو علم ہوتا ہے کہ سنکھیا مار دے گا۔ کہا جائے کہ یہ جو سنکھیا چاٹ رہا ہے یا پھانک رہا ہے وہ جانتا نہیں تھا کہ سنکھیا ہے' جو غلطی سے کھا جاتا ہے' اسے تو نہیں پتہ ہوتا اس کا۔ یعنی اسے مغالطہ ہو سکتا ہے۔ جو خودکشی کرنے والا ہو سنکھیا کھا کے' اسے تو اس پہ ایمان ہوتا ہے کہ سنکھیا مار دے گا۔ تو کہا کہ یہ لوگ اس کے باوجود کہ جانتے پہچانتے ہیں پھر اس حقیقت کو کیوں نہیں مانتے؟ کہا اس لیے کہ یہ خودکشی کرنا چاہتے ہیں۔ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (2:26) اپنی تباہی کرنا چاہتے ہیں آپ' اس لیے وہ اس پر ایمان نہیں لاتے اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ اپنی تباہی کیسے آ جاتی ہے؟ خدا کی حاکمیت کو چھوڑ کے انسانوں کی حاکمیت کے اوپر راضی ہو جانا اور سب سے بڑی حاکمیت تو یہ مذہبی پیشواء جو ہیں' اپنی قائم کراتے ہیں وہ نہیں اس طرف آنے دیتے۔ وہ ہیں جنہوں نے عبادت کا ترجمہ پرستش کر دیا انہیں یہیں تک رکھا۔ ان کی اس پرستش میں امامت خود لے لی۔ اتنی چار دیواری کے اندر ہی سہی یہ جتنے Personal Laws ہوتے ہیں اس کے اندر تو ان کی حاکمیت آ جاتی ہے نا۔ یاد رکھئے! جہاں بھی مذہب ہوتا ہے آپ کو معلوم ہے کہ میں دین اور مذہب میں فرق جو کرتا ہوں۔ دین تو خدا کی طرف سے دی ہوئی تعلیم کا نام' آئین کا نام ہے۔ مذہب مذہبی پیشواؤں کا بنایا ہوا مذہب ہوتا ہے' شریعت ہوتی ہے۔ مذہب پرست جہاں بھی ہوگا اس کو سیکولر نظامِ حکومت ہمیشہ راس آئے گا۔ دنیاوی معاملات حکومت کے پاس' شرعی معاملات ان کی تحویل میں۔ ایک مملکت کے اندر Dualism دو مملکتیں۔ یہ ان کی مملکت میں دخل نہیں دیتے وہ ان کی مملکت کے اندر دخل نہیں دیں گے۔ یہ شور مچاتے ہیں جب ان کی مملکت کے اندر کوئی دوسرا دخل دینے لگے۔ وہ دوسرا دخل دینے کی کونسی چیز ہے؟ شرعی قوانین (Personal Laws) شخصی قوانین نکاح طلاق عدت وغیرہ مہر کے مسائل' یہ انہوں نے اپنے پاس رکھے۔ انگریزوں کی حکومت کے زمانے کی یہ بات تھی۔ وہ سیکولر گورنمنٹ چاہتے تھے انہوں نے بھی کہا کہ ہمیں اس سر دردی سے کیا لینا ہے' کس کا نکاح کس کے ساتھ ہو گیا'' کیہدی بیوی کیہدے نال نٹھ گئی''۔ انہوں نے کہا نبڑتے پھرو۔ انہوں نے یہ شخصی قوانین اپنے ہاتھ میں رکھے وہ سیکولر گورنمنٹ تھی۔ یہاں آ گئے اعلان ہو رہا ہے کہ اسلامی حکومت بن رہی ہے۔

اسلامی حکومت کی شناخت......اس میں کوئی شخص محکوم ہوگا اور نہ ہی محتاج

اسلامی حکومت کے معنی یہ ہیں کہ Dualism یا ثنویت وہاں نہیں رہتی۔ اسلامی حکومت زندگی کے ہر شعبے اور ہر گوشے کے اندر قانون اسلامی نافذ خود کرتی ہے وہاں دو اتھارٹیز نہیں ہوتیں کہ Public Laws میں اور اتھارٹی ہو Personal Laws میں اور اتھارٹی ہو۔ اعلان ان کا پہلے دن سے کہ اسلامی نظام یہاں نافذ کریں گے۔ کیفیت یہ کہ Personal Laws جو بنے ہوئے چلے آرہے تھے جو ان کی تحویل میں تھے، حکومت نے پہلی دفعہ Family Laws بنائے اور اس نے کہا کہ ان امور کا فیصلہ حکومت کی طرف سے قائم کی ہوئی عدالت کرے گی۔ شور مچا دیا' دہائی مچ گئی خلافِ اسلام' خلافِ قانون' شریعت کے خلاف۔ محاذ قائم کر لیے یہ کہا کہ ہم اس کے خلاف بغاوت کر دیں گے یہ دخل اندازی ہے' مداخلت فی الدین ہے۔ کیا ہے جی مداخلت فی الدین؟ کہ یہ جو شخصی شریعتوں کے احکام ہماری تحویل میں تھے جس میں ہماری حکومت تھی حکومت ان کو اپنی تحویل میں کیوں لے رہی ہے۔

اسلامی حکومت میں مذہبی اجارہ داری کا کوئی وجود نہیں ہوتا

وہ جانتے ہیں اس چیز کو کہ اسلامی حکومت میں Dualism نہیں ہوتی۔ وعظوں میں وہ بھی تو کہتے رہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اور خلافتِ راشدہ کے زمانے میں کہیں یہ صورت نہیں تھی کہ نکاح اور طلاق کے مسائل حل کرنے کے لیے وہ مولویوں کی طرف جاتے تھے' ان کا وجود ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ خود بتاتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں ایک عورت آئی اس نے آ کے عدت کا مسئلہ پیش کیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی عدالت میں ایک آئی اس نے مہر کا مسئلہ پیش کیا۔ ان کی عدالت میں آتے تھے۔ کہیں آپ کو نہیں بتائیں گے کہ وہ گئی مفتی صاحب کے پاس' اس نے قاضی صاحب سے فتویٰ لیا' کہیں نہیں۔ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (6:20) خوب پہچانتے ہیں اس بات کو۔

ایک نکاح اور تین مختلف فیصلے نتیجہ زندگی اجیرن

اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (6:20) اپنے آپ کو تباہ کرنے پہ تلے ہوئے ہیں اس لیے اس طرف نہیں وہ آتے اس سے بڑی تباہی کیا ہو سکتی ہے۔ ایک مسئلہ ان کے سامنے لے آیئے کہ یہ نکاح ہوا تھا یا نہیں ہوا تھا۔ مختلف فرقے تو الگ الگ رہے کہ الگ الگ فیصلہ دیں گے ایک ہی فرقے کے مفتی صاحبان (طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں یہ آیا ہوا ہے آپ دیکھئے گا) سوال اتنا تھا کہ ایک لڑکی کا نکاح اس کے باپ نے لڑکی کے نابالغ ہونے پہ بچپن میں کر دیا کہیں' لڑکی بڑی ہوئی' اس کے بعد انہوں نے پوچھا یہ تھا کہ نکاح یہ جو ہے قائم ہے۔ نہیں ہے تو پھر یہ دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے تو پہلا نکاح کیسے ٹوٹ سکتا ہے؟۔ روز ہمارے ہاں ہوتا

ہے یہ قصہ۔ایک ہی School of thought ہے مذہب ہے حنفی' شریعت ایک ہی ہے۔اسی حنفی فرقے کے تین مفتی ہیں بڑے بڑے جلیل القدر جناب۔اتنے بڑے بڑے جلیل القدر اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ جس آئین پہ ہماری مہر نہیں لگی ہوئی ہوگی' وہ اسلامی نہیں ہوسکتا۔بہت بڑا دعویٰ ہے۔اور کیفیت یہ ہے کہ تینوں کے فتوے مختلف ہیں ایک دوسرے سے۔اس سے بڑی تباہی بھی اور ہوسکتی ہے کسی قوم کی کہ جس میں تفرقہ اور اختلاف اس حد تک پہنچ چکا ہوا ہو۔اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ(6:20)

شریعت کے نام پر پیش کردہ فتوے جو ذاتی سوچ اور تصورات پر مبنی ہوں' قرآن حکیم انہیں ظلم قرار دیتا ہے

اور آگے ان کی بات آ گئی۔وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (6:21)اللہ اکبر۔اس سے زیادہ ظالم اور کون ہوسکتا ہے۔اب دو یہاں شقیں گنائیں۔ایک تو یہ چیز کہ اپنی طرف سے بات کہے اور کہے یہ خدا کی شریعت ہے۔جتنے فتوے یہ دیں گے اس پہ آپ دیکھیں گے یہی کہ خدا اور رسول کی شریعت یہ کہتی ہے۔اپنی طرف سے بات کرے اور کہے کہ یہ خدا کا قانون ہے' اس سے زیادہ ظالم بھی کوئی ہوسکتا ہے۔آپ کو معلوم ہے عربی زبان میں ظلم کے معنی کیا ہیں؟ یہ چیزیں تو بیسیوں دفعہ ہمارے ہاں آ گئیں دہراتا چلا جاتا ہوں میں۔ظلم کہتے ہیں کہ جس شے کو جس مقام پہ ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو یا اس سے نیچے ہو یا اس سے اوپر ہو' شے یا اشخاص۔جہاں جس شخص کو ہونا چاہیے' وہ وہاں نہ ہو۔کتنی جامع اصطلاح ہے عزیزانِ من! یہ کیا زبان تھی یہ۔جو جہاں ہونا چاہیے اس سے اونچا اس کو پہنچا دیجیے یہ بھی ظلم ہے اس سے نیچے رکھئے اس سے آگے جانے نہ دیجیے جہاں اس نے جانا ہوا اپنے جوہرِ ذاتی کی بناء پر وہاں نہ جا سکتا ہو یہ بھی ظلم ہے۔جس بات کا جو مقام ہے' وہ اس مقام کے اوپر نہ رکھی جائے وہ بھی ظلم ہے۔تمہارا فتویٰ' کہو کہ میری رائے یہ ہے میری بصیرت یہ کہتی ہے یہ بات اپنے مقام پہ ہے۔یہ کہ خدا کی شریعت کا یہ فیصلہ ہے' ظلم ہے۔

خدا کے فیصلوں کو کھلے بندوں منسوخ کرنے کا اعلان ظلم عظیم ہے

اس کے بعد کہتا ہے پہلی تو یہ چیز ہے کہ یہ ظلم ہے پھر دوسری چیز یہ کہ واقعی خدا کا فیصلہ اس کے سامنے آئے' قرآن آئے اور وہ کہے کہ نہیں میں اسے نہیں مانتا۔آپ کہیں گے کہ اتنی جرآت تو نہیں کوئی کرتا ان میں سے بھی کہ وہ دھڑلے سے کہدے کہ نہیں میں نہیں مانتا۔آپ کو معلوم ہے کہ یہ شریعت ان کے ہاں کی جو مرتب ہوئی ہے اس کی بنیاد کن چیزوں کے اوپر ہے۔پہلی بنیاد ان کے ہاں کی یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے بیشمار احکام ایسے ہیں جو منسوخ ہو چکے ہیں۔خدا نے نہیں کہا یہ کہ میرا یہ فلاں حکم منسوخ ہے' کہیں نہیں قرآن میں یہ آیا کہ منسوخ ہے' کہہ دیا کہ منسوخ ہے۔یہ تکذیب نہیں تو اور کیا ہے کہ قرآن کا ایک حکم سامنے لائیے وہ کہیں کہ میں اسے مانتا نہیں' یہ تو

منسوخ ہے۔ارے بھئی! وہ حکم دینے والے نے قانون بنانے والے نے تو کہیں نہیں لکھا کہ یہ منسوخ ہے۔وہ نہ لکھے' ہم جو کہتے ہیں یہ منسوخ ہے۔ یہ انہوں نے خود کہا ہوا ہے کہ منسوخ ہے خدا نے نہیں کہا ہوا۔ پہلا عقیدہ یہ نکلا: قرآن کی آیتیں قرآن سے منسوخ۔ بہت سے احکام ایسے تھے جن کے متعلق یہ خود بھی نہیں بتا سکتے تھے یعنی خود ہی وہاں اتنے عاجز آ گئے کہ یہ بات بھی نہ چل سکی۔ پھر قرآن کی آیتیں روایات سے منسوخ۔اور آگے آیئے۔ یہ دونوں چیزیں فقہ کے آئمہ کے اقوال سے منسوب۔تو یہ جو چیز ہے اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ (6:21) آیاتِ خداوندی' احکامِ قرآنی کی یہ عملاً تکذیب نہیں ہے۔ یہ کہا جائے کہ نہیں صاحب! اس کا حکم ہی باقی نہیں رہا ہوا' منسوخ ہے۔اس سے زیادہ کہا کون ظالم ان لوگوں سے ہوسکتا ہے۔خود گھڑیں خدا کی طرف منسوب کریں۔

ایک قدم اور آگے خدا سے براہِ راست پوچھ لینے کا دعویٰ

یہ تو آراء ہیں' اس سے بھی آگے جو چیز ہے کہ ہم براہِ راست یہ پوچھ کے آتے ہیں وہ براہِ راست ہم کو یہ بتایا کرتا ہے۔کشف اور الہام کے اتنے اتنے دعاوی اتنی بڑی چیز۔اپنے ذہن کی پیداوار شعوری یا غیر شعوری طور پر: یہ خدا کی طرف سے آیا ہوا ہے۔ یہ چلتا ہے۔قرآن سے ذرا ہٹ جایئے تکذیب ہوتی ہے عملاً خدا کے احکام کی۔اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (6:21) یاد رکھو! یہ اصول وہ کہتا ہے ہمارا: ظالم کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی۔ یہ ٹھیک ہے ان چیزوں سے کچھ وقت کے لیے مفاد تو حاصل ہوسکتا ہے لیکن یہ کھیتیاں کبھی فصل نہیں پیدا کر سکتیں' ہو نہیں سکتا۔ بڑی جامع چیز ہے عزیزانِ من! اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (6:21) پنپ نہیں سکتی۔

ظہورِ نتائج کی تصور کشی کا منظر

وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (6:22) جب نتائج سامنے آئیں گے ان غلط اعمال کے تو پوچھا جائے گا کہ وہ جو آپ کہتے تھے کہ نہیں! اکیلا خدا ہی نہیں' اس کا قانون نہیں کوئی اور بھی ہیں جن کے قانون چلتے ہیں تو بتایئے یہ نتائج تو خدا کے قانون کے مطابق نکلے ہیں۔کہاں ہیں وہ قوتیں جن کے متعلق تم اپنے ذہن میں سمجھتے تھے تَزْعُمُوْنَ (6:22) کہ وہ اس کے قانون کو الٹ سکتی ہیں' کہاں ہیں وہ قوتیں تمہاری؟ ۔نہیں الٹ سکتا کوئی۔ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَ اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (6:23) وہاں کوئی جواب نہ ہوگا سوائے اس کے کہ وہ کہیں کہ نہیں صاحب! اللہ جانتا ہے ہم تو نہیں شرک کیا کرتے تھے بالکل نہیں ہم نے ایسا کیا۔ وہاں جواب ہی نہیں کوئی اور بن پڑے گا۔یعنی اتنی محکم شہادت سامنے آ جائے گی' بین ثبوت آ جائے گا مجرم کے سامنے' وہ انکار کی مجال اور جرأت اس کو نہیں ہو سکے گی' ہو ہی نہیں سکتا۔وہ کہتا ہے کہ آگ میں انگلی ڈالنے سے جل جائے گی' وہ کہتا ہے غلط ہے نہیں جلے گی۔انگلی آگ میں ڈال دی جاتی ہے' وہ جل جاتی ہے۔اس کے بعد انکار کسے

ہوسکتا ہے پھراس کے صحیح ہونے کا۔تو کہااس وقت پھرکیا ہوگا یہ کیا کریں گے۔کتنی عجیب انسان کی فطرت بتائی۔کہامکر جائیں گے میں نے تو یہ کہا ہی نہیں تھا کہ انگلی آ گ میں ڈالنے سے جلتی نہیں ہے میں نے تو نہیں کہا تھا۔یہ کہنے سے ان کا بنے گا کیا۔تم نے تو ڈال دی انگلی آ گ میں' وہ جل بھی گئی۔کہتا ہے اُنۡظُرۡ کَیۡفَ کَذَبُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ وَ ضَلَّ عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ (6:24) دیکھو! کس طرح یہ خود اپنی ذات کے خلاف جھوٹ بول رہے ہیں۔جلی ہوئی انگلی بتا رہی ہے کہ اس نے اس کہنے والے کی بات نہیں مانی تھی اور کہہ رہے ہیں کہ نہیں غلط کہتا ہے میں نے تو یہ نہیں کہا تھا۔نہیں کہا تھا تو انگلی کیوں ڈالی تھی اس آ گ میں۔اس قدر اپنے خلاف یہ پھر جھوٹ بول رہے ہیں۔جھوٹ کسی دوسرے کے خلاف نہیں اپنے خلاف بولتے ہیں۔

اپنا کیا ہوا جرم خود اپنے ہی سامنے

جب جرم سامنے آ جاتا ہے عزیزانِ من! وہ اس سے پہلے اپنی Defence میں جتنی غلط بیانیاں کی ہوئی ہوتی ہیں وہ اسکے خلاف جاتی ہیں ساری کی ساری۔اور بعض اوقات تو دو تین فرد جرم اور اس کے اوپر لگ جاتے ہیں۔پہلا جرم یہ پھر اس کے بعد دھوکہ دہی کا بھی پھر اس کے بعد وہ کاغذات میں خرد برد کرنے کا بھی۔بیسیوں چیزیں اور آ جاتی ہیں۔کہا دیکھو! کس طرح اپنے خلاف یہ سب کچھ بکتے چلے جاتے ہیں۔وَ ضَلَّ عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ (6:24) لیکن یاد رکھو! یہ چیزیں افتراء ہیں غلط بیانیاں وہ Document بدل دینے۔کہا سب چیزیں اس وقت بالکل ختم ہو جائیں گی وَ ضَلَّ عَنۡہُمۡ (6:24) کوئی نتیجہ نہیں برآمد کریں گی' تباہی لے آئیں گی ان کی یہ تمام چیزیں جتنی بھی ہیں۔یہ دنیاوی عدالتوں کے قانون نہیں ہیں جن میں اس قدر اسقام ہوتے ہیں کہ یہ ساری چیزیں بھی چل جاتی ہیں' چل سکتی ہیں۔وہاں نہیں چل سکتا یہ قانون۔وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّسۡتَمِعُ اِلَیۡکَ (6:25) کہتا ہے یہ تو ان کی کیفیت ہے دھڑلے سے کہنے والے کہ نہیں ہم یہ نہیں مانتے۔خیر کچھ یہ بھی مان لیں گے کچھ اور بھی مانیں گے یہ ہے جرأت سے انکار کرنے والے۔

منافقین کی ذہنی کیفیت اور سوچ

کہتا ہے' ایک طبقہ ان منافقین کا ہوتا ہے۔ان کی کیفیت ہی اور ہوتی ہے' عجیب ہوتی ہے۔وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّسۡتَمِعُ اِلَیۡکَ وَ جَعَلۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ اَکِنَّۃً اَنۡ یَّفۡقَہُوۡہُ وَ فِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَقۡرًا (6:25) کہتا ہے' آئے ہوئے ہیں تمہاری محفل میں بیٹھے ہیں۔جو تم کہہ رہے ہو سن رہے ہیں' ایسا نظر آتا ہے کہ جذب ہوئے ہوئے ہیں' اس کے اندر' اوہو! اس قدر اس میں دلچسپی ہی نہیں لیتے کھوئے ہوئے ہیں۔حالانکہ کیفیت یہ ہے کہ بیٹھے وہ یہاں ہیں' بظاہر نظر یہ آتا ہے تمہاری سن رہے ہیں' خیالات کہیں کے کہیں گئے ہوئے ہیں۔جو سنتے ہیں بیٹھے ہوئے سوچ رہے ہیں کہ اس کا توڑ کیا ہوگا' اس کی مخالفت کیسے کی جائے' سازش کیسے ہوگی' بہت آگے بڑھتا چلا جا رہا

ہے۔ کہنے لگا' کیفیت یہ ان کی ہو رہی ہے سن رہے ہیں تمہاری' خیال کہیں اور ہیں ارادے کچھ اور ہیں' نیتیں کچھ اور ہیں۔ کہتا ہے یوں سمجھئے کہ جیسے ان کے دلوں کے اوپر کچھ مہریں لگی ہوئی ہیں' پردے پڑے ہوئے ہیں' اس قسم کے غلاف پڑے ہوئے ہیں کہ باہر کی کوئی بات اندر جا ہی نہیں سکتی' کانوں میں گویا ڈاٹ لگے ہوئے ہیں۔ بات تو ہو رہی ہے فضا میں بھی پھیلی ہوئی ہے تو وہ بات تو خود اندر چلی جانی چاہیئے' وہ کہتا ہے وہ اندر تب جا سکتی ہے۔

کسی کی بات تسلیم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کی بات کو دل و دماغ سے قبول کریں

جو اندر یہ جو سننے کی' قبول کرنے کی' تمہارے ہاں قوت ذہن کی ہے' قلب کی ہے' اس کو بھی ساتھ ملاؤ۔ ورنہ عزیزانِ من! آپ کسی خیال میں غرق ہوں' آپ کو معلوم ہے روز جھگڑے ہوتے ہیں ان بچوں سے کہ ابا جی! میں نے صبح جاتے ہوئے آپ سے کہا تھا کہ شام کو یہ لیتے آنا' آپ پھر نہیں اس کو لائے۔ ارے بچے! کب کہاں تم نے کہا تھا؟ ابا جی میں نے کہا تھا' تم نے نہیں کہا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ جب میں کہہ کے گئی تھی کمرے سے جاتی ہوئی۔ اب ابا جی اس کے بعد ڈانٹتے بھی ہیں' ابا جی کا احترام بھی ہے اب یہ تو نہیں کہتی ہے کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ یہی وہ کہے جائے گی کہ ابا جی میں نے تو کہا تھا۔ ہوا کیا ہے؟ ابا جی اس وقت دو اور دو چار میں پھنسے ہوئے تھے یا کسی ناول کے اندر الجھے ہوئے تھے یا کسی چیز کے اندر وہ جذب تھے۔ وہ جو قرآن کہتا ہے آنکھیں رکھتے ہیں دیکھتے نہیں ہیں' کان رکھتے ہیں سن نہیں سکتے۔ یہ کیفیت ہوتی ہے۔ کہتا ہے یہ اس انداز سے محفلوں میں تمہاری بیٹھ جاتے ہیں' دل کہیں ہیں' ارادے کچھ ہیں' نیتیں کچھ ہیں۔ اور پھر اس لیے بھی قرآن ہی کے درس میں سہی کہ اتنا کچھ ہوتا ہے یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں' کوئی نہ کوئی چیز تو اسکی تائید میں مل ہی جائے گی بالآخر۔ کہیں جا کے تو کہہ دیں گے کہ ٹھیک ہے ہم جو یہ کر رہے ہیں' ایسا ہم نے خود سنا ہے کہ یہ کچھ ہوتا تھا۔ وَ اِنْ یَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا (6:25) کہتا ہے کہ جو یوں سنے کوئی بات' اس کے سامنے ساری دلیلیں لے آیئے آپ اس کے حق میں' کیا وہ اٹھتے وقت کہے گا کہ ہاں صاحب! میں مطمئن ہو گیا۔ اس نے تو کسی دلیل کو جذب ہی نہیں ہونے دیا اپنے اندر۔

اسلام اور قرآن اور شریعت وغیرہ کا اس قدر چرچا ہونے کے باوجود ہماری یہ ناگفتہ بہ حالت کیوں

آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ جس قدر یہاں اسلام اسلام اسلام قرآن شریعت دین جتنا چرچا اسکا ہو رہا ہے اس تیئس سال میں کبھی تیرہ سو سال میں بھی اتنا چرچا نہیں سنا ہوگا ہر شخص کی زبان پہ یہ سارا کچھ ہے' دن رات اٹھتے بیٹھتے یہ چرچا ہو رہا ہے۔ اور اس کے بعد کبھی آپ نے دیکھا کہ کسی کے دل میں بھی یہ اترا ہے جو کچھ یہ ہو رہا ہے۔ یہ ہو کیا رہا ہے؟ ایک مصلحت ہے جس کی خاطر یہ چرچا بھی ضروری ہے اور اپنی مفاد پرستیاں ہیں جن کی خاطر انہیں ان سنی کر دینا بھی ضروری ہے۔ بات دل میں اتاری ہی نہیں جاتی۔ وَ اِنْ یَّرَوْا

كُلَّ ايَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا حَتّٰى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (6:25) دونوں گروہ آ جاتے ہیں۔ یہ آتے ہیں تو اس کے بعد وہی جیسے میں نے کہا بچی جھگڑتی ہے کہ نہیں ابا جی! میں نے ضرور کہا تھا' آپ کہتے ہیں کہ نہیں کہا تھا۔ اور یہ جو کھلے بندوں انکار کرنے والے ہیں' ان کی تو کیفیت ہی یہ ہے وہ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے صاحب! یہ جو کچھ آپ کہتے ہیں۔ تیرہ سو سال پہلے کی بات اس زمانے میں یہ چل سکتا تھا اب یہ ماضی کے قصے ہمیں کیوں سناتے ہیں۔ یہ ہے ہمارے ہاں کی نئی نسل۔

آخر نوجوان نسل کو وحی کی اہمیت سے بے خبر رکھنے کی ذمہ داری کس پر ہے؟

عزیزانِ من! جنہیں ہم نے آج تک بتایا ہی نہیں کہ نظامِ خداوندی کیا ہوتا ہے' آئینِ خداوندی کسے کہتے ہیں' قرآن کیا دیتا ہے' Permanent Values کیا ہوتی ہیں' کیوں ضروری ہوتی ہیں۔ ہم نے انہیں بتایا ہی نہیں ہے۔ جو کچھ انہیں بتا رہے ہیں ہم' وہ دیکھ رہے ہیں کہ آج کے حالات میں وہ قابلِ عمل چیز ہے نہیں۔ وہ سنتے ہیں تو کیا کہتے ہیں؟ آپ کسی نوجوان سے کہہ کے دیکھئے وہ کہیں گے کہ ٹھیک ہے صاحب! یہ ماضی کے قصے جتنے آپ کہہ رہے ہیں یہ اس زمانے کی داستانیں ہیں' حالات بہت بدل چکے ہیں آج یہ چیز نہیں چل سکتی۔ یہ چیز ہے قرآن کہتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (6:25) پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ کہا اب ان گروہوں کو لے آیئے' خود بنا کے فتوے اور خدا کی طرف منسوب کرنے والے' وہ لوگ کہ جو ان چیزوں کو سنتے ہیں منافقت کے طور کے اوپر' وہ سرکش نسل جو یہ کہتی ہے یہ اساطیر الاولین ہیں یہ کیفیت وَ هُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَ يَنْئَوْنَ عَنْهُ (6:26) خود بھی اس طرف آنے سے رکتے ہیں' آتے نہیں ہیں اور روش ان کی یہ ہے کہ کسی اور کو بھی ادھر آنے نہیں دیتے۔

خالص قرآنِ حکیم کی تعلیم کو عام کرنے پر ایک ہزار علماء کی طرف سے علامہ غلام احمد پرویزؒ پر کفر کا فتویٰ

آج آپ عزیزانِ من! یہ آواز اٹھایئے کہ قرآنِ خالص ہے جو آپ کے اس مملکت کے دستور کی بنیاد ہونی چاہیے۔ آپ دیکھئے کتنی مخالفت ہوتی ہے اس کی۔ سنی سنائی بات نہیں میں عرض کر رہا' تیئس سال سے جو ایک شخص یہاں ہے جسے پرویزؒ کہتے ہیں اس کے خلاف آپ نے ہر جگہ سنا ہوگا الحاد ہے' جی ارتداد ہے' جی مرتد ہو گیا' پتہ نہیں کوئی نیا فرقہ بنا رہا ہے' نیا ہی دین لا رہا ہے' اس کی سنو نہ وہاں جاؤ نہ طلوعِ اسلام پڑھو۔ کیا ہو رہا ہے کیا جرم ہے اس کا؟ اس سے نہ پوچھئے ہزار علمائے کرام نے East & West کے مل کے فتویٰ کفر کا اس کے خلاف صادر کیا۔ اتنا بڑا فتویٰ اس سے پہلے کسی کے خلاف صادر نہیں ہوا ہوگا ہزار علمائے کرام کا۔ جرم کیا تھا؟ کہ یہ کہتا ہے کہ دین جو ہے وہ قرآنِ خالص کا نام ہے' اسی کی بنیادوں کے اوپر آپ کا آئین ہوگا۔ اس جرم کی بناء پہ ہزار علمائے کرام کی طرف سے کفر کا فتویٰ صادر ہو رہا ہے۔ خود آتے نہیں۔ وَ هُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَ يَنْئَوْنَ عَنْهُ (6:26) عجیب زبان ہے یہ يَنْهَوْنَ وَ يَنْئَوْنَ

بس یونہی 'ھ' کوء' سے بدلا اس نے' خود تو دور تھے ہی وہ جو آنا چاہتے ہیں ان کے راستے میں بھی رکاوٹ بن کے کھڑے ہو جاتے ہیں کم بخت۔ کہتا ہے' سمجھتے یہ ہیں کہ ہم نے اس کو مار دیا ختم کر دیا جناب ایک فتوے میں۔ **وَ اِنۡ یُّھۡلِکُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَھُمۡ** (6:26) کسی سچ کہنے والے کو یہ ہلاک نہیں کر سکتے' وہ نہیں تباہ ہوتا' یہ خود تباہ ہو رہے ہیں' اس سے۔ تباہ ہو رہے ہیں اور اگلی چیز ہے **وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ** (6:26) سمجھتے نہیں ہیں کہ تباہ ہو رہے ہیں۔ خوش ہو رہے ہیں صاحب! کہ شریعتِ حقہ کا غلبہ یہاں ہو رہا ہے' اسلامی نظام قائم ہو گا یہاں پہ۔ سمجھتے نہیں ہیں کہ ہلاکت ہو رہی ہے ہماری۔ عزیزانِ من! وقت ہو گیا۔ سورۃ الانعام کی آیت 26 تک ہم آ گئے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

تیسرا باب **سورۃ الانعام** (آیات 27 تا 34)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اگست 1971ء کی پہلی تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی 27 ویں آیت سے ہو رہا ہے۔

معذرت خواہ ہوں کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے درس کے آغاز میں چند منٹ کی تاخیر ہوگئی ورنہ میں تو وقت کا بڑا پابند رہنے کی کوشش کیا کرتا ہوں۔

معاشرے کا ایک ایسا گروہ جس کو اپنے نقصان کا خود ہی اندازہ نہیں

پچھلی آیت میں کہا یہ گیا تھا کہ یہ نظام اس قسم کا متشکل ہو رہا ہے جس میں تمام نوعِ انسانی کی منفعت بخشیاں عام ہو جائیں گی۔ اس میں انہی کا فائدہ ہے۔ لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ خود بھی اس کی طرف نہیں آتے اور دوسروں کو بھی اس کی طرف نہیں آنے دیتے۔ اور کہا یہ کہ یہ سوچتے نہیں کہ اس میں انہی کا نقصان ہے' یہ اس سے اپنے آپ ہی کو تباہ کر رہے ہیں کسی دوسرے کا کچھ نہیں بگاڑ رہے۔ وہ جو میں عام طور پہ مثال میں کہا کرتا ہوں کہ اگر یہ سکیم ہو کہ کسی گاؤں میں ہسپتال کھول دیا جائے یا سکول قائم کر دیا جائے اور وہ گاؤں والے اس کی مخالفت پہ اتر آئیں اور جو شخص بھی اس سکیم کو لے کے جائے اس سے دنگا فساد کرنے لگ جائیں۔ یہی کہا جائے گا کہ کس قدر حماقت ہے ان کی کہ یہ ان کے بھلے کا ہی کچھ ہو رہا ہے۔ اس کی مخالفت کرنے سے یہ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں کسی دوسرے کا

نقصان نہیں کر رہے۔

بغیر کسی اجر کے ہر نبی کی دعوت تو صرف خدا کی محکومیت اختیار کرنے کے متعلق تھی

اس نظام کی طرف دعوت دینے والے انبیائے کرامؑ جہاں پہلی چیز یہ کہتے تھے کہ اعبدوا اللہ صرف خدا کی محکومیت اختیار کرو۔اسی سانس میں یہ بھی ساتھ کہتے تھے کہ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (25:57) اس کے بدلے میں میں تم سے اپنے لیے کچھ نہیں چاہتا۔تو یہ دعوت دینے والے تو اپنے لیے کچھ بھی نہیں چاہتے تھے۔انہی کے فائدے کی چیز تھی لیکن انسان کی کوتاہ نگہی یہی ہے کہ وہ اپنے نفع نقصان کا بھی خیال نہیں رکھتا جذبات کی رو میں اس طرح سے بہے چلا جاتا ہے کہ وہ تمیز نہیں کرتا کہ یہ چیز میرے بھلے کی کہی جا رہی ہے۔تو کہا کہ وَ اِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ (6:26) سمجھتے نہیں کہ اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں اس سے۔

خدا تعالیٰ کے قانون میں اصلاح کی خاطر ایک مہلت کے وقفے کے علاوہ زندگی کی اہمیت

اور اب آگے ہے کہ وَ لَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (6:27) یہ چیز سامنے ہمارے آ چکی ہے کہ انسانی اعمال کے ارتکاب اور ان کے نتائج کے محسوس شکل میں سامنے آنے کے درمیان ایک وقفہ ہوتا ہے جیسے بیج بونے میں اور فصل کے پکنے میں ایک معیاد ہوتی ہے۔ یہ وہ وقفہ ہوتا ہے کہ جس میں انسان اگر اپنی اصلاح کرلے' اور اصلاح کی شکل قرآن نے یہ بتائی ہے کہ جتنی تخریبی چیز اس سے سرزد ہوئی ہے' اس سے زیادہ وزن کا تعمیری کام وہ کرلے تو اس سے اس کے نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے جسے توبہ کہتے ہیں۔اس دوران میں اگر یہ چیز ہو جائے تو وہ اس اپنے غلط عمل کے تباہ کن نتیجے سے بچ سکتا ہے۔لیکن جب یہ وقفہ ختم ہو جائے' کھیتی پک جائے تو پھر اس کی واپسی کی کوئی شکل نہیں ہوتی' لوٹائی نہیں جا سکتی۔کہا کہ اس وقت تو چونکہ وہ نتائج ان کے سامنے محسوس شکل میں نہیں آئے اس لیے ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہی نہیں کہ ہم کس قدر اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں۔لیکن جب وہ صورت پیدا ہو جائے گی کہ تباہی ان کے سامنے محسوس شکل میں آ کھڑی ہوگی۔اس زندگی میں وہ آ کے کھڑی ہو یا اس کے بعد کی زندگی میں اور بعد کی زندگی میں خاص طور پہ۔یہاں اس لیے کہا گیا کہ یہ مہلت کا وقفہ موت کے ساتھ یکسر ختم ہو جاتا ہے۔کہا کہ تو ذرا اس کیفیت کو سامنے لا' دیکھو تو سہی کہ وہ عذاب ان کے سامنے محسوس شکل میں کھڑا ہوگا تو اس وقت ان کی آرزو یہ ہوگی۔اور یہ ہے اہم چیز جو سامنے آ رہی ہے۔اس وقت یہ کہیں گے کہ اگر ایک دفعہ بھی ہمیں پھر لوٹا دیا جائے' واپس بھیج دیا جائے' پھر دنیا میں بھیج دیا جائے اور ایک اور زندگی دیدی جائے' وہیں ایک چانس اور دیدیا جائے تو پھر دیکھیئے ہم کبھی ان قوانین کی تکذیب نہیں کریں گے' ہم ان پر ایمان لائیں گے۔قرآنِ کریم میں یہ چیز متعدد مقامات پر آئی ہے کہ یہ اس وقت چاہیں گے کہ ایک چانس اور مل جائے زندگی میں۔مرنے کے بعد ہم پھر واپس لوٹ جائیں۔پھر سے وہ زندگی دنیا کی نصیب ہو جائے تو پھر ہم بتائیں کہ کس قدر اچھے

کام ہم کرتے ہیں۔اور قرآن نے ہر بار یہ چیز کہی کہ یہ غلط ہے۔زندگی تو ایک جوئے رواں ہے اور جو پانی ایک دفعہ بہہ کر آگے چلا جائے وہ واپس نہیں آیا کرتا۔یہ جیسا میں نے ابھی عرض کیا تھا یہ ایک بڑا اہم سوال ہے جسے دو لفظوں میں قرآن حل کر کے رکھ دیتا ہے۔

وحی کی روشنی کے بغیر عہد طفولیت میں انسانی سوچ کا معیار اور ہندوؤں کے دھرم کی تاریخ

یہ مسئلہ تناسخ یا Trans migration of soul جسے کہتے ہیں یہ Birth اور Rebirth کا سلسلہ آواگون کا چکر۔یہ ذہن انسانی جب ابھی اپنے عہد طفولیت میں تھا' بچپن میں تھا تو یہ جو زندگی میں مختلف ناہمواریاں دیکھتا تھا' معاشرے میں کسی کو دیکھتا کہ وہ غریب ہے' کوئی امیر ہے' بعض بچے پیدائش کے اعتبار سے لولے لنگڑے پیدا ہو جاتے ہیں' اندھے اور مریض ہوتے ہیں' یہاں مصیبتیں آتی ہیں۔پھر اس سے آگے چلے تو انہوں نے دیکھا کہ زندگی میں حیوانات بھی ہیں انسان بھی ہیں۔حیوانات کی بھی مختلف قسمیں ہیں۔اس پہ اپنے طور پہ غور کرنے سے بات ان کی سمجھ میں نہ آئی۔یونان سے اس خیال کی ابتداء ہوئی کہ مرنے کے بعد انسان کی روح پھر سے اسی دنیا میں آتی ہے اور جتنے کرم اس نے کیے ہوتے ہیں اپنی پہلی زندگی میں ان کے اعتبار سے اس کو دوبارہ کوئی پیکر ملتا ہے۔اس نے غلط کام کیے ہیں تو غریبوں کے گھر پیدا ہوتا ہے مریض ہوتا ہے' اپاہج ہوتا ہے' لولے لنگڑے بچے پیدا ہوتے ہیں۔اور اس سے بھی زیادہ غلط کام کیے ہوں تو چوہا بن جاتا ہے' کتے اور بلی کی شکل میں آجاتا ہے۔ان کا ذہن انہیں اس طرف لے گیا۔اور یہی وہ تصور تھا تناسخ کا جو وہاں سے ہندوستان میں آیا۔یاد رکھئے! ہندوؤں کا جو یہ دھرم ہے ان میں کوئی بھی ان کی اپنی چیز نہیں ہے۔ان کے ہاں تو فکر کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔یہ سارا کچھ ان کا دوسروں کے ہاں سے مستعار لیا ہوا ہے۔اگر تجزیہ کر کے دیکھیں ان کے ہاں کے دھرم کا اور جسے یہ فلسفہ کہتے ہیں اس کا تو بیشتر حصہ یونانیوں کا نظر آئے گا۔اور سکندر کے ساتھ جو اس کے دانشور کچھ آئے' سکندر واپس چلا گیا' بہت سا حصہ اس کی فوج کا اور ان لوگوں کا یہاں رہ گیا تھا۔تو یہ ان کے خیالات تھے وہ علم و فکر کے اعتبار سے ان کے مقابلے میں کہیں آگے اور بلند تھے۔تو ان کی فکر ان کے اوپر چھا گئی۔اور چونکہ یہ ہندو تو اکال الامم ہے' حالی کے الفاظ میں یہ سب آنے والی قوموں کو' امتوں کو' جتنے بھی یہاں آئے' ان کو یہ نگل لیتا تھا' اپنے اندر ہضم کر لیتا تھا۔اسی طرح انہیں بھی اس نے ہضم کیا۔چنانچہ آج ہندوستان میں یونانی نام کی کوئی قوم نہیں ہے پارسین' باختزین جتنے بھی باہر سے آئے تھے' ان میں سے کوئی بھی اپنے نام سے باقی نہیں' سب ہندو ہیں۔یہ تو سخت ہڈی تھی مسلمان کی کہ جو جذب نہیں ان کے اندر ہو سکا۔اور یہی اس کی ہڈی کی سختی ہے کہ جو اس وقت تک ان کے لیے وبالِ جان ہو رہی ہے اور ہمارے لیے قدم قدم پر خطرے کا موجب کہ اسے وہ ہضم کیوں نہیں کر سکے یا یہ ایسا نرم و نازک کیوں نہیں ہوا کہ یہ ہضم کر لیتے۔ان کے علاوہ وہاں ہندوستان میں آپ دیکھیں گے جتنی قومیں آئیں' ان دو تین چار ہزار سال کے عرصے میں' کوئی قوم بھی اپنے اور یجن اپنے اصل کے اعتبار سے وہاں متشخص ہی نہیں ہے' سب ہندو ہیں۔تو یہ خیالات جتنے تھے یونانیوں کے' یہ بھی انہوں نے وہاں سے لیے اور باقی حصہ تو

ایران کا تھا زرتشت کا' مجوسیوں کا۔ خیر۔ میں تناسخ کے متعلق کہہ رہا تھا۔ تو انہوں نے اسے اواگون بنایا۔ وہاں تو یہ صرف فلسفہ تھا۔ یہاں آنے کے بعد یہ دھرم بنا اور انہوں نے بھی اواگون کا یہ مسئلہ اپنے ہاں لے لیا کہ بار بار چانس ملتا ہے' بار بار انسان آتا ہے۔ بڑا کمزور فلسفہ ہے۔ یہاں جو شخص کسی مصیبت میں آ گیا لولا لنگڑا اپاہج اندھا پیدا ہو گیا' اور اسے یہ پتہ ہی نہیں ہے کہ یہ کونسا جرم تھا جس کی خطاء میں مجھے یہ سزا ملی ہے' وہ کونسی برائیاں مجھ سے سرزد ہوئیں کہ جن کی میں اصلاح کروں تو پھر یہ صورت پیدا نہ ہو۔ اسے علم ہی نہیں دیا گیا' اسے پتہ ہی نہیں کہ اس سے پہلے میرا کوئی جنم بھی تھا وہ اصلاح کیا کرے گا۔ بہر حال! میں اس فلسفے کے اوپر تو نہیں آ رہا' میں کہہ یہ رہا ہوں کہ قرآنِ کریم نے اس کی تردید کی ہے۔

انسانی زندگی کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی وضاحت

قرآن حکیم نے کہا ہے کہ یہ اس دنیا کی موجودہ زندگی کسی ایک فرد کی' صرف ایک بار کی زندگی ہے' دوسرا چانس نہیں مل سکتا۔ اور آپ دیکھئے کہ اس سے اس زندگی کی اہمیت کتنی بڑھ گئی۔ ایک ہی چانس ہے۔ اس زندگی میں تو یہ ہے کہ مواقع ملتے ہیں۔ غلطی ہوتی ہے' لغزش ہوتی ہے' اس کی اصلاح کے مواقع دیے جاتے ہیں آخر تک دیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ کہہ دیا کہ جب یہ زندگی ختم ہو جائے گی تو پھر دوبارہ یہ چانس نہیں مل سکتا۔ اس سے دنیا کی زندگی آپ دیکھئے کتنی اہم اور Serious ہو گئی۔ قرآن اسی لیے یہ کہتا ہے کہ ہم بار بار تمہیں Warn کیے دیتے ہیں کہ یہ زندگی دوبارہ نہیں مل سکے گی ایک ہی بار کی زندگی ہے۔ اور اگر میں دوسری طرف جاؤں تو آپ کو بتاؤں کہ Evolution کے سلسلے میں' ارتقاء کے سلسلے میں Return کی ٹکٹ تو ملتی نہیں ہے۔ جتنی Species پیچھے سے آئی ہیں یا وہ آگے بڑھ گئی ہیں یا وہیں کھڑی ہو گئی ہیں' دوبارہ چانس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ نظام اس قسم کا ہے کہ جو افلح' جو انفع ہے' وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ جو ایسا نہیں ہے' رک جاتا ہے' مٹ جاتا ہے۔ دوسرا چانس یہاں نہیں مل سکتا۔ انسانی زندگی میں البتہ یہ چانس اگلی زندگی میں جا کے تو پھر مل جاتا ہے۔ انہیں مل جاتا ہے کہ جنہوں نے اس زندگی سے بلند سطح کی زندگی بسر کرنے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کر لی ہو۔ جنہوں نے ایسی نہ پیدا کی ہو' ان کے لیے بھی وہاں کوئی چانس نہیں ہوتا۔ وہ رکے ہوئے ہوتے ہیں۔ جحیم اسی لیے جہنم کو قرآن نے کہا ہے کہ جہاں پہنچ کے کسی کے آگے بڑھنے کا سلسلہ رک جائے۔ تو یہ چانس دوبارہ نہیں ہے۔ اور ضمناً میں عرض کروں کہ یہ جو ہمارے ہاں اب تعلیم کے سلسلے میں' بار بار سال میں تین تین چار چار امتحانوں کا چانس دیے چلے جا رہے ہیں۔ ہوا تو وہ یہ کہ ان سٹوڈنٹس نے اس قدر Lightly لیا اپنے اس امتحان کے سلسلے کو کہ وہ پاس ہی نہیں ہوتے' امتحان ہی میں نہیں بیٹھتے۔ بجائے اس کے کہ اس کا تدارک کیا جاتا اور ایسی کیفیت پیدا کی جاتی کہ وہ اس امتحان کو Seriously لیں' وہ چھوٹ دیتے چلے گئے۔ ایک Subject میں دوبارہ Supplementary ہو گیا۔ سارے Subject میں دوبارہ' وہی آہستہ آہستہ انہوں نے انگلی پکڑتے ہوئے آخر میں پانچہ پکڑا۔

آخر میں یہ ان کا تقاضا ہوا کہ بغیر امتحان کے ہی پاس کر دیا جائے۔ یہ بنیاد وہاں سے پڑی تھی جو ایک سے زیادہ چانس کی بات آ گئی‘ Seriousness اٹھ گئی اس کی۔ ورنہ جب ایک ہی امتحان ہوا کرتا تھا اور معلوم تھا کہ فیل ہوئے تو پھر سارا سال اس پہ لگے گا بڑی Serious study اس زمانے میں ہوا کرتی تھی طلباء کے ہاں۔ اب تو مذاق بن گیا ہے۔

کرۂ ارض پر انسانی زندگی کے لیے صرف ایک چانس ہے

یہ تو چھوٹی سی چیز ہے اس امتحان کی۔ پوری زندگی کے لیے ایک امتحان‘ ایک چانس اس سے زیادہ نہیں ہے دوبارہ یہاں نہیں بھیجا جائے گا۔ اس زندگی کی اہمیت کے لیے بڑی چیز ہے عزیزانِ من! ۔ اسی لیے کہا کہ وہاں پہنچ کے ان کی یہ تمنا ہوگی کہ دوبارہ بھی چانس مل جائے۔ لیکن یہیں انہیں بتا دیا گیا کہ دوبارہ یہاں نہیں تم آ سکتے۔ ایک ہی بار کا یہ چانس ہے اس لیے زندگی کو بڑا Seriously لینا چاہیے تمہیں۔ کہا کہ یہ جو چیز ہے یہ تڑپ کیوں پیدا ہوئی‘ یہ آرزو کیوں وہاں بیدار ہوئی‘ اتنی حسرت یہ کیوں ٹپکی ان کی آنکھوں سے۔ جہنم یا قیامت کے عذاب کے متعلق بہت سی شکلیں سامنے آتی ہیں۔ لیکن میں نے اپنی بصیرت کے مطابق جس چیز کو سب سے اشد شکل عذاب کی سمجھا ہے وہ یہ ہے جو اس آیت میں سامنے آتی ہے اور اس قسم کی آیات جو قرآن کی ہیں۔ بَلْ بَدَا لَهُم مَّا كَانُوا يُخْفُونَ مِن قَبْلُ (6:28)

انسانی زندگی میں ظاہریت پر مبنی معتبری کو قدم قدم پر قائم رکھنا ایک بہت بڑا عذاب ہوتا ہے

اس زندگی میں عزیزانِ من! ہم اپنے اپنے دائرے میں پھرتے ہیں۔ عزیزوں کا دائرہ‘ رشتے داروں کا‘ دوستوں کا‘ معاشرے کا‘ Colleages کا اور ان میں ہم بڑے معتبر بنے رہتے ہیں۔ اپنے اپنے دائرے میں ہر شخص معتبر بننے کی کوشش کرتا ہے۔ دوستوں کے حلقے میں بالخصوص اپنا اعتماد قائم رکھتا ہے‘ چاہتا ہے کہ اس کا اعتبار بنا رہے۔ اسی کا نام زندگی ہے حقیقت میں۔ احساس ہونا چاہیے۔ آپ سوچیے کہ اگر کیفیت یہ ہو کہ ہم یہاں اس حلقے کے اندر بنے ہوئے کچھ اور ہوں حقیقت میں کچھ اور ہوں۔ دوست سے کہیں کچھ اور سوچیں اس کے خلاف اپنے دل میں اور روز یہ کیفیت پیدا کریں۔ اور یہ تو پھر جتنا زیادہ کوئی چالاک ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ اس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس نہج سے زندگی میں بڑے شریف‘ بڑے مخلص دوست‘ بڑے ہمدرد‘ بہت بڑے عالم‘ بڑے ناصح‘ بہت قرآن پیش کرنے والے‘ بڑا مقام حاصل کیا ہوا ہو اور اندر زندگی اس کے برعکس ہو۔ آپ سوچیے کہ دوستوں کی محفل میں زندگی یوں گذاری ہوئی ہو اور ان میں سے کسی دن ایسا ہو جائے کہ آپ کی کوئی ایک بات جو آپ نے جھوٹی کی تھی یا کہی تھی ان کے سامنے بے نقاب ہو کے آ جائے‘ آپ کی کیفیت کیا ہوگی۔

جہنم کے دردناک عذاب کی وجہ جواز اور اس کی کیفیت

اگر احساس اندر موجود ہے تو آپ سوچئے کہ یہ کتنا بڑا عذاب ہے ان دوستوں کے سامنے جن میں آپ اتنے معتبر اور معتمد علیہ بنے ہوئے تھے' اتنے بڑے صاحبِ تکریم وتحریم تھے ان کی نگاہوں میں' اتنی آپ کی عزت تھی' اتنے آپ نیک پارسا سیرت بنے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے آپ کا ایک گھناؤنا جرم بے نقاب ہوجائے کیفیت آپ کی اس کے بعد کیا ہوگی۔ یہاں تو اس قسم کی کیفیت کا بے نقاب ہونا ہے۔ اگر یہ کیفیت ہو کہ آپ کی ساری زندگی بے نقاب ہو کے سامنے آجائے۔ آپ کے جتنے جاننے والے ہیں ان کے سامنے کیا کیفیت آپ کی ہوگی۔ میں کہتا ہوں اس سے بڑا جہنم کا عذاب کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اور قرآنِ کریم نے اسی لیے قیامت کا' جہنم کے عذاب کا ذکر کیا ہے۔ کہا ہے سب سے بڑی چیز وہاں یہ ہوگی کہ جو کچھ تم یہاں چھپاتے تھے وہ سارے کا سارا وہاں بے نقاب ہوگا۔ اور یہ سب موجود ہونگے وہاں جن محفلوں میں تم بڑے بنے پھرتے تھے' جن دوستوں کے حلقے میں تم اپنے اخلاص کے دعوے کیا کرتے تھے جہاں تم اپنی پارسائی کی دھاک بٹھایا کرتے تھے' جہاں اتنے بڑے تم شریف النفس بنے پھرتے تھے' وہ سارا حلقہ موجود ہوگا اور ان میں ساری زندگی تمہاری بے نقاب ہو کے ایک ایک ریشہ ان کے سامنے آجائے گا۔ کیا کیفیت ہوگی عزیزانِ من! میں کہتا ہوں اس سے بڑا جہنم کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (40:19) دل کی گہرائیوں میں جو خیالات تم نے چھپا کے رکھے ہونگے' وہ بھی سامنے آجائیں گے۔ سوچئے تو سہی! قرآن یہ بتاتا ہے کہ وہاں ایک دوسرے کو پہچانیں گے کیفیت یہ ہے۔ عزیزانِ من! وہاں آپ سب ہونگے' وہاں یہ بندۂ پرتقصیر بھی ہوگا۔ کیسی زندگی گذاری ان کی نگاہوں کے اندر اور وہاں دل میں گذرنے والے خیالات بھی سامنے آجائیں اور آپ کو معلوم ہوجائے کہ یہ ہے وہ شخص جو ساری عمر ہمیں قرآن پڑھاتا رہا اور اس کی کیفیت یہ تھی اور اسی طرح سے وہاں موجود ہوں اور وہاں اس سے انکار بھی نہ ہوسکے گا۔

اگر چپ رہے گی زبانِ خنجر
لہو پکارے گا آستیں کا

تمہارے اعضاء وجوارح میں سے ایک ایک تمہارے خلاف شہادت دے گا۔ کہتا ہے تم خود اپنے خلاف شہادت دو گے' انکار کی مجال ہی نہیں ہوگی۔ ایک ٹیپ ریکارڈر اندر لگا ہوا ہے' وہ چل رہا ہے انکار کیسے ہوسکتا ہے۔ یہ میں جو درس دیتا ہوں اس سے منکر ہی نہیں ہوسکتا۔ یہ تین چار کراماً کاتبین میرے دائیں بائیں رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں تو پھر بھی یہ ہوسکتا ہے چالاکی کہیں مٹا ہی دوں' کاٹ ہی دوں' وہ تو بہت محفوظ کتاب کے اندر ہے۔ یہ شہادتیں ہونگی اس طرح سے یہ چیزیں بے نقاب ہونگی' ارادے اور نیتوں تک سامنے آجائیں گے اور یہ ساری محفل اور زندگی جس جس نے یہاں گذاری ہے جن حلقوں میں' پورا حلقہ وہاں موجود ہوگا اور ان کے سامنے کھڑا انسان بے نقاب

ہوگا۔ یہ ہے عزیزانِ من! جہنم۔

قرآن حکیم کی روشنی میں انسان کی نفسیاتی کیفیت کا تجربہ

کہا تمہیں معلوم ہے کہ یہ اس وقت اس طرح چلا کے کہیں گے کہ ذرا رکئے' ایک دفعہ ہمیں پھر واپس بھیج دیجیے۔ کہا یہ کیوں کہیں گے ؟ انہیں معلوم ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ **بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ** (6:28) جو کچھ چھپایا کرتے تھے اس کے ظاہر ہونے کا وقت آ گیا۔ فی الواقعہ انسان چیخ اٹھے گا کہ سرکار کچھ کیجیے' اس پہ پردہ پڑا رہنے دیجیے اور ایک دفعہ پھر ہمیں چانس دیدیجیے۔ **وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ**(6:28) کہا جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ کیفیت یہ ہے انسان کے جذبات کی کہ اگر پھر بھی ان کو چانس مل جائے' یہ پھر بھی یہی کچھ کریں۔ انسان بڑی جلدی بھولتا ہے۔ یہاں بھی یہ ہوتا ہے' بڑی جلدی بھول جاتا ہے۔ پھر اعتماد جما لیتا ہے۔ ہم جو روز فریب کھاتے ہیں دوست کا' یہ کیسے کھا جاتے ہیں؟ اسے پھر سے اعتماد جمانا آتا ہے۔ کہا درحقیقت یہ چیزیں وہ لوگ کرتے ہیں (یہاں بڑی بنیادی چیز آئی ہے صاحب) یہ کچھ وہ لوگ کرتے ہیں جو زبان سے بے شک یہ کہتے ہوں کہ ہمارا ایمان ہے مکافاتِ عمل پر' مرنے کے بعد کی زندگی پر' حشر نشر پر' ان کیفیات پر جو قرآن بتا رہا ہے لیکن یہ زبان سے بات ان کی ہوتی ہے' اس پر ان کا یقین نہیں ہوتا ایمان نہیں ہوتا۔ بات بڑی صاف ہے' عزیزانِ من! واقعی اگر آپ کو معلوم ہو کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ بے نقاب ہو کے سامنے آ جائے گا اور انہی لوگوں کے سامنے آ جائے گا۔ یقین ہو آپ کو اس چیز کا اور ان میں رہنا بھی ہو آپ نے پھر بہت محتاط ہو جائیں گے آپ۔ وہ یہ کہتا ہے کہ ایمان نہیں اس چیز کے اوپر ان کا ہوتا۔

قندیل آسمانی کی روشنی میں زندگی کے دو نظریوں کی تفصیل

بنیادی چیز عزیزانِ من! قرآن کی رو سے جسے ایمان کہتے ہیں' وہ ایمان بالآخرت ہی ہے۔ زندگی کے دو ہی نظریے ہیں: ایک نظریۂ زندگی یہ کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے' حیوانی سطح کی زندگی ہے۔ کھایا پیا سوئے' جاگے افزائش نسل کی' مر گئے' مرنے کے ساتھ معاملہ ختم ہو گیا۔ اگر یہ نظریۂ زندگی ہو تو اس میں پھر انسان محتاط رہتا ہی نہیں' ضرورت ہی نہیں رہی کہ محتاط رہے۔ یعنی وہ کوشش یہ کرتا ہے کہ یہاں کسی نہ کسی طرح سے ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ باہر نہ آئے اور اس زندگی میں ایسا کر لینا کوئی مشکل ہے نہیں۔ اکثریت ان لوگوں کی ہے کہ جو ساری عمر پتہ نہیں کیا کچھ کرتے رہتے ہیں' بڑے معتبر بنے پھرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اسی طرح سے۔ ایک نظریۂ زندگی یہ ہے۔ اور دوسرا نظریۂ زندگی یہ ہے کہ نہیں! اس زندگی میں اگر ہم ان چیزوں کے چھپانے میں کامیاب بھی ہو گئے تو بھی کچھ نہیں' زندگی تو آگے چلے گی اور اس کے بعد وہ وقت آئے گا کہ ان چھپی ہوئی چیزوں کو بے نقاب ہونا پڑے گا۔ میرا

کوئی عمل حتیٰ کہ میرا کوئی ارادہ بھی بغیر نتیجہ مرتب کیے نہیں رہ سکے گا۔ایک نظریہ زندگی یہ ہے۔اور جسے آپ ایمان یا اسلام یا دین کی زندگی کہتے ہیں اس میں اساسی اور بنیادی عقیدہ یہ حیاتِ آخرت کا ہے۔بنیادی عقیدہ۔

اگر کسی انسان کا آخرت پر ایمان نہیں تو پھر اس کا قرآن پر ایمان کچھ معنی نہیں رکھتا

یعنی ہم تو یوں کچھ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم پر ایمان لانے والا یقیناً حیاتِ آخرت پر بھی ایمان رکھے گا۔قرآن نے اس کو الٹا کے بیان کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں وہ بڑی عجیب چیز ہے جیسے اس نے بیان کیا ہے۔اس نے کہا ہے وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (6:92)۔کہتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جو حیاتِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ درحقیقت قرآن پہ ایمان رکھتا ہے۔بڑی اہمیت ہوگئی۔یعنی منتہا و مقصود وہ ہے۔قرآن بڑی عظیم کتاب ہے معجز نما ہے' خدا کا کلام ہے' بڑی راہنمائی ہے' کہتے چلے جائیے کچھ حاصل نہیں۔اصل چیز یہ ہے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے' یہ مسلسل آگے چلنے والی ہے اور قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے میرے ہر عمل اور ارادے اور نیت تک کا بھی نتیجہ سامنے آئے گا' یہ ایمان ہے۔اس کے بعد اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ بھئی! پھر دیکھا جائے کہ کون کونسی چیزیں ہیں جن سے بچنے سے ہم اگلی زندگی میں فائز المرام ہو سکتے ہیں' کونسے ایسے کام ہیں جن سے ہمارے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے۔اس راہنمائی کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب پہلے یہ ایمان رکھا جائے کہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔اگر ایمان یہ ہو کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے' آپ کو نہ وحی کی ضرورت ہے نہ خدا پہ ایمان لانے کی' نہ رسولوں پہ' سوال ہی نہیں۔یہ ساری ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ زندگی کے متعلق یہ نظریہ ہو کہ زندگی یہیں ختم ہو جانے والی نہیں ہے۔اساسی اور بنیادی چیز یہ ہے۔

انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں فرق کی وضاحت

قرآنِ کریم نے زندگی کی جو سطحیں بتائی ہیں' ان میں کہا یہ ہے کہ یہ زندگی حیوانی سطح کی زندگی ہے۔حیوان کی زندگی یہ ہے کہ یہاں اسی زندگی میں وہ کھاتا پیتا ہے' مر جاتا ہے' ختم ہو جاتا ہے' یہ حیوانی سطح کی زندگی ہے۔انسانی سطح کی زندگی یہ ہے کہ اس سے وہ ختم نہیں ہوتا اس میں ایک ایسی چیز بھی ہے جو اس سے آگے بھی چلتی ہے۔لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ انسان کے جذبات جو ہیں وہ جب اس پہ غالب آ جاتے ہیں تو پھر وہ اسے اس طرف نہیں آنے دیتے۔دیکھئے اس نے (45:22) میں کیا کہا ہے ایک ایک لفظ غور طلب ہے عزیزانِ من! ان آیات کا۔وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (45:22) یہ سلسلۂ کائنات حقیقت پر مبنی ہے بالحق پیدا کیا گیا ہے ایک مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

یہ پوری کی پوری کائنات انسان کے اعمال کو محفوظ کرنے اور اس کا نتیجہ مرتب میں ہر آن مصروف کار ہے

یہ ساری کارگہ سرگرمِ عمل ہے کس لیے؟ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ (45:22) کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلا

دیا جائے۔ یعنی یہ سارا محیر العقول سلسلۂ کائنات سب اس لیے سرگرمِ عمل ہے کہ انسان کا کوئی کام بلا نتیجہ نہ رہنے پائے۔ کیا معلوم عزیزانِ من! کہ اس کارگہ کی یہ مشینری' پتہ نہیں کیا کیا کر رہی ہے کہ جس سے ہمارے دل میں گذرنے والے خیالات بھی محفوظ ہو جاتے ہیں اس کے اندر۔ اور اس طرح سے محفوظ ہوتے ہیں کہ وہ دوبارہ سامنے لایا جاتا ہے۔ صرف سامنے لانا ہی نہیں کہ اس کا علم ہی صرف ہو' وہ نتیجہ خیز ہوتے ہیں ان کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ پوچھا کرتے ہیں کہ صاحب کائنات کے وجود میں لانے اور اس طرح سے سرگرمِ عمل لانے سے بالآخر مقصد کیا ہے؟ خدا کے پلان میں دیگر مقاصد تو ایک طرف رہے' اس نے تو ہمیں اس کا ایک مقصد یہ بتایا ہے کہ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (45:22) اور کسی پر کچھ زیادتی نہ ہو یہ سارا اس لیے سرگرمِ عمل ہے۔ انسان کو اس کے اعمال کا نتیجہ مل جائے' بدلہ مل جائے۔

انسانی اعمال کے سلسلہ میں انسانی جذبات اور پھر آرزوؤں کا عمل دخل

کہا لیکن دیکھئے یہاں وہ لوگ بھی تمہیں ملیں گے اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ (45:23) جن کی کیفیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیا۔ جذبات قرآن کی رو سے بڑی قیمتی متاع ہیں انسان کے۔ عمل کا محرک ہمیشہ جذبہ ہی ہوتا ہے' جذبات اگر باقی نہ رہیں تو کوئی عمل ہی سرزد نہیں ہو سکتا۔ پہلے آپ کے دل میں ایک آرزو بیدار ہوتی ہے' ایک خواہش پیدا ہوتی ہے' ایک تمنا اٹھتی ہے پھر اس کے حصول کے لیے آپ کوئی حرکت کرتے ہیں' اسے آپ عمل کہتے ہیں۔ اور اگر یہ آرزو ہی پیدا نہ ہو تو اس کے بعد عمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی آرزو ہے جسے جذبہ کہا جاتا ہے۔ اور جسے فنا کرنے کے لیے اتنی اتنی بڑی سازشیں ہوئیں۔ کہیں بدھا جیسے اٹھے اُنہوں نے فلسفے میں یہ چیز کہی کہ دنیا میں ہر تکلیف کی بنیاد آرزو پہ ہے۔ ترکِ آرزو جو ہے' یہ ماحصل ہے زندگی کا۔ نروان جسے انہوں نے ایسی کیفیت کہا کہ جس میں کوئی آرزو ہی پیدا نہ ہو۔ اور یہی چیزیں تھیں جو ہمارے ہاں پھر تصوف میں آئیں۔ ہر چیز کا ترک' ترکِ دنیا' ترکِ مولا اور اس کے بعد ایک اور چیز ہے ترکِ ترک۔ کہیں گے یہ ترکِ ترک کیا؟

ترکِ آرزو کے بعد آرزو کے ترک کرنے کو بھی ترک کرنا ہوگا

فلسفہ ذرا ملاحظہ فرمائیے! کہا کہ یہ ٹھیک ہے دنیا بھی تم نے ترک کر دی' مولا بھی ترک کر دیا یہ ترک کرتے گئے اس لیے کہ کوئی آرزو نہ دل میں پیدا ہو کیونکہ آرزو کی موجودگی ہی تو ساری قیامت لاتی ہے۔ ان کا یہ فلسفہ ہے نا کہ آرزو ہی پیدا نہ ہو۔ کہا کہ یہ جو تمہارے دل میں آرزو ہے کہ اس کو ترک کر دیا جائے' یہ بھی تو آرزو ہے۔ ترکِ ترک۔ یہاں تک پہنچو یعنی آرزو کو اس طرح سے ختم کرو کہ کسی چیز کے ترک کرنے کی آرزو بھی دل میں پیدا نہ ہو۔ شعر تو یونہی سا ہے لیکن برجستہ ہے

وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری

چھپے جو ہم سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی

وہ کہتا ہے یہ جو تمہارے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ ترک کر دینا چاہیے دنیا کو، یہ بھی تو آرزو ہے کم بخت۔ کہتا ہے یہی مشکل ہے

ع ورنہ ہم خدا ہوتے دلِ بے مدعا پاتے

بدھا اور تصوف کے تصورات کے بعد قرآن حکیم کی راہنمائی جو عقل انسانی کو صراط مستقیم کی نعمت سے سرفراز کرتی ہے

منتہا ہے یہ آپ کے ہاں بدھا کا تصور ہو، بدھا کا نروان ہو، آپ کے ہاں کا تصوف ہو۔ یہاں تک وہ لے جاتا ہے۔ جذبات کی قرآن نے بڑی اہمیت بتائی ہے۔ لیکن وہ ہر شے کو حدود کے اندر رکھتا ہے۔ پانی بڑی مفید چیز ہے، ممدِ حیات ہے بشرطیکہ یہ دریا کے ساحلوں کے اندر رہے، ساحل کو توڑا تو سیلاب بنا۔ وہ ان چیزوں کو سیلاب نہیں بننے دیتا۔ قرآن نے کہا ہے دوسری جگہ وَ مَنۡ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيۡرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (28:50) کہا جرم جذبات کی پیروی کیے جانا وحی کی حدود کو چھوڑ کر۔ زندگی اس چیز کا نام ہے۔

انسان کے سرکش جذبات قوموں کی عقل کو ماؤف کر دیتے ہیں

عزیزانِ من! انسانی جذبات اس کی عقل کے تابع رہیں اور عقلِ انسانی وحی کی روشنی میں کام کرے، دین ہو گیا۔ ہر چیز اپنے اپنے مقام پہ قائم رہتی ہے۔ لیکن جب جذبات ہی کو الٰہ بنا لیا جائے، انہی کی پرستش شروع ہو جائے، صاحبِ اقتدار جذبات ہو جائیں یعنی جو وہ ڈکٹیٹ کریں، وہ کرتے چلے جایئے۔ اس کے بعد ہوتا کیا ہے؟ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلۡمٍ (45:23) کیفیت پھر یہ ہوتی ہے کہ علم رکھنے کے باوجود غلط راستوں پہ چلتا ہے۔ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمۡعِهٖ وَقَلۡبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (45:23) کیا بات ہے!!!۔ جذبات جب غالب آ جائیں کسی پہ اس کے بعد آپ دیکھئے عقل و فکر ماؤف، سمجھنے سوچنے دیکھنے بھالنے کی ساری صلاحیتیں مفلوج۔ ہوتا ہی یہ ہے۔ بڑے بڑے جذبات میں مفلوج ہو جانا تو ایک طرف رہا، ذرا سا غصہ انسان کو جس وقت آتا ہے وہ بالکل پاگل ہو جاتا ہے۔ تو غصے میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ اسی لیے جب غصہ فرو ہوتا ہے تو پھر آدمی خود اپنے کیے پہ نادم ہوتا ہے۔ اس وقت یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ اور یہی کیفیت ہر جذبے کی ہے۔ جب بھی اسے آپ ان ساحلوں کے اندر نہ رکھیں گے، اسے بیباک ہو جانے دیں گے، آپ دیکھیں گے کہ سمجھنے سوچنے کی صلاحیت مفلوج ہو جائے گی اس وقت۔ اس نے کہا کہ یہ ہے جذبات کو الٰہ بنانے کا نتیجہ کہ سمجھنے سوچنے، دیکھنے بھالنے کی صلاحیتیں ہونے کے باوجود انسان اندھا بہرہ گونگا ہو سکتا ہے۔ اور افراد ہی نہیں ہوتے، اقوام بھی تو ہوتی ہیں۔ یہ قومیں جو اپنی قوت کے نشے میں بدمست ہوتی ہیں، یہ انفرادی شرابی سے کم جذبات میں بہے ہوئے نہیں ہوتیں ان کی عقل و فکر کی قوتیں کم

مفلوج نہیں ہوتیں۔

صرف آخرت پر ایمان ہی انسانیت کو تمام تر تباہیوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے

کہا دیکھا تم نے کہ جس نے جذبات ہی کو اپنا معبود بنالیا' رہنما بنالیا اور کیفیت یہ ہوگئی ان کی **فَمَنۡ یَّهۡدِیۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰهِ** (45:23) کہا جو اپنی کیفیت یہ بنالے پھر کونسی چیز ہے جو اس کو صحیح راستے پہ لگادے۔ اور اس کے بعد ہے کہ ایسا کون کرتا ہے۔ یہ تھی وہ چیز جس کے لیے میں نے یہ پہلی آیت تلاوت کی۔ کہا ہے کہ **وَقَالُوۡا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا** (45:24) یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ بس زندگی یہی اسی دنیا کی زندگی ہے۔ جب آپ کے سامنے یہ چیز آجائے کہ یہی زندگی ہے تو اس کے بعد جذبات کی تسکین کے علاوہ مقصد حیات کوئی اور رہتا ہی نہیں ہے۔ پھر جسے کہتے ہیں چل سو چل۔

آج گردشِ زمانہ اہل مغرب کو موت کے بعد کی زندگی کے متعلق سوچنے پر مجبور کر رہی ہے

کہتا ہے یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کا نظریہ' جن کا ایمان یہ ہے کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ **نَمُوۡتُ وَنَحۡیَا وَمَا یُهۡلِکُنَاۤ اِلَّا الدَّهۡرُ** (45:24) کتنی بڑی چیز ہے!!۔ کہتا ہے یہ زمانے کی گردشیں ہیں اور ان کے اندر انسان پیدا ہوتا ہے' جوان ہوتا ہے' بوڑھا ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ مشینری گھس جاتی ہے' یہ پھر ختم ہو جاتا ہے۔ **وَمَا لَهُمۡ بِذٰلِکَ مِنۡ عِلۡمٍ** (45:24) قرآن کہتا ہے یہ باتیں بھی ساری جذبات پہ ہی مبنی ہیں' علم اور حقیقت پر مبنی نہیں ہیں۔ علم اور حقیقت عزیزانِ من! یہ جو مغرب کی 19 ویں صدی کی دہریت تھی' انہیں بھی مجبور کر کے اس طرف اب لا رہا ہے خاص طور پر ان کی سائیکولوجی (Human Psychology) کہ وہ زندگی کے بعد کی زندگی کی طرف آتے چلے جا رہے ہیں۔ قرآن نے یہ کہا تھا کہ علم نہیں ہے ان کے پاس' ظن اور قیاس سے یہ باتیں کر رہے ہیں **اِنۡ هُمۡ اِلَّا یَظُنُّوۡنَ** (45:24) ظن و قیاس سے محض یہ باتیں کر رہے ہیں' علم نہیں ہے ان کو۔ علم آنے کے بعد معلوم ہوگا کہ انسان کی زندگی صرف حیوانی زندگی اور طبعی زندگی نہیں ہے' اس سے اونچی زندگی ایک اور بھی ہے۔ اور یہ چیز کہ ایک Psyche چیز ہے یہ تو ہمارے دور کی چیز ہے جس کو سامنے لایا ہے۔ اور ابھی تو یہ علم طفولیت میں ہے۔ آپ دیکھئے گا آگے آگے ان کی تحقیقات کہاں تک لے جاتی ہیں انسان کو۔ بہر حال قرآن نے کہا یہ ہے کہ جب انسان کا نظریہ یہ ہو جائے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے تو پھر اس کے بعد اقدار' اخلاق' کوئی حدود' کوئی قیود یہ کچھ باقی نہیں رہتیں' مقصد صرف اپنے جذبات کی تسکین ہوتا ہے۔ اپنے مقاصد کا حصول ہوتا ہے۔ زندگی دنیا کی کامیاب کرنا مقصد ہوتا ہے جس طریق سے بھی ہو جائے۔ اس لیے کہ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہم یہاں کامیاب ہوگئے ان چیزوں پہ جو چیزیں ہم اختیار کر رہے ہیں' ان کے نتائج سے بچنے میں کامیاب ہوگئے تو معاملہ ختم ہے پھر۔ **وَقَالُوۡۤا اِنۡ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا**

الدُّنۡیَا وَ مَا نَحۡنُ بِمَبۡعُوۡثِیۡنَ (6:29) کہا وَ لَوۡ تَرٰۤی اِذۡ وُقِفُوۡا عَلٰی رَبِّہِمۡ ؕ قَالَ اَلَیۡسَ ہٰذَا بِالۡحَقِّ ؕ (6:30) کہتا ہے کہ اب یہاں تو ان کے پاس علم نہیں، ظن ہے۔ لیکن اس کے بعد تو یہ بات ایک حقیقت ثابتہ کی طرح سامنے آنے والی ہے تو اس وقت پھر ان سے پوچھا جائے گا کہ کیوں! کہو!! یہ ایک حقیقت تھی یا نہیں، موت کے بعد کی زندگی ایک حقیقت تھی یا نہیں۔ قَالُوۡا بَلٰی وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَکۡفُرُوۡنَ (6:30) وہاں یہ چیز ہوگی۔

قرآن حکیم زندگی کے حقائق کو بڑے محاکاتی انداز میں پیش کرتا ہے

میں عرض کردوں کہ جس انداز سے قرآن نے سمجھایا ہے یہ نہیں ہے کہ دو شخص باتیں کررہے ہیں آمنے سامنے کھڑے۔ یہ تو سمجھانے کا انداز ہوتا ہے بڑا مؤثر جسے محاکات کہتے ہیں Graphically ایک چیز کو سامنے لاکے بتا دینا کہ ان سے یوں کہا جائے گا اور اس وقت یہ تسلیم کریں گے۔ قَدۡ خَسِرَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِلِقَآءِ اللّٰہِ ؕ (6:31) کہا کہ وہ لوگ جو اس سے انکار کرتے تھے کہ خدا کے قانونِ مکافات کا آمنا سامنا کرنا ہے ہم نے، وہ یقیناً اپنے آپ کو تباہ کرتے رہتے تھے۔ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَتۡہُمُ السَّاعَۃُ بَغۡتَۃً قَالُوۡا یٰحَسۡرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطۡنَا فِیۡہَا ۙ (6:31) کہا کہ جب وہ تباہی محسوس شکل میں سامنے آجاتی ہے تو پھر وہ کہتے ہیں کہ ہم سے کتنی تقصیر ہوئی جو ہم نے یہ کہا۔ وَ ہُمۡ یَحۡمِلُوۡنَ اَوۡزَارَہُمۡ عَلٰی ظُہُوۡرِہِمۡ (6:31) بڑا خوبصورت انداز ہے۔ چلے آئیں گے کانپتے ہوئے لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگیں، کپکپاتے ہوئے جسم، منہنی، زرد رو، آنکھیں دھنسی ہوئیں اور پشت پر بوجھ کا ایک انبار لدا ہوا۔ اس نے اس طرح کمر کو جھکا رکھا ہے کہ گویا وہ ٹوٹ رہی ہے۔ یَحۡمِلُوۡنَ اَوۡزَارَہُمۡ عَلٰی ظُہُوۡرِہِمۡ ؕ (6:31) اپنے اپنے بوجھ اپنی اپنی کمر کے اوپر لادے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ کدھر جارہے ہیں یہ۔ شاید آپ کو یاد ہو پہلے بھی بات آئی تھی۔ اقبالؒ نے اس چیز کو سمجھایا ہے اپنے انداز میں، بڑا خوبصورت انداز ہے۔ یہ بوجھ کیا ہیں اور یہ کہاں جارہے ہیں؟

اقبال کے الفاظ میں جہنم میں گرفتار تباہ حال قوم کی حالتِ زار کو بیان کرنے کا محاکاتی انداز

اقبالؒ نے کہا ہے کہ میں عالمِ بالا کی سیر کو گیا اور وہاں فرشتوں نے مجھے جنت دکھائی اور یہ حوضِ کوثر دکھایا اور نعمائے جنت اور ساری چیزیں دکھائیں۔ بہت خوش تھا، خوشی خوشی واپس آیا۔ واپس آتے ہوئے کہا کہ وہ جہنم جسے کہتے ہیں اس کی بھی تو جھلک ذرا دیکھ لی جائے۔ فرشتے سے کہا کہ ذرا مجھے جاتے جاتے وہ جہنم دکھا دیجیے گا۔ اس نے کہا کہ ہاں! آیئے۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا وہاں جا کے دیکھا کہ وہ ایک بڑا لمبا چوڑا بے انتہا (میرے ذہن میں آیا کہ آگ کے شعلے ہونگے، وہ دور دور تک ان کی تپش پہنچ رہی ہوگی) وہاں جا کے دیکھا تو وہ یخ بستہ بالکل ٹھنڈا۔ میں نے اس سے کہا کہ جہنم کے متعلق تو ہم نے یہ سن رکھا ہے کہ اس میں تو آگ بھڑکتی ہے اور دور دور

تک اس کے شعلے جاتے ہیں' یہ تو ٹھنڈا ہے' آگ کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے یہ خود تو ٹھنڈا ہی ہے آگ اس میں جلتی ہے۔وہ کہتا ہے کیسے؟ وہ کہنے لگا کہ ہر شخص جو جہنم میں داخل ہوتا ہے اپنا اپنا ایندھن خود ساتھ لاتا ہے۔جہنم کی آگ خود ان کے اپنے ایندھن سے بھڑکتی ہے۔یہاں پہ جو کوئی بھی آتا ہے۔اپنے انگار ساتھ لاتا ہے

کہاں قرآن حکیم اور اقبال کا محاکاتی انداز اور کہاں ہمارے ہاں کی یہ تفسیریں

بڑا خوبصورت انداز ہے صاحب اقبالؒ کا۔قرآن نے تو اتنا ہی کہا تھا اپنی اپنی لکڑیاں اپنے اپنے بوجھ لادے چلے آ رہے ہیں۔یہیں سے اس نے لی ہے بات' فراست اس کی بڑی عجیب تھی' کہنے کا انداز قدرت نے بڑا حسین دیا تھا۔اور یہ وہ آگ ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ (105:6) یوں لکڑیوں سے جلنے والی آگ نہیں' وہ آگ جو انسان کے دل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔اف۔وَ هُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا (6:31) قرآن کا انداز عزیزانِ من! وہ عربی جاننے والے سراہیں گے۔یہاں جو اَلَا کہا ہے۔اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ (6:31) انہیں معلوم نہیں کہ کتنا تباہ کن ہے یہ بوجھ جو اٹھائے لیے چلے آ رہے ہیں' ایسا بوجھ جو ان کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔اتنا بھی نہیں کہ راستے میں پھینکتے چلے آئیں۔پھینک تو سکیں گے نہیں' اٹھائے ہوئے ہیں چلے آ رہے ہیں کشاں کشاں رواں دواں۔اتنی بھی اجازت نہیں ہے کہ بوجھ کو پھینکیں۔اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ (6:31) کتنا بڑا بوجھ ہے اور اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔آہاہا۔کہتا ہے یہ کون تھے؟ وہی جنہوں نے کہا تھا کہ زندگی یہاں کی زندگی ہے۔انہیں معلوم ہونا چاہیے ایسا کہنے والوں کو کہ وَ مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ (6:32) قرآنِ کریم کے عام تراجم میں آپ دیکھیں گے کہ یہی ہوگا کہ یہ زندگی دنیا کی کھیل تماشے کی زندگی ہے۔اور یہ جو آیت قرآن میں ایک دفعہ نہیں آئی' متعدد مقامات میں ہے بس اس کو بنایا بنیاد۔کہ یہ زندگی بس کھیل تماشے کی زندگی ہے اور تو کچھ ہے ہی نہیں۔اور پھر یہ ترکِ دنیا' یہاں جی نہ لگانا اور یہ سب کچھ اس کے اوپر۔وہ یہ دو لفظ جو اس میں آ گئے۔

قرآن حکیم کے نزدیک کائنات اور انسان کا باہمی تعلق اور اس کا مقصد

ذرا سوچیے عزیزانِ من! اس دنیا کی زندگی کے متعلق قرآن جو کچھ کہتا ہے سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (45:13) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سارا تمہارے لیے تابع تسخیر کیا ہوا ہے۔آپ دیکھ رہے ہیں۔جس کی حیثیت یہ ہو کہ وہ یونہی کھیل تماشا ہو' "لکھو گھوڑے جینوں کیندے ہیگے نیں" بچوں کا کھیل' گھروندے جیسے بچے بناتے ہیں اس کے لیے وہ خالق کائنات اتنی بڑی چیز بتائے گا کہ ہم نے مسخر کر کے رکھ دیا تمہارے لیے؟۔جس زندگی کے متعلق دعا یہ سکھائی گئی ہے کہ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ (2:201) بعد میں کہا ہے۔اس دنیا کی زندگی میں خوشگواریاں۔وہ ایمان اور اعمالِ صالح کا نتیجہ

یہ بتاتا ہے لَیَسۡتَخۡلِفَنَّھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (24:55) اس دنیا کے اندر تمکن اور حکومت اور مملکت عطا ہوگی۔ وہ خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا(2:85) اس دنیا کی زندگی میں ذلت اور خواری کو خدا کا بدتر عذاب قرار دیتا ہے۔ جن قوموں کو اس دنیا میں ذلت نصیب ہوتی ہے ضُرِبَتۡ عَلَیۡھِمُ الذِّلَّۃُ وَ الۡمَسۡکَنَۃُ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ (2:61) خدا کا غضب ان قوموں کے اوپر کہ جو دنیا میں ذلت کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس دنیا کی زندگی کو وہ کتنی اہمیت دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر یہ کیا ہے جو کچھ وہ کہتا ہے۔ بات بڑی آسان سی ہے سمجھنے کی ہے۔ یہ زندگی' دنیا' اس کی متاعِ حیات' ساز و سامانِ زیست حتیٰ کہ قرآن کہتا ہے آرائش و زیبائش کی چیزیں بھی۔ سورۃ اعراف میں جو ہے کہ ان سے پوچھو کہ کون ہے جو ان چیزوں کو کہ جن کو خدا نے اپنے بندوں کے لیے زینت کا موجب بنائی ہیں حرام قرار دیتا ہے۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے۔ کہ یہ ساری چیزیں اس قابل ہیں کہ ان کو حاصل کیا جائے' تمتع کیا جائے' فائدہ اٹھایا جائے۔ یہی مومن کی زندگی ہے' کائنات کو مسخر کیا جائے۔

انسانی زندگی اور طبعی زندگی کے باہمی رشتے کے بنیادی فرق کی وضاحت

یہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن زندگی اتنی ہی تو نہیں' یہ سارا کچھ تمہاری طبعی زندگی سے متعلق ہے۔ دنیا اور اس کی آسائشیں آرائشیں سب انسان کی طبعی زندگی کے متعلق ہیں' کہتا ہے نہایت ضروری ہے یہ۔ لیکن انسان کی زندگی طبعی' زندگی تو نہیں اس سے اونچی اس کی ایک انسانی زندگی بھی ہے اور وہ زندگی ہے جو مستقل اقدار کے تابع چلتی ہے۔ کہتا ہے کہ اگر ایسا وقت آ جائے (یہ ہے غور طلب چیز عزیزانِ من!) ایسا وقت آ جائے کہ دنیا کی کسی جاذبیت اور کشش میں اور کسی مستقل قدر کے اندر' جس کا تعلق انسانی زندگی سے ہے' دونوں میں تصادم ہو رہا ہو' ٹکراؤ ہو رہا ہو' Tie دونوں میں پڑ رہی ہو۔ دس ہزار روپیہ ایک طرف رکھا ہوا ہو' اسے تھوڑے سے فریب سے' جھوٹ سے' رشوت سے' لینے کا ذریعہ بن رہا ہو' مستقل قدر یہاں سامنے آ جائے گی دیانت اور امانت۔ دونوں کے اندر ٹکراؤ پیدا ہو گیا۔ کہا جب یہ وقت کہیں آ جائے تو اس وقت یہ سمجھو کہ یہ سب کچھ دنیا اور جو کچھ اس کا متاع و ساز و سامانِ حیات ہے اس کے مقابلے میں پرِ کاہ جتنی حیثیت نہیں رکھتا' کھیل اور تماشے جتنی حیثیت رکھتا ہے۔

قرآنی لفظ 'لعب' کے لغوی مفہوم کو سمجھنے کے لیے بھنور میں پھنسی کشتی کی مثال

یہیں دیکھیے اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَھۡوٌ ط وَ لَلدَّارُ الۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لِّلَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ ط (6:32) ایک ہی آیت میں بات بتا دی کہ جب تقابل ہوگا ان دونوں کا' تصادم ہوگا ان دونوں کے اندر' وہاں پھر یہ یاد رکھو کہ اس کے مقابلے میں پوری دنیا کی دولت اور متاع پرِ کاہ جتنی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس Tie کے وقت یہ سمجھ لیجیے یہ زندگی لَعِبٌ(6:32) ہے اور لَھۡوٌ (6:32) کی ہے۔ کیا الفاظ قرآن استعمال کر جاتا ہے۔ یہ جو لَعِبٌ(6:32) ہے اس کے معنی ہوتے ہیں کہ حرکت تو رہے لیکن انسان منزلِ مقصود تک نہ پہنچے۔ وہ عرب اس کو استعمال

کرتے تھے **لعب من الموج** دریا کی موجیں جو ہیں کشتی کو مصروفِ حرکت تو رکھ رہی ہیں اس کو ساحل کی طرف نہیں لے جا رہیں۔ آ ہا ہا ہا۔ کیا قوم تھی اور کیا ان کی زبان تھی۔ مصروفِ حرکت تو رکھ رہی ہیں۔ ایک تو یہ زندگی ہے نا کہ افیون کھائی ہوئی ہے' سو رہے ہیں' کر ہی کچھ نہیں رہے۔ آپ دنیا کی قوموں کی طرف دیکھئے کہ امواجِ مضطرب کس طرح ان کی کشتی کو حرکت میں رکھے ہوئے ہیں۔ ایک سیکنڈ کے لیے کشتی کو سکون میسر نہیں آ رہا' مسلسل حرکت ہے۔ حرکتِ مسلسل بھی لیکن ایک قدم کشتی کا ساحلِ مراد کی طرف نہیں اٹھتا' ایک بھنور سے نکلتی ہے دوسرے بھنور میں جا پھنستی ہے۔

؎ رُست از یک بند تا افتاد در بندِ دگر

بھنور میں الجھی ہوئی اس کشتی کو انسانیت کی منزل مقصود آخر کس طرح حاصل ہو گی؟

کیفیت یہ ہو رہی ہے **لعب من الموج** ۔ کہا اس وقت سمجھ لیجیے کہ یہ دنیا کی زندگی حرکتِ مسلسل تو ضرور ہے اس کے اندر' لیکن اگر انہی کے اندر تمہاری کشتی مبتلا ہو کر رہ گئی تو یہ تمہیں ساحلِ مراد تک نہیں پہنچائیں گے۔ کشتی کو چلنا چاہیے روشنی کے مینار کی طرف دیکھ کر' ساحل کو سامنے رکھ کر' اس کی حرکت کا ہر رخ ساحل کی طرف ہونا چاہیے۔ اور کشتی حیات کا رخ' مستقل اقدارِ خداوندی متعین کرتی ہیں۔ اب یوں حرکت جو ہے یہاں کی وہ ضروری ہو گئی۔ یعنی اگر امواجِ سمندر حرکت نہیں کشتی کو دے رہیں تو کشتی تو ساکن رہ جائے گی چلے گی نہیں۔ وہ کہتا ہے کشتی کا چلنا ضروری ہے۔ ان موجوں کا ہونا بڑا ضروری ہے۔ واہ واہ واہ۔ ورنہ سٹینڈ ہو جائے گی۔ ان کا ہونا بڑا ضروری ہے لیکن اس کشتی کو پانی کے اوپر رہنا چاہیئے' کہیں پانی کشتی کے اوپر نہ آ جائے۔ بس اتنا سا ہی فرق ہے۔ کشتی پانی کے اوپر ہے تو پانی اس کے لیے سہارا ہے' ممدِ حیات ہے' وہی ممدِ حیات اگر اس پہ غالب آ گیا ہے' وہی پانی اس کو ڈبو دیتا ہے۔ کہتا ہے ان موجوں کا کشتی کے ساتھ رہنا بڑا ضروری ہے بشرطیکہ یہ موجیں ذریعہ بنیں اس کشتی کے ساحل کی طرف جانے کا۔

لفظ ''لھو'' کے مفہوم کو سمجھنے کی ایک واضح مثال اور ''تکاثر'' کی کیفیت کا ذکر جس کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی

لَھْوٌ کہتے ہیں ایسی باتیں جو انسان کو اہم مقاصد سے ہٹا کر غیر اہم مقاصد کی طرف لے جائیں۔ وہ بکریاں چرانے کے لئے لڑکے کو بھیج دیتے تھے کہ بکریاں چراؤ اور وہ بکریوں کو باہر لے جاتا تھا۔ اور راستے میں کہیں مداری تھا بندر کے تماشے والا۔ اب مقصد تو اس کا وہاں چراہ گاہ میں لے جانا تھا اور جو یہ ڈگڈگی راستے میں بجی تو آپ کو پتہ ہے کہ بچہ وہاں کھڑا ہو گیا۔ یہ جو کیفیت ہوتی تھی' ریوڑ کو لے جانے والا بچہ راستے میں مداری کا کھیل دیکھنے کے لیے کھڑا ہو گیا اور ریوڑ وہاں رک گیا اس کو وہ لَھْوٌ (6:32) کہتے تھے۔ بجائے خویش یہ کوئی بری چیزیں نہیں ہیں لیکن دو مقاصد جب سامنے آئیں ان میں سے اہم مقصد کو چھوڑ کے اس سے کم مقصد میں جذب ہو جانا اور وہ راستے میں اناگیر آپ کا ہو جائے' یہ لَھْوٌ (6:32) ہوتا تھا۔ اور یہ وہ چیز تھی۔ آپ دیکھئے قرآن نے جہاں متاعِ حیات کو اتنی اہمیت دی

ہے'اس نے کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے زندہ رہنے کے لیئے' زیست کے لیئے' متاعِ حیات کی بڑی ضرورت ہے۔ لیکن یہی لفظ ہے۔ جی لَھْوٌ (6:32) جہاں سے ہے اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ (102:1) جب کیفیت تکاثر کی ہو جائے۔ یعنی یہ نہیں کہ ضروریات کے لیے یہ سامان چاہیے بلکہ مقصد یہ ہو جائے کہ دوسروں سے آگے بڑھنا ہے۔ اس کے پاس ایک موٹر ہے میرے پاس دو ہونی چاہئیں' اس کے پاس ایک کوٹھی ہے' چار ہونی چاہئیں اور ریس لگ رہی ہے پھر۔ قرآن کہتا ہے ضرورت کی تو ایک حد ہوتی ہے لیکن تکاثر جو ہے اس کی حد ہی نہیں ہوتی حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:2) ریس لگی ہوئی ہے اور جو بھاگتا چلا جا رہا ہے ہر ایک قبر کے اندر جا کے گرے گا۔ کیا بات ہے اس کے نقشے کی!! تکاثر کی ریس ختم کہاں ہوتی ہے؟ کہتا ہے قبر میں جا کے۔ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ (102:1) یہاں کہا ہے جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ہلاک کر دیے۔ یہ ہلاک نہیں ہے یہ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ (102:1) یہی ہے لَھْوٌ (6:32) ہے۔ یہ جو راستے میں جاذبیتیں آئیں گھر سے چلے تھے اتنا بڑا کام کرنے کے لیے۔ آپ سوچئے تو سہی سٹیشن پہ آپ نے جانا ہو وقت کے اوپر گاڑی پکڑنے کے لیے اور راستے میں وہ سپیرا ہو بین بجانے والا اور آپ وہاں کھڑے ہو جائیں۔ ٹھیک ہے یہ دلچسپی کا سامان ہے فارغ وقت میں یہاں کہیں کھڑے ہو جایئے۔ وہ کہتا ہے یہ لَعِبٌ (6:32) بولتے ہی اس وقت ہیں جب کسی زیادہ اہم Serious Nature کے کام سے راستے میں کوئی کم اہمیت کا کام آ جائے اور وہ اس کو پکڑ کے بیٹھ جائے' اسے لَھْوٌ (6:32) کہتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں قرآن کے الفاظ عزیزانِ من! تکاثر جو ہے تمہیں Seriousness of life جو ہے زندگی کے بلند مقاصد اس سے ہٹا کے کم درجے کی چیزوں میں الجھا کے رہ جاتا ہے۔ کہا ایسے وقت میں جب حیاتِ آخرت' دارالآخرت میں اور دنیا کی کسی جاذبیت میں Tie پڑ جائے تو اس وقت سمجھ لیجیے کہ جو دنیا کا سامان و زیست ہے یہ کیا ہے؟ لَھْوٌ (6:32) ہے' حرکت ہے جو مقصد کی طرف نہیں لے جا رہی۔ لَھْوٌ (6:32) ہے' ایسی جاذبیت ہے جو بلند مقصد سے ہٹا کر ایک Non Serious مقصد کی طرف تمہیں لے آ رہی ہے۔ وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (6:32) کہا یہ سارا کچھ جو تھا ہم نے بتایا کہ جذبات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ان سے کہو کہ ذرا جذبات کے دیے کو پیچھے ہٹا کے عقل سے کام لے کے دیکھیں' بات صاف ہو جائے گی۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس چیز کی طرف توجہ دی گئی ہے؟ تَعْقِلُوْنَ (6:32) عقل کو اپیل کیا جا رہا ہے کہ ذرا عقل و ہوش سے سوچو اس بات کو' سمجھ میں بات آ جائے گی۔ ہر شخص یہ کہے گا کہ ٹھیک ہے وقت کے اوپر گاڑی پہ پہنچنا ہے تو راستے میں کتنی جاذبیت کا تماشہ کیوں نہ ہو رہا ہو وہاں نہیں رکنا چاہیے ورنہ آپ ٹرین Miss کر جائیں گے۔ ہے نا ہوش کی بات یہ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (6:32)۔

انسانیت کی غم خوار ہستی نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد

یہ کشمکش جاری تھی عزیزانِ من! یہ نہ ماننے والے' یہ داعیٔ انقلاب ان کے بھلے کی کہنے والا' یہ جواب میں اینٹ اور پتھر مارنے والے۔ یہ طبیبِ مشفق پتھر کھاتا تھا' ان کے خلاف غصہ نہیں آتا تھا ان کے خلاف ہمدردی کا جذبہ اور زیادہ ابھرتا تھا۔ مریض بد پرہیز ہو جائے' مشفق ڈاکٹر کا ردِعمل اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ ہمدردی ہوتا ہے۔ غصے کا اظہار تو کچھ ہوتا ہے لیکن اس غصے کے اظہار میں ہمدردی ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہے' یہ کیوں نہیں مان رہا' یہ کیوں نہیں دوا پی رہا وقت کے اوپر' یہ کیوں نہیں پرہیز کر رہا۔ دیکھا آپ نے یہ! یہی وہ کیفیت ہے جو قرآن نے بتائی ہے نبی اکرم ﷺ کی کہ جب وہ دیکھتے کہ یہ قوم اپنے آپ کو تباہ کر رہی ہے اور عقل و ہوش کی بات نہیں سن رہی تو آپ ﷺ پہ یہ بات بڑی ہی گراں گذرتی تھی بہت ہی افسردہ خاطر آپ ﷺ ہوتے تھے۔ کہا قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِىْ يَقُوْلُوْنَ (6:33) کہا ہمیں معلوم ہے کہ جو کچھ یہ باتیں کرتے ہیں' اس سے تمہیں بڑی کبیدہ خاطری ہوتی ہے' حزن پیدا ہوتا ہے۔ اور اس میں پھر یہ بھی بات ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ غلط ہے جھوٹ ہے' اس کا بھی انسان پہ اثر ہوتا ہے۔

سیرتِ نبوی کا وہ عظیم ترین معجزہ جو آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے متعلق ہے

عزیزانِ من! دو لفظ قرآن یہاں کہہ گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے لیے بہرحال ہمارے لیے کسی شہادت اور Certificate کی ضرورت نہیں ہے' اقوامِ عالم کے لیے Certificate ہے۔ یہ لفظ کہنے سے پہلے وہ دہرا دوں کہ نبی اکرم ﷺ کے لئے یہ اپنی قوم تھی' اپنا معاشرہ تھا' اپنا ملک تھا۔ انہیں میں آپ ﷺ نے زندگی گذاری تھی۔ آپ ﷺ ان سے کہتے ہیں کہ تم مجھ سے آ کے کہتے ہو کہ میں یہ جو دعویٰ کر رہا ہوں اس کی صداقت کے ثبوت میں کوئی شہادت پیش کروں۔ تم مجھ سے کچھ معجزے مانگتے ہو کہ کوئی معجزہ دکھاؤں کہ جس سے معلوم ہو کہ میں واقعی سچا ہوں۔ کہا آؤ تمہیں میں اپنا معجزہ دکھاؤں۔ سنو! توجہ سے دیکھو کہ یہ کیا معجزہ ہے۔ کہا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (10:16) میں باہر سے نہیں آیا کہیں' اجنبی نہیں' کوئی مسافر نہیں کہ پہلے دن یہاں آیا۔ میں نے ساری زندگی تمہارے اندر بسر کی ہے۔ میں تم ہی سے پوچھتا ہوں سینے پہ ہاتھ رکھ کے بتاؤ کہ اس قسم کی زندگی ایک سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی ہوتی ہے۔ مثال نہیں ملتی اس ثبوت کی کہیں بھی۔ اور میں کہتا ہوں کہ دنیا میں انقلاب پیدا ہی وہ کر سکتا ہے جو مخاطب سے یہ کہے کہ میں نے تمہارے اندر اپنی زندگی بسر کی ہے بتاؤ رکھو انگلی میری زندگی پر' میرے کریکٹر کے اوپر کہیں۔ کہو کہ یہ زندگی ایک پاک بیں اور پاکباز انسان کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی زندگی ہوتی ہے۔

سیرت رسول ﷺ کے متعلق ابوسفیان جیسے دشمن کی حق گوئی

تیئیس سال کے اس پورے دعویٔ رسالت کی زندگی میں عزیزانِ من! بد سے بدترین دشمن نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ تمہاری سیرت اور کردار میں ہم نے یہ چیز دیکھی ہے۔ سامنے ہی نہیں، ہرقل کے دربار میں بھی جب ابوسفیان مدد مانگنے گیا تھا ان کے خلاف۔ اس سے بھرے دربار میں یہ پوچھا تھا کہ یہ شخص جو تم کہتے ہو کہ نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے، یہ تمہارا اپنا آدمی ہے یا باہر سے آیا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ اپنا آدمی ہے، ہمارا آدمی ہے، ہمارا عزیز ہے، ہمارے ہاتھوں کا پلا ہوا ہے، ہم میں زندگی بسر کی ہے۔ اُس نے کہا کہ کہو اس کی زندگی کیسی ہے پھر؟۔ اندازہ لگائیے! ابوسفیان جیسا دشمن اس مشن پہ گیا ہوا ہے۔ ہرقل جیسے دشمن کے دربار میں کھڑا ہے، اس سے مدد لینی ہے اس شخص کے خلاف۔ یہ وہ پوچھتا ہے۔ موجودہ سیاست کا کوئی لیڈر رہوتا تو آپ کو معلوم ہے یہ کیا کرتا۔ عام لیڈر نہیں میں شہادتیں پیش کرتا ہوں مہاتما بھی ہوتا تو آپ کو معلوم نہیں کیا کرتا۔ ابوسفیان وہاں اس سے یہ کہتا ہے کہ یہ تو ہم بتائیں گے کہ اس کی زندگی میں ہم نے کسی قسم کی خرابی نہیں دیکھی ہے۔ تو اس نے جواب میں یہ کہا کہ جس نے چالیس سال تمہارے اندر زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا، وہ یہ بھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ قرآن شہادت دیتا ہے کہ ٹھیک ہے ان کی باتیں بڑی گراں گذرتی ہیں اے رسول ﷺ تم پہ۔ فَاِنَّھُمۡ لَا یُکَذِّبُوۡنَکَ (6:33) فرق کرو دونوں باتوں میں۔

دشمنوں کی طرف سے مخالفت نبی اکرم ﷺ کی نہ تھی بلکہ یہ سب کچھ قوانین خداوندی کے خلاف تھی نظام کے خلاف تھی

وہ یہ نہیں کہتے تو جھوٹا ہے۔ وَ لٰکِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجۡحَدُوۡنَ (6:33) یہ کہتے ہیں کہ جو تم نظام اور اصول اور یہ خدا کے قوانین بیان کرتے ہو اور کہتے ہو کہ ان کا نتیجہ یہ نکلے گا، خلاف ورزی کرو گے تو یہ بات ہے، یہ اس چیز کو جھٹلاتے ہیں، تمہیں تو نہیں جھوٹا کہہ رہے۔ اور پھر یہاں یَجۡحَدُوۡنَ (6:33) کہہ کے تو بات ہی کہیں سے کہیں لے گیا قرآن۔ جَحَدُ کہتے ہیں اس قسم کے انکار کو کہ دل تو اندر سے مانے کہ بات ٹھیک ہے لیکن جھوٹی عزت یا مفاد پرستی کا خیال اعتراف نہ کرنے دے اس بات کا۔ کیا کہا ہے قرآن نے!! کہتا ہے ایک تو یہ ہے کہ تجھے جھوٹا نہیں کہتے، ان کو جرآت ہی نہیں، تم نے کبھی جھوٹ ہی نہیں بولا۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ جو تم کہتے ہو کہ ہماری یہ روش تباہیاں ہم پہ لے آئے گی، یہ بات غلط ہے۔ اور اسکی بھی یہ صورت ہے کہ دل سے تو مانتے ہیں کہ ہاں بات تو کچھ ٹھیک ہی کہتا ہے۔ جب یہ کہتا ہے کہ یاد رکھو! یہ جو تم لوگوں کو اتنا بھوکا مار رہے ہو، ضروریاتِ زندگی سے محروم کر رہے ہو، تو ابھی تک تو یہ برداشت کی قوت ان میں ہے۔ آگے جب بڑھ گئے اور جب ان پہ فاقے آنے شروع ہو گئے تو تمہیں پتہ ہے کہ بندریا کے پاؤں جلنے لگے تھے تو اس نے اپنے

بچوں کو پاؤں کے نیچے لے لیا تھا۔ اگر ایسی ان کی کیفیت ہوگئی تو پھر یہ اٹھ کے سب کچھ چھین جھپٹ لیں گے۔ اس لیے ابھی سے کیوں نہیں اس میں تم اصلاح کر لیتے۔ کہتا ہے دل تو ان کا مانتا ہے کہ بات تو ٹھیک ہی کہتا ہے لیکن پھر کئی قسم کی Consideration اور مفاد پرستیاں ہیں جو اس طرف آنے نہیں دیتیں۔ یہ جو اس قسم کا انکار ہوتا ہے' عربی میں اسے کہتے ہیں جَحدُ۔ قرآن نے اسکی تشریح کردی دوسرے مقام پہ۔ جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں۔

آزاد قوم کے نزدیک محکوم قوم کا مقام

عزیزانِ من! قرآن تو دوسرے مقام پہ تشریح کرتا ہے۔ وہ بات ہے دربارِ فرعون کی اور ساحرین کی۔ کہا یہ سب کچھ انکے سامنے ہوا۔ میں کہہ رہا تھا کہ جَحدَ جو ہے قرآن کا لفظ یا عربی زبان کا اس کی تفسیر قرآن نے کیسے کی ہے۔ وہ کہتا ہے وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا (27:14) انکار کر رہے تھے درآں حالیکہ دل ان کے اندر سے مان رہے تھے یقین کر رہے تھے کہ ٹھیک ہے۔ جَحَدُوْا . ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (27:14) وہ جو ان کی سرکشی تھی نا! ہم قومِ غالب' قومِ فرعون۔ پہلے ہی کہہ دیا تھا فرعون نے کہ یہ آیا ہے ہمیں سمجھانے کے لیے ہمیں کچھ بتانے کے لیے کہ تباہ و برباد ہو۔ وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (23:47) یہ ہماری محکوم قوم کا ایک فرد اور آیا ہے ہمیں سمجھانے۔ بات ٹھیک ہے صاحب! محکوم قوم کی کوئی بات قابل اعتماد نہیں سمجھی جاتی۔

ے جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

مفاد پرست طبقوں کی سرگشت جنہوں نے ہمیشہ حق کی مخالفت کی ہے

فرعون نے یہ کہا تھا کہ ہماری محکوم قوم کا ایک فرد اور ہمیں سمجھانے آیا ہے۔ یہاں بھی وہ کہہ رہا ہے ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (27:14) کی بنا پر کیفیت یہ ہے کہ اعتراف نہیں کرتے' دل مان رہا ہے کہ بات یہ سچی کہہ رہا ہے کہ بنی اسرائیل کو بھیج دو میرے ساتھ ورنہ جس حالت میں تم ان کو رکھ رہے ہو ان کا احساس بیدار ہوگیا تو سیلاب بن جائیں گے یاد رکھو۔ تم نے وہاں جا کے ڈوبنا ہے' یہیں غرق ہو جاؤ گے۔ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰهُمْ نَصْرُنَا (6:34) کہتا ہے یہ بات کوئی نئی نہیں ہے کہ تمہارے ہی ساتھ ہوئی ہو۔ پوری انسانی تاریخ کی سرگذشت ہی اس کی شاہد ہے کہ جہاں اور جب بھی کسی نے اس قسم کے انقلاب آفریں پیغاماتِ خداوندی دیئے مفاد پرست طبقوں نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی اس کو جھٹلایا' اس کی مخالفت کی' ان کو ایذائیں دیں۔ انہوں نے مقابلے میں کیا کیا؟ فَصَبَرُوْا (6:34) ''آ پنجابی والا صبر نئیں! جھولی کڈ کے دعاواں منگنا میرا صبر''۔ انہوں نے استقامت دکھائی جم کے ڈٹے رہے اپنے اس دعوے پر' اپنی اس پکار پر' اپنے اس اعلان پر۔

حق کی خاطر استقامت کے ساتھ جم کر کھڑے ہونے کا نتیجہ' سرفرازی کے ساتھ ایک دوسرے نظام کی شکل میں نکلتا ہے

صبر کے معنی استقامت ہوتا ہے۔ جمے رہے۔ اور اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ اَتٰھُمْ نَصْرُنَا (6:34) قانونِ خداوندی کی نصرت اور تائید آ گئی' ان کے شاملِ حال ہوگئی' انہوں نے تختہ الٹ کے رکھ دیا۔ کہتا ہے یہ کچھ پہلے بھی ہوتا چلا آیا ہے۔ اور آگے سنئے عزیزانِ من! یہ جو کہتے ہیں قرآن نے تاریخ کی بڑی اہمیت بتائی ہے۔ کیا اہمیت ہے وہ؟ کہا' یہ پہلے بھی ہوتا چلا آیا ہے وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (6:34) اور خدا کے قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔ پہلے بھی یہ ہوتا رہا اور وہ اس کا نتیجہ نکلا' آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے' اس کا بھی وہی نتیجہ نکلے گا کوئی نئی بات نہیں۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ شکن نئے
وہی فطرتِ اسد الٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

اس کا دوسرا شعر یاد آ گیا

گلۂ جفائے وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کبھی بت کدے میں بیاں کروں تو صنم بھی کہہ دے ہری ہری

عجیب بات کہہ گیا ہے۔ گلۂ جفائے وفا نما' یہ جو ہو رہا ہے تیئیس برس سے یہاں: اسلامی مملکت' اسلام کے نام پہ حاصل کی گئی' اسلامی دستور بنے گا۔

گلۂ جفائے وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کبھی بت کدے میں بیاں کروں تو صنم بھی کہہ دے ہری ہری

تاریخ کو بدلنا تو انسان کے اپنے اختیار میں ہے لہٰذا یہ چیز نظام سے وابستہ ہوتی ہے

وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (6:34) یہ ہے تاریخ کی اہمیت ہیگل اور مارکس کی نہیں ہے کہ تاریخ جدلیات کا نام ہے جس پہ انسان کو کوئی بس نہیں' بے بس بیٹھا دیکھ رہا ہے۔ تاریخ کی قوت ایک نظام کو لاتی ہے وہ جب پختگی پہ پہنچتا ہے تو اس میں اس کا بدل اس کا الٹ ایک دوسرا نظام نکلتا ہے انسان کو اختیار ہی نہیں کہ اس کو بدل سکے اس قدر بے بس اور مجبور انسان۔ قرآن کہتا ہے یہ بات غلط ہے۔ قوانین ہیں جو ان کے مطابق زندگی بسر کرے گا' خوشگوار نتائج نکلیں گے جو ان کی خلاف ورزی کرے گا' تخریبی نتائج برآمد ہوں گے۔ تاریخ

کی سرگذشتیں اس کی شہادت دیتی ہیں اور لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (6:34) قوانینِ خداوندی میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔

قرآن حکیم میں تاریخی داستانوں کو بیان کرنے کا مقصد اصولِ زندگی کو بیان کرنا ہے

وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ (6:34) اور یہ ہے وہ ضرورت جس کے لیے ہم انبیائے سابقہؑ کی تاریخ بیان کرتے ہیں تمہارے سامنے' ان کے قصے بیان کر رہے ہیں۔ یہ کوئی تاریخ کی کتاب نہیں' نہ ہی یہ نانی اماں کی لوری ہے' جو رات کو بچوں کو سلانے کے لیے دی جاتی ہے۔ وہ وعظ جسے آپ کہتے ہیں' یہ تو لوریاں ہوتی ہیں۔ قرآن نے سامری کو کہا ہے کہ وہ سنایا کرتا تھا۔ سامری ہوتا ہے جو رات کو سوتے وقت داستانیں سنایا کرتا ہے۔ کہا یہ جو ہم مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ (6:34) تمہیں دے رہے ہیں۔ انبیائے سابقہؑ اور اقوامِ گذشتہ کی سرگذشتیں پیش کر رہے ہیں تو یہ ثابت کرنے کے لیے کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (6:34) قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ بات شروع ہو رہی ہے آگے کچھ نئی' وقت رہ گیا ہے تین چار منٹ۔ بات اہم ہے جی۔ وہی سوال یہ کہ معجزہ دکھا کے حقیقت منواتا تھا نبی' کرامتیں دیکھنے کے بعد اولیاء اللہ کے مقام مانے جاتے ہیں یا کوئی اور طریقہ ہے حقیقت کے ماننے کا۔ ہے نا سوال بڑا اہم۔ یہ آگے آ رہا ہے اور بڑی ہی تفصیل سے قرآن نے اس کو بیان کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ آج بات شروع کی تو یہ ختم نہیں ہوگی اس لیے ہم اسے آئندہ اتوار پہ اٹھا رکھتے ہیں۔ سورۃ الانعام کی آیت 34 تک ہم آ گئے عزیزانِ من!۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

چوتھا باب **سورۃ الانعام** (آیات 35 تا 38)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اگست 1971ء کی 8 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی 35 ویں آیت سے ہوتا ہے (6:35)۔

علامہ پرویز کے نزدیک انگریزی میں کتاب لکھنے کا مقصد اور پھر اس پر یورپ والوں کا تبصرہ

شاید آپ میں سے اکثر احباب کو معلوم ہو کہ میں نے انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھی۔ مقصد اس کا تھا مغرب کے فلاسفرز' Historians , Scientists وغیرہ کے سامنے اسلام کو پیش کرنا' اسلام کو Introduce کرانا۔ اس کتاب کا ٹائٹل یا عنوان جسے کہتے ہیں وہ ہے Islam a Challenge to religion۔ اہل مغرب تو ان معاملوں میں بہت باریک بیں ہوتے ہیں وہ خود اس ٹائٹل کو دیکھ کے ہی چونک اٹھے۔ اور میں نے عمداً یہ ٹائٹل اس کا رکھا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام مذہب کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ بڑی متضاد سی بات نظر آتی تھی۔ اسلام تو یکے از مذاہبِ عالم شمار کیا جاتا ہے' دنیا کے مذاہب میں سے ایک مذہب' ہم خود یہی کچھ کہتے چلے آ رہے ہیں' ساری دنیا یہی سمجھتی چلی آ رہی ہے۔ ایک شخص اٹھتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اسلام تو مذہب کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ تو وہاں اس کتاب کو بڑا Seriously لیا گیا۔ اور مجھے خوشی ہوئی کہ انہوں نے اسلام کی اس حیثیت کو متمیز طور پر پہچانا کہ یہ مذہب نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ان میں سے دو ایک بڑے بلند مرتبہ مشنری فلاسفر تھے' انہوں نے تو مجھے لکھا کہ آج تک مسلمانوں کا مقابلہ عیسائیت کے ساتھ ہوتا رہا۔ یہ مناظرے کرتے رہے' مباحثے کرتے رہے۔ اور ان میں اگر میں یہ نہ کہوں کہ ہم جیتتے تھے تو کم از کم یہ ماننا پڑتا ہے کہ برابر سرابر کشتیاں رہتی تھیں۔ لیکن اسلام کی یہ جو حیثیت تم نے بتائی ہے تو اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ کم از کم عیسائیت تو اسلام کے مقابلے میں اکھاڑے میں آ ہی نہیں سکتی۔ ان دونوں کے میدان ہی تم نے مختلف کر دیے ہیں۔ اور ہمیں اب اس کے بعد سوچنا پڑے گا کہ عیسائیت کو اسلام کے مقابلے میں لائیں کس گوشے سے۔

مذہب کے مقابلے میں دین کے پیش کردہ تصور کی اہمیت

میں اس چیز کو قرآنِ کریم کی رو سے ایک عرصہ سے پیش کر رہا ہوں کہ قرآن مذہب کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ مذہب یا Religion کی جتنی بنیادی خصوصیات ہیں وہ ان ایک ایک کو توڑتا چلا جاتا ہے اور اس کے بعد دنیا حیران ہوتی ہے کہ خود اسی سٹیج پہ کھڑا ہے۔ یہ بہت بڑی خصوصیت ہے اور کوئی بات ہو یا نہ میں کہتا ہوں یہی ایک دلیل اور اگر اس کو قرآن سے ثابت کر دیا جائے تو اس چیز کے لیے کافی ہے کہ کم از کم قرآن تو ضرور خدا کی کتاب ہے۔ انسانوں کی تصنیف اسے مذہب کے ہی زمرے میں شامل کرتی ہے۔ مذہب کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ کسی اہلِ مذہب کو آپ دیکھئے وہ جب بھی اپنے بانی مذہب کی بات کرے گا' اس کی خصوصیات' معجزات بتائے گا۔ وہ اپنے مذہب کا مدار ہی اس پہ رکھے گا کہ ہمارے وشن جی نے پہاڑ کو جلا دیا' رام چندر جی نے دریا کو کھڑا کر دیا' اس نے مردے جلا دیئے' اس نے اندھوں کو اچھا کر دیا۔ ان اہلِ مذاہب کے بانیاں کی باتیں تو سننے میں آپ کے کم آتی ہونگی' یہ آپ کے ہاں کے جتنے اہلِ تصوف اولیائے کرام گنے جاتے ہیں ان کے ہاں تو اکثر جو لوگ جاتے ہیں' شاید آپ بھی جاتے رہے ہوں۔ وہاں آپ جا کے دیکھئے ان مجاوروں سے وہ کوئی ان کی تعلیم خاص پیش نہیں کریں گے حتیٰ کہ ان کی کوئی کتاب بھی عام نہیں کریں گے۔ وہ ایسی ہوتی نہیں ہیں کہ انہیں عام کیا جائے۔ جتنا عرصہ آپ وہاں رہیں گے' وہ حضرت صاحب کی کرامات سناتے رہیں گے آپ کو۔ اور یہ جو دنیا جائے گی بھی وہاں' وہ مرجع انام جو بنا رہے گا۔ ان کے ہاں کا آستانہ' وہ ان کی کرامات کے زور پہ بنا رہے گا۔ جتنے لوگ بھی وہاں جائیں گے' کچھ ان کی تعلیم سے حاصل کرنے کے لیے نہیں جاتے' وہ جاتے اس لیے ہیں کہ کرامت کے زور پہ وہ کچھ کر دکھاتے ہیں جو عام حالات میں عام طریقوں سے نہیں ہوسکتا۔ انبیاء یا بانیانِ مذاہب کے معجزات اور اسی کا نام انہوں نے پھر اولیاء کرام یا صوفیاء کے قصے میں کرامات رکھ لیا ہوا ہے۔ کچھ فوق الفطرت سی بات' محیر العقول سے کارنامے' ایسے شعبدے جو سمجھ میں نہ آئیں۔ یہ ہر مذہب میں ہوگا دنیا کی ہر قوم میں ہوگا۔ یہ مذہب کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔

قرآن حکیم مافوق الفطرت کی بجائے زندگی کے غیر متبدل اصولوں کو دلیل و براہین سے پیش کرتا ہے

قرآنِ کریم کی کیفیت یہ ہے کہ شروع سے آخر تک دیکھ جایئے۔ وہ اسکی مخاطب اولیں قوم جو ہے' وہ اسے بھی مذہب سمجھ کے اسی کا مطالبہ کرتی ہے۔ ہر مقام پہ اس کی تردید کی جاتی ہے' اس سے انکار کیا جاتا ہے۔ ان سے کہا جاتا ہے کیا مانگتے ہو تم۔ میں تمہاری عقل و فکر کو اپیل کر کے ایک بات کہتا ہوں۔ تم کہتے ہو کہ یہ چراغ گل کر کے پھر ہم کو یہ مذہب بتاؤ۔ سارا اس چیز کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ غور فرمایا آپ نے کہ کس طرح سے مذہب کے پورے دائرے میں سے الگ ہو جاتا ہے یہ۔ ان حضرات کے متعلق جہاں یہ احسان گنائیں گے

ان کے مجاور کہ یہ یہاں آئے تو کفرستان تھا اور پھر آپ نے یہاں اسلام پھیلایا۔ کیسے پھیلایا؟ وہاں بیٹھ گئے سارا علاقہ ہندوؤں کا تھا۔ ایک دن ایک مردے کو لیے جا رہے تھے۔ وہ حضرت صاحب نے فرمایا کہ رکھو یہاں اس کو' وہ رکھ دیا اور انہوں نے کہا کہ اٹھ اللہ کے نام سے اور وہ اٹھ کے بیٹھ گیا اور سارا علاقہ مسلمان ہو گیا۔ یعنی ان علاقوں کو مسلمان کرنے یا ان قوموں کو مسلمان بنانے میں کسی تعلیم کا اثر نہیں' وہ کوئی نہ کوئی کرامت دکھائی' مسلمان ہو گئے۔ اب ان کی کرامت تو ایک چھوٹے سے علاقے کے ایک چھوٹے سے حلقے کی کرامت تھی۔ ان سے اگر اتنا علاقہ مسلمان ہو سکتا ہے تو آپ سوچئے کہ یہ انبیائے کرامؑ جو تھے ان کو یہ کیا مصیبت پڑی ہوئی تھی' ساری زندگی مخالفین کی مخالفت میں گذر گئی۔ گالیاں کھا رہے ہیں' مار کھا رہے ہیں اذیتیں پہنچائی جا رہی ہیں' وطن چھوڑنا پڑ رہا ہے' میدانِ جنگ میں جا رہے ہیں' شہید ہو رہے ہیں' اذیتیں برداشت کی جا رہی ہیں۔ آخر اس کی ضرورت کیا تھی پھر۔ اُن کو تو ایک کرامت دکھا دی جاتی' علاقے کا علاقہ مسلمان ہو جانا چاہیے تھا۔ اگر حضرت صاحب کی اتنی سی کرامت سے ایک چھوٹا سا گاؤں' چھوٹا سا علاقہ مسلمان ہو جاتا ہے تو ان کی کرامت سے جسے معجزہ کہا جاتا ہے' اس سے تو آدھی دنیا یا ان کا دائرۂ تبلیغ وہ سارا مسلمان ہو جانا چاہیے تھا۔ کیا بات ہوئی ان کی؟ وہاں کیوں نہ یہ کچھ ہوا؟۔

آج ہماری مجلسوں میں اسلام کے نام پر پیش کی جانے والی تعلیم کی نوعیت

اور معاف فرمائیے ہمارے ہاں بھی جب یہ دین مذہب کی سطح پہ لایا گیا تو آج آپ اپنے ہاں کے وعظ اور میلاد کی مجلسوں میں جائیے تو وہاں بھی آپ کو معجزات گنائے جائیں گے وہاں حضورﷺ کے۔ معجزے بھی اس قسم کے عالمگیر' ساری دنیا جن کو دیکھے۔ چاند کی طرف حضورﷺ نے انگلی کی تو دو ٹکڑے ہو گیا آدھا اِدھر سے نکل گیا آدھا اِدھر سے نکل گیا بغل کے نیچے سے یا پہاڑ کے ایک طرف آدھا ہو گیا' ایک طرف آدھا ہو گیا۔ آپ سوچئے تو سہی ذرا کہ آپ کے اس حضرت لسوڑی شاہ کے ذرا سے کسی معجزے سے کہ انہوں نے کسی آنکھ میں لب لگا دیا اور آنکھ اچھی ہو گئی' علاقہ مسلمان ہو گیا۔ یہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے' ساری دنیا نے اس کو دیکھا ہو گا اور باقی دنیا تو ایک طرف رہی' وہ مکے والے بھی کافر کے کافر ہی رہے۔ یہ بڑے سوچنے کی چیزیں ہیں عزیزانِ من!۔ یہ ٹھیک ہے کہ باقی اہلِ مذاہب کے مقابلے میں مناظرے میں جب آپ اترتے ہیں تو مناظرہ تو دنگل ہوتا ہے۔ اگر اپنے بانی مذہب کا ایک معجزہ بیان کریں گے آپ اپنے ہاں کے تین بیان کریں گے۔ یعنی ان کے مقابلے میں مقابلہ جیتنے کے لیے۔ لیکن سوچئے ذرا اس چیز کو کہ اگر اتنی سی کرامت سے اتنا علاقہ مسلمان ہو جاتا ہے تو اس ایک معجزے سے یہ ساری دنیا کے کافر مسلمان کیوں نہ ہوئے۔

نبوت کے بعد نبی اکرمؐ کی عملی جدوجہد کو معجزات کی شکل میں پیش کرنے کا نتیجہ

ساری دنیا تو چھوڑ دیجیے' میں کہتا ہوں' وہاں کے مخاطبین یہ تیرہ سال مکے اور پھر آٹھ سال میں ہجرت کے بعد' نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے صرف دو ڈیڑھ سال پہلے تک یہ سارے مسلسل مقابلے جنگِ بدر اور جنگِ احد اور جنگِ حنین اور خیبر اور یہ اور وہ' عجیب مصائب میں زندگی گذر رہی ہے۔ تیرہ سال مکے کی اذیتوں میں گذر رہی ہے۔ پھر یہ ساری زندگی جنگوں میں گذر رہی ہے۔ اور اس کے بعد بھی قریش یا اہلِ مکہ اگر وہ سرنگوں ہوئے ہیں تو مکہ فتح ہونے کے بعد ہوئے ہیں۔ یہ جتنے معجزات ہمیں بتائے جاتے ہیں ان کا انھوں نے کیا یہ ہے ہمارے ہاں جو منہاج السنۃ وغیرہ جو کتابیں ہیں اس میں کہ تمام انبیاء کے معجزات کو اکٹھے کر کے ان کو دی دو سے ضرب اور اس کے بعد حضور ﷺ کے اتنے معجزے گنائے اس لیے کہ حضور ﷺ تو سید المرسلین ہیں۔ بات یہ سوچنے کی ہے عزیزانِ من! اس مسئلے کو چھوڑ دیجیے معجزہ ہو سکتا ہے یا نہیں ہو سکتا' سوچیے اس چیز کو کہ اتنی زندگی میں اتنے معجزے دکھائے جائیں اور کافر پھر کافر کے کافر ہی رہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد

غور طلب چیزیں ہیں یہ۔ کیا مشکل تھا اس کے لیے۔ اور اس کے بعد آیئے قرآن کی طرف۔ پہلی دو آیتوں میں یہ تھا نا کہ **قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِىْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ** (6:33) کہ جو باتیں یہ کرتے ہیں ہم جانتے ہیں کہ اے رسول! تیرے دل پر یہ کتنی گراں گذرتی ہیں۔ گویا کس قسم کی یہ طعن و تشنیع والی باتیں تھیں جو اس قدر گراں گذر رہی تھیں حضور ﷺ کے اوپر۔ اور آپ ﷺ سے کہا یہ جا رہا ہے اور نہایت بصیرت پر مبنی یہ تشفی ہے جو دی جا رہی ہے' جذباتی چیز نہیں ہے **فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ** (6:33) یہ تجھے نہیں جھوٹا کہتے' کہا ہے' ہم جو ان کو تعلیم دے رہے ہیں یہ اس کو جھٹلاتے ہیں۔ سیرت کی یہ کیفیت ہے حضور ﷺ کی بلندیٔ سیرت کی لیکن بہرحال یہ چیز کہا گیا ہے کہ گراں گذرتی ہے۔ یہاں کسی حضرت صاحب کے اوپر کوئی بات گراں ذرا گذرے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح سے آپ کو دہرا نہیں کر دیتے۔ ڈرو سامنے تو ایک طرف' اپنے تنہائیوں میں کمرے میں بیٹھے ہوئے حضور کے خلاف دل میں اگر کوئی خیال گذر گیا تو وہ تو دلوں تک کے حالات کو جانتے ہیں تو یاد رکھو! تڑپا کے رکھ دیں گے' تباہ ہو جاؤ گے' برباد ہو جاؤ گے۔

مخالفت کے سلسلہ میں حضور کے کبیدہ خاطر ہونے پر قرآن حکیم کا فرمان اور سابقہ انبیاء کا ذکر

یہاں رسول اکرم ﷺ' قرآن شہادت دے رہا ہے کہ ان کی باتیں جو ہیں' تجھے بڑا ہی کبیدہ خاطر کرتی ہیں' ہم جانتے ہیں بہت گراں گذرتی ہیں۔ نہ خدا کا غضب جوش میں آتا ہے نہ حضور ﷺ کی کوئی کرامت کام دے رہی ہے۔ خدا بھی رسول اللہ ﷺ سے یہ کہتا

ہے' یہ نہیں کہہ رہا کہ ذرا ٹھہر! ''میں ایناں دی پگی مروڑنا''۔ کہا یہ ہے وَ لَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا (6:34) آپ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا۔ انہوں نے صبر سے کام لیا تم بھی استقامت سے برداشت کرو' ہمت نہ ہار جاؤ' افسردہ خاطر مت ہو جاؤ' دلبرداشتہ نہ ہو جاؤ' برداشت کرو ان سب چیزوں کو استقامت سے' استقلال سے۔ كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا (6:34) جھٹلاتے ہیں اذیتیں دے رہے ہیں تمہیں۔ حَتّٰٓى اَتٰهُمْ نَصْرُنَا (6:34) تا آنکہ تم دیکھو گے کہ تائید ونصرت خداوندی آئے گی' کامیابی ہوگی۔ کہا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (6:34) قوانین خداوندی میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ ہوگا اس کے مطابق ہی' برداشت کرنا ہوگا' استقامت سے کام لینا ہوگا' استقلال سے ثبات سے صبر سے' برداشت کرنا پڑے گا۔ یہ تو حضور ﷺ کے متعلق کہا۔ بات یہ تھی کہ انبیائے سابقہؑ باقی اہلِ مذاہب کے دعاوی کے مطابق وہ تو ان مقامات پر ہمیشہ معجزہ دکھا کے فوراً ہی سدھ کر لیتے سارے کام۔ کہا وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ (6:34) پہلے نبیوں کی سرگذشتیں بھی تو تمہارے سامنے آ چکی ہیں۔ دیکھئے لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (6:34) ان قوانین خداوندی میں تبدیلی نہیں ہوتی اور پہلے انبیاء کی سرگذشتیں بھی تمہارے سامنے آ چکی ہیں۔ تو بات تو صاف ہے کہ پہلوں کے ساتھ بھی یہ ہوتا رہا انہوں نے بھی اسی طرح سے مقابلہ کیا۔ تمہارے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے' تمہیں بھی یہی کرنا ہوگا۔ نہ ان کے معاملے میں قانون بدلا نہ تمہارے معاملے میں قانون بدل سکتا ہے۔ یہاں تو یہ کہا جا رہا ہے۔ اس کے بعد آیا ان کا مطالبہ۔ یہاں سے یہ آج کا درس شروع ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کو سمجھنے کے سلسلہ میں تصریفِ آیات کی اہمیت اور مافوق الفطرت مطالبات کی نوعیت اور ہمارے ہاں کی کرامتیں

وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِىَ نَفَقًا فِى الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِى السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ (6:35) بڑی عجیب چیز ہے۔ عام ترجمہ تو یہ ہوگا کہ اگر تم پر ان کی یہ باتیں بہت گراں گذرتی ہیں تو اگر تمہیں استطاعت ہے (عام ترجمے کے اعتبار سے) تو پھر ٹھیک ہے زمین میں کوئی سرنگ لگا لو آسمان کے لیے کوئی سیڑھی بنوا لو اور پھر یہ جس قسم کا مطالبہ کر رہے ہیں اس قسم کی کوئی محیر العقول بات ان کو بتا دو۔ یہ انداز ہے بات کہنے کا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کا مفہوم سمجھنے کے لیے ہمیشہ یہ دیکھئے کہ اسی مضمون کی دوسرے مقامات پر آیات کیا آئی ہیں۔ اسی کو دوسری جگہ قرآنِ کریم میں یوں بیان کیا ہے بڑی عجیب آیات ہیں۔ یعنی اس نقطے کو سمجھانے کے لیے وہاں بات صاف یوں کی۔ وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ (17:90) یہ کہتے ہیں کہ یوں نہیں ہم ایمان لائیں گے۔ ان کا مطالبہ ہے کہ یوں نہیں ہم ایمان لائیں گے۔ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا (17:90) اشارہ کرو اور زمین سے

ایک چشمہ ابل پڑے۔ اَوۡ تَکُوۡنَ لَکَ جَنَّۃٌ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الۡاَنۡھٰرَ خِلٰلَھَا تَفۡجِیۡرًا (17:91) یا یوں ہاتھ کرو اور اس صحرا کے اندر لہلہاتے ہوئے درختوں کا ایک نہایت عمدہ باغ' اسکے نیچے پانی کی ندیاں جاری' یہ کچھ ہو جائے۔ اَوۡ تُسۡقِطَ السَّمَآءَ کَمَا زَعَمۡتَ عَلَیۡنَا کِسَفًا (17:92) یا یہ جیسا تو کہتا ہے کہ آسمان سے عذاب تم پہ آ جائے گا' آسمان کا ٹکڑا گرا دو ہمارے اوپر۔ اَوۡ تَاۡتِیَ بِاللّٰہِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ قَبِیۡلًا (17:92) حتیٰ کہ یہاں تک بھی یہ کہیں گے کہ نہیں! یہ فرشتے اور خدا جن کا تو ذکر کرتا رہتا ہے ان کو ذرا سامنے لا کے کھڑا کرو۔ اَوۡ یَکُوۡنَ لَکَ بَیۡتٌ مِّنۡ زُخۡرُفٍ (17:93) یا اپنے لیے ذرا چٹکی بجاؤ' بلاؤ' ایک کالے دیو کو اور سونے کا مکان تمہارے لیے کھڑا ہو جائے ایک۔ اَوۡ تَرۡقٰی فِی السَّمَآءِ (17:93) یا ہمارے سامنے آسمان کی طرف چڑھ جاؤ۔ وَ لَنۡ نُّؤۡمِنَ لِرُقِیِّکَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیۡنَا کِتٰبًا نَّقۡرَؤُہٗ (17:93) نہیں نہیں! ہم صرف تمہارے آسمان پہ چڑھنے سے ایمان نہیں لائیں گے' وہاں سے ایک لکھی لکھائی بنی بنائی ایک مجلد کتاب یوں اترتی دکھایئے اور وہ ہمارے سامنے آئے تو ہم اس کو پڑھیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم اسی صورت میں ایمان لائیں گے کہ یہ باتیں ہم کو دکھاؤ تو۔ یہ ہیں ناوہی چیزیں جو روز ہم معجزات اور کرامات میں گنتے چلے آتے ہیں۔ کہاان کا یہ مطالبہ ہے۔ اب اس مطالبے میں دو فریق آ گئے' خدا آ گیا اور اس کا رسول آ گیا۔

خدا تعالیٰ کی ذات انسانی خواہشات کے پیش نظر اپنے قوانین کو کبھی نہیں بدلتی

سنئے جواب عزیزانِ من! قُلۡ سُبۡحَانَ رَبِّیۡ (17:93) ان سے کہو کہ میرا خدا تو اس سے بہت بلند ہے کہ اس قسم کی شعبدہ بازیاں دکھائے تمہیں۔ خدا تو وہ رہا اور اپنے متعلق رسولؐ کے الفاظ سنئے۔ ھَلۡ کُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا (17:93) جہاں تک میں ہوں' میں تو انسان ہوں' میں تو بشر ہوں' میں تو صرف خدا کا پیغام تم تک پہنچاتا ہوں اس کے بعد میں تو ایک انسان ہوں۔ تم کیا مطالبے کرتے ہو۔ نہ تم نے خدا کی حقیقت کو پہچانا کہ وہ ہر ایک کے مطالبے کے لیے ان قوانینِ فطرت کو بدلتا چلا جائے سُبۡحَانَ رَبِّیۡ وہ اس سے بہت بلند ہے۔ تم کہو کہ ہم تب ایمان لاتے ہیں کہ یہاں خلاف فطرت ایک چشمہ پھوٹے اور خدا تمہاری خاطر ایک چشمہ یہاں سے نکال دے اور وہاں باغ اگا دے ''اوہدے اچ امب لا دوے' کابل اچوں سردا منگا دوے''۔ خدا کو کیا سمجھا ہے تم نے۔ تم نے خدا کو پہچانا ہی نہیں ہے۔ سبحان ربی۔ اور پھر مجھ سے یہ کہتے ہو کہ میں یہ کر کے دکھاؤں۔ بابا! میں تو ایک بشر ہوں' انسان ہوں تمہارے جیسا انسان' فقط رسول ہوں خدا کے پیغام تم تک پہنچاتا ہوں اور اس کے علاوہ تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔

مذہب کی بنیاد ہمیشہ کرامات پر استوار ہوتی ہے جب کہ قرآن حکیم کا یہ انداز نہیں ہے

عزیزانِ من! وہ جو میں نے کہا تھا کہ اسلام چیلنج ہے Religion کے خلاف' یہ حقیقت ہے یا نہیں ہے یہ ہے چیلنج یا نہیں

Religion کے خلاف۔ ہر مذہب اپنے دعوے کی بنیاد ان معجزات پہ رکھتا ہے' کرامات پہ رکھتا ہے۔ اسلام میں بھی ان مخاطبین نے یہ مطالبے کیے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ یہ یونہی بات گذر گئی ہے پتہ نہیں صاحب! اگر وہ مانگتے وہ کہتے تو یہاں بھی یہ کچھ ہوتا' انہوں نے مانگے ہی نہیں تھے۔ قرآن یہ بتا رہا ہے ایک جگہ نہیں ہے بیسیوں مقام پہ یہ کچھ کہا ہوا ہے کہ وہ مطالبے کرتے ہیں' یہ جواب ملتا ہے۔ یہی چیز یہاں جو آیت ہمارے سامنے ہے جہاں سے درس شروع ہوا ہے' انداز یہی ہے۔ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ یہ کچھ ہو۔ کہا کہ بفرضِ محال اگر اس پہ اے رسول تمہیں بھی یہ بات گراں گذرتی ہے یعنی یہ بات نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بھی یہ چاہتے تھے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ وہ بات تو وہاں قرآن نے بتا دی نا اسی کا انداز' لوٹایا ہوا انداز اس کو کہتے ہیں۔ تو کہا ہے کہ یہ سب کچھ بھی کرو۔ سوال یہ نہیں ہے کہ اس طریق سے ہم چاہتے ہیں کہ یہ راہِ راست پہ آ جائیں یا ایمان لے آئیں یا حقیقت کو مان لیں۔ **وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى** (6:35) اگر ہماری مشیت میں یہ ہوتا کہ سارے انسان ایمان والے مومن ہی پیدا ہوتے تو یہ سارا سلسلۂ رسل و ہدایت' رسولوں کا بھیجنا' انبیاء کا آنا' یہ تمام چیزیں ضرورت ہی نہیں تھی ہمیں صاحب۔ ساری دنیا کی بکریاں پہلے دن سے آج تک ایک ہی مذہب پہ چلی جا رہی ہیں۔ ہر شیر کا وہی مذہب ہوتا ہے جو دوسرے شیر کا۔ آج تھا یا پانچ ہزار سال پہلے تھا۔ سورج کا ایک ہی مذہب ہے' ستارے سارے ایک مذہب کے اوپر چلے جا رہے ہیں۔

حیوانوں سے انسانوں کی زندگی کو متمیز کرنے کا طریق

ہر نوع جس طریق پہ چلنے کے لیے پیدا کی گئی ہے ان میں اختلاف نہیں ہوتا ان کو Convert کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی طرف انبیا نہیں بھیجے گئے' رسولوں کی ضرورت ہی نہیں۔ کیا ہے؟ انہیں مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ جس روش پر چلنے کے لیے جسے ان کی فطرت کہتے ہیں' انہیں پیدا کیا گیا ہے' وہ مجبور ہیں اس روش کے اوپر چلنے کے لیے۔ اگر انسانوں کے معاملے میں بھی یہی مقصود ہوتا کہ یہ عقل و فکر کے چراغ گل کر کے ان کو اس طرح سے ہدایت پہ لایا جاتا تو یوں الٹی طرف سے ناک کو ہاتھ لگانے کی ضرورت کیا تھی' بھیڑ بکریوں کی طرح انہیں ایسا ہی پیدا کر دیتے۔ اسلام پہ انہیں پیدا کرتے' اسلام کے اوپر یہ چلتے رہتے۔ بات ختم ہو گئی۔ **وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى** (6:35) اگر ہمارا قانونِ مشیت یہ ہوتا تو جیسا کائنات کی باقی چیزوں کے متعلق ہم نے کیا ہے' اس کے متعلق بھی یہی کرتے' اسی قسم کا اسے بھی پیدا کر دیتے تو یہ مجبوراً چلتا جاتا۔ ہماری مشیت یہ تھی نہیں۔ مشیت کیا تھی؟ وہ یہ تھی کہ حیوانات کی زندگی سے اس کی زندگی متمیز کر دی جاتی۔ جب اس کی زندگی متمیز کی۔

مذہب اور دین میں بنیادی فرق عقل وشعور پر دلالت کرتا ہے

عزیزانِ من! مذہب حیوانات کا ہوتا ہے جس میں عقل وفکر کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ انسان کو پیدا کیا تو ایک امتیازی چیز اس میں پیدا کر دی کہ عقل وفکر دیا گیا، انتخاب یا چوائس کی ایک صلاحیت دیدی گئی۔ حیوانات کے سامنے ایک ہی راستہ ہوتا ہے، ایک سے زیادہ Possibilities ہوتی نہیں ہیں۔ بکری کے لیے یہ چوائس نہیں ہے کہ گوشت کھانا چاہے یا سبزی کھائے۔ انتخاب کا سوال نہیں ہے۔ جب انتخاب کا سوال نہیں ہوتا تو عقل وفکر کا سوال نہیں ہوتا، انتخاب تو عقل وفکر سے ہوتا ہے۔ انسان کے متعلق کہا وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (90:10) عجیب وغریب چیزیں ہیں عزیزانِ من! قرآن کی۔ ہمیشہ Two Possibilities اس کے سامنے ہوتی ہیں، دو راستے اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ جونہی ایک سے زیادہ راستہ ہوا، سوچنا پڑ گیا آپ کو کہ کونسا اختیار کیا جائے۔ کہا کہ ہم نے اس طرح سے اس کو پیدا کیا، عقل وفکر دی انتخاب کے لیے، دو راستے دیئے، وہاں اس کو چھوڑا، اسے کہا فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29) کہ ہم نے اتنا ہی کرنا تھا دونوں راستے دکھا دیئے، عقل وفکر دیدی، روشنی دیدی، آنکھیں دیدیں، سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دیدیں اور اس کے بعد پھر جس کا جی چاہے دائیں کا راستہ اختیار کرے، جس کا جی چاہے بائیں کا اختیار کرے۔ اور اگر ہم نے اس دوراہے پہ کھڑے ہو کے کوئی اس قسم کا کارنامہ کرنا ہوتا کہ یہ خود نہ فیصلہ کرتے، ہم مجبور کر دیتے ان کو ایک ہی رستے پہ چلنے پہ۔ معجزہ دکھا کے، کرامتیں دکھا کے، تو یہ پھر دو راستے، عقل وفکر، انتخاب کی صلاحیت یہ سارا کچھ بکھیڑا کاہے کے لیے۔

کیا ہر بچہ اسلام کا تصور لیے پیدا ہوتا ہے

دیکھا لو شَآءَ کے کیا معنی ہیں یہاں۔ یونہی اگر ان کو ایک راستے پہ چلانا ہوتا تو ہم انہیں پیدا ہی کیوں نہ ایسا کر دیتے۔ قرآن کس طرح سے اس کی تردید کرتا ہے۔ اسلام میں سازشیں کہاں کہاں ہوئیں تو آپ کے ہاں بھی یہ چیز آ گئی کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور اسلام دینِ فطرت ہے۔ یعنی ہر بچہ اسلام پہ پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد ماں باپ ہیں جو یہودی نصرانی اس کو بنا دیتے ہیں۔ کبھی کوئی کسی کی فطرت بھی بدل سکتا ہے؟ بکری کے بچے کی ایک فطرت ہوتی ہے جس فطرت پہ وہ پیدا ہوتا ہے۔ ساری دنیا کی بکریاں یا شیر مل کے بھی چاہیں کہ اس کی فطرت بدل کے اس کو گھاس، نہیں وہ درندہ بنا دیں، بنا ہی نہیں سکتے۔ فطرت کہتے ہی اسے ہیں جو بدلی نہ جا سکے۔ فطرت پہ پیدا ہوتا ہے اور فطرت کیا ہے؟ دینِ فطرت اسلام ہے۔ الفاظ ہیں کوئی کھڑا ہو کے سوچتا نہیں ہم کہہ کیا رہے ہیں۔ اسلام پہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے بعد پھر کیفیت یہ ہے کہ وہ جو باقی غیرِ مسلم کے گھروں میں پیدا ہونے والے بچے ان کو تو چھوڑ دیجیے، یعنی پیدا تو ہر بچہ، اسلام پہ ہوتا ہے، وہ بھی اسلام پہ ہی ہوتے ہونگے۔ انہیں چھوڑ دیجیے۔ ہم جو خود مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوئے ہیں، ہم اسلام

کے اوپر ہیں۔یعنی مسلسل ہمارے ہاں شور مچ رہا ہے کہ اسلام نہیں ہے' مسلمانوں کی زندگی اسلام جیسی نہیں ہے۔ یہ فطرت ہے ان کی۔ بہر حال قرآن کہتا یہ ہے کہ اگر ہمیں مقصود یہی ہوتا کہ ان کے عقل وفکر کی صلاحیتیں مفلوج کر کے ان کو ایک راستے پہ چلایا جائے' ہمارے لیے مشکل کیا تھا کہ ہم ان کو پیدا ہی اسی طرح سے کرتے۔انسان کی پوزیشن حیوانات کے مقابلے میں بڑی متمیز ہے۔اور یہ شرفِ انسانیہ ہے جس کو عقل وفکر کہتے ہیں۔دوراستے کا دینا' انتخاب کا چوائس کا' اس کو حق دیدینا' بہت بڑی چیز ہے۔عزیزانِ من! کائنات میں یہ حیثیت لامحدود حد تک خدا کو حاصل ہے اور اس کی عطا کردہ اس کائنات میں صرف انسان کو حاصل ہے۔یہ شرفِ انسانیت ہے۔اور جب اس نے کہا ہے کہ ہم پھر یہ کچھ دکھا کے چراغ گل نہیں کرنا چاہتے ان کی عقل وفکر کے' اس کے معنی یہ ہیں کہ جانے کہ دادند دیگر نہ گیرند۔کیا بات کہہ جاتا ہے یہ شخص۔جان کے متعلق کہا یہ جو صلاحیتیں دی ہیں خدا نے وہ کہتا ہے جب ہم نے دی ہیں' ہم واپس نہیں لیا کرتے' چھینا نہیں کرتے ہم ایسے دیالو نہیں ہیں کہ ایک ہاتھ سے دیا' دوسرے سے چھین لیا۔ایک شعر اقبالؒ کا بھی سن لیجیے' پلے باندھنے کی چیز ہوتی ہے

جانے کہ دادند دیگر نہ گیرند

خدا نے انسان کو جان دی ہے وہ اس سے جان چھینتا نہیں ہے

آدم بمیرد از بے یقینی

انسان اپنی بے یقینی سے مرجاتا ہے' وہ تو نہیں جان چھینتا۔**وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى** (6:35) ہماری مشیت ہوتی' ہم ایسا چاہتے تو ہم پیدا ہی تمہیں ایسا کردیتے۔

قرآن حکیم معجزہ کی بناپر' کرامت کے زور پر' عقل کو موقوف نہیں کرتا

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (6:35) ایسا خیال کرنے سے کہ ایک معجزہ دکھا کے ساری دنیا کو مسلمان کر دیا جائے کرامت دکھا کے' کہتا ہے' جہالت ہے۔اللہ اکبر۔جہالت ہے۔یہ جنہیں بڑے فخر سے پیش کیا جاتا ہے کہ آپ کے ہاں کے حضرت صاحب نے ایک معجزہ دکھایا' سارا گاؤں مسلمان ہوگیا۔قرآن کہتا ہے **فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ** (6:35) جہالت ہے۔اور پھر آپ کے ہاں اوپر چلیں تو انبیائے کرامؑ کے معجزات کا جو ذکر ہے۔قرآن کہتا ہے **فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ** (6:35) عزیزانِ من! میں نہیں کہتا میں کب جرآت کرسکتا ہوں یہ کہنے کی۔یہ کہتے ہیں' خدا بھی کب جرآت کرسکتا ہے یہاں اسے پتہ ہی نہیں ہے (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ ہزاروں معجزے جو گنائے جاتے ہیں تو اب کیا کہا جائے اس کے بعد کہ یہ کیا کہتا ہے **فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ** (6:35) ''اے ایویں ای مخول کردا ہیگا''۔سورۃ یونس میں عجیب وغریب آیات آتی ہیں۔**وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ** (10:99) یہ دیکھئے وہی شَآءَ جو یہاں آیا ہے **وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا** (10:99) خدا کی مشیت میں اگر یہ ہوتا' اس کا قانون مشیت ایسا ہوتا

ہے کہ زبردستی مسلمان بنانا ہے تمام انسان کُلُّھُمْ جَمِیْعًا (10:99) یعنی اندازہ لگائیے جامعیت کا' بلا استثنٰی ایک کے سب کے سب مسلمان ہوتے۔لیکن کیا یہ ہوتا؟ جواُس سے تو نہ ہوتے۔تو جب خدا کی مشیت یہ نہیں تھی تو رسول اللہ ﷺ سے کہا اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (10:99) تو خدا کی تو مشیت یہ نہیں تھی کیا تو چاہتا ہے کہ زبردستی لوگوں کو مومن بنالیا جائے کسی طرح سے۔ یعنی تو سمجھتا ہے کہ خدا سے یہ بات رہ گئی ہے وہ کر نہیں سکتا تھا اس لیے تو اس طرح سے کردے۔اگر یہی کچھ کرنا ہوتا' مجبوراً کسی کو مسلمان بنانا ہوتا تو ہم یہ کر نہ سکتے؟ ہم نہیں کرسکتے تھے؟۔کُلُّھُمْ جَمِیْعًا (10:99) ہم تو یوں پیدا کرتے۔اوراس کے بعد اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (10:99) تو کیا پھر تو یہ کرنا چاہتا ہے کہ ایسا طریق اختیار کیا جائے کہ ان کے عقل وفکر کے دیے بجھا کے' مجبور کر کے ان کو مسلمان بنادیا جائے کسی طرح سے۔کیا تو یہ چاہتا ہے۔آگے سنیئے۔وَ مَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ (10:100) ایمان جبرواکراہ سے نہیں یہ تو قانونِ خداوندی کے مطابق لایا جاسکتا ہے۔

ہمارے ہاں کے تراجم میں خدا کی اجازت کے غلط مفہوم کا نتیجہ

یہاں بھی ہمارے ترجموں نے بِاِذْنِ اللّٰہ کا ترجمہ اللہ کی اجازت کیا اور بات پھر وہیں کی وہیں لوٹا دی۔بات تو وہی ہوگئی اگر آپ کہیں کہ ایمان تو ہماری اجازت سے لایا جاسکتا ہے تو پھر انسان کے اختیار میں تو پھر کچھ نہ رہا۔جسے اس نے اجازت دی' وہ مسلمان ہوا جسے اس نے اجازت نہ دی' وہ ہوا ہی نہیں۔یعنی جس چیز کی وہ تردید کررہا ہے کہ ہم مجبوراً نہیں کرنا چاہتے' اگلی ہی آیت میں ایک لفظ کے غلط ترجمے سے پھر وہیں لے گئے۔کہا اس کے لیے ایک قانون ہے۔اور اگلے ہی لفظوں میں وہ بات ہے میں سمجھتا ہوں پتہ نہیں کیا ہوگیا ہے۔کہا' وہ قانون کیا ہے؟

عقل وفکر سے کام نہ لینے والے کے ہاں معاملہ مشتبہ ہوجاتا ہے

جورواکراہ سے ایمان لانا نہیں' قانونِ خداوندی کے مطابق وہ کیا ہے؟ وَ یَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (10:100) وہ قانون یہ ہے کہ جو شخص عقل وفکر سے کام نہیں لیتا اس پر معاملہ مشتبہ رہ جاتا ہے۔رِجْسَ بڑا عجیب لفظ ہے''آپانی اچ کچولا ماریا ہویا ہونداا ے نا' آ چکڑ اچ پانی رلا دینا'' کیا لفظ قرآن استعمال کرجاتا ہے!!۔یعنی ایک صاف ستھرا نتھرا پانی اس کے ساتھ کثافت اور غلاظت الگ رہنی چاہیے اس سے۔کفر اور اسلام اس طرح سے دو الگ الگ متمیز چیزیں ہیں انہیں الگ رہنا چاہیے۔

معجزے طلب کرنے والوں کو قرآن حکیم کا جواب

کہتا ہے' جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتے ہوتا یہ ہے کہ ''او کچولا ماردیندے نیں'' وہ ان دونوں چیزوں کو ایسا گڈمڈ کردیتے ہیں کہ بات

صاف ہی نہیں ہوتی ان کے اوپر۔ یہ ہے ہمارا قانون۔ لَا یَعۡقِلُوۡنَ (10:100)۔ کہتا ہے باقی یہ جو پوچھتے ہیں کہ معجزہ دکھایئے قُلِ انۡظُرُوۡا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ مَا تُغۡنِی الۡاٰیٰتُ وَ النُّذُرُ (10:101) کہتا ہے ان سے کہو کہ جاؤ کائنات میں چلو پھرو دیکھو تو سہی گھاس کی ایک ایک پتی معجزہ بن کے نظر آتی ہے کہ نہیں۔ معجزہ وہ ہے جو انسان کو عاجز کردے کہ وہ ایسا نہ کرسکے۔ اگا تو دیجیے خدا کے قانون کے خلاف ایک پتی گھاس کی۔ معجزے دیکھنا چاہتے ہیں تو جائیں کائنات میں چلیں پھریں' خدا کے معجزے نظر آجائیں گے۔ باقی رہا ان کا یہ تقاضا تو اس کے بعد تو پھر جبراً مسلمان بنانے والی بات ہے۔ یہی کچھ کرنا ہوتا ہم نے تو پھر ہم پیدائشی ان کو کیوں نہ بنا دیتے۔ قانون ہمارا یہ ہے۔ اور یہی چیز یہاں دہرائی برادرانِ عزیز! یہاں جو کہا کہ یہ معجزات کے مطالبے کرتے ہیں۔ تم بھی اگر کرسکتے ہو تو کر دکھاؤ۔ اس کے معنی یہ ہیں' سوال یہ نہیں کہ ایسا کر دکھاؤ۔ سنو! وہ پھر فقرہ سامنے رکھئے کہ اگر ہماری مشیت میں ہوتا تو ہم پیدا ہی ایسا کرتے کہ سارے کے سارے مسلمان ہوتے۔ یہ بات نہیں۔ اِنَّمَا یَسۡتَجِیۡبُ الَّذِیۡنَ یَسۡمَعُوۡنَ (6:36) ہماری اس دعوت پر لبیک وہ کہے گا جو دل کے کانوں سے اسے سنے گا۔ دیکھنے سننے سمجھنے کی صلاحیت کو مفلوج کر کے ایمان نہیں لایا جاسکتا اور نہ مسلمان بنایا جاسکتا ہے۔ اس پہ تو وہ لبیک کہے گا جو اسے سنے گا۔ سننے اور دیکھنے کی دو کیفیتیں قرآن نے دوسرے مقامات میں بیان کردی ہیں کہ تمہاری مجلس میں آ کے بیٹھتے بھی ہیں ایسا نظر آتا ہے کہ بڑی گہرائی سے تمہاری بات سن رہے ہیں اور تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں۔ عجیب لفظ ہے وہاں کہا تَرٰهُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡکَ وَ هُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ (7:198) نظر اور بصر میں وہاں فرق کیا ہے قرآن نے کہ ٹھیک ہے Physical Eye سے تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں Mental Eyes جو ہیں' ان کے فکر کی جو آنکھیں ہیں' وہ کہیں اور گئی ہوئی ہیں' وہ بند ہوئی ہوئی ہیں۔ کان تو ہیں ان کے' کان نے جہاں پہنچائی تھی بات وہ ہیڈ کوارٹر انہوں نے مصروف رکھا ہوا ہے۔ سنتے بھی اس طرح سے ہیں۔ کہا یوں سننے کی بات نہیں ہے۔ جو سنتا ہے اور سننے کے معنی ہیں کہ پھر اس کو دل تک اتارتا ہے اس سے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اس پہ لبیک کہے۔ (50:37)

قرآن حکیم نے عقل وفکر سے کام نہ لینے والوں کو اندھا کہا ہے بہرہ کہا ہے مردہ کہا ہے

اب دوسری کیٹگری ہے۔ عام طور پہ یہ کہا جاتا ہے وَ الۡمَوۡتٰی یَبۡعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَیۡهِ یُرۡجَعُوۡنَ (6:36) کہ آگے قرآن نے یہ کہا ہے کہ اللہ مردوں کو زندہ کرے گا۔ آپ دیکھتے ہیں اس طرح سے ربط کچھ نہیں نظر آتا کہ لبیک وہ کہیں گے کہ جو سنیں گے اور مردوں کو خدا اٹھائے گا قیامت میں' کچھ بات نہیں نظر آتی۔ قرآنِ کریم میں آپ دیکھئے اس میں یہ لوگ جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتے' صحیح راستے پہ نہیں آتے' سنتے نہیں دیکھتے نہیں' انہیں اندھا کہا ہے' بہرہ کہا ہے' اور مردہ کہا ہے۔ ان کے مقابلے میں زندہ اسے کہا ہے کہ جس کا دل زندہ ہے۔ اور یہی ہے وہ زندگی اور موت

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

یہ اس کو قرآنِ کریم نے جو مردہ کہا ہے ایک تو وہ ہیں کہ جو اس دعوت کی مخالفت کر رہے ہیں، مقابلے میں آ رہے ہیں، سرکشی برت رہے ہیں، نہیں چلنے دیں گے سمجھنے سوچنے کے باوجود اپنی ضد پہ اڑے ہوئے ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (2:6) یہ وہ ہیں، یہ نہیں کہ جو کافروں کے گھر میں پیدا ہو گئے، وہ ایمان ہی نہیں لائیں گے۔ تو پھر یہ اسلام ہے کن کے لیے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (2:6) فعل ہے وہاں، جو یہ روش اختیار کرتے ہیں۔ کفر کے معنی انکار ہی نہیں ہوتا، سرکشی ہوتا ہے۔ لیکن ایک وہ ہیں کہ جو بے حس پڑے ہوئے ہیں، سرکشی کا ردِعمل نہیں ہے، بے حس سے ہیں۔ ان کی کیفیت کیا ہو گی یہ ہے جو کہا کہ یہ جو ہیں ان تک پہنچائے چلے جاؤ۔ آہستہ آہستہ ان میں زندگی کے آثار نمودار ہو جائیں گے۔ ان میں امکان ہے اس چیز کا کہ آ جائیں تمہاری طرف۔ یہ کہاں سے بات لی۔

مُردوں کے سلسلہ میں حضرت ابراہیم کا مطالبہ اور خدا تعالیٰ کا جواب

حضرتِ ابراہیمؑ کا واقعہ پہلے بیان کر چکا ہے قرآنِ کریم، وہ جسے سب سے بڑا معجزہ گنایا جاتا ہے۔ حضرتِ ابراہیمؑ نے خدا سے کہا کہ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (2:260) یا اللہ مجھے دکھا تو کیسے مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔ اللہ نے کہا کہ کیا تو ایمان نہیں رکھتا اس پہ؟ کہا ایمان تو رکھتا ہوں لیکن اطمینان چاہتا ہوں۔ اور پھر جو آگے وہ ساری آیتوں کا ترجمہ سورۃ بقرہ میں (2:260) وہ سارا واقعہ ہے کہ ان سے کہا کہ چار پرندے لے لو، پھر ان کو ذبح کر کے قیمہ کرو، پھر وہ ملاؤ قیمہ، پھر اس کا تھوڑا تھوڑا حصہ چار پہاڑوں کی چوٹیوں پہ رکھو، پھر اس کے بعد تم آواز دو تو وہ پھڑ پھڑاتے ہوئے آ جائیں گے تمہاری طرف۔ اس طرح سے ہم مُردوں کو زندہ کریں گے" تہاڈا کراں گے قیمہ"۔ وہ آیات پہلے آ چکی ہوئی ہیں، تفصیل میں نے وہاں عرض کی۔ بات یہاں اختصاراً یہ عرض کرتا ہوں کہ مردے کو زندہ کرنا، ہر نبی کے ساتھ یہ ہوتا تھا۔ یہ قوم کا سرکش طبقہ جو تھا اس کو تو چھوڑ یئے، باقی قوم کا بے حس طبقہ سامنے ہوتا تھا اور یہ طبقہ واقعی بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ چھوڑا جا نہیں سکتا کہ آپ نا امید نہیں ان سے ہو سکتے، سوئے ہوئے کے متعلق کبھی نہیں آپ کہہ سکتے کہ یہ اٹھنے کے بعد دوست ہو گا یا دشمن ہو گا۔ جاگتے کے متعلق تو آپ بتا سکتے ہیں کہ دوست ہے یا دشمن ہے اس کے متعلق امکانات ہوتے ہیں۔ اور یہ سلسلۂ رشد و ہدایت ایسا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس طبیبِ مشفق کی طرح حساس نرم خو، حریص اور کردار کی بلند ترین سطح پر ارجمند ہے

رسول تو اس قدر جسے قرآن نے خود کہا ہے حریص ہے یہ' بڑا حریص ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک ہی ایمان لے آئے۔''اے نئیں پئی مینوں چندہ دیدوے'' یہ بچ جائے کسی طرح سے۔ایک طبیب مشفق کی طرح ہر مریض کے متعلق اس کے دل میں یہ ہوتا ہے کہ یہ بچ جائے کسی طرح سے۔اس کو کہتے ہیں حریص۔ایک ایک کو بچانے کی خاطر یہ رسول یہ کرتا تھا' گالیاں کھاتا تھا' مار کھاتا تھا' لہولہان ہوتا تھا' اور اس کے باوجود یہ چاہتا تھا۔دعا یہ تھی طائف سے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس آئے ہیں اور انہوں نے واقعی لہولہان کر دیا تھا' تھک کے' چور ہو کے' درخت کے نیچے بیٹھ گئے کچھ کہہ رہے تھے زبان سے۔ایک بدو نے یہ کہا کہ میں قریب آ کے سننا چاہتا تھا میں دیکھنا چاہتا تھا کہ رسول ایسے وقت میں گالیاں کس قسم کی دیتا ہے ان کے حق میں' بددعائیں کیا کرتا ہے اس وقت۔خاموشی سے اپنے خدا سے کہہ رہا تھا کہ یا اللہ! ان کو معاف کرنا ان کو پتہ نہیں میں کون ہوں۔اس مشفق کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے۔ان تک بھی پیغام پہنچا' کیا یہ بھی زندہ ہو سکتے ہیں؟'کیا یہ بھی زندہ ہو سکتے' میں نے بھی ترجمہ صحیح نہیں کیا عزیزانِ من! سن لیجیے گا۔ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی (2:260) وہ طریقہ کیا ہے جس سے یہ زندہ ہونگے۔دیکھا دونوں میں فرق کیا ہے۔جب تو کہتا ہے کہ ان تک پیغام پہنچا یہ ہونگے' تو یہ تو ہے میرا ایمان ہے کہ زندہ ہو سکتے ہیں ان میں سے۔

اے خالقِ کائنات تو مجھے وہ طریق تو بتا کہ یہ مردہ قوم زندگی کی نعمتوں سے کس طرح سرفراز ہوگی

میں پوچھتا یہ چاہتا ہوں کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی (2:260) کیا بات ہے وہ طریقہ میں کیا اختیار کروں کہ یہ زندہ ہو جائیں' یہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ایمان تو اس پہ ہے۔اگلا جو فقرہ ہے کہ کیا ایمان نہیں ہے؟ تو نبی سے بھی پوچھا جا رہا ہے کہ ایمان نہیں ہے اس کے واسطے کہ خدا مردوں کو زندہ کرے گا قیامت میں' نبی کو بھی ایمان نہیں ہے؟ نہیں! اس پہ میرا ایمان ہے جو تو کہتا ہے' دعوت پہنچائے جا' میرا ایمان ہے کہ ان میں امکان ہے اس کا۔میں تو پوچھتا ہوں وہ طریقہ کیا ہے' طریقہ تو بتا دے گا تو مجھے اطمینان ہو جائے گا کہ اس طریقے سے جو میں چل رہا ہوں تو ٹھیک ہے میرا طریقہ۔مجھے اپنے طریقے کے متعلق اطمینان نہیں ہے کہ صحیح ہے یا غلط ہے۔واہ واہ واہ۔تو بتا دے گا تو بس اطمینان سے چل پڑونگا کہ ٹھیک ہے۔دوائی دینا انجیکشن لگانا اس کو بھی آتا ہے لیکن جب اسے ڈاکٹر بتا دیتا ہے نا اسے یوں کرنا اس کے بعد پھر وہ جس یقین اور اطمینان سے انجکشن لگاتا ہے' دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی (2:260) بس یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔کہا کہ بات سمجھ میں آجائے گی تمہیں۔

قرآن حکیم کے نزدیک تباہ حال قوم مردہ صفت قوم کو ازسرنو زندگی کی نعمتوں سے سرفراز کرنے کا طریق

کہا یہ جنگل میں اڑنے والے پرندے تیتر' طوطے' بلبلیں' کیفیت ان کی یہ ہے کہ تو جنگل میں چلا جائے سوکھے ہوئے پتوں کے اوپر پاؤں تمہارا آ جائے تو اس کی آہٹ سے یہ پھڑ پھڑا کے اڑ جاتے ہیں' تمہارے قریب ہی نہیں آتے۔ لیکن تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ صبح ہی صبح ایک شخص پنجرہ بند کیے آگے آگے جا رہا ہے جنگل میں باہر کھلی فضا میں تیتر اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ اس کے ہمنوا اور ہم صفیر جنگل کے تیتر' وہ آوازیں دے رہے ہیں کہ ہم یہاں ہیں' وہ سن بھی رہا ہے لیکن وہ جا رہا ہے اس کی طرف۔ کہا کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

بات کسی کو تعمیری نکتہ نظر سے اپنے ساتھ مانوس کرنے یا سدھانے کی ہے

وہی تیتر وہ' وہی تیتر یہ ہے' یہ کیا ہوا ہے اس تیتر میں یہ قلبِ ماہیت جو اسکی ہوگئی؟ یہ اس کے ساتھ اتنا مانوس جو ہے' ہوا کیا ہے؟ کہا کہ ذرا جا کے یہ دیکھو کہ یہ جنگل کے وحشی پرندوں کو سدھایا کیسے جاتا ہے فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ (2:260) یہ ہے لفظ وہاں سدھایا کیسے جاتا ہے۔ کیسے سدھایا جاتا ہے عزیزانِ من!؟ پرندے کا سدھانا اللہ اکبر!! بڑا صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے ''بڑا پتہ مارنا پینداا ے'' بڑی استقامت چاہتا ہے' بڑا ثبات چاہتا ہے۔ یہ ایک طوطے کو میاں مٹھو چوری کھانی ہے ''ایناں اک سکھان واسطے کدی تسی دیکھو' یہ تو بچے کا عشق ہوتا ہے جو اسے یہ کچھ کر جاتا ہے۔ بڑا اہمت طلب مسئلہ ہے۔ کہا کہ ابراہیم! دیکھا ہے تم نے پھر' جنگل میں اڑنے والے نامانوس وحشی پرندے ایک چٹکی بجانے سے کس طرح سے اس کی طرف اڑ کے آ جاتے ہیں۔ پنجرے والے کو تو چھوڑ دیجیے' باز اور شاہین جیسا پرندہ' یہ ابوظہبی سے جو آتے ہیں آپ کے ہاں شکار کھیلنے' عقاب پرندوں کا شیر' اڑنے میں فضا کی انتہائی بلندیوں تک جانے والا۔ جنگل میں صحراء میں شکار کے پیچھے کھلا چھوڑ دیتے ہیں اس کو' بالکل کھلا' تیر کی طرح جھپٹ کے جاتا ہے۔ بعض اوقات بیسیوں میل اسے نکل جانا پڑتا ہے شکار کے پیچھے۔ اتنی توانائیوں کا اتنے عظیم شاہکار رکھنے والا شاہباز فضا کی آزادیوں کے اندر اتنی تیزی سے اڑنے کے بعد پھر وہیں اس کے ہاتھ کے اوپر آ کے بیٹھ جاتا ہے۔ کہا ابراہیم! یہ کیسے ہوا ہے؟ سدھانا پڑتا ہے۔ اگر سدھانے والا درمیان میں کسی طرح دل برداشتہ ہو جائے ثبات و استقامت کو چھوڑ دے پھر یہ رام نہیں ہوتا۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کی دل جوئی کی ایک عظیم مثال اور پھر حجۃ الوداع کا ذکر

کہا ابراہیم! مرحلہ ذرا جاں گداز اور صبر طلب ہے لیکن ایک نبی کو تو یہی کرنا پڑتا ہے۔ نہ تلوار لے کے اس کو سر کاٹ دینا ہوتا ہے۔ قیمہ کر دینا ہوتا ہے نہ چٹکی بجا کے اس کو معجزہ دکھانا ہوتا ہے۔ استقامت سے' صبر سے' ان کی عقل و فکر کو مخاطب کر کے اپیل کرتے چلے جاؤ۔

وہ وحشی پرندے ہیں ان کا ردِعمل اور ہوگا تم دل برداشتہ نہ ہوجاؤ' ہمت نہ چھوڑ جاؤ اور اس کے بعد دیکھو کہ یہی وحشی پرندے کس طرح سے تمہاری ایک آواز کے اوپر دوڑتے ہوئے تمہاری طرف چلے آتے ہیں۔عزیزانِ من! وہی مکہ کہ تیرہ سال تک جس کی یہ کیفیت تھی کہ پرندہ تو صرف کھٹکھٹاہٹ سے اڑ جاتا ہے۔انسان تو اس کھٹکھٹاہٹ کے بعد پتھر مارتا ہے تیر چلاتا ہے۔اسی مکے کے میدان کے اندر حجتہ الوداع میں نبی اکرم ﷺ کے اس زمانے کو سامنے رکھ کے دیکھئے۔تاریخ کے اندازے کے مطابق ایک لاکھ پرندہ اس شمع کے گرد جمع ہوا ہوا تھا اور پروانہ وار۔تیرہ اور کم از کم بائیس سال کی اس تاریخ سے جو ابراہیم کو سکھایا گیا تھا ایک شخص ان میں سے نہ تلوار کے زور پہ مسلمان کیا گیا نہ کوئی معجزہ دکھا کے اس کو اسلام کی طرف لایا گیا۔وہی طریقِ ابراہیمؑ جس سے کہ مردے زندہ ہوا کرتے ہیں۔سن لیا۔یَسۡتَجِیۡبُ الَّذِیۡنَ یَسۡمَعُوۡنَ (6:36) یہ جو بیدار ہیں تمہارے سامنے' جاگتے ہیں ان میں سے تو جو دل کے کانوں سے تمہاری بات کو سنے گا وہ لبیک کہے گا۔وَ الۡمَوۡتٰی یَبۡعَثُہُمُ اللّٰہُ ثُمَّ اِلَیۡہِ یُرۡجَعُوۡنَ (6:36) اور یہ جو اس وقت بے حس تمہیں نظر آتے ہیں' کوئی ردِعمل ہی ان کا نہیں' ان کے متعلق بھی مایوس دل برداشتہ مت ہوجاؤ۔ان کو طریقِ ابراہیمؑ کے مطابق سدھانا شروع کرو' پہنچاؤ اپنی آواز' کہتے چلے جاؤ کہتے چلے جاؤ اس حد تک کہتے چلے جاؤ۔

نبی اکرم کی زندگی کے آخری ایام میں ایک حسین آرزو کا اظہار اور پھر اس کا جواب

نبی اکرم ﷺ کی آخری زندگی میں (سورۃ اعراف میں بھی ہے یہ دو تین مقام پہ ہے) یہ مقدس آرزو دل میں بیدار ہوئی اور ہونی چاہیے تھی کہ یا اللہ! میری ساری زندگی اسی دعوت میں اور اس کے نتیجے میں اسی قسم کی مصائب اور مشکلات اور اذیتوں میں گذر جائے گی۔ان سے تو نہ میں ڈرا ہوں نہ مجھے ان کا شکوہ ہے۔جی چاہتا یہ ہے کہ جس نظام کی دعوت دی تھی' جس درخت کو اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا' میرے سامنے وہ برگ و بار لے آئے۔جی چاہتا ہے کہ میری آنکھوں کے سامنے کامیابی اس میں ہو اور وہ نظام متشکل ہوجائے۔کہا کہ یا اللہ! کیا یہ ہوگا کہ میں دیکھ لوں اپنی آنکھوں سے اس کو۔کتنی معصوم آرزو ہے۔ایک شخص تیئس سال سے زندگی اپنی وقف کیے ہوئے ہے اذیتیں' مصیبتیں' تکلیفیں' صعوبات' مشکلات اس کے حصے میں آرہی ہیں۔جو کچھ کررہا ہے اس کے متعلق پہلے دن سے کہہ رہا ہے مَاۤ اَسۡئَلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ (25:57) اس کا میں کوئی معاوضہ نہیں تم سے مانگتا۔بلا معاوضہ یہ کچھ کررہا ہے۔اتنی سی آرزو تو بیدار ہونی ہی چاہیے اور عمر کے آخری حصے میں کہ یا اللہ! میں اسی طرح سے آگے چلا جاؤنگا یا اپنے سامنے دیکھونگا۔جی چاہتا تھا اور جی چاہتا ہے کہ کم از کم اتنی رعایت تو اس کی طرف سے ہوجاتی اور اس کے لیے مشکل بھی کیا تھا کہ وہ کہہ دیتا کہ ہاں! کوئی بات نہیں! تیری زندگی میں ہم ایسا کردیں گے۔یہ بھی نہیں کہا۔لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (6:34) کہا اے رسول! ہم جانتے ہیں تیری اس آرزو کو بھی' ان جذبات کو جس کے ماتحت تم نے کہا ہے۔لیکن فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ (3:20) تیرے ذمے تو اس بات کو پہنچائے جانا ہے وَعَلَیۡنَا

الْحِسَابُ (13:40) اور یہ بات ہمارا قانون ہے جو حساب کر کے دے گا کہ اس درخت پہ پھل کب آئے گا۔ تمہاری اس آرزو کی خاطر قبل از وقت پھل نہیں آ سکتا۔ اللہ اکبر۔

نبی اکرم ﷺ کی آرزو کہاں خدا تعالیٰ کا جواب کہاں اور پھر حضرت صاحب کا رتبہ کیا کہیے؟

قرآن ہے' دین ہے' اس کا رسول ہے' خدا ہے یہ کیفیت ہے۔ یہاں انبیائے کرامؑ تو ایک طرف رہا ہر بوہڑ پیر ہر ککڑ پیر'' ندی وگن ڈئی اے'' دن بھر جا کے ان کے پاس مرادیں لاتے ہیں وہ کہتے ہیں کل آ جائے گا۔ کل کا ہے کو آئے گا؟ کہ حضرت صاحب رات کو جاتے ہیں اور پھر اللہ میاں کے ہاں سے ان درخواستوں کے اوپر حکم لکھوا کے لے آتے ہیں اپنی مرضی کے مطابق۔ ان کی مرضی!! چہیتے ہیں خدا کے' بڑے لاڈلے ہیں۔ اللہ اکبر۔ وہ خدا اپنے رسول سے کہہ رہا ہے' رسول بھی آخری رسول' زندگی کے آخری دنوں میں ایک آرزو دل میں بیدار ہو رہی ہے کہ یا اللہ! تیئیس سال کی محنتوں کا سرمایہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکونگا۔ انہوں نے پوچھا ہے کہ کیا دیکھ سکونگا۔ یعنی انداز بھی دیکھئے درخواست کا انداز بھی یہ ہے کہ کیا دیکھ سکونگا میں۔ جواب یہ ملتا ہے کہ تیرے ذمے تو پہنچائے چلے جانا ہے۔ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40) حساب ہے یہاں' یہاں تو ہر بات قاعدے اور حساب سے ہوتی ہے۔ یہ حساب ہمارے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ کوئی درخت کتنی محنت چاہے گا اور کب پھل لائے گا' یہ کھیتی کب پکے گی' ہمارا حساب ہے اس کے مطابق ہوگا۔ معاف رکھئے! میں تو یہ کہتا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ نے دیکھ تو لیا تھا ہو تو جانا تھا ذرا ہی پہلے پوچھا تھا نا۔ میں تو یہ کہونگا کہ اگر وہ جب یہ ہونا تھا اور اللہ کو تو معلوم تھا کہ آپ ﷺ کے سامنے ہو جائے گا'' تے اینی اک گل او ہدے جی رکھن نوں کہہ دیندا''۔ لیکن جو اس میں ہے عَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40) میں' پھر وہ بات نہ رہتی۔ ہو سکتا تھا کہ'' کج تھوڑی جی رعی کر گیا اے جناب'' ہو سکتا تھا کہ بعد میں ہم کہہ دیتے کہ وہ تو رسول اسکی خاطر تو خدا نے کہہ دیا پہلے کہ ہاں ہم ضرور تمہیں دکھائیں گے' ہماری خاطر تو نہیں۔

ہر عمل کا نتیجہ خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ظہور پذیر ہوتا ہے

جو رسول سے کہا وہی ہم سے کہا جا رہا ہے عَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40) ہر عمل کا نتیجہ ایک Reckoning کے مطابق ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی نتیجہ قانون کے مطابق نکلے گا ہر چیز حساب شدہ اس کے مطابق ہوگی۔ ایسا Exact حساب لگا ہوا ہے کہ زمین پہ بیٹھے ہوئے چاند کے اوپر کنٹرول ہو رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے یہ کس قوت سے ہو رہا ہے حساب کی قوت سے۔ وَ الْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (6:36) جو میں نے کہا تھا کہ وہ ترجمہ وہ جو کان رکھتے ہیں تیری آواز پہ لبیک کہیں گے' مردے' ہم ان کو اٹھائیں گے قیامت کو وہ ہماری طرف آ جائیں گے بات نہیں ہے۔ یہ وہ مردے ہیں جو اس وقت بے حس ہیں اس وقت تمہاری دعوت کے سامنے' ان سے مایوس

مت ہو جاؤ' طریقِ ابراہیمیؑ اختیار کرو' کہے جاؤ اپنی بات' پہنچائے جاؤ' ان وحشی پرندوں کو سدھائے چلے جاؤ' سدھائے چلے جاؤ۔

قرآن حکیم کا ترجمہ کسی زبان میں کیا وہ تو عربی زبان میں بھی نہیں ہوسکتا

یَبۡعَثُہُمُ اللّٰہُ ثُمَّ اِلَیۡہِ یُرۡجَعُوۡنَ (6:36) اٹھا بٹھائیں گے ہم ان کو۔ یہ بعث عجیب لفظ ہے جو استعمال ہوا ہے یہاں۔ اٹھانا ہی عام ترجمہ ہم اس کا کر دیتے ہیں۔ مشکل یہی ہے کہ ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن کے الفاظ کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہوسکتا عزیزانِ من! خود عربی زبان میں نہیں ہوسکتا اس کے مرادف نہیں مل سکتے اور زبانوں میں کیا ہوگا۔ بعث کے معنی ہوتا ہے کسی کی آزادی کے راستے میں جو رکاوٹیں کھڑی ہوں انہیں دور کر دینا۔ جاگنے والے کے راستے میں نیند ایک رکاوٹ ہوتی ہے جسے اسے جگانا کہتے ہیں' اس رکاوٹ کو دور کرنا ہوتا ہے۔ یہی جو بعث آپ نے دیکھا وہ بعث پارٹی ہے وہاں عراق میں۔ آزادی کے معنوں میں۔ جو وہاں یہ لفظ آتا ہے یہ اسی لیے آتا ہے کہ وہ جو آزادی کے راستے میں رکاوٹیں ہیں' انہیں دور کرنے والی پارٹی۔ عربی زبان میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آج استعمال ہو رہا ہے۔ کہا یہ کہ یہ جو بے حس ہیں ان کے راستے میں کچھ رکاوٹیں ہیں' وہ رکاوٹیں ہم دور کر دیں گے۔ تم کہے چلے جاؤ' وہ رکاوٹیں دور ہوتی چلی جائیں گی۔ نتیجہ کیا ہوگا؟ اِلَیۡہِ یُرۡجَعُوۡنَ (6:36) ہمارے ہاں تو جہاں بھی یہ راجعون کا لفظ آیا اور ہم نے قیامت پہ اٹھایا کہ وہاں جائیں گے۔ کیا کہا؟ پھر یہ ہماری طرف آ جائیں گے۔ یہ وحشی پرندے جو اس وقت کھٹکھٹاہٹ سے دور بھاگتے ہیں پھر اس کے بعد ایک آواز دینے سے تیری طرف چلے آئیں گے۔ لیکن چونکہ یہ نبی اپنی طرف نہیں بلاتا' یہ دعوت الی اللہ ہوتی ہے' خدا کی طرف بلاتا ہے اس لیے ثُمَّ اِلَیۡہِ یُرۡجَعُوۡنَ (6:36) کہا۔ تو کہے چلا جا پھر یہ آواز دینے پہ خدا کی طرف چلے آئیں گے' لوٹ آئیں گے' کہیں نہیں جائیں گے۔

انبیائے اکرام سے خدا کے احکام معجزوں کے زور پر تسلیم کروانے کی بجائے دلیل و براہین پیش کرتے ہیں

وَ قَالُوۡا لَوۡ لَا نُزِّلَ عَلَیۡہِ اٰیَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ (6:37) پھر وہی بات میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ان کا مطالبہ تھا معجزے کا جس کی بناء پہ یہ کہا تھا کہ معجزوں کے زور کے اوپر مسلمان کرنا ہوتا تو ان کو ہم پیدائشی مسلمان کیوں نہ بناتے۔ کہا یہ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اس قسم کی یہ چیز نازل ہوتی۔ قُلۡ اِنَّ اللّٰہَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنۡ یُّنَزِّلَ اٰیَۃً (6:37) بات یہ نہیں ہے کہ وہ ایسا کر نہیں سکتا۔ اگلے لفظ عجیب وغریب ہیں۔ یہ بات نہیں کہ وہ جیسا یہ کہتے ہیں ایسا کر نہیں سکتا' وہ قادر ہے اس کے اوپر وہ کر سکتا ہے۔ وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (6:37) بات یہ ہے کہ یہ جہالت کی فرمائش ہے یہ جو کرتے ہیں علم وبصیرت پہ مبنی نہیں ہے۔ اس لیے وہ ایسا نہیں کرے گا' کر سکتا ہے۔ یہ ہمارے ہاں متکلمین میں بھی بحثیں چلی آرہی ہیں آج کل بھی کبھی کبھی نوجوان آجاتے ہیں وہ یہ بات کہتے ہیں۔ وہ بات چلی آیا کرتی ہے۔ خدا کا

اختیاراس کا قادر مطلق ہونا خدا قادر مطلق ہے سب کچھ کرسکتا ہے۔

صرف مالی مفاد کی خاطر غلط بات کو منوانے کے سلسلہ میں وکیلانہ حربوں کا سہارا

اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ کیا خدا جھوٹ بول سکتا ہے۔یعنی آپ دیکھیں گے محض ایک Way of Logic جسے آپ کہتے ہیں اس میں کچھ بات نہیں ہے۔یعنی مقابلے میں جو شخص ہے اس کو محض مقابلے میں ہرا دینا جسے کہتے ہیں' لا جواب کر دینا بات میں صرف' کیا خدا جھوٹ بول سکتا ہے۔ یہ اسی قسم کی چیز وکیلانہ حربہ جسے کہتے ہیں جو عدالت میں یہ چیز ہوتی ہے۔دعویٰ یہ تھا کہ بیوی نے کہا تھا کہ یہ مجھے مارتا پیٹتا ہے۔اس نے کہا تھا کہ نہیں مارتا۔تو وکیل نے اس سے پوچھا تھا کہ مجھے یہ بتایئے کہ آپ نے اپنی بیوی کو مارنا چھوڑ دیا ہے یا نہیں۔ کہے چھوڑ دیا ہے تو اس کے معنی ہیں مارتا تھا' کہے نہیں چھوڑا تو اس کے معنی ہیں اب بھی مارتا ہے۔''تہانوں پتہ اے مقدمے کیویں کتے جاندے ہیگے نیں؟ سٹ ہزار روپیہ میں تینوں ایوں بری کرا کے لے آؤنگا'' ایسے بری ہوتا ہے' منطق ہوتی ہے۔خدا ایسا کرسکتا ہے یا نہیں۔کہا قَـــادِرٌ (6:37) دو لفظوں میں بات ساری کر جاتا ہے صاحب قرآن۔خدا یہ کچھ کرسکتا ہے خدا یہ کرتا نہیں ہے۔سیدھی سی بات ہے صاحب۔کیا وہ خلافِ فطرت دکھا سکتا ہے یا نہیں دکھا سکتا؟ دکھا سکتا ہے دکھاتا نہیں ہے۔کیا وہ یہ کرسکتا ہے کہ آم کا پیڑ ہم بوئیں اور اس کے اندر ببول آئیں؟ کرسکتا ہے وہ' کرتا نہیں ہے۔کیوں نہیں کرتا؟ لَـنْ تَـجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً (33:62) خدا بڑا اصول پرست ہے اس نے ایک دفعہ کہہ دیا ہے کہ ہم ایسا نہیں کریں گے' کبھی نہیں وہ ایسا کرے گا۔تمہارے ہاں جو شخص ایک دفعہ یہ کہہ دے کہ میں اصول کا پکا ہوں اصول ہوں اچھے' اس پہ پابند ہوا' اس کی شان میں تو قصائد پڑھتے ہو اور یہ چیز خدا کے خلاف لے جاتے ہو تم کہ جو وہ کرسکتا ہے کرتا نہیں۔ایک آدمی سچا ہے ساری عمر سچ بولتا ہے اصول کا پکا ہے آپ یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! وہ سچ بولے گا آپ جب بھی اسے کہیں گے۔کہا یہ جاسکتا ہے کہ کیا وہ جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں؟ بول سکتا ہے' آپ کہیں گے ٹھیک ہے' جھوٹ بول سکتا ہے وہ جھوٹ بولے گا نہیں کیونکہ اصول کا پکا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ باری تعالیٰ اپنے اصول کو کبھی نظر انداز کرتا ہی نہیں

وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (33:62) لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (6:34) ہم نے خود یہ قوانین بنائے ہم ہر وقت اس کو بدل سکتے تھے جو بنا سکتا ہے بدل سکتا ہے لیکن اس کے بعد ہم نے خود یہ چیز کہہ دی کہ ہم بدلیں گے نہیں۔ہم وعدے کے سچے ہیں' بات کے پکے ہیں' اصول پرست واقع ہوئے ہیں ہم بدلیں گے نہیں' جب کہہ دیا ہم نہیں بدلیں گے تو ہم نہیں بدلیں گے۔اس سے اس کے قادرِ مطلق ہونے کے اوپر کوئی حرف نہیں آجاتا بلکہ یہ تو بہت بڑی قدرت ہے کہ اتنی بڑی قدرت رکھتے ہوئے کہ بدل سکتا ہے پھر نہیں بدلتا۔

یہ بڑی چیز ہوتی ہے۔ کیسا حسین شعر یاد آ گیا

بے قراری ہے کس قرار کے ساتھ

جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

اسے اپنے اختیارِ کلی کے ساتھ اتنا بڑا جبر ہے اپنے اوپر۔ اپنے اوپر خود عائد کردہ یہ مجبوری نہیں ہوتی۔ جو خود عائد کردہ ہوتا ہے یہ اصول پرستی ہوتی ہے۔

خالق کائنات نے سوائے انسان کے، ہر چیز کو مجبور پیدا کیا ہے

قُلۡ اِنَّ اللّٰہَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنۡ یُّنَزِّلَ اٰیَۃً وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (6:37) یہ چیز تم کہتے ہو کہ خدا یہ کچھ کر کے زبردستی مومن پیدا کرے، مجبوراً ایک روش کے اوپر چلنے والا پیدا کرے، یہی چاہتے ہو نا تم۔ کہا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اس نے یہ کچھ بھی کیا ہوا ہے۔ **وَ مَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ یَّطِیۡرُ بِجَنَاحَیۡہِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمۡثَالُکُمۡ** (6:38) یہ جو تم کہتے ہو کہ سارے مومن کیوں نہ پیدا ہو گئے' کہتے ہو کہ خدا ایسا کر نہیں سکتا تھا؟ کہا ذرا دیکھو تو سہی یہ سارے جتنے ذی حیات ہیں دآبہ اور طیر دونوں اس میں لے آیا۔ دآبہ وہ ہیں جو زمین کے اوپر چلنے والے ہوتے ہیں۔ یہ جتنے بھی ذی حیات ہیں جتنے بھی اڑنے والے پرندے ہیں' دیکھتے ہو ان کو کیا ہوا ہے مجبور پیدا کیا ہم نے ان سب کو' ہیں نا سب مومن۔ کوئی ان میں سے' جس روش کے اوپر چلنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے' اس کے خلاف کبھی بھی ادھر اُدھر کچھ کرتا ہے۔ مجبور پیدا کر سکتے ہیں نا ہم۔ پہلے تو یہی چیز ہے کہ یہ دآبہ اور یہ طائر جتنے بھی ہیں یہ سب جانتے ہیں کہ انہوں نے کس روش پہ چلنا ہے۔ آپ کو معلوم ہے قرآن نے اس کے لیے الفاظ کیا استعمال کیے ہیں۔ سنئے کیا کہتا ہے قرآن!! **اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ الطَّیۡرُ صٰٓفّٰتٍ** (24:41) تم نے اس پہ کبھی غور نہیں کیا۔ ''تَرَ'' ہوتا ہے جہاں محسوس طور کے اوپر کسی چیز پہ غور کیا جائے۔ غور نہیں تم نے کیا کہ اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ بھی ہے' اب یہاں ترجمہ آپ کے ہاں ہو گیا خدا کی تسبیح کرتا۔ اردو میں تسبیح کرتا ہے'' پنجابی اچ تسبیح پھیر دا اے''۔ جہاں دیکھیں گے آپ 'تسبیح کرتا ہے'۔ تسبیح کو تسبیح لیا پھر اس کے بعد تسبیح کرتا ہے۔ کائنات میں ہر شے تسبیح کرتی ہے۔

لفظ ''سبح'' کے معنی تسبیح پھیرنے کی بجائے ہر آن قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے

سَبۡحٌ کے بنیادی معنی ہوتے ہیں گھوڑا اپنی اس چال سے جس میں وہ پوری توانائیوں سے اپنے پاؤں کھول کے چلتا ہے ''پوری دوڑ نال جیہڑا چلدا ہوندا ہیگا اے'' سرپٹ دوڑنا جسے کہتے ہیں۔ وہ جو چال گھوڑے کی ہوتی ہے جس کے اندر وہ پورے پاؤں کھول کے بھاگتا

ہے' وہ جو تیرا کی ہوتی ہے جس میں پورا ہاتھ یوں کر کے تیرنا ہوتا ہے' عربی زبان میں اسے سبح کہتے ہیں۔ جو کام کسی کے ذمے ہو اس میں پوری توانائی صرف کر کے تا بہ حدِ امکان' پوری استطاعت کے ساتھ سرگرمِ عمل رہنا۔ دیکھتے نہیں ہو تم۔ "تَـرَ" ہے یہاں۔ فکری چیز یونہی نہیں ہے' محسوسات کے طور پہ ہے' طبعی چیزیں ہیں۔ سائنٹسٹ کی لیبارٹری میں دیکھا جائے۔ دیکھتے نہیں ہو کہ ہر شے کس طرح اپنے فرائض مفوضہ کی سر برآوری میں اس طرح سے تیزی سے سرگرمِ عمل ہے۔ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ (24:41) اور یہ پرندے بظاہر جو تمہیں یونہی نظر آتے ہیں' اڑتے چلے جا رہے ہیں' یہ کیوں ایسے ہے؟ ان میں سے ہر شے كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ (24:41) ان میں سے ہر شے اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو جانتی ہے۔ دیکھا صلوٰۃ کا لفظ تسبیح کا لفظ۔ جب ان سے پوچھئے کہ جنہوں نے صلوٰۃ کو محدود کر دیا مقید کر دیا صرف اتنے سے حصے پہ جو مسجد میں ادا کی جاتی ہے عزیزانِ من! وہ بھی صلوٰۃ ہے صلوٰۃ کا ایک گوشہ ہے۔ صلوٰۃ تو ساری زندگی میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ صلوٰۃ کے معنی ہیں قوانینِ خداوندی کے پیچھے پیچھے چلے جانا۔ لیکن جب صلوٰۃ کو صرف نماز اور تسبیح کو پھیرنا کہا اور ان سے پوچھا جائے کہ یہ تو پھر ان کی نماز ان کی تسبیح تم دیکھتے نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے یہ چیزیں تم دیکھ نہیں سکتے' وہ کرتے ہیں اندر ہی اندر۔ چل بھئی۔ ہر شے ان میں سے جانتی ہے کہ وہ کیا منزل ہے جس کی طرف مجھے جانا ہے' وہ کونسی روش ہے جس کے اوپر اس نے چلنا ہے۔ اور پھر پوری توانائی سے اس کے پیچھے چلے جاتی ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (24:41) اور ہم جانتے ہیں کہ یہ کیا کرتے ہیں۔ میں کہہ یہ رہا تھا وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ (6:38) یہاں اور بات کہی ہے۔ کہا تو یہ ہے کہ مجبور تو یہ ہیں۔ یہاں ایک لفظ آیا ہے سائنٹسٹ حضرات کے لیے غور طلب اور میں کہتا ہوں ایک لفظ ہی اگر لے لیں تو بتا دیتا ہے کہ یہ واقعی خدا کی کتاب ہے۔ ایک دہریے سائنٹسٹ کے سامنے بھی یہ چیز لائی جائے گی تو اس کا سر جھک جائے گا اس کے لیے۔ وہ کہتا ہے یہ ساری چیزیں ذی حیات جتنے تمہیں نظر آتی ہیں اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ (6:38) تمہارے جیسی Species ہیں۔

ڈارون کی Evolution تھیوری کی وضاحت اور قرآن حکیم کا اعجاز ایک فرق کے ساتھ

میں نے Species کا ترجمہ اس لیے کیا کہ ڈارون نے جب ریسرچ کی ہے Evolution کے اوپر تو اس نے یہ جتنی چیزیں پہلے دن سے جو ایک Unitary Cell (ایک لائف سیل' ایک جرثومہ زندگی کا) وہاں سے لے کے زندگی پیکرِ بشریت تک جو آئی ہے' اس میں جن مراحل میں سے یہ گذری ہے' ان میں سے جب وہ ان کی تحقیق کرتا ہوا چلتا جا رہا ہے تو مختلف انواع گنا رہا ہے' نوع گنا رہا ہے' اس کا نام Species ہے۔ یہ آپ کے اس دور کی سائنس کا معرکۃ الآراء کارنامہ ہے جسے Evolution کی تھیوری کہتے ہیں۔ اور اس میں بتایا یہ گیا ہے کہ یہ سارے ذی حیات پیکروں کے اعتبار سے تو مختلف نظر آتے ہیں اپنی اوریجن کے اعتبار سے یہ سب ایک ہی ہیں ایک جیسے ہیں۔ انسان سے لے کے وہ پہلے کیڑے تک ساری انواع جو ہیں ایک جیسی ہیں نوعِ انسانی جیسی ہیں اور یجن کے

اعتبار سے۔اس نے اپنی کتاب کا نام "The Origin of Species" رکھا ہے کہ ان کا اوریجن کیا ہے' سرچشمہ کیا ہے۔قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ یہ جتنے بھی تمہیں ذی حیات نظر آتے ہیں' وہ زمین پہ چلنے والے ہوں' فضا میں اڑنے والے ہوں اُمَمٌ اَمۡثَالُكُمۡ (6:38) یہ انسانوں جیسی Species ہیں۔لفظ یہاں ہے اُمَمٌ(6:38) ام کے معنی ماں ہوتا ہے۔عربی زبان میں سرچشمے کو کہتے ہیں Origin کے لیے یہ لفظ آتا ہے Origin of species ترجمہ ہے اس کا۔اللہ اکبر۔قرآن ہے عزیزانِ من!۔ہم آپ کیا سمجھیں گے اس کو۔ڈارون کے سامنے کوئی لے آتا' جھوم اٹھتا اس چیز کے اوپر کہ کیا لفظ استعمال کر گیا ہے قرآن۔اَمۡثَالُكُمۡ(6:38) کے تو معنی یہ ہو گئے کہ تمہاری جیسی وہ نوع ہیں۔یہ ٹھیک ہے کہ امم کا لفظ آخر میں چل کے گروہ یا نوع کے لیے آتا ہے۔اپنے روٹ کے اعتبار سے یہ جوام ہے کیونکہ ماں کے معنی میں ہوتا ہے۔قرآن میں بھی استعمال ہے' عربی زبان میں بھی کسی شے کا جو سرچشمہ ہوتا ہے اوریجن ہوتی ہے اسے وہ ام کہتے ہیں۔ام الکتاب قرآن نے کہا ہے قرآن تمہارے پاس یہاں ہے اس کی ام وہاں ہے۔کہتا ہے یہ جتنے ذی حیات ہیں ام کے اعتبار سے سارے امثالکم تمہارے ہی جیسے ہیں۔ہیں تو یہ تمہارے ہی جیسے' فرق دیکھو کتنا پڑ گیا! وہ اتنے مجبور ہیں کہ کوئی دوسری روش اختیار نہیں کر سکتے۔تم اتنے صاحبِ اختیار ہو کہ تمہیں ہم نے خود چوائس دیدیا ہے۔مَا فَرَّطۡنَا فِی الۡكِتٰبِ مِنۡ شَیۡءٍ (6:38) ان کے لیے جتنی بھی یہ کتابِ فطرت بچھا رکھی ہے ہم نے' کہیں کوئی کمی اس میں نہیں ہے۔کوئی شے ایسی نہیں ہے جس کی زندگی کے لیے وہاں قوانین موجود نہ ہوں۔اور اسی طرح سے یہ الکتاب جو تمہیں ہم نے دی ہے اس میں بھی تمہاری زندگی کے لیے اسی طرح سے قوانین موجود ہیں۔پھر تم دیکھتے ہو ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمۡ یُحۡشَرُوۡنَ (6:38) ثم کے معنی یہی نہیں ہوتا کہ آخر میں جا کے یہ ہوگا اور کے معنی بھی ہوتا ہے۔تم دیکھتے ہو کہ یہ ساری جتنے بھی امم ہیں' یہ جتنی Species ہیں جن کے لیے کتابِ فطرت میں قوانین ہم نے دیے ہیں' وہ کیسے اس مرکز کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔وہ مجبوراً ہوتے ہیں تم اپنے اختیار و ارادے سے ایسا کرو گے۔یہ ہے فرق عزیزانِ من! دونوں میں۔اب آپ نے بات سمجھ لی جو شروع کی تھی کہ کہتے یہ ہیں کہ معجزہ دکھا کے کیوں نہیں مسلمان بنا لیا جاتا۔کس طرح سے قرآنِ کریم اس کو رد کرتا چلا آ رہا ہے۔یوں مجبوراً تمہیں مسلمان بنانا ہوتا تو پیدا ہی ایسا کر دیتے۔دیکھتے ہو ساری جتنی بھی باقی امم امثالکم ہیں یہ ذی حیات کائنات میں بکھرے ہوئے پھیلے ہوئے دیکھتے ہو کہ کس طرح سے ہمارے قانون کے اوپر چلنے کے لیے مجبور پیدا کیے گئے ہیں' مجبور چلے جا رہے ہیں۔کر سکتے تھے ہم ایسا تمہارے لیے بھی' ہم کریں گے نہیں ایسا کہ ہم نے کہہ دیا تھا پہلے دن سے اور ہم کبھی وعدہ خلافی نہیں کیا کرتے۔

خواہ پوری کائنات کا معاملہ کیوں نہ ہو خدا اپنے قانون کو کسی صورت نہیں بدلتا

''رب ہونا چڈا ای اوہنوں ہے عزیزانِ من! جیہڑا کدی وعدہ خلافی نہ کرے'' مَـا یُبَـدَّلُ الۡـقَوۡلُ لَدَیَّ (50:29) کہتا ہے بات کا بڑا سچا' روش کا بڑا پکا ہو۔قانون قانون ہی ہوتا ہے جو کسی کی خاطر بھی نہ بدلے اس میں نہ رورعایت ہو کسی کی نہ کسی کی دشمنی اس

میں مقصود ہو اور یہ وہی کر سکتا ہے جو جذبات سے بلند اور عاری ہو اور یہ صرف کائنات میں خدا ہو سکتا ہے کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ انسان کتنا ہی بڑا قانون ساز کیوں نہ ہو اس کے دل کے نرم گوشے کسی نہ کسی طرح سے ضرور جھک جاتے ہیں کسی نہ کسی طرف۔ وہ کہ جو Objectively اس چیز کو کر سکتا ہے جذبات سے بلند ہو کر۔ وحی کی ضرورت ہی اسی لیے پڑتی ہے کہ وہ جذباتِ انسانی سے بلند سرچشمۂ علم ہے وہاں سے وہ چیز آتی ہے۔ کر سکتا ہے کرتا نہیں ہے کرے گا نہیں۔ طریق تمہارے لیے یہ اختیار کیا ہے راستے تمہارے سامنے کھول کے رکھ دیے۔ باہر روشنی دیدی تمہاری آنکھوں میں بینائی دیدی ہر موڑ کے اوپر سائن پوسٹ نصب کر کے رکھ دیا اور تم سے کہہ دیا فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (18:29) جس کا جی چاہے ادھر جائے جس کا جی چاہے اُدھر جائے۔ جی چاہے جونسا راستہ اختیار کرو لیکن جو راستہ اختیار کرو گے وہ راستہ اسی منزل کی طرف پہنچائے گا جس کی طرف جانے کے لیے اسے بنایا گیا ہے۔

انسان کسی راستے کے تعین کی حد تک تو با اختیار ہے لیکن منزل کا رخ بدلنے کے معاملے میں اختیار سے محروم

یہ نہیں ہو سکتا کہ سڑک تم لے لو قصور کی طرف جانے کی اور پہنچ جاؤ گوجرانوالے۔ یہ تو تمہارے اختیار میں ہے کہ تم مزنگ چونگی سے فیصلہ کر لو کہ کونسی سڑک اختیار کرنی ہے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنے فیصلے سے سڑک اختیار کرو کدھر جانے کی منزل تمہیں مل جائے دوسری۔ یہاں تم مجبور ہو وہاں تم صاحبِ اختیار ہو۔ یہ ہے قرآن کا پیغام اور یوں آپ نے دیکھ لیا کہ یہ کس طرح A Challenge to religion ہوتا ہے عزیزانِ من!۔ یہ ایک گوشہ ہے میں نے جو بتایا ہے آتے جائیں گے اس قسم کے گوشے جہاں یہ مذہب کی ایک ایک متمیز خصوصیت کے خلاف چیلنج بن کے۔ اسلام دین ہے مذہب نہیں ہے۔ Religion اس کا ترجمہ بالکل غلط ہے۔ ہم سورۃ الانعام کی 38 ویں آیت تک آ گئے 39 ویں سے آگے شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

پانچواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 39 تا 47)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اگست 1971ء کی 15 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی 39 ویں آیت سے ہو رہا ہے (6:39)۔

یوم پاکستان پر مبارک باد کی بجائے یوم الفرقان کا بنیادی مقصد

سب سے پہلے آپ احباب میری طرف سے یومِ پاکستان پر مبارکباد قبول کیجیے۔ میں اسے ہمیشہ یومِ پاکستان مبارک نہیں بلکہ پاکستان مبارک کہا کرتا ہوں۔ کل میرے ایک دوست نے کھانے کا ایک خوان بھیجا تحفتاً میری طرف بعینہٖ جس طرح سے عید کے دن ہم سیویاں بھیجا کرتے ہیں ایک دوسرے کے ہاں۔ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ انہوں نے اس دن کی اہمیت کو بڑی اچھی طرح سے پہچانا۔ اگر ہمیں احساس ہوتا کہ آزادی کیا ہے، آزادی کی اہمیت کو ہم جانتے تو اس دن کو ہمیں واقعی عید کے دن کی طرح منانا چاہیے تھا۔ اور یہ جو عید ہے آپ کی وہ بھی تو یومِ آزادی ہی کی تقریب تھی جو مذہب میں آ کے ایک رسم بن کے رہ گئی۔ یہ ٹھیک ہے قرآنِ کریم رمضان

میں نازل ہوا تھا اس اعتبار سے وہ نزولِ قرآن کا بھی ایک جشن تھا۔ لیکن یہ جشن تو منایا گیا تھا پہلی بار جنگِ بدر کی فتح کے بعد' وہ یوم الفرقان قرآن نے کہا تھا اس کو' الگ ہو جانے والا دن۔ اور جنگِ بدر ہی وہ تھا جس میں درحقیقت آزادی نصیب ہوئی تھی ان مسلمانوں کو اور اس کے بعد انہوں نے اپنی مملکت کے قیام کی پہلی اینٹ رکھی تھی مدینے میں۔ تو یہ جو عید منائی گئی سب سے پہلی دفعہ وہ جنگِ بدر کی اس فتح کے بعد تھی اور یہ ابتداء تھی اسلامی مملکت کے قیام کی مدینۂ منورہ میں۔ اور اس کے ساتھ چونکہ قرآنِ کریم کے نزول کا بھی وہی دور تھا اس لیے یہ دونوں چیزیں جمع کر دی گئیں کہ یہ ہماری فتح و کامیابی جس سے ہماری مملکت کا آغاز ہوتا ہے' قرآنِ کریم کے حدود کے اندر رہتے ہوئے کارفرما رہے گی۔ اور یہ تھا جسے آپ یہ سیویوں والی عید کہتے ہیں۔ عید الفطر کا جشن جو آپ مناتے ہیں اسکی تقریب یہ تھی۔ اور تیرہ سو سال کے بعد پھر یہ ایک موقعہ آیا ہے امت کی زندگی میں کہ انہوں نے اسلام کے نام پہ ایک مملکت کا مطالبہ کیا' اس میں کامیابی ہوئی۔ یہ یوم الفرقان تھا جو 14 اگست تھا آپ کے لیے۔ الگ ہوئے ہم ہندو کی اس غلامی سے ایک مملکت کے قیام کی پہلی اینٹ رکھنے کے لیے۔ مملکت وجود میں آئی اور جیسا میں نے کہا ہے اور ہمیشہ کہا کرتا ہوں میرے لیے تو یہ چیز جزوِ ایمان تھا اور ہے۔ اس لیے کہ میں تو قرآنی بصیرت سے اس نتیجے پر پہنچا اور میں ہی نہیں' ہم لوگ جنہوں نے قرآن کی روشنی میں اس چیز کو لیا تھا' ہم اس نتیجے پہ پہنچے تھے اور پہنچے ہوئے ہیں کہ اسلام مذہب کی حیثیت سے ہر حالت ہر کیفیت ہر مملکت ہر حکومت غلامی محکومی میں زندہ رہ سکتا ہے اور اس کی حیثیت ہی کچھ نہیں ہوتی رسومات کے علاوہ۔ لیکن وہ ایک دین کی حیثیت سے ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے صرف اپنی آزاد مملکت میں زندہ رہ سکتا ہے۔ اور یہی تھا وہ تقاضا ہمارے دین کا جس کے لیے ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔

علامہ اقبال اور قائد کے تصور پاکستان کا مقصد اور اس کی عملی شہادت

علامہ اقبالؒ نے 1930ء میں اس کا تصور پیش کیا ہے اور یہ کہہ کے تصور پیش کیا تھا کہ اسلام ایک زندہ حقیقت اپنی آزاد مملکت میں بن سکتا ہے اس کے بغیر اسلام' اسلام ہوتا ہی نہیں ہے۔ اور یہ ہمارا تقاضا ہے جس کے لیے ہم مطالبہ کرتے ہیں ایک الگ مملکت کا۔ اور اسی مطالبے کی رو سے پھر یہ مملکت ہمیں حاصل ہوئی۔ قائدِ اعظمؒ عمر بھر اس کو دہراتے چلے گئے تھے کہ یہ مملکت ہم اس لیے حاصل کر رہے ہیں کہ یہاں قرآنی نظام کے مطابق ایک مملکت یا حکومت تشکیل ہوگی۔ اور اس کے لیے ہمیں یہ مملکت تقسیم کے بعد چودہ اگست کو ملی۔ تیرہ اگست کی رات کے بارہ بجے کے بعد۔ تو چودہ اگست کا دن حقیقت میں سب سے پہلے ملتِ پاکستانیہ کے لیے اور اس کے بعد تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے واقعی ایک نئی عید کا دن ہے اور اسے اسی طرح سے منانا چاہیے تھا۔ لیکن یہ کچھ تو وہ قومیں کرتی ہیں جن کے احساس بیدار ہوں' جن کے تصورات اجاگر ہوں جنہیں معلوم ہو کہ غلامی اور آزادی میں فرق کیا ہوتا ہے' جنہیں پتہ ہو کہ مذہب اور دین میں امتیاز کیا ہوتا ہے۔

جشنِ آزادی کا دن منانے کی شرط اور اس کے خدوخال

افسوس ہوا کہ یہ حقیقت یہاں فراموش کردی گئی‘ کرادی گئی‘ میں کہونگا ہمارا یہ مجرمانہ تغافل تھا جس کی وجہ سے ہمیں آج یہ دن دیکھنے نصیب ہوئے کہ یہ اس قسم کے جشن کی تقریبیں ہمارے ہاں کی ماتم کدوں میں بدل جاتی ہیں۔لیکن اس کے باوجود یہ حوادث آنے جانے ہوتے ہیں۔ یہ آتے ہیں گذر جاتے ہیں۔اگر مملکت کی بنیادیں مضبوط ہیں‘ اگر آپ کا وہ تصور کہ کس مقصد کے لیے یہ حاصل کی گئی‘ وہ زندہ ہے تو پھر یہ دن واقعی جشن کے دن ہیں۔اور میں نے جو آپ کو مبارکباد دی تو اس احساس کے ماتحت دی کہ یہ خطۂ زمین ہم نے قرآنی نظام کو متشکل کرنے کے لیے حاصل کیا ہوا ہے۔جب تک یہ دعویٰ ہے آپ کی قوم کا‘ یہ دن دین کا تقاضا ہے‘ روزِ عید ہے آپ کے لیئے اسی طرح منانا چاہیے۔بدقسمتی سے اگر قوم پھرگئی اپنے اس مقام سے تو پھر ٹھیک ہے‘ دنیا کی اور مملکتوں کی طرح یہ بھی ایک مملکت ہوگی۔اور دنیا کی تو اپنی عام مملکتوں کا بھی جو دن آزادی کا مناتی ہے‘ وہ امریکہ کی آزادی کے دن کو اندازہ لگایئے‘ ہفتہ بھر کا ان کے ہاں جشن ہوتا ہے وہ۔اور وہ جشن ایسا ہوتا ہے کہ ساری قوم سارا ملک بوڑھے‘ بچے‘ مرد‘ عورتیں تمام کی تمام اس جشن کے اندر ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔انداز ان کے منانے کا کیا ہے‘ یہ الگ بات ہے لیکن انہیں معلوم ہے کہ یہ دن کس قدر اہم ہے اور کس قدر اس کے شایانِ شان اس کو منانے کی ضرورت ہے۔زندہ قومیں اس طریق سے اپنے دنوں کی یاد کو قائم رکھتی ہیں۔حالانکہ آج انہیں شاید ضرورت بھی اس کی نہ ہو کہ وہ تو اب دوسری قوموں کو زندگیاں اور آزادیاں بخشنے کی حالت میں آ پہنچی ہے۔لیکن اپنی آزادی کے دن کو وہ آج بھی اسی طرح سے مناتی ہے۔اور اس آزادی کے ہیروز‘ انہوں نے پہاڑوں کی چٹانوں کو تراش کر وہاں ان کے مجسمے قائم کیے ہوئے ہیں۔ یہ ہوتی ہے آزادی عزیزانِ من!۔اور پھر اگر وہ آزادی آپ کے اسلام کی آزادی کے مرادف ساتھ ہو جائے تو آپ سوچئے تو سہی کہ پھر وہ جشن کس قدر آپ کے لیئے دنیا اور آخرت دونوں میں شادمانیوں کا موجب بن سکتا ہے۔یہ تھا چودہ اگست کا دن جو کل یوں گذر گیا۔بہرحال! میں نے اس کی تفصیل کو ملتوی کر رکھا ہے۔کل کو اس قسم کا جلسہ نہیں کر سکے پابندیاں تھیں۔

14 اگست 1947ء کی اہمیت کے علاوہ چھ ستمبر کے واقعہ کی قدرومنزلت

چھ ستمبر کو ہر سال ہم پھر ایک یاد منایا کرتے ہیں کہ جو ایک جنگِ بدر کا سا واقعہ تھا ہمارے لیے۔اس میں اگر یہ پابندیاں نہ ہوئیں اور اجازت ملی ایک عام جلسہ کرنے کی تو میرے ذہن میں ہے کہ میں کم از کم اس مملکت کا پس منظر اور اس کی اہمیت اور اس کے تحفظ کے لیے جانیں دینے والوں کا مقام جو ہے اسے تفصیل سے اس میں بیان کرونگا۔اس کا اعلان ہم بعد میں کریں گے جب یہ چیز طے ہو جائے گی۔ آج ہم درس کو شروع کرتے ہیں سورۃ الانعام کی 39 ویں آیت سے۔

مضمون چونکہ مربوط چلا آ رہا ہے تجدید یاداشت کے لیے 38 ویں آیت کو دوبارہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے بھی جیسا میں نے عرض کیا تھا، بڑی اہم آیت ہے، بڑی ہی بلند حقیقت کی مظہر ہے وہ آیت۔ اور میں نے جیسا عرض کیا تھا کہ اس ایک آیت کو ہی اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ قرآن واقعی کسی انسان کی تصنیف و تالیف نہیں تھی یہ خدائے علیم و خبیر ہی کی طرف سے آیا ہوا پیغام تھا۔ وَ مَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ یَّطِیۡرُ بِجَنَاحَیۡهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمۡثَالُكُمۡ (6:38) بڑی عظیم چیز تھی۔

قرآن حکیم میں انسان کی راہنمائی کے سلسلہ میں کائناتی حقائق کا ذکر

قرآنِ کریم سائنس کی کتاب نہیں ہے، یہ تاریخ کی کتاب نہیں ہے، یہ طبیعات کی کتاب نہیں ہے۔ یہ تو آدمی کو انسان بنانے کی کتاب ہے۔ لیکن اس کے اصولوں میں جہاں کہیں یونہی چلتے ہوئے بھی فطرت کے قوانین کا کوئی اشارہ مل جاتا ہے، کائنات کے نظام کا، ان حقائق کا جو بکھرے پڑے ہیں، کہیں ضمناً بھی اشارہ آ جاتا ہے تو وہ اشارہ چونکہ خدائے علیم کی طرف سے ہے، ہو نہیں سکتا کہ آپ کے ہاں کی سائنس کی تحقیقات اور Researches کسی حتمی نتیجے پہ پہنچیں اور وہ قرآن کے اس بیان کے خلاف چلی جائے۔ قرآن نے تو اپنے دعوے کی صداقت کے ثبوت میں دلیل یہ پیش کی ہے کہ سَنُرِیۡهِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ (41:53) کہ ہم اپنی نشانیاں عالم انفس اور آفاق میں تمہیں دکھاتے چلے جائیں گے، دکھاتے چلے جائیں گے اور ہر مضمر حقیقت پہ پڑا ہوا پردہ جب اٹھے گا تو اس کے بعد نظر آئے گا کہ قرآن کا بیان واقعی حقیقت ہے۔

قرآنی حقائق کی عظمت کو سمجھنے اور جاننے کا طریق

قرآن کے بیان کو حقیقتِ ثابتہ معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم رموزِ کائنات پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھاؤ، ہر پردہ جو اٹھے گا، قرآن کی صداقت کی دلیل بنتا چلا جائے گا۔ یہاں قرآن نے بات تو یہ کہی یہ ہے انسانوں سے کہ تم کارگہ کائنات پہ غور کرو کس طرح قوانینِ خداوندی کی اطاعت میں وہ سرگرداں چلے جاتے ہیں اور کسی کو مجالِ سرتابی نہیں یارائے سرکشی نہیں۔ انہیں کا جز و تم ایک ہو۔ تم بھی تو کائنات کا ایک حصہ ہو، تمہارے لیے بھی تو قوانین ہیں۔ ان حیوانات کی، ان کیڑے مکوڑوں کی، ان پرندوں چرندوں کی، تو یہ کیفیت ہے اور تم انسان اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہتے ہو اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم ان قوانین سے سرکشی برتتے ہو، ان کی تکذیب کرتے ہو اندھے بہرے گونگے بن کے چلتے رہتے ہو۔ یعنی اس نے کہا یہ ہے کہ تم ان سے بھی گئے گذرے ہو گئے۔ بات تو اس نے یہ کہی تھی۔ لیکن میں نے عرض کیا تھا کہ چلتے ہوئے ایک لفظ وہ کہہ گیا ہے اور اس کے بعد ہمارے اس دور میں سائنس کی جس تحقیق کو انسانیت کی تاریخ میں معرکۃ الآراء کہا جاتا ہے، قرآن چودہ سو سال پہلے یہ بات یہاں کہہ گیا۔ اس نے کہا کہ یہ زمین میں، زمین کے اوپر چلنے والی، رینگنے

والی جاندار مخلوق، دآبہ میں یہ سب آجاتے ہیں۔ اور یہ فضاؤں میں اڑنے والے پرندے یہ سب کے سب اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ (6:38).

Species کے متعلق قرآن حکیم کے پیش کردہ حقائق

عزیزانِ من! انسانوں کی تاریخ میں پہلی بار یہ چیز ہے جو کہیں کہی گئی ہے کہ یہ ساری کی ساری Species تمہاری جیسی ہیں۔ کسی کے ذہن میں، تصور میں، خیال میں، قیاس میں، نہیں یہ بات آسکتی تھی کہ چودہ سو سال پیشتر یہ بات کہی جائے کہ جس قدر تمہیں یہ جاندار مخلوق نظر آتی ہے اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ (6:38) یہ تمہارے ہی جیسی Species ہیں۔ اور پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا لفظ یہاں امم، ام کی جو جمع ہے، ویسے تو اس کو گروہ یا Specie کہا جائے گا، نوع کہا جائے گا اس کو۔ لیکن روٹ کے اعتبار سے یہ ام جو ہے اور یجن کے لیے آتا ہے۔ کسی شے کے سرچشمے کے لیے یہ آتا ہے کہ اپنی اوریجن کے اعتبار سے تم اور یہ سب کے سب ایک ہی نوع ہو۔ اور جسے آج Theory of Evolution کہا جاتا ہے وہ ہے کیا؟ یہی چیز ہے جو کہی گئی کہ زندگی اپنے اولیں جرثومے سے اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی مختلف پیکروں میں سے گذری، مختلف مراحل میں سے گذری۔ یہ Microscopic Cell جو آپ کو نظر آتے ہیں، یہ جراثیم جو آج Naked Eye سے نظر ہی نہیں آتے، اس کے بعد زندگی محسوس شکل میں جب تمہارے سامنے آتی ہے۔ رینگنے والے کیڑے مکوڑے ہوں، چوپائے ہوں، دو پاؤں پہ چلنے والے ہوں، اڑنے والے ہوں۔ یہی چیز کہی گئی ہے نا اس میں کہ Evolve کرتی ہوئی زندگی ان پیکروں میں سے گذرتی ہوئی، انسان کے پیکر کے اندر آخر الامر آ گئی۔ میں کہتا ہوں ڈارون نے جب نام رکھا ہے اپنی کتاب کا Origin of Species، حیرت ہوتی ہے کہ ترجمہ ہے اس کا اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ (6:38)۔ اور یہ چیز تھی ہمارے سائنٹسٹ جس دور میں تھے ان کی نگاہوں میں یہ چیز تھی۔ ہماری طرف تو کم معلوم ہوگا لوگوں کو، یورپ کو تو یہ پتہ تھا، ڈارون کے تو علم میں تھا۔ Theory of Evolution جو ہے سب سے پہلے اس پہ کتاب ابنِ مسکویہ نے اپنا ''فوز الاصغر'' ان کی کتاب کا نام ہے، وہ لکھی تھی اس نے۔

ڈارون کی Theory of Evolution کے علاوہ ابن مسکویہ کی کتاب فوز الاصغر کے انکشافات اور قرآن حکیم کا بنیادی موضوع

یہ ٹھیک ہے کہ ریسرچ تو اس طرح سے نہیں کی تھی جیسے کہ ان لوگوں نے کی۔ زمانہ من حیث الکل بھی تو آگے آیا ہوا ہے۔ اب Researches کے لیے آسانیاں ہیں۔ اس زمانے میں نہیں تھیں۔ ابنِ مسکویہ نے قرآن کی آیات سے اشارہ پا کر یہ کہا کہ یہ زندگی تو اس طرح سے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ اور اس نے حیوانات سے نہیں شروع کیا، نباتات سے شروع کیا تھا اس کو۔ قرآن تو اس قسم کی نشانیاں اور آپ کو راستے کے چراغ دیتا ہوا چلا جاتا تھا۔ یہ جو ہر تیسری آیت کے بعد یہ تفکرون اور تعقلون اور

تشعرون پہ قرآن زور دیتا چلا جا رہا ہے غور وفکر' شعور' عقل' تدبر یہ کا ہے کے اوپر غور وفکر ہے؟ یہی حقائق ہیں قرآن کے جن کے متعلق وہ کہتا ہے کہ یوں نہ گذر جاؤ ان آیات کے اوپر۔لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ یہ اس کا بنیادی موضوع نہیں ہے۔موضوع تو اور ہے وہ تو انسان ہیں مخاطب وہ اس کو اس کا مقام عطا کرتا ہے۔اور یاد رکھئے کہ قرآن کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ وہ انسان کو اس کا صحیح مقام عطا کرتا ہے۔کہا کہ یہ ساری انواع تم ہی جیسی ہیں۔یہ تم ہی جیسا کہنے سے اس نے ایک عجیب بات کہی کہ ان کے متعلق تو تم دیکھتے ہو کہ ہر شے قانون کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی چلی جا رہی ہے۔مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (6:38) تم دیکھو قوانینِ فطرت پر' کوئی شے ایسی نہیں اور اس شے کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے لیے فطرت کے قوانین (Laws of nature) موجود نہ ہوں۔مَـا فَـرَّطْـنَـا فِـي الْـكِـتٰـبِ (6:38) یہاں یہ الکتاب کتابِ فطرت ہے۔کمی نہیں کی' کوئی چیز نہیں جہاں کسی شے کی زندگی کا گوشہ Neglect کر دیا ہو اس نے' بھول گئے ہوں نہ دیا گیا ہو۔کمی کے معنی ہوتا ہے۔ہر نوع کے لیے کائنات کی ہر شے کے لیے فطرت کے قوانین جنہیں تم کہتے ہو' ہم نے وہ قوانین بنائے۔

کائنات کی ہر شے اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح سے واقف ہے

جیسا کہ میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا' قرآنِ کریم نے پھر یہ بھی بتایا کہ یہ تمام اشیائے کائنات اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ (24:41) تم نے کبھی اس پہ بھی غور کیا ہے کہ کائنات کی ہر شے اور یہ اڑنے والے پرندوں تک جو تمہیں نظر آتے ہیں' ہر شے اس پروگرام کی تکمیل میں جو ان کے لیے تفویض کیا گیا ہے' سرگرمِ عمل رہتے ہیں ہر وقت۔كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ (24:41) ان میں سے ہر شے اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح سے واقف ہے۔صلوٰۃ فرائضِ منصبی کو کہتے ہیں' تسبیح اس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے پوری توانائی صرف کر کے اس پروگرام کو حاصل کیا جائے جو صلوٰۃ کے اندر پنہاں تھا۔کہا تم دیکھو گے کائنات کی ہر شے' قانون اس کے لیے مقرر ہے' وہ خود جانتی ہے اس قانون کو۔پانی کو پتہ ہے کہ میں نے نشیب کی طرف بہنا ہے۔آگ کو معلوم ہے میں نے حرارت دینی ہے بکری کو پتہ ہے کہ میں نے گھاس چرنا ہے۔مرغی کے نیچے سئے ہوئے انڈے کچھ بطخ کے انڈے کچھ مرغی کے انڈے' کئی دفعہ جیسا میں نے عرض کیا ہے' انڈوں میں سے چوزے نکلتے ہی مرغی کے چوزے خشکی کی طرف بھاگتے ہیں' بطخ کے چوزے پانی کی طرف بھاگتے ہیں۔مرغی کے چوزوں کو پانی کی طرف لے جایئے' دوڑ دوڑ کے پیچھے کی طرف چلے جائیں گے۔چیل کا سایہ پہلی دفعہ ان کی نظر میں پڑے گا تو ماں کے نیچے آ کے چھپ جائیں گے۔كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ (24:41) ہر ایک جانتا ہے ان میں سے۔کہا مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (6:38) قوانینِ فطرت کی جو کتاب ہے یہ کتابِ فطرت' صحیفۂ فطرت اس میں کہیں کوئی کمی نہیں کی گئی۔کہا تم بھی تو اس کائنات کے ایک جزو ہو' ایک حصے ہو' تو کیا تمہاری زندگی قوانین کے دائرے سے

بالکل بیباک سرکش جیسے جی چاہے بسر کرو، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تمہارے لیے بھی الکتاب ہے تمہیں بھی قوانین کے تابع زندگی بسر کرنی ہوگی۔ یہ تمہاری الکتاب وحی کے ذریعے دی گئی ہے۔ تمہیں اس کے مطابق زندگی بسر کرنی ہوگی۔ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمۡ یُحۡشَرُوۡنَ (6:38) ان تمام چیزوں کو دیکھئے کہ وہ ایک مرکز کے گرد جمع ہوئے ہوتے ہیں۔ اور تمہاری کیفیت وَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا (6:39) اس کے لئے بات کی گئی۔ تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم تکذیب کرتے ہو ان قوانین کی' جھٹلاتے ہو اس کو کہ نہیں آگ جلاتی نہیں ہے۔ جھٹلا کے دیکھ لیا' پھر کیا ہوا۔ کون کرتا ہے یہ کچھ؟ کہتا ہے اربابِ عقل وشعور تو ایسا نہیں کرسکتے' اصحابِ فکر وتدبر تو ایسا نہیں کرسکتے۔ صُمٌّ وَّ بُکۡمٌ فِی الظُّلُمٰتِ (6:39) ان کی کیفیت یہ ہے بہرے گونگے عقل وفکر سے کوئی کام نہ لینے والے۔

متقی کی تعریف یعنی زندگی کے راستوں پر دیکھ بھال کر کھلی آنکھوں سے سفر کرنے والا

ایک لفظ میں بات ساری ختم کردی۔ پھر ظلمات' تاریکیوں میں سفر کرنے والے۔ زندگی کے راستوں پہ سفر تو کرتا ہے ہر شخص۔ یہاں تو ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ ایک سفر ہے روشنی میں آنکھیں کھول کے کان کھول کے دیکھ بھال کے یوں سفر کرنا' ایسے سفر کرنے والے کو متقی کہتے ہیں' سفر کے اس انداز کو تقویٰ کہتے ہیں عربی زبان میں۔ دیکھ بھال کے چلنا کہیں کوئی کھائی تو نہیں' کہیں کوئی گڑھا تو نہیں' کسی طرف سے خطرے کا امکان تو نہیں' کوئی آہٹ تو ایسی کان میں نہیں آرہی جس کی سرسراہٹ سے معلوم ہو کہ ادھر سے کوئی نشان آرہا ہے۔ یہ ایک راستہ ہے چلنے کا جس کے لیے روشنی کی ضرورت ہے۔ کہتا ہے آنکھیں بند' کان بند' تاریکی اور چلے جا رہے ہیں ایک راستے کے اوپر۔ کہتا ہے کائنات میں کسی دوسری چیز کو بھی تم نے دیکھا کہ وہ اس طرح سے سفرِ حیات طے کررہی ہو۔ کیا انداز ہیں قرآن کے عزیزانِ من!!!۔

اختیار وارادہ رکھنے کی بناپر انسان کی کوئی فطرت نہیں ہوتی اور یہی اس کا شرف ہے

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ کائنات کی ہر شے تو یوں چلی جارہی ہے لگے بندھے قانون پر' انسان کی یہ کیفیت کیوں ہے؟ کہنے لگا' صرف اس لیے کہ تمہیں اختیار وارادہ دیا گیا ہے' اُنہیں اختیار وارادہ نہیں دیا گیا۔ اُنہیں مجبور پیدا کیا گیا' وہ مجبوراً اس راستے کے اوپر چل رہے ہیں جسے کہتے ہیں ان کی فطرت ایسی ہے۔ انسان کی فطرت کوئی نہیں ہے۔ تمہیں ہم نے اختیار وارادہ دیا' بہت بڑی چیز تھی جو تمہیں ہم نے دی ہے۔ یہ اختیار وارادہ جو ہے اس کائنات میں اوپر خدا کو حاصل ہے اور اس کا عطا کردہ نیچے انسان کو حاصل ہے کسی اور کو یہ حاصل نہیں۔ بہت بڑا شرف ہے انسانیت کا یہ۔ اور اسی کو Abuse کرنے سے یہ اسفل سافلین میں چلا جاتا ہے۔ وہ کہاں چلا جاتا ہے؟ اپنے اختیار وارادے سے صحیح راستہ اختیار کرنا' یہ شرفِ انسانیت کی بالیدگی ہوگی۔ اور قانون کی خلاف ورزی کرکے چلنا' حیوانات

سے بدتر زندگی ہوگی اس لیے کہ حیوانات بھی قانون کے مطابق چلتے ہیں۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ (95/4-5) یہ تو تقویم احسن میں پیدا کیا گیا تھا' سر اٹھا کر چلنے کے قابل' اختیار وارادے کا مالک جو کسی اور شے کو حاصل نہیں تھی۔ لیکن جب یہ اس کو Abuse کرتا ہے' غلط استعمال کرتا ہے تو پھر جو پست ہیں' اس سے بھی پست تر درجے پہ چلا جاتا ہے۔ اختیار وارادے کی ساری چیز تھی صاحب۔

من یشاء کے غلط تراجم نے انسانی سوچ کو تباہ کر رکھا ہے

مَنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یُضْلِلْهُ وَ مَنْ یَّشَاْ یَجْعَلْهُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (6:39) بس ترجمہ آپ نے دیکھا اور جو کچھ کہا گیا ہے غلط ہوگیا۔ وہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ یہ اشیاء مجبوراً قوانینِ فطرت کی اطاعت پہ مجبور ہیں اور چلی جارہی ہیں۔ نہایت حسن وخوبی سے نظام چل رہا ہے۔ تمہیں بھی قوانین دیے گئے لیکن کہا یہ گیا کہ اپنے ارادے سے ان کو اختیار کرو' اپنے انتخاب سے راستے کا انتخاب کرو۔ یہ ہے تمہارے لیے شرفِ آدمیت۔ جبراً نہیں چلایا جائے گا تمہیں۔ اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ اندھے بہرے گونگے بنے ہوئے آنکھیں بند کیے ہوئے تاریکیوں کے اندر چلے جارہے ہو' کیا شرافت ہے یہ۔ یوں چلے جارہے ہو تو کس کا نقصان ہے؟ آگے یہ ترجمہ دیکھیں گے تو اس کے بعد کہ پھر جس کو اللہ چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے وہ صراطِ مستقیم پہ ڈال دیتا ہے۔ ارے!! یہ کیا کہا جارہا تھا ان سے' وہ کہیں گے کہ سرکار پھر ہمیں یہ ڈانٹ کیوں پلائی جارہی ہے اور پھر جہنم کا آگے کیوں وعدہ کیا جارہا ہے' ہم نے کیا کیا؟۔ انہیں تو آپ نے گمراہ نہ کیا وہ شجر وحجر اور نباتات وحیوانات تک مجبور ہی سہی' چلتے تو صراطِ مستقیم پہ ہیں۔ انہیں تو آپ نے گمراہ نہ کیا اور ہمارے متعلق کہہ رہے ہیں کہ یہ سارا کچھ کرنے کے بعد جسے چاہتے ہیں ہم صحیح راستے پہ چلاتے ہیں جسے چاہتے ہیں' گمراہ کر دیتے ہیں۔ تو ہم کھول کے آنکھیں رکھتے تو پھر کیا ہوتا' بند کر لیں تو پھر کیا ہوا' وہ تو آپ نے چلانا ہے۔ ایک ترجمے سے عزیزانِ من! کہاں سے کہاں بات چلی جاتی ہے۔

خدا کے قانون مشیت کی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ وہاں متضاد خیالی نہیں ہے

آپ سوچیے کہ اس طرح سے کیا قرآن سمجھ میں آئے گا۔ وہ کہہ رہا ہے کہ یہ ہماری مشیت تھی قانونِ مشیت تھا جو ہم نے اختیار تمہیں دیا ہے اور اس کے لیے ہم نے قانون مقرر کر دیے ہیں۔ قانون یہ ہے کہ جو آنکھیں کھول کر چلے گا' اس کو راستہ صحیح نظر آئے گا۔ صحیح اور غلط راستہ خدا کے اس قانون کے مطابق اختیار کیا جاتا ہے' یہ نہیں کہ خدا جسے چاہتا ہے صحیح راستے پہ چلاتا ہے' جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ یعنی خدا کی ایک چیز گمراہ کرنے والا بھی ہم مان رہے ہیں۔ اور آپ نے یہ دیکھا ہوگا ضمناً بات آگئی وہ جو ننانوے نام اللہ میاں کے گنائے جاتے ہیں اس میں ایک الھادی ہوتا ہے۔ یہ کہیں وہ چارٹ ہوتے ہیں چھپے ہوئے' آپ دیکھئے گا' ان میں الھادی ہدایت دینے

والا صحیح راستہ دکھانے والا۔ اس کے بعد ہوتا ہے الـمُـضِـلُّ گمراہ کرنے والا (معاذ اللہ)۔ یعنی خدا گمراہ کرنے والا۔ عزیزانِ من کپکپی چھا جاتی ہے۔ لیکن دہرائے چلے جا رہے ہیں آپ ان چیزوں کو۔ مـن یَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّلَهٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ ہر خطبے کا آغاز اس سے ہوتا ہے آپ کے ہاں' جسے خدا ہدایت دیدیتا ہے سیدھے راستے پہ چلاتا ہے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے وہ گمراہ کردیتا ہے اس کو کوئی سیدھے راستے پہ نہیں چلاسکتا۔ اور اس کے بعد کہا گیا ہے کہ ہم پھر تمہیں جہنم میں بھیج دیں گے۔ اچھا جی!! ''کی کرنا ہویا بھائی تیرے وس جو پئے ہوئے آں''۔ یعنی سوچئے تو سہی کہ جسے ہم چاہتے ہیں گمراہ کردیتے ہیں اور جو غلط راستے پہ چلتا ہے' اس کو جہنم میں بھیج دیتے ہیں۔ یہ تو تصور بھی نہیں ہوسکتا کہ خدا یہ بات کہے۔ ایک عام مصنف اپنی کتاب میں اس قسم کی متضاد بات نہیں کہہ سکتا۔ خدائے علیم و خبیر کی کتابِ عظیم اور جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ کتاب بھی آخری کتاب اس کی

؎ تُرا کشید و دست از قلم کشید خدا

تجھے لکھنے کے بعد اس نے قلم رکھ دیا کہ اب اور نہیں لکھونگا۔ اللہ اکبر۔ جس کتاب کی یہ عظمت ہو اور اس میں یہ کیفیت اس کی کی گئی ہو؟ تھوڑا سا وقت اور انتظار کیجیے' پھر اس کے متعلق میں کچھ اعلان کرونگا کہ یہ چیزیں کیسے سمجھ میں آئیں گی۔

قرآن حکیم کو ترجموں کی بجائے مفہوم القرآن سے سمجھیے' پرویزؒ کی اپیل

ابھی تو میں یہی کہے جاتا ہوں' بار بار یہ کہے جاتا ہوں کہ ان ترجموں سے نہ سمجھئے قرآن کو' بڑے غلط مقام پہ آپ کو پہنچا دیں گے۔ سرِ دست تو میں یہی کہونگا کہ مفہوم القرآن سے سمجھئے اگر آپ نے سمجھنا ہے تو۔ اور اس کی مزید وضاحتیں پھر اور آگے چل کے آئیں گی۔ غلط راستے پہ چلنے کے لیے' صحیح راستے پہ چلنے کے لیے اس نے کہا یہ ہم نے قوانین مقرر کردیے ہیں اور اس قانون کی بنیاد (میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا یا اس سے پہلی دفعہ بھی) قرآن کی یہ آیتیں وَ یَـجْـعَـلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (10:100) ایک کہتا ہے اصول بنیادی یہ ہے یاد رکھئے صحیح اور غلط راستے کے انتخاب کا کہ جو شخص عقل و فکر سے کام نہیں لیتا اس پہ راستے جو ہیں وہ Confuse ہو جاتے ہیں' التباس ہو جاتا ہے' بات صاف نہیں ہوتی اس سے۔

لفظ رجس کا لغوی مفہوم

تو میں نے کہا تھا یہ لفظ رجس جو ہے وہ پانی میں جب آپ کیچڑ ملا دیتے ہیں اور اسے گدلا کر دیتے ہیں نا ''او کچولا مار دینا جھنوں کیندے نیں پنجابی اچ'' یہ وہ لفظ ہے جس کے اوپر معاملہ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ کیا بات کہہ جاتا ہے قرآن!! کہ جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتا اس پہ معاملہ مشتبہ رہ جاتا ہے' بات صاف نہیں ہوتی اس کے سامنے۔ اور وہ ہے جو غلط راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ الَّـذِیْـنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ۔ اب یہاں سے وہ آگے چلا۔ غلط راستے پہ چلنے والے قُـلْ اَرَءَیْتَکُمْ اِنْ اَتٰکُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْکُمُ السَّاعَةُ اَغَیْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ

کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ [6:40] بَلۡ اِیَّاہُ تَدۡعُوۡنَ فَیَکۡشِفُ مَا تَدۡعُوۡنَ اِلَیۡہِ اِنۡ شَآءَ وَ تَنۡسَوۡنَ مَا تُشۡرِکُوۡنَ (6:41) وہ کہتا ہے ٹھیک ہے عام حالات میں تمہاری ایسی حالت ہوتی ہے' بھولے ہوئے ہوتے ہوان چیزوں کو' کبھی یادنہیں وہ آتا۔ جب مصیبت پڑتی ہےعوام کے اعتبار سے' تو یہ دیکھئے کہ جب بھی مصیبت پڑتی ہے خدایادآتا ہے یہ تو عام بات ہے۔لیکن اگراس سے آگے بھی چلے جائیں جوقرآن نے یہ کہا ہے کہ کبھی یہ چھوٹی چھوٹی سزائیں جن کو کہا جاتا ہے' یعنی بعض تو اس قسم کا آخرِ کار انقلاب آجاتا ہے جس میں قوم ختم ہوجاتی ہے' تباہ ہوجاتی ہے' اس سے پیشتر چھوٹی چھوٹی Warnings آتی ہیں اس قوم پہ۔ یہ جو ہمارے ساتھ ہورہا ہے سرِ دست' ہم اس دور میں سے ابھی گذرر ہے ہیں۔ یہ 1965ء کی وارننگ آپ کے ہاں آئی تھی کہ سنبھل جاؤ۔اگلی آیت آتی ہے' وہاں اس کی تشریح زیادہ میں کرونگا۔ یہ بھی ایک وارننگ تھی ہمارے پاس جو آئی تھی۔ وہ کہتا ہے اس قسم کی Warnings آئیں یا پھراس کے بعدوہ آخری تباہی آجائے۔

کہتا ہے جب بھی ایسی صورتیں ہوں۔ ہزار بار یہ کہا جائے کہ بھئی دیکھئے گاؤں کے گرد بند بنالیجیے اگر کبھی سیلاب آ گیا تو گاؤں تباہ ہوجائے گا۔آ ہاہا! کیا باتیں کررہے ہوصاحب' یہاں نہیں آیا کرتا سیلاب' ہم نہیں ڈوبا کرتے۔ یہ ہے تکذیبِ آیات اللہ۔ کہتا ہے یہ کچھ تم کہتے ہو۔جس دن سیلاب آتا ہے او پھراس دن پھاوڑے لے کے کیوں بند بنانا شروع کردیتے ہو۔ وہ کہتا ہے اس کے سوا کوئی اور چارہ ہوتا ہے اس دن تمہارے پاس کہ جو ہم نے کہا تھا کہ بند بنالو بچ جاؤ گے اور تم تکذیب کرتے تھے۔اوجس دن سیلاب آجاتا ہے اس دن تو وہی کچھ کرتے ہو جو ہم تم سے کہہ رہے تھے۔ کچھ اور کرونا اس دن پھر۔ کیا انداز ہے بات کرنے کا!!۔ ہم کہتے تھے کہ پانی کی بالٹیاں اور ریت لٹکا کے رکھ دیجیے' آگ لگ گئی تو اس وقت بجھانے کے یہ کام آئے گا۔ انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! کچھ بھی نہیں۔ جب آگ لگتی ہے تو پھر وہی پانی کی بالٹیاں لینے کے لیے کیوں دوڑتے ہو کہتا ہے کچھ اور کرونا پھر۔ شرک اسے کہتے ہیں عزیزانِ من!۔ وہ کہتا ہے اس وقت تو یہ شرک وِرک سارا بھول جاتے ہو' خالص آتے ہو خدا کے قوانین کے اوپر۔ آگ میں انگلی نہ ڈالو جل جائے گی۔ ڈال دی' اس کے بعد کیا کرتے ہو؟ جو ہم نے بتایا ہے کہ پھراس کے لیے مرہم ہے' اسی طرف جاتے ہونا۔ کہتا ہے جب شروع میں ہم نے کہا تھا تو اس وقت کیوں نہیں مان لیتے۔ ہمارے ہاں ایک ہندی دوہے والے گذرے ہیں بہت اچھے دوہے ان کے ہاں کے۔ انہیں چیزوں سے انہوں نے یہ چیز اخذ کی ہے اس میں اس نے یہ کہا ہے کہ

دکھ میں تو ہر کو بھجیں اور سکھ میں بھجیں نہ کو
جو سکھ میں ہر کو بھجیں تو دکھ کاہے کو ہو

اس نے تو یہ بھجیں والی بات اپنے انداز میں کہی۔ بات تو ساری یہ ہے کہ وہ جو کہتا ہے کہ اس چیز سے بچنا چاہو تو یہ کرلو' سیلاب سے

بچنے کے لیے بند بنالو' آگ سے بچنے کے لیے پانی کا انتظام کرلو۔

دنیا بھر کے مصائب والآم کی بنیادی وجہ قوانین خداوندی سے انحراف ہے

اس نے جو کچھ کہا ہے اگر جس زمانے میں یہ سیلاب نہیں آیا' آگ نہیں لگی' اس زمانے میں یہ کچھ کرلو' یہ کچھ ہوگا' ہر کو بھجنا' سکھ کے زمانے میں۔ اس زمانے میں اگر یہ کرلو تو وہ دکھ کاہے کو ہو۔ جب دکھ آتا ہے تو کہتا ہے کہ اس وقت پھر یہی کچھ کرتے ہو نا تم۔ ایک بعد از خرابی بسیار۔ ہو ہی یہ رہا ہے۔ اور پھر پوری انسانیت کی تاریخ اس کے اوپر شاہد ہے کہ انسان نے اپنی زندگی کے مسائل سلجھانے کے لیے خدا کے دیے ہوئے قوانین سے منہ موڑا اور شرک کرنے لگ گیا۔ اپنے بنائے ہوئے قوانین کی رو سے اس نے چاہا مسائل کا حل کرلونگا۔ حکومت کے انداز کے لیے کبھی ملوکیت آئی' کبھی ڈکٹیٹرشپ آئی' آہستہ آہستہ اس کے بعد دیکھتا گیا۔ جب تباہی آئی تو دیکھا کہ نہیں صاحب! غلط ہے۔ پھر اس میں کچھ ترمیم کی' پھر اس میں کچھ تنسیخ کی۔ اور آپ نے دیکھا کہ اس پوری تاریخ میں ہر عذاب آنے کے بعد انسانیت کا قدم اسی علاج کی طرف اٹھا ہے جو قرآن نے اس سے پہلے بتایا تھا۔

قرآن حکیم انسانیت کی حد تک حکومت کے تصور کی بجائے کچھ غیر متبدل قوانین پیش کرتا ہے

یاد رکھو شوریٰ ہے اس کا علاج۔ یہ کوئی کسی دوسرے کو نہ محکوم بنا سکتا ہے' نہ محتاج بنا سکتا ہے' حکومت کا تصور غلط ہے۔ کچھ قوانین ہیں جن پہ چلنا مقصود ہے اس کے چلنے کے طریقے کیا ہونگے؟ باہمی بیٹھ کے' مل بیٹھ کے مشورہ کرو اور ان قوانین کے نافذ کرنے کے طریقے اپنے ہاں وضع کر لیجیے۔ کہا یہ طریق ہوگا۔ یہ ہے تمدن کی زندگی تمہاری صحیح۔ آپ دیکھئے کہ ہر دکھ کے بعد انسانیت کی تاریخ شاہد ہے کہ ہر کو بھجنے کی طرف اس کا قدم اٹھا ہے۔ آج جس کو آپ جمہوریت کہہ رہے ہیں یہ اسی کی ایک بھونڈی اور ناقص سی شکل ہے۔ آ رہا ہے ادھر انسان۔ کہتا ہے کہ جب یہ چھوٹی چھوٹی وارننگز تمہیں آتی ہیں یا بڑے بڑے انقلابات آتے ہیں تو اس کے بعد تمہیں یہ بات یاد آتی ہے۔ لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر تم بھول جاتے ہو اسے۔ یہاں پھر لفظ آیا ہے اِنْ شَآءَ ۔ بَلْ اِیَّاهُ تَدْعُوْنَ فَیَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ اِنْ شَآءَ (6:41) کہ تم اس کی طرف پھر رجوع کرتے ہو' وہ طریقے اختیار کرتے ہو۔ پھر ترجمہ آ گیا غلط کہ پھر اگر وہ چاہے تو تمہاری تکلیف کو رفع کر دیتا ہے۔ یعنی بات پھر وہی آ گئی' اگر وہ چاہے تو'۔ یہ اس کے معنی ہیں ہی نہیں۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے ایک درس انشاءاللہ کے اوپر دیا تھا۔ آج جس کے معنی ہمارے ہاں غیر یقینی چیز ہیں۔ کیوں بھئی آ ؤ گے چار بجے' وہ کہتا ہے انشاءاللہ' وہ کہتا ہے انشاءاللہ کو چھوڑ و' پکی بات کرو' آ ؤ گے یا نہیں آ ؤ گے۔ ''اوسے ویلے پتہ لگ جانداا ے''۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر اللہ چاہے تو۔ یہ مفہوم تجویز کیسے گئے؟ ذمہ داری سے فرار۔ اگر یہ کہے کہ ہاں ٹھیک ہے میں کرونگا' نہ کرے گا تو پوچھا جائے گا۔ اور اگر کہہ دیا انشاء

اللہ اگر اللہ چاہے گا تو پھر میں یہ کرونگا' نہ کیا تو کہا اللہ نے چاہا ہی نہیں ہے' میں کیا کروں۔

پی آئی اے کو حادثات سے بچانے کے لیے مذہب پرست طبقے کی ایک تجویز

آپ کو یاد ہے یہ پہلی دفعہ حادثہ آپ کے ہاں پی آئی اے کا ہوا تھا تین چار سال کی تو بات ہے ساری۔ اس پہ انہوں نے کمیٹیاں بٹھائیں' کمیشن بٹھائے کہ کیوں ہوا تھا اور پھر یہ کہ آئندہ اس کے لیے کیا تدبیریں اختیار کی جائیں کہ نہ ہوا ایسا۔ ملک میں سے بھی مختلف جتنے بھی تھے یہ لال بجھکڑ انہوں نے بھی تجویزیں بھیجی تھیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے مذہب پرست طبقے کی طرف سے ایک تجویز گئی تھی۔ اس شخص نے یہ کہا تھا کہ یہ حادثے اس لیے ہوتے ہیں کہ میں نے دیکھا ہے ہوائی جہاز جب اڑنے لگتا ہے تو اس وقت اناؤنسمنٹ جو کیپٹن کرتا ہے' وہ یہ کہتا ہے کہ ہم یہاں سے یوں اڑ رہے ہیں' اتنی بلندی پہ جائیں گے اس رفتار سے جائیں گے' اور اتنے بجے ہم چکلالہ کے ہوائی اڈے پہ لینڈ کر جائیں گے۔ وہ اس میں انشاءاللہ نہیں کہتا' اس لیے حادثہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ان سے کہا گیا کہ وہ ساتھ انشاءاللہ بھی کہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انشاءاللہ اس کی وجہ تھی لیکن اس ایک حادثے کے بعد پھر متواتر حادثے ہونے شروع ہو گئے تھے۔ ایک Psychological Effect ہوتا ہے ذمہ داری سے فرار۔ جونہی آپ نے یہ کہا کہ اگر اللہ چاہے گا تو یہ ہو جائے گا تو بس بات ختم ہوگئی آپ کی طرف سے۔ اس کے معنی یہ ہیں عزیزانِ من! قرآن کی طرف سے کہ تم پھر آتے ہو ان طریقوں کو اختیار کرتے ہو۔ اگر تمہارا طریقہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوا تو ضرور اس کا نتیجہ نکل آئے گا۔ یہ معنی ہیں انشاءاللہ کے۔ جب بھی یہ ہوا اس 'ان' کے معنی اگر اور 'جب' دونوں آتے ہیں۔ جب بھی تم نے اس کے قانونِ مشیت کے مطابق قدم اٹھایا اس کا نتیجہ یہ نکل کے رہے گا۔ اگر تم نے اس کے قانون کے مطابق قدم اٹھایا' یہ نتیجہ نکل کر رہے گا اتنی یقینی چیز ہے جو قرآن نے یہ کہی تھی۔ آج ہمارے ہاں جو عدمِ یقین کے لیے ایک مذاق بن کے رہ گیا ہے اس ترجمے کی وجہ سے۔

ہمارے ہاں کے قرآنی تراجم نے فکر قرآنی کو تباہ کر دیا ہے

یہاں بھی یہی ہے کہ پھر تم آتے ہو خدا کی طرف' اس کے قانون کی طرف اور پھر وہ دور کر دیتا ہے' اگر وہ چاہتا ہے تو پھر دور کر دیتا ہے تمہاری ان چیزوں کو۔ یعنی اس کے قانون کی طرف بھی تم آتے ہو اس کے مطابق بھی کرتے ہو اور پھر بھی اگر وہ چاہتا ہے تو اس کے بعد کر دیتا ہے' وہ نہیں چاہتا تو تم اس کے قانون کے مطابق لاکھ کرو کچھ نہیں بنتا وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰۤی اُمَمٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ (6:42) کہتا ہے نئی بات نہیں جو تم سے کہی جا رہی ہے۔ قوانینِ خداوندی سے پہلے دن سے اسی طرح چلے آ رہے ہیں ہر زمانے میں ہر امت نے ہر قوم نے جس قسم کی روش اختیار کی اسی قسم کا نتیجہ نکلا۔ تم سے پہلے بھی ہم نے رسولوں کو بھیجا مختلف امتوں کی طرف۔ فَاَخَذۡنٰھُمۡ بِالۡبَاۡسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّھُمۡ یَتَضَرَّعُوۡنَ o فَلَوۡ لَاۤ اِذۡ جَآءَھُمۡ بَاۡسُنَا تَضَرَّعُوۡا وَ لٰکِنۡ قَسَتۡ قُلُوۡبُھُمۡ وَ

زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (6:42-43) ہماری داستاں۔ کہا پھر ان امتوں میں قوموں میں' ہوا یہ کہ جب بھی ان کو وارننگ دی گئی کہ دیکھئے تباہی آ رہی ہے تمہارے اس معاشرے پہ' غلط تمدن تمہارا جو ہے اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہو رہا ہے' آ رہی ہے یہ چیز۔ اس آنے سے پہلے یہ جھکڑ اور آندھی سے پہلے ہلکی ہلکی ہوا چلتی ہے۔ زور کی بارش آنے سے پہلے بوندا باندی ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پہلے یہ ہلکی ہلکی چیزیں آتی ہیں اس میں۔ وہ آئیں یہ اس لیے تھی کہ اس وارننگ سے انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ واقعی ایک تباہ کن چیز آنے والی ہے' ہمیں بچ جانا چاہیے۔ کہا اس لیے وہ چیزیں پہلے ہلکی ہلکی وارننگز آتی ہیں۔

بار بار کی وارننگ کے باوجود مفاد پرستی انسان کے دل کو احساس کی نعمت سے محروم کر دیتی ہے

کہا جب اس قسم کی یہ ہلکی ہلکی وارننگز ان پہ آئیں تھیں تو کیوں نہ ان کے دل نے توجہ دیدی اس طرف۔ وہ وارننگ آتی تھی ذرا سی لیپا پوتی وہ کر لیتے تھے۔ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ (6:43) اس کے بعد دل پھر پتھر کے ہو جاتے تھے۔ سوچئے عزیزانِ من! کس کی داستان بیان ہو رہی ہے۔ پھر دل پتھر کے ہو جاتے تھے۔ کیوں ہو جاتے تھے؟ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (6:43) وہ جو مفاد پرستیاں تھیں' وہ جو سمیٹنے کی چیزیں تھیں' وہ جو عیش سامانیاں تھیں' کہتا ہے یکسر برائیاں اور تخریبی چیزیں تھیں قوم کے لیے۔ لیکن ان کے جذبات ان کو بڑا مزین کر کے دکھاتے تھے کہ بہت اچھا ہے صاحب! Over night Millionaire ہو جاتا ہے آدمی۔ یونہی بکواس ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ طریقہ نہ اختیار کرو' وہ طریقہ نہ اختیار کرو۔ یہ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ (6:43) بڑی عجیب چیز ہے جو قرآن کہتا ہے۔ جب بھی کسی قوم میں برائی' اچھائی بن کے نظر آنے لگ جائے' وہ خوبصورت معلوم ہونے لگ جائے' وہ جاذب اور باعثِ کشش ہو جائے بس پھر سمجھئے' وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ برائی سے اگر بچتا نہیں لیکن معاشرہ برائی کو برائی سمجھتا ہے' کوئی اس کو ٹوکتا ہے' کوئی اس سے روکتا ہے' وہ برائی کرنے والا معاشرے کے اندر کچھ نادم تو ہوتا ہے' شرمسار تو ہوتا ہے۔ تاریخ کا لمبا عرصہ نہیں کوئی ایسی لمبی عمر بھی نہیں ہماری' ہم نے اپنی ابتدائی زندگی کے اندر یہ دیکھا ہے کہ اگر کسی سے محلے میں بازار میں کسی قسم کی ایسی حرکت ہو جاتی تھی' گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا وہ شرم کے مارے۔ ایسے بھی واقعات ہیں کہ انہوں نے وطن کو چھوڑ دیا ہمیشہ کے لیے ایک لغزش ہونے کے بعد۔ ابھی معاشرے کی یہ کیفیت تھی۔ اور اس کے بعد اب ان چیزوں پہ فخر کرتے ہیں۔ کسے معلوم نہیں ہے کہ کل بازار میں بیٹھے دال بیچ رہے تھے۔ یہ حضرت صاحب کے جو اتنے اتنے لمبے لمبے محل کھڑے ہو گئے ہیں' کوٹھیاں بن گئی ہیں' ہر ایک کو معلوم ہے۔ خود فخر سے یہ کہتے ہیں کہ یہ اس دور کے اندر تم بیٹھے رہے ہو دیانتدار بن کے' اسی تنخواہ پہ گذارہ ہوگا۔ سب کچھ ہوگا میاں! جھونپڑا تک نہیں مل سکتا۔ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ یعنی دوسروں کو بھی ساتھ سکھاتے ہیں کہ یہ ہیں طریقے یوں کرو۔ کوئی معیوب نہیں اس کو قرار دیتا۔ جو درخواست دیتا ہے وہ اس کے بعد کہتا ہے کہ اتنے دن ہو گئے ہوا نہیں۔ فوراً مشورہ ملتا ہے کہ بس سیدھی سی بات ہے اس کاغذ کے نیچے پہیے لگاؤ چاندی کے اور چل

پڑے گی گاڑی۔ مشورہ دینے والا یہ دیتا ہے جا کے اس سے کہو کہ وہ نہیں یہ بات کہتا کہ یہ تو جرم ہے صاحب' وہ کہتا ہے یہ تو ٹھیک ہے۔ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیۡطٰنُ مَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (6:43) مزین بن کے دکھا دیتی ہیں' برائیاں اچھائیاں نظر آنے لگ جاتی ہیں۔

جب برائی بذاتِ خود مزین بن کر دکھلائی دے تو پھر اس کا نتیجہ ہر سو تباہی ہوتا ہے

کہتا ہے بس وہ وقت ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد سنیے عزیزانِ من! وہ کہتا ہے کہ آخری تباہی آنے سے پہلے کیا ہوتا ہے؟ قرآنِ کریم کی رو سے بھوک اور افلاس خدا کا عذاب ہے بہ نصِ صریح (16:112)۔ وہ کہتا ہے کہ جو ہمارے قوانین سے اعراض برتتی ہے قوم' ہم اس کی روزی تنگ کر دیتے ہیں (20:124)۔ پہلے یہ نہیں ہوتا۔ فَلَمَّا نَسُوۡا مَا ذُكِّرُوۡا بِهٖ (6:44) جب وہ قوم ان قوانین کو ان راہنمائیوں کو فراموش کر دیتی ہے پسِ پشت ڈال دیتی ہے۔ یہ دونوں ہی معنی اس کے آجاتے ہیں نَسُوۡا (6:44) کے۔ جب وہ قوم ان کو فراموش کر دیتی ہے پسِ پشت ڈال دیتی ہے ان صحیح قوانین کو تو پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ فَتَحۡنَا عَلَیۡهِمۡ اَبۡوَابَ كُلِّ شَیۡءٍ (6:44) رزق کے دروازے کھول دیتے ہیں ہم' بڑی فراوانی سے آتا ہے۔ غور فرمایئے عزیزانِ من! یہ عذاب آنے سے پہلے کی تمہید ہوتی کیا ہے۔ کیا ہے یہ؟ غلط روشِ زندگی مزین بن کے دکھائی دیتی ہے غلط راستوں سے کمانے والی چیزیں بڑی جاذب بنتی چلی جاتی ہے۔ کہتا ہے پھاٹک کھل جاتے ہیں ہُن برسنے لگ جاتا ہے۔ یہ ہوا ہے نا آپ کی قوم کے ساتھ۔

تقسیم سے پہلے کی حالت اور تقسیم کے بعد کی کیفیت اور بلا آخر اس قسم کی فراوانی کے متعلق قرآن حکیم کا فیصلہ

ذرا تقسیم سے پہلے کے حالات دیکھئے یہاں جو آپ کو اس طرح سے نظر آتے ہیں جن کے ہاں یہ "ہڑ آیا ہویا دولت دا" یہ لفظ ہے نا فَتَحۡنَا عَلَیۡهِمۡ اَبۡوَابَ كُلِّ شَیۡءٍ (6:44) یعنی ایک دروازہ نہیں ہر شے کے کتنے ہی دروازے کھول دیتے ہیں۔ تمہید یہ آتی ہے۔ قوم بڑی خوش ہو جاتی ہے۔ حَتّٰۤی اِذَا فَرِحُوۡا بِمَاۤ اُوۡتُوۡۤا (6:44) مگن ہو جاتی ہے کہ اتنی ترقی آپ اندازہ لگایئے صاحب' وہ Statistics شائع ہو جاتے ہیں۔ تقسیم کے Immediately بعد قوم کی کیا حالت تھی' نیشنل انکم کیا تھی' کوئی کارخانہ نہیں تھا' کوئی زمینداری نہیں تھی' محلات نہیں تھے' اتنا روپیہ کس کے پاس تھا' یہ فراوانیاں کہاں تھیں' سارے لاہور میں تین موٹریں نظر آیا کرتی تھیں۔ اس کے بعد آپ دیکھئے تو سہی کیا کیفیت ہے۔ یہ سارا کچھ بھول جاتے ہیں کہ اتنی فراوانیاں۔ کیا الفاظ ہیں قرآن کے صاحب!!!۔ کہتا ہے یہ ہو جاتا ہے اس قوم کا۔ اب دو چیزیں ہوئیں۔ اس نے یہ کہا تھا کہ رزق کی فراوانیاں خدا کی نعمت ہے' اس کا احسان بھی ہے۔ ایک طرف تو وہ یہ کہتا ہے۔ اور دوسری طرف کہتا ہے کہ رزق کی فراوانیاں ایک آنے والے آخری انقلاب اور تباہی کی تمہید بھی ہے۔ کیا ہوتا ہے؟ اگر وہ رزق قوانینِ خداوندی کے تابع آپ کے پاس آتا ہے تو وہ نعمتِ خداوندی ہے۔ اس میں زندگی اور شادابیوں

کے راز مضمر ہیں۔ وہی رزق اگر ان قوانین کو توڑ کے آتا ہے تو وہ آنے والی ہلاکت کی تمہید ہوتا ہے۔ مزدور بھی صبح سے شام تک محنت کرنے کے بعد چار روپے جیب میں لے کے چلتا ہے۔ یہ بھی چار روپے ہیں۔ وہ اس کی جیب کاٹنے والا وہ لے جاتا ہے اس کی جیب میں بھی چار روپے ہوتے ہیں۔ روپے تو چار ہوتے ہیں دونوں کی جیب میں' بڑا فرق ہے دونوں میں۔ جب جیب کترے کو اپنا یہ عمل مزین بن کے دکھائی دینے لگ جائے' موج ہوگئی۔ یہ کیفیت جب ہو جائے معاشرے کی' کہتا ہے ٹھیک ہے' پھاٹک تو کھل جاتے ہیں پھر اس طرح سے۔ حَتّٰۤی اِذَا فَرِحُوۡا بِمَاۤ اُوۡتُوۡۤا (6:44) عزیزانِ من! اگلے الفاظ کہنے سے پہلے دل کانپ اٹھتا ہے اس لیے کہ داستان ہماری بیان ہو رہی ہے۔ کہتا ہے جب یہ فراوانیاں رزق کی آتی ہیں اور تو اس دولت کے نشے میں بدمست ہو جاتی ہے قوم۔ اَخَذۡنٰهُمۡ بَغۡتَةً (6:44) اور اس کے بعد اچانک جھپٹا مارتے ہیں ہم اس قوم کے اوپر۔ پھر ہوتا کیا ہے؟ لفظ سنئے جھوم جایئے قرآن کے ایجاز پہ۔ فَاِذَا هُمۡ مُّبۡلِسُوۡنَ (6:44) ابدی طور پہ مایوس ہو جاتی ہے وہ قوم۔ افوہ! ۔ زندگی کا کوئی سہارا باقی نہیں رہتا' امید کی کوئی کرن نہیں۔ اس سے پہلے تو وہ کہتا ہے کہ یہ کیفیت تھی فَاَخَذۡنٰهُمۡ بِالۡبَاۡسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ (6:42) دیکھئے کیا کہتا ہے یہاں اَخَذۡنٰهُمۡ بَغۡتَةً (6:42) ہے بِالۡبَاۡسَآءِ (6:42) اور ضَرَّآءِ (6:42) میں چھوٹے چھوٹے ''پنگھوڑے جئے جنوں کیندے نیں''، وہ آتے رہتے ہیں تو وہ کہتا ہے ٹھیک ہے' اس سے وارننگ دیتے ہیں پہلے۔ اب بھی بچ جاؤ اب بھی بچ جاؤ۔ قوم اگر اسی راستے پہ چلتی رہے کہتا ہے' پچتی ہے تھوڑے عرصے کے لیے' چار دن کے لیے پچتی ہے۔

1965ء کی جنگ کے بعد دن بدن مایوسی کی کیفیت قرآن حکیم کے الفاظ میں ذلت آمیز عذاب

1965ء کی جنگ کے دنوں میں آپ دیکھتے ہیں قوم کی کیفیت کیا ہوگئی تھی۔ پاکیزہ ترین معاشرہ تھا ان دنوں کے اندر آپ کا عزیزانِ من! ۔ وہ سترہ دن تو رہے اس کے بعد شاید سترہ دن اور رہے' پھر کیا ہوا؟ وَ لٰكِنۡ قَسَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ (6:43) پھر دل پتھر ہوگئے۔ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيۡطٰنُ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ (6:43) پھر شیطان نے ان کے اعمال کو مزین بنا کے دکھائی دینا شروع کر دیا۔ کہتا ہے' پھر جھٹکا دیا۔ لیکن اس دفعہ یہ ہوا کہ رزق کی فراوانیوں کے پھر پھاٹک کھل گئے' سیلاب آ گیا ان کا صاحب۔ کہا اس فراوانیوں کے اوپر حَتّٰۤی اِذَا فَرِحُوۡا بِمَاۤ اُوۡتُوۡۤا (6:44) بدمست ہوگئے جب اس کے اندر' مگن ہوگئے جب اس کے اندر۔ یہ کیفیت جب قوم کی ہوگئی اَخَذۡنٰهُمۡ بَغۡتَةً (6:44) ایک جھپٹا مارا' پھر کیا ہوا؟ یہ نہیں ہوا کہ ایک زلزلہ آیا قوم ساری زمین میں دھنس گئی۔ یہ کیفیت ہوتی تو پھر تو کوئی نہ انجام دیکھنے والا ہوتا نہ اس کے بعد یہ احساسات ہوتے۔ نظر آتا ہے کہ سانس لینے والی وہ قوم باقی رہتی ہے۔ ہوتا کیا ہے؟ فَاِذَا هُمۡ مُّبۡلِسُوۡنَ (6:44) ابدی طور پہ مایوسی چھا جاتی ہے قوم پہ۔

تاریخ انسانیت قرآن حکیم کے آئینہ میں

زندہ ہوانسان اور ابدی مایوسی میں وہ گرفتار ہواس سے بڑا عذاب اور کوئی نہیں ہوسکتا۔قرآن کے دوسرے مقام سے اس کی تائید آپ کے سامنے لے آؤں۔تائید میں تو بیشمار آیات ہیں کم از کم ایک آیت وَ کَمۡ اَهۡلَـکۡنَا مِنۡ قَرۡیَةٍ (28:58) تاریخِ انسانیت پہ غور کرو تباہ ہونے والی قوموں کے حالات کے اوپر ذرا تدبر سے دیکھو' دیکھو کہ تاریخ کے نوشتے کس چیز پہ پہنچاتے ہیں۔کہتا ہے کہ ہلاک ہونے والی قومیں ان کو دیکھو بَطِرَتۡ مَعِیۡشَتَهَا (28:58) بڑی معاشی خوشحالیاں انکو حاصل ہوگئی تھیں۔ہر ڈوبنے والی قوم کی تاریخ دیکھئے وہ ان خوشحالیوں کے Climax پہ پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔رومن ایمپائر' Persian Empire' یہ پہلی قومیں جتنی بھی ہیں' مصر کی قومیں' چین کی قومیں' ان کی تباہی سے ذرا پہلے ان کی تاریخ کو دیکھئے تو ان کا معاشرہ جگمگا رہا ہوتا ہے۔کسی کے تصور میں بھی نہیں آتا کہ یہ قوم مٹنے والی ہے' ذہن میں بھی نہیں آتا کہ چراغِ سحری ہے یہ۔کہتا ہے کہ یہ بَطِرَتۡ مَعِیۡشَتَهَا (28:58)۔ہر قسم کے طریقے وہ اختیار کر لیتی ہے دولت کمانے کے۔دولت کا سیلاب آجاتا ہے۔اَهۡلَکۡنَا (28:58) تباہی ہوتی ہے۔

افرادی شکل میں تو قوم باقی رہتی ہے لیکن وہ اپنے تشخص سے محروم ہوجاتی ہے

دیکھئے عزیزانِ من! کتنا Graphic ہے وہ جو نقشہ ہے۔کہا سن لیا تم نے! فَتِلۡکَ مَسٰکِنُهُمۡ (28:58) یہ ہیں ان کی اجڑی ہوئی بستیاں۔او جینے والو' آنکھیں رکھنے والو' یہ ہیں ان کی اجڑی ہوئی بستیاں جن کی کیفیت یہ ہے کہ لَمۡ تُسۡکَنۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهِمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا (28:58) کوئی نہ بسا ان کے بعد ان بستیوں کے اندر' ابدی طور پر اجڑ گئی یہ بستیاں۔یونہی کبھی کسی نے رَین بسیرے کی خاطر آ کے یہاں ٹھکانہ کر لیا تو کر لیا' بسی نہیں پھر۔فَاِذَا هُمۡ مُّبۡلِسُوۡنَ (6:44) یہ جسے ہم کہتے ہیں' صفحۂ ہستی سے کوئی قوم مٹ گئی' کوئی قوم بھی اس طرح سے نہیں مٹتی' ایسا زلزلہ تو کہیں بھی نہیں آتا کہ پورے کے پورے ملک اور قوم کو ہی زمین کے اندر دھنسا دے۔قوموں پہ تباہی آتی ہے۔ان قوموں کے افراد تو چلتے پھرتے نظر آتے ہیں' قومی تشخص ختم ہوجاتا ہے۔ان کے مساکن تو ہوتے ہیں' بستا نہیں پھر ان کے اندر۔یہ کونسی بستیاں تھیں۔پھر آجایئے اسی طرف۔جھپٹ لیتے ہیں' ہلاک ہوجاتی ہے قوم' ابدی طور پہ مایوس ہوجاتی ہے۔

ظلم کے ختم ہونے پر خدا کی حمد مظلوموں کی زبان سے ادا کی جاتی ہے

اگلے الفاظ سنیئے عزیزانِ من! فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا (6:45) یہ قوم کہ جنہوں نے سلب ونہب (Exploitation) ظلم استبداد اس طریقے سے یہ دولت اکٹھی کی تھی' جن کے معاشرے کا انداز یہ ہوگیا تھا۔ایک لفظ ظَلَمُوۡا (6:45)

ہے ترجمہ ہی نہیں ہوسکتا کسی زبان میں اس کا' اتنا جامع لفظ ہے یہ۔ بنیادی طور پہ جو عربوں کے ہاں وہ جو روٹ ہوتا تھا اس کے ایک معنی ہوتے تھے۔ روٹ کے اعتبار سے اس مادے کے معنی ہوتے ہیں کہ جس شے کو جس مقام پہ ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو۔ وہ وہاں نہ ہو کے معنی یہ ہیں کہ وہ پست مقام تھا' حقیقت میں اس کو آپ نے آشیاں کے اوپر بٹھا دیا۔ گدھے کے گلے میں طوق ڈال دیے ہیروں کے جواہرات کے' یہ بھی غلط ہوگیا۔ اسپِ تازی کو اگر آپ نے ریڑھے میں جوت لیا' یہ بھی ظلم ہے۔ ہر قسم کے نالائق' بددیانت' ہر قسم کے وہ لوگ جو بدخواہ ہیں' ان کو مقامات بلند پہ پہنچا دیا۔ جنہیں بلند مقامات پہ ذمہ داریوں پہ ہونا چاہیے تھا ان کو آپ نے يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ (28:4) قرآن نے جو کہا ہے ابنائے قوم کو ذبح کرتے گئے' خسیسے جو تھے ان کو اوپر چڑھاتے گئے۔ یہ ہے نافرعون کی حکمت۔ اسے ظلم کہا ہے قرآن نے۔ جس چیز کو جہاں ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو' وہ کسی اور جگہ ہو۔ محنت والے کی محنت اس کی جیب میں نہ ہو کسی اور جگہ ہو۔ اس سے انہوں نے سلب و نہب کے معنی لیے تھے۔ جامع لفظ ہے۔ کیا ہوا؟ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (6:45) اس قوم کی جنہوں نے ظلم کو شعار بنا رکھا تھا' جڑ کاٹ کے رکھ دی ہے۔ یہ کہنے کے بعد ہم آپ کوئی بھی اس بات کو کہیں گے یا لکھیں گے (معاف رکھئے گا پنجابی میں کہونگا) ''ایہدے بعد کوئی ہوکا جیا اسی بھراں گے ہائے ہائے قوم دیاں جڑاں ای کٹ گیاں''۔ ایک تاسف کی سی کیفیت ہوگی نا یہ۔ دیکھئے قانون کیا کہتا ہے۔ یہ سارا کچھ قانون کے اعتبار سے' مکافاتِ عمل کے اعتبار سے ہوا ہے۔ ظالم کی جڑ کاٹ دی۔ کہا الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (6:45) یہ آواز کس کی زبان سے نکل رہی ہے؟ دنیا کے مظلوموں کی زبان سے یہ آواز نکل رہی ہے' قرآن ان کی نمائندگی کر رہا ہے۔ ظالم کی جڑ کٹی مظلوم کی زبان پہ بے ساختہ آ گیا الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (6:45) یا اللہ تیرا شکر ہے' ہزار ہزار تیرا احسان ہے' انہوں نے جینا حرام کر دیا ہوا تھا ہمارا۔ اور یہ حمد اللہ کے لیے کیوں ہے۔ بے ساختہ زبان پہ آیا تو یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا تھا۔ اس زبان میں حمد کہتے ہی اسے ہیں کہ کسی کی طرف سے اتنا بڑا کارنامہ سرانجام ہو کہ اسے دیکھ کے بے ساختہ اسکے لیے تحسین و تبریک کے الفاظ آئیں۔ بے ساختہ آئیں گے تو حمد ہوگی اگر وہ بالارادہ آپ اسے کہیں گے تو مدح اور ثناء و ستائش ہو جائے گی' حمد نہیں اس کے لیے عرب بولے گا کبھی بھی۔ ظالم کی جڑ کٹنے کے بعد مظلوم کی زبان پہ جو آواز حمد کی آتی ہے وہ مدح نہیں ہوتی۔ پھر یہ دیکھئے کہ یہ الحمد للہ وہ تو خود اپنے متعلق کہہ رہا ہے کہ باعثِ حمد و ستائش ہے۔ کیونکہ ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ وہ میں نے اردو میں کچھ کہنا ہے' یہ حمد و ستائش ہی کہوں اور کیا ہے ورنہ حمد کے معنی تو ستائش ہو ہی نہیں سکتے۔ 'یہ سب تعریف ہے اللہ کے لیے' ترجمہ نہیں ہے اس کا' Praise بھی اس کا ترجمہ نہیں ہے' ہو ہی نہیں سکتا ترجمہ اس کا۔ اللہ کے لیے بے ساختہ مظلوموں کی زبان پہ آ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کیوں ہوا کیوں اس ظالم کی جڑ کٹی اس کی جڑ کٹنے کے اوپر کیوں کہا گیا کہ یہ ایسا موقعہ ہے جس کے اوپر حمد و ستائش کے الفاظ تمہاری زبان

پہ آنے چاہئیں تھے۔ کیوں یہ ہمارا پروگرام ہے؟ اس لیے کہ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (6:45) ہے وہ اپنی پوری مخلوق کا پوری نوعِ انسانی کی ربوبیت چاہتا ہے' پروردگاری چاہتا ہے۔ اور ظالم ان پروردگاریوں کے راستے کے اندر رکاوٹیں کھڑا کرتا ہے۔ ان رکاوٹوں کا دور ہو جانا' خدا کی ربوبیتِ عالمینی کے پروگرام کی تکمیل کے لیے ہے اس لیے الحمدللہ۔ اقبالؒ نے ظالم کی موت پہ کہا تھا نا کہ

مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگی

یہ ہے الحمدللہ رب العٰلمین۔ فطرت نے اس شخص کو بھی عجیب بصیرت' نگاہ عطا کی تھی اور پھر کہنے کا انداز بھی کیا خوبصورت دیا تھا۔

مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگی
باش تا بینی کہ انجامِ تو چیست

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ (6:45) ظالم کی جڑ کٹ رہی ہے۔ کٹنے سے پہلے کیا ہے؟ وہ یہ چیز فَتَحْنَا عَلَیْھِمْ اَبْوَابَ کُلِّ شَیْءٍ (6:44) عزیزانِ من! دولت کی فراوانیاں بجائے خویش کوئی شے نہیں ہیں کہ جن کے Satistic بنانے کے بعد آپ مطمئن ہو کے بیٹھ جائیں' مگن ہو کے بیٹھ جائیں' بڑی ترقی ہو رہی ہے۔ معیار اس کے یہ ہیں: قوانینِ خداوندی کی پابندی کتنی ہو رہی ہے اس کے اندر۔ حرام اور حلال کا فرق خدا نے بتایا ہوا ہے۔ دوسرے Concepts جو ہیں لائف کے یا زندگی کے' اس میں یہی تو مصیبت ہے کہ ان میں فرق نہیں ہے کہ حرام اور حلال جو میں کہہ رہا ہوں تو میرا مطلب صرف سؤر اور مردار سے ہی نہیں ہے۔

رزق کا لفظ صرف روٹی تک محدود نہیں اور نہ ہی غلامی کا لفظ بیڑیوں تک محدود ہے

قرآن نے رزقِ کریم کیوں کہا ہے مومن کے لیے' یہ کیوں عزت کا لفظ بڑھایا ہے عزت کی روٹی۔ کریم صرف عزت ہی نہیں (پھر وہی مشکل آ جاتی ہے میرے لیے) لیکن بہرحال اس نے صرف رزق نہیں کہا ہے رزق کے ساتھ یہ بھی تو کہا ہے۔ کل ہی ایک نوجوان سے بات کر رہا تھا۔ عام آجکل یہ ہو گیا ہے چرچا اور یہ جتنی بھی محکوم اور غلام قوم ہوتی ہے' غلامی محکومی سچ مچ کی بیڑیوں' ہتھکڑیوں میں نہیں ہوتی' ذہنیت غلام جو ہوتی ہے' وہ اصل میں غلام ہوتی ہے۔ ہم نے آزادی حاصل کر رکھی ہے' ہم غلام کے غلام ہیں' ذہنیت ہماری ابھی تک وہی غلامی کی ہے۔ کوئی بات ہم از خود سوچ کے نہیں کہتے۔ اِدھر سے ایک مغرب کی تہذیب آئی تھی اس ریلے کے اندر ہم بہہ گئے ہوئے تھے۔ اب Russia کی طرف سے سوشل ازم کیمونزم کا ایک سیلاب چلا جا رہا ہے اس میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ نہ اس پہ کبھی سوچا تھا کہ ہم یہ کیوں کر رہے ہیں۔ سوچا ہی نہیں تھا۔

تقلید پرستی کی انتہا' سخت گرمی کے موسم میں کوٹ اور ٹائی کے کیا معنی؟

میں کہتا ہوں آج بھی کسی سے اب پوچھ لیجیے اس مئی جون کے زمانے میں قمیص پہننے کے بعد اسے ٹائی میں باندھا ہوا ہو گا۔ اسے

پوچھیئے کہ صاحب! یہ آپ ٹائی کیوں باندھتے ہیں۔ جس قوم کے دانشوروں کی یہ کیفیت ہو کہ وہ اتنے سے کیوں کا جواب خود نہ دے سکے کہ میں ٹائی کیوں باندھتا ہوں' اس قوم کی غلامانہ ذہنیت کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت ہے؟۔ اس کا اپنا' دورلد گیا۔ لیکن ہمارے ہاں تو ہوتا یہ ہے کہ وہاں سے بات شروع ہوتی ہے تو پچاس برس کے بعد یہاں آتی ہے۔ لیکن یہاں اس وقت پہنچتی ہے'' جدوں اوہدا اوتھے چالیسواں ہون ڈیا ہونداا ے''۔ وہاں یہ مر مرا گئی ہوئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی نے دیر میں جا کے دیکھا کہ'' سوری وہ بوشرٹ پہن لگ پئے نے سیاپا او ہناں نیں اتار دیا ہیگا''۔ غلام قوم میں یہ ہوتا ہے عزیزانِ من!۔ یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں نہیں' وہ بڑی بڑی چیزیں ہیں۔ نشانیاں چھوٹی چھوٹی ہیں' چیزیں بڑی بڑی ہیں۔ ادھر سے اب جھگڑ چلا آ رہا ہے۔ کسی نوجوان سے پوچھو وہ کہتا ہے کہ زندگی کا مسئلہ جو ہے' روٹی کا مسئلہ ہے' سیدھی سی بات ہے۔ بس یہ حل ہو گیا' زندگی کے مسائل حل ہو گئے۔ لہٰذا آپ جو لیے پھرتے ہیں یہ نظریۂ پاکستان' اسلامی مملکت' مستقل اقدار اور یہ سب کچھ یہ وہ ساری چیزیں شاعری کی ہیں'' ویلھیاں دا کم ہیگا اے'' بیٹھے دھنتے رہو دھنکتے رہو روئی یہ سب کچھ۔ صاحب! قوم آج بھوکی مر رہی ہے اور اس کے بعد کتنے بچے جن کے تن پہ کپڑا نہیں ہے' سکول میں نہیں جاسکتے' رات کو روٹی نہیں مل رہی' چیزیں مہنگی ہو گئی ہیں۔ وہ پورے کا پورا سارا نقشہ۔ قوم کی یہ حالت ہو رہی ہے اور آپ اسلام کے احکام اور مستقل اقدار آگے رکھ دو۔ مسئلہ روٹی کا ہے صاحب! یہ باقی سب چیزیں جتنی ہیں سرمایہ داروں کے پیدا کردہ تصورات ہیں۔ وہ تو خدا کا تصور بھی کہتے ہیں سرمایہ داروں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ تو یہ ساری چیزیں جو خدا کی ہیں وہ تو ہوئیں۔ یہ Trend ہے ہمارے ہاں گفتگو کا۔

آج کے معاشرے میں پائی جانے والی سوچ اور پھر قرآن حکیم کا ارشاد

کسی نوجوان سے آپ کہہ کے دیکھیئے بشرطیکہ ذرا وہ آشفتہ منہ ہو بال بکھرے ہوئے ہوں' گریبان کا اوپر کا بٹن کھلا ہوا ہو اور یوں ذرا سا مڑا ہوا ہو'' کھدر دا ہووے کرتا لمبا جیا تھلے ہووے پاجامہ اوسے طراں' دا چپل ہووے پیراں اچ' ہتھ ہووے تھیلا' وال وکھرے ہوئے ہون''۔ کسی سے بات کر کے آپ دیکھیئے۔ مسئلہ سارا روٹی کا ہے' یہ ساری جتنی چیزیں آپ نے بنائی ہیں یہ سرمایہ پرستی کی پیدا کردہ ہیں۔ روٹی کا مسئلہ حل ہو جائے' بات ختم ہو گئی۔ ٹھیک ہے۔ میں نے کہا صاحبزادہ! مسلمان ہو۔ کہنے لگا کیا نظر آتے ہیں تمہیں' ٹھیک ہے میں نے کہا میری نظر کو چھوڑیے میں تو آپ سے پوچھ رہا ہوں یہ بات۔ ٹھیک ہے۔ میں نے تین دفعہ دہرایا میں نے کہا کہ آپ کہہ یہ رہے ہیں کہ انسانی زندگی کا مسئلہ صرف روٹی کا ہے اس کے علاوہ کوئی مسئلہ اور ہے نہیں' یہ حل ہو جائے تو مسائل حل ہو جائیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے؟ کہنے لگے ٹھیک ہے۔ میں نے پھر دہرا دیجیے کہیں التباس آگے چل کے نہ ہو' آپ نے کہا ہے کہ مسلمان بھی ہوں' کہنے لگے یہ ٹھیک ہے جی! مسئلہ ہی سارا روٹی کا ہے اور کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں نے کہا مسلمان ہونے کے لیے یہ چیز ہے کوئی سند وند ہونا چاہیے کہیں پتہ چلے کہ صاحب! وہاں سے یہ کفر ہے یہ اسلام ہے یہ مسلمان ہے یہ غیر مسلم ہے۔ کہنے لگے ہاں ٹھیک ہے آپ کہہ

دیجیے۔ میں نے کہا جس نے کہا مسلمان کون ہوتا ہے اور کافر کون ہوتا ہے اس نے کہا یہ ہے۔ عزیزانِ من! لکھ رکھئے۔ اس نے کہا یہ ہے سنئے! کہ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَتَمَتَّعُوۡنَ وَيَاۡكُلُوۡنَ كَمَا تَاۡكُلُ الۡاَنۡعَامُ (47:12) جو یہ کہتے ہیں کہ مسئلہ صرف روٹی کا ہی ہے جو حیوانات کا مسئلہ ہے یہ کفر ہے۔ تو میں نے کہا فیصلہ کر لیجیے۔ میں آپ کو روکتا نہیں آپ یہ کہیں آپ کا نظریہ ہے ٹھیک ہے ہو گا رکھئے۔ کہیے کہ مسئلہ صرف روٹی کا ہے کوئی اور مسئلہ انسان کا نہیں ہے۔ پھر یہ نہ کہیے کہ مسلمان ہوں۔ اس نے کہا وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَتَمَتَّعُوۡنَ وَيَاۡكُلُوۡنَ كَمَا تَاۡكُلُ (47:12) یہ کہنے والے کہ مسئلہ صرف روٹی کا ہے اور کوئی مسئلہ اس کے بعد نہیں انسان کا۔ اس نے کہا کہ حیوانات کا بھی تو یہ مسئلہ ہے انسانوں میں سے جو یہ کہتا ہے کہ مسئلہ یہی ہے یہ کفر ہے۔ وہ کفر اور ایمان کی تمیز اس میں بتاتا ہے امتیاز اس میں ہے۔

انسانی تاریخ کا ایک قابل غور پہلو قومیں بھوک سے نہیں اقدارِ خداوندی کو فراموش کرنے سے مرتی ہیں

روٹی کی اہمیت اتنی ہے کہ اس کا نہ ملنا خدا کا عذاب قرار دیتا ہے لیکن صرف روٹی کو مسئلہ قرار دینا اور اس کے علاوہ سمجھنا کوئی مسئلہ انسان کا نہیں، وہ کہتا ہے یہ حیوانات کی سطح تک تو ٹھیک ہے انسانوں میں سے جو ایسا کہتا ہے وہ کفر کی زندگی اختیار کرتا ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ روٹی کا مسئلہ اگر اقدارِ خداوندی کو چھوڑ کے حل کیا جاتا ہے تو ٹھیک ہے بَطِرَتۡ مَعِيۡشَتَهَا (28:58) قرآن نے کہا ہے ہم ابواب کھول دیتے ہیں مختلف شے کے فراوانی سے رزق مل سکتا ہے آپ کو۔ لیکن یہ جو فراوانی سے ملا ہے یہ دریا کے ساحلوں میں گھرا ہوا پانی نہیں آ رہا سیلاب آ رہا ہے۔ انسانیت کی تاریخ میں دیکھئے گا تباہ ہونے والی قومیں اس زمانے میں تباہ نہیں ہوئیں جب وہ بھوکی مرتی تھیں۔ اُس زمانے میں تباہ ہوئیں جب ان کے ہاں دولت، ثروت، طاقت، قوت، اقتدار کی فراوانیاں تھیں اقدارِ خداوندی کو فراموش کیا ہوا تھا اس میں۔

قوموں کی ہلاکت قرآنی نظامِ ربوبیت کو پس پشت ڈالنے کی وجہ سے ہوتی ہے

عزیزانِ من! مذہب اور غیر مذہب کی بات نہیں انسانیت کی تاریخ آپ کو بتا رہی ہے۔ وہ کہتا ہے جب آخری وقت پھر کسی قوم کی تباہی کا آتا ہے تو پھر یہ پھاٹک کھلتے ہیں۔ وہ اور اس میں بدمست ہوتے ہیں اقدارِ خداوندی کو فراموش کر دیا جاتا ہے مذاق اڑنے لگ جاتا ہے پھر ان چیزوں کا۔ پھر ذہن کے اندر بات اتنی رہ جاتی ہے کہ مسئلہ روٹی کا ہے جس طرح سے بھی پھر یہ حل ہو جائے اس کو حل کیجیے۔ وہ کہتا ہے ٹھیک ہے پھر فراوانیاں تو حاصل ہو جاتی ہیں فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا (6:45) ظالم قوم کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ وَالۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ (6:45) یہ جو خدا کی ربوبیتِ عالمینی کے راستے کے اندر اس طرح رکاوٹیں بن کے کھڑے ہوئے تھے اس قوم کا ہلاک ہو جانا انسانیت کے لیے وجۂ تشکر ہے اس لیے وَ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ (6:45)۔ کہا یہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو کہ ہم اتنا کما رہے ہیں اور اتنا کر رہے ہیں۔ کسی سے آج یہ کہیے کہ فلاں شخص دیانتدار ہے ایماندار ہے، گذارہ نہیں ہو رہا پھر اس کے

باوجود' کچھ کمائی نہیں ہو رہی۔ کہتا ہے بدھو ہے۔ دیانتدار ہے اگر تو پھر تو وہ کہیں گے کہ بزدل ہے' جرأت نہیں ہے۔ ٹھیک ہے ڈاکو کے لیے تو جرأت ہونی چاہیے۔ دیانتدار آپ کے معاشرے میں پھر بزدل بن جاتا ہے۔ یہ فقرہ ہمارے سامنے ہے۔ بہت دور کی بات ہے ہمارے ایک دوست نے دوسرے سے کہا تھا دفتروں میں کہ وہ بڑی دیانتداری سے کام کرتا ہے' بڑا ایماندار ہے' کچھ نہیں لیتا۔ اس نے کہا گردے کمزور ہونگے اس کے۔ ہمارے ہاں دل گردہ کہتے ہیں نا یہ جرأت کے لیے' یہ فقرہ اب تک معلوم ہے' بزدل کہا جاتا ہے۔ کاروبار کے اندر جو دیانتداری سے کمانے والا ہو اور بہت تھوڑا سا ملے' بدھو ہے۔ تیز طرار' چالاک' ہوشیار۔ ٹھیک ہے یہ تو Battle of witts ہے' دماغ لڑتے ہیں جو اس کے اندر تیز ہوتا ہے' لے جاتا ہے۔ کہا ٹھیک ہے۔ یہ دماغ کیا ہے وہ کہتا ہے' یہ تمہاری سماعت' یہ تمہاری بصارت' یہ سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں یہ سب کچھ کہتا ہے ذرا یہ فرمایئے آپ نے کتنے پیسے میں یہ خریدی تھیں۔ یہ دیکھنے کی قوت' سننے کی' سمجھنے کی' سوچنے کی' یہ دماغ' یہ قلب آپ بتا دیں گے کہ کہاں منڈی ہے اس کی کہاں ملتا ہے یہ۔ White میں نہ سہی سمگل کیا ہوا سہی' کہیں سے ملتا ہے' کہیں سے خرید کے لائے ہو؟ خود پیدا کیا ہے یہ تم نے' یوں بنایا تھا؟۔ قرآن مختلف مقامات پہ ایک بڑی عجیب چیز کہتا ہے کہ یہ Basically صلاحیتیں جو تم کہتے ہو اس کو Develope تو تم کرتے ہو خود۔ اس کی بنیادیں جتنی ہوتی ہیں' وہ تو تمہاری اپنی نہیں ہوتیں' وہ تو فطرت کا عطیہ ہوتی ہیں اور اسے وہ خدا کی نعمتیں قرار دیتا ہے جسے انسان نے نہ خود خریدا ہو' نہ خود بنایا ہو' نہ خود اکتسابی طور اس کو یہ لیا ہو۔ Develope کرنا اور بات ہے۔

انسان کی تمام جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں خدا کی عطا کردہ ہیں جن کا ایک خاص مقصد ہے

زندگی یہ نہ خریدنے سے ملتی ہے' نہ مستعار کہیں سے ملتی ہے' نہ خود بنائی جاتی ہے' یہ ملتی ہے بطورِ نعمت ملتی ہے۔ ٹھیک ہے اس کی حفاظت ہم کرتے ہیں' احتیاط برتتے ہیں' اس کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ ملتی جو ہے یہ بطورِ نعمت ملتی ہے۔ اسی طرح سے یہ صلاحیتیں سمجھنے کی' سوچنے کی' دیکھنے' بھالنے کی یہ بطورِ نعمت ملتی ہیں۔ وہ کہتا ہے انہی کے بل بوتے پہ آگے جا کے یہ سارا کچھ کرتے ہو اور اس کے بعد پھر بڑا فخر کرتے ہو نا کہ ہم نے ایک چکرا ایسا دیا۔ کہا یہ جس زور پہ کرتے ہو قُلْ اَرَءَ یْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ (6:46) اگر کہیں ایسا ہو کہ یہ جتنی چیزیں بنیادی طور پہ ملی ہیں' تمہیں یہ نہ بنیادی طور پہ ملیں یا اس کے بعد سلب ہو جائیں' کوئی اور ہے اس کائنات میں جو تمہیں دے سکے۔ کہا اور کچھ نہیں تو کم بختو! جس نے یہ بنیادی سامان تمہیں دیا ہے' اس کاروبار میں اس کا حصہ ہی نکال دو اور کچھ نہیں تو۔ کیا بات ہے!!!۔ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ (6:46) ہے کوئی اور ایسی ہستی اقتدار والی جو یہ کر دے۔ یہیں ختم کرنے کے بعد بات کی۔ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ (6:46) دیکھو ہم کس طرح سے پھیر پھیر کے لاتے ہیں باتوں کو' دلائل کو کہ بات سمجھ میں آجائے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ انہی آیات میں کس طرح سے مختلف گردشوں سے' مختلف

گوشوں سے لایا ہے ایک بات کو بیان کرنے کے لیے۔ کہتا ہے ہم یہ کچھ کرتے ہیں۔ سمجھ میں بات آ بھی جاتی ہے ان کے **ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ** (6:46) پھر وہ جو مزین چیز نظر آتی ہے کہ یوں کیا' دس ہزار آ گئے۔ کہنے لگے اس کے بعد پھر یہ ادھر ہی پھر جاتے ہیں۔ **قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ** (6:47) پھر کہا دہرا دیتے ہیں جو پہلے کہا تھا ہم نے کہ یہ ابتدائی جھٹکے آئیں یا آخری تباہی آ جائے یاد رکھو! ایک چیز **هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ** تباہ اور ہلاک ہمیشہ ظالم قوم ہوتی ہے۔ جو ظلم اختیار کرتی ہے وہ تباہ اور برباد ہو جاتی ہے جو ظلم اختیار نہیں کرتی وہ کبھی تباہ نہیں ہوتی۔ یہ **هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ** (6:47) ہلاکت ہمیشہ ظالم قوم کی ہوتی ہے۔ جس قوم پہ بھی کوئی تباہی آئے۔

آخر اسلام کے نام پر قائم حکومت میں ظلم کا راج کیوں؟

عزیزانِ من! اور باقی قوموں کو تو چھوڑ دیجیے' وہ اس کو تو نہیں مانتے۔ ہم تو صبح شام اسلام کا نام لیتے چلے جاتے ہیں۔ آج بھی ہم یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلامی مملکت یہی بنی ہے۔ اسلام کے لیے یہ ایک کوڈ آپ کے پاس ہے جس پہ ایمان ہے ہم سب کا۔ اس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جہاں ظلم ہوتا ہے وہاں تباہی اور ہلاکت آ جاتی ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ جب بھی کہیں تم پہ کوئی بربادی اور تباہی آئے تو سوچ لو کہ کہیں ظلم ہو رہا ہے۔ ہم پہ یہ چیزیں آتی ہیں تو یہ ٹھیک ہے کمیٹیاں ہم بٹھاتے ہیں' کمیشن بٹھاتے ہیں۔ وہ جتنی Technical چیزیں اس کی ہوتی ہیں وہ اس کے متعلق تو دیکھ بھال کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے یہ ٹھیک ہے ان میں بھی کوئی نقص ہوگا' وہ بھی دیکھنا ضروری ہے۔ میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے دیکھنا کہ بارود خشک ہے' گولی ٹھیک ہے' ضروری بات ہے۔ کہتا ہے اصل چیز جو تھی اس کو دیکھو کہ کہیں ظلم تو نہیں ہو رہا معاشرے کے کسی گوشے میں۔ اس کا تدارک کرو۔

اس ظلم وستم کا علاج صرف اس ایک سجدہ میں ہے جو ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اس لیے کہ اصول یہ ہے **هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ** (6:47) تباہی جب آئے گی' ظلم کی بنیاد پہ آئے گی۔ پہلے جھٹکوں کے بعد جب بھی اپنے ہاں تحقیقات کے لیے کمیشن بٹھاؤ تو ان سے یہ کہو کہ پہلے یہ دیکھو کہ کہیں ظلم تو نہیں ہو رہا ہمارے معاشرے میں۔ وہ ہو رہا ہے تو تمہارے مشنوں کی ہزار Effetiency بھی تمہیں نہیں بچا سکے گی۔ ظلم نہیں ہوگا تو یہ چھوٹی چھوٹی سی چیزیں جو ہیں چھوٹے چھوٹے نقصان پہنچا سکیں گی ان کی تلافی ہو جائے گی۔ ظلم کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

ہلاکت سے پہلے وارننگ کے زمانے میں یہ دیکھ لو اور ظلم ہو رہا ہے تو اس کا تدارک کر لو بچ جاؤ گے۔ اور آخری مرحلہ جب بَغْتَةً (6:47) کا آجائے گا تو اس کے بعد پھر عزیزانِ من! وہ کہتا ہے کہ مُبْلِسُوْنَ (6:47) پھر سانس لیتے رہو گے، زندہ رہو گے، اور ابدی حرماں نصیبی، اور مایوسیاں تمہارے اوپر چھا جائیں گی۔ سوچو کہ یہ کیا زندگی ہوگی۔ سورۃ الانعام کی آیت 47 تک ہم عزیزانِ من! آ گئے 48 آیت سے ہم آئندہ شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

چھٹا باب: سورۃ الانعام (آیت52)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج اگست 1971ء کی 22 تاریخ ہے۔اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی 52 آیت سے ہوتا ہے (6:52)

مذہب تو خالصتاً انفرادیت کا نام ہے جب کہ دین اجتماعیت کی ترغیب دیتا ہے

مذہب اور دین کا ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ مذہب انفرادی شے ہے یعنی ایک فرد اکیلا تنہائی میں مذہب کے تقاضوں کو پورا کرسکتا ہے۔ بلکہ وہ تو ایسے تقاضے ہیں' جتنی زیادہ تنہائی ہوتی چلی جائے' وہ کہتے ہیں اتنا ہی زیادہ ان تقاضوں کو بہتر طور پہ پورا کرسکتے ہیں۔ایک فرد اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا اپنے تصور کے مطابق اپنے خدا سے اپنا تعلق پیدا کر لیتا ہے۔ پوجا پاٹ بھگتی پرستش بندگی۔اور انہی معنوں میں عبادت کا لفظ استعمال ہونے لگ گیا۔ یہ اکیلے تنہائی میں سب کچھ ہوسکتا ہے۔ بلکہ جیسا میں نے عرض کیا' روحانیت کی دنیا میں جتنا زیادہ آگے بڑھتے ہیں' وہ اتنا ہی زیادہ آبادیوں سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔زاویوں میں' حجروں میں' خانقاہوں میں' پھر جنگلوں میں' ویرانوں میں' دریاؤں کے کنارے' پہاڑیوں کی چوٹی پر۔اگر اس میں کچھ اس قسم کی عبادت کے علاوہ کچھ پیسے خرچ کرنے کا بھی سوال ہوتا ہے تو انفرادی طور پر دان' پُن' صدقہ خیرات اور ہماری مروجہ رسم کے مطابق' زکوٰۃ تک انفرادی چیز ہوتی ہے۔کسی نے اپنے طور پر یہ پیسے نکالے' کسی کو اپنے طور پہ دیدیا۔اور اگر انسان نہ بھی ہوں تو وہ ہندوؤں کے ہاں بڑے بڑے نمک کے ٹکڑے رکھ دیتے تھے گائے بھینسوں کے لیے' پیاؤ بنا دیتے تھے پانی پینے کے لیے گھوڑوں کے' چڑیوں کے لیے دانہ دنکا ڈالتے تھے' کیڑے مکوڑوں کے خانوں کے اوپر آٹا ڈالتے تھے۔ یہ سب مذہب کے تقاضے ہیں' یہ انفرادی طور پر پورے ہوسکتے ہیں۔ دین اجتماعی نظامِ زندگی کا نام ہے اس کے لیے ایک جماعت ضروری ہے' یہ انفرادی شے نہیں ہے۔

قرآن حکیم نے نبی اکرم ﷺ کو المزمل کے الفاظ سے نوازا یعنی ہم آہنگ افراد کو اکٹھا کرنے والی شخصیت

یہ ایک نظام قائم کرنا ہوتا ہے اور نظام تو لامحالہ ایک جماعت کا متقاضی ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے اس سے پیشتر بھی کئی دفعہ عرض کیا ہے' صرف جماعت ہی نہیں' آگے بڑھ کے ایک مملکت کا تقاضا کرتا ہے۔ بہر حال ایک جماعت کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اسلام دین ہے اس لیے اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ جماعت کے بغیر اسلام کا تصور نہیں کیا جا سکتا یہ حقیقت ہے۔ اسی لیے رسول کا فریضہ جماعت کی تشکیل ہوتا ہے۔ خدا کا پیغام تو وہ انسانوں تک پہنچاتا ہے اور یہ تو عام چیز ہوتی ہے۔ جو کچھ اسے خدا کی طرف سے ملتا ہے' اسے وہ عام کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس عام کرنے تک ہی اس کا فریضہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ جن تک اس پیغام کو پہنچاتا ہے پھر ان میں سے جو افراد اس پر لبیک کہتے ہوئے ادھر آتے ہیں' وہ ان کی ایک جماعت تیار کرتا ہے۔ اس کا ایک پروگرام ہے ایک پروسیس ہے ایک طریق ہے۔ **وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ** (2:129) وہ ان کو قوانینِ خداوندی کی تعلیم دیتا ہے' ان قوانین کی غرض و غایت بتاتا ہے' علت سمجھاتا ہے' یہ بتاتا ہے کہ ان کے اوپر عمل پیرا ہونے سے کیا نتائج مرتب ہونگے۔ اور پھر ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرتا ہے' ان کو عام سطح سے ابھار کر انسانی سطح پر لاتا ہے۔ یہ افراد ہیں جنہیں اس رسول کی جماعت' اس کی امت یا اس نظام کو قائم کرنے کی ذمہ دار ایک جماعت یا گروہ یا حزب اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ نہایت ضروری ہے اور یہی وہ فریضہ تھا جس کے لیے نبی اکرم ﷺ کو **يٰٓأَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ** (73:1) کہہ کر پکارا گیا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں' عملِ تزمیل ہے ہی یہ کہ ہم ساز و ہمنوا اور ہم آہنگ افراد کو اکٹھا کرتے چلے جانا' ان میں باہمی قلب کی تالیف' موافقت بلکہ مواخات یہ چیزیں پیدا کر کے ان کو ایک Solid چٹان کی طرح بناتے چلے جانا۔ اور یہ ہے وہ جماعت جس کو ساتھ لے کر رسول اٹھتا ہے اور پھر اس دین کو ایک عملی نظام کی شکل میں متشکل کرتا ہے۔ یہ بنیادی چیز ہے' یہ اس رسول کا دینی فریضہ ہے۔ اب آپ سوچئے کہ اس جماعت کی اہمیت کتنی ہوگی جس کے بغیر رسول کا پیغام دین کی شکل اختیار کر ہی نہیں سکتا۔ تنہا رسول اس دین کو ایک عملی نظام میں متشکل نہیں کر سکتا کہ انفرادی شے نہیں ہے۔ فرد خواہ رسول ہی کیوں نہ ہو اس کے لیے جماعت کی ضرورت ہے۔ اور یہی وہ جماعت ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے' بڑی اہم جماعت۔

رسول اکرم ﷺ کی جماعت میں شامل ہونے والوں میں مترفین کے بجائے نچلے طبقہ کے لوگوں نے شمولیت اختیار کی تھی

یہی وہ جماعتِ اولیں ہے جسے ہماری تاریخ میں صحابہؓ کبارؓ کہا جاتا ہے رسول اللہ ﷺ کے ساتھی وہی بات ہے۔ سب سے پہلی جماعت جس نے اس پیغام کو ایک عملی پیکر میں ڈھالا اس کو نظام کی شکل دی' ایک مملکت قائم کی۔ اور یہ نبی اکرم ﷺ پر ہی موقوف نہیں' دین

کا چونکہ نظام ہی یہ ہے' ہر رسول نے یہ کیا تھا' جماعت تیار کی تھی۔ لیکن قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ اس جماعت میں سب سے پہلے اس قوم کے' جس میں رسول آتا تھا اس قوم کا غریب' ضعیف' ناتواں' بے کس' بے بس طبقہ جسے آج کی اصطلاح میں نچلا طبقہ کہتے ہیں' یہ پہلے اس دعوت پر لبیک کہتا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ اوپر کا طبقہ جسے آپ کہتے ہیں' جسے عام طور پر ترجموں میں سردارانِ قوم کہا گیا ہے لیکن درحقیقت قرآن کے الفاظ خواہ وہ ملا کا لفظ ہو خواہ مترفین کا لفظ ہو وہ قوم کا سرمایہ دار طبقہ' دولت مند طبقہ خوشحال طبقہ اس کے معنی ہیں۔ سردار کہتے ہی اس لیے ہیں کہ جس کے پاس دولت ہو' سرداری تو اس کے ساتھ آ ہی جاتی ہے۔ یہ جو اوپر کا طبقہ تھا۔ اب آپ اوپر کا اور نیچے کا طبقہ یہی دو اصطلاحیں سامنے رکھیئے۔

اوپر کا طبقہ اس پیغام کی ہمیشہ مخالفت کرتا تھا' نیچے کا طبقہ سب سے پہلے ساتھ دیتا تھا۔ قرآنِ کریم نے اس سلسلۂ رشد و ہدایت کی داستان کا آغاز حضرتِ نوحؑ سے کیا۔ کہا یہ ہے کہ انہوں نے یہ دعوت دی۔ قوم کے نچلے طبقے نے لبیک کہا اور وہ ان کے ساتھ ہو گیا۔

اوپر کے طبقہ کی وہ پست ذہنیت جو حضرت نوح کے دور یعنی 6 ہزار سال سے چلی آ رہی ہے

یہ جو اوپر کا طبقہ ہے اس کا پہلا مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ ہم آنے کو تو تیار ہیں لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کہ جسے کمی یا کمین کہتے ہیں' یہ ہمارے ہاں کے کمینوں کا طبقہ' کمیوں کا طبقہ' محنت کشوں کا طبقہ' مزدوروں کا طبقہ' غریبوں کا طبقہ' جن کا ہم سلام تک لینے کے لیے تیار نہیں ہیں' آپ ہمیں یہ کہتے ہیں کہ ان کے برابر آ کے ہم بیٹھیں یا یہ ہمارے برابر بیٹھیں ہم دونوں مل کے ایک جماعت بنیں ان میں کسی قسم کا تفاوت' کوئی تمیز تفریق ہی نہ ہو۔ تقاضا یہ تھا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ بات تو حضرتِ نوحؑ کی قوم کی ہو رہی ہے۔ قیاس تاریخ کا جو ہے اس تک بھی اگر آ جایئے تو کم از کم چھ ہزار سال پہلے اور داستان یہ آج کی معلوم ہوتی ہے۔ پہلا تقاضا ہی اس اوپر کے طبقے کا یہ ہوتا ہے کہ انہیں باہر نکال دیجیے۔ یہ بڑی غلط بات ہے کہ یہ شرفائے قوم اجلاس میں ان کے ساتھ آ کر ایک ہی سطح کے اوپر بیٹھ جائیں' یہ نہیں ہو سکتا۔ انہیں نکال دیجیے تب ہم آئیں گے۔ اور اس کا تو پیغام ہی یہ ہوتا تھا کہ یہ جو تفریق ہے' یہ باعثِ تذلیل انسانیت ہے۔ اسی کو تو وہ مٹانے کے لیے آتا تھا۔ ٹکراؤ ہی پہلا یہ ہوتا تھا ان کے درمیان۔ سٹیج یہ ہے کہ انہیں دعوت دی ہے حضرتِ نوحؑ نے' یہ نیچے کا طبقہ جو ہے وہ ساتھ ہو لیا ہے اوپر کا طبقہ مخالفت کرتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی سب سے زیادہ مخالفت خوشحال گھرانوں کی طرف سے ہوئی تھی

مخالفت کی ذرا وجہ بنیادی سنئے! فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ (11:27) دیکھا یہ الْمَلَاُ (11:27) جو ہے لفظ' میں نے کہا تھا جس کا ترجمہ ہمارے ہاں سردارانِ قوم کیا جاتا ہے' بنیادی معنی جو ہیں روٹ کے اعتبار سے اس کے مطابق وہ جن کے گھروں

کے برتن ان چیزوں سے بھرے ہوئے ہوں ''جناں دیاں کوٹھیاں اچ دانے بہت سارے پئے ہوئے ہون'' نہایت خوشحال گھرانہ' دولت مند گھرانہ۔تو قوم کے اس طبقے میں سے جو سرکش تھے' جو انکار کرنے والے تھے' وہ مخالفت کے لیے اٹھتے ہیں۔آ کے وہ کہتے یہ ہیں کہ مَا نَرٰکَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا(11:27) پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم بھی ہمارے جیسے ایک انسان ہو اس لیے تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ خوامخوہ کے لیے اپنے آپ کو ایک لیڈر کی حیثیت سے تم اونچے مقام کے اوپر کھڑے ہو جاؤ۔ ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو۔ٹھیک ہے' رسول تو کبھی یہ دعویٰ ہی نہیں کرتا کہ میں تم سے اونچا یا تم سے الگ کوئی انسان ہوں۔ یہاں تک بات تو ٹھیک ہے آگے ہے وہ اعتراض وَمَا نَرٰکَ اتَّبَعَکَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا(11:27) اور یہ جو تمہارے ساتھ ہو لیے ہیں یہ تو ہماری قوم کا رذیل طبقہ ہے' اراذل ہیں۔ یہ طبقہ تمہارے ساتھ ہولیا۔اور یہ ساتھ کیسے ہولیا؟ کہا کہ یہ طبقہ غریبوں کا' رذیلوں کا طبقہ جو ہے' یہ کوئی صاحبِ فکر ہو سکتے ہیں' کوئی عقلمند ہو سکتا ہے؟۔

عقل وفکر کو دولت کے ترازو میں نہیں تولا جاتا

وہ جو ہمارے ہاں محاورہ ہے کہ ''جیہدی کوٹھی اچ دانے اوہدے کملے وی سیانے'' جن کے گھر کھانے کو ہوتا ہے' ان کے ہاں کے بیوقوف بھی بڑے عقلمند۔ محلے کے اندر چوہدری کا بیٹا یا اس قسم کا کاٹھ کا الو ہو لیکن سب سے بڑا عقلمند سمجھا جائے گا کوئی اس کی بات کو ٹوک ہی نہیں سکتا۔طاقت تو پیچھے دولت کی ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ ساری چیزیں آ جاتی ہیں۔کہا کہ یہ طبقہ یہ غریبوں کا' محنت کشوں کا طبقہ' یہ صاحبِ عقل و دانش کیسے ہو سکتے ہیں۔تمہارے ساتھ ہو لیے۔یونہی سرسری طور پہ انہوں نے کچھ دیکھی بات' تمہارے ساتھ ہو لیے بادی الرائے میں' کوئی قابلِ وقعت چیز نہیں ہے۔لہٰذا تم خوامخوہ کے لیے ایک فریب میں آ گئے ہو کہ اتنا طبقہ میرے ساتھ ہو گیا ہے' یہ ہو کیا گیا۔قوم کا نچلا طبقہ عقل وفکر ان کی کچھ ہے نہیں ان کو تم نے ساتھ ملا لیا ہے۔وَ مَا نَرٰی لَکُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ م بَلْ نَظُنُّکُمْ کٰذِبِیْنَ (11:27) ہم دیکھتے ہیں کسی اعتبار سے بھی تم لوگوں کو' تمہاری جماعت کو ہم پہ تو کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔اور یہ ہو گیا معیار ان کے ہاں صداقت اور کذب کے پہچاننے کا۔کہا جب صورت یہ ہے کہ نہ دولت تمہارے پاس' نہ حسب ونسب کے اعتبار سے یہ طبقہ اشراف کا طبقہ' اونچا طبقہ اس لیے بَلْ نَظُنُّکُمْ کٰذِبِیْنَ (11:27) ہم سمجھتے ہیں تم جھوٹے ہو۔ٹھیک ہے جی! ''زور آور ستیں ویہیں سو''۔

کفار کی الزام تراشی کے برعکس نبی اکرم ﷺ کا اپنی شخصیت کے متعلق اظہارِ خیال

یعنی اندازہ لگایئے عزیزانِ من! قرآن کس انداز سے بات کرتا چلا جاتا ہے۔کوئی دلیل نہیں کوئی' برہان نہیں کوئی' اپنی صداقت کا

ثبوت نہیں، صرف یہ بات کہ یہ تمہارے ساتھی یونہی غریب سے لوگ، کمین سا طبقہ بادی الرائے میں، یوں ساتھ ہوگیا ہے لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ تم جھوٹے ہو۔ جواب ملتا ہے کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، ٹھیک ہے تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں تم کہتے ہو میں بھی یہی کہتا ہوں۔ ایک فرق یہ ہے کہ وَ یٰقَوۡمِ لَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مَالًا (11:29) جو کچھ میں تم سے کہتا ہوں، اس کے معاوضے میں تم سے میں کوئی مال و دولت نہیں مانگتا۔ اور یہ بڑی چیز ہے عزیزانِ من! ۔ قرآنِ کریم نے ہر رسول کی دعوت میں جہاں پہلا فقرہ یہ کہا ہے کہ اس نے کہا وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ (4:36) خدا کی محکومیت اختیار کرو۔ اسی سانس میں یہ کہا ہے کہ میں اس کے بدلے میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ یہ ہے بنیادی شرط کہ اپنی ذات کے لیے اس کے بدلے کوئی معاوضہ نہ چاہے۔ پھر یہ چیز نظر آتی ہے کہ کچھ بے لوث سی بات کہتا ہے۔ اپنا کوئی اسکا مفاد نظر نہیں اس میں آتا کوئی مقصد نہیں کوئی، مطلب نہیں، جان کھپاتا ہے، مارکھاتا ہے، دن رات ایک چیز کہے جاتا ہے، لیتا ہم سے کچھ نہیں، مانگتا کچھ نہیں۔ بہت بڑی چیز ہے۔ ہر رسول نے یہ کہا۔ کہا کہ پہلی چیز تو یہ ہے آپ مالدار ہوں اپنے گھر میں ہوں۔ میں تو تم سے تمہارا مال نہیں مانگ رہا۔ لہٰذا یہ چیز تو یوں ہوگئی۔ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ (11:29) جو کچھ میں کر رہا ہوں اس کا بدلہ جو ہے وہ خدا کی طرف سے مجھے ملے گا۔ اور اگلی بات یہ تمہارا تقاضا کہ یہ چھوٹی سطح کے لوگ تمہارے ساتھ آ کے ہو لیے ان کو نکال دو پھر ہم تمہارے پاس آ کے بیٹھیں گے۔ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا (11:29)

ان کو تو میں دھتکار نہیں سکتا۔ یہاں صرف ان کی ایک خصوصیت بتائی ہے الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا (11:29) یہ جو اس دعوت کی صداقت پر ایمان لے آئے ہیں بس یہی چیز کافی ہے میرا ساتھی ہونے کے لیے۔ اس لیے تمہارے تقاضے کے مطابق انہیں میں نہیں دھتکار سکتا، یہ نہیں ہوسکتا، یہ سودا نہیں ہوسکتا۔ اور بڑی چیز ہے آگے۔ وَ یٰقَوۡمِ مَنۡ يَّنۡصُرُنِیۡ مِنَ اللّٰهِ اِنۡ طَرَدۡتُّهُمۡ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ (11:30) کہا کہ تمہیں خوش کرنے کے لیے انہیں میں نکال دوں اور یہ جو اتنا بڑا جرم ہوگا، اسکی پاداش میں خدا سے مجھے کون بچائے گا۔ تم نہیں بچا سکتے۔ اس لیے انہیں نہیں نکال سکتا۔ آپ دیکھتے ہیں کتنی بڑی اہمیت ہے یہ جماعت جو وہ انہی کے قول کے مطابق نہیں، آج بھی! دنیا کے عام ہر معیار کے مطابق جس کا کوئی وزن نہیں، کوئی قیمت نہیں، غریب مفلس بقول ان کے اراذل چھوٹے طبقے کے لوگ، یہ بہت چھوٹے چھوٹے کاروبار کرنے والے بیچارے کوئی وزن نہیں۔ مقابلے میں یہ قوم کے سرداران، دولت مند طبقہ ہے، سردار بھی ہیں قوم کے جو تقاضا صرف یہ پیش کرتے ہیں کہ انہیں نکال دو، ان کی جگہ ہم آتے ہیں۔ آپ سوچیے ہر سیاسی لیڈر ہزار درجہ اس کو قبول کرلے گا کہ ان سے لینا کیا ہے میں نے۔ اور وہ اسی تصادم میں ان سے کہہ دیتا ہے کہ یہ نہیں ہوسکتا۔

نبی اکرم ﷺ کا مشن انسان کو کسی طبقاتی تفریق کے ترازو میں تولنا نہیں

یہی تو میرا مشن، یہی تو میرا منشاء ہے۔ خدا کے ہاں کیا جواب دونگا۔ ایک چیز دوسرے مقام پہ یہ بھی کہی ہے غالباً انہوں نے تو یہی کہا

ہوگا جب ارذل کہا ہے کہ یہ قوم کے یونہی یہ چھوٹے چھوٹے کام کرنے والے یہ نائی حجام' سقے یعنی ان کے الفاظ میں کہہ رہا ہوں عزیزانِ من! کہیں یہ نہ سمجھئے کہ میں بھی ان کو معاذ اللہ ارذل میں شمار کرتا ہوں۔ یہ تو تقسیم کار ہے معاشرے کے اندر جو مختلف کام مختلف لوگوں کے ذمے لگ جاتے ہیں۔ یہ چیز تو نہ وجہ عزت ہو سکتی ہے' نہ باعثِ رذالت ہو سکتی ہے۔ تقسیم کار ہے۔ لیکن انہوں نے اور میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ چھ ہزار سال کی تاریخِ انسانیت بتا رہی ہے کہ جب بھی خدا کی اقدار کا وہ معیار نہ رہے پھر معیار دولت وقوت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک یہ کمی۔ یہ کمی آپ کو معلوم ہے ہمارے ہاں پنجاب میں کمین کا مرادف ہو گیا ہوا ہے۔ وہ حالانکہ ''کمی تے او ہے نا جیہڑا کم کرے''۔ ٹھیک ہے جی! یہ جو اوپر کا طبقہ ہے' اس کے نزدیک کام کرنے والا جو ہے یہ تو کمین ہو گا ہی۔ سمجھ لیا نا۔ وہاں تو اشراف تو وہ ہونگے ''جیہڑ او یہلیاں کھاوے''۔ اور اس کے بعد جب بیکار' بغیر محنت کیے ہوئے سب کچھ ملے تو پھر جو کچھ وہ کرتا ہے وہ تو ہمارے سامنے ہے۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ دولت اور قوت ہوتی ہے' اس واسطے چوہدری وہی ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن نے اس داستان کا آغاز حضرتِ نوحؑ سے کیا اور پہلی بات یہ کہی کہ یہ طبقہ ساتھ ہوا۔ اُس کی قوم نے مخالفت کی اور اُس کا مطالبہ یہ تھا کہ! انہیں نکالیے پھر ہم آتے ہیں۔ قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لَکَ وَاتَّبَعَکَ الۡاَرۡذَلُوۡنَ (26:111) دلیل: تم کہتے ہو کہ جو بات میں کہتا ہوں اس پہ ایمان لاؤ' کیسے ہم ایمان لائیں یہ جو تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں یہ تو ہماری قوم کے ارذل ہیں' کمین ہیں اور ان کی سطح کے اوپر ہم بھی آ جائیں۔ آپ دیکھتے ہیں کذب اور صداقت کے پہچاننے کا معیار کیا قرار دیا جا رہا ہے۔ یہاں سے وہ بات ہوئی جو میں نے کہا تھا کہ ان کا جو اعتراض تھا وہ یہ کہ یہ کام کاج کیا کرتے ہیں۔ کہا قَالَ وَمَا عِلۡمِیۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (26:112) مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ یہ کیا کیا کام کرتے ہیں۔ یہ کنجڑے ہیں' محنت کش ہیں' یہ عام اصطلاح میں حجام ہیں' سقے ہیں۔ کہا مجھے اس سے غرض ہی نہیں۔ اِنۡ حِسَابُہُمۡ اِلَّا عَلٰی رَبِّیۡ (26:113) یہ جو معاملے ہیں اس کے متعلق یہ بات میرے خدا سے متعلق ہے۔ مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ یہ کام کیا کرتے ہیں' مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ یہ ایمان لائے ہیں۔ صداقت ہے' خلوص ہے' دیانت ہے ان کے اندر۔ یہ ہے چیز دو لفظ دیکھئے لَوۡ تَشۡعُرُوۡنَ (26:113) کچھ آئی بات سمجھ میں۔ کیا بات ہے نبی کا مقام!!۔ اتنا بڑا سودا سامنے ہو رہا ہے' پوری کی پوری جماعت امراء کی' روساء کی بقول ان کے شرفاء کی' سردارانِ قوم کی' دولت ان کے پاس' قوت ان کے پاس لے کے آ رہے ہیں۔ تقاضا صرف اتنا کیا جا رہا ہے کہ انہیں نکال دیجیے' ہم سب کے سب تمہارے ساتھ ہو جائیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ بات یہ نہیں کہ تم اور یہ' بات معیار کی ہے۔ معیار غلط ہے تمہارا۔ میرا معیار یہ ہے انسان جو حق وصداقت کا اعتراف کرتا ہے اور ساتھ ملتا ہے' اس کا مقام اونچا ہے۔ دولت' قوت یہ چیزیں معیار نہیں بن سکتیں۔ لَوۡ تَشۡعُرُوۡنَ (26:113) سمجھے کچھ۔ لیکن دولت اور قوت کا نشہ سمجھنے بھی دے کسی کو۔ یہ آپ نے الفاظ سن لیے حضرتِ نوحؑ کے سلسلے میں قرآن نے جو استعمال کیے اور آ جایئے (6:52) کے اوپر جہاں سے آج کے درس کا

آغاز ہوتا ہے اور دیکھئے وہی الفاظ وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ (6:52) ان کے تقاضے یہ آ رہے ہیں۔ یہ نبی اکرم ﷺ کی اب بات آ گئی ہے۔

ذاتی مفاد سے بالاتر خالصتاً ایمان جیسی متاع گراں کی قدر و قیمت سے سرفراز ہونے والوں کا مقامِ بلند

عزیزانِ من! اور میں نے عرض کیا ہے کہ درمیان میں اس سلسلہ کی کڑی میں' ہر رسول نے یہی کیا اور اس کے ساتھ یہی ہوا۔ قرآن نے آغاز کی بات کی' میں اس کے بعد آخری چیز حضور ﷺ کی وہ سامنے لاتا ہوں۔ کہا کہ ان کا تقاضا یہ ہے لیکن دیکھنا' یہ نہ ہو جائے۔ انہیں نہیں دھتکارنا' یہ متاع بڑی قیمتی ہے۔ کیا خصوصیت ان کی بتائی؟ صبح شام یہ اس خدا کی دعوت کو عام کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد ہے یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ (6:52) اپنا کوئی ذاتی مفاد اس میں نہیں ہے۔ صرف اس مقصد کی تکمیل کے لیے جو خدا نے متعین کیا ہے' یہ یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ غریب سہی' مفلس سہی' نادار سہی' بے کس سہی لیکن دیکھو تو سہی کہ ان کی زندگی کیا ہے؟ صداقت اور خلوص سے اس دعوت پہ لبیک کہا اور اس کے بعد صبح شام اپنی بساط' امکان اور طاقت کے مطابق' اس فکر کو عام کرنے کے لیے' اس پروگرام کی تکمیل کے لیے لگے ہوئے ہیں۔ اور کیا چاہیے۔ باقی رہی وہی بات جو حضرتِ نوحؑ کے زمانے میں تھی کہ یہ کام کاج کیا کرتے ہیں' وہی الفاظ یہاں ہیں مَا عَلَیْکَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِکَ عَلَیْهِمْ مِّنْ شَیْءٍ (6:52) یہ سوال ہی نہیں ہے' یہ کام کاج کیا کرتے ہیں۔ اس کا حساب تمہارے ذمے نہیں ہے۔ تمہارا بھی ذاتی زندگی کا کاروبار کیا ہے' کام کاج کوئی کیا کرتا ہے' انہیں اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سوال نہیں آپس میں' رشتہ ہی کچھ اور ہے۔ لہٰذا فَتَطْرُدَهُمْ فَتَکُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (6:52) اگر تم نے انہیں دھتکار دیا تو تم بھی ظالمین میں سے ہو جاؤ گے۔ وہی ظلم کی تعریف کہ جسے جس مقام پہ ہونا چاہیے' اسے اس مقام پہ نہ رہنے دینا۔ ان کا صحیح مقام یہی ہے السابقون الاولون بلند ترین مقام ہے ان کا۔ دولت معیار نہیں ہے انسان کا ذاتی جوہر معیار ہے۔

نبی اکرم ﷺ اور صحابہ اکرامؓ کی باہمی رفاقت کو ہر لحہ قائم دائم رکھنے کی قرآنی تاکید

معاشرے میں تقسیم کار کی رو سے کوئی کیا کام کرتا ہے' یہ معیار نہیں ہے۔ معیار جوہرِ ذاتی ہے' شرافت ہے' تقویٰ ہے' بلندیٔ کردار ہے' پاکیزگیٔ سیرت ہے۔ یہ ہے معیار۔ یہ تھی وہ جماعت جس کے متعلق نبی اکرم ﷺ کو تاکید کی گئی۔ یہی الفاظ جو ہیں یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ (6:52) ان کو سامنے رکھئے گا۔ پہلے تو یہ پروگرام دیا رسول کو وَ اتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ (18:27) خدا کی طرف سے وحی کی جاتی ہے جو اس کتاب کے اندر ہے اسے تم پیش کرتے چلے جاؤ۔ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِهٖ (18:27) کوئی اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی خدا کے الفاظ میں۔ وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (18:27) اور یاد رکھئے

اس کے علاوہ کہیں کوئی پناہ نہیں مل سکتی کسی کو۔اس کے قانون کی خلاف ورزی کرنے کے بعد کسی اور جگہ پناہ نہیں مل سکتی۔ یہ تو ہوا مشن ایک رسول کا۔اورآ گے فرمایاوَ اصۡبِرۡ نَفۡسَکَ مَعَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَ الۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَہٗ(18:28)وہی الفاظ۔ ان لوگوں کے ساتھ جمے رہو استقامت سے ان کے ساتھ' وابستہ رہو ان کے ساتھ۔رسول سے کہا جا رہا ہے' ان کے ساتھ وابستہ رہو۔ انہیں تو بہرحال یہ کہا ہی گیا تھا کہ اس مرکز کے ساتھ وابستہ رہو۔ یہاں رسول سے کہا جا رہا ہے کہ ان کے ساتھ وابستہ رہو۔ یہ وہ لوگ جو سارا وقت خدا کی اس دعوت کے عام کرنے میں لگے رہتے ہیں' پکارتے ہیں خدا کو۔اور مقصد اپنا کوئی ذاتی نہیں ہے اس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے یہ سب کچھ کرتے ہیں۔وَ لَا تَعۡدُ عَیۡنٰکَ عَنۡہُمۡ تُرِیۡدُ زِیۡنَۃَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (18:28) یہ کبھی بھی نہیں ہونا چاہیے۔ دوسری طرف یہ ٹھیک ہے دنیاوی متاع کے انبار ہیں' دولت ہے' قوت ہے' ان سردارانِ قوم کے پاس' ان قریش کے پاس یہ سب کچھ ہے۔لیکن اس کی کشش و جاذبیت کہیں ایسا نہ کر دے کہ ان کی طرف سے تم آنکھ پھیر لو۔ یہ بڑی متاع ہے صاحب۔

نبوت ﷺ اور صحابہؓ کرامؓ کے باہمی مومنانہ تعلقات کے ثمر نے زمین و آسمان کی قدر و قیمت کو بدل کر رکھ دیا

آپ نے غور فرمایا' وہی معیار جو پہلے دن تھا نبوت کے اس آخری دن بھی وہی معیار پیش کیا جا رہا ہے اور حکم یہ دیا جا رہا ہے کہ ان افراد کے ساتھ' جو دنیا کے معیاروں کے مطابق بالکل غریب ہیں' ناتواں ہیں' کمزور ہیں' تم ان کے ساتھ وابستہ رہو۔یہی وہ جماعت ہے تم دیکھو گے کہ ایک دن' یہ زمین بدل دے گی' یہ آسمان بدل دے گی۔ یہ قرآن کے الفاظ ہیں یَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَیۡرَ الۡاَرۡضِ وَ السَّمٰوٰتُ (14:48) ان کے ساتھ تم جمے رہو۔اس جماعت کی اہمیت' اور آگے چلئے (8:62)۔یہاں تو عزیزانِ من! یہی کہا تھا کہ ان کے ساتھ جمے رہو۔یہاں پہلے کہا ہے فَاِنَّ حَسۡبَکَ اللّٰہُ (8:62) یہ اوپر سے بات چلی آ رہی ہے' یہ جس قدر مخالفین ہیں اور مخالفت کی شدت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ میدانِ جنگ میں سامنے وہ آ گئے ہیں۔ وہاں بھی کہا جا رہا ہے کہ قطعاً مفاہمت نہیں' کوئی Compromise نہیں' کسی قسم کی مصالحت کی بات نہیں' حق سے ذرا نہیں ٹلنا۔شدید ترین مخالفت ہے تو ہوتی رہے حَسۡبَکَ اللّٰہُ (8:62) تیرے لیے خدا کافی ہے۔یہ الفاظ ہیں یہی ان کا ترجمہ اس وقت میں پیش کرتا ہوں۔اب آگے سنئے یہ جو خدا کافی کہا ہے' اسکے ساتھ ہی یہ الفاظ اور ہیں۔ہُوَ الَّذِیۡۤ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِہٖ (8:62) خدا وہ ہے کہ جس نے تیرے لیے اپنی نصرت سے سامانِ تقویت بہم پہنچایا۔بات تو اتنی ہونی چاہیے تھی نا حَسۡبَکَ اللّٰہُ (8:62) کا مفہوم کہ اس نے اپنی نصرت سے تیرے لیے سامانِ تقویت بہم پہنچایا۔ اتنی بات نہیں ہے۔ہُوَ الَّذِیۡۤ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِہٖ وَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ (8:62) تیرے لیے سامانِ تقویت کیا ہے؟ نصرتِ خداوندی اور یہ

جماعتِ مؤمنین۔

نصرتِ خداوندی کے ساتھ جماعت مومنین کی کفایت کا ذکر جسے لازم وملزوم قرار دیا گیا ہے

آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من! یہ تنہا خدا کی نصرت نہیں پھر۔ یہ ٹھیک کہا ہے کہ تیرے لیے خدا کافی ہے لیکن خدا کی کفایت کی شکل یہ ہے' یہ جماعت تیرے ساتھ ہونی چاہیے۔ یہ وہ جماعت ہے کہ جس کے دست وبازو سے خدا کی نصرت کا مظاہرہ ہوگا۔ وہ جو اسی سورۃ میں دوسری جگہ ہے' جنگِ بدر کے دوران میں جو کہا گیا ہے کہ ٹھیک ہے ان کی شمشیریں دشمنوں کے سر قلم کر رہی تھیں کہا کہ یہ نہیں انہیں قتل کر رہے تھے' خدا خود قتل کر رہا تھا۔

جنگ بدر میں رسول اکرم ﷺ کی طرف سے تیراندازی کو خدا تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کرلیا

اور جو آگے کہا ہے کہ تو تیر نہیں چلا رہا تھا' ہم تیر چلا رہے تھے۔ وہ تو اس طرح سے دو قوسین میں ایک تیر مل جاتا ہے جب یہ جماعت ساتھ ہوتی ہے تو۔ یہ جماعت ہوتی ہے کہ جس کے دست وبازو سے خدا کی تائید ونصرت ایک عملی شکل اختیار کرتی ہے۔ یہ نصرت خدا کی جسے میں نے بار بار کہا قرآن بھی یہ کہہ رہا ہے' یہ کیا چیز ہے؟ اسی جماعتِ مؤمنین کے ایمان کی یہ قوت اس صداقت کے اوپر جو یقین ہے اور اس صداقت کی خاطر مر مٹنے کا جو عزم ہے یہ ہے خدا کی نصرت اور تقویت جو اس شکل میں سامنے آتی ہے۔ قوانینِ خداوندی کے اوپر کامل اعتماد اور اس کے بعد ان کو بلند رکھنے کے لیے جان تک دیدینے کا عزمِ راسخ۔ یہ ہے جو خدا کی نصرت اور تائید کا مظہر بنتی ہے۔ اسی لیے پہلے کہا حَسْبَکَ اللّٰہ اور اس نے کہا هُوَ الَّذِیْۤ اَیَّدَکَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ (8:62)

مومن کی زندگی کے خدوخال باہمی قلبی رفاقت جسے دو بادلوں کا ملاپ ہوتا ہے

اب ان مؤمنین کی ذرا خصوصیت ملاحظہ فرمایئے کہ یہ کس قسم کے مومن تھے۔ وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ (8:63) دو لفظوں میں عزیزانِ من! جماعت اور انبوہ کا فرق کر کے بتا دیا۔ ایک اجتماع ایسا بھی جس کے متعلق قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے تَحْسَبُهُمْ جَمِیْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰی (59:14) تو یہ سمجھے گا کہ یہ ایک اجتماع یہ جماعت ہے ایک' نہیں! یہ یونہی کچھ افراد مل کے ایک جگہ بیٹھ گئے ہیں' ان کے دل ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ایک یہ چیز ہے جو قرآن نے بتائی کہ اس قسم کے بھی اجتماعات ہوتے ہیں وہاں Heads گنے جاتے ہیں' سروں کا شمار ہوتا ہے دلوں کا شمار نہیں ہوتا' گنتی ہوتی ہے۔ وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰی (59:14) اور ان کے دل ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ ہوتے ہیں۔ کہا ایک تو وہ ہوتا ہے۔ اور یہ ایک جماعتِ مؤمنین ہے کہ وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ (8:63) ان کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ جڑنا جو ہے یہ بھی کچھ صحیح مفہوم نہیں پیدا کرتا۔ جڑنے میں بھی تو دو چیزیں یوں الگ الگ یونہی کسی

شے سے پیوست ہوتی ہیں۔عرب اس کو استعمال کیا کرتے تھے' یہ ایک بادل کا ٹکڑا آ کے جس شکل میں دوسرے بادل کے اندر مدغم ہو جاتا ہے' وہاں یہ لفظ آیا کرتا تھا۔ یہ ہے الفت' یہ ہے جماعتِ مؤمنین کی خصوصیت۔اس طرح سے ایک دوسرے کے اندر پیوست و جذب ہو جانا۔کیا قوم تھی یہ' کس قدر عمدہ ان کی تشبیہات تھیں اور کہاں یہ لفظ استعمال کیا کرتے تھے!!۔میں سمجھتا ہوں اس سے بہتر ذہن میں نہیں آ سکتا کوئی اور سمجھانے کا طریقہ کہ بادل کا ٹکڑا دوسرے بادل کے ٹکڑے میں چلا جائے۔یہ ٹھیک ہے کہ غالب نے 'عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا' کہا تھا۔لیکن یہاں وہ فنا نہیں ہو جاتا' یہ قطرے کی عشرت دریا میں فنا ہو جانے والی بات ہے' وہ یہ بات نہیں ہوتی۔ وہاں ان کا تشخص قائم رہتا ہے لیکن گھل مل اس طرح سے جاتے ہیں' تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری' یہ جو کیفیت ہے کہ تشخص بھی قائم رہتا ہے اپنا' وجود بھی قائم رہتا ہے اور یوں ملنا آپس میں' یہ ہے اَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ(8:63).

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

وَ اَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ (8:63)

زندگی میں دو دلوں کا آپس میں گھل مل جانا' باہمی رفاقت کی یہ انتہا بہت بڑی متاع ہے

یہ کتنی بڑی چیز تھی۔فرمایا کہ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ (8:63) اگر تو ساری دنیا کی دولت صرف کر کے چاہتا کہ یہ جنسِ گراں مایہ کہیں سے خرید کے لے آؤں' یہ دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوست کرنے کی چیز' تو نہیں کر سکتا تھا۔ساری دنیا کی دولت دے کے بھی یہ خریدی نہیں جا سکتی' بکتی نہیں ہے یہ متاع کہیں دنیا کے اندر' یہ تو خود اندر سے پیدا کی جاتی ہے' تو نہیں کر سکتا تھا۔وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ (8:63) یہ چیز صرف خدا کر سکتا تھا۔خدا نے کیسے یہ کیا تھا فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا (3:103) یہ جو نعمتِ خداوندی' یہ جو قرآن دیا تھا' اس کی رو سے تم ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہو گئے۔یہ آپس کا رشتہ جو تھا' یہ ہے' جسے قرآن کا رشتہ اس نے کہا ہے' اس نے آپس میں تمہارے دلوں کو ملایا اخوت پیدا کی تمہارے ساتھ۔اور اس لیے یہ کہا کہ خدا کر سکتا تھا کہ انسانی تدبیریں یہ کچھ نہیں کر سکتیں' یہ صرف خدا کے دیے ہوئے معیار' اصول' ہدایت' تعلیم' قوانین' اقدار ہیں کہ جس وقت دو فرد ان کے اوپر عمل پیرا ہوتے ہیں تو ان کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

اسلام میں ایمان کا اشتراک ہی قومیت کا مدار ہے جس کی بنیاد پر پھر ذرے چٹان بن جاتے ہیں

اسے کہتے ہیں ایمان کا اشتراک اور یہی ہے قومیت کا مدار اسلام میں۔اب آپ سوچتے ہیں کہ جو قوم اس طرح سے وجود میں آئے گی اس قوم کی کیفیت کیا ہوگی۔وہ ذرے چٹان بن جائیں گے' وہ قطرے دریا بن جائیں گے۔مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ

اَلَّفَ بَیۡنَہُمۡ اِنَّہٗ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ (8:63) غلبے سے ہی نہیں اس کے ساتھ حکمت بھی ہے۔اس طرح سے اس نے یہ تالیف کی۔اور پھر آگے دہرایا! یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ حَسۡبُکَ اللّٰہُ وَ مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ(8:64) اب سمجھ رکھوا ے نبی تیرے لیے' بات تو اوپر یہ تھی نا خدا کافی ہے اور بات بھی ٹھیک ہے جب کہہ دیا جائے خدا کافی ہے تو اور کیا۔لیکن وضاحت کے لیے کہ کتنی اہمیت ہے اس جماعت کی۔کہا تیرے لیے خدا اور یہ جماعتِ مؤمنین' یہ کافی ہیں۔قوانینِ خداوندی کا اتباع اور اس جماعت کی رفاقت بس یہ دو چیزیں حاصل رہیں گی پھر دنیا کی کوئی قوت تم پر غلبہ نہیں پا سکتی۔غور فرمایا عزیزانِ من! اہمیت کتنی ہے اس جماعت کی۔اور جیسا میں نے عرض کیا کہ یہ جماعت یونہی دو آنے کی ممبری کے فارم پہ دستخط کرنے سے جماعت نہیں یہ بن گئی تھی۔

کسی پروگرام کے تحت جماعت کا بن جانا عملِ تزمیل کا رہینِ منت ہوتا ہے

وہ سیاسی پارٹیاں تو بنتی ہیں۔ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ(2:129) اس قدر لمبا تھا یہ پروگرام تعلیم کتاب و حکمت اور پھر ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما دینا۔رسول کے ذمے یہ تھا یوں یہ جماعت بنی تھی' یوں عملِ تزمیل نے ایک محسوس شکل اختیار کی تھی۔اس طرح سے ایک ایک فرد کئی سال کے عرصے میں۔کئی سال کا عرصہ ایک عام فرد کی زندگی کا نہیں نبوت کا تیرہ سال کا عرصہ' تیئس سال کی نبوت کی ساری زندگی' نبی بھی آخری نبی جس کے بعد پھر کوئی نبی آنا نہیں۔تیئس سال کی نبوت کی زندگی جو آخری نبوت ہے اس میں سے تیرہ برس اس عملِ تزمیل میں گذر گئے' اس جماعت سازی میں گذر گئے۔ ماحصل: تین سو کے قریب افراد۔بظاہر عام معیاروں کے مطابق کچھ ایسی کامیابی نہیں۔اس لیے کہ کامیابی تو یہاں Voting strength سے ہوتی ہے۔لیکن یہ جو تین سو تیرہ تھے پھر آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے کیا کچھ کر کے دکھا دیا۔اس طرح سے یہ جماعت بنتی ہے۔

جماعت کا امیر ہونا کئی قسم کی ذمہ داریوں کو اپنے اوپر فرض قرار دینا ہے

اس جماعت بنانے والے کا فریضہ: پروگرام کی ابتدائی سٹیج ہے' ہر طرف خطرات ہی خطرات ہیں' ہر طرف سے خطرات ہی خطرات ہیں۔اب یہ جو جماعت بنانے والا صرف معلم نہیں ہے کہ تعلیمِ کتاب وحکمت دی اور معاملہ ختم ہوا۔بالکل نہیں۔ابتدائی سٹیج کی ذرا سی ایک تمثیلی شکل سامنے لائیے تو قرآن کا لفظ جو ہے اس کا مفہوم سمجھ میں آ جائے گا۔مرغی کے بچے پہلے دن' دو دن کے' چار دن کے' دس دن کے' وہ ان کو ساتھ لیے لیے پھرتی ہے' کٹ کٹ کٹ کٹ کٹ کٹ دانہ دنکے کی تلاش میں۔یہ تو ان کی پرورش ہو گئی۔کچھ ان کو سکھاتی ہے پھر ان کی پرورش کرتی ہے۔بلا تمثیل کہہ لیجیے یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ (2:129) اس کے بعد کرتی کیا ہے؟ جونہی کسی چیل کا سایہ اُدھر سے گذرا ایک سیکنڈ میں سارے بچوں کو اپنے پروں کے نیچے لے لیتی ہے۔اس قسم کی Protection۔اس Protection کے اندر آپ دیکھتے ہیں کہ ماں کی سی محبت کی لطافت بھی شامل ہے۔شیلڈ تو ہے یہ' لوہے کی نہیں ہے۔اور اس میں

بڑی چیز یہ ہے کہ اگر کوئی خطرہ آنے والا ہے تو یہ مرغی کیا کہتی ہے؟ پہلے مجھ پہ آئے پھر ان کے اوپر آئے۔ بڑی چیز ہے یہ۔ خطرہ اس کے سامنے ہوتا ہے لیکن اس خطرے میں انہیں وہ اپنے پروں کے نیچے لیتی ہے کہ مجھ پہ آئے پہلے آفت' یہ محفوظ ہو جائیں۔ قرآن کہتا ہے اے رسول! وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ (15:88) خطرات کے وقت اس جماعت کو اپنے پروں کے نیچے لے لیا کر جیسے مرغی بچوں کو پروں کے نیچے لے لیتی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں تعلق عزیزانِ من! Leader کا اور Followers کا۔ قدم قدم کے اوپر ان کی تعلیم کرتا چلا جا رہا ہے' قدم قدم کے اوپر ان کی صلاحیتوں کی نشو ونما کرتا چلا جاتا ہے۔ اور جب کہیں سے خطرہ آتا ہے تو سب سے پہلے ان کے سامنے شیلڈ بن جاتا ہے کہ مجھ پہ یہ پہلا وار ہو' یہ بچ جائیں کسی طرح سے۔ اللہ اکبر۔

نبی اکرمﷺ کے تحفظ کی خاطر صحابہ کرام کا کردار

اس طرح کا جو لیڈر ہوتا ہے پھر اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ احد کے میدان میں جب یہ خطرہ آیا اور اس کے اوپر وہ خطرہ آیا جس نے ان کو اس طرح سے پروں کے نیچے دیا تھا۔ فی الواقعہ صحابہؓ کی جماعت پروں کی طرح سے گرد جمع ہوگئی۔ سوانح نگار لکھتے ہیں کہ وہ ان کی پشت کے اوپر جو دوسروں کے تیر آتے تھے تو دور سے یہ شہد کا چھتہ نظر آتے تھے۔ یوں بچا رہے تھے اسے۔ یہ تعلق کیوں پیدا ہوا تھا؟ اس لیے کہ انہوں نے دیکھا تھا کہ یہ خطرے کے وقت جب ہم چھوٹے چھوٹے چوزے تھے (تمثیل میں) تو یہ کس طرح سے ہماری حفاظت کرتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ آج اس کی حفاظت میں ہماری حفاظت ہے۔ یہ باہمی تعلق تھے ان کے۔ یہ ہے وہ جماعت' یہ ہے جماعت کا وہ لیڈر۔ ان دونوں کا ساتھ ہونا لازم وملزوم ہے۔ اور ان دونوں کا وہ ساتھ ہونا ہے جیسے سورۃ الفتح کی اس آیۂ جلیلہ میں یوں تو قرآن کی کونسی آیت ہے جو آیۂ جلیلہ نہیں ہے۔ بعض آیات کا بہرحال جو قلب پہ زیادہ اثر ہوتا ہے تو اس کے لیے یہ الفاظ آجاتے ہیں سامنے۔ مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے یوں نہ کہیے کہ میں محسوس طور پہ یہ کہہ رہا ہوں کہ خدا اس طرح تھا' نبی اکرمﷺ اور حضورﷺ کی معیت میں یہ جو جماعتِ مؤمنین اس طرح یہ شمع اور پروانوں کی کیفیت تھی اور پھر جس طرح سے کہ انہوں نے خدا کے اس پروگرام کی تکمیل کے لیے' جن سرفروشیوں' جاں سپاریوں' سے کام لیا ہے اور اس کے بعد جب یہ کامیابی محسوس شکل میں سامنے آنی شروع ہوئی ہے' اس آیۂ جلیلہ کو جب بھی میں دیکھتا ہوں یوں نظر آتا ہے کہ نگاہِ خداوندی نے جب یہ دیا تو ایک رقص میں جھوم اٹھا ہے وہ خدا بھی کہتا ہے۔

قرآنی آیات کا ترجمہ کرنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے پھول کی پتیوں کو ہاتھوں میں مسَل دیا جائے

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (48:29) ان کے معنی بیان کرنا ایسی کوشش ہے جیسے خوشبو کی تلاش

میں پھول کی پتی کو مسل کے رکھ دیا جائے۔ کیسے اس میں سے خوشبو نکال کے بتادی جائے۔

نبوت کے آخری تاج دار ﷺ اور آپ کے ہم سفر رفیقوں کی رفاقت دلوں کو گرما دینے والی تصویر کشی

عزیزانِ من! کیا چیز ہے جو کہی گئی ہے؟ محمد اللہ کا رسول اور یہ جماعت جو اس کے ساتھ ہے۔ کیفیت ان کی کیا ہے؟ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ (48:29) دشمنوں کے مقابلے میں ایک چٹان کی مانند کھڑے ہوئے ہیں آپس میں ریشم کی طرح نرم۔ کیا کیفیت ہے!! ایک ہی فرد کی ایک ہی جماعت کی یہ دو متضاد کیفیتیں کہ وہ ایک سنگین حصار بھی بن جائے ریشم کی طرح نرم بھی ہو۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

یہ ہے مسلمان کی تعریف: اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ (48:29)۔ دوسری جگہ اس نے یہ کہا ہے کہ

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہوجا
گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہوجا

مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ (48:29)۔ اب دیکھ رہے ہیں کیسے جھوم جھوم کے کہہ رہا ہے۔ تَرٰىہُمۡ کہا ذرا دیکھا تم نے۔ انداز دیکھئے بات کہنے کا ارے! ذرا دیکھا تم نے۔ پتہ نہیں کن سے کہہ رہا ہوگا۔ ان فرشتوں سے کہہ رہا ہوگا کہ جب خدا کے پروگرام میں پہلے آدم کی نمود ہوئی تو انہوں نے کن اکھیوں سے ایک دوسرے سے کہا کہ اس کے تو ہیولے اور خمیر کے اندر ہم آگ کی چنگاریاں اور خون کے چھینٹے دیکھ رہے ہیں۔ اور کہا تھا کہ اے بارِ الٰہا! کسے زمین کے اندر تو خلیفہ بنا رہا ہے وَ نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ (2:30) تم دیکھتے نہیں ہو کہ ہم تیری تسبیحاں پھیرتے رہتے ہیں تقدیس بیان کرتے رہتے ہیں۔

قصہ آدم کی وہ کہانی جو قرآن حکیم نے تمثیلی اور حکیمانہ انداز میں بیان کی ہے اس کا تعارف

اس وقت تو اس نے یہ کہہ کے ان کو ٹال دیا' ٹال نہیں دیا جواب ایسا دیا کہ جس کی تفصیل بعد میں آ کے تاریخ نے کرنی تھی کہ ہم جانتے ہیں اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ (2:30) ہم جانتے ہیں تم نہیں جانتے۔ معاف رکھئے گا پھر تاریخِ انسانیت جن ادوار سے گذری ان میں تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ وہ پھر فرشتے ایک دوسرے سے تو کہتے ہونگے کہ دیکھئے صاحب! ہمیں تو یہ کہہ خاموش کر دیا تھا' اب

دیکھئے خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں، آگ کی خندقیں کھولی جا رہی ہیں۔ ساری تاریخ یوں نظر آتی ہے ہمیں۔لیکن اسی تاریخ میں پھر یہ دور بھی آتا ہے اور یہ جماعت بھی سامنے آتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ تھی وہ جماعت اور یہ ان کی کیفیت تھی جس کے لیے تَرٰھُم ان فرشتوں سے کہا گیا ہوگا کہ ہاں! تم نے اس دن یہ اعتراض کیا تھا اور ہم نے کہا تھا کہ ہم جانتے ہیں تم نہیں جانتے۔ دیکھ لو اپنی آنکھوں سے اسی آدم سے اس جماعت کی بھی نمود ہونی تھی یہ تھا ہمارا پروگرام۔ تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا (48:29) تو دیکھے گا خدا کے قوانین کی اطاعت میں کبھی تمہیدی طور پہ ہے تو اتنا سا جھکنا ہے، آخری منزل ہے تو پورا سر و تسلیم خم کر جانا ہے، ہتھیلیوں پہ سر لیے ہوئے میدانِ جنگ میں نکل آتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہے۔ اور کوئی ذاتی مفاد نہیں کوئی اپنی خواہشِ نفس نہیں، صرف اس کے پروگرام سے ہم آہنگی، اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔

انسانی اعمال کا سارا دارومدار اس کے اپنے خیالات و تصورات پر منطبق ہوتا ہے

سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (48:29) یہ جو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنا ہے بڑی عجیب چیز عزیزانِ من! کہہ گیا ہے اگر وقت ہوتا یا میں سمجھتا ہوں اس ایک آیت کے اوپر تو کتنے درس چاہئیں، جو کچھ یہ کہہ گیا ہے۔ سائیکولوجی میں ایک چیز ہے جسے Parallelism کہتے ہیں کہ انسان کے خیالات، ارادے، نیتیں، دل میں جو کچھ گذرتا ہے، وہ تو غیر محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اس کا مظاہرہ انسان کے جسم کی حرکات سے، اس کی علامات سے ہو جاتا ہے یہ دونوں چیزیں Parallel چلتی ہیں، متوازی چلتی ہیں۔ جب کوئی سامنے آتا ہے اور سلام علیکم کہے، احترام کا جذبہ آپ کے دل میں نمود ہو، بے اختیار ہاتھ ماتھے، پہ تبسم لب پہ غیر شعوری طور پہ۔ یہ ہوتا ہے، بیک وقت ہوتا ہے۔ جب آپ ہاں کرتے ہیں اچھی بات، جب آپ نہ کرتے ہیں، نہیں بھئی! میں نہیں جا رہا۔ اسے کہتے ہیں دل کے خیالات کا اثر جسم کی حرکات پر اور چہرے کے آثار۔

قانون خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے نتیجہ میں چہروں کی بشاشت سکون قلب کی ترجمانی کو واضح کر دیتی ہے

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس کو ندامت ہو دل کے اندر، زبان سے کچھ نہ کہے، چہرہ بتا دیتا ہے اس کا کہ نادم ہے۔ اور دوسری شکل وہ Brazen Faced جس کو کہتے ہیں ندامت ہی نہیں، کوئی شرم ہی نہیں، چہرہ بتا رہا ہوتا ہے کہ کوئی احساس ہی اس کو نہیں۔ خوشی کے احساسات آپ دیکھتے ہیں چہرے کے خدوخال سے چھلکتی نظر آ جاتی ہے آپ کو یہ خوشی۔ قرآن جو کہتا ہے عام ترجمہ اس کا کیا جاتا ہے کہ سجدوں کے اثرات ان کے چہروں پہ ہوتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ نماز سے جو کٹھا پڑ جاتا ہے یہ اس سے مقصد ہے۔ بہرحال جو اس کو یوں

مجاز کے معنوں میں لے' یوں سمجھ لے۔لیکن بات تو قرآن بڑی گہری کہہ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دل کی رضا مندی سے جو قوانینِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں یا جھکتے ہیں' ان کے آثار ان کے نورانی چہروں سے نظر آجاتے ہیں۔

قرآنِ حکیم تو ایک سجدے اور دوسرے سجدے کے بنیادی فرق کو واضح کرتا ہے

واقعی عزیزانِ من! سچا دیانتدار پرخلوص انسان جسے اطمینانِ قلب نصیب ہو' اس کے چہرے سے نظر آجاتا ہے کہ اس کی کیفیت کیا ہے۔جہنم کی آگ میں جس کا دل مضطرب اور بیقرار ہو' بظاہر اسے دنیا کی ساری آسائشیں اور ستائشیں کیوں نہ میسر ہوں' چہرہ بتا رہا ہوتا ہے کہ کس جہنم میں سے یہ گذر رہا ہے۔ یہ چہرے کے آثار نفسیاتی طور پہ بڑی چیز ہوتے ہیں۔اور یہی چیز ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ اس دن یہ باتیں تو سمجھانے کی ہیں۔تمہارے اعمال نامے کھولے جائیں گے' میزانیں کھڑی کی جائیں گی یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیمٰهُمْ (55:41) مجرم تو اپنی پیشانیوں سے پہچانا جاتا ہے۔مجرم پہچانا جاتا ہے۔اور یہ بھی کہا کہ سِیمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (48:29) یہ جو جھکے ہیں ان قوانین پہ۔ایک تو جھکنا Mechanical ہوتا ہے اس کا کوئی اثر چہرے پہ مرتب نہیں ہوتا' وہ نفسیاتی کیفیت نہیں ہوتی' وہ خارج سے عائد کردہ ایک چیز ہوتی ہے جس کی آپ تعمیل کرتے ہیں۔تھانیدار اگر آپ سے کہتا ہے کہ تھانے آیئے' جاتے ہیں آپ تعمیل کرتے ہیں۔کیا آپ کے چہرے پہ نورانیت پھیل رہی ہوتی ہے اس وقت؟ یہ بات نہیں۔لیکن اپنے دل کی رضا مندی سے اطمینان سے اسی طرح سے جب اس سے آپ کہیں جاتے ہیں دوست کے ہاں جاتے ہیں' ملنے کے لیئے چہرے کی کیفیت اور ہوتی ہے۔عجیب بات یہ کہہ گیا ہے۔اس لیے کہ وہ رضوان اللہ کے لیئے خارج سے عائد کردہ کوئی پابندیاں نہیں ہیں کہ جن کو یہ اس طرح سے پورا کررہے ہیں' دل سے اٹھنے والی ان کی رضا مندیاں ہیں جن کی وجہ سے یہ کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے ان کے آثار تو ان کے چہرے سے نمودار ہوتے ہیں۔یوں پہچانی جاتی ہے یہ جماعت۔ دیکھ رہے ہیں کہ کس وجدِ مسرت سے اللہ تعالیٰ یہ بیان کررہا ہے ان کو۔ذٰلِکَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ (48:29) نئی بات نہیں ہے ہر دور میں ہر نبی کے ہاں یہ جماعت پیدا ہوتی ہے۔اس لیے یہ جتنی چیزیں ہم نے بیان کی ہیں اگر انجیل وتورات تمہارے سامنے اپنی اصلی شکل میں ہوتی تو یہ کچھ اس میں بھی تمہیں نظر آتا۔نئی بات نہیں ہے۔

انسان کی نیک عملی کا پھل بڑا ہی مسرور کن ہوتا ہے

جب اور جہاں بھی انبیائے کرامؑ کی تعلیم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ایک جماعت وجود میں آئی ہے' اس کی یہی کیفیت تھی۔ کہا اس جماعت کی کیفیت کیا ہے؟ اب سنئے وہ جو میں نے کہا تھا کہ جس طرح سے کسان بیج بونے کے بعد ہر روز کھیتوں میں جاتا ہے پھر جب اس کے بعد پہلی کونپل پھوٹتی ہے اس کسان کی خوشی کا تو ہم یہاں اندازہ نہیں لگاتے۔ جو یہ اپنے گھروں میں چھوٹے چھوٹے

Gardening وغیرہ کرتے ہیں وہ اس کیفیت سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں کہ جب وہ بویا ہوا بیج پہلی سوئی نکالتا ہے۔ پھر اس کے بعد وہ روز دیکھتا ہے آ کے اس کو' ذرا وہ بڑھا پھر ذرا سا اور بڑھا اونچا ہوا ''ہُن ایہدے اچ بور آیا'' پھول لگا پھل لگا پھل پکا۔ ہر روز کیفیت اس کی باغبان کی آپ دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتی ہے۔

کائنات کے ذرے ذرے میں غیر محسوس طور پر ہر آن رونما ہونے والے تغیر کی نوعیت حیران کن ہے

پھر اس میں ایک چیز جو مثال قرآن دیتا ہے بڑی لطیف مثال ہے۔ یہ سارا کچھ غیر محسوس طور پر ہو رہا ہے۔ یعنی اس کی جو ترقی یا Progress کی شکل ہے' وہ تو آپ کے سامنے آتی ہے۔ یہ ہو کیسے رہا ہے بڑی سے بڑی باریک بین نگاہ بھی نہیں دیکھ سکتی عزیزانِ من! سارا دن چوبیس گھنٹے پودے کے کنارے بیٹھے رہیے آپ کبھی نہیں محسوس کر سکتے کہ یہ بڑھتا کس طرح سے ہے اور کب بڑھتا ہے۔ پودا تو ایک طرف بچوں کا نہیں پتہ چلتا۔ روز سامنے ہوتے ہیں بالکل نہیں پتہ چلتا۔ کوئی برس کے بعد آنے والا مہمان کہتا ہے آ کے ''ایئوں نئیں سیانیاں میں' کون اے کہن لگے اے رانی اے نا چھوٹی' اوئے اوئے ایہڈی وڈی ہوگئی اے''۔ یعنی ہمیں کبھی احساس نہیں ہوتا کہ یہ اتنی بڑی ہوگئی ہے' وہ نمایاں ہوتا ہے جو دیر سے دیکھتا ہے۔ یہ جو روز دیکھنے والا ہے اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ بڑھتا پھولتا کیسے ہے۔

قرآنی معاشرے میں جماعتِ مومنین کی سوچ کو بڑی مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جاتا ہے

یہ ہے نظامِ خداوندی اپنی ابتدائی Stages کے اندر۔ بڑھ رہا ہوتا ہے' نشوونما پا رہا ہوتا ہے' اتنی غیر محسوس طریق کے اوپر Progress ہوتی ہے' نظر نہیں آتی۔ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ (48:29) اس ننھے سے بیج میں سے پہلی سوئی جب نکلتی ہے اسکی یہ نکلی فَاٰزَرَهٗ (48:29) پھر وہ ذرا سی بڑھی فَاسْتَغْلَظَ (48:29) پھر وہ ذرا مضبوط ہوئی' ڈنٹھل اس کا ذرا سا موٹا ہوا' بوجھ سہارنے کے قابل ہوگئی۔ خارج کے بوجھ نہیں وہ جو اپنی سٹوں کے اوپر لگنے تھے اس کے' وہ جو خوشے لگنے تھے' خوشوں کا بھی تو اپنا بوجھ ہوتا ہے۔ اس قابل بناتا ہے خدا اس کو' اس کا نظام کہ خود اپنی ہی ترقیوں کے جو پھل ہوتے ہیں ان کو سہارنے کے لیے بھی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جو اوچھا پن پیدا ہو جاتا ہے نو دولتیوں میں' یہ ہوتا کیا ہے؟ یہ اس فصل کا جو ڈنٹھل ہوتا ہے نا وہ مضبوط نہیں ہوتا ''سٹے بہت سارے لگ جاندے ہیگے نیں' دوئے دن ایووں ہویا ہویا ہوندا اے''۔ نئی فصل کی جو خوبی بتاتے ہیں وہ یہ کہ ٹھیک ہے صاحب! جھاڑ بہت دیتی ہے سٹہ بڑا ہوتا ہے اس کے ساتھ یہ کہ ڈنٹھل بڑا مضبوط ہے اس کا۔ میکسکو پاک (گندم) میں یہ بتایا جاتا ہے۔ جب کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ فصل تو بڑی تھی یہ ہوا کیا یہ ساری کی ساری ڈھیر ہوگئی؟ وہ کہتے یہ ہیں کہ اس کا ڈنٹھل کمزور رہ گیا تھا۔

نظام خداوندی کا ہر شعبہ نہایت مستحکم بنیادوں پر استوار ہوتا ہے اور اس نظام کی نسبت کسی نبی سے نہیں ہوتی

نظامِ خداوندی وہ ہے کہ اس انداز سے وہ اس جماعت کو تیار کرتا ہے کہ جب اتنی بھرپور اور پر فصل آئے سٹے لگیں تو ان کا ڈنٹھل اتنا

مضبوط ہوتا ہے کہ وہ پھر اپنے بوجھ سے گرتا نہیں ہے' اس بوجھ کو سنبھال لیتا ہے۔ دیکھتے ہیں میں نے عرض کیا تھا کہ ایک ایک لفظ پھر ایک ایک درس دیا جاسکتا ہے۔ ایک مثال دی ہے قرآن نے' مثال دینے والا تو خدا ہے عزیزانِ من! فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ (48:29) یوں کھڑی ہوگئی یہ کھیتی اپنے اس ڈنٹھل کے اوپر تنی ہوئی' خوشوں سے بھری ہوئی۔ کل ہی ابھی اس نے ننھی سی سوئی نکالی تھی' کس طرح سے آج بھرپور فصل اس میں آ گئی۔ اور وہ جو میں نے کہا تھا کہ وجدِ مسرت میں گویا جھوم اٹھتا ہے یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (48:29) کسان اس کو دیکھ کر وجد میں آ جاتا ہے۔ کون تھا کسان اس کھیتی کا؟ خود باری تعالیٰ پروگرام تھا خدا کا جس کی تکمیل یہ ہو رہی تھی۔ اسی لیے قرآن نے اس کو ہمیشہ دین اللہ کہا ہے۔ عجیب چیز آپ دیکھیں گے' یہ رسول کتنے آئے انہوں نے دین پیش کیا' سارے قرآن میں کہیں ان رسولوں کی طرف نسبت دین کی نہیں کی دینِ محمدی ﷺ نہیں آیا' دینِ ابراہیمؑ نہیں آیا' دینِ موسیٰؑ نہیں کہیں آیا' دین اللہ آیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب یہ دین پیش کرتے تھے تو اس کو کہتے تھے کہ یہ میرا دین ہے یعنی میں نے اسے قبول کیا ہے۔

دین صرف خدا تعالیٰ کی ذات کے لیے ہی مخصوص ہے لہٰذا اسی بنا پر اسے دین اللہ کہتے ہیں

کوئی قوم جب دین قبول کرتی تھی تو وہ کہتی تھی ہمارا دین یہ ہے۔ لیکن درحقیقت وہ دین خدا کا ہوتا ہے جو یہ قبول کرتے ہیں۔ تو یہ جتنی بھی اس میں نشوونما ہوئی ہے اس کھیتی میں' یہ کس کی کھیتی تھی؟ یہ خود خدا کی کھیتی تھی۔ کاہے کے لیے اس نے اگائی تھی؟ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1) وہ جو ربوبیتِ عالمینی کا ذمہ لیا تھا اس نے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (6:151) تمہیں بھی ہم رزق دیں گے اور تمہاری اولاد کو بھی۔ اس پروگرام کی تکمیل کے لیے یہ فصل اگی تھی۔ اس لیے یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (48:29) کسان دیکھ کر اس کو باغ باغ ہو جاتا ہے۔ کسان کی یہ کیفیت ہوتی ہے لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (48:29) اور یہ جو اس کے مخالفت کرنے والے تھے' ان کی چھاتی پہ مونگ دلے جاتے ہیں۔ کہا یہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ۔ یہاں تک تو بات یہ تھی جیسے اس جماعت کے متعلق ایک ذکر ہو رہا ہے۔ ٹھیک ہے ذکر بھی اس جماعت کا تھا۔ کہا کہ یہ بعد میں آنے والے پھر اس الجھاؤ میں نہ پڑ جائیں کہ صاحب ان کا کیا ہے رسول اللہ ﷺ خدا کے رسول' صحابہؓ حضور ﷺ کے صحابہؓ۔ اب کون ہے صاحب! جو عمرؓ اور ابوبکرؓ ہو جائے۔ اب کون ہے جو ان کی مثال پیش کرے۔ وہ ان کے ساتھ باتیں تھیں' وہ ہو گئیں ''اسی تے جی اسی ہوئے نافیر''۔ یعنی یہ ذہن میں پیدا ہو جائے کہ یہ چیز مقید تھی کسی خاص زمان و مکان سے' محدود تھی کسی خاص قوم اور کسی خاص امت تک' بالکل نہیں۔

قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ صحابہ اکرام جنہوں نے ہجرت کی اور جنہوں نے انہیں پناہ دی وہ سب کے سب مومن حقا ہے

عزیزانِ من! قرآن ہے۔ بات ان کی صرف کرر ہا ہے۔ آگے کہا ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (48:29) یہ بات تو ایمان اور اعمالِ صالح کا نتیجہ تھی۔ نوعِ انسانی میں سے جو بھی یہ چیز اختیار کرے گا اس کے ساتھ یہ وعدے کیے ہیں اس نے، یہی نتیجہ نکلے گا۔ زراعت کا قانون غیر متبدل ہے۔ اچھی زمین ہو، عمدہ بیج ہو، صحیح پانی ملے، نشوونما ہو، روشنی ہو، حرارت ہو، پانی ہو، دیکھ بھال ہو یقیناً اسی قسم کا پھل دے گی، ہر دور میں پھل دے گی بشرطیکہ یہ شرطیں پوری ہوں۔ بہرحال یہ جماعت تھی محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کی۔ یہ وہ جماعت تھی عزیزانِ من! ظاہر ہے کہ رسول کے ہاتھوں کی پروردہ۔ خود خدا اس جماعت کے متعلق یہ کچھ کہہ رہا ہے۔ اس جماعت کے پکے اور سچے مومن ہونے میں کسی کو کلام ہوسکتا ہے۔ یہ جماعتِ مؤمنین، دو گروہوں پر مشتمل ہے۔ ایک وہ تھے جو مکے سے ہجرت کر کے مدینے آ گئے تو مہاجرین تھے۔ اہلِ مدینہ تھے یہاں کے مسلمان جنہوں نے انہیں پناہ دی، یہ انصار کہلاتے تھے۔ انہی دونوں گروہوں کے اوپر اس وقت یہ جماعتِ مؤمنین مشتمل تھی۔ سنئے قرآن کی شہادت عزیزانِ من! وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا (8:74) یہ جو ایمان لائے انہوں نے ہجرت کی جہاد کیے اللہ کی راہ میں اور یہ کہ جنہوں نے ان بے گھر خانماں خراب آنے والے قافلوں کو پناہ دی، یہ دونوں جماعتیں مہاجرین اور انصار۔ غور سے سنیے عزیزانِ من! خدا کی شہادت۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا (8:74) یہ ہیں مومنِ حقا، پکے سچے مومن۔ سارے مہاجرین تمام انصار بلا استثنا، قرآن کہتا ہے مومنِ حقا ہیں۔ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (8:74) ان کے لیے مغفرت ہے ان کے لیے رزقِ کریم ہے، یہ مومنِ حقا ہیں۔ خدا کی شہادت عزیزانِ من! کسی کا استثنا اس کے اندر نہیں ہے۔ یہی سارے کے سارے تو یہ تھے۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے ان کے متعلق۔ دوسری جگہ قرآن کہہ رہا ہے ان کے متعلق۔ وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ (9:100) سبقت کرنے والے سابقون الاولون مہاجرین میں انصار میں Pioneer جو ان کے اندر ہیں، پہل کرنے والے وہ بھی اور وہ بھی جنہوں نے پھر حسنِ عمل سے ان کا اتباع کیا، اسی طرح وہ بھی آتے چلے گئے۔ یہ سارے کے سارے رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ (9:100) خدا ان سے راضی ہو گیا وہ خدا سے راضی ہو گئے۔ کتنا بڑا Certificate ہے ان سب کے لیے۔ پہلے پہل آنے والوں کے لیے، جو ان کو Follow کر کے آنے والے تھے، سب کے لیے یہ سارا کچھ ہے رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا (9:100) ان کے لیے خدا نے جنتیں تیار

کررکھی ہیں ابدی طور کے اوپر ان کے اندر رہنے والے۔ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ (9:100) کتنی بڑی Acheivement ہے یہ جوان کو حاصل ہوگئی ہے۔اور اگر اسی جماعت کو یہ چیز نصیب نہیں ہوگی نہ ملے گی' اس کے بعد اور کون ہے کہ جو اس چیز کو لے سکتا ہے۔اور اسے ایسے ہی نہیں چھوڑ دیا کہ ہمارے قیاس پہ خدا نے چھوڑ دیا ہو اس کے لیے شہادت دیدی' اس کے لیے Certificate دیدیا قرآن نے۔مومن حقا کہا ہے' رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کہا ہے' جنت اور مغفرت ہے' رزقِ کریم ہے۔یہ تمام چیزیں قرآن کے اندر ہیں۔یہ سارے کے سارے اس کے اندر شامل ہیں۔

آج کرہ ارض پر مسلمانوں کی موجودگی جس قسم کی نعمتوں سے سرفراز ہیں یہ انہیں مومنین حقا ہی کا صدقہ ہے

عزیزانِ من!۔اور انہی کا صدقہ تھا کہ جو آپ کے ہاں یہ دین اس طرح متمکن ہوا انہی کے ایمان کا صدقہ ہے ایک زور سے جو انہوں نے دھکا لگایا ہے گاڑی کو تو اگر چہ اس کے بعد نہ وہ انجن رہا نہ وہ حرارت رہی' وہ مومنٹم سے ابھی تک چودہ سو سال تک چلے آ رہی ہے۔الگ بات ہے کہ بعد میں کانٹے ہم نے ایسے بدلے کہ یہ ڈبہ کسی اور پٹڑی پہ جا پڑا لیکن بہر حال ان کے ایمان اور حسنِ عمل کا صدقہ ہے کہ یہ اتنے عرصے تک اتنی صدیوں تک اس امت کی شکل میں ہی سہی چلی آ رہی ہے۔ Pioneers وہی ہیں السابقون الاولون دونوں ہیں۔حق تھا ان کا۔لیکن خدا نے تو یہ شہادت دے کر ابدی طور پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی کہ مومنِ حقا ہیں یہ سب کے سب۔یہ ٹھیک ہے قرآن میں ہے کہ مدینے میں جا کے ابتدائی دور میں کچھ اعراب کچھ اس قسم کی ایسی آبادیاں تھیں جو منافقین کی شکل میں ساتھ آ کے مل گئے۔قرآن یہ بتاتا ہے کہ قدم قدم کے اوپر ان کی نشاندہی ہوتی چلی جاتی ہے' قدم قدم پہ وہ الگ ہوتے چلے جاتے ہیں چھٹ کے' ان کو الگ کیا جاتا ہے' جماعت خالص ہوتی چلی جاتی ہے۔لیکن یہ بھی کچھ ایسی چیز ہماری نہیں ہے اس کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے ایک شہادت دیدی ایک Certificate دیدیا۔سورۃ ال عمران کی 178 آیت اور بڑی اہم آیت ہے۔کہا یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت درمیان میں آ کے مل گئے ہیں یہ لوگ۔لیکن مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (3:179) یہ نہیں کہ یہ کیفیت ہمیشہ تک رہے گی' بالکل نہیں۔ٹھیک ہے یہ آ ملے ہیں لیکن ہم یہ کرتے چلے جا رہے ہیں' خدا یہ کرتا چلا جا رہا ہے کہ ان خبیث کو طیب سے الگ کرتا چلا جا رہا ہے' چھانٹ کے الگ کر دیتا ہے۔طیب خالصتاً جماعت جو ہے وہ ہے۔اور وہ ہمیں معلوم ہو گیا کہ کم از کم صلح حدیبیہ کی وہ آیت ہے سورۃ فتح کی جو میں نے ابھی کہی ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (48:29) آخری دور کی آیت۔تو نظر آتا ہے قرآن نے جو کہا تھا کہ ہم یہ Process کر رہے ہیں کہ خبیث کو طیب سے الگ کر کے رکھ دیا جائے۔وہ جو آخری دور آیا ہے اس میں خبیث اور طیب الگ الگ ہو چکے تھے۔خدا کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم یہ کریں گے۔یہ ہوتا چلا گیا۔اور ایک صحابہؓ کی جماعت جو مہاجرین اور انصار پر مشتمل تھی' نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھی' حضور ﷺ کے آخری دور میں اور میں کہونگا کہ حضور ﷺ کی

اس دنیا سے تشریف براری کے وقت میں جو جماعتِ صحابہؓ آپ ﷺ کے ساتھ موجود تھی ان کے تمام کے مومنِ حقا ہونے کی شہادت قرآن نے دی ہے۔

آپ ﷺ کی زندگی کے بعد تاریخ کے پیش کردہ وہ اوراق جنہوں نے تمام حقائق کو مسخ کردیا

عزیزانِ من!۔اوراس کے بعد پھر وہ جانکاہ حقیقت سامنے آتی ہے اوروہ ہے آپ کی تاریخ جس کے متعلق ہمیشہ کہا کرتا ہوں اسے سن لیجیے زندگی کا بھروسہ نہیں ہے کہ اسلام حقیقی طور پہ آپ کے سامنے اس وقت صرف آسکے گا جب یہ آپ کے درمیان کی تاریخ کو آپ الگ کردیں گے۔تاریخ آپ کی اسلام کے صدرِاول کی قرآن سے مرتب ہوسکتی ہے' یہاں سے مرتب ہوگی صدرِاول کی تاریخ۔بعد کی تاریخ مسلمانوں کی تاریخ ہے جیسی ہے' ہوا کرے اس سے ہمیں غرض نہیں ہے' اس تاریخ سے ہمیں غرض کیا ہے عزیزانِ من!۔قرآن یہ کہتا ہے' خدا شہادت دیتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی آخری زندگی میں جو جماعت حضور ﷺ کے ساتھ تھی' مومن حقا تھی۔سیدھی بات ہے۔ رُحَمَآءُ بَيۡنَهُمۡ (48:29) باہمی بے حد محبت تھی۔ان کے قلوب میں فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ (3:103) کی کیفیت تھی دل جڑے ہوئے تھے ایک دوسرے کے ساتھ۔یہ قرآن کی شہادت ہے۔تاریخ تو چند سال کا عرصہ بھی نہیں بتا رہی۔تاریخ یہ کہہ رہی ہے کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد ابھی جسدِ طیب ﷺ باہر تھا دفن بھی نہیں ہوا تھا' اوران میں باہم سر پھٹول شروع ہوگئی تھی۔ثقیفۂ بنی سعد کی تفصیل ذرا تاریخِ طبری سے دیکھئے نکال کے۔انتخاب ہو رہا ہے خلیفے کا' آپ کے الیکشنوں میں کیا ہوگا جو اس کے اندر لکھا ہوا ہے۔جرأت نہیں پاتا میں بیان کروں' دہراؤں ان الفاظ کو۔یعنی کون کون اس میں ہیں؟ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ یعنی اولیں صحابہؓ السابقون الاولون جنہیں قرآن کہہ رہا ہے۔مدینے کے اندر یہ اعیانِ مدینہ تھے صحابہؓ میں سے' جن کا ایک اجتماع ہو رہا ہے۔اس اجتماع کے اندر خلیفہ کا انتخاب ہے۔اس انتخاب کے اندر جو آپ کی تاریخ نقشہ پیش کررہی ہے (معاذ اللہ) وہ یہ ہے کہ ایک جو Candidate ہے اس کی داڑھی ہے' عمرؓ کا ہاتھ ہے' تلوار پکڑی ہوئی ہے اور کہتا ہے ''بول تے سو ہرے توں''۔اللہ اکبر۔ابھی ابھی لب نہیں خشک ہوئے ہیں جبریل کے یہ کہتے ہوئے کہ رُحَمَآءُ بَيۡنَهُمۡ (48:29) ابھی قرآن کی سیاہی خشک نہیں ہوئی ہے جن میں یہ حروف لکھے گئے ہیں۔خدا کی شہادت ہے رُحَمَآءُ بَيۡنَهُمۡ (48:29) نقشہ یہ سامنے نظر آتا ہے۔دوسرا کہتا ہے کہ یہ خلیفہ ہوگیا تو اس کے بعد مدینے کی گلیاں خون سے بہہ جائیں گی' ہماری تلواریں میان میں نہیں جائیں گی جب تک ہم ایک ایک کا تکا بوٹی نہ کردیں گے۔اللہ اکبر۔فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ (3:103)' رُحَمَآءُ بَيۡنَهُمۡ (48:29)۔اور چار قدم آگے بڑھنے کے بعد تو پھر پوچھئے ہی نہیں کیا نقشے سامنے آتے ہیں کہ جنہیں خلفائے راشدین ابھی یہ کہہ رہے ہیں صحابہؓ میں سے بھی چن کے' یہ انہیں کے دور کی آگے پھر تاریخ آرہی ہے کہ ایک میدان میں ایک ایک جنگ کے اندر دس دس ہزار شہید ستر ہزار شہید جنگِ جمل اور صفین میں یہ کہہ رہے ہیں۔کون مارنے والے تھے کون مرنے والے

تھے؟ یہ رُحَمَآءُ بَیۡنَھُمۡ (48:29) کی جن کے لیے شہادت ہے یہ مومن حقا۔ یہ تو رہی صرف وہ جنگوں میں خوں ریزیاں ان کی۔ ہمارے ہاں مسلمانوں میں ایک فرقہ ہے جن کا وہ عقیدہ اور ایمان ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں ہے' میں تو فرقے بندی کو شرک قرار دیتا ہوں قرآن کی رو سے۔ انکا وہ عقیدہ ہے ان کا وہ مذہب ہے مجھے اس سے واسطہ نہیں۔ میں تو قرآن کا طالبعلم ہوں قرآن کی بات میرے سامنے ہے۔ قرآن انہیں مومن حقا کہتا ہے۔ انہیں چھوڑ دیجئے' شیعہ حضرات کی نہ میں تاریخ لیتا ہوں نہ احادیث لیتا ہوں۔ سنی آپ کے ہاں کے' ان سب کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہم ان کو صحابہؓ کبارؓ بھی' خلفائے راشدینؓ بھی یہ سب کچھ۔ بخاری ان کے ہاں کی سب سے معتمد علیہ احادیث کی کتاب ہے۔

خدا کے حضور نبی اکرم ﷺ روزِ قیامت اپنے صحابہ کے متعلق شکایت کریں گے معاذ اللہ

بخاری شریف کی یہ حدیث ہے کہ قیامت میں جب حساب کتاب اِدھر اُدھر ہو چکا ہوگا' اس میں یہ لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں دیکھونگا کہ ایک گروہ کو فرشتے جہنم کی طرف لیے جا رہے ہیں' جب میں نے غور سے دیکھا تو وہ میرے صحابہؓ تھے۔ اور میں پکارا چلایا او میرے صحابہؓ میرے صحابہؓ ان کو کہاں لیے جا رہے ہو۔ بخاری شریف کی حدیث ہے۔ تو خدا ان سے یہ کہے گا کہ ٹھیک ہے تیرے صحابہؓ تھے جب تک تو ان میں رہا اور اُدھر تم نے آنکھ بند کی تو پھر یہ مرتد ہو گئے۔ معاذ اللہ۔ خدا کہتا ہے ان کے لیے ہم نے جنت ریز رو کر دی ہوئی ہے۔ وہ جنت تو ان صحابہؓ کے مرنے کے بعد ملنی تھی تو ان کی موت تک تو ان کی کیفیت تھی ان صحابہؓ کی موت تک۔ غور فرمایا! آپ نے۔ اور یہ کون کہہ رہا ہے؟ خدائے علیم کہہ رہا ہے۔ وہ یہ نہیں ہے جو وہ یہ کہے کہ صاحب! اس وقت تو ان کے حالات کچھ ایسے ہی نظر آتے تھے ''آدمی تے بڑا معقول نظر اوندا سی پیا تے ہن دلاں دیاں گلاں تے اللہ ای جانے نا' ہن ساہنوں کی پتہ سی مگروں اپنے ایہو جیا نکل اونا''۔ اللہ اکبر۔ خدا کہہ رہا ہے کہ ان کے لیے ہم نے وہاں جنت تیار رکھی ہوئی ہے۔ وہ تو مرنے کے بعد ملے گی۔ خدا کو یہ علم نہیں تھا کہ یہ رسول ﷺ کی وفات کے بعد اپنی وفات سے پہلے یوں کچھ ہو جائیں گے؟۔ پھر جو ان کے لیے جنت تیار کر رکھی ہے (معاف رکھئے گا)۔ یہ بخاری کی حدیث ہے سنیوں کی حدیث ہے' اہل سنت والجماعت کی حدیث ہے' کہ ان میں سے یہ ہو گئے تھے۔ خدا کہہ رہا ہے مومنِ حقا تھا وہ کہتا ہے ان کے لیے ہم نے جنت تیار کر رکھی ہے۔

ہمارے ہاں موجودہ معتبر روایات اور واقعات کی تاریخی حیثیت

عزیزانِ من! یہاں پہنچنے کے بعد وہ جو میں بات دہرایا کرتا ہوں یاد رکھئے اسے۔

آپ کی تاریخ' آپ کی حدیث کی کتابیں' نبی اکرم ﷺ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد مرتب ہوئیں۔ امام بخاری کی وفات

256ہجری میں ہوئی۔طبری، سب سے پہلی تاریخ آپ کی چوتھی صدی میں وفات ہوئی ہے اس کی۔مرتب کیسے ہوئی؟ کوئی پہلے Written Record نہیں، زبانی باتیں سن کے۔یہ اڑھائی تین سوسال کا عرصہ ذہن میں نہیں ہمارے آتا۔اورنگزیب کا زمانہ سمجھ لیجیے۔اورنگزیب کے زمانے کا نہ تو کوئی آدمی ہوسکتا ہے تین سوسال بعد۔کچھ Written record نہ ہواوراس کی ہسٹری مرتب کرنا چاہیں۔ہسٹری تو کم بخت ایسی چیز ہے ان کے دور میں جو ہمعصر مرتب کرتے ہیں، وہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتی۔اس طرح سے یہ ہسٹری مرتب ہوئی آپ کی۔اس ہسٹری میں یہ بعد کے جو مسلمان تھے ان سے تعلق نہیں ہمارا۔یہ جن کی شہادت قرآن نے دے رکھی ہے جہاں تک ان مسلمانوں کا تعلق ہے اب دو چیزیں آ گئیں۔قرآن ان کے متعلق کہتا ہے مومن حقا تھے رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) تھے۔یہ تاریخ اب کہہ رہی ہے، حدیث کہہ رہی ہے کہ وہ مرتد ہو گئے تھے۔معاذ اللہ۔تاریخ کہہ رہی ہے کہ ایک کی تلوار تھی اور دوسرے کا سر تھا۔یہ عام چیز ان کے ہاں ہوگئی۔قرآن کی شہادت کے علی الرغم یہ چیز اس کے خلاف گئی۔میں پوچھتا ہوں قرآن پہ ایمان رکھنے والوں کو کہ ان دونوں میں سے کونسی چیز ماننے کے قابل ہے۔دو جواب ہی نہیں اس کے ہوسکتے۔

قرآن حکیم کی شہادت کے علی الرغم جو کچھ بھی ہو اس کی قدر و منزلت کو کسی ترازو میں نہیں تولا جاسکتا

قرآن کے مقابل میں تو کسی کا بھی قول ہو اگر وہ اس کے خلاف جاتا ہے، پھٹکار دینے کے قابل ہے کوئی بھی راوی کیوں نہ ہو۔لہٰذا محمد رسول اللہ والذین معہٗ جو ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔جہاں تک ان کی تاریخ کا تعلق ہے، اس کا معیار صرف قرآن ہے۔تاریخ میں جتنی باتیں اس کے مطابق ہونگی یعنی کس کے مطابق؟ انہیں مومنِ حقا کہا ہے۔مومنین کی خصوصیات قرآن نے خود گنا دی ہیں۔اب تاریخ میں کوئی ایسی بات جو ان خصوصیات کے خلاف ہو اور ان کی طرف منسوب ہو ہم کہیں گے جھوٹی ہے، غلط ہے، وضعی ہے، کیوں؟ قرآن کی شہادت اس کے خلاف جاتی ہے اور قرآن پہ ہمارا ایمان ہے تاریخ پہ تو ایمان نہیں ہے۔اس لیے ایمان بالقرآن کا تقاضا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اور والذین معہٗ کے متعلق کسی جگہ بھی کوئی بات اگر ایسی ہو جو کسی مومن کی خصوصیت کے خلاف جاتی ہے، اس کے متعلق ہم بلا تامل و تکلف کہہ دیں، غلط ہے، وضعی ہے، ہم نہیں ماننے کو تیار، کیوں نہیں ماننے کو تیار؟ اس سے ہمارے ایمان بالقرآن پہ حرف آتا ہے۔اس کے متعلق باز پرس ہوگی ہم سے، خدا کہے گا کہ میں نے یہ کہا تھا کہ یہ مومنِ حقا ہیں، میں نے کہا تھا رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) ہیں تم یہ مانتے تھے وہاں۔کس طرح تم نے یہ مان لیا؟ کیسے جرأت تم کو ہوگئی؟۔ٹھیک ہے جو قرآن کو نہیں مانتا وہ جو جی میں آئے، مانتا رہے۔جو قرآن پہ ایمان رکھتا ہے عزیزانِ من! ہم تو اس پہ پابند ہو جاتے ہیں پھر۔قرآن نے اگر یہ کہا تھا کہ اصحابِ کہف کی غار کے باہر کتا یوں بیٹھا ہوا تھا، ہمارا اس پہ بھی ایمان ہے۔اگر تاریخ کوئی کہے کہ وہاں بھیڑیا بیٹھا تھا ہم کہیں گے غلط ہے تاریخ، قرآن نے کہہ دیا کہ نہیں! بھیڑیا نہیں کتا تھا۔یہ ہے قرآن ماننے والوں کی پابندی کی کیفیت چہ جائیکہ ان کے متعلق یہ چیز کہی جائے۔

نبی اکرم ﷺ نے قرآنی نظام کی تشکیل کی خاطر ایک جماعت کی تشکیل کرنا تھی

عزیزانِ من! میں نے قرآن کی چند آیات آج آپ کے سامنے صرف پیش کی ہیں' قرآن تو بھرا پڑا ہے۔ یہ جماعت ہی تو تھی جو تیار کی تھی رسول اللہ ﷺ نے' یہ جماعت ہی تو تھی جو مقصود تھی خدا کا کہ اسکے ہاتھوں سے یہ نظام دین قائم ہو۔ اگر اس جماعت کی ایمان و کردار کی یہی کیفیت تھی تو (معاذ اللہ) پھر پوچھیئے کہ یہ رسول ﷺ کر کے کیا گئے ہیں؟۔ انسانیت سازی یہی تو مقصد ہوتا ہے۔ اور اگر یہی چیز تھی کہ ان کے سامنے تو یہ ایسے تھے' انہوں ﷺ نے آنکھ بند کی اور ان کی یہ کیفیت ہوئی تو عزیزانِ من! پھر یہ تعمیرِ سیرت تو نہیں ہے اس کے لیے تو کچھ اور وجوہات ہمیں تلاش کرنی پڑیں گے۔ لہٰذا اس قسم کا کوئی تصور اور کوئی عقیدہ قرآن ماننے والے کے نزدیک قرآن کی بین شہادات کے خلاف جاتا ہے۔ یہ وجہ ہے عزیزانِ من! کہ جب تک تاریخ کو آپ یہ حیثیت دیں گے کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے اس کے متعلق آپ کہیں کہ صاحب! یہ صحابہؓ تو ایسے تھے آپ کبھی صدرِ اول کے متعلق صحیح تصور نہیں ذہن میں قائم کر سکیں گے جب تک یہ تاریخ آپ کی موجود ہے۔

قوموں کی تعمیر و تخریب میں تاریخ کا بڑا دخل ہوتا ہے

آپ کو یہ ہسٹری Re-write کرنی پڑے گی اور اس کے لیے صرف ایک ماخذ ہے اب قرآن' دوسرا تو ماخذ ہی کوئی نہیں ہے۔ اس دور کے انسان تو آپ سے ہمکلام ہونے سے رہے' میٹریل کوئی اس دور میں بھی نہیں تھا آج میٹریل کہاں ہوگا۔ وہ تو بات دور چلی جائے گی میٹریل کے متعلق تو معلوم نہیں کتنی بڑی سازش آپ کے ساتھ ہوئی۔ مدینہ آپ کے ہاں کیپٹل سٹی دارالحکومت تھا کم از کم حضرت عثمانؓ کے عہد تک خلافتِ راشدہؓ اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس میں مملکت کا دارالحکومت مدینہ تھا۔ لاکھوں مربع میل پر پھیلی ہوئی یہ مملکت تھی دور دراز علاقوں تک' اس کا یہ کیپٹل تھا' دارالخلافہ تھا۔ اس کے دفاتر ہونگے' اس کا سیکرٹریٹ ہوگا' اس کا ریکارڈ ہوگا۔ یعنی کوئی چند خاندانوں پہ مشتمل نہیں یعنی دور دراز کے علاقوں تک' ایران تک' بازنطین تک' مصر تک' مملکت پھیلی ہوئی ہے۔ مملکت کا کاروبار ہو رہا ہے۔ کوئی زبانی کلامی تو ساری باتیں نہیں ہوتی تھیں۔ گورنر موجود تھے فوجیں جاتی تھیں' انتظام ہوتا تھا' مالیہ آتا تھا' حساب کتاب رکھا ہوا تھا' یہ سارا کچھ تھا۔ مملکت کا یہ سارا ریکارڈ مدینے کے اندر رہا۔ مدینہ میں اس کے بعد نہ تو کوئی زلزلہ ایسا آیا کہ وہ پہلی بستی کسی طرح سے زمین دوز ہوگئی' نہ کوئی سیلاب ایسا آیا کہ وہ بہا کے لے گیا' نہ کوئی آتش زنی ایسی ہوئی کہ اس نے جلا دیا مدینے میں کوئی چیز ایسی نہیں ہوئی۔ مدینہ اس وقت تک اسی طرح سے ایک محفوظ بستی چلا آ رہا ہے۔

جس قوم کا تاریخی حافظہ کمزور ہو جائے وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے

کیا یہ چیز سوچنے کی نہیں کہ اتنی عظیم مملکت کے ریکارڈ میں سے ایک پرزہ کاغذ نہیں مل رہا آپ کو کہیں سے۔ بہت بڑی چیز ہے فکر کے لیے ایک کاغذ نہیں مل رہا۔ زمین کھودنے سے دس دس ہزار سال پہلے کے کچھ مل جاتے ہیں لوگوں کو' وہیں سے ہسٹری مرتب ہو جاتی ہے۔ تمہارے ہاں زمین کھودنے سے کچھ نہیں مل رہا۔ کہاں سے ہسٹری مرتب کریں گے آپ اس پہلے دور کی۔ یہ سارے ماخذ مٹا دیے گئے کہ مجبور ہو جائیں آپ کسی ہسٹری کے اوپر مدار رکھنے کے لیے۔ As a Historian وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ قابلِ اعتماد نہیں بتایئے پھر آپ کے ہاں کونسا Source اور ہے ہسٹری کا۔ ہمیں ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہؓ کے متعلق تاریخ قرآن میں جو موجود ہے وہ ہمارے لیے درست ہے۔ اس پہ ہمارا ایمان ہے۔ اگر یہ نہ بھی معلوم ہوا کہ وہ کیسے کپڑے پہنتے تھے' کس قسم کے فرش پہ بیٹھتے تھے' دین کا کچھ نہیں بگڑتا۔ لیکن اگر تمہاری تاریخ یہ بتاتی ہے کہ رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ (48:29) نہیں تھے وہ آپس میں اعدا تھے' اگر تمہاری تاریخ یہ کہہ رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد وہ مرتد ہو گئے تھے (معاذ اللہ معاذ اللہ معاذ اللہ) یہ تاریخ تندور میں جھونک دینے کے قابل ہے۔ خدا کی شہادت کے خلاف' قرآن کے دعوے کے خلاف' ہم قطعاً ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بعد میں مسلمان جن کے متعلق ہم مکلّف نہیں ہیں کہ ان کے متعلق ہم کچھ ایمان رکھیں' بناتے رہو ہسٹری اس کے متعلق۔ ایک Historian کچھ کہے گا دوسرا اس کی تردید کر دے گا۔ ہم دین کے اعتبار سے مکلّف نہیں ہونگے اس کو ماننے یا تردید کرنے کے۔

قرآن حکیم کی شہادت کے برعکس ہمیں کوئی چیز قبول نہیں لہٰذا ہمیں اپنی ہسٹری کو Re-write کرنا ہوگا

یہ دور جو ہے محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہؓ کا ہم قرآن کی رو سے اس کے مکلّف ہیں کہ ان کے متعلق یہ ایمان رکھیں۔ اور اس طرح سے آپ کی ہسٹری کو Re-write کرنا ہوگا اگر کسی نے کیا۔ اور نہ کی گئی تو یہ ہسٹری کم از کم اس دور تک اس وقت تک اس ہسٹری کو تو آپ الگ کر کے پھینک دیجیے اس ہسٹری کو' پھر دین سمجھ میں آئے گا۔ ورنہ جونہی ہم ایک بات قرآن کی کہتے ہیں' وہ کہتے ہیں آپ نے یہ عجیب بات کہہ دی کہ وہ سارے کا سارا لا کے انہوں نے دیدیا تھا' اپنے پاس کچھ نہیں رکھا تھا۔ اور فلاں صحابیؓ کے متعلق کہ ان کے اونٹ' سوداگری کے اگلا اونٹ مدینے ہوتا تھا پچھلا اونٹ مصر میں ہوتا تھا۔ دس دس ہزار کروڑ روپیہ ان کے خزانوں میں جمع ہوتا تھا۔ آپس میں ان کی یہ کیفیت تھی۔ یہ کیسے تم نے بتا دیا؟ یہ دیکھئے نا تاریخ بتا رہی ہے ان کی۔ تو پھر بتایئے سچی تاریخ کونسی ہے۔ جیسے یہ نہایت ضروری ہے دین کے لیے کہ وہ تاریخ اس دور کی آپ کے پاس ہو۔ قرآن نے جو تاریخ مرتب کر دی' قرآن تو حضرتِ نوحؑ سے لے کے حضور ﷺ

کے زمانے تک کی قوموں کی تاریخ دے رہا ہے۔ تو محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کی تاریخ ہی نہیں دے گا یہ۔ اس میں ہے۔

؎ تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہوں

عزیزانِ من! ایک ہی آیت 52 میں آج لے سکا اور اس کو بھی میں اختصاراً ہی بیان کر سکا ہوں۔ خدا کرے کہ جو بات میں قرآن کی کہنا چاہتا تھا وہ واضح ہو جائے آپ کے ہاں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

ساتواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 48 تا 59)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج اگست 1971ء کی 29 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کے آغاز کے متعلق یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ پچھلے ہفتے سورۃ الانعام کی آیت 48 سے درس کی ابتداء ہونی چاہیے تھی (6:48) سے۔ سہواً میں نے اسے 52 آیت سے شروع کیا اور وہ ایک ہی آیت میں پورا درس ختم ہو گیا تھا۔ تو آیت 52 کا درس پچھلے اتوار کو ہوا لیکن درمیان میں یہ تین چار آیتیں پھر رہ گئیں۔ تو آج کا درس سورۃ الانعام کی آیت 48 سے شروع ہم کریں گے۔

ظلم و استبداد کی کہانی قرآن حکیم کی زبانی

پچھلی آیت میں آخری بات یہ تھی کہ هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ (6:47) کہ تباہی اور ہلاکت ظالم قوم کی ہوتی ہے۔ جہاں ظلم پھیلتا ہے، جس نظام کی بنیاد سلب و نہب اور Exploitation ناانصافی پر ہوتی ہے، قرآن کا یہ ابدی قانون بتایا گیا ہے کہ وہ

نظام بھی تباہ ہوتا ہے' اس نظام کی حامل قوم' مملکت ملک وہ بھی تباہ ہوجاتے ہیں۔ظلم سے تباہ ہوتے ہیں اور جو انداز بیان ہے وہ تو یہ کہ ہلاکت ہوتی ہی ظالم کی ہے۔ جہاں کہیں تباہی اور بربادی ہو کسی قوم کی' قوم کی بربادی سے مراد ہوتی ہے وہ نظام جو اس قوم نے اپنے ہاں اختیار کر رکھا ہو' اس کا انداز معاشرے کا۔تو جہاں بھی وہ تباہ ہو' اس میں آپ دیکھیں گے' قرآن کہتا ہے کہ ظلم' کہیں نہ کہیں ظلم کا شائبہ ہوگا' وہی تباہ ہوتے ہیں۔لیکن قرآنِ کریم نے دوسرے مقامات میں یہ بھی کہا ہے کہ ہم پہلے ان اقوام کی طرف اپنے رسول بھیج دیتے تھے جو انہیں آگاہ کرتے تھے کہ تمہاری یہ روش غلط ہے اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ان میں سے جو لوگ اس صداقت پر لبیک کہتے' اس کا اعتراف کرتے' جنہیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لے آتے' وہ اس سے محفوظ ہوجاتے۔ جو اس کی تکذیب کرتے' مخالفت کرتے اس سے سرکشی اختیار کرتے' وہ تباہ ہوجاتے۔یعنی پہلی چیز یہ تھی کہ انہیں اس سے آگاہ کیا جاتا تھا کہ تمہاری یہ روش غلط ہے۔اور یہی وہ چیز ہے اسی آیت سے آگے 48ویں آیت میں جو کہا گیا کہ وَمَا نُرۡسِلُ الۡمُرۡسَلِيۡنَ اِلَّا مُبَشِّرِيۡنَ وَ مُنۡذِرِيۡنَ (6:48)

انبیائے اکرام کے مبعوث ہونے کا مقصد انسانیت کو خوف وحزن سے نجات دلانا تھا

یہ جو پیغامبر ہمارے آتے تھے' یہ نہیں کہ یہ ہلاکتیں اور تباہیاں لے کر آتے تھے یا جس قوم میں کوئی رسول مبعوث ہوجاتا تھا' صرف اس وجہ سے کہ اس میں وہ رسول آگیا ہے' وہ قوم تباہی سے بچ جاتی تھی۔رسول کا تو منصب اتنا ہی ہوتا تھا کہ وہ ان لوگوں کو آگاہ کردے کہ غلط روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا' صحیح روش کا نتیجہ کامرانیاں اور کامیابیاں ہونگی۔قرآن کے الفاظ میں وہ غلط روش کے تباہ کن نتائج سے انہیں وارن کرتا' صحیح روش کے خوشگوار ثمرات کی انہیں خوشخبریاں دیتا۔یہ تھا منصب رسالت کا' رسول کا' جو اپنی رسالت کے ذریعے سے اسے پورا کرتا۔فَمَنۡ اٰمَنَ وَ اَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (6:48) اور اس کے بعد ان میں سے جو بھی ان قوانین کی صداقت پر ایمان لے آتے اور وہ پروگرام اختیار کرتے جو ان کی انسانی صلاحیتوں کو بیدار کرنے والا ہے تو اس ایمان یعنی ان قوانین کی صداقت پر یقین اور یہ نہایت ضروری ہے' جذبۂ محرکہ کسی عمل کا دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے اور یہی چیز ہے جسے ایمان کہا جاتا ہے۔کفر ہے تو اس کی سرکشی کا نام ہے۔ایمان ہے تو ان صداقتوں کے مطابق کام کرنے کا ارادہ ہے۔اور اس کے بعد پھر وہ ارادہ عمل کی شکل میں آتا ہے تو اسے عملِ صالح کہا جاتا ہے۔یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہونگی تو پھر اپنے نتائج مرتب کریں گی۔وہ کہتا ہے کہ جو ان قوانین کی صداقت پر ایمان لا کر اعمالِ صالحہ کرتے تھے پھر کرتے ہیں ان کے اوپر' قرآن نے ان کا نتیجہ اگرچہ مختلف مقامات میں بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ دنیا کی کتنی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں۔آخرت کی کتنی کامرانیاں حاصل ہوتی ہیں۔لیکن جب وہ سمٹا کر بات کرتا ہے تو دو لفظوں میں بات کرتا ہے اور بڑی جامع چیز ہے وہ کہ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (6:48) خوف باہر سے آنے والے خطرات کا ہوتا ہے اور حزن دل سے پیدا ہونے والی افسردگی کو کہتے ہیں۔

قرآنی نظام حکومت کا عملی ثبوت' خوف وحزن سے نجات ہے

بعض اوقات ایسا آپ نے دیکھا ہوگا' گذرے بھی ہونگے یہ لمحات کہ بظاہر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا وجہ ہے خوف کی' کوئی بیرونی خطرہ نظر نہیں آتا مگر اس کے باوجود دل ہے کہ ڈوبا جائے ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کیا چیز ہے۔ یہ بہت بڑی نفسیاتی چیز ہوتی ہے اور دل میں حزن پیدا ہوتا ہے' افسردگی پیدا ہوتی ہے' ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات میں نے عرض کیا ہے کہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ اس کے اسباب کیا ہیں۔ وہ بڑی گہرائی سے اس پہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جسے Unconscious Mind کہتے ہیں نفسِ غیر شعوریہ' وہ اس کے اندر اصل میں ڈوبی ہوئی چیزیں ہوتی ہیں' قرآن اس کو حزن کہتا ہے۔ اور بڑی جامع چیز ہے کہ نہ تو بیرونی خطرات انہیں ستاتے ہیں نہ اندرونی کیفیت حزن اور ملال اور افسردگی اور دل گرفتگی کی پیدا ہوتی ہے۔ کتنی بڑی چیز ہے جس قوم کو یا جن افراد کو یہ چیز نصیب ہوجائے کہ نہ باہر سے کوئی خطرہ انہیں ستائے اور نہ دل کے اندر ہی کوئی افسردگی کے سامان ان کے ہاں بیدار ہوں کہا کہ ایمان اور اعمالِ صالح کا یہ نتیجہ ہے۔ اس کو ذرا الٹ دیجیے کہ جہاں یہ چیز نہیں ہے' وہاں ایمان اور اعمالِ صالحہ نہیں ہیں۔ جہاں کسی قوم کو ہر وقت دھڑکا ہی لگا رہے کہ اب چھری صیاد نے لی' اب قفس کا در کھلا یا جہاں افراد کی کیفیت ہو کہ وہ ہر وقت ان کا دل افسردہ رہے' کسی غم میں ڈوبا رہے' پریشانی رہے' اطمینان وسکون نصیب ہی نہ ہو۔ ایسا بھی ہو کہ یہ طبعی ضروریاتِ زندگی ساری مہیا ہو رہی ہیں مگر اس کے باوجود دل کی یہ کیفیت ہو تو قرآن کے اس اصول کے مطابق سمجھ لیجیے کہ اس قوم میں نہ ایمان ہے نہ اس کے اعمال اعمالِ صالحہ ہیں۔ اس لیے کہ ان کا نتیجہ لازمی قرآن نے فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (2:38) بتایا ہے۔ تو سیدھی سی بات ہے کہ جہاں یہ نہیں ہے اس کے معنی ہیں کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ نہیں ہیں۔ ایسے عمدہ ٹیسٹ دیتا ہے قرآن کہ کوئی فرد یا قوم خود فریبی میں رہ ہی نہیں سکتی۔ قدم قدم کے اوپر وہ ماپ سکتی ہے' دیکھ سکتی ہے کہ ہم میں ایمان اور اعمالِ صالحہ ہیں یا نہیں۔ اور اس کا یہ ایک بین' نہایت نمایاں ٹیسٹ قرآن نے قرار دیا ہے کہ یہ دیکھئے کہ اس قوم اور قوم کے افراد کو' قوم کو اجتماعی حیثیت سے کسی بیرونی خطرے کا ڈر تو نہیں ستا رہا افراد کی یہ کیفیت تو نہیں ہے کہ ہر وقت حزن اور ملال اور پریشانی اور تفکر اور انتشار' یہ چیز تو نہیں ان میں پیدا ہوئی۔ جب یہ ہوگی تو سمجھ لیجیے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ نہیں ہیں۔ یہاں قرآن نے جو کہا ہے نا کہ مرسلین پہلے بھیجے جاتے ہیں وہ بتاتے ہیں صحیح روش اور غلط روش کے نتائج سے آگاہ کرتے ہیں۔ تو نبی اکرم ﷺ پر تو نبوت ختم ہوگئی اب اس کے بعد تو یہ کہا جائے گا کہ اب تو یہ مرسلین نہیں آتے اقوام کی طرف' اب تو انبیاء یہ کچھ کرنے کے لیے نہیں آتے۔ اصل چیز ہے کہ یہ جو رسول آتے تھے اس میں اہمیت ان کی رسالت کی ہوتی تھی یعنی پیغامات جو وہ دیتے تھے وہ قانون جس سے لوگوں کو آگاہ کرتے تھے' اصل شے وہ تھی۔ نبی کی ذات تو اس لیے تھی کہ اس کے ذریعے سے یہ پیغامات ملتے تھے۔ تو پہلے تو یہ صورت تھی کہ نبی آتا وہ اپنے پیغامات دیتا' چلا جاتا ان پیغامات میں تحریف ہوجاتی' کبھی وہ مٹ ہی جاتے پھر ایک دوسرا نبی آتا' وہ ان

چیزوں کو دہراتا' یہ سلسلہ تھا۔ پھر وہ نبوت بھی ان کی مقامی ہوتی تھی کسی خاص علاقے میں کسی خاص قوم کی طرف ۔ نبی اکرمﷺ جب مبعوث ہوئے ہیں تو اس کے لیے کیا یہ گیا کہ نوعِ انسانی کو جن ابدی غیر متبدل اصولوں کی ضرورت قیامت تک تھی وہ رسول اللہﷺ کے ذریعے قرآن میں محفوظ کر دیے۔ انہیں غیر متبدل کہہ دیا' غیر محرف کہہ دیا' محفوظ کہہ دیا۔ اور اس کے بعد دنیا اب اس انداز کی چلی آ رہی تھی کہ یہ چیز مقامی رہ نہیں سکتی تھی۔

آج کے دور میں رسل ورسائل کی کیفیت اوران کی اہمیت

وسائلِ رسل ورسائل کے عام ہو جانے سے اب تو کیفیت یہ ہے کہ میں یہ بات آپ کے سامنے یہاں کر رہا ہوں' چند ہی دنوں کے بعد یہ بعینہ امریکہ میں دہرائی جائیں گی' لندن میں دہرائی جائیں گی۔ اور چند ہی دنوں کے بعد تو اس لیے کہ ہمیں یعنی مجھے یا ہمارے نظام کو وہ وسائل میسر نہیں' ورنہ بیک وقت یہاں سے بات کرنے والا' دنیا کے گوشے گوشے میں وہ پہنچ جاتی ہیں۔ اور اب تو کیفیت یہ ہے کہ یہاں سے بیٹھ کے وہ بات کرتے ہیں' چاند والوں کو بھی وہ باتیں سنائی دیتی ہیں۔ چاند والے وہاں سے ٹیلیفون کرتے ہیں' وہ نیچے زمین والوں کو سنائی دیتی ہیں۔ ٹیلیفون اس قسم کا نہیں کہ تار کے ذریعے لگا ہوا ہے' بغیر تار کے بغیر کسی محسوس ذریعے کے۔ کیفیت یہ ہے کہ زمین کی باتیں آسمان پر آسمان کی باتیں زمین پر آ رہی ہیں۔ یہ دور آنے والا تھا اس لیے اب ایک محسوس پیکر میں رسالت کی ضرورت نہیں تھی۔ رسالات کی ضرورت تھی' پیغام کی ضرورت تھی۔ وہ پیغام محفوظ رہنا چاہیے۔ زمانہ' زمانے کی ہوائیں اپنے کندھوں پہ اٹھا کے اسے دنیا کے کونے کونے تک خود پہنچا دیں گی صاحب' آسمانوں تک پہنچا دیں گی ان چیزوں کو۔ تو دور یہ آ گیا۔ اس لیے اب رسول اللہﷺ کے بعد کسی محسوس پیکر میں کسی نبی یا رسول کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس پیغام کی ضرورت رہتی ہے کہ یہ موجود رہے دنیا میں۔ اور دنیا میں کوئی بھی اس وقت مہذب اور متمدن قوم ایسی نہیں ہے جو ان قوانین سے آگاہ نہ ہو۔ اس طرح سے دنیا کے گوشے گوشے اور کونے کونے میں یہ پیغامات پہنچ چکے ہوئے ہیں کہ اب کسی محسوس پیکر میں نئے نبی کے آنے کی ضرورت ہی نہیں۔ لہٰذا یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ ہم بھیجتے تھے انبیاء کو جو ان کو آگاہ کیا کرتے تھے۔ ان انبیاء یا رسولوں کی جگہ یہ رسالتِ محمدیہﷺ جو ہے یہ قیامت تک کے لیے وہ کام دے رہی ہے جو پہلے آنے والے خود نبی محسوس پیکروں میں کام دیا کرتے تھے۔ کہا کہ وہ آتے تھے ان کو آگاہ کرتے تھے۔ جو اس پہ ایمان لے آتے تھے اور عمل کرتے تھے وہ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ . وَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا یَمَسُّهُمُ الۡعَذَابُ بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ (6:48-49) اور جو لوگ ان قوانین کی تکذیب کرتے تھے' وہ تباہی میں آ جاتے تھے۔ اتنا ہی کہنے پہ بس نہیں کیا' بات واضح کر دی کہ یہ یونہی نہیں تھا کہ خدا کی طرف سے عذاب آ جاتا تھا۔ وہ مَنۡ یَّشَآءُ (2:284) کے معنوں میں جو ہمارے ہاں یہ آتا ہے کہ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ (2:284) کہ صاحب جسے جی چاہے وہ عذاب دیدے۔ یَمَسُّهُمُ الۡعَذَابُ بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ (6:49)

اس لیے کہ انہوں نے غلط روش اختیار کی تھی۔

خدا کی طرف سے آنے والا کوئی رسول یا نبی فوق البشر نہ تھا کہ جو عقل وفکر کی بجائے معجزات کا سہارا حاصل کرتا

اس غلط روش کا نتیجہ وہ تباہی تھی۔ صحیح روش کا نتیجہ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (6:48)' غلط روش کا نتیجہ عذاب۔اور اس کے بعد پھر وہ حقیقت واضح کر دی جو اس زمانے میں لوگوں کے ذہن میں تھی کہ یہ جو خدا کی طرف سے آنے والا کوئی نبی رسول اوتار پیغمبر اس کو فوق البشر ہونا چاہیے کوئی سپر مین ہونا چاہیے۔ عام انسانوں جیسا انسان نہیں اسے ہونا چاہیے۔ اور اسی کے لیے جیسا اس سے پیشتر دو ایک درسوں میں' میں بتا چکا ہوں' وہ معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ اور قرآن ہر مقام پہ ان سے کہتا تھا کہ ہم تمہاری عقل وفکر کو اپیل کرتے ہیں' دعوت دیتے ہیں اور تم ہم سے وہی توہم پرستی کی باتیں طلب کرتے ہو۔ ذرا سوچو کہ میں کیا کہتا ہوں اور تم کیا طلب کرتے ہو۔ کہا کہ یہ چیز تھی۔ رسولوں کے آنے کے ساتھ یہ کچھ ہوتا تھا۔ رسول کی ذات کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا' رسول کے پیغامات کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ جہاں تک رسول کی ذات کا تعلق تھا' یہیں پھر بات واضح کر دی قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ لَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ لَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ (6:50) کہا جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے' یہ نہیں ہے کہ یہ میں کچھ کر کے دکھا دونگا میں تمہارے درمیان انوکھے قسم کا کوئی انسان آ گیا ہوں اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ کہا ان سے کہدو کہ میرے پاس نہ تو کوئی خدا کے دبے ہوئے خزانے ہیں جن کا تمہیں علم نہیں ہے اور وہ میرے پاؤں کے نیچے ہیں دبے ہوئے۔ نہ تو یہ ہیں میرے پاس' نہ ہی میں غیب کا علم جانتا ہوں۔ کتنی واضح چیزیں ہیں' جو قرآن بتا رہا ہے۔ میں غیب کا علم نہیں جانتا' خزانے نہیں ہیں خدا کے میرے پاس' میں کوئی فرشتہ نہیں ہوں میں تمہارے جیسا انسان ہوں۔ کرتا کیا ہوں؟ صرف یہ کہ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (6:50) جو کچھ میری طرف وحی ہوتا ہے خدا کی طرف سے' میں اس کا اتباع کرتا ہوں۔ اب یہ دوسری چیز آ گئی رسول کی۔ نبوت تو یہ ہے کہ خدا کی طرف سے اسے وحی عطا ہوتی ہے۔ رسالت یہ ہے کہ وہ اس وحی کو دوسرے لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ یہ چیز تو Mechanical ایک آلۂ ابلاغ جسے آپ کہتے ہیں یہ بھی کر دیتا ہے۔ یہ لاؤڈ سپیکر ہمارا بھی یہ آواز پہنچاتا ہے۔

خدا کا نبی سب سے پہلے وحی پر ایمان لاتا اور عمل کرتا ہے

اگلی چیز یہ ہے اس رسول کی کہ وہ خود اپنی وحی کا اتباع کرتا ہے۔ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6:163) قرآن نے کہا ہے کہ میں سب سے پہلے اسکے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں' پہلے میں عمل کرتا ہوں۔ بس یہ ہے خصوصیت ساری میری کہ میں اس کا اتباع کرتا ہوں

اور اسی کی تمہیں دعوت دیتا ہوں۔ اور اس کا نتیجہ تمہیں بتا دیتا ہوں کہ اس کا اگر تم بھی اتباع کرو گے تو خوف اور حزن سے مامون اور محفوظ ہو جاؤ گے۔ میں صرف یہ کرتا ہوں کہ جو کچھ میری طرف وحی ہوتا ہے' اس کا اتباع کرتا ہوں۔ یہاں سے ایک بڑی اہم چیز سامنے ہمارے آتی ہے۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اب یہ چیزیں بار بار سامنے آ گئی ہوئی ہیں نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب احادیث یا روایات جنہیں کہا جاتا ہے وہ دو اڑھائی سو سال بعد جا کر مدون ہوئی تھیں۔ خود مجموعے بتا رہے ہیں کہ ان میں صحیح بھی ہیں' ان میں غلط بھی ہیں۔ ہمارے ہاں غلط نگہی یوں پیدا ہوئی ہے کہ جو اس قسم کے مجموعے ہیں ان کو تو یقینی طور پر سمجھا جاتا ہے کہ قابلِ اعتماد ہیں۔ اس کے بعد اگلی چیز یہ کہی جاتی ہے کہ! قرآن کو سمجھنا ہو تو سیدھی سی بات ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے بہتر قرآن کا سمجھنے والا کون تھا (بالکل صحیح بات ہے ہمارا ایمان ہے یہ) لہٰذا قرآن کو اگر سمجھنا ہو تو وہ جو احادیث ہیں ان کی رو سے سمجھا جانا چاہیے۔ یہ تو ٹھیک ہے نبی اکرم ﷺ زندہ تھے لوگوں کے اندر جو کچھ حضور ﷺ بتاتے تھے وہ حضور ﷺ کی احادیث تھیں ان کے مطابق قرآن کی تفسیر وہ آپ ﷺ کرتے تھے۔

احادیث کے مجموعوں کی روشنی میں قرآن حکیم کی تفسیروں کی کیفیت

یہ جو کچھ اب مجموعوں کے اندر ہے' یہ خود مجموعوں کے مرتب کرنے والے انہیں اقوال منسوب الی الرسول کہتے ہیں یعنی رسول اللہ ﷺ کی طرف ان کی نسبت کی گئی ہے۔ اور ہر حدیث کے پہلے ہوتا ہے قال رسول اللہ ﷺ حضور نے یہ فرمایا' بعد یہ ہوتا ہے اوکما قال رسول اللہ ﷺ ایسا یا جیسا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ یعنی خود وہاں یہ چیز لکھی ہوئی ہوتی ہے کہ یہ یقینی طور پہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضور ﷺ نے ایسا ہی فرمایا یا جیسا حضور ﷺ نے فرمایا۔ اب اس قسم کی چیز کو آپ بنیاد بنائیں اور وہ اور قرآن کی آیت اگر آپس میں ٹکرائے تو آپ یہ کہیں کہ آپ کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ قرآن کی اس آیت کا کوئی دوسرا مفہوم لیں۔ مفہوم وہی صحیح ہوگا جو رسول اللہ ﷺ نے لیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کا لیا ہوا مفہوم وہ ہے جو اس مجموعۂ حدیث کے اندر ہے۔ یعنی اگر اس کے اندر یہ لکھا ہوا ہے اور جیسا کہ لکھا ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ میں دیکھونگا قیامت میں ایک گروہ جہنم کی طرف کھینچے کھینچے لیے چلے جا رہے ہیں اور میں دیکھونگا کہ کون ہیں تو وہ میرے صحابہؓ ہونگے اور میں دہائی دونگا کہ میرے صحابیؓ ہیں۔ اور خدا کہے گا ان کے متعلق کہ جب تک تو ان میں تھا اس وقت تک تو یہ مسلمان رہے تھے تیرے مرنے کے بعد یہ سب پھر گئے تھے۔ یہ بخاری کی حدیث ہے ایک۔ اب اس کو وہ کہتے ہیں یقینی طور پہ صحیح مانو۔ قرآنِ کریم میں اس گروہ کے متعلق بتایا ہے کہ یہ مومنِ حقا ہیں۔ خدا نے کہا ہم نے ان کے لیے مغفرت اور جنت لکھ دی ہے۔ اب یہ حدیث اس کے خلاف جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نہیں! قرآن کی آیتوں کا مفہوم اس کے تابع لینا چاہیے' اسے یقینی ماننا چاہیے۔

روایات کو پرکھنے کا معیار تو صرف قرآن حکیم ہے

اتنی سی بات ہے۔ہم کہتے ہیں کہ قرآن کی آیتیں یقینی طور پہ لفظاً لفظاً حرفاً حرفاً وہی ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ یہ جتنے اقوال ہیں یہ ایسے نہیں ہیں اس لیے ان اقوال کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہوں۔قرآن کی آیت کا مفہوم یوں نہیں کہ وہ ان روایات کے مطابق ہو۔وہ تو خود آپس میں ٹکراتی ہیں' ایک دوسرے سے متضاد ہوتی ہیں اور قرآن کی اس آیت نے واضح کر دیا کہ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ (6:50) میری طرف جو وحی ہوتی ہے میں صرف اس کا اتباع کرتا ہوں۔اب جو چیز کہی جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیا تھا اس کے متعلق یہ دیکھئے کہ مَا یُوْحٰی کے مطابق وہ ہے جو بیان کیا گیا ہے۔اگر وہ قرآن کے مطابق ہے ہم کہیں گے ٹھیک ہے حضور ﷺ نے ایسا کیا ہوگا۔اگر اس کے خلاف جاتا ہے تو ہم کہیں گے کہ یہ غلط ہے جو تم کہتے ہو اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف غلط ہے حضور ﷺ نے ایسا نہیں فرمایا ہوگا حضور ﷺ نے ایسا نہیں کیا ہوگا۔

وضعی روایات کے تحت قرآنی آیات کو منسوخ تصور کرنے کا عقیدہ

لیکن یہاں کہا یہ جاتا ہے کہ ان کو تو مانو' انہیں مانو یقینی اور قرآن کی تفسیر اس کا مفہوم ان کے ماتحت لو تم۔اور اگر یہ مفہوم کسی طرح سے بھی آپس میں نہ ملے' مطابقت بھی نہ ملے تو کہتے ہیں' کچھ تاویل کرو قرآن کی آیت کی' کھینچو تانو کچھ کسی طرح سے اس کے برابر کرو۔لیکن اگر ایسا بھی نہ ہو' اوکانوں ایہو جئی پئی ہوئی ہووے پئی منجی ٹھیک ای نہ ہووے' تاویل نہ بنتی ہو۔اس کے بعد آپ کو معلوم ہے عزیزانِ من! کیا عقیدہ ہے؟ قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھو۔آپ سوچئے کہاں بات چلی جاتی ہے۔آپ کو معلوم ہے پھر ان چیزوں سے فائدہ کیا اٹھایا جاتا ہے؟ یہ ہے چیز سمجھنے کی' ان کا نقصان کیا پہنچتا ہے؟۔یہاں ہمارے ہاں مجھے مثال دینی پڑتی ہے سمجھانے کے لیے اس کے علاوہ بات واضح نہیں ہوتی ورنہ مجھے نہ شخصیتوں سے تعلق ہے نہ جماعتوں سے تعلق ہے۔یہاں جماعتِ اسلامی ہمارے کچھ عرصہ ہوا اس کے جماعت کے ساتھ بہت سے لوگ جو دیرینہ اس کے ساتھ چلے آ رہے تھے انہوں نے اس جماعت سے علیحدگی اختیار کی اور بیان یہ دیا کہ ہم اس لیے الگ ہو رہے ہیں کہ اس جماعت کے ابتدائی دور میں جب یہ جماعت بنائی جا رہی تھی تو جو اصول دین کے ہمیں بتائے جا رہے تھے ہمارے امیر مودودی صاحب نے بتائے تھے' وہ بڑے شاندار اصول تھے دین کے مطابق تھے ہم نے ان کو Accept کیا' ہم ساتھ ہو گئے۔

ایک غلط روایت کے سہارے مودودی صاحب کی اصول پرستی کی ایک مثال

اب جو یہاں آئے ہیں' آہستہ آہستہ تو یہاں کچھ الیکشن شروع ہوئے' سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان

اصولوں کو بدلا جارہا ہے' ان سے انحراف برتا جارہا ہے' ان کو توڑا جارہا ہے۔ تو جب ہم نے یہ پوچھا کہ یہ کیا ہورہا ہے تو بجائے اس کے کہ اس پہ ندامت ہوتی' اعتراف ہوتا کہا جاتا' غلطی سے کیا گیا۔ کہا کہ نہیں! یہ چیز اگر میں کرتا ہوں تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ اب یہاں وہ بات آئی جو میں نے عرض کرنا تھا' جس کے لیے میں مثال دے رہا ہوں۔ کہا کہ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی تو یہی کیا تھا (معاذ اللہ)۔ ارے بھئی! آپ ﷺ نے کیا کیا تھا؟۔ آپ سوچئے کتنی بڑی چیز ہے کہ اصول پیش کیے جاتے ہیں ابتدائی دور میں اور اس کے بعد جب قوت ملتی ہے' اصولوں کو توڑا جاتا ہے۔ آپ سوچئے کسی کے متعلق بھی آپ یہ بات کہیے تو اس کے کریکٹر کے متعلق کیا نقشہ ذہن میں آتا ہے۔ کہا کہ یہ رسول اللہ ﷺ نے خود کیا تھا۔ انہوں نے کیسے کیا تھا؟ کہنے لگے کہ حضور ﷺ نے جب ابتدائی دور میں یہ جماعت بنائی تو اس وقت مساوات انسانیہ کے اصول دیے کہا کہ یہ کوئی کسی قسم کا تفرقہ نہیں نہ قریش میں نہ غیر قریش میں' نہ عرب میں' نہ غیرِ عرب میں' نہ کالے میں نہ گورے میں' نہ حبشی میں نہ عربی میں' بلال حبشیؓ اور عمرِ فاروقؓ ایک درجے میں اور اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰكُمۡ (49:13) جو تم میں سے زیادہ متقی ہے وہ سب سے زیادہ واجب التعظیم ہے۔ یہ اصول دیا مساوات انسانیہ کا اور معیارِ تکریم جو تھا وہ قرآن نے تقویٰ کو بتایا۔ کہا کہ یہ اصول دیے رسول اللہ ﷺ نے اپنی جماعت کے ابتدائی ایام میں۔ اور مدینے میں آنے کے بعد جب مملکت آپ ﷺ نے قائم کی تو اس وقت آپ ﷺ نے فرمادیا ائمة من قريش کہ نہیں! خلیفہ جو ہونگے' سربراہ جو ہونگے مملکت کے وہ قریش ہونگے۔

نبی اکرم ﷺ کی اصول پرستی (معاذ اللہ) بیان ہورہی ہے

تو کہا دیکھا آپ نے کہ وہ جو اصول تھا مساواتِ انسانیہ کا اس کو توڑا نا رسول اللہ ﷺ نے آ کے آخری دور میں جب مملکت ملی اور قوت ملی اور یہ ساری چیزیں حاصل ہوئیں۔ تو کہا ہمارے سامنے یہ نظیر موجود ہے کہ جماعت سازی کے ابتدائی ایام میں بڑے درخشندہ اور تابناک اصول دیجیے جو لوگوں کو بہت جچیں اور وہ کھنچ کے چلے آئیں۔ اور بعد میں جب طاقت حاصل ہو جائے تو ان اصولوں کو توڑ دیجیے دیکھئے رسول اللہ ﷺ نے یہ کیا۔ اب اس سے آپ نے سوچ لیا کہ یہ بات کیا ہوئی۔ اس سے بھی آگے بڑھے۔ کہا اتنی بات ہی نہیں اصول توڑنے کی بلکہ ضرورت پڑے تو اس وقت دھوکہ دینا' جھوٹ بولنا یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے' عین دین کے مطابق ہوتا ہے۔ یا میرے اللہ!! اس دین کے متعلق تو ہم کچھ اور ہی سمجھے ہوئے تھے۔ یہ کیا چیزیں دین کے متعلق دی جارہی ہیں کہ صاحب! جھوٹ بولنا دھوکہ دینا؟

جھوٹ کے سلسلہ میں ایک اور مثال

کہنے لگے یہ بھی دیکھئے رسول اللہ ﷺ نے کیا' دیکھ لیجیے کہ فلاں روایت موجود ہے کہ وہ کعب بن اشرف کے قتل کے لیے رسول اللہ ﷺ نے آدمی تیار کیے' وہ جانے لگے تو انہوں نے کہا' اس مہم میں جارہے ہیں ہم سازش کے ماتحت خفیہ طور پہ' اس میں اگر کچھ فریب

دینا پڑے یا جھوٹ بولنا پڑے' تو ہمیں اجازت ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں' تمہیں اجازت ہے۔ چنانچہ صحابہؓ کرامؓ جارہے ہیں رسول اللہ ﷺ سے یہ لائسنس لے کے (معاذ اللہ)۔ اور وہاں جا کے پھر آگے وہ تفصیل دی ہوئی ہے کہ کس طرح دھوکے سے اس کو گھر سے بلایا' گلے سے لگایا' سر کو چوما اور اس کو باہر سیر کے بہانے سے لے گئے اور اس طرح دھوکے میں اس کو باہر لے جا کے اور اس سے جھوٹ بولا کہ ہم کاہے کے لیے آئے ہیں' کیوں یہاں آئے ہیں اور باہر جا کے قتل کر دیا۔ کہا یہ دیکھ لیجیے۔

یعنی اب قرآنِ کریم کی تعلیم جو ہے وہ ہمارے سامنے واضح ہے کہ اصول شکنی کسی حالت میں بھی جائز قرار نہیں پا سکتی۔ بدترین عہد ہے انسان کا۔ سچ صداقت یہی تو وہ چیز ہے کہ جس سے ایک نبی کی نبوت پر ایمان لایا جاتا ہے۔ یعنی نبی یہ کہتا ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ مجھے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے۔ کوئی محسوس نشان نہیں ہوتا اس کے پاس' وہ تو معجزہ بھی نہیں دکھاتا۔ یہ کیسے مانا جائے؟ اس کے ماننے کی ایک چیز ہے کہ اس شخص نے ساری عمر کبھی جھوٹ نہیں بولا اس لیے ہمیں Out right اس کو Condemn نہیں کر دینا چاہیے' Reject نہیں کر دینا چاہیے' انکار نہیں کر دینا چاہیے کیونکہ اس نے کبھی ساری عمر جھوٹ نہیں بولا۔ تو ہمیں سوچنا چاہیے کیوں ہم کہہ دیں کہ یہ چیز جھوٹی ہے' اس نے تو کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ یعنی بنیاد یہ ہوتی ہے صداقت جو نبی کی ہے' وہ بنیاد بنتی ہے اس کے دعوے کی۔ اور اگر نبی کے متعلق یہ چیز ہو کہ وہ یہ کہتا ہے کہ جاؤ فریب بھی دو' جھوٹ بھی بولو عند الضرورت۔ عند الضرورت ہی آدمی جھوٹ بولتا ہے بلا ضرورت تو کوئی جھوٹ نہیں بولتا۔ اور وہ تو آپ کو معلوم ہی ہے ہمارے ہاں محاورہ موجود ہے۔ وہ اسے کہتا ہے کہ ''او جھوٹ بولنا پیا ایں' او کہندا اے مینوں کی لوہڑ پئی سی میں جھوٹ بولدا'' مجھے کیا ضرورت تھی میں جھوٹ بولتا۔ یعنی ضرورت پہ جھوٹ بولتا ہے آدمی' بلا ضرورت تو کوئی جھوٹ ہی نہیں بولتا۔ تو کہا کہ صاحب! ضرورت کے اعتبار سے جھوٹ بولنا' فریب دینا' اصول توڑنا' یہ سب جائز ہے۔ جائز ہی نہیں اس کے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی سے مثالیں دی جاتی ہیں۔ کہاں سے یہ مثالیں ملی ہیں؟ روایات کے مجموعے سے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق قرآن شہادت دیتا ہے کہ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ (6:50) جو بھی خدا کی طرف سے وحی ہوئی تھی' رسول اس کا اتباع کرتے تھے' ساری عمر اتباع کرتے رہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں کوئی واقعہ آپ کی تاریخ میں ایسا آتا ہے جو قرآن کے کسی اصول سے ٹکراتا ہے' ہم کہیں گے کہ تاریخ اس میں غلطی کر گئی ہے' حضور ﷺ نے ایسا نہیں کیا ہوگا کیونکہ قرآن شہادت دیتا ہے کہ حضور ﷺ کی زندگی وحی کے مطابق تھی۔ بات ختم ہوگئی۔ جہاں کوئی ایسی چیز آئے حضور ﷺ کی طرف منسوب' کہہ دیجیے غلط ہے۔ کیوں غلط ہے؟ قرآن کے خلاف جاتی ہے۔ اور قرآن کی شہادت یہ ہے کہ حضور ﷺ اتباع کرتے تھے وحی کا۔ اس اصول کو یاد رکھیے۔

نبی اکرم ﷺ کی طرف سے پیش کی جانے والی تعلیم اور آپ کے منصب کی وضاحت

تو بڑی چیز آپ ﷺ نے کہی کہ مجھ سے ان چیزوں کے مطالبے کیا کرتے ہو۔ میں تو یہ کہنے کے لیے آیا ہوں کہ جس راستے پہ تم جا رہے ہو آگے تباہی ہے کنواں ہے بچ کے جاؤ۔ تم اس سے یہ کہتے ہو کہ صاحب! یہ تم بالوں میں سے دودھ نکال کے بتاؤ۔ ارے ان دونوں کے اندر تعلق کیا ہے۔ چل کے دیکھ لو کنواں نظر آ جائے گا۔ میں نے یہ دعویٰ ہی نہیں کیا کہ میرے پاس کوئی خزائن ہیں' خدا کے یا میں غیب جانتا ہوں میں کوئی فرشتہ ہوں۔ میں تمہارے جیسا انسان ہوں۔ میں خود وحی کا اتباع کرتا ہوں جس کے اتباع کی تمہیں تلقین کر رہا ہوں۔ یہ ہے میرا منصب۔ اور اس کے بعد یہ کہا کہ قُلۡ هَلۡ یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَ الۡبَصِیۡرُ (6:50) سوچو تو سہی! اندھا اور آنکھوں والا کبھی دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ میں کہتا تمہیں یہ ہوں کہ آنکھیں بند کر کے نہ چلو آنکھیں کھول کے چلو تم مجھے کہتے ہو کہ معجزہ دکھاؤ۔ اور اگلی چیز ہے عزیزانِ من! جس نے بات واضح کی۔ اَفَلَا تَتَفَکَّرُوۡنَ (6:50) تم غور و فکر نہیں کرتے اس بات پہ جو میں کہہ رہا ہوں۔

یہ معجزہ یا کرامت یا جس کو خارقِ عادت چیزیں کہتے ہیں' وہ تو آتی اس وقت ہے جب آدمی کی فکری قوتوں کو مسلوب کر دیا جائے۔ معجزے کے معنی ہی ہیں عاجز کر دینے والی چیز' جس کے سمجھنے سے انسان عاجز آ جائے' بات سمجھ میں نہ آئے کہ کیسے کیا اس نے یہ۔ ان چیزوں سے اسی طرح مرعوب ہوتا ہے نا انسان کہ اس کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جس وقت اس کی توجیہ سمجھ میں آ جاتی ہے وہ بات کرامت رہتی نہیں ہے۔ یہ مداری کا کھیل جب تک آپ کی سمجھ میں نہیں آتا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک روپیہ تھا' اس سے دو ہو گئے' اس سے کیسے چار ہو گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ ذرا سا سمجھ سے کام لیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر یہ اس طرح سے چٹکیوں میں ایک کے دو دو کے چار کرتا تو یوں در بدر جھولا اٹھا کے بھیک کیوں مانگتا پھرتا۔ دیکھا فکری طور پہ آپ نے یہ بات کہی بات صاف ہو گئی۔

خدا کا نبی معجزوں سے عقل کو ماؤف کرنے کی بجائے انسانی فکر و تدبر کو وحی کی روشنی سے متعارف کرتا ہے

قرآن نے یہ کہا ہے کہ تم ان چیزوں کا مطالبہ کرتے ہو جو کچھ میں کہتا ہوں اَفَلَا تَتَفَکَّرُوۡنَ (6:50) ذرا غور و فکر سے کام لو تو تمہیں بات سمجھ میں آئے کہ واقعی یہ معجزے طلبی والی بات نہیں ہے۔ میں تو دلیل و برہان کی رو سے ایک بات تم سے کہتا ہوں۔ تو کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتا ہے۔ آنکھوں والا وہ ہے جو اپنی عقل و فکر سے کام لے وحی کی روشنی میں چلے۔ اندھا وہ ہے جو آنکھیں بند کر کے چلے' سیدھی سی بات ہے۔ وَ اَنۡذِرۡ بِہِ الَّذِیۡنَ یَخَافُوۡنَ اَنۡ یُّحۡشَرُوۡۤا اِلٰی رَبِّہِمۡ لَیۡسَ لَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ وَلِیٌّ وَّ لَا شَفِیۡعٌ لَّعَلَّہُمۡ یَتَّقُوۡنَ (6:51)

اب ان سے پوچھو کہ راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کے چلنا چاہتے ہو یا تباہ ہونا چاہتے ہو۔ یہ ہے تقویٰ کے معنی' آپ کو

معلوم ہے اب' راستے کے خطرات سے بچ کے چلنے والا یا یہ احساس کہ مجھے بچ کے چلنا ہے۔ کہا یہ جو کچھ تم کہتے ہو اسے وہی مانے گا جو یہ طے کرے کہ مجھے زندگی کے راستوں کے خطرات سے محفوظ رہنا ہے۔ جو خودکشی کرنے کے لیے جائے اس سے کہنا کہ آگے نہ جانا دریا بہت زیادہ گہرا ہے ڈوب جاؤ گے' وہ ڈوبنے کے لیے تو جا رہا ہے۔ یہ وارننگ اس کو کام دے گی کہ جو دریا پار کرنا چاہتا ہے حفاظت سے محفوظ رہ کے' راستے میں جہاں جہاں اس قسم کا گہرا پانی آتا ہے اس سے بچ کے چلنے والے کے لیے ضرورت ہے یہ کہنے کی کہ بچ کے چلنا' گڑھا آ گیا ہے آگے۔ کہا یہ جو زندگی کے خطرات سے بچ کے چلنے کا ارادہ کریں گے انہیں یہ چیز کام دے گی جو کچھ تم کہہ رہے ہو۔ انہی کو آگاہ کرو' وہ لوگ ہیں' کون لوگ؟ جنہیں معلوم ہے کہ ہمارا ہر عمل اس کے لیے ہم Accountable ہیں اس کے لیے ہم ذمہ دار ہیں۔ اس کے نتائج سامنے آئیں گے' ہمیں بھگتنے پڑیں گے۔ جو تو یہ مانتے ہیں ان کو تو یہ بتاؤ کہ سنکھیا ہلاکت پیدا کرتا ہے۔ جو اس کو تسلیم ہی نہیں کرتا' لاکھ کہے جاؤ ان کو سوال ہی نہیں ہے کہ وہ تمہاری بات پہ آ جائیں یا تمہاری بات کو مان لیں۔ **لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ** (6:51) تا کہ وہ راستے کے خطرات سے بچ کے چلیں انہیں آگاہ کرو۔ اب آگے وہ آئی 52 آیت جو پچھلے درس میں موضوع رہی تھی ہمارے درس کا' پورا درس اس نے لے لیا تھا۔

دولت، قوت اور وسائل کے بل بوتے پر طبقاتی تقسیم

یہاں وہ بات آئی کہ یہ لوگ تم سے معجزے مانگتے ہیں۔ یہ اپنی دولت اور قوت کے نشے میں بدمست ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ تم مساوات کی دعوت دیتے ہو' یہ طبقات قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ہوا یہ کہ تمہاری دعوت پر سب سے پہلے ان لوگوں نے لبیک کہا ہے کہ جو ان کے نزدیک اس معاشرے میں نچلے درجے کے لوگ ہیں۔

اب ان کا تقاضا یہ تھا کہ ٹھیک ہے ہم آنے کو تیار ہیں لیکن اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ قریش کا اتنا بڑا سردار اور بلالِ حبشیؓ ایک ہی دستر خوان پہ بیٹھ جائیں' ایک ہی صف میں کھڑا ہو جائے' ایک ہی ہم مرتبہ ہو۔ بلکہ اگر بلالؓ زیادہ تقویٰ شعار ہے تو اس کا مرتبہ ابو جہل سے بڑھ جائے۔ ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس لیے پہلی چیز یہ ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے ''اے جیہڑے ساڈے معاشرے دے کمی سن''۔

گاؤں کے اندر ملازم یا مزارع کی حیثیت غلام جیسی تصور کی جاتی ہے

اس کمی کا ہمارے ہاں درجہ ہوتا ہے غلام تو ہم سمجھ ہی نہیں سکتے' غلام ہوتا کیا ہے۔ چھوٹے سے معنوں میں شہری زندگی میں تو خیر نوکروں کے ساتھ ایسی چیز نہیں۔ ہے گاؤں میں جا کے دیکھئے وہ کمی یا جو ملازم ہوتے ہیں یعنی ان کے مزارع جو ہوتے ہیں زمیندار اور

مزارع میں کتنا فرق وہ زمیندار رکھتا ہے اپنے ہاں۔اس کی جرأت ہی نہیں ہوسکتی کہ چار پائی پہ بیٹھ جائے اگر وہ زمیندار چار پائی پہ بیٹھا ہے' ہو ہی نہیں سکتا۔

عرب میں جنگ کی حدتک قبائلی بنیاد پر تفریق کی نوعیت

اس زمانے میں عرب میں تو یہ طبقاتی امتیاز اور حسب ونسب کا امتیاز اتنا گہرا تھا کہ صلح کا میدان تو ایک طرف جب وہ جنگ میں آتے تھے' جنگ اس زمانے میں ہوتی تھی ایک ایک فرد کی پہلے' شروع میں ایک ادھر سے نکلتا تھا اُدھر سے ایک کو آواز دیتا تھا۔ اِدھر سے جو جنگ کے لیے نکلتا تھا جنگ کے لیے کوئی شادی بیاہ کے لیے نہیں' ناطہ رشتہ نہیں کر رہا وہاں وہ۔ جنگ کے لیے آواز دے رہا ہے' سامنے سے جو آ رہا ہے اس سے پوچھتا ہے کون ہو؟ کہ فلاں ہوں' کس قبیلے سے ہو' اس نے کہا جی فلاں قبیلے سے ہوں۔ وہ قبیلہ اگر طبقاتی معیار کے مطابق ان سے پست ہوتا تو انکار کر دیتا تھا یہ شخص اس سے جنگ کرنے سے۔ کہنے لگا جاؤ تمہارے ساتھ ہم نہیں جنگ کرسکتے ہمارے قبیلے کے مقابل کا کوئی شخص بھیجو۔ان کی کیفیت یہ تھی۔ان کے سامنے یہ تعلیم پیش کرنا کہ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) تمام نوعِ انسانی جتنے بھی ہیں وہ انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہیں۔اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (49:13) اور سب سے زیادہ واجبِ تکریم وہ ہے' جو سب سے زیادہ ان احکامِ خداوندی کی اطاعت کرتا ہے جو فرائض شناس ہے۔ یہ تعلیم ان کے سامنے پیش کرنا جو جنگ میں بھی اپنے سے نچلے درجے یا اپنے سے پست قبیلے کے آدمی سے لڑائی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ان کا تقاضا یہ تھا کہ نہیں' انہیں نکال دیجیے' ہم آتے ہیں۔

وحی کی روشنی میں رسول اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ کی رفعت

یہ ہے فرق عزیزانِ من! ایک رسول کے اسوہ میں اور عام انسانوں میں۔آج کے کسی لیڈر سے جا کے چپکے سے کان میں کہہ دیجیے کہ صاحب! وہ جو ہے نالٹو وڈیرہ وہ تیار ہے آنے کے لیے لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ ہم تو اپنے اس گروہ کے سردار ہیں اپنے علاقے کے بہت بڑے زمیندار ہیں اب یہ نہ ہو جائے کہیں کہ ہم ہوں اور اسی جگہ تم ان کو بھی بٹھا دو۔تو وہ فوراً Count کرے گا کہ اس کے ساتھ کتنے ووٹس ہیں کتنے لوگ ہیں' روپیہ کتنا ہے اس کے پاس' اثر کتنا ہے اپنے علاقے میں۔ یہ اس کا معیار ہوگا اور اگر یہ دیکھے گا کہ واقعی وہ زیادہ وزنی ہے اس اعتبار سے' وہ جو شرطیں کہے گا مان لے گا۔ یہ جو اس کے ہاں ایسے بیچارے آکے داخل ہوگئے جن کا کام ہی دریاں بچھانا' کرسیاں سمیٹنا ہوتا ہے۔ان پارٹیوں میں تو یہ حیثیت ہوتی ہے بیچاروں کی' جہاں وہ غریب ہوتا ہے' وہاں بھی اسکی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن یہ تو معیار ہی اور ہے۔ یہاں یہ کہا گیا کہ کتنی کشش و جاذبیت کیوں نہ ہو ان کی اس آفر کے اندر' سوال ہی نہیں ہے۔تمہارا تو پیغام پہلا یہ ہے کہ تم نے مساواتِ انسانیہ قائم کرنی ہے۔اور اگر تم نے یہ کیا کہ ان کی خاطر ان غریبوں کو نکال دیا تو تم نے تو سب سے پہلے

مخالفت کی۔

خدا کی بارگاہ میں انسانی اعمال کے بالمقابل قبیلوں کی نسبت یا دولت کے ڈھیر کو نہیں تولا جاتا

یہاں تھا جو انہوں نے کہا تھا وَ لَا تَطۡرُدِ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَ الۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَہٗ مَا عَلَیۡکَ مِنۡ حِسَابِہِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ وَّ مَا مِنۡ حِسَابِکَ عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَتَطۡرُدَہُمۡ فَتَکُوۡنَ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ(6:52) جو محض اس مقصد کی خاطر آئے ہیں کوئی اور ذاتی مفاد نہیں جن کے پیشِ نظر' انہیں نکال دینا' جن کا پہلا مطالبہ ہی ذاتی ہے کہ ہم اونچے ہیں' ہم نہیں آئے ہیں' قطعاً غلط ہے ان سے کہہ دو کیا کاروبار یہ کرتے ہیں' کیا کام کاج کرتے ہیں' تمہیں اس سے کوئی تعلق نہیں ہے' زندگی کے کاروبار اور ہوتے ہیں ۔یعنی کوئی وہ آبرو باختہ نہیں تھے کہ ان کے کاروبار اخلاقی اعتبار سے پست تھے بلکہ یہ جو انہوں نے معاشرے میں طبقات قائم کر رکھے ہیں اس کے اعتبار سے کاروبار ان کا۔ اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہمارے ہاں میزان کریکٹر کی ہے' تقوے کی ہے ایمان کی ہے' یہ میزان نہیں ہے کہ حسب ونسب کیا ہے کاروبار کیا ہے۔ یہ آیت میں نے کہا ہے پچھلی دفعہ پورے درس کا موضوع تھی اس لیے اس میں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب آگے آیت آئی نئی پھر' اسی کے ساتھ ملتی ہوئی اور بڑی اہم آیت ہے۔ وَ کَذٰلِکَ فَتَنَّا بَعۡضَہُمۡ بِبَعۡضٍ (6:53) پہلی آیت تو یوں تھی جیسے اس دور کی ایک بات قرآن کر رہا ہے۔

دنیا کی تباہی کی سب سے بڑی وجہ طبقاتی تقسیم ہے

اب ایک اصول دیا کہ یہ بات یہیں نرالی نہیں ہے کہتا ہے یہ جو طبقات کا انہوں نے امتیاز قائم کر رکھا ہے' یہی تو مصیبت کا باعث ہے دنیا میں بَعۡضَہُمۡ بِبَعۡضٍ (6:53)۔ یہ اوپر والے انہیں حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ جب تک تو یہ مجبور ہوتے ہیں اس حقارت اور نفرت کو برداشت کرتے رہتے ہیں اور جب یہ جذبات تیز ہو جاتے ہیں تو پھر یہی ان کے خلاف اٹھتے ہیں اور معاشرے کے اندر ایک انارکی اور فساد پیدا ہوتا ہے۔ فَتَنَّا بَعۡضَہُمۡ بِبَعۡضٍ (6:53) غور فرمایا جی آپ نے! کیا بات کہہ گیا ہے قرآن۔ ٹھیک ہے ابتدائی دور میں تو یہ ہوتا ہے کہ جو اوپر والا طبقہ ہوتا ہے یہ نیچے والوں کے لیے ایک مصیبت کا باعث ہے۔ فَتَنَّا(6:53) ان کو بھٹیوں میں سے نکالتا ہے۔ ٹھیک ہے اگر یہی چیز قرآن نے کہی ہوتی جس سے مطلوب استبداد تھا تو اتنی بات تھی کہ یہ اوپر کا طبقہ نیچے والوں کو یہ۔ بَعۡضَہُمۡ بِبَعۡضٍ (6:53) ہے لیکن کہتا ہے اس کے بعد پھر ایسا ہوتا ہے کہ جب ان کا خون کھولتا ہے تو یہ جس کو اتنا نیچے کا طبقہ کہا گیا ہے پھر یہ ابھرتا ہے پھر یہ ان کے لئے اسی طرح سے مصیبت کا باعث بنتا ہے۔ کہا یہ طبقاتی امتیاز ہی تو ہے جو فتنے کا باعث ہے اس دنیا کے اندر۔ کَذٰلِکَ فَتَنَّا بَعۡضَہُمۡ بِبَعۡضٍ(6:53) میں کیا عرض کروں صاحب! قرآن کے الفاظ کیا کہہ جاتے ہیں۔ ایک وقتی کسی دور کی بات یوں کر رہا ہے قرآن کہ اس زمانے میں یہ بات ان کا مطالبہ تھا۔ یہ نہیں مانا گیا اور آگے اصول دے رہا ہے ایک' کہتا ہے یہی چیز

ہے۔اسی طرح سے یہ طبقات ایک دوسرے کے لیے عذاب بن جاتے ہیں' فتنہ بن جاتے ہیں اور ہمیشہ یہ ہوتا چلا آیا ہے۔اور ہماری تعلیم یہ ہے کہ ہم ان طبقات کو مٹا رہے ہیں کہ وہ وجہ فساد آدمیت ہے ایک شئے' اسے ہم مٹانا چاہتے ہیں۔شرافت وتقوے کو معیار قرار دیجئے آپ دیکھئے کس طرح سے یہ فساد مٹتے ہیں۔وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا (6:53) کہتا ہے کیسے یہ چیز فتنہ بنتی ہے؟

انسانی معاشرے میں فتنہ وفساد کی اصل وجہ نیز ایک بنیادی اصول کی وضاحت یعنی کسی عمل میں ارادے کا دخل

یہ جنہوں نے قوت ودولت جمع کر رکھی ہوتی ہے یا کسی بڑے گھر میں پیدا ہو گئے ہوتے ہیں' قرآن کہتا ہے یہ بات کہ یہ کہ فلاں بچہ کس کے گھر میں پیدا ہو گیا' وہ کہتا ہے اس میں اُس بچے کی خوبی کیا ہے۔یعنی کونسا جوہرِ ذاتی تھا جس کے لیے اس نے اس گھر میں پیدائش لی۔اس سے تو پوچھا بھی نہیں گیا تھا پہلے کہ کس گھر میں پیدا ہونا چاہتے ہو' کوئی اختیار کی چیز ہی نہیں ہے۔اور اصول یاد رکھئے قرآن کا جس بات میں کسی کا اپنا اختیار وارادہ شامل نہ ہو' اسکی وجہ سے نہ اس کو کوئی عزت دی جاسکتی ہے نہ اس کو سزا دی جاسکتی ہے۔اصول ہے قرآن کا جرم کے متعلق بھی۔قرآن نے یہ بات کہی ہے کہ یاد رکھئے جس فعل کے اندر انسان کا قلب شامل نہ ہو كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (2:225) عمل تمہارے قلب کا جس کے اندر شامل نہ ہو اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔بڑی چیز ہے۔یہ الگ بات ہے کہ جو چیزیں سہواً بھی ہوتی ہیں اس کے لیے یونہی عادت نہ اپنی بنالو Carelessness کی' لاپرواہی کی' اور یوں کرتے چلے جاؤ۔اس پہ بھی وہ سرزنش کرتا ہے۔لیکن اسے وہ جرم قرار نہیں دیتا۔اس نے تو قتل عمد اور قتل خطا کے اندر فرق کیا ہوا ہے۔جس میں دل کا ارادہ شامل ہو۔یہ جو بچہ پیدا ہو جاتا ہے یہ بڑے کے گھر میں' بڑے بڑے کارخانے داروں کے گھر میں' اس میں اس بچے کے دل کے ارادے کی شمولیت کہاں ہوتی ہے۔یہ جو غریب کے گھر میں پیدا ہو جاتا ہے' وہ پیدا ہونے سے پہلے وہاں پرچی لکھ کے دیتا ہے کہ ٹھیک ہے اس گھسیارے کے گھر میں' میں پیدا ہونا چاہتا ہوں۔دونوں کا اس میں اختیار نہیں۔اس لیے یہ چیزیں ان دونوں میں وجہ امتیاز کیوں ہوں۔یہ چیز کہتا ہے انہوں نے پیدا کی۔سنتے ہو یہ کیا کہتے ہیں۔عجیب چیز ہے۔کہتا ہے آتے ہیں اور کہتے ہیں اور تمہارے پاس جو طبقہ بیٹھا ہوتا ہے' وہ ان کی نگاہوں میں بڑا ذلیل ہوتا ہے۔کہتا ہے اچھا یہ ہیں ہم میں سے جن پہ خدا نے بہت انعام کیا۔مومن ہونا تو بہت بڑی چیز تھی۔

قرآنی معاشرے میں عزت وذلت کے معیار کے پیمانے

ساری عزت قرآن کہتا ہے کہ وہ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (63:8) ہے۔اتنا بلند مرتبہ اس کا پھر ہو جاتا ہے کہ بلالِ حبشیؓ آ رہا ہے اور عمرِ فاروقؓ کہہ رہا ہے' سیدنا بلال آ رہے ہیں۔کہتا ہے یہ آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اچھا! یہ ہیں ہم میں سے جن کو خدا نے

اتنی بڑی نعمتوں سے نوازنے کے قابل سمجھا۔ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ (6:53) تمہارا علم تو یہی تھا کہ یہ فلاں کے گھر میں پیدا ہوئے' یہ اس قبیلے میں پیدا ہوئے یا کہ یہ کاروبار کے اعتبار سے یہ سبزی فروش ہے' یہ دودھ بیچتا ہے' یہ حجام ہے۔ تم سے زیادہ وہ جانتا ہے کہ کون وہ ہے جو قدر شناس ہے ہماری ان نعمتوں کا' کون وہ ہے جو ناقدری کر رہا ہے۔ کون وہ ہے کہ جس کے تمام اعمال بے نتیجہ رہ جاتے ہیں فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (18:105)۔ کون وہ ہیں جن کے اعمال بھرپور نتائج دینے والے ہیں ہم جانتے ہیں۔ تمہارے معیاروں کے مطابق یہاں یہ کچھ نہیں ملتا ہمارے معیاروں کے مطابق یہ کچھ ملتا ہے۔

قرآنی معیار کے مطابق راندہ درگاہ وہ ہے جو ارادے سے سرکشی پر اتر آئے

معیار یہ ہے کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (49:13) رسول سے کہا کہ یہ ہے وہ جماعت جو تمہاری طرف کھنچ کے آ رہی ہے اس کو اور کھینچ کے بلاؤ۔ اسوۂ ابراہیمؑ کے ماتحت' ان وحشی پرندوں کو سدھاؤ' اپنی آواز پہ لگاؤ' پھڑ پھڑاتے ہوئے بلانے پہ تمہاری طرف آئیں۔ ٹھیک ہے ان سے غلطیاں بھی ہونگی' سہو بھی ہوگا ان سے' یہ چیزیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بناء پہ ان کو تم جماعت سے نکال دو اور ان کو تم مطرود اور مردود قرار دیدو' ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہو جائیں۔ یہ بات نہیں۔ سہو اور خطا سے راندۂ درگاہ نہیں ہوتا۔ وہ جو دل کے ارادے سے سرکشی برتتا ہے وہ راندۂ درگاہ انسان ہوتا ہے۔ کتنی بڑی گنجائش ہے جو رکھ دی گئی ہے عزیزانِ من!۔ اور دیکھیے اس گنجائش کو کن الفاظ میں قرآن بیان کرتا ہے۔ وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ (6:54) یہ لوگ جو ایمان لائے ہیں' کتنے ہی نچلے درجے کے کیوں نہ ہوں ان کے معیار کے مطابق' یہ جب تمہارے ہاں آئیں' عام الفاظ میں تو یہ کہیے کہ رسول سے کہا گیا ہے کہ ان سے کہو سلام علیکم۔ پہلے تو یہی دیکھیے یعنی اگر یہ چیز محض Formally بھی کی جائے' اس میں بھی کتنی بات ہے وہ جو تفاوت ہے طبقاتی' اس کو مٹانے کی۔

رسولِ ہاشمی ﷺ نسبی اعتبار سے بلند ترین مقام پر فائز تھے

رسول قریش کے بلند ترین قبیلۂ ہاشم کا بلند ترین فرد ہے نسبی اعتبار سے۔ مقام ہے اس کا جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے۔ جہاں تک ایمان کا تعلق ہے اس کی رسالت پہ ایمان لانے سے یہ مومن ہوئے ہیں۔ اس کے فیصلوں کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کبیدگی نہیں ہونی چاہیے یہ قرآن کا ارشاد ہے (4:65)۔ یہ مقام ہے رسول کا۔ Formally میں کہہ رہا ہوں کہ وہاں یہ چیز کہی گئی کہ یہ آئیں تو تم کہو سلام علیکم۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی بڑی چیز ہوتی ہے۔

ذہنی تفاوت کو مٹانے کا بہترین انداز فرمانِ رسول ﷺ کی روشنی میں

عزیزانِ من! ۔وہ جو ہے ہمارے ہاں حضور ﷺ کا فرمان چمکتا ہوا فرمان کہ سوار کو چاہیے کہ پیادے کو سلام کرے۔ بڑی چیز ہے اس میں۔ غیر شعوری طور پر Psychologically ایک چیز جو اندر پیدا ہو رہی ہوتی ہے سوار کے' پیادے کے تفاوت ہے نا۔ یونہی مٹا دیا کہ پہل تم کرو۔ لیکن اصل چیز جو اس کے اندر ہے فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ (6:54) کوئی بات نہیں ہے اگر کہیں کوئی سہو ہو جاتا ہے کسی قسم کی لغزش ہو جاتی ہے' کوئی بات نہیں تمہارے لیے سلامتی ہے۔ سلامتی کا پیغام رسول کی زبانِ مبارک سے مل رہا ہے ان لوگوں کو۔ بڑی چیز ہے عزیزانِ من! ۔غلطیاں ہو سکتی ہیں' سہو ہو سکتا ہے انسان سے۔ سوال یہی ہے کہ اس سہو سے ردِعمل کیا ہوتا ہے۔ یہاں ایک قسم کی غلطی نوکر سے آپ کے ہو اور اسی قسم کی غلطی بیٹے سے ہو' آپ دیکھتے ہیں دونوں کے ڈانٹنے میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ سہو ہوتا ہے دونوں کے ہاں۔ اس کا سہو جرمِ عمد بن جاتا ہے آپ کے نزدیک۔ صاحبزادہ کے متعلق اگر کہا بھی جاتا ہے' کوئی سہو اور غلطی نہیں بڑے بڑے عیوب اخلاقی۔ بات ہوتی ہے تو کہتا ہے باپ اوہ کوئی بات نہیں اس عمر میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے ٹھیک ہے۔ آہستہ آہستہ اسکے بعد یہ سمجھ جائیں گے۔ یعنی اگر کہیں شراب پیتا ہوا بھی پتہ چلے اور ماں اس کا شکوہ کرے تو وہ کہتے ہیں' ہوا ہی کرتا ہے ایسی عمر کے اندر۔ نوکر کے متعلق کہہ دے کہ یہ بیڑی پیتا تھا۔ ہاں! بیڑی پیتا تھا بس ٹھیک ہے آج بیڑی پیتا ہے' کل شراب بھی پیئے گا' نہیں بھئی یہ نہیں۔ اور پھر کھال اترتی ہے اس کی۔

انسانی ذات پر اپنے اپنے ماحول کے مطابق وارد ہونے والے نفسیاتی اثرات

طبقاتی امتیاز آپ دیکھتے ہیں' کہاں کہاں جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے یہ جوان کے نزدیک نچلے درجے کے لوگ ہیں ٹھیک ہے' سہو بھی ہو جائے گا ان سے' غلطی بھی ہو جائے گی۔ اور عزیزانِ من! قرآن تو اس کا بڑا الاؤنس دیتا ہے۔ یہ جو ابتدائی تربیت ہے' ماحول ہے انسان کا' جس گھر میں پیدا ہوتا ہے جس قسم کا ماحول ہوتا ہے' اس کا بڑا اثر ہوتا ہے اس کے اوپر۔ ایک بچہ پیدا ہوتا ہے جرائم پیشہ لوگوں کے اندر' ابتدائی تعلیم و تربیت اس کی اس انداز کی ہوتی ہے کہ وہ جرم کو کچھ زیادہ قابلِ نفرت چیز سمجھتا ہی نہیں ہے۔ بعد میں وہ آ جاتا ہے اس قسم کی جماعت کے اندر۔ ان چیزوں سے توبہ وہ ضرور کر لیتا ہے۔ لیکن اس میں اور ایک بچہ جو اس قسم کے ماحول میں پیدا ہوا ہے جہاں گھر کے اندر شرافت' نجابت' ہر قسم کے اخلاقِ حسنہ موجود تھے' تعلیم اچھی ملی' تربیت اچھی ملی ان دونوں میں آپ دیکھیں گے۔ دونوں اس جماعت کے اندر آ جائیں' دونوں کے اندر ایک فرق ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں ماحولیاتی اثرات کے مطابق سزاؤں کا تعین

قرآن اندازہ لگائیے کہ اس فرق کو کیسے ملحوظ رکھتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ اگر زنا کا ارتکاب ایک (اس زمانے میں آزاد عورت کہتے تھے

بڑے گھرانے کی شریف بیبیاں جن کو ہم کہتے ہیں' خواتین بیگمات) ان میں سے بھی کسی سے یہ لغزش ہو اور یہ جو باندیاں' چھوکریاں ملازمائیں ہیں ان سے بھی وہی حرکت سرزد ہو تو قرآن کہتا ہے کہ یہ جو چھوکریاں' باندیاں ہیں ان کی سزا ان سے آدھی ہوگی۔اس لیے کہ ان کی تربیت ایسے ماحول میں ہوئی ہے کہ یہ اتنا زیادہ حساس نہیں ان کو بنا سکیں ان جرائم کے متعلق۔اور نسآء النبی کے متعلق کہا ہے' نبی کی بیویاں اور نبی کے گھر کی عورتوں کو کہا ہے کہ تم سے اگر اسی قسم کی خطا ہوئی جو عام عورتوں سے ہوتی ہے' تمہیں دوگنی سزا ملے گی۔اس لیے کہ تم دوسری عورتوں جیسی عورتیں نہیں ہو۔کیا بات ہے اس قرآن کی عزیزانِ من!۔یہ دیکھنا پڑتا ہے۔سزا دیتے وقت یہ دیکھنا پڑتا ہے۔

معاشرتی آداب کے پیشِ نظر مختلف اشاروں اور جذبات کا ذکر

یہ جماعت جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ تقاضا ہے' نکال دو یہ سب کچھ کرو۔کہا ٹھیک ہے' ہوسکتا ہے کہ ان سے کچھ اس قسم کی باتیں بھی ہوں جو عام طور پہ مہذب سوسائٹی میں معیوب سمجھی جاتی ہوں۔یہ کس قسم کی سوسائٹی تھی جس میں سے یہ لوگ آئے تھے۔قرآن ہمیں بتاتا ہے' بڑے عجیب عجیب اشارے ملتے ہیں۔انہیں یہ بھی قرآن سکھاتا ہے کہ میاں! آیا کرو تو باہر سے دروازہ کھٹکھٹا کے اندر آیا کرو۔یہ تھی وہ جماعت یعنی یہ تھی وہ سوسائٹی جس میں سے یہ لوگ نکل کے آئے ہیں۔اجازت لے کے آیا کرو' قرآن ان کو یہ بھی بتاتا ہے کہ دیکھیے اگر دعوت کے لیے تمہیں بلایا جائے تو اتنی جلدی آ کے نہ بیٹھ جایا کرو کہ '' ہجے ہانڈیاں چاڑھیاں ہویاں ہون تے تسی بہہ جاؤ آن کے''۔یعنی یہ چیزیں قرآن میں آئی ہیں' ان کو یہ بتاؤ کہ یہ نہ کیا کرو' گھر والا تنگ پڑ جاتا ہے۔اور اس کے بعد یہ ہے کہ کھانا کھا لو تو پھر اسکے بعد وہاں باتیں کرنے کے لیے' داستان گوئی کے لیے نہ بیٹھ جاؤ۔گھر والوں نے کچھ اپنے کام کرنے ہیں' انہوں نے آرام کرنا ہے۔یہ تھی عام تربیتی حالت اس سوسائٹی کی جس میں سے یہ لوگ آئے ہیں۔اور پھر ان میں سے' اس تعلیم و تربیت کے بعد' یہ جو لوگ ہوئے ہیں' انہوں نے ایران کے کسریٰ اور بازنطین کے قیصر کو بھی تہذیب و تمدن کے اصول سکھائے ہیں۔عمرؓ کا بنایا ہوا کوڈ آج بھی ان لوگوں کے ہاں شمعِ ہدایت دیتا ہے۔لیکن قرآن اس کی رعایت رکھتا ہے کہ یہ اس قسم کے ماحول سے آئے ہیں اس لیے ان سے اگر اس قسم کی کوئی معیوب سی حرکت ہو جائے کسی قسم کی جس کو یہ لوگ اتنا بڑا چڑھا کے پیش کرتے ہیں کہ ان کے ہاں ہم آ کے بیٹھے ہیں ان کو یہ بھی پتہ نہیں کہ جوتا اتار کے اس دری پہ بیٹھا کرتے ہیں۔کہا اگر تمہارے ہاں یہ لوگ آئیں' انہیں دھتکارا نہ کرو۔بڑی چیز ہے عزیزانِ من! یوں تربیت کی جاتی ہے سوسائٹی میں۔انہیں دھتکارا نہ کرو۔اور اس کے بعد جب آئیں تو سلام علیکم کہو کہ کوئی بات نہیں ہے' گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے اگر اس قسم کی کوئی چیز معیوب سی ہوگئی ہے' کوئی بات نہیں!

خدا تعالیٰ کی صفت اللہ الصمد کے مروجہ تراجم انسان کو حقیقت تک پہنچنے ہی نہیں دیتے

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6:54) عظیم چیز ہے عزیزانِ من! خدا نے اپنے اوپر رحمت کو واجب قرار دے رکھا

ہے۔ کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6:54)۔ دہرادوں جو بار بار چیز آئی ہے۔ انسانوں کے متعلق بھی قرآن نے یہی لفظ یہ مادہ کَتَبَ (6:54) کا ہی ہے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (2:183)' کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ (2:216) تم پہ فرض قرار دیے گئے ہیں صیام' تم پہ فرض قرار دیا گیا ہے قتال۔ خدا کی طرف سے تو بندوں کے اوپر یہ چیز فرض قرار دی جاتی ہے' واجب ہو جاتا ہے ان کے اوپر ایسا کرنا' ضروری ہو جاتا ہے تم پہ کرنا۔ خدا تو قادرِ مطلق ہے تمام لا انتہا اختیارات کا مالک ہے اس کے اوپر پابندی کے کیا معنی ہیں۔ یہ جو چیز کہی کہ صیام واجب قرار دیدیے گئے ہیں۔ صبح سے لے کر رات تک تم نے کھانا پینا نہیں ہے۔ پابندی عائد کی اوپر سے کسی پابندی عائد کرنے والے نے۔ خدا پہ کون پابندی عائد کرسکتا ہے۔ اور خدا کا تو تصور ہمارے ہاں یہ ہے اَللّٰهُ الصَّمَدُ (112:2) کا ترجمہ لا پرواہ یعنی بڑی صفت اس کی بیان ہو رہی ہے کہ اس کو کیا پرواہ ہے کسی کی۔

خدا تعالیٰ کی ذات اپنے اوپر خود پابندی عائد کرتی ہے دیکھیے لفظ رحمت اور توکل کا لغوی مفہوم

تو کہا کہ غلط ہے یہ بات۔ ہمارے اوپر کوئی اور پابندی نہیں عائد کرسکتا۔ ہمارے اوپر کوئی نہیں ہے۔ لیکن ہم اپنے اوپر خود پابندی عائد کرتے ہیں۔ اور کہا کہ اپنے اوپر جو خود پابندی عائد کی جائے' اس سے آزادی نہیں سلب ہو جاتی۔ اسی کو تو اصول پرستی کہتے ہیں۔ ہم ایسا کرسکتے ہیں' ہم ایسا کریں گے نہیں۔ کیونکہ ہم نے یہ تم سے وعدہ کر رکھا ہے اور ہم اپنے وعدے کے خلاف کبھی نہیں کرتے (30:6)۔ کتنی بڑی پابندی ہے۔ انسان کو کہا گیا کہ تم یہ کرو' تم یہ کرو' پابندیاں عائد کیں اور اس کے بعد کہا فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (18:29) جس کا جی چاہے کرو جس کا جی چاہے نہ کرو۔ یعنی اس پہ پابندی عائد کرنے کے بعد اس کو ایسا رکھا ہے کہ جی چاہے ایسا کرو' جی چاہے ایسا نہ کرو۔ اور اپنے متعلق کہا کہ ہم جب اپنے اوپر پابندی عائد کرتے ہیں تو ہم اس کے خلاف کبھی کرتے ہی نہیں ہیں۔ وہ جو عام الفاظ میں' میں کہا کرتا ہوں کہ انسان اس کے باوجود صاحبِ اختیار رہے۔ خدا اپنے اوپر پابندی عائد کرنے سے اپنا اختیار ہی سلب کر لیتا ہے۔ اللہ اکبر۔ اور جب خدا وہ بنے کہ جس کا سایہ اس زمین کے اوپر آپ کا نظامِ مملکت ہو تو پھر اس نظامِ مملکت کو کیا ہونا چاہیے۔ کہ جو پابندیاں اپنے اوپر یہ عائد کرے ان کو کبھی نہ توڑو۔ کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6:54) اس نے اپنے اوپر رحمت کو فرض قرار دے لیا ہے۔ رحمت۔ ہمارے ہاں تو رحمت کا وہ تصور ہے نا

اوتھے کی پرواہ اے راکب اوتھے بے پرواہیاں
پھڑ لے عملاں والیاں نوں چھڈ دے اوگنہگاراں نوں

''اے چھڈ دے اوگنہگاراں نوں رحمت کیندے نیں''۔ پھر لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (39:53) کچھ نہ کرو بیٹھے رہو ہاتھ پاؤں توڑ کے' اس کا نام توکل۔ ملیں گے کیسے خدا کی رحمت سے؟ جتنے گنہگار ہیں وہ سارے کے سارے بیٹھے مست ہوئے ہیں۔ کیا

بات ہے صاحب؟ وہاں تو ''عملاں دے اتے نئیں نبیڑا ہیگا' اوہدی رحمت نال نبیڑا ہیگا''۔

باز آفرینی کی گنجائش کے لیے اگر خدا کی طرف سے رحمت کا عمل شاملِ حال نہ ہوتا تو پھر کسی کی زندگی ثمر بار نہ ہوتی

آپ کو پتہ ہے کہ یہ رحمت کیا ہے؟ سنئے رحمت کیا ہے؟ سہو اور خطا کہا کہ اس کا امکان ہے' انسان میں یہ ہوسکتا ہے۔ سہو اور خطا کے بعد اگر اس کو ہمیشہ کے لیے دھتکار دیا جائے' مردود کر جائے کہ اب باز آفرینی کی کوئی گنجائش نہیں ہے' یہ اس کے لیے تباہی ہے۔ گنجائش ہی کوئی نہیں ہے ایک ہی دروازہ تھا اس کا اس نے' وہ بند کر دیا۔ کہا کہ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ ہماری رحمت ہے۔ رحمت کا معنی ہوتا ہے' سامانِ نشوونما دینا' صلاحیتوں کو ابھارنے کا سامان دینا جس میں لچک ہو۔ بڑی عجیب چیز ہے یہ۔ رِحم کی طرح سے جیسے بچے کی نشوونما اس میں ہوتی ہے کتنی Elasticity ہوتی ہے اس کے اندر۔ کہا یہ جو انداز ہے ہمارا سنئے۔ اب دیکھئے عزیزانِ من! یہ جو آیا ہے کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کو فرض قرار دیدیا ہے' وہیں تشریح ہے ساتھ۔ سنئے رحمت کیا ہے۔ اَنَّـهٗ مَـنْ عَـمِـلَ مِنكُمْ سُوْٓءً بِجَهَالَةٍ (6:54) رحمت یہ ہے کہ تم میں سے کوئی کسی قسم کی لغزش کرتا ہے جہالت کی بناء پہ' ناواقفیت کی بناء پہ' سہواً ایسا ہوجاتا ہے۔ تو پھر؟ یہودی شریعت تو اس کو ہمیشہ کے لیے Condemn کرتی ہے۔ عیسائی شریعت کے اندر Mercy اور رحمت یہ تھی کہ عمل سے نجات ہو ہی نہیں سکتی۔ کہتا ہے دونوں غلط ہیں۔ مَنْ عَـمِـلَ مِـنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِـجَهَالَةٍ (6:54) عمداً دل کے ارادوں سے اس سے ارتکابِ جرم نہ ہو' جہالت سے یہ چیز ہو۔ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ (6:54) پھر اس کے بعد اس سے ندامت ہو' باز آ جائے پلٹ کے آ جائے وہیں پھر۔ تَابَ کا معنی آپ کو معلوم ہے کہ جہاں سے غلط راستہ اختیار کیا تھا' جہاں احساس ہوا کہ غلط راستے پہ آ رہا ہوں' وہاں سے لوٹ کے پھر اس مقام پہ آنا' اسے توبہ کہتے ہیں۔ وہاں پھر آ جائے وہ۔ آ گیا' گویا اس سے کام بن گیا۔ نہیں صاحب! یہاں آنے کے بعد صحیح راستے پہ چلے گا تو پھر منزل پہ جائے گا' اگلی بات یہ ہے۔ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ (6:54) پھر جو صحیح کام ہیں' وہ کریں۔ یہاں آنے کے بعد یہ موقعہ جو اس کو دیا گیا فَـاَنَّـهٗ غَـفُـوْرٌ رَّحِيْمٌ (6:54) یہ ہے رحمت' رحیم۔ وہ پھر کرتا یہ ہے کہ یہ جو غلطی سے تم سے سہواً کوئی چیز ہوئی' اس سے نقصان کی حفاظت کرتا ہے اور وہ رحمت اس کی اسی طرح سے سامانِ نشوونما لیے ہوئے آ جاتی ہے اور تمہارے ساتھ چلتی ہے۔ یہ ہے رحمت عزیزانِ من!۔ یہیں سمجھا دیا قرآن نے۔ سُوْٓءًۢا بِـجَهَـالَةٍ (6:54) اور اس کے بعد پھر تَـابَ وہیں آئے اور اس کے بعد اَصْلَحَ (6:54) صحیح قدم اٹھائے' رحمت اس طرح سے آ جاتی ہے۔ ان سے کہدو۔ اور اگلی بات یہ ہے کہ وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لِتَسْتَبِيْـنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ (6:55) یہ بات دیکھا کیسے ہم نے واضح کر کے بتادی ہم یوں واضح کر کے بتاتے ہیں تا کہ یونہی سہواً

غلط راستے پہ چلنے والا اور جو دانستہ جرم کا ارتکاب کرنے والا' ان دونوں کے راستے الگ الگ ہو جائیں۔ کیا بات کہتا ہے قرآن۔ یہ ہے میری دعوت۔ کہا ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں دعوت کیا دیتا ہوں؟ یہ چیزیں نہیں ہیں کہ یہ کاروبار کیا کرتا ہے' یہ چھابڑی فروش ہے' یہ خوانچہ لگاتا ہے' یہ حجام ہے' یہ سقہ ہے' تم بہت بڑے سردار ہو۔

ذاتِ خداوندی اپنے جذبات کی تسکین کی خاطر دوسروں کو اپنا محکوم نہیں بناتی

قُلۡ اِنِّیۡ نُہِیۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ (6:56) کہا مجھے اس بات سے روک دیا گیا ہے کہ خدا کے علاوہ کسی اور کی محکومی اختیار کروں۔ سیدھی سی بات ہے میرا تو یہ پیغام ہے۔ اطاعت محکومی فرماں پذیری صرف خدا کے احکام کی ہے کسی اور کی نہیں ہے۔ تم بڑے سردار بنے پھرتے ہو' ان لوگوں کو اپنے ماتحت رکھنا چاہتے ہو' اپنا مطیع بنانے چاہتے ہو' فرماں بردار بنانا چاہتے ہو' میری دعوت اس کے خلاف دعوتِ انقلاب ہے۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کسی دوسرے انسان کو اپنے سامنے جھکائے۔ مجھے اس سے روک دیا گیا ہے کہ خدا کے علاوہ کسی اور کے سامنے جھکوں اور کسی کی محکومیت اختیار کروں۔ یہ جو تم جھکاتے ہو لوگوں کو اپنے سامنے' کیا ہے؟ بڑی عجیب چیز کہہ گیا ہے۔ یہ تمہارے اندر برتری کا ایک جذبہ ہے ایک Complex پیدا ہوا ہوا ہے دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہو' اپنے جذبات کی تسکین کے لیے دوسروں سے اپنے احکام منواتے ہو۔ اگر کوئی کام نہیں ہوتا' نکلتے ہو گھر سے باہر' نوکر کو یا مالی کے لیے تو وہ کہہ دیتے ہو کہ بھئی! شام تک یہاں سے یہاں تک تین فٹ گہرا ایک گڑھا کھود رکھنا۔ کھود دیا اس نے' وہ تو پوچھ نہیں سکتا کیوں کھودوں' کھود دیا۔ دوسرے دن اٹھے ان سے کہا کہ کھود دیا' ہاں ٹھیک ہے صاحب' آج دن بھر میں اس گڑھے کو پھر اسی طرح سے بھر دینا۔ چلے گئے۔ اس سے کہا یہ کیا کیا تم نے' کیا فائدہ۔ کہنے لگے اگر ان سے اس طرح سے حکم کو نہ منواتے رہا کریں تو ان کی عادت بگڑ جاتی ہے۔ وہ عادت ان کی نہیں بگڑتی' اندر جو ایک تسکین خود چاہتا ہے نا انسان' پندارِ نفس جو ہے اس کی تسکین نہیں ہوتی۔ سنئے کیا کہتا ہے قرآن' مجھے تو اس سے روک دیا گیا ہے۔ قُلۡ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَہۡوَآءَکُمۡ (6:56) تم یہ جو کچھ کرتے ہو' یہ جذبات کی تسکین کے لیے کرتے ہو۔ یہاں جذبات کی تسکین کا سوال نہیں ہے۔ یہاں تو کچھ قانون ہیں' کچھ فرائض ہیں' کچھ احکام ہیں' ان کا اتباع کرنا ہے۔ جذبات کی تسکین کا کیا سوال ہے۔ قَدۡ ضَلَلۡتُ اِذًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُہۡتَدِیۡنَ (6:56) اگر میں بھی یہی روش اختیار کرلوں کہ محض جذبات کی تسکین کے لیے یہ کچھ کرنا شروع کردوں تو پھر سیدھے راستے سے میں بھی گم ہو گیا۔ میں بھی پھر اسی طرح سے جیسے تم جاتے ہو۔ لیکن میں تو قُلۡ اِنِّیۡ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّیۡ وَ کَذَّبۡتُمۡ بِہٖ (6:57) تم دیکھو جو باتیں میں کر رہا ہوں' کس قدر صاف واضح کھلی ہوئی روشن ہیں۔ تم ان کی تکذیب کرتے ہو۔ تکذیب کے بعد کہتے یہ ہو کہ تم جو کہتے ہو کہ اس کا نتیجہ تباہی ہوگا' تباہی آتی کیوں نہیں ہے۔ کہا کہ اگر تو سوال یہ ہوتا کہ تم نے مجھے گالی دی ہوتی اور میں نے لینا ہوتا انتقام تو ایک سیکنڈ میں تھپڑ مار دیتا۔

بیج بونے اور پھر فصل کاٹنے کے درمیان مہلت کا وقفہ خدا کا غیر متبدل اصول ہے

یہ مسئلہ آ گیا ہے قانون کا' قانون کی خلاف ورزی کی' اس کے نتائج نکلتے ہیں۔ اس کے درمیان ایک مہلت کا وقفہ ہوتا ہے بیج کے بونے اور فصل کے پکنے میں۔ اور وہ وقفہ ایسا ہے کہ جس کو کم کر دینا' میرے اختیار کی بات بھی نہیں ہے۔ **مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ** (6:57) جس چیز کی تم جلدی مچا رہے ہو میرے اختیار میں نہیں ہے وہ۔ قانون کے سامنے کس طرح سے' رسول خود اپنا بے اختیار ہونا بتا رہا ہے۔ کتنی بڑی چیز ہے۔ **اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ** (6:57) قانون' فیصلے' حکم یہ تو صرف خدا کے ہیں۔ میرے قانون بھی یہ نہیں بنائے ہوئے کہ آج میں نے بنایا ہے کل اس کے اندر ایک دوسرا ایشو کر دوں' اس میں ایک ترمیم کر دوں۔ کرنا کیا ہے ایک اناؤنسمنٹ ہی میں نے کرنا ہے کہ وہ منسوخ ہو گیا ہے آج سے یہ ہوگا۔ سوال ہی نہیں ہے۔ میں تو ان قوانین بنانے کے لیے مجاز ہی نہیں ہوں' بنا ہی نہیں سکتا۔ **اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ** (6:57) قانون' حکم' فیصلہ صرف خدا کا ہے میرے لیے بھی اسی کا ہے۔ **یَقُصُّ الْحَقَّ** (6:57) وہ حق کو بیان کرتا ہے تمہارے پاس۔ **وَ هُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ** (6:57) بہترین فیصلہ کرنے والا وہ ہے۔

نبی اکرم ﷺ کو نتائج کے حصول کی خاطر تیرہ سال کا طویل سفر طے کرنا پڑا

اور آگے بات کہی۔ کہا تھا کہ میرے بس میں نہیں ہے کہ میں جلدی سے وہ بات لے آؤں۔ **قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَکُمْ** (6:58) میرے اختیار میں ہوتا تو سچی بات یہ ہے' مدت سے فیصلہ ہو گیا ہوتا تمہارے اور میرے درمیان۔ کتنی بڑی مجبوریاں ہیں یہ۔ اف۔ تیرہ سال تک یہ مقابلے میں یہ کچھ کرتے رہے' کونسی اذیت تھی جو نہ پہنچائی' کونسی ہتک تھی جو نہ کی' کونسی تکلیف تھی جو نہ دی گئی۔ کہا یہ گیا کہ ایک لفظ زبان پہ نفرت اور گالی کا نہیں لانا۔ قریش کے ممتاز ترین قبیلے کا یہ فرد' اتنا بڑا جتھہ' اتنا بڑا گروہ ان کے ہاں۔ آپس میں تو اسی دن نپٹا لیا کرتے تھے۔ یعنی انہوں نے کہیں سے کوئی حکومت بھی ایسی نہیں تھی کہ جہاں سے جا کے ان کو فیصلہ لینا پڑتا' پارلیمنٹ سے ریزولیشن پاس کرانا پڑتا۔ یہ تو قبیلے تھے۔ ایک ذرا سی غصے کی بات ہوئی اور اسی وقت قبیلے نے دوسرے پہ حملہ اور چلی پھر بات یہ۔ کہا کہ میں بھی تم میں سے ہی ہوں' میرا قبیلہ بھی موجود ہے مجھے بھی معلوم ہے کہ ہم کیا کرتے تھے یہ سب کچھ میں بھی کر سکتا تھا۔ لیکن اس دعوت کے بعد تو میں ان تمام چیزوں سے خود مجبور ہو گیا ہوں۔ اس لیے کہ **اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ** اب تو فیصلہ خدا کے قانون کے مطابق ہوگا۔ کیا بات کہی ہے۔ اگر یہ معاملہ میرے اور تمہارے درمیان میں ہوتا تو مدت ہوئی اس کا فیصلہ ہو چکا ہوتا صاحب۔ لیکن **وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ** (6:58) ظالم کو کہاں تک' کس نتیجے تک' انجام تک' پہنچانا ہے اس کا زیادہ علم اسے ہے۔ اس لیے میں تو وارن کیے دیتا ہوں اور کچھ نہیں ہے۔ مجھے بھی اس کا علم نہیں ہے کہ یہ کب چیز آئے گی۔

علم غیب کی نوعیت اوراس کا مفہوم

وَ عِنۡدَهٗ مَفَاتِحُ الۡغَيۡبِ لَا يَعۡلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ (6:59) اب اپنے مقابلے میں خدا کی بات آئی۔مَفَاتِحُ الۡغَيۡبِ(6:59) غیب کے خزانے بھی معنی ہوسکتے ہیں اورغیب کے خزانے کی چابیاں بھی ہوسکتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہاں یہ چابیاں مراد ہے۔غیب وہ ہے جوکسی وقت محسوس طور پہ کسی کے سامنے نہ آیا ہو۔غیب میں بہت سی چیزیں تو ایسی بھی ہیں کہ جوانسان کے علم میں کبھی آ ہی نہیں سکتی۔ قیامت کیا ہے، بعدکی زندگی کے متعلق کیا چیزیں ہیں' کس نوعیت کی یہ چیزیں ہونگی' عالمِ امرخدا کاکس قسم کا ہے' وحی کی بنیاد کیا ہوتی۔ یہ وہ چیزیں غیب کی ہیں جن کاعلم انسان کوہوہی نہیں سکتا خدا کے لیے مختص ہے۔لیکن یہ چیزکہ ایٹم میں قوت کتنی ہے' چھ ہزار سال تک انسان کے لیے غیب رہا۔آج وہ غیب نہیں رہا' آج وہ چیزمشہود ہوگئی اس کے لیے۔اس اعتبار سے میں نے کہا ہے مَفَاتِحُ الۡغَيۡبِ(6:59) کے یہ جومعنی ہیں غیب کی کنجیاں جو ہیں' یہ کھل سکتے ہیں تالے' اس کے لیے خدانے آدم کو پیدا کیااورکہاوَ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا (2:31) اشیائے فطرت کاعلم آدم کے اندررکھ دیا گیا' امکان ہےاس کے لیے۔كُلَّهَا(2:31) یہ ہے وہ بات۔کائنات کی ہرمحسوس شے کاعلم اسے دیدیا گیاہے۔اب وہ علم تو Develope ہوکے آہستہ آہستہ آتا ہے۔ پہلا آدم جوتھا اسے تو گھر بنانا بھی نہیں آتا تھا' آگ جلانی نہیں آتی تھی' کچی سبزیاں کھالیتا تھا بیچارہ' غاروں میں رہتا تھا' درختوں پہ رہتا تھا' اتنا بھی اس کونہیں پتہ تھا۔اورآگے متمدن ہوتا ہے توحضرتِ نوحؑ کا زمانہ نظرآتا ہے کہ بہرحال ذرامتمدن زمانہ ہے۔لیکن ابھی اس آدم کے بیٹے کویہ بھی نہیں آتا تھا کہ سیلاب سے بچنے کے لیے کشتی بنالیا کرتے ہیں۔یہ بھی وحی کے ذریعے بتانی پڑی خدا کو۔یہ تمام چیزیں انسان کے لیے غیب تھیں۔آہستہ آہستہ علمِ انسانی بڑھتا چلا گیا۔ اور یہ جوقرآن نے کہا تھا کہ آدم کوعلم دیا گیا ہے اشیائے فطرت کا' اس کے مطابق جوں جوں اس کاعلم بڑھتا چلا گیا غیب کی چابیاں ملتی گئیں اس کو۔کتنا حسین انداز ہے بات کرنے کا کہ بس ہوتا صرف یہ ہے کہ جب تک اس کےعلم کی سطح اونچی نہیں ہوتی' وہ غیب کی چابی ہمارے پاس ہوتی ہے۔اس وقت تک لَا يَعۡلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ (6:59) وہ خداہی جانتا ہےاس کے اندرکیا کیا Potentialities ہیں' کیا کیا صلاحیتیں۔ ہیں چابی کہاں رکھی ہے وہ جانتا ہے۔علمِ انسانی بڑھتا چلا جاتا ہےتو وہاں سے اِس تالے کی چابی اب مل گئی پھراُس تالے کی چابی اب مل گئی' اب کھلتا چلا جارہا ہے۔اقبالؒ نے جوکہا ہے قرآن کے متعلق ایک مصرعے کے پانچ چھ الفاظ میں عزیزانِ من! اتنی بڑی حقیقت بیان کرگیا ہے اورفطرت نے اس کوبڑی صلاحیت دی تھی کہ دین کا منصب کیا ہے' مشن کیا ہے' کرتا کیا ہے۔وہ کرتا ہے

از کلید دیں درِ دنیا کشاد

مومن کرتا یہ ہے کہ دین کی چابی سے دنیا کے تالے کھولتا چلا جاتا ہے۔اوربڑی خوبصورت چیز ہے۔قرآن یہ کہتا ہے کہ مَفَاتِحُ الۡغَيۡبِ(6:59) اس کے پاس ہیں' آدم کواس طریق سے وہ ملتے چلے جاتے ہیں۔

کائنات کی خشکی اور تری میں بکھری ہوئی ان پستیوں اور بلندیوں کے پرشکوہ دامنوں کے اندر ظاہر اور باطن ہزاروں قسم کے خزانے اور پھر ایک ایک ذرے کی خصوصیات اور ان کی لحہ بہ لحہ بدلتی ہوئی شکل و صورت اور حرکات وسکنات کا علم اس خالقِ کائنات کے دستِ قدرت کے علم میں روزِ اول سے محفوظ ہے

وَ یَعۡلَمُ مَا فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ ؕ (6:59) خدا کو اس کا علم ہے خشکی اور تری میں کیا ہے۔ وہ یہی علم جب انسانوں کو دیتا جاتا ہے تو انسان بھی تسخیرِ کائنات کرتا چلا جاتا ہے۔ وَ مَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَۃٍ اِلَّا یَعۡلَمُہَا (6:59) ایک درخت سے پتہ جب گرتا ہے اسے اس کا بھی علم ہے۔ وَ لَا حَبَّۃٍ فِیۡ ظُلُمٰتِ الۡاَرۡضِ وَ لَا رَطۡبٍ وَّ لَا یَابِسٍ (6:59) زمین کی گہرائیوں کے اندر، زمین کی تاریکیوں کے اندر ایک دانہ جو تم ڈالتے ہو اس کا بھی اس کو علم ہوتا ہے۔

علم غیب سے علم مشہود تک پہنچنے کا طریق اور قرآن حکیم کو قرآنِ مبین بنانے کا مقصد

رطب و یابس جو ہے محاورے کے طور پہ بولتے ہیں جیسے ہر چیز کا علم ہو۔ جیسے خشکی اور تری کہا جاتا ہے اسی طرح سے یہ محاورہ بولا جاتا ہے۔ ان کا علم ہے اس کو، اس کے علم میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو غیب ہو۔ انسان کے لیے یہ غیب جو ہے، مشہود بنتا چلا جاتا ہے، جوں جوں اس کا علم ترقی کرتا ہے اور خدا اس کو اس غیب کی چابیاں دیتا چلا جاتا ہے۔ کہا یہ سارا علم ہے خدا کا، کہاں ہے یہ؟ یہ ہے غور طلب چیز۔ علم اس نے ایک تو وہ ہوتا ہے وہ صدری علم، جسے حکیم صاحب کا نسخہ کہتے ہیں۔ اپنے ہی سینے کے اندر رکھا، علاج کرتے گئے، معرکتہ الآراء، مر گئے قبر میں، آگے چلتا ہی نہیں ہے ختم ہوا۔ اور اگر وہی جو اس کے نسخے ہیں، وہ کتاب میں لکھ دے۔ ٹھیک ہے اپنے اس کے دور کے اندر وہ کتاب نہ ہی شائع کرے اس کے مرنے سے وہ ختم نہیں ہو جائے گا۔ جو چیز کتاب میں آجاتی ہے، محفوظ ہو جاتی ہے۔ جب بھی اس کتاب کے پڑھنے کی صلاحیت کسی اور کو ہو گی، اس کا علم اسے حاصل ہو جائے گا۔ کہا یہ ساری چیزیں ہیں، اس کا علم ہے خدا کو۔ اور یہ کہاں ہیں؟ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ (6:59) سینے میں نہیں چھپا کے رکھ لیں، کتابِ فطرت میں یہ سارا علم ہم نے بھیج دیا ہے۔ کتاب ہے کتابِ مبین، اوگپت ودیا نہیں ہے برہمنوں کے ویدوں کی طرح، پرانوں کی طرح، کتابِ مبین ہے، ہم نے چھپا کے نہیں کہیں رکھی ہم نے عام کر دیا ہے اس کو۔ We have published the book بڑی روشن کتاب ہے، بڑی وضاحت سے بات کرنے والی پھیلی ہوئی ہے، جاؤ پڑھو۔ جتنے جتنے ورق پڑھتے چلے جاؤ گے، غیب مشہود ہوتا چلا جائے گا۔ یہ ہے طریقہ اس کا۔ اگلی آیت آئی دو چار منٹ تو آپ مجھے دے ہی دیں گے ذرا اور ویسے بھی میں نے پانچ منٹ بعد میں شروع کیا تھا نا جی، پانچ منٹ دیدیں گے۔ بات بڑی اہم ہے۔

خدا تعالیٰ رات کے وقت انسان کو وفات دیتا ہے کا مفہوم

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُکُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤی اَجَلٌ مُّسَمًّی ج ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُکُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (6:60) کیا باتیں ہیں صاحب!۔ عام ترجمے کے اعتبار سے دیکھیں گے وہ ہے جو رات کو تمہیں وفات دیتا ہے ثُمَّ یَبْعَثُکُمْ فِیْهِ (6:60) پھر دن میں اٹھا کھڑا کرتا ہے اور وہ جانتا ہے پھر جو کچھ تم دن میں کرتے ہو۔ اٹھا کھڑا کرتا ہے کہ اس طرح سے وہ جو ایک میعاد ہے مقررہ، وہ پوری ہوتی چلی جائے۔ عمر کی نہیں بلکہ اعمال کے نتیجہ مرتب کرنے کی۔ اور پھر اس کے بعد وہ تمہیں بتا دے گا تم نے کیا کیا کیا اور اس کے نتائج کیا کیا تمہارے سامنے آئے۔ بات تو یہ ہے۔ بات جو میں نے کہا تھا نا تھوڑا سا وقت چاہتا ہے۔ وفات دیتا ہے رات کے وقت، یہ کیا چیز ہے؟ وفات کی بات قرآن بڑے ہی لطیف کنایے سے بیان کرتا ہے اس لیے کہ یہ باتیں وہ تھیں جو انسان کے علم کی سطح کے بلند ہونے کے ساتھ سمجھ میں اچھی طرح سے آ سکتی تھیں۔ اس زمانے کے انسانوں کے سمجھ میں ابھی بات نہیں آ سکتی تھی۔ ہر دور میں بھی انسانی علم کی سطح جن افراد کی نیچے ہوتی ہے، ان کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ لیکن وہ کتابِ مبین میں لکھ گیا ہے کہ جب بھی تمہاری سطح اتنی اونچی ہو تم میں سے جو بھی اس کتاب کو پڑھنے کے قابل ہو جائے وہ پڑھ لے، بات سمجھ میں آ جائے گی جسے آپ وفات کہتے ہیں رات کو جو کچھ ہوتا ہے اس سے قرآن ایک دلیل لایا ہے، مرنے کے بعد جو کچھ ہوتا ہے۔

نیند کی حالت میں انسان کے نفس کو روکنے اور موت کی حالت میں نفس کو روکنے میں فرق

اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا (39:42) خدا نفس انسانی کو وفات دیتا ہے موت کے وقت بھی اور نیند کی حالت میں بھی۔ فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰۤی اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی (39:42) موت جس پہ طاری ہو جاتی ہے اس کا نفس اس کو، تو روک لیتا ہے، جو صرف سوئے ہوتے ہیں، نیند جن پہ طاری ہوتی ہے ان کا واپس آ جاتا ہے۔ بڑی گہری چیز نیند اور موت کے اندر ایک کیا چیز مشترک ہے اور یہیں سے بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ نیند کی حالت میں انسان کی زندگی (Life) جان اسی طرح سے ہوتی ہے، وہ تو نہیں روکی جاتی، زندہ ہوتا ہے۔ اس کے جتنے بھی اعضاء و جوارح ہیں، فنکشن کر رہے ہوتے ہیں۔ مردہ میں یہ چیز نہیں ہوتی، جان نہیں ہوتی۔ لیکن نیند کی حالت میں جان تو باقی ہوتی ہے۔ وہ جو قرآن کہتا ہے کہ وہ نفس کو لے جاتا ہے تو نفس جان کے معنی میں نہ ہوا، جان کو تو نہیں لے جاتا نیند کی حالت میں۔ کوئی اور چیز ہے۔ نفس انسان کی یہ Biological Life نہیں ہے کیونکہ نیند کی حالت میں اسے نہیں لے جاتا وہ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہے موجود، کیا چیز ہوتی ہے جسے لے جاتا ہے؟ اس کے شعور کو لے جاتا ہے Consciousness کو لے جاتا ہے نیند کی حالت میں Consciousness نہیں ہوتی شعور نہیں ہوتا،

یہ معطل ہوتا ہے۔ کہتا ہے اس کے بعد نیند والا جب جاگتا ہے تو جو چیز روکی ہوئی ہوتی ہے ہم نے، وہ اس کی واپس آ جاتی ہے۔ نیند سے جاگنے والے کی کونسی چیز واپس آتی ہے؟ صرف شعور واپس آتا ہے، باقی تو سب کچھ موجود ہوتا ہے اس میں۔ اور کہا جو مردہ ہوتا ہے اس کا شعور واپس نہیں آتا اِدھر، اُسے ہم اپنے ہاں روک لیتے ہیں تاکہ یُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُوْنَ (6:60) تاکہ وہاں تمہیں بتا دیا جائے کہ تم نے وہاں کیا اعمال کیے تھے، اس لیے اسے روک لیا جاتا ہے۔ اللہ اکبر۔ عزیزانِ من! کسی سائیکولوجسٹ سے پوچھئے کہ کیا بات کہہ گیا ہے یہ۔ ایک لفظ میں Life & Consciousness کے اندر فرق بتا دیتا ہے۔ زندگی اور شعور میں فرق پیدا کرنا، نفس کے متعلق کہنا کہ یہ Human کی Biological Life نہیں ہے، Physical Life جسے تم زندگی کہتے ہو، نفس وہ نہیں ہے۔ یہ اس سے الگ شے ہے۔ لہٰذا یہ نفسِ انسانی جس پروسیس سے انسان کی یہ جان پیدا ہوتی ہے، اس کے اندر اِس پروسیس کی بات نہیں ہے، Physical Laws کا پیدا کردہ نہیں، Physical Laws کے تابع نہیں، یہ اس سے الگ شے ہے کوئی۔ شعورِ انسانی جسے آپ کہتے ہیں یہ اس کی Physical Body کا فنکشن نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دماغ پہ چوٹ لگتی ہے تو حافظہ گم ہو جاتا ہے، غش آ جاتا ہے۔ وہ تو اس کا وہیکل ہے اس کا وہ ذریعہ ہے، اس نفس کو باہر کی دنیا کے ساتھ متعارف کرانے کا۔ ابھی میں بول رہا ہوں تو یہ آواز آپ کو میری آواز نہیں آ رہی، اس کے اندر سے یہ آواز آ رہی ہے۔ یہ اگر آف ہو جاتا ہے، آپ تک آواز نہیں آتی تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں بول نہیں رہا، اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ میں اور مجھ میں جو ذریعہ تھا آواز پہنچانے کا، وہ ذریعہ Damage ہو گیا ہے۔ یہ Physical Brain انسان کا جو ریڈیو کا آلۂ مکبر الصوت ہے۔ اگر آپ کا ریڈیو سیٹ بگڑ جائے کسی طرح اور آپ کہیں کہ یہاں کا ریڈیو سٹیشن تباہ ہو گیا، بم پڑا تھا وہ ختم ہو گیا، کیسے؟ جی! میرے آواز ہی نہیں آ رہی۔ ارے وہ تو نہیں تباہ ہو گیا یہ تمہارے ریڈیو کا بلب آف ہوا ہے۔ Human Brain تمہارا ریڈیو سیٹ ہے کہ نفسِ انسانی وہ ریڈیو سٹیشن ہے۔ سیٹ خراب ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم انسانی زندگی اور نفس میں فرق پیدا کرتا ہے

قرآن نے یہاں لائف میں اور نفس میں فرق بتایا ہے کہ نیند کی حالت میں لائف باقی ہوتی ہے، نفس نہیں ہوتا۔ جب زندگی آتی ہے نیند کے بعد، نفس پھر واپس آ جاتا ہے۔ مردہ کا نفس واپس نہیں آتا، جان تو پہلے ہی جس کو آپ لائف کہتے ہیں وہ تو خیر مردے میں ہوتی نہیں۔ یعنی اسے روک لیا جاتا ہے۔ اگلی آیت میں عزیزانِ من! ایسی عمدگی سے اس بات کو واضح کیا ہے، اگلے درس میں پھر میں لوں گا۔ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُوْنَ (6:60) یہ روکی ہوئی چیز وہ ہے جس سے آگے پھر محاسبہ ہو گا۔ اور یہ ہے جو آگے کہا وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَ يُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً (6:61) تم سمجھتے ہو کہ کیا معاملہ ختم ہوا ارادہ کیا شعور ختم ہوا، مر گئے کچھ باقی نہیں ہے۔ تمہیں پتہ نہیں ہے ہم نے وہ محافظ رکھے ہوئے ہیں ایک ایک چیز کو حفاظت میں رکھتے ہیں۔ یہ جو ہم نے روکا ہے، ضائع نہیں ہوا وہ محافظ

بہت بڑے محافظ ہیں ان کی Custody میں ہے۔ آگے بات کرونگا عزیزانِ من! اس کے بعد حیاتِ آخرت پہ آگے جاکے بات آتی ہے، بڑی عجیب آیات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اس وقت تو صرف اتنا ہی سمجھئے کہ وہ ہے جورات کے وقت تمہیں وفات دیتا ہے، شعور ختم کر دیتا ہے۔ یَبۡعَثُکُمۡ (6:60) جس کے معنی دوبارہ زندہ کرنا ہمارے ہاں کہتے ہیں، دوبارہ زندہ کرنا اس کے معنی نہیں ہوتے۔ بعث کے معنی ہوتے ہیں کسی کے آزادی کے راستے میں جو رکاوٹ ہو اس رکاوٹ کو دور کر دینا۔

زندگی کے اعمال کی ذمہ داری انسانی نفس پر ہوتی ہے جو آگے چلتا ہے

نیند کے وقت ایک رکاوٹ تھی شعور کے راستے میں، جاگنے کے وقت رکاوٹ دور کر دی۔ مرنے کے بعد ایک رکاوٹ ہے زندگی کے آنے کی یہاں وہ نہیں رکاوٹ دور کی جاتی، وہ رکاوٹ آگے دور کر دی جاتی ہے، اس کے بعد وہ زندہ ہوتا ہے اس کا شعور زندہ ہوتا ہے۔ یَبۡعَثُکُمۡ فِیۡہِ لِیُقۡضٰۤی اَجَلٌ مُّسَمًّی ۚ ثُمَّ اِلَیۡہِ مَرۡجِعُکُمۡ ثُمَّ یُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (6:60) اور یہ سارا اس لیے سلسلہ ہے کہ یہاں تمہارے اعمال اگر نتیجہ خیز نہیں ہوتے، نہ ہوں زندگی آگے چلتی ہے۔ وہ جو اعمال کی ذمہ دار شے تھی جسے نفس کہا جاتا ہے، تم یا میں جسے کہتے ہو، اسے ہم سنبھال کے رکھ لیتے ہیں، اسے Detain کر لیا جاتا ہے Interogation کے لیے آج کی اصطلاح میں۔ وہاں یہ بات صاف ہو جائے گی۔ اور اگلی آیت میں یہ بتایا کہ کیسے اس کو محفوظ رکھتے ہیں کس طرح تمہاری ہر حرکت دل کا ارادہ محفوظ ہوتا ہے۔ کیسے پھر وہ نمایاں طور پہ تمہارے سامنے آجائے گا۔ سورۃ الانعام کی آیت 60 تک ہم آئے 60 سے ہی آگے بات پھر شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

آٹھواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 60 تا 70)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج ستمبر 1971ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی 60 ویں آیت سے ہو رہا ہے (6:60)۔

پچھلے اتوار یومِ شہدآء کی تقریب کی وجہ سے درس کے سلسلے میں ناغہ ہوا تھا۔

تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ اس آیت یعنی آیت نمبر 60 کو اس درس میں ہم نے چھوا تھا۔ لیکن میں نے عرض کیا تھا کہ یہ ذرا تفصیلی تشریح چاہتی ہے کیونکہ اس میں بڑا اہم نقطہ ایک آ گیا ہے۔ اور اسی لیے آج اسی سے پھر میں آغازِ بیان کر رہا ہوں۔

دین کی بنیاد' یہ سارا سلسلۂ رشد و ہدایت' وحی' قوانین' ہدایاتِ خداوندی اس کی بنیاد اس پہ ہے کہ انسان کی زندگی یہی اسی دنیا کی

طبعی زندگی، نہیں موت کے بعد بھی زندگی آگے چلتی ہے۔ اسی پہ سارا مدار ہے اگر یہ چیز بیچ میں نہ ہو تو اس کے بعد نہ خدا کو ماننا کچھ کام دیتا ہے، نہ وحی کی ضرورت رہتی ہے، نہ کسی پابندی کی۔ ٹھیک ہے حیوانات کی سطح پر زندگی کھانا' پینا' افزائشِ نسل کرنا اس کے بعد طبعی زندگی' جینا طبعی موت مر جانا۔ زیادہ سے زیادہ سوسائٹی کے قوانین تمدنی زندگی کی پابندیاں' ان کو پورا کر لینا چاہیے کیونکہ یہاں ایک دوسرے سے مل جل کر رہنا ہے اس سے زیادہ اور کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ تو آپ نے دیکھا کہ یہ سارا سلسلہ حتیٰ کہ خدا پر ایمان کے معنی بھی یہ ہیں انسان کا اس چیز پر ایمان کہ زندگی صرف طبعی زندگی نہیں ہے، آگے بھی چلتی ہے۔ یہی چیز تھی جس کے متعلق اقبالؒ نے بڑے ہی گہرے انداز میں یہ کہا تھا کہ

شاخِ نہالِ سدرۂ خار و خسِ چمن مشو
منکرِ او اگر شوی منکرِ خویشتن مشو

اپنی ذات کا اقرار کیے بغیر خدا تعالیٰ پر ایمان کوئی معنی نہیں رکھتا

تُو تو بڑے بلند مقام کا حامل ہے' اپنے آپ کو کیوں پستیوں کے اندر گرا لیتا ہے۔ اگر ایسی صورت ہے کہ خدا کو بھی تو نہیں مانتا' نہیں پہچانتا' نہیں جانتا تو کم از کم اپنا انکار نہ کر۔ اپنی ذات کا اقرار کر' اس پہ ایمان رکھ' اس پہ ایمان رکھے گا تو خدا پہ بھی ایمان آ جائے گا اور سارا سلسلہ آگے چل پڑے گا۔ اور اگر یہ چیز نہ ہوئی' تو نے اپنے آپ پہ ایمان نہ رکھا' اپنی ذات پہ ایمان نہ رکھا تو پھر خدا پر ایمان وحی اور رسل و رسائل کا یہ سلسلۂ یہ سارے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ بڑی بنیادی چیز ہے جو کہی گئی ہے۔

آگے چلنے والی بات جو تھی اس کے متعلق پھر عجیب عجیب تصورات چلے آ رہے تھے بہت قدیم زمانے سے' جب سے انسان کے شعور نے آنکھ کھولی۔

نفس انسانی جو محسوسات کی دنیا سے ماوارا ہے اس کی ماہیت کو سمجھنے یا سمجھانے کا طریق

انسان کی روح ہے جسے Soul کہا جاتا ہے مغرب نے اس کو Spirit کہہ کے پکارا۔ یہ کیا شے ہے؟ فلسفے نے اس کے متعلق بڑی لمبی چوڑی بحثیں کیں تفصیل کی۔ لیکن یہ چیز ایسی تو تھی نہیں کہ کوئی Material ہوتی' مادی ہوتی' طبعی ہوتی جو محسوسات کی دنیا کی گرفت میں آ سکتی۔ بات تو اس سے ماوراء تھی۔ لیکن قرآنِ کریم نے اتنے مشکل مسئلے کو اور آج سے چودہ سو سال پہلے کی دنیا کی علمِ انسانی کی سطح تھی' اس کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کس خوبصورتی سے وہ بات کو سمجھا گیا ہے کہ وہ شے کیا ہے۔ اس کو تو چھوڑو وہ تو سمجھ میں آ نہیں سکتی' اس کا فنکشن کیا ہے' وہ چیز کرتی کیا ہے یہ تم سمجھ سکتے ہو۔ اور اسی کے سمجھ لینے سے وہ کہتا ہے کہ بات سمجھ میں آ جائے گی۔ یہاں سے

آیت شروع ہوتی ہے۔ وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰكُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى (6:60) عام ترجمے کے اعتبار سے کہ خداوہ ہے کہ جو رات کو تمہیں لفظ ہے یَتَوَفّٰكُمْ (6:60) وفات دیتا ہے جس کا عام ترجمہ ہو جاتا ہے اور دن میں پھر تمہارے راستے میں جو یہ رکاوٹ ہوتی ہے اس کو اٹھا دیتا ہے تم پھر چلتے پھرتے ہو' کام کاج کرتے ہو۔ یعنی عمل کی زندگی یہ دن کی زندگی ہے جب تم سوئے ہوئے نہیں ہوتے۔ اور پھر اس کے بعد یہی وہ تمہاری عمل کی زندگی ہے کہ جس کی ذمہ داری تم پہ عائد ہوتی ہے۔ یہی ذمہ داری ہے جسے مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے اس دنیا کی زندگی میں وہ نتائج اگر تمہارے سامنے آ جائیں تو ٹھیک اگر نہ آئیں تو اس کے بعد زندگی کا سلسلہ آگے چلتا ہے' وہ نتائج پھر سامنے آ جائیں گے۔

اعمالِ انسانی کی نتیجہ خیزی کا ہی دوسرا نام مکافاتِ عمل ہے

یہ ہے ساری لم' ملخص' مغز اس ساری تعلیم کا۔ اب یہ دیکھئے کہ یہاں اس نے رات کا سونا اور دن کا جاگنا ان دونوں میں ایک تمیز کی ہے۔ اعمال کا دائرہ اس نے دن کو قرار دیا ہے۔ یہ معنی نہیں کہ یہاں کچھ وقت کا اعتبار ہے کہ فلاں وقت سے فلاں وقت تک عمل کا دائرہ نہیں اور فلاں وقت سے فلاں وقت تک تمہارا یہ دائرۂ عمل و کردار شروع ہوتا ہے۔ بلکہ سمجھانے کے لیے کہ نیند کے عالم میں ایک کیفیت تمہاری ہوتی ہے' جاگنے کے عالم میں ایک دوسری کیفیت تمہاری ہوتی ہے۔ کیا فرق ہوتا ہے ان دونوں کے اندر؟ نیند میں انسان کے جسم کی مشینری ساری کی ساری چل رہی ہوتی ہے اسی طرح جیسے دن میں' جاگنے کے عالم میں' بیداری کے عالم میں یہ چل رہی ہوتی ہے۔ ہر شے اس کی اسی طرح سے فنکشن کر رہی ہوتی ہے' طبعی زندگی جتنی بھی ہے۔ ایک چیز نہیں ہوتی اور وہ ہے کہ جسے اس کا شعور یا Consciousness اس کی کہتے ہیں' قوتِ تمیز نہیں ہوتی Consciousness نہیں ہوتی' شعور نہیں اس کا ہوتا۔ بس اتنا ہی فرق ہے۔ اور یہ جو فرق ہے یہ بڑا بنیادی فرق ہے۔ سویا ہوا انسان نہ مومن ہوتا ہے' نہ کافر ہوتا ہے جیسے مردہ نہ مومن ہوتا ہے' نہ کافر ہوتا ہے۔ یہ جب اس شعور کی حالت میں آتا ہے Consciousness کی حالت میں آتا ہے' تمیز کی حالت میں آتا ہے' وہاں فرق پڑتا ہے۔ تو سوتے میں انسان کی ایک چیز ہے جو کم ہوتی ہے اس میں سے اور وہ ہے اس کا شعور Consciousness۔ میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ یہ Materialist جو ہیں محض طبعی زندگی ماننے والے' وہ کہتے ہیں کہ یہ دماغ کا فعل ہے۔ انسان کا یہ طبعی Brain ہے جس کا فنکشن ہے۔ یہ اس وقت Rest کر رہا ہوتا ہے یا اس کا سوئچ آف ہوتا ہے' اس لیے اس میں شعور نہیں ہوتا۔ اب اور آگے بڑھی ہے خود انسانی علم کی سطح ذرا اونچی ہوئی ہے۔

انسان میں ''شعورِ خویش'' کی یا ''میں کی'' آگہی دیتا ہے

یہ جو نیا دور ہمارا سائیکولوجی کا شروع ہوا ہے وہ اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ Consciousness جو ہے یہ اس طبعی Brain کا

فنکشن نہیں ہے یہ ایک اور چیز ہے جسے انہوں نے Psyche کہا ہے۔ پہلے مائنڈ کا ایک لفظ چلا آ رہا تھا اس سے انہوں نے الگ ایک اصطلاح اپنے لیے تجویز کی ہے' وہ کہتے ہیں ایک اور شے ہے Psyche جسے کہا جاتا ہے۔ اس کا ہی ترجمہ ہمارے ہاں نفس کیا گیا ہے۔ اسی لیے سائیکولوجی کو علم النفس یا نفسیات کہا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں' یہ وہ شے ہے کہ جو انسان کے اندر تمیز پیدا کرتی ہے' شعور پیدا کرتی ہے' Consciousness پیدا کرتی ہے۔ بلکہ وہ اس سے آگے گئے ہیں وہ کہتے ہیں صرف Consciousness نہیں Self Consciousness پیدا کرتی ہے' شعورِ خویش پیدا کرتی ہے۔ انسان کو اس کے میں کے متعلق پتہ دیتی ہے۔ یہ جو انسان میں کہتا ہے اپنے آپ کو' یہ وہ ہے جسے Psyche کہتے ہیں اور اس علم کا نام Psychology ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کا دماغ یہ ایسے ہی ہے جیسے سینما کا سکرین ہوتا ہے' پردہ ہوتا ہے۔ اس پر آ کے جو عکس پڑتا ہے' وہ ہمیں نظر آتا ہے وہ عکس اس سکرین کا پیدا کردہ نہیں ہوتا۔ اگرچہ اگر سکرین نہ ہو تو وہ عکس ہمارے سامنے آ ہی نہیں سکتا لیکن وہ عکس سکرین کا پیدا کردہ نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ شعور اور تمیز جو ہے یہ Psyche کا فعل ہے اور انسانی دماغ صرف اس کا ایک ذریعہ ہے جس سے وہ چیز باہر آتی ہے۔ جیسے آئینے میں انسان اپنی شکل دیکھتا ہے اگر آئینہ ٹوٹ جائے یا نہ ہو تو اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان نہیں ہے اس وقت۔ وہ ایک میڈیم' ایک ذریعہ جس سے وہ اپنی شکل دیکھ رہا تھا' وہ ذریعہ نہیں باقی رہا۔ یا جیسے میں مثال دیا کرتا ہوں یہ ریڈیو کا سیٹ آپ کے پاس ہے اس میں سے آپ کو آوازیں آتی ہیں' گانا بھی سنائی دیتا ہے' سب کچھ ہوتا ہے۔ اب تو آپ ٹیلیویژن کو لے لیجیے کہ اس میں شکلیں بھی نظر آتی ہیں۔ آپ کا سیٹ اگر خراب ہو جائے تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آج ٹیلیویژن کا سٹیشن بند ہو گیا ہے۔ وہ اسی طرح سے فنکشن کر رہا ہوتا ہے۔ وہ جو آپ کا ذریعہ ہے' جس سے اس چیز نے آپ کے سامنے آنا تھا یا آپ کے کانوں تک پہنچنا تھا' آپ کا ذریعہ خراب ہو گیا ہے سارا' اس ذریعے کو ٹھیک کر لیجیے پھر وہ آوازیں آنے لگ جائیں گی' پھر وہ شکلیں دکھائی دینے لگ جائیں گی۔ انسان کا دماغ ریڈیو کا سیٹ ہے' ٹیلی ویژن کا سیٹ ہے۔ یہ جو ٹیلی ویژن کا سٹیشن ہے یا براڈ کاسٹنگ سٹیشن ہے وہ Psyche ہے انسان کے اندر ایک اور چیز ہے۔ وہی قوتِ ارادہ ہے اس کی' وہی قوتِ تمیز ہے' اسی کا یہ سارا فنکشن ہے' وہ یہ سب کچھ کرتی ہے۔ دماغ وہ ذریعہ ہے جس سے وہ شے پھر باہر کی دنیا میں' محسوسات کی دنیا میں آتی ہے۔ یہ جو شے ہے جسے نفس کہا گیا ہے' Psyche کہا گیا ہے' شعور کہا گیا ہے آپ دیکھئے کہ نیند کی حالت میں آپ کا یہ جو سیٹ ہے ٹیلی ویژن کا' یہ آف ہو جاتا ہے' اسے آپ یوں آف کر دیتے ہیں۔ ٹیلی ویژن سٹیشن اسی طرح سے کاروبار اپنا کر رہا ہوتا ہے۔ صبح کے وقت آپ اس سیٹ کو پھر آن کر دیتے ہیں وہ بیداری آپ کے ہاں کی' وہ شعور آپ کے ہاں کا لوٹ آتا ہے۔ وہ قوتِ شعور' اندر وہ شے جو یہ چیز پیدا کر رہی ہے' وہ نہیں اس وقت مر چکی ہوتی وہ نہیں کہیں چلی گئی ہوتی۔

نبوت سے پہلے آپ ﷺ نے کسی آسمانی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا، لفظ تلاوت کا لفظ صرف آسمانی کتابوں کے لیے استعمال ہوتا ہے

عزیزانِ من! غور کیجیے چودہ سوسال پہلے یہ بات سمجھائی تھی۔ ویسے انسانیت کی تاریخ میں اس دور کو دورِ تاریکی کہتے ہیں اس کے بعد عرب جیسا ملک ہے کہ جو اس زمانے کی علمی سطح میں بھی باقی دنیا کے مقابلے میں بہت پیچھے ہے' باہر کی دنیا کی ہوا ہی نہیں لگی تھی ان کو۔ اور پھر اس عرب کے اندر بھی ایک شخص ﷺ وہ ہے جو اس دعویٰ نبوت سے پہلے ان پڑھ ہے۔ یاد رکھئے یہ دائرۂ نبوت سے پہلے کی بات ہے۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ اس کے بعد یہ بات نہیں کہ حضور ﷺ ساری عمر ان پڑھ رہے تھے۔ اس وقت تک جب تک وہ یہ باتیں نہیں کر رہا ہے' وہ ان پڑھ ہے۔ چودہ سوسال پہلے کا عام علمی سطح کا دور پھر اس میں عرب جیسا ملک بالکل تاریک اس میں ایک شخص بالکل ان پڑھ۔ بات اس نے اتنی اہم سمجھائی ہے۔ کہیے کہ انسانی دماغ یہ بات پیدا کر سکتا تھا؟۔ Contemporary علم اس زمانے کا جو ہم عصر علم ہے انسان کا وہ دنیا کے مختلف ممالک میں موجود ہے۔ اسے اٹھا کے دیکھئے آپ کو کہیں بھی یہ بات اس انداز سے نظر آئے گی جو یہ بات کہہ گیا ہے۔ کیا یہ انسان کا ذہن کہہ سکتا تھا ایسے وقت میں؟ ممکن ہی نہیں تھا۔ سنیے کیا کہتا ہے اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ حِیۡنَ مَوۡتِہَا وَالَّتِیۡ لَمۡ تَمُتۡ فِیۡ مَنَامِہَا (39:42) وہ کہتا ہے کہ موت اور نیند میں ایک ہی چیز ہوتی ہے حقیقت میں۔ موت اور نیند ایک ہی چیز ہے۔ ایک شے ہے جس کو خدا نیند کی حالت میں بھی روک لیتا ہے موت کی حالت میں بھی وہ روک لیتا ہے۔ موت کی حالت کو تو چھوڑ دیجیے' نیند کی حالت میں کس چیز کو روک لیتا ہے' وہ تو ہمارے سامنے ہے۔ طبعی زندگی انسان کی اسی طرح سے چل رہی ہوتی ہے' روک کیا لیتا ہے؟ Consciousness یا شعور یا قوتِ تمیز۔ یہ نہیں فنکشن کر رہی ہوتی۔ اب یہ وہ کہتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں جو ہیں موت اور نیند اس میں یہ سمجھ لیجیے کہ Common Factor (قدرِ مشترک) یہ ہے کہ شعور انسان کا روکا ہوا ہوتا ہے۔ فَیُمۡسِکُ الَّتِیۡ قَضٰی عَلَیۡہَا الۡمَوۡتَ وَیُرۡسِلُ الۡاُخۡرٰۤی اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی (39:42) کہتا ہے نیند کی حالت میں تو کچھ وقت کے بعد جب انسان جاگتا ہے تو وہ روکی ہوئی چیز واپس دیدی جاتی ہے۔ موت کی صورت میں تمہارے ہاں وہ واپس نہیں آتا جاگ کر' اس لیے یہاں اس کو وہ چیز نہیں دی جاتی۔ سوچیے عزیزانِ من! میں کہتا ہوں آج ابھی فرائیڈ اور ینگ کو بھی یہ بات نصیب نہیں ہوئی تھی کہ یوں بات کو وہ سمجھا جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد چودہ سوسال پیشتر عرب کے تاریک دور کا ایک ان پڑھ شخص کہتا ہے ان اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ (39:42) یہ جو بات میں کہہ گیا ہوں یہ ان لوگوں کی سمجھ میں آئے گی جو غور و فکر سے کام لیں گے۔ غور و فکر کو اپیل کر رہا ہے وہ شخص کہ بات وہ کہہ چلا ہوں میں کہ جوں جوں علم انسانی بلند ہوتا جائے گا جتنی گہرائیوں میں اس کی فکر پہنچتی چلی جائے گی وہ اس حقیقت

تک پہنچتا چلا جائے گا کہ میں نے کیا بات کہہ دی ہے۔ایک شے ہے جو روکی ہوئی ہے اور وہ شے ہے' میں نے عرض کیا ہے کہ نیند کے عالم میں کیا روکی ہوئی ہے' یہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔تو اسی سے وہ بات سمجھا تا ہے اُدھر کی کہ اتنا ہی فرق ہے۔

جس شے کو نیند کے عالم میں روک لیا جاتا ہے اسے قدرت موت کے عالم میں بھی اپنے پاس کسی خاص وقت کے لیے محفوظ کر لیتی ہے

نیند کے عالم میں وہ تمہارے ہاں بیدار ہو جاتا ہے' وہ روکی ہوئی شے یوں سامنے آتی ہے۔موت کے عالم میں تمہاری طرف وہ لوٹ کے بیدار نہیں ہوتا۔وہ چیز معدوم نہیں ہوجاتی' موت میں وہ چیز مٹ نہیں جاتی۔جیسے نیند کے عالم میں ہم روک لیتے ہیں اسے' موت کے عالم میں بھی روک کے رکھا ہوتا ہے' بالکل محفوظ رکھا ہوتا ہے۔جس طرح نیند کے بعد بیداری میں اسے لوٹا دیتے ہیں وہ اُدھر کی دنیا کے اندر اسے ہم لوٹا دیتے ہیں' بات تو بڑی آسان ہے۔ثُمَّ اِلَیۡہِ مَرۡجِعُکُمۡ ثُمَّ یُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (6:60) اور یہ اس لیے کہ جب یہ وہاں آگے چلتا ہے یہی شعور اس کو جب دیدیا جاتا ہے تو پھر اسے بتایا جاتا ہے کہ تم نے کیا کیا تھا اور اس کے نتائج کیا ہیں۔ اللہ اکبر۔اگلا ٹکڑا جو ہے اگلی آیت کا اور وضاحت کر رہا ہے۔وَ ھُوَ الۡقَاھِرُ فَوۡقَ عِبَادِہٖ (6:61) یہ نہ سمجھ لے انسان کہ جو کچھ وہ یہاں کرتا ہے بلکہ جو کچھ سوچتا بھی ہے' یہاں اس کے سر پہ کوئی سپاہی نہیں کھڑے۔ایک ایک آدمی پہ ایک ایک سپاہی تو کبھی مقرر ہی نہیں ہوسکتا۔اور پھر سپاہی بھی مقرر ہو تو سپاہی بھی جو کچھ کرتا ہے' وہ ہمارے سامنے ہے۔

قدرت کے ہاں تو انسان کے ایک ایک لمحہ کا عمل محفوظ ہے

کہتا ہے یہ چیز ہے جو ہم اس کے اوپر غالب ہیں۔ہمارا کنٹرول ہے انسان کے اوپر۔اس لیے یہ نہیں ہے کہ یہ جو کچھ کرتا ہے' شتر بے مہار ہے کوئی اس سے پوچھنے والا ہی نہیں ہے۔ہمارا کنٹرول ہے اس کے اوپر۔سوال یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس زندگی میں تو دیکھ رہے ہیں کہ سب کچھ انسان ایسے دھاندلیوں سے کرتے چلے جاتے ہیں' کوئی پوچھتا بھی نہیں۔مرنے کے بعد معاملہ ختم ہو گیا' کنٹرول کہاں ہے۔کہتا ہے وَیُرۡسِلُ عَلَیۡکُمۡ حَفَظَۃً (6:61) ہم نے محافظ مقرر کر رکھے ہیں وہ محفوظ رکھتے ہیں اس چیز کو۔اب غور کیجیے قرآن اس حَـــفَـــظَۃً یہ جو حفاظت کرنے والی شے ہے وہ کیا ہے جس کو محفوظ رکھا جاتا ہے قرآن کی رو سے۔یہ آج تو کوئی سائیکولوجسٹ اس کو Appreciate کر سکتا ہے۔اس نے کہا تھا لِقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ (39:42) وہی Appreciate کریں گے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ ہم کیا Appreciate کریں گے۔یہ کیا چیز ہے جس کو محفوظ رکھا جاتا ہے؟ لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَ مِنۡ خَلۡفِہٖ یَحۡفَظُوۡنَہٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ (13:11) مُعَقِّبٰتٌ (13:11) کیا لفظ ہے۔اس کے پیچھے پیچھے چلنے والے ''چل ہاں بچو کتھے جانا ایں''۔دیکھا فَوۡق

عِبَادِهٖ (6:61) کا جو کنٹرول ہے کیا انداز ہے سمجھانے کا کہ چل تو کہاں جاتا ہے۔ دائیں بائیں آگے پیچھے۔ کام ان کا کیا ہے؟ **یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ** (13:11) عالمِ امر سے اس کا تعلق اب آ گیا۔ طبعی طور پہ نہیں ہے کہ ایک اس طرح سے ہم نے کوئی سپاہی سچ مچ دیکھتے یا بھالتے ہوئے انسان ہیں جو اس کے آگے پیچھے لگا چھوڑے ہیں۔ یہ ہمارے عالمِ امر کی چیز ہے ہم نے انتظام یہ کر رکھا ہے کہ اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں کہیں جائے اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں' دائیں بائیں آگے پیچھے۔ کیا کرتے ہیں وہ؟ **یَحْفَظُوْنَهٗ** (13:11) محفوظ کر لیتے ہیں اس چیز کو۔ پہلے تو یہیں دیکھئے عزیزانِ من! آیت کے اگلے ٹکڑے میں بتا دیا کیا چیز ہے جس کو وہ محفوظ کرتے ہیں۔ انسان کے بدن کو تو محفوظ کوئی کرتا ہی نہیں ہے۔ یہ تو بہرحال وہ کہتا ہے کہ ہر نفس کو' ہر فرد کو ہر شخص کو موت آنی ہے اور آتی ہے۔ وہ آگے پیچھے والے اس کے جسم کو تو محفوظ نہیں رکھتے۔

قدرت انسان کے مادی جسم کو محفوظ کرنے کی بجائے اس کے اعمال کو محفوظ کرتی ہے

آخر وہ کیا شے ہے جس کو یہ محفوظ کرتے ہیں؟ وہ کہتا ہے **یَحْفَظُوْنَهٗ** (13:11) اصل میں کہتا ہے وہ شے وہ انسان اسی کو کہا جائے گا' یہ جسے تم جسم کہتے ہو یہ شے ہی کچھ نہیں ہے۔ اور بات تو ہے بھی یہ۔ جسم کے متعلق تو اب تحقیق یہ ہے' پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ سات سال کے بعد' اب کہا جاتا ہے قریباً تین سال کے بعد انسان کے طبعی جسم کا ایک ذرہ بھی' وہ نہیں رہتا جو تین سال پہلے تھا۔ ہر آن کروڑوں کی تعداد میں اس کے سیلز مرتے جاتے ہیں' تلف ہوتے جاتے ہیں' نئے سیلز پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ طبعی جسم اس کا سارا سیلز کا ہی بنا ہوا ہے۔ جن سیلز کی کیفیت یہ ہو کہ ہر آن میں وہ کروڑوں کی تعداد میں بدلتے چلے جائیں' تین سال کے بعد اس میں پرانا ایک سیل بھی باقی نہیں رہتا۔ یہ پورے کا پورا جسم اور بنا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن اس تین سال کے بعد بھی آپ کی میں تو وہی ہوتی ہے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ سے کہے کوئی کہ تین سال پہلے آپ نے یہ مجھ سے وعدہ کیا تھا' دستاویز لکھی تھی' آپ کہیں کہ اس تین سال سے پہلے والے انسان کا تو ایک ذرہ بھی باقی نہیں رہا' آپ مجھے کیا کہہ رہے ہیں۔

انسانی جسم تو ہر آن بدلتا ہے لیکن اس کا نفس اور اس کے اعمال کبھی نہیں بدلتے

وہ کیا چیز ہے جو باقی ہوتی ہے تین سال نہیں تیس سال ساری۔ بچپن کی تصویر کو جب آپ دیکھ کے کہتے ہیں میری تصویر نوے سال کی عمر میں۔ یہ کیا چیز تھی جو میری تھی اس کے اندر۔ پچاس سال پہلے کا بھی کوئی جرم کیا ہوا ہوتا ہے تو عدالت کو ثبوت جب مل جاتا ہے' وہ کہتی ہے کہ تم نے یہ کیا' تم مجرم ہو۔ حالانکہ وہ جسم تو اس دوران میں دس بارہ مرتبہ بدل چکا ہوتا ہے۔ جس طرح سے آپ کا کوٹ مجرم نہیں ہوتا خواہ آپ نے کتنے ہی اس دوران میں بدل لیے ہوں' اسی طرح سے یہ جسم بھی آپ کے لباس کی طرح ہے' چینج ہوتا رہتا ہے۔ لیکن آپ کا ''میں'' جسے آپ کہتے ہیں' وہ تو نہیں بدلتا۔

آج بھی اکثر شبِ تنہائی میں بیتے ہوئے دن عیش کے
گذری ہوئی خاموشیاں بنتی ہیں شمعِ زندگی
اور ڈالتی ہیں روشنی میرے دلِ صد چاک پر

یہ کیا چیز ہوتی ہے اکثر شبِ تنہائی میں۔ساری عمر کے اپنے احوال وکوائف یاد ہی نہیں آتے جس چیز سے بیس سال پہلے آپ کو خوشی ہوئی تھی' اس کی یاد سے آج بھی اسی طرح آپ کو خوشی ہوتی ہے۔جس سے آپ کو رنج پہنچا تھا' آج بھی اس سے آپ کو رنج پہنچتا ہے۔ اس کی یاد سے۔جسم کو نہ رنج پہنچتا ہے' نہ خوشی ہوتی ہے وہ تو بدل چکا ہوتا ہے۔ یہ کیا شے ہے کہ جسے آج بھی وہی تاثر لے رہی ہے' وہی کیفیت اس کی ہو رہی ہے جو آج سے پچاس سال پہلے ہوئی تھی۔کسی نے اس زمانے میں آپ کو اگر گالی دی تھی اور آپ کی عزت نفس پہ احساس ہوا تھا' پچاس برس کے بعد بھی وہ آپ کے سامنے آتا ہے' بالکل وہی کیفیت ہو جاتی ہے۔کونسی چیز ہے جو یہ کیفیت پیدا کر رہی ہے آپ کے اندر؟ یہ وہی شے ہے کہ جو جسم کے بدلنے سے بدلتی نہیں ہے۔ یہ ہے چیز جس کو محفوظ رکھا جا رہا ہے۔جسم کو محفوظ نہیں رکھا جا رہا' اسے محفوظ رکھا جا رہا ہے۔عزیزانِ من! پھر اور آیت سنئے قرآنِ کریم کی پھر اس کو بھی آج کا سائیکولوجسٹ جو ہے' وہی بتائے گا۔

قوموں کی تعمیر کا انحصار سنگ وخشت کی بجائے مائنڈ کی نشو ونما پر منحصر ہوتا ہے

آپ کے ہاں آج کی سائیکولوجی یہ کہہ رہی ہے کہ قوموں کی موت وحیات یہ ان کے تمدنی' سیاسی (Political) یہ زندگیاں ہیں' اس پہ دارومدار نہیں ہے۔دارومداران کا یہ ہے کہ اس قوم کی نئی نسل کی نفسیات کیا آپ پیدا کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں قوموں کی تبدیلی' اس کی نفسیات کی تبدیلی سے ہوتی ہے۔کس قسم کا اس کے مائنڈ کا Attitude ہوتا ہے' کس قسم کی تربیت آپ کرتے ہیں' اس کی ذات کی نشو ونما کیسے آپ کرتے ہیں اس کا جو مینٹل میک اپ ہے وہ کیا آپ کرتے ہیں' وہ کہتے ہیں اس پہ دارومدار ہے قوموں کی زندگی کا۔ سنئے قرآن جو کہتا ہے کہ ہم ہر آن بدلنے والے جسم کے اندر کسی شے کو محفوظ رکھتے ہیں اور یاد رکھئے **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ** (13:11) اور یاد رکھو! کہ کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں آتی تاوقتیکہ اس قوم کی نفسیات میں پہلے تبدیلی نہ آجائے۔ یہ نفسیات کی تبدیلی ہے جو آج جرم کو جرم ہی نہیں سمجھا جاتا' برائی کو برائی ہی نہیں سمجھا جاتا' احساس ہی اس کا نہیں ہوتا کہ کوئی چیز برائی کی ہوئی۔نفسیات کی تبدیلی آگئی آپ کے ہاں۔اور یہ پولیس کی Strength زیادہ کرنے سے اور فوج زیادہ بڑھا دینے سے' یہ اندر کی چیزیں تو نہیں بدل سکتیں۔غور فرما رہے ہیں کہ کس زمانے کی یہ کتاب ہے' کون شخص یہ باتیں کر رہا ہے۔اس زمانے میں ابھی یہ Psyche کا تصور بھی کسی کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔کہتا ہے' یہ ہے ٹیسٹ اور یہ ہے وہ چیز جسے ہم محفوظ رکھتے ہیں۔ایک آیت اور' محفوظ رکھتے ہیں جسے ہم۔**قٓ وَالۡقُرۡاٰنِ الۡمَجِیۡدِ ۔ بَلۡ عَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَہُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡہُمۡ فَقَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ ہٰذَا شَیۡءٌ**

عَجِیۡبٌ (50:1-2) کہتے ہیں یہ جوان کو آ گاہ کرنے والا آیا کہ تم قانونِ مکافاتِ عمل کے دائرے سے نکل نہیں سکتے۔دل میں گذرنے والا خیال اور ارادہ جو ہے' اس پہ بھی گرفت ہو رہی ہے۔

مرنے کے بعد کی زندگی پر اٹھنے والے اعتراض پر قرآن حکیم کا جواب

وہ کہتے ہیں کیا بات یہ کر رہا ہے' یہ بڑی عجیب سی بات ہے۔ءَ اِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا تُرَابًا (50:3) کیا جب ہم مر جائیں گے اور پھر گل سڑ کے ہمارا جسم مٹی ہو جائے گا' مٹی کے ساتھ مٹی مل جائے گی۔ کچھ عرصے کے بعد قبر کو کھود کے دیکھئے اس میں تو بالکل کچھ نہیں ہوتا۔تو جب جسم کی یہ کیفیت ہو جائے گی ذٰلِکَ رَجۡعٌۢ بَعِیۡدٌ (50:3) یہ بات بالکل سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کہ پھر انسان کو زندگی ملتی ہے اور یہ کیفیت اس کی پیدا ہوتی ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ بھی نہیں اس میں سے باقی رہتا۔آپ نے اعتراض سن لیا۔ چودہ سو سال پہلے کا اعتراض نہیں ہے آج بھی یہ اعتراض ہوتا ہے۔اور اب تو یہ نیا دور جو آیا ہے اس میں تو یہ جھکڑ کی طرح ایک رو چلی ہے اس مارکس ازم کی وجہ سے کہ نہیں یہ جسم مادی جسم ہے اس کے بعد کچھ بھی نہیں رہتا۔مرنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے قصہ۔ یہی اعتراض وہاں ہو رہا ہے۔ عزیزانِ من! کس خوبصورتی سے جواب دیا گیا ہے۔کہا ہے۔

مرنے کے بعد زمین انسان کا سب کچھ نہیں کھا جاتی بلکہ خدا کے ہاں نفس انسانی کو محفوظ کر لیا جاتا ہے

قَدۡ عَلِمۡنَا مَا تَنۡقُصُ الۡاَرۡضُ مِنۡهُمۡ (50:4) ہم جانتے ہیں کہ زمین انسان میں سے کس کس چیز کو کم کر دیتی ہے ہمیں معلوم ہے۔ہم جانتے ہیں سارا انسان معدوم نہیں ہو جاتا۔ہم جانتے ہیں کہ زمین اس کی کس کس چیز کو کھا جاتی ہے۔کس کس چیز کو کم کر دیتی ہے ہم جانتے ہیں۔ہمیں بتا رہے ہو تم' ہم جانتے ہیں۔ یہ جس چیز کو تم نے دیکھا ہے کہ وہ ختم ہو گئی اس چیز کے متعلق ہم بات نہیں کر رہے کہ آگے چلے گی۔ہم جانتے ہیں۔کیا انداز ہے کہنے کا قَدۡ عَلِمۡنَا مَا تَنۡقُصُ الۡاَرۡضُ مِنۡهُمۡ (50:4) ہم جانتے ہیں کہ کس چیز کو زمین کھا گئی۔وَعِنۡدَنَا کِتٰبٌ حَفِیۡظٌ (50:4) اور ہمارے پاس اس کے باوجود وہ ایک کتاب رکھی ہے جس کے اندر سب کچھ یہ اس کا محفوظ بھی رہا ہے۔ زمین کیا کھا گئی' اس کا بھی ہمیں علم ہے۔ کیا چیز اس میں سے باقی رہی' وہ ہم جانتے ہیں' ہمارے پاس ہے وہ۔ وہی حَفِیۡظٌ (50:4) یہاں کہا گیا ہے حَفَظَةً (6:61) جہاں یہ کہا گیا تھا۔ہم جانتے ہیں کہ محفوظ کیا رہا اس میں سے' ہم جانتے ہیں کہ زمین کھا کس چیز کو گئی۔کیا انداز حسین ہے بات کہنے کا!!۔ہمیں بتا رہے ہو تم یہ تو بڑی تعجب انگیز سی بات ہے۔وہ مردہ ہے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں' وہ ختم ہو گیا ہے' وہ گل سڑ گیا ہے۔کیا انداز ہے بات کہنے کا کہ ہمیں بتا رہے ہو۔ہم جانتے ہیں کہ زمین کیا کیا چیز کھا گئی اور ہمارے پاس ایک شے ہے جس میں وہ کچھ محفوظ رہتا ہے جسے زمین نہیں کھا سکتی۔ یہ ہے حیاتِ آخرت جسے کہا گیا ہے یہ ہے جسے محفوظ رکھا گیا ہے۔

انسان کی میموری یا یادداشت اس کے مادی جسم سے الگ اس کی ذات کا فعل ہے

میں کہتا ہوں کہ آج کی زندگی میں یہ تجربہ ہمارے ہاں پچاس سال پہلے کا واقعہ نہیں کہ کہتے ہیں میموری تو یادداشت جو ہے' یہ دماغ کا فعل ہے۔ میں چھوڑتا ہوں اس بحث کو۔ اگرچہ برگسان نے تو یہ چیز ثابت کی ہے کہ حافظہ یادداشت میموری یہ انسان کے مادی جسم کا فعل نہیں ہے وہ کہتا ہے کہ یہ انسان کا جو Self ہے' یہ اس کا فعل ہے۔ لیکن میموری کو تو آپ چھوڑ دیئے میں کہتا ہوں جو تاثر اور Feeling پیدا ہوتی ہے آپ کی۔ واقعہ تو آپ کی یاد میں آ گیا اس سے جو تاثر آپ کے اوپر ہوا تھا' اس زمانے میں پچاس سال پیشتر جب کہ حواس بھی ختم ہوئے' وہ سرگذشتیں ختم ہوئیں' میں کہتا ہوں شاید وہ لوگ بھی باقی نہ رہے ہوں' یہ تاثر آپ کے ہاں یہ جو ہے یہ کیا چیز ہے' جو محفوظ رہی۔ جبکہ جسم کا ایک سیل بھی باقی نہیں رہا۔ یہ ہے وہ شے جو اس چیز کو محفوظ رکھتی ہے۔ آپ کے ہر عمل کو محفوظ رکھتی ہے اور یہ ہے جسے قرآن کہتا ہے کہ پھر آگے چلتی ہے۔

زندگی میں یا اس کے بعد سب سے بڑا جہنم یہ ہے کہ آپ کا باطن نکھر اور ابھر کر دوسروں کے سامنے آ جائے

اس Consciousness کی کیفیت' شعور کی کیفیت قرآن یہ بتاتا ہے کہ وہاں تم ہوگے اور یہ سب ہونگے سامنے تمہارے' پہچانو گے ایک دوسرے کو۔ اور جو میں نے ایک دن پہلے بھی کہا تھا جہنم' اس سے بڑا جہنم کیا ہوگا کہ ہم اپنے دوستوں کے سامنے' ملنے والوں کے سامنے اتنے معتبر' اتنے دیانتدار' اتنے شریف' اتنے پاکیزہ بنے پھرتے ہیں اور پتہ نہیں کہ اندر کی زندگی کیا ہوتی ہے۔ اور ہم اس کا اہتمام کر لیتے ہیں کہ ان میں سے کسی کو اس کا علم نہ ہونے پائے۔ اور خیالات جو گذرتے ہیں اس کا تو علم کسی کو ہوتا ہی نہیں ہے۔ اس قدر معتبر بنے ہوئے' اس قدر ان میں پاکیزہ بنے ہوئے' بلند مرتبہ بنے ہوئے' حضرت صاحب بنے ہوئے۔ یہ کیفیت ہو اپنوں میں اور یوں چلے جائیں یہاں سے اور اس کے بعد یہ سارے وہاں موجود ہوں اور جتنی چیزیں ان سے چھپائی ہوئی ہوں' وہ ساری کی ساری ان کے سامنے آ جائیں۔ عزیزانِ من! اس سے بڑا جہنم کوئی نہیں ہے۔ آپ کی کوئی ایک بات یہاں چھپی ہوئی آپ کے عزیز ترین دوستوں کے حلقے میں' کہیں باہر آ جائے اس وقت جو آپ کی کیفیت ہوتی ہے' وہ قابلِ برداشت نہیں ہوتی آپ کے لیے۔ اور اگر ساری زندگی کا جتنا بھی کارنامہ ہے ان سب کے سامنے وہاں آ جائے اور یہ موجود ہوں آپ کے سامنے' جن میں آپ اتنے معتبر بنے ہوئے تھے اور پھر کہیں بھاگ بھی نہ سکیں۔ یہاں انتہا یہ ہوتی ہے انسان کی کہ ایسے وقت میں جب معلوم ہو کہ یہ چیزیں باہر آ رہی ہیں خودکشی کر لیتا ہے آدمی اس ندامت سے بچنے کے لیے جو اس حلقے کے اندر ہو۔ اور اگر وہاں خودکشی کا بھی امکان نہ ہو تو پھر سوچئے تو سہی کیا بات ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

انسانی اعمال کومحفوظ کرنے والی قوتوں کاتعلق عالم امر سے ہوتا ہے

یہ ہے وہ سائیکی' یہ ہے وہ شے جسے محفوظ رکھا جا رہا ہے عزیزانِ من!۔ پھر دہرا دوں کیا انداز تھا ان کا۔ یہ کہتے ہیں' بڑی تعجب انگیز بات ہے' انسان مر مرا گیا' مٹی کے ساتھ مٹی مل گئی' سب کچھ ہو گیا اور یہ کہہ رہا ہے کہ اس کے باوجود یہ سب چیزیں محفوظ ہیں۔ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ (50:4) ہم جانتے ہیں کہ زمین انسان کے جسم میں سے کس چیز کو کھا جاتی ہے۔ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ (50:4) ہمارے پاس ایک محفوظ چیز رکھی ہے جس میں ہر شے جو مٹ نہیں سکتی' جسے زمین نہیں کھا سکتی' وہ ہمارے پاس محفوظ ہے۔

عالم امر کے متعلق کوئی انسان کچھ نہیں جانتا

اور عجیب بات ہے عزیزانِ من! Memory & Matter کتاب ہے برگسان کی۔ اس میں آپ دیکھئے گا' ایسا نظر آتا ہے جیسے ان چیزوں کے ترجمے کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ چیز اس نے کہی ہے کہ میں ان کو کس طرح سے بتا دوں' میری آنکھیں دیکھتی ہیں جب تم قبر کھود کے بتاتے ہو کہ اس میں کچھ نہیں رہا' میری آنکھیں دیکھ رہی ہوتی ہیں کہ کیا باقی رہ گیا ہے اس میں' میں جانتا ہوں۔ وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَ يُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً (6:61) محفوظ رکھنے والے موجود ہوتے ہیں۔ یہ عالمِ امر سے متعلق ہوتے ہیں یہ عالمِ خلق سے متعلق نہیں ہوتے کہ یہاں کے سپاہی ہوتے ہیں۔ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَ هُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ (6:61) موت آتی ہے' ٹھیک ہے جسم کے اوپر موت آتی ہے' طبعی قوانین کی رو سے یہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ جتنے خدا کے طبعی قوانین کارفرما ہیں' ان کی کارفرمائی کی جو قوتیں ہیں آپ کہیے' ان کو بھی قرآن ملائکہ کہتا ہے' ان کی رو سے یہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ جو محافظ ہیں ان کی کیفیت یہ ہے کہ کوئی شے نہیں کہ انہوں نے کمی کر دی ہو کسی میں' کوئی بات رہ گئی ہو حفاظت سے۔ کوئی بات نہیں رہتی۔ اور یہ تو میں نے عرض کیا ہے کہ وہ تو بات سمجھانے کی ہے۔ عالمِ امر کے متعلق ہمیں پتہ نہیں کیسے ہے۔ وہ اس نے بتایا ہے یہ کہیں باہر کی بات نہیں ہے۔ انسان خود اپنے آپ محافظ ہوتا ہے ان تمام چیزوں کا' ہر شخص کا اعمالنامہ اس کی گردن میں لٹکا ہوا ہو گا۔ عجیب لفظ ہیں قرآن کے!!!۔ فرق صرف یہ ہے کہ اِس وقت وہ لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ اُس وقت وہ کھول دیا جاتا ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی!!!۔ کہتا ہے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اور یہ آپ لکھتا ہے اسے۔ پھر اسی لیے کہا ہے کہ وہاں ضرورت ہی نہیں پڑے گی کہ کسی دوسرے گواہ کو بلایا جائے۔ اعتراض ٹھیک تھا وہ کہ

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

''اپنے ای توں گواہ لیا کے بٹھا دتے ساہڈے خلاف جرم دے' کوئی ساہڈے ولوں وی دس نا گواہ''۔ وہ تو شوخی ہے اس کے انداز

کی۔ وہ کہتا ہے ہمارے والے بھی گواہ نہیں ہونگے۔ تم خود اپنے خلاف گواہی دو گے۔ اور سمجھانے کا انداز

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

انسان کے ہر ہر عمل کی گواہی اس کے جسم کا ایک ایک انگ خود دے گا

تمہیں پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ تمہاری زبان کہے گی' تمہاری آنکھیں کہیں گی' تمہارے ہاتھ پکاریں گے' تمہاری جلد پکارے گی' تمہارے خلاف جائے گی۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ (75:14) خود انسان اپنے خلاف وہاں شہادت دے گا۔ کیا چیزیں ہیں یہ۔ اپنے خلاف شہادت دے گا یعنی وہ بات ایسی جس سے مکر ہی نہیں سکتے۔

خدا پر ایمان کی ساری بنیاد حیات آخرت اور مکافات عمل پر ہے

عزیزانِ من! جسے آپ حیاتِ آخرت یا مکافاتِ عمل کہتے ہیں' یہ ہے بنیاد۔ اس کو اگر مان لیا جائے تو پھر خدا' وحی' رسول' کتاب ہر چیز کی پھر تو ضرورت ہے اور ایمان فائدہ بھی کچھ دیتا ہے۔ اور اگر یہ نہیں تو اس کا فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ جتنے بھی الحمدللہ کہہ کے ہم کہہ رہے ہیں کہ مسلمان ہیں اور اٰمَنْتُ باللہ و ملائکتہ یہ کوئی شے نہیں ہے۔ اگر اس پہ ایمان ہو جائے یہ جو قرآن کہتا ہے کہ ہر عمل ہی نہیں بلکہ دل میں گذرنے والا خیال بھی محفوظ ہے' سامنے لایا جائے گا اور اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ اس پہ اگر ایمان تو اس کے بعد جنہیں ہم خدا پرست کہتے ہیں وہ کس قسم کی قوم بنتی ہے دنیا کے اندر۔ یہ جو ہو رہا ہے' باقیوں کو چھوڑ دیجیے خود مسلمانوں کے ہاں بھی جو ہو رہا ہے' یہ ساری اس لیے ہے کہ اس پہ ایمان نہیں رہا کہ ہم اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہیں' کہیں اور بھی جوابدہ ہیں۔ یہیں سے دیکھتے ہیں دور سے کہ سپاہی تو نہیں کھڑا ہے' نہیں کھڑا ہے تو پھر راوی عیش لکھتا ہے۔ کھڑا تو پھر دیکھ لیتے ہیں کہ جیب میں چونی ہے دونی ہے یا آٹھ آنے کے پیسے ہیں کتنی قیمت ہے اسکی' پھر یہ دیکھ لیتے ہیں۔

صدرِ اوّل کے مسلمانوں میں اور ہم میں بنیادی فرق اپنے اپنے اعمال کی جواب دہی کے احساس کا ہے

معاشرہ تو یہ ہو رہا ہے۔ کس کا ایمان ہے اس چیز کے اوپر کہ غلط کام کرنا تو ایک طرف غلط کام کے متعلق ارادہ کرنا سوچنا بھی جرم ہے' اس کی بھی مجھے گرفت ہوگی۔ کس کا ایمان ہے اس کے اوپر۔ کہ جی وہ صدرِ اول کے مسلمانوں کو دیکھئے' بس اتنی سی بات کہہ کے ہم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کیا فرق ہے ان میں اور ہم میں۔ فرق ان میں یہ کہ ان میں سے ہر شخص کا اس پہ ایمان تھا کہ میں اپنے دل میں گذرنے والے خیالات کے لیے بھی جوابدہ ہوں Accountability جو ہے یہ ہے اصل شے اس کی ذمہ داری مجھ پہ عائد ہوتی ہے۔

پختہ کرداری کے بارے خلفائے راشدینؓ کے دور میں اسوۂ حسنہ کی ایک مثال اور حضرت عمر فاروقؓ کا بیوی سے مطالبہ

یہ ہے وہ چیز جو ان کے اندر پیدا ہوئی تھی۔ اور پھر یہ نہیں کہ جس کو ہم کہتے ہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ ' حضرت عمرؓ ' وہ جو کہا جی وہ تو خلفائے راشدینؓ تھے' آگے بڑھے جی وہ صحابۂ کبارؓ تھے یعنی وہ تو آسمان سے اترے تھے' یہ ہمارے لیے تو ہے نہیں۔ اس معاشرے کے اندر یہ کیفیت پیدا ہو گئی تھی کہ حضرت عمرؓ جا رہے ہیں رات کو خیمے کے باہر' وہ تو ایک ایک کا حال خود معلوم کیا کرتے تھے۔ ماں کہہ رہی ہے بیٹی سے کہ بیٹا وہ دودھ آگ پہ رکھ دو۔ اور وہ ہمارے ہاں بھی آپ جانتے ہیں اب تو خیر دودھ ہمارے ہاں اونڈھایا ہی نہیں جاتا' اس میں دھون ڈالتے ہیں وہ برتن جو ہوتا ہے' اس میں پانی ڈال کے' اس کو دھو کے اس میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ وہاں جہاں خالص ہوتا تھا۔ اب تو ضرورت ہی نہیں ہے آپ کو جو آتا ہے اس میں کہیں سے اگر ملے تو دودھ کچھ تھوڑا سا ڈالنا چاہیے تاکہ کچھ تو وہ دودھ بنے۔ ورنہ وہ جو خالص دودھ ہوتا تھا گاؤں میں' ہم بھی جانتے ہیں بچپن میں والدہ کو جو اس کو اُبالنے کے لیے رکھتی تھی تو دھون تھوڑا سا ڈال دیتی تھی۔ وہ ذہن میں یہ تھا کہ آگ سے یہ پانی جل جائے' دودھ کا دودھ تو رہے۔ اس ماں نے کہا بیٹی سے کہ چڑھا دو دودھ اور وہ دھون پانی اس میں ڈال دو اور پھر چڑھا دو۔ اُس نے کہا کہ ماں! دودھ تو میں نے چڑھا دیا ہے' پانی میں نہیں ڈالوں گی۔ اُس نے کہا پانی کیوں نہیں ڈالو گی؟ اُس نے کہا تمہیں یاد نہیں ہے کہ خلیفہ نے یہ بات کہی تھی کہ دودھ میں پانی نہیں ڈالا کرتے۔ اُس نے کہا کہ کہاں خلیفہ تمہارے سر پہ کھڑا ہے تو یہ کر۔ اُس نے کہا کہ بات یہ نہیں خلیفہ نے کہا تھا اس نے کہا تھا کہ خدا دیکھتا ہے جب تم پانی ڈالتے ہو اس لیے امی میں نہیں پانی ڈالوں گی۔ یہ گھر آئے عام قبیلے کی وہ لڑکی تھی' بیوی سے جا کے کہا کہ جاؤ اور اس کی منت کرو اور جس قیمت پہ بھی ہو سکے اس بیٹی کو بیاہ کے لے آؤ کہ یہ ہیں وہ جن کے بطن سے مومن پیدا ہوں گے۔

خدا دیکھتا ہے یعنی خیالات و اعمال کی جوابدہی کا احساس ہی دین کا اصل علم ہے

عجیب بات ہے تاریخ کی کہ سو سال کے بعد جو حضرت عمر بن عبدالعزیز آئے ہیں جنہوں نے پھر خلافتِ راشدہ کا دور یاد دلا دیا تھا' وہ اسی لڑکی کے بطن کی شاخ میں سے پیدا ہوئے تھے۔ نہیں امی! خلیفہ نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں دیکھتا ہوں اس نے کہا تھا' خدا دیکھتا ہے۔ بس یہ فرق تھا۔ کچھ بات بڑی نہیں ہے' اس کے لیے کسی کمیٹی کی ضرورت نہیں' کسی کمیشن کی ضرورت نہیں ہے' صرف یہ ضرورت ہے کہ جو آپ زبان سے کہتے ہیں اس کو آپ دل سے مانتے بھی ہیں یا نہیں۔ یہ لمبے چوڑے مسئلے نہیں' نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر' یہ Law Makers کی بات نہیں یہ Constitutionalist کا مسئلہ نہیں ہے عزیزانِ من! ۔ مسئلہ صرف اتنا ہے کہ آپ اسے مانتے ہیں یا

نہیں کہ میرے دل میں گذرنے والا خیال بھی جو ہے اس کے لیے میں ذمہ دار ہوں اور اس کی باز پرس مجھ سے ہوگی۔بس یہ ہے سارا مسئلہ۔وہاں یہ بات پیدا ہوگئی ہوئی تھی ہمارے ہاں یہ بات ہے نہیں۔اور جب یہ نہ ہو جی میں آئے کر کے دیکھ لیجیے گا۔ٹھیک ہے اوپر کی گرفت آپ کر سکے ہیں؟۔وہ قرآن نے جو کہا تھا کہ قوموں کی حالت بدلتی ہے' جب ان کی نفسیات بدلتی ہے۔سنا وہ کہہ کیا گیا ہے۔ آپ کی کبھی توجہ نفسیات کی طرف آتی ہی نہیں ہے آپ ان کے جو باہر کی جتنی بھی خارجی چیزیں ہیں' ان کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔یہ خرابی یہاں ہوگئی' وہاں یہ ہوگیا سمینٹ کم ڈالا' گیا ریت زیادہ ڈالی گئی' کچھ نہیں ہے۔یہ ہے اصل لم' یہ ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔اس ایمان کے محور کے اوپر ساری قوموں کے اعمال کی گردش ہوتی ہے۔وَ هُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ (6:61) کوئی کمی نہیں کرتے وہ' ہر چیز کو محفوظ رکھا جاتا ہے۔ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ (6:62) پھر اس کی Accountability آ گئی۔ٹھیک ہے یہاں اگر مر گیا ہے کوئی بات سامنے آئی نہ سہی' اس نے تو خدا کے سامنے جانا ہے زندگی تو مسلسل جوئے رواں ہے۔پہلے یہ آپ کو سامنے نظر آتی تھی اب وہ باڑ کے نیچے سے گذر کے گلستاں کے اندر چلی گئی ہے۔بس اتنا ہی فرق ہے۔رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ (6:62) یہ ہے چیز۔یہاں بھی تو ہر اپنے سے اوپر جو آقا آپ کا ہوتا ہے' اس سے ڈر رہے ہوتے ہیں۔وہ کہتا ہے وہ ہے فی الحقیقت جو کارفرما ہے جو تمہارے سر کے اوپر ہے' پھر اس کے سامنے جانا ہے۔یہ آپ یہاں بھی تو دیکھتے ہیں کارندہ اور ملازم اِدھر اُدھر کچھ کرتا ہے' وہ دیکھتا یہ ہے کہ آقا یا ماسٹر نہ دیکھنے پائے۔ وہ کہتا ہے تم اس کے سامنے جاؤ گے جو فی الحقیقت تمہارا آقا اور ماسٹر ہے' جہاں ایک ایک چیز کا حساب ہونا ہے۔اور سنئے عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کے الفاظ کی گہرائیوں پہ جایا کیجیے۔مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ (6:62) اور سن رکھو فیصلہ اسی کا فیصلہ ہے الحکم' اس کے بعد اور کوئی نہ کہیں اپیل ہے نہ کہیں غلطی ہے۔وہ مولا ہے الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ (6:62).

انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ساتھ ہی ساتھ انسانی ذات پر ایک نقش مرتب کرتا ہے

پھر یہ چیز کہ کوئی بات نہیں یہ ہم کرتے رہیں گے وہ چلے جائیں گے وہاں جا کے حساب ہوگا'' کچھ تے غلطیاں ہون گی نا او ہدے اچ' ایناں لماں حساب'' اتنی لمبی عمر میں کچھ نہ کچھ تو غلطی ہوگی۔کہتا ہے وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ (6:62) یہ بات نہیں ہے کہ اٹھا رکھا ہے اس نے کہ قیامت میں آؤ گے' تمہارا حساب کریں گے۔ہم ہر سانس میں حساب کرتے جاتے ہیں تمہارا۔وہ آج کل بینکنگ کے اندر یہ سسٹم ان کے ہاں ہے۔جونہی آپ نے کوئی انٹری وہاں کی' ٹیکس جمع کرایا اور وہاں سے ڈرا کیا اُسی وقت وہ ٹک کرتا ہے اور اس کے اندر انٹری ہو جاتی ہے' شام تک کا انتظار ہی نہیں کرتا۔اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ (6:62) اس سے زیادہ تیز حساب کرنے والا کوئی کمپیوٹر ابھی تک ایجاد نہیں ہوا۔ساتھ کے ساتھ کرتے چلے جاتے ہیں ہر سانس میں۔کیا ہوتا چلا جاتا ہے؟ انسان کی یہ جو نفس یا ذات یا Psyche ہے اس کے اوپر اس کا اثر مرتب ہوتا چلا جاتا ہے۔یہ ہے جو اثر ہوتا ہے کوئی الگ رجسٹر نہیں رکھا کہ اس میں انٹری ہوتی چلی جاتی ہے۔اس

پہ اس کا نقش مرتب ہوتا چلا جاتا ہے اس کے بعد صرف دیکھنا یہی ہے اس میں!! ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ (101:6) خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ (101:8) جھکنے والی صلاحیتوں کا پلڑا جھک رہا ہے' وہ زیادہ ہو گیا ہے' اس قابل ہیں کہ آپ آگے بڑھ جائیں' اس کا وزن کم رہ گیا ہوا ہے' رک گئے وہ جہنم کی زندگی ہوگئی اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ (6:62)۔لیکن کہتا ہے تمہاری حالت یہ ہے تم بھی خدا کو مانتے ہو کہا تمہیں بتائیں تم کیسے خدا کو مانتے ہو۔کیسی دکھتی ہوئی رگ ہماری پکڑ رہا ہے۔یہ چھ ستمبر کو ہی ہمارے ہاں عام ایک بات آپ نے دیکھی ہوگی کہ صاحب! وہ سترہ دن 1965ء کے۔ان دنوں ذرا خدا زیادہ یاد آتا ہے۔پھنس جائے نا کوئی آدمی مقدمے میں دیکھئے خدا یاد آتا ہے' بیماری میں پھنس جائے' نقصان میں پھنس جائے' افسر اس کے خلاف جا رہا ہو' یہ اپیل کر رہا ہو پھر پوچھئے نہیں وہ خدا تو بڑی دور ہے ''داتا صاحب تے جاکے ایڑیاں رگڑن ڈیا ہونداا ے آدمی صاحب'' یہ کیفیت ہے اس کی۔قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً (6:63)

ظہورِ نتائج کے وقت انسان کی کیفیت بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی کی طرح ہوتی ہے

کہتا ہے جب تم پھنس جاتے ہو کہیں اور پھنسنے کی سب سے محسوس ترین شکل سمندر میں کشتی بھنور میں پھنس جائے۔دیکھا پھنسنے کی مثال!!۔کہتا ہے وہاں جب پھنس جائے تو پھر تمہیں پتہ ہے کہ کس طرح چیخا کرتے ہو' چلایا کرتے ہو''یا یارہویں والے آیا سترہویں آلے آیا' خواجہ خضر'' اور پھر یا اللہ اور وہ جتنے وہ پیرو پیر ہوتے ہیں' وہ سارے کے سارے سب چلے آتے ہیں' سب چلے آتے ہیں۔اور تم کہتے ہو لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ (6:63) یا اللہ! اگر یہاں سے بچ جاؤں میں کسی طرح سے پھر تو دیکھ کہ تُو پانچ نمازیں کہتا ہے' میں دس روز کی پڑھا کرونگا' پھر دیکھو میں کیسا بنتا ہوں۔قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ (6:64) وہاں سے جب نجات مل جاتی ہے تو اس کے بعد پھر وہی کچھ ہونے لگ جاتے ہیں۔کہنے لگے بس اتنا ہی فرق ہے۔جو کیفیت تمہاری اس وقت ہوتی ہے' جب تم پھنسے ہوئے ہوتے ہو اس بھنور کے اندر جو اس نے کہا ہے جب تمہاری کشتی پھنسی ہوئی ہوتی ہے' اُس وقت یہ کچھ تم کرتے ہو۔اور جو میں نے ابھی عرض کیا کہ پھر تو پوچھو نہیں نیازیں کتنی پھر آدمی بانٹتا ہے۔

مرادیں پورا کروانے کی خاطر دردر کی ٹھوکریں کھانے کی سعی لاحاصل

وہ سنا ہے آپ نے میراثی کا بیل گم ہو گیا تھا تو وہ چلا اور اس نے آکے کہا کہ یا پنجتن پاک میرا بیل اگر مل جائے'' تے میں پنج رپیاں دی تہانوں نیاز دیاں گا''۔ابھی نہ ملا تو اس نے کہا کہ کسر رہ گئی' گیارہویں والے اگر میرا بیل مل جائے گا تو میں گیارہ روپے کی نیاز دونگا۔وہ آگے چلے تو یا نظام الدین اولیاء (وہ سترہویں شریف والے ہوتے ہیں جی) کہ سترہویں والے میرا بیل مل جائے تو میں

سترہ روپے کی نیاز دونگا۔ وہ کرتا چلا گیا ایک نے اس سے کہا او میں نے تمہارا بیل دیکھا ہوا تھا' مریل سا وہ تو سارا دس بارہ روپے کا بیل تھا تمہارا اور جتنی تم نے اس وقت تک منتیں مان لی ہیں وہ تو کوئی ڈیڑھ دوسو روپے کی ہوگئیں تو کیا کرو گے اس کے ملنے کے بعد۔ کہنے لگا ''سنگیں ہتھ پے لین دئے ساریاں نوں ڈو کے دیدیاں گا آخراچ''۔ انہیں بھی جُھل دیتے ہیں وہ۔ کہا یہی کہ اس وقت تم چیخ رہے ہوتے ہو کہ یا اللہ یہاں سے بچادے اور اس کے بعد پھر دیکھ میں کتنا بڑا مومن بنتا ہوں۔ کہتا ہے وہاں سے بچ جاتے ہیں۔ اس کے بعد پھر تمہاری کیفیت وہی ہو جاتی ہے۔ بات یہ کہی۔ اس دوہے کو عزیزانِ من! یاد رکھئے گا بات بڑی عجیب کہہ گیا ہے وہ ہندی میں جو ہمارے ہاں کہنے والا تھا کہ

دکھ میں تو ہر کو بھجیں اور سکھ میں بھجیں نہ کو

جو سکھ میں ہر کو بھجیں تو دکھ کا ہے کو ہو

آ ہاہاہا!! ۔ دکھ پھر ہوتا ہی نہیں ہے۔ Preventive کے اوپر اسی لیے زیادہ زور دیا جاتا ہے' حفظِ ماتقدم کے اوپر کہ بیماری آئے ہی نہیں۔ ٹھیک ہے کبھی غلطی ہو تو پھر تو کوئی چیز Curative بھی ہونی چاہیے کہ جو علاج اس کا ہو۔ لیکن اصل یہ ہے صحت کا علاج کہ صحت کے عالم میں کوئی چیز ایسی نہ کی جائے جس سے بیماری آجائے۔

جو سکھ میں ہر کو بھجیں تو دکھ کا ہے کو ہو

کیا بات قرآن نے کہی ہے لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ (6:63) اگر ہمیں یہاں سے نجات دیدو تو دیکھو ہم کیسے پھر تمہارے ہو جاتے ہیں۔ کہتا ہے جب پھر ہم نجات دیدیتے ہیں ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ (6:64) پھر تم ہمارے قوانین کے ساتھ اور ملانے لگ جاتے ہو۔ پھر مشرک کے مشرک ہو جاتے ہو۔ یہ ہے ایمان ہمارا خدا کے اوپر یہ ہے ایمان بالآخرت۔ ان دنوں جب مصیبت میں پھنسا ہوا ہوتا ہے تو پھر قیامت بھی آتی ہے پھر تو خوابوں میں فرشتے آتے ہیں گرزوں والے جو ہوتے ہیں۔ کہتا ہے یہ چیز تمہاری نارمل کیفیت ہونی چاہیے' انہی دنوں کیوں ہو۔ کہتا ہے جب یہ کیفیت نہیں ہوتی اجتماعی طور پر' یہ پھر ہو جاتا ہے تمہارے معاشرے کے اندر' تو یہ غلط روش اور غلط اعمال پھر عذاب بن کے تمہارے اوپر نازل ہوتے ہیں۔ یہ عذاب کی شکلیں عزیزانِ من! ذرا سنئے' غور کیجیے گا' کب یہ بات کہی جا رہی ہے۔ ہمیشہ یہ ذہن میں رکھئے گا کہ چودہ سو سال پہلے کی یہ کتاب ہے جس میں ایک لفظ کا اضافہ نہیں ہوا' کمی بیشی نہیں ہوئی۔ کہتا ہے جب معاشرے کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے تو پھر تباہی آتی ہے۔ عذاب کا ترجمہ تباہی کیا کیجیے بات سمجھ میں آتی ہے ورنہ وہ عذاب تو ہم اُدھر لوٹا دیتے ہیں کسی طرح سے۔ تباہی آتی ہے معاشرے کی۔

غلط اعمال کا نتیجہ اور عذاب کی مختلف شکلیں

سنئے کیا شکلیں اس کی ہوتی ہیں اور اپنے ہاں غور کیجیے گا۔ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ (6:65) کہتا ہے کیفیت پھر یہ ہوتی ہے تباہی کی شکلیں یوں ہوتی ہے۔ اس سے پہلے یا عام ترجمے کے اعتبار سے یہ جو آیتیں تھیں بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ خدا اوپر سے تمہیں عذاب بھیج دے یا نیچے سے عذاب بھیج دے تو پھر عجیب عجیب اس کی توجیحات ہوتی تھیں۔ اوپر سے عذاب پھر نیچے سے عذاب۔

قرآن حکیم نے شعبہ سوشیالوجی کے پیش نظر قوموں پر عذاب کی مختلف وجوہات بیان کی ہیں

آپ غور کیجیے قرآن کتنا بڑا سوشیالوجی کا مسئلہ کہتا ہے۔ کہتا ہے عذاب کی شکلیں یوں ہوتی ہیں کہ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ ماسز بالکل ٹھیک ہوتے ہیں یہ اوپر کے کچھ لوگ وہ اتنے غلط کار ہو جاتے ہیں کہ وہ مسلط ہو جاتے ہیں نیچے والوں کے اوپر ان کا استبداد خود ایک شکنجہ بن جاتا ہے اور اس شکل میں عذاب تمہارے اوپر آتا ہے۔ یہ بھی ایک شکل ہوتی ہے۔

حضرت صالح کی قوم کو درست کرنے کے سلسلہ میں دارالسلطنت کے نوسرغنوں کو گرفت میں لانے کی ہدایت

جب مستبد حاکم اس قسم کے آجائیں کہ وہ نیچے والوں کو ہلنے نہ دیں ان کے اوپر ایک شکنجہ فولادی بن کے بیٹھ جائیں' یہ بھی ایک عذاب ہے خدا کا' تباہی کی شکل ہے۔ اور یہ آج کی بات نہیں ہے' بہت پہلے زمانے کی بات ہے کہ جب حضرت صالحؑ سے کہا گیا کہ جاؤ اس قوم کو درست کرو۔ تو انہوں نے کہا کہ اس قوم کو کیسے درست کروں 'سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم' یہ تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے' یہاں ان کی اصلاح کی شکل کیسے ہوگی۔ تو قرآن نے کہا ہے کہ نہیں! کوئی بات گھبرانے کی نہیں ہے' یہ سارے کے سارے بگڑے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ جو ان کا دارالسلطنت ہے نا اس میں تِسْعَةُ رَهْطٍ (27:48) وہ نو ہیں جو بدمعاش وہاں بیٹھے ہوئے وہ' ساری تاریں ہلا رہے ان کا علاج کر دو' معاشرے کا علاج ہو جائے گا۔ عجیب چیز ہے جو کہہ گیا ہے قرآن۔ ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ اوپر اس قسم کے کوئی آٹھ نو بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ پھر چلاتے ہیں سارے معاشرے کو یہ ایک عذاب کی شکل ہے۔ سنورنے کی شکل: وہ اوپر والے جو اتنے سے ہیں ان کو تم سنوار دو۔ بیشتر تو یہیں علاج ہو جاتا ہے۔

قوموں کی سوچ لیکچروں اور وعظوں سے نہیں بلکہ خود اپنی مثال قائم کرنے سے بدلتی ہے

عزیزانِ من! عوام تو عام طور پہ ان کے نقشِ قدم پہ ہی چلنے والے ہوتے ہیں۔ ایک تبدیلی اپنے اندر اوپر والا کر لے۔ جسے کہتے ہیں کفایت شعاری سے رہیے' سادگی سے رہیے' دیے جایئے لیکچر' کیے جایئے وعظ' کچھ نہیں ہوتا' کیوں نہیں ہوتا؟ یہ کہنے والا تو خود ملبوس

ہوتا ہے اس وقت دو ہزار روپے کا سر سے پاؤں تک لباس اس کا ہوتا ہے۔ یہ ایک دن ملیشیا پہن کے باہر آجائے آپ دیکھئے ساری قوم ملیشیا پہننے لگ جائے گی۔ ایک دیانتدار افسر اوپر آجائے آپ دیکھیں گے کہ پورے دفتر کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ ایک افسر Punctual ہو جائے' وقت کے اوپر آنے والا' دفتر میں آپ دیکھئے گا نیچے چپڑاسی تک وقت کے اوپر آجاتے ہیں۔ ایک شکل تو یہ ہے جو کہا کوئی بات نہیں ہے یہ اوپر بیٹھے ہوئے ہیں یہ آٹھ نو ہیں سارے' ان کو ٹھیک کر لیجئے' بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک شکل تو یہ ہے کہ اوپر جب یہ خراب ہوتا ہے تو پھر عذاب ہوتا ہے۔

قوموں کی تباہی کا ایک دوسرا موثر حربہ فرعونی سیاست کو اپناتے ہوئے انہیں پارٹیوں اور گروہوں میں تقسیم کرنا ہے

اس کا اگلا درجہ یہ ہوتا ہے مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ (6:65) جب یہ عوام اتنے تنگ ہو جاتے ہیں' وہ انار کی پیدا کر دیتے ہیں Lawlessness پیدا ہو جاتی ہے' لاقانونیت پیدا ہو جاتی ہے معاشرے کے اندر۔ عذاب کی دوسری شکل یہ ہے۔ آج ہمارے دور میں تو دنیا کی تاریخیں یہ بتا رہی ہیں کہ جب بھی اس مقام کے اوپر لایا گیا عوام کو کہ جہاں راستہ آگے جانے کا کوئی نظر نہ آئے Blind Valley آ گئی وہاں ابھرے اور انہوں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر اس کے بعد عذاب جس شکل میں آتا ہے اس کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ کل ہمارے سامنے مشرقی پاکستان میں یہ ہوا۔ ایک شکل خدا کے عذاب کی یہ ہے۔ تیسری شکل اور ہے اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا (6:65) معاشرے میں پارٹیاں مختلف بن جائیں ہر پارٹی کے اوپر وہی جو آٹھ نو دس گنائے تھے' انہوں نے اس قسم کے وہ ایک ایک پارٹی کا لیڈر بن جائے' عوام کو بھی بانٹ لیا اوپر والے بھی بٹ گئے۔ اب کہا کہ یہاں یہ شکل پیدا ہو جاتی ہے کہ پھر اس قسم کی پارٹیاں بن جاتی ہیں ایک ایک لیڈر' اپنی اپنی پارٹی کو لے لیتا ہے وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ (6:65) وہ آپس میں ٹکرانے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ جو آپس میں پھر پارٹیاں ٹکراتی ہیں' کہا عذاب کی یہ ایک شکل بھی ہے۔ یہ جو چیز ہے یہ قوموں کی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ وہ بڑی ایک مشہور چیز تصوف میں ہم لوگوں کو یہ پڑھایا کرتے تھے' کبھی کبھی یہ کام آجاتا ہے کھوٹا پیسہ کہ حضرتِ نوحؑ جب وہ کشتی میں بیٹھ گئے' سیلاب آ گیا اپنے ساتھی جو تھے ان کو لے لیا وہ وہاں کشتی میں محفوظ جا رہے تھے بڑے خوش تھے کہ ہم محفوظ رہے اور یہ سارے مخالفین کفار جو ہیں یہ اب ان کی تباہی آئی' مرے۔ تو اُنہوں نے دیکھا کہ یہ جو تھے انہوں نے ایک ایک مٹکا لیا اور وہ مٹکے کے اوپر پانی میں ٹھہر گئے۔ تو حضرتِ نوحؑ نے کہا (یعنی یہ سمجھانے کی باتیں ہیں) اللہ میاں سے کہ یہ مجھے اتنا وقت سے پہلے کہہ رکھا تھا' کشتی بناؤ یہ کچھ میں نے کیا۔ اس کشتی میں اپنوں کو لے کے آیا۔ اتنا لمبا تردد کیا جب یہ چار آدمی محفوظ ہوئے۔ اور یہ کفار جن کے متعلق تو نے کہا تھا کہ

یہ سب غرق ہو جائیں گے وہ ایک ایک مٹکا لے کے چلے آ رہے ہیں اور محفوظ ہیں یہ کیا ہوا۔ وہ اللہ میاں نے کہا ذرا ٹھہر جاؤ ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔ تو یہ چلے جا رہے تھے تو اللہ میاں نے ایک تیز جھکڑ چلایا' ہوا چلائی اور مٹکے آپس میں ٹکرائے جناب ٹھاہ ٹھاہ اور وہ مٹکے سارے ٹوٹے اور یہ گئے گھڑم۔ یہ پارٹیاں مٹکوں کے اوپر تیرنے والی ہوتی ہیں۔ وہ کہتا ہے وَّ یُذِیۡقَ بَعۡضَکُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ (6:65) پھر یہ آپس میں ٹکراتی ہیں یہ مٹکے ٹوٹتے ہیں ہے اور اس طرح سے قوم ڈوب جاتی ہے۔

مذہبی فرقے ہوں یا سیاسی پارٹیوں کی فرعونی چال یہ دونوں انسانیت کے قاتل ہیں

کیا نقشے ہیں صاحب !!۔ کبھی عوام ٹھیک ہوتے ہیں Solid ہوتے ہیں اوپر کے چار آدمی وہ بیڑہ غرق کر دیتے ہیں۔ کبھی نیچے والے تنگ آ جاتے ہیں تو قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کے لاقانونیت انارکی شروع ہو جاتی ہے' اس میں تباہیاں آتی ہیں۔ کبھی پوری کی پوری قوم اس طرح پارٹیوں میں بٹ جاتی ہے۔ پارٹیاں ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتی ہیں' قوم اس طرح تباہ ہوتی ہے۔ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّهُمۡ یَفۡقَهُوۡنَ (6:65) سو دیکھو! کس طرح سے بات سمجھانی ہے کس طرح لوٹا لوٹا کے مختلف مثالوں سے تمہیں بات ہم سمجھاتے ہیں تاکہ کسی طرح بات تمہاری سمجھ میں آ جائے۔ اور جو اس پر بھی وہ نہ سمجھے تو پھر اس کا ایک علاج۔

قرآن حکیم اپنے احکامات کو کھول کھول کر واضح انداز میں بار بار بیان کرتا ہے

کتنا مشفق ہے یہ استاد کہ ایک انداز سے بات سمجھ میں نہیں آتی پھر دوسرے انداز سے سمجھاتا ہے پھر تیسری مثال دے کے سمجھاتا ہے' لوٹا لوٹا کے لاتا ہے ان چیزوں کو لَعَلَّهُمۡ یَفۡقَهُوۡنَ (6:65) تاکہ تمہاری بات سمجھ میں آ جائے۔ کہتا ہے ہم تو اس انداز سے یہ سب کچھ سمجھاتے ہیں وَ کَذَّبَ بِهٖ قَوۡمُکَ وَ هُوَ الۡحَقُّ (6:66) اتنی بڑی حقیقت ثابتہ یوں ہم سمجھا رہے ہیں ان کی کیفیت یہ ہے اس کے باوجود' اس کی تکذیب کیے جا رہے ہیں کہ نہیں جی کچھ نہیں بگڑتا۔ اس کے بعد کہا قُلۡ لَّسۡتُ عَلَیۡکُمۡ بِوَکِیۡلٍ (6:66) ان سے کہہ دو کہ پھر میں تمہارے اوپر کوئی داروغہ تو مقرر ہوا نہیں۔ میرا کام تو یہ ہے تمہیں بتاتا چلا جاؤں' زبردستی تو تمہیں میں محفوظ رکھنے سے رہا یہ میرا کام نہیں ہے۔ یَفۡقَهُوۡنَ (6:65) بات تو تمہارے اپنے سمجھنے کی ہے۔

ظہورِ نتائج کے لیے ایک وقت کا تعین ہوتا ہے جس سے پہلے مہلت کا وقفہ ہوتا ہے

اب یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ سارا کچھ ہو رہا ہے' وہ تباہی آتی کیوں نہیں ہے۔ آپ کو یاد ہو گا یہ چیز کئی مرتبہ سامنے آ گئی اصول جو ہے کہ عمل اور اس کے نتیجے کے محسوس طور پہ سامنے آنے میں ایک وقفہ ہوتا ہے' جسے مہلت کا وقفہ کہا جاتا ہے اور یہ بڑی چیز ہے' اس کی رحمت ہے حقیقت میں۔ قرآن نے کہا ہے کہ اگر ہم ہر بدعملی کے اوپر انسانوں کو یوں پکڑ لیتے تو کوئی انسان باقی ہی نہ رہتا۔ بویا جاتا ہے دانہ اس

دانے کے بونے اور فصل کے پکنے کے درمیان ایک وقت ہوتا ہے۔ اس دوران میں بھی اگر وہ قوم اپنے آپ کو سنبھال لیتی ہے، غلط روش کو چھوڑ دیتی ہے تو قرآن کہتا ہے کہ حسنات جو ہیں سیات کو بہا کے لے جاتے ہیں۔ اگر وہ زیادہ اچھے کام کرنے لگ جاتی ہیں تو ان کی غلط کوشیوں کے تباہ کن نتائج مٹ جاتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے درمیانی عرصہ۔ اور وہ کہتا ہے کہ اسی سے یہ لوگ غلط فائدہ اٹھاتے ہیں یا یہ کہتے ہیں کہ نہیں بات کیا ہوئی یہ کہتا ہے کہ صاحب معاشرے میں جب بددیانتی عام ہو جائے تو معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے، وہ سارے پنپ رہے ہیں، موج ہو رہی ہے، وہ تو دن بدن پھولتے پھلتے چلے جا رہے ہیں۔ کہتا ہے یہ چیز ہے جہاں غلطی ان کی ہوتی ہے۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے الفاظ کے مادوں کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے

ایک لفظ یہاں آیا ہے، میں نے گذارش کی ہے کہ قرآن کے الفاظ کو ان کے مادوں کے اعتبار سے دیکھا کیجیے بڑی باتیں سمجھ میں آئیں گی۔ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ (6:67) کیا میں سمجھاؤں کہ کیا بات ہے یہ۔ کہتا ہے ہر واقعے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ آہستہ آہستہ گیند کی طرح لڑھکتا چلا جاتا ہے، آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے آگے آگے۔ اور اس کے بعد مستقر کہتے ہیں وہ مقام جہاں پھر جا کے رک جاتا ہے۔ ہر واقعہ وہ اسی وقت نہیں رک جاتا، وہ چلتا رہتا ہے۔ اس کے اثرات آہستہ آہستہ مرتب ہوتے رہتے ہیں اور پھر ایک مقام آ جاتا ہے کہ جہاں آ کر وہ محسوس شکل میں سامنے آ جاتے ہیں، یہ اس واقعہ کا مستقر ہوتا ہے جہاں آ کے اس نے ٹھہر جانا ہے، رک جانا ہے۔

قانونِ مکافاتِ عمل ایک پروسیس کے تحت بتدریج ظہور پذیر ہوتا ہے

یہاں آنے کے بعد وَّ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (6:67) پھر یہ صورت ہے کہ عنقریب وہ جان لیتے ہیں کہ ہاں آ گئی بات سامنے۔ محسوس شکل میں پھر وہ نتیجہ سامنے آ جاتا ہے۔ یہ جو ہے آہستہ آہستہ بتدریج اس مقام تک لیے جانا یہ ہے قرآن کا یا خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کا پروسیس یا طریقہ جس سے ہر غلط کام اپنا صحیح نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ اس کے لیے ایک لفظ جو قرآن نے استعمال کیا ہے صوتی اعتبار سے بھی دیکھئے اس کو Pronounce کیجیے اس لفظ کو تو اس لفظ میں آپ دیکھیں گے کہ خود وہ Step by step قدم قدم درجہ بدرجہ جسے آپ کہتے ہیں وہاں تک وہ کہتا ہے۔ وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا (7:182) جو لوگ ہمارے قوانین کی تکذیب کرتے ہیں۔ کہتے ہیں نہیں، کچھ نہیں ہوگا ایسے ہی ہے یہ بات یونہی کہہ رہے ہیں، اسے تکذیب کہتے ہیں عزیزانِ من!۔ جو یہ چیز کہتے ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ فوری نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ لفظ ہے وہ آگے سَنَسْتَدْرِجُهُمْ (7:182) اس لفظ کو آپ بول کے دیکھئے یعنی اسے آپ دیکھیں گے کہ یوں بول ہی نہیں سکتے یہ Step by step چلا جا رہا ہے سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (7:182) ہم انہیں درجہ بہ درجہ Step by step قدم بہ قدم لیے چلے جاتے ہیں اس مقام پہ جس کا ان کو محسوس طور پہ علم بھی نہیں ہوتا کہ کہاں لے جائے گا ہمیں۔ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ (7:182)۔ یہ ہے طریق، یہ ہے Process اس کا اس کو آپ Historical Process

کہتے ہیں۔ تاریخ میں آپ دیکھئے کہ کس طرح سے یہ قومیں قدم بہ قدم آگے بڑھتی ہوئی اس مقام تک پہنچ گئیں جہاں ان کی اس غلط روش کے Cumulative نے آ کے محسوس شکل اختیار کی اور وہاں پھر وہ قوم جو تھی' وہ تباہ ہوگئی۔

خدا کا قانون تو مجرم کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوتا ہے

دوسرے مقام پہ اس کو بڑا عمدہ طریقے سے اس نے کہا ہے فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ (21:12) کہ قومیں غلط کار رہیں' مطمئن رہیں کہ کچھ نہیں ہو رہا۔ جب انہوں نے محسوس طور پہ دیکھا کہ وہ آ گئی تباہی ہمارے سامنے تو بھاگنا شروع کیا۔ اور اس کے بعد ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل نے پیچھے سے آواز دی لَا تَرْكُضُوْا (21:13) مت بھاگو اب تم کہیں نہیں بھاگ سکتے اور پیچھے سے جا کے ان کو پکڑ لیا۔ بڑا عجیب Graphic انداز ہے سمجھانے کا۔ وہاں سے جا کے پکڑ لیا اور ان سے کہا کہ چلو مڑ کے پھر اسی دولت کے ڈھیر میں' انہی محلات میں تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ کس کے گاڑھے پسینے کی کمائی تھی جس پہ تم نے یہ چیزیں بنائی تھیں۔ کیا انداز ہے بات کرنے کا۔ آواز پیچھے سے ہم نے دی' جیسے وہ سپاہی دیکھ لے چور کو تو۔ ہم نے پیچھے سے آواز دی لَا تَرْكُضُوْا (21:13) مت بھاگو تم بھاگ کے کہیں نہیں جا سکتے چلو لوٹ کے وہیں وہ جو تم نے عشرت سامانیوں کے محلات کھڑے کیے تھے تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ وہ کس کے پسینے تھے جس سے تمہارے ان محلات کی رنگینیاں بنی تھیں' تجھ سے پوچھا جائے گا۔ یہ ہے وہ مقام جہاں وہ قرآن کہتا ہے کہ مستقر ہوتا ہے وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (6:67) وہاں بات سمجھ میں آتی ہے۔

انسان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بڑی سنجیدگی کا طلب گار ہے

کہا کہ یاد رکھو یہ تمام باتیں جو تمہیں ہم کہہ رہے ہیں بڑی Seriously لینے کی ہیں۔ میں نے ایک دن آپ سے عرض کیا تھا قرآن نے کہا ہے کہ زندگی بڑی Seriously لینے کی ہے' بڑی سنجیدگی سے اس پہ غور کرنا چاہیے یہ Lightly لینے کی بات نہیں ہے' کھیل تماشہ نہیں ہے' تاش کے پتے نہیں کہ دفع الوقتی کے لیے آپ نے باتیں سن لیں۔ اور اس کی اہمیت عزیزانِ من! یوں بھی ذہن میں آجاتی ہے کہ یہ زندگی اس صفحۂ ارض کی ایک ہی بار ملتی ہے۔ پہلا کچھ عرصہ بیس تیس پچیس سال کا اس سے بھی زیادہ بچپن کے تغافل میں' جوانی کی لاابالیوں میں' ناتجربہ کاریوں میں گذر جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر کچھ بات سمجھ میں آنے لگتی ہے تو قواء کمزور ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد پھر دوبارہ یہاں ہے نہیں' Once only and once ایک چانس ہے صرف۔ اور اس پہ دارومدار ہے آپ کی اس اگلی زندگی کا جو لامنتہا سی ہے۔ کتنی Importance ہوگئی اس کو' کتنی اہمیت ہوگئی اس کو کہ طالب علم سے کہا جائے کہ Only one chance صرف ایک چانس ہے امتحان میں بیٹھنے کا' دوبارہ چانس نہیں مل سکتا۔ خود ہی وہ Seriously اس چیز کو پھر لیتا ہے۔ اسی

لیےاس نے کہا کہ تم تو Seriously لو گے۔معاشرے کے اندر اگر کیفیت یہ پیدا ہو جائے کہ وَ اِذَا رَاَیۡتَ الَّذِیۡنَ یَخُوۡضُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ حَتّٰی یَخُوۡضُوۡا فِیۡ حَدِیۡثٍ غَیۡرِهٖ (6:68) آج کل یہ بات ہماری سمجھ میں آجاتی ہے اچھی طرح سے۔

کسی معاشرے میں اندازِ گفتگو کا معیار اور اس سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد

آپ دیکھتے ہیں کافی ہاؤس یا ٹی ہاؤس جب کہتے ہیں ہم اس کے اب ذہن میں معنی ہی نہیں آتے کہ وہاں چائے پی جاتی ہے یا کافی پی جاتی ہے۔وہاں مذاق اڑایا جاتا ہے ہر Serious بات کا' مذاق اڑایا جاتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ اگر کہیں ایسا اتفاق ہو جائے تم کسی ایسی محفل میں پھنس جاؤ کہ جہاں زندگی کے مسائل کے متعلق مذاق کیا جارہا ہو' Seriously نہ لیا جارہا ہو تو کہا کہ آ ؤ اٹھ آ ؤ وہاں سے' ان کے اندر نہ بیٹھو غیر شعوری طور پہ تم پر بھی اثر ہو جائے گا۔تا نکہ وہ پھر کوئی دوسری بات نہ شروع کریں جس کو Seriously وہ Discuss کر رہے ہوں' مت وہاں جاؤ۔وَ اِمَّا یُنۡسِیَنَّکَ الشَّیۡطٰنُ فَلَا تَقۡعُدۡ بَعۡدَ الذِّکۡرٰی مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ (6:68) اور اگر ایسا ہو کہیں کہ تم جذب ہوئے باتوں میں' کچھ محو ہو گئے ہو قرآن اس کو شیطان کہتا ہے کہ وہ تمہیں بھلا دیگا۔

زندگی کے اہم مسائل کو نظر انداز کرنے والی محفلوں میں شریک ہونے کا نتیجہ

جس وقت بھی یہ بات یاد آئے' اسی وقت اٹھ کے چلے آ ؤ وہاں سے۔یعنی یہ ایسی باتیں نہیں کہیں کہ وہ کوئی جھوٹ بول رہے ہوں' جرائم کی سازشیں کر رہے ہوں' کوئی شراب پی رہے ہوں' کوئی جوا کھیل رہے ہوں' نہیں۔اس قسم کی باتیں کر رہے ہوں جو زندگی کے اہم مسائل سے متعلق Lightly ہوتی ہیں' یونہی ان کا مذاق اڑایا جارہا ہو' استہزاء ہو اس کو Lightly لے رہے ہوں' اس کے متعلق کہا جارہا ہے' مت بیٹھو وہاں۔جب بھی یہ یاد آ جائے' اسی وقت اٹھ کے چلے آ ؤ۔قوم الظالمین کہا ہے ان کو اس لیے کہ انہوں نے زندگی کو جو مقام دیا جانا تھا اس نے وہ زندگی کے مسائل کو مقام نہیں دیا انہوں نے۔ظالم اس کو کہتے ہیں کہ وہ مقام نہ دے۔یاد رکھو وَ مَا عَلَی الَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ وَّ لٰکِنۡ ذِکۡرٰی لَعَلَّهُمۡ یَتَّقُوۡنَ (6:69) یہ جو کچھ کرتے ہیں اس کا حساب تم سے نہیں پوچھا جائے گا۔لیکن تمہیں ہم اس لیے یہ بات بتاتے ہیں کہ تم تو نگہداشت کرو ان چیزوں کی جو تم سے زندگی کے مسائل سے متعلق بیان کی جارہی ہیں۔ٹھیک ہے تم یہ کہدو گے کہ وہ باتیں کرتے ہیں' مجھے کیا ہے میں تو نہیں کر رہا۔کہا اس لیے تم سے کہا جارہا ہے' ٹھیک ہے ان کی ذمہ داری تم پہ نہیں ہے لیکن اس کا اثر غیر شعوری طور پر ہو سکتا ہے۔تقویٰ کا تقاضا یہی ہے کہ تم بچ کے چلو۔

لفظ تقویٰ کا مفہوم انسان کو لاحاصل محفلوں سے محفوظ رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے

یہاں لفظِ تقویٰ آیا ہے بڑی عجیب چیز ہے۔عرب اس لفظ کو استعمال کیا کرتے تھے۔آپ چل رہے ہوں جنگل میں خاص طور پہ وہ

پگڈنڈی ہو' چھوٹی ہو اور ادھر دائیں بائیں جھاڑیاں ہوں' جن میں کانٹے ہوں۔ اور ان کے کپڑے تو Loose ہوتے تھے ڈھیلے ڈھالے سے ہوتے تھے۔ تو ڈھیلے ڈھالے سے کپڑے ہوں' راستہ ہو تنگ سا جھاڑیاں ہوں جن میں کانٹے ہوں کہا کہ تم اس راستے سے کیسے گذرتے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ جی وہ جھاڑیوں سے کانٹوں سے بچ کر' اِدھر سے سمٹ کے اِدھر سے سمٹ کے اِدھر سے سمٹ کے' بچتے بچاتے ہوئے ان کانٹوں سے گذرتے ہیں۔ کہا اسے تقویٰ کہا جاتا ہے۔ یہاں لفظ آیا۔ کہا یہ ٹھیک ہے کہ کانٹا چبھا تو نہیں ہے تمہیں لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ کانٹوں والا جو راستہ' وہاں سے سمٹ کے کپڑے کو سمٹا کے وہاں سے گذرو Loosely نہ گذرو۔ ہم اس لیے تمہیں یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر ذرا بے احتیاطی کی تم نے تو دامن الجھ کے رہ جائے گا ان کانٹوں میں۔ اور پھر تم نے اگر جھٹکا دے کے چھڑایا تو دامن پھٹ جائے گا تمہارا۔ تو بہتر یہی ہے کہ نہ ہی اس راستے سے گذرو۔

قرآنی تعلیم کے پیش نظر لفظ متقی کے سلسلہ میں ایک اٹھنے والے اعتراض کا جواب

تقویٰ کا آپ نے دیکھا تقاضا کیا قرآن بتاتا ہے۔ یعنی Actually وہ کام کرنا نہیں بلکہ Preventive احتیاط برتنی ہے۔ اور یہیں سے وہ بات سمجھ میں آتی ہے جو پہلے ہی اعتراض کیا جاتا ہے قرآن کے متعلق **ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ** (2:2) پہلا اعتراض آ کے پڑا کرتا تھا کہ ہدایت ہے یہ متقیوں کے لیے۔ اور چونکہ متقی کے معنی ہمارے ذہن میں بتایا ہوا تھا وہ تو مومن سے بھی اگلی شکل ہوتی ہے نا متقی ہر قسم کا پرہیز گار' تو یہ اعتراض ہوا کرتا تھا کہ قرآن ہدایت ہے متقیوں کے لیے تو جو پہلے ہی متقی ہے اس کو ہدایت کی ضرورت کیا ہے او غیر متقی کے لیے تو ہدایت کی ضرورت ہوئی' وہ تو پہلے صحیح راستے پہ چلتا ہے۔ وہ اس لیے کہ یہ الفاظ ہیں عربی کے قرآنِ کریم کے' تو مفہوم اپنے ہاں اردو میں اور پنجابی میں ان کو لے رکھا ہے بڑا متقی پرہیز گار ہے۔ ورنہ یہ اگر اس کے معنی صحیح مادے کے اعتبار سے یا عربوں کے استعمال کے اعتبار سے قرآن نے جو استعمال کیا ہے' اس اعتبار سے سامنے ہوں' کوئی الجھاؤ ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہے وہ شخص متقی جو ان خار دار کانٹوں سے بچ کے چلنا چاہے۔ تو کہا یہ قرآن راہنمائی کرتا ہے صحیح راستے کی ان لوگوں کے لیے جو راستے کی خار دار جھاڑیوں سے بچ کے چلنا چاہیں۔ جو بچ کے چلنا ہی نہ چاہے اس کو یہ کہنا کہ ادھر سے نہ جانا اُدھر سے جانا وہ بے معنی سی چیز ہے۔ متقی تو وہ ہے جو خطرات سے بچ کے چلنا چاہے۔

زندگی کے ہر ہر موڑ پر خود کو خار دار جھاڑیوں سے بچا کر رکھنے والا

یہاں یہی کہا کہ اٹھ کے چلے آ ؤ۔ ٹھیک ہے تمہارا دامن الجھا نہیں لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس راستے پر چلو ہی نہ جس میں ذرا سی بھی بے احتیاطی ہوئی تو دامن الجھ جائے گا۔ دیکھا قرآن کی ہدایت کیا ہے۔ **وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا وَّ غَرَّتْهُمُ**

الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا (6:70) پہلے بھی یہ آیت آئی ہے۔اور وہ لوگ جو اپنے دین کو محض لھو ولعب سمجھیں' کھیل تماشہ سمجھیں' مذاق سمجھیں یونہی Lightly اس چیز کو لیں وَذَرِ الَّذِیْنَ (6:70) اس کو تو چھوڑ دو بالکل قطع تعلق ان سے کر دو۔ یہ دِیْنَھُمْ (6:70) جو یہاں کہا ہے عام طور پہ اس کے معنی لیے جاتے ہیں کہ جو بھی ان کا ضابطۂ حیات ان کے لیے ہے جو اس کو بھی Seriously نہیں لے رہا اس کے متعلق بھی یہ ہے۔ اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ جو دین تم اپنا ان کے سامنے پیش کرو اور جو اس کو اس طرح سے مذاق میں اڑائیں' ان سے قطع تعلق کرو۔

کلبوں کی زندگی میں اخلاقی جرأت کا فقدان اور اس کا علاج کیا؟

آج ہمارے ہاں اتنی اخلاقی جرآت بھی نہیں اور خاص طور پہ Higher Society کے اندر تو قطعاً نہیں ہوتی کلبوں کی زندگی کے اندر۔ جو لوگ ان چیزوں کے اندر نہیں بھی جاتے ان سے بھی کہیے تو وہ کہتے ہیں کہ ٹھیک بات ہے جاتے تو نہیں بھئی لیکن اب سوشل ہونے کا تقاضا یہ ہے' جانا ہی پڑتا ہے کلب کی زندگی جو ہے اور پھر وہاں جا کے کون ہر ایک سے لڑائی لیتا رہے۔ ٹھیک ہے کسی نے دوسرے کی قبر میں تھوڑا پڑنا ہے' وہ ان کا معاملہ ان کے ساتھ ہے۔ قرآن کہتا ہے غلط ہے یاد رکھو۔ غیر شعوری طور پہ ان چیزوں کا اثر ہو جاتا ہے چھوڑ دو ان لوگوں کو وَذَرِ الَّذِیْنَ (6:70) چھوڑ دو ان لوگوں کو کہ جو دین جیسے اہم Serious معاملے کو لھو ولعب سمجھ رہے ہیں چھوڑ دو ان کو۔ چھوڑ دو کے یہ معنی ہو گئے کہ پھر وہ جس تباہی میں' جس ہلاکت میں' جس بربادی کے راستے میں جا رہے ہیں تو جانے دو ان کو؟

اس قدر تباہی و بربادی میں نہ الجھنے کے باوجود قرآن سے نصیحت کرنے کی تاکید

عزیزانِ من! قرآن ہے۔ہم آپ کسی کو نصیحت کرتے تو یہی کرتے کہ جائے جہنم میں تجھے کیا تم اپنی حفاظت کرو۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ چھوڑ دو اور آگے پتہ ہے کیا کہتا ہے وَ ذَکِّرْ بِہٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ م بِمَا کَسَبَتْ (6:70) اس کے باوجود یہ بات صحیح جو ہے قرآن کی یہ پہنچاتے رہو ان تک' ایسا نہ ہو کہ اپنی غفلت کی وجہ سے وہ تباہ ہو جائیں۔ آہاہا۔ کیسا مشفق ہے یہ طبیب۔ ان سے قطع تعلق بھی کرو لیکن وہ قطع تعلق یہ نہ ہو کہ پھر تم یہ کہو کہ مرتا ہے تو مرنے دو' جاتا ہے جہنم میں جانے دو ذَکِّرْ بِہٖٓ نہ! یہ بات جو ہے یہ کہتے رہو۔ اس کہنے میں ٹھیک ہے تمہارا تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ م بِمَا کَسَبَتْ (6:70) اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص غلط کار ہے تو تم یہ کہہ کے غلط کار کو میں قرآن کیوں سمجھاتا پھروں اور میں ان تک قرآن کیوں پہنچاؤں۔ اَنْ تُبْسَلَ (6:70) لفظ ہے یہاں' محروم نہ رہ جائے وہ کہیں۔ غلط کار بھی قرآن کی ہدایت سے محروم' نصیحت سے محروم نہ رہ جائے' قرآن پیش کرتے چلے جاؤ اس کے اوپر۔ ان کو تو زیادہ ضرورت ہے اس کی۔ یہ نہ ہو کہ کوئی شخص اپنی غلط کاری کی وجہ سے قرآن کی اس راہنمائی سے محروم رہ جائے۔

قطع تعلق کر دیوں لیکن یہ بات اس تک پہنچاتے رہو۔ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ (6:70) یاد رکھو! یہ معاملہ ایسا ہے غلط کام کے نتیجے کا انہیں پتہ نہیں ہے ورنہ جب وہ نتیجہ سامنے آئے گا کوئی دوست ان کا نہیں ہوگا' کوئی ساتھ کھڑے ہونے والا نہیں ہوگا۔ وَ اِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا (6:70) اگر یہ چاہیں گے کہ کتنا ہی رشوت دے کے اس سے چھٹکارا حاصل کرلیں' کفارہ دے کے اس سے چھوٹ جائیں' نہیں ہو سکے گا۔ معاملہ ایسا ہے اس لیے قطع تعلق تو ان سے کرو لیکن یہ بات ان کو سمجھاتے چلے جاؤ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا (6:70) یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کو یوں سمجھانے والا کوئی نہیں تھا اپنے راستے غلط پہ چلتے گئے' انجام تک پہنچ گئے' محروم رہ گئے زندگی کی ساری خوشگواریوں سے۔ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ (6:70) جن باتوں سے انکار کیا' سرکشی برتی تھی اس کا نتیجہ یہ ہے شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ (6:70)۔

غلط معاشرے میں سامان زیست کی فراوانی بھی تباہی کا موجب بن جاتی ہیں

قرآن کی اصطلاحیں عجیب چیز ہیں۔ پانی ممدِ حیات ہے زندگی اس سے ملتی ہے' پودوں کی زندگی پانی کے سر کے اوپر ہے۔ کسی پودے پہ کھولتا ہوا پانی ڈال دیجیے' وہ بھی پانی ہے۔ پانی کی ذرا کیفیت میں فرق ہوا۔ بجائے اس کے کہ ممدِ حیات ہو' وہ ہلاکت آفریں ہو جاتا ہے' پودا جھلس کے رہ جاتا ہے۔ کہتا ہے بڑی گہری چیز ہے یہ کہ غلط نظام ہوا گر معاشرے کا تو وہی چیزیں جو عام حالات میں ممدِ حیات ہوتی ہیں' پانی جیسی چیز جس پہ زندگی کا دارومدار ہے' وہ سمجھ لیجیے کہ کھولتا ہوا پانی بن جاتا ہے جو پیئے گا' انتڑیاں گل جائیں گی۔ پودوں پہ ڈالو گے' وہ جل کے رہ جائیں گے۔ غلط نظامِ معاشرہ میں سامانِ زیست کی فراوانیاں تباہی کا موجب بن جاتی ہیں۔ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ کھولتا ہوا پانی۔ بہر حال میں نہیں کسی کو الزام دیا کرتا' وہ دور ایسا تھا لوگ آگے بات سمجھ نہیں سکتے تھے۔ جہنم میں ہر چیز ہم نے بتا دی اقبالؒ کہتا ہے۔

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گوئی

حشر کے زمانے کے وہ حساب کتاب اور وہ ترازو اور جہنم اور جنت بڑی لمبی چوڑی وعظیں تم نے کہیں

ہزار حیف نہ بینی قیامت موجود

جہنم ہو یا جنت اس کے آثار تو یہیں سے شروع ہو جاتے ہیں

افسوس یہ ہے کہ جس قیامت میں اور جس جہنم میں تو اس وقت ہے' اس کو نہیں دیکھ رہا' کہ کیا چیز ہے۔ یہ قیامتِ موجود جہنم وہیں نہیں ہے' یہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔ کیا ہے یہ شرابِ حمیم؟ کیا انداز ہے قرآن کا بات کرنے کا! پانی جیسی ممدِ حیات چیز یہی ہے ذریعہ

رزق انسان کے لیے۔ کچھ نہیں وہ پانی ہے بس کیفیت تھوڑی سی بدلی ہے اس کی' کھولتا ہوا ہے۔ زندگی کو تباہ کرنے والی چیز۔ یہ Steralize کرتا ہے ڈاکٹر سوئی کو' کیا کرتا ہے وہ؟ وہ جراثیم جو آنکھوں سے نظر بھی نہیں آتے' وہ اتنے کھولتے ہوئے پانی میں اس کو ڈالتا ہے کہ وہ بھی تلف ہو جاتے ہیں۔ زندگی کا نام ونشان مٹ جاتا ہے کھولتے ہوئے پانی سے' وہی پانی کہ جو ممدِ حیات تھا۔ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (21:30) قرآن کہتا ہے' پانی سے ہی ہر شے کی زندگی ہے اور اسی پانی کے اندر کیفیت تھوڑی سی بدل دی جائے تو وہی پانی تمہارے لیے ہلاکت کا موجب۔ غلط معاشرے میں کہتا ہے اتنا ہی کچھ ہوتا ہے۔ رزقِ حلال اور رزقِ حرام میں فرق کیا ہے؟ محنت کر کے شام کو پیسے چار کماؤ اور گھی لے آؤ' جیب کاٹ کے کسی کی روپے چار لاؤ اور گھی لے آؤ۔ اس گھی کو دنیا کی کسی لیبارٹری میں بھیج دیجیے' دونوں گھی ایک جیسے ہوں گے' طبعی طور پہ دونوں کا ایک اثر ہوگا' کچھ فرق نہیں ان کے اندر۔ ٹھیک ہے کھائیے صحت بھی بن جائے گی' پہلوان بھی آپ ہو جائیں گے۔ کہاں ہے یہ فرق جسے رزقِ حلال اور رزقِ حرام کہا گیا ہے فرق کہاں ہوتا ہے؟ محسوسات میں ہی بات کو سمجھا سکتا ہے وہ کہتا ہے بتاؤ تو سہی یہ پانی جو ممدِ حیات تھا یہ موجبِ ہلاکت کیوں بن گیا؟ تھوڑا سا اس کے اندر کیفیت میں فرق آ گیا بس اتنی سی بات ہی ہوتی ہے اور۔ پانی یہ وہی تھا جسے آپ جہنم کا شراب کہتے ہیں شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ (6:70) یعنی عَذَابٌ اَلِيْمٌ (6:70) وہی کھولتا ہوا پانی خوشگوار ہونے کی بجائے الم انگیز تباہی کا موجب بن جاتا ہے۔ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ (6:70) اس لیے کہ تم نے اس چیز سے انکار کیا تھا کہ پانی کس حالت میں پیا جائے تو وہ ممدِ حیات ہوتا ہے۔ رزقِ حلال اور رزقِ حرام میں تم نے تمیز نہیں کی تھی' اس لیے یہ چیز وہاں کی ہوگئی۔ عزیزانِ من! سورۃ انعام کی آیت 70 تک ہم آ گئے ہیں 71 سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀......❀......❀

نواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 71 تا 79)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج ستمبر 1971ء کی 26 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی 71 ویں آیت سے ہوتا ہے (6:71)۔

مجھے افسوس ہے کہ گذشتہ اتوار میری ناسازیٔ طبیعت کی وجہ سے درس کا ناغہ ہوا۔ طبیعت تو اب بھی میری اچھی طرح بحال نہیں ہوئی لیکن بہر حال مناسب یہی سمجھا ہے کہ درس میں ناغہ نہ ہو۔

ارشادِ خداوندی ہے کہ دوسروں کے لیے راہنمائی کا فریضہ آخری وقت تک جاری رہنا چاہیے

سابقہ آیت میں کہا یہ گیا تھا کہ جو لوگ مستقل اقدارِ خداوندی کے مقابلے میں، مادی زندگی کی جاذبیتوں کو ترجیح دیتے ہیں، وہ اپنے آپ کا نقصان کر لیتے ہیں۔ کہا یہ گیا تھا کہ ان لوگوں سے تم الگ رہو لیکن الگ رہنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تم انہیں صحیح راستے کی طرف

نشانہ ہی بھی نہ کرو۔ یہ چیز کرتے جاؤ' یہ چیز کہتے جاؤ تا کہ کوئی شخص بھی محض اس لیے ہلاک نہ ہو جائے کہ اسے صحیح راستے کا علم نہیں تھا۔ اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ انسان کا صحیح مقام یہ ہے جسے قرآن متعین کرتا ہے اور جو اس کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ ہے کہ انسان کو اس کا صحیح مقام بتایا جائے۔ اور مقام یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے سامنے جھکے نہیں۔ یہ وجۂ تذلیل انسانیت ہے۔ انسان ہونے کی جہت سے سب برابر ہیں' یکساں طور پر تکریم کے مستحق ہیں۔

معاشرتی زندگی میں عملی تعاون کے علاوہ خود کو کسی کے سامنے پست مقام پر لے جانا' انسانیت کی تذلیل ہے

لیکن دوسرے کے سامنے انسان جھکتا اس وقت ہے جب اس کا کوئی کام رکا ہوا ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ میرا کام کر دے گا۔ اس کی بھی دو شکلیں ہیں: ایک تو یہ جسے ہم تعاون کہتے ہیں۔ بیمار ہے' وہ ڈاکٹر کو بلاتا ہے' وہ اس کی مدد کا محتاج ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ اس احتیاج کے اندر اس کے سامنے تذلیل و تحقیر کی بات نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ یہی ڈاکٹر دوسرے ہی قدم پر یہ بلانے والا مثلاً اگر مزدور ہے تو دوسرے ہی وقت پر یہ اس کا محتاج ہو جائے گا۔ یہ اگر بڑھئی ہے تو یہ اس کا محتاج ہو جائے گا۔ یہ باہمی تعاون کہلاتا ہے۔ یہ تقسیم جو ہے معاشرے میں کام کی' تقسیمِ عمل جسے کہتے ہیں' اس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے تعاون کے محتاج ہوتے ہیں۔ تعاون کے معنی ہوتا ہے ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ یہ اس معاملے میں اس کی مدد کا محتاج ہے وہ اس معاملے میں اس کی مدد کا محتاج ہے۔ معاشرہ تو چلتا ہی اس طرح سے ہے۔ لیکن دوسری شکل جس میں جھکنے کی بات ہے وہ یہ کہ کسی ہستی کو ایسا سمجھ لیا جائے کہ وہ میری مرادیں بر لائے گا میری مصیبتیں رفع کر دے گا' مجھے کچھ فائدہ پہنچائے گا۔ تعاون کی شکل اس کے ساتھ نہ ہو بلکہ اسے ہر وقت اونچے مقام پہ رکھا جائے اور خود اس کے سامنے ہمیشہ پست مقام کے اوپر گڑگڑاتے ہوئے اس کے سامنے جایا جائے۔ یہ ہے وہ چیز جس سے انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے۔ اور قرآن کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ کوئی انسان اپنے آپ کو اس پوزیشن میں نہ گرا لے کہ وہ کسی دوسرے انسان کے سامنے اپنے آپ کو اتنا پست اور ذلیل سمجھے۔ یہ مقام وہ کہتا ہے کہ صرف خدا کو حاصل ہے۔ اور خدا کے ساتھ چونکہ انسانوں کا تعلق ان قوانین کے ذریعے سے ہے جو اس نے کائنات میں نافذ کر دیے اور جنہیں اس کتاب کے اندر دیدیا۔ اس لیے جسے ہم اطاعت کہتے ہیں یہ اطاعت بھی خدا کے ابدی قوانین کی اطاعت ہے۔

دعا کا حقیقی مفہوم مانگنے کا نہیں بلکہ پکارنے کا ہے

ظاہر ہے کہ جب قانون کی اطاعت ہوتی ہے تو وہاں بھی کسی کی ذلت نہیں ہوتی' تحقیر نہیں ہوتی۔ یہ ہے جو قرآن چاہتا ہے۔ اب یہ دیکھئے وہ کہتا ہے کہ انسانوں کی کیفیت یہ ہے اور یہ کہلایا گیا ہے خود جماعتِ مؤمنین کے لئے نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے کہ قُلْ

(6:71) ان سے کہد وکہ کیاتم چاہتے ہواَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَ لَا يَضُرُّنَا (6:71) کیاتم چاہتے ہو کہ ہم خدا کو چھوڑ کر خدا کے سوا' خدا کے علاوہ ایسی ہستیوں کو پکارنے لگ جائیں جو نہ ہمیں نفع پہنچاسکتی ہیں' نہ نقصان پہنچاسکتی ہیں۔ دیکھئے قرآنِ کریم میں مختلف مقام پہ یہ لفظ نَدْعُوْا وغیرہ آئے گا د ع و مادہ معنی ہوتا ہے پکارنا۔ دعا بھی دراصل حقیقت میں کسی سے مانگنا نہیں ہوتا کسی کو پکارنا ہوتا ہے۔ اور یہ پکار کی بات آپ جانتے ہیں کہ انسان مدد کے لیے مصیبت کے وقت کسی کو آواز دیتا ہے' اسی کو اس کا پکارنا کہا جاتا ہے۔ یہی لفظ قرآن نے استعمال کیا ہے ان ہستیوں کے لیے جنہیں معبودانِ باطل کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ کیوں ان کے سامنے جاکے جھکتے ہیں؟ کیوں ان کو پکارتے ہیں؟ اس لیے کہ یہ کسی مصیبت میں ہوتے ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ ہے کہ ہمیں ان کی مدد حاصل ہو جائے وہ ہماری مصیبت کو رفع کر دیں یا ہمیں فلاں قسم کا فائدہ مل جائے۔ مصیبت میں پکارتے ہیں کہ بیمار ہے' مایوس ہو رہا ہے اس کی طرف سے۔

کسی کو تعاون کی خاطر اپنے لیے بلانے اور حضرت صاحب کو پکارنے میں ایک بنیادی فرق' دوسروں کو خدا بنانا ہے

یہ علاج اگر کراتا ہے تو یہ تو تعاون اور جب یہ حضرت صاحب کے مزار پہ جاکے گڑگڑاتا ہے تو اسے پکارتا ہے یا حضرت! میرے بچے کی جان بخشی کر دیجیے' میں بڑا مصیبت زدہ ہوں۔ یہ جو پکارنا ہے جس کو پکارا جا رہا ہے اس کا مقام اپنے سے بہت اونچا رکھا جاتا ہے' تعاون کی شکل نہیں ہے۔ ڈاکٹر کا بلانا نہیں ہے یہ۔ بلکہ یہ چیز ہے کہ میں محتاج ہوں اور آپ اس پوزیشن میں ہیں کہ میری مصیبت کو رفع کر دیں اور ہم تو کبھی اس پوزیشن میں نہیں ہونگے کہ آپ کے کسی کام آسکیں۔ آپ تو ان چیزوں سے بہت اونچے ہیں' آپ کو تو ہر قسم کی قوت حاصل ہے' اقتدار حاصل ہے۔ یہ انہیں حقیقت میں خدائی مقام دینا ہے۔ یا نفع کے لیے پکارنا ہے اور نفع کے پکارنے والے تو بزنس والے جانتے ہیں' جونہی ادھر سودا کیا ادھر اس کے ساتھ رشوت کا ٹھہرایا اور وہاں جاکے منت مانی۔ وہ رشوت کی دوسری قسم ہے کہ یا حضرت! اگر اس سودے کے اندر مجھے اتنا فائدہ ہو جائے گا تو میں یہاں آپ کی قبر کے اوپر سونے کا کلس لگوا دونگا۔ کیا چیز ہے یہ؟ ابھی ابھی یہ افسر سے کیا کہتا چلا آ رہا تھا کہ اگر اس میں اگر ذرا آپ ہماری مدد کر دیجیے تو اس میں سے دس ہزار روپیہ آپ کا ہے۔ یعنی یہ وہی مقام ہے۔ نفع یا نقصان دونوں کے متعلق قانون کی طرف رجوع کرنا' اس میں کوئی کسی قسم کی بھی ذلت اور پستی نہیں ہے دوسرے انسانوں سے تعاون چاہنا' اس میں بھی تذلیل و تحقیر نہیں ہے۔ لیکن کسی ہستی کو اپنے سے بلند تصور کر کے یہ کہنا کہ وہ ان چیزوں کے بغیر میری مدد کر دے گا' مجھے مصیبت سے نکال دے گا' مجھے کوئی نفع پہنچا دے گا' یہ ہے دوسرے کو خدا بنالینا۔ یہ ہے جس کی جڑ کاٹتا ہے قرآن۔ اسی کو وہ شرک کہتا ہے۔ اس کی ایک فارم اگلی آیت میں آتی ہے جسے کہ ایک محسوس شکل کے اندر مٹی کی مورتی یا پتھر کا تراشیدہ مجسمہ سامنے رکھ کے

ان سے بھی مرادیں مانگتے ہیں۔ مسلمان ان کے اوپر تو مذاق کرتا ہے لیکن وہ کچھ بھی ہوان گھڑ سہی' کچھ تو گھڑا ہوا ہوتا ہے۔ یہاں ایک بالکل چبوترا ہوتا ہے سمینٹ اور چونے کا' وہاں جاکے یہ سب کچھ کر رہا ہوتا ہے۔ یہ توحید پرست ہے' وہ مشرک ہے۔ کہا یہ ہے کہ کیا تم چاہتے ہو کہ ہم پھر خدا کو چھوڑ کر' ان ہستیوں کو بلانا شروع کر دیں' ان کو پکارنا شروع کر دیں۔ اور میں نے کہا ہے کہ اس پکار کے تو ہمارے ہاں زندہ مظاہرے ہوتے ہیں۔ بڑے جلی حروف میں لکھا ہوا آپ کو ملے گا یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ۔ پکار کتنے زور کی ہے اے حضرتِ شیخ عبدالقادر! خدا کے لیے کچھ دیجئے مجھے۔

قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ تقلید پرستی انسانی عقل وفکر کو مفلوج کر دیتی ہے

یہ تو میں نے ایک مثال دی ہے' یہاں تو ہر معروف اور غیر معروف ذرا بھی ڈھیر مٹی کا اونچا لگا اور اس پہ ایک جھنڈی گاڑنے کی بات ہے اور شروع ہو گئے۔ کچھ معلوم نہیں کہ ان کے نیچے کیا ہے۔ بسا اوقات تو کبھی کسی حادثے سے وہ قبر پھٹ جائے یا اس کو کھودنا پڑے تو پیر کی جگہ شہتیر نکلتا ہے اس میں سے۔ لیکن مانگتے چلے جاتے ہیں۔ اور اگر اس میں سے نہ بھی شہتیر نکلے جو کچھ بھی نکلے' وہ شہتیر ہی ہوتا ہے اس میں تو کچھ نہیں ہوتا عزیزانِ من! لیکن پکار رہے ہیں وہاں جاکے' گڑگڑا رہے ہیں وہاں جانے کے بعد۔ سارے یہ توحید پرست۔ سنئے قرآن کیا کہتا ہے۔ اعلان کرا رہا ہے یہ نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے کہ ان سے کہہ دو کہ تم یہ چاہتے ہو کہ ہمیں تو خدا نے اس بلند مقام پہ پہنچا دیا کہ ہم کسی کے سامنے نہیں جھکتے سوائے اس کے قوانین کے۔ اور تم چاہتے یہ ہو کہ ہم انہیں پکارنا شروع کر دیں اور اس طرح سے وجۂ تذلیل انسانیت عمل اختیار کر لیں۔ کہا ہے وَ نُرَدُّ عَلٰٓی اَعۡقَابِنَا بَعۡدَ اِذۡ ھَدٰىنَا اللّٰہُ (6:71) تم چاہتے ہو کہ بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں صحیح راستہ دکھا دیا ہے ہم پھر اسی مشرکانہ راستے کے اوپر چلے جائیں۔

قرآن حکیم کا منشور' ہماری حالتِ زار اور اس کا علاج

سوچئے کہ یہ کس سے کہا گیا ہے۔ کیا آج مسلمان کی یہی حالت نہیں ہے؟۔ مشرک بت پرست جن کے سامنے یہ ہدایت نہیں آئی تھی وہ تو یہ کہہ سکتے تھے کہ ہمیں جہالت کے دور میں پتہ نہیں تھا۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس کے بعد خدا نے ہمیں صحیح راستہ دکھا دیا' کیا ہم پھر اسی اپنی پرانی مشرکانہ روش کی طرف لوٹ جائیں' تم یہ چاہتے ہو۔ اور مسلمان نے یہ کر کے دکھا دیا۔ خدا کی ہدایت آنے کے بعد پھر وہی شکلیں اختیار کر لیں اپنے ہاں جن کو مٹانے کے لیے قرآن آیا تھا۔ قدم قدم پر زندہ انسانوں اور ان کی ہڈیوں کے اوپر جاکے' پکار کے ان کو اور ان سے جن کے متعلق قرآن کہتا ہے مَا لَا یَنۡفَعُنَا وَ لَا یَضُرُّنَا (6:71) بنیادی طور پہ نفع اور نقصان اختیار کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے' یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے' ہمارا تصور ہے جو خواہ مخواہ کے لیے ہم سمجھ لیتے ہیں کہ یہ کر سکتے ہیں اور یہ کر

دیتے ہیں۔ آپ اپنا عقیدہ پہلے سے نہ لے کے جایئے یعنی عقیدت مندی جسے آپ کہتے ہیں یہ نہ ذہن کے اندر رکھئے اور اس کے بعد آپ دیکھئے، اس کی پوزیشن کیا رہ جاتی ہے۔

جناب تم نے بنایا حضور تم نے بنایا دراصل یہ سارا کھیل انسان کے اپنے جذبات کا ہے

مٹی کے ڈھیر کی تو خیر پوزیشن ہی کچھ نہیں ہوتی۔ یہ زندہ انسان جو آپ کے سامنے ہوتا ہے، اس کی حیثیت بھی کیا رہ جاتی ہے ایک انسان کی حیثیت رہتی ہے۔ آپ اس کو یہ سب کچھ بناتے ہیں۔ اپنے ذہن میں پہلے اس کے متعلق ایک تصور قائم کرتے ہیں کہ یہ ان قوتوں کا مالک ہے۔ وہ ہوتا نہیں ہے آپ کے ذہن کا تصور ہے۔ یہ عقیدت ہے آپ کی جو اس کو پھر سب کچھ بنا دیتی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ بعد اس کے کہ خدا نے ہمیں اس مقام سے نکال لیا ایسی ہدایت ہمیں دیدی کہ ہر ایک کا صحیح صحیح مقام اس کائنات میں اس نے ہمیں بتا دیا۔ تم چاہتے یہ ہو کہ اس کے بعد ہم پھر پرانی روش کے اوپر لوٹ جائیں جہاں سے ہمیں قرآن نکال کے لایا تھا۔ اور پھر ہم انسانوں کو ملجا ماویٰ اور سمجھ لیں اپنی ضرورتوں کے لیے اپنی احتیاجات کے لیے۔ اس پست مقام کے اوپر ہمیں تم گرانا چاہتے ہو۔ اگلے لفظ میں یہ پستی کا تصور محسوس شکل میں سامنے وہ لے آیا۔ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ (6:71) اس شخص کی طرح کہ جسے اس کے سرکش جذبات عقل و فکر کو اس کے ماؤف کر دیں اور پھر ایسے مقام میں لا کے چھوڑ دیں جہاں کوئی راستہ اس کو نہ نظر آتا ہو، سجھائی نہ دیتا ہو کوئی راستہ۔ حَيْرَانَ اس کو کہتے ہیں۔

جذباتی سوچ یا جذباتی گفتگو کا نتیجہ ہمیشہ ناکامی اور شرمندگی کی شکل میں ہی نکلتا ہے

یہ جتنے بھی اس طرح انسانوں سے مدد یں مانگنے والے، پکارنے والے، رونے والے ہوتے ہیں، آپ دیکھتے ہیں کہ یکسر جذباتی چیز ہوتی ہے۔ عقل و فکر کی رو سے، دلائل و شواہد کی رو سے، کبھی وہ گفتگو نہیں کر سکتے آپ کے ساتھ۔ وہ کہیں گے کہ سوال یہ ہے کہ آپ کا عقیدہ یہ نہیں اس لیے ہم آپ کو کیا سمجھائیں۔ یہ بات تو عقیدے سے متعلق ہے ہمیں تو زمین سے آسمان تک نور ہی نور نظر آتا ہے۔ اب تمہاری آنکھوں میں تاریکی ہو تو ہم اس کا کیا علاج کریں کہ آپ تو اندھے ہوئے۔ یعنی آپ دیکھیں گے بالکل جذباتی بات ہے، رو رہے ہیں، گڑگڑا رہے ہیں، اس میں کوئی چیز فکر کی، دلیل کی نہیں ہے۔ خالص جذباتی چیز ہے۔ کئی دفعہ میں نے یہ بات کہی کہ عربوں کی زبان معلوم نہیں اس قوم نے، فطرت کے پروگرام نے کیا ہی یہ تھا کہ یہ قوم ایک زبان تیار کرتی رہے کہ جو حامل ہو سکے قرآن جیسے حقائق کی۔ کوئی دنیا کی اور زبان اس طرح سے حامل نہیں ہو سکتی۔ اور حیرت یہ ہے کہ یہ وہ قوم ہے جس کے پاس ابھی خدا کی ہدایت آئی نہیں۔ لیکن زبان اس نے ایسی اپنے ہاں وضع کر لی، مانجھ دیا اس زبان کو کہ وہ حامل ہو گئی قرآن کے حقائق کی۔ جسے ہم خواہشات یا جذبات کہتے ہیں یہی

ساری چیز ہے کہ انسان ان جذبات میں آ کے یہ سب چیزیں اختیار کر لیتا ہے اس کے لیے عربوں کے ہاں لفظ ھـوا ء ہے۔ اور اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں بلندی سے پستی کی طرف آ جانا۔ اندازہ لگائیے۔

لفظ ھوا کا لغوی مفہوم

قرآن نے یہ بات کہی تھی کہ جو شخص عقل وفکر وبصیرت اور سندِ خداوندی کو چھوڑ کے جذبات کے پیچھے لگ کے ان کو اپنا خدا بنالیتا ہے' وہ اپنے مقامِ بلند سے پستیوں کی طرف آ جاتا ہے یہ۔ اب اس کے لیے اس زبان میں پہلے سے ایک لفظ موجود ہے۔ یہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ خالص جذبات کے تابع۔ خود جذبات کے لیے ان کے پاس جو لفظِ ھـو اء ہے اس کے بنیادی معنی ہیں بلندی سے پستی کی طرف گر جانا۔ اور یہی تو قرآن بتانا چاہتا تھا کہ جو شخص خالص اپنے جذبات کی پیروی کرنے لگ جاتا ہے' مقامِ انسانیت کی بلندی سے وہ حیوانیت سے بھی پست تر درجے کے اوپر آ جاتا ہے۔ ایک لفظ اس کے لیے موجود ہے پہلے سے اور یہیں سے ہے كَـالَّـذِي اسْتَهْـوَتْـهُ الشَّيٰطِيْنُ (6:71) اس شخص کی مانند جو جذبات کے پیچھے لگ گیا۔ اب جذبات کوئی ایسی معیوب چیز نہیں کہ ان کے پیچھے لٹھ لے کے پھرا جائے۔ جذبات سے عاری کر دیا جائے انسان کو تو اس کے بعد تو یہ مردہ ہوتا ہے۔ کوئی کام دنیا میں آپ کر ہی نہیں سکتے جب تک اس کا محرک جذبہ نہ ہو۔ یہ جسے جذبات کہتے ہیں' یہی تو محرک ہوتے ہیں۔ آپ کوئی کام جب کرنا چاہتے ہیں' کر نہیں سکتے۔ پہلے دل میں اس کے لیے ایک آرزو پیدا ہوتی ہے۔ اٹھ کر باہر آنے کے لیے بھی آپ کے ذہن میں پہلے ایک آرزو ایک خیال ایک خواہش پیدا ہوتی ہے باہر جانے کی۔ اور اگر یہ چیز پیدا ہی نہ ہو تو آپ لیٹے ہوئے ہیں کوئی دنیا کا کام ہی نہیں کر سکتا انسان جب تک کہ دل میں اس کے لیے پہلے آرزو وارادہ خواہش بیدار نہ ہو۔ اور اسی کا نام تو جذبہ ہوتا ہے۔ تو اگر جذبات کی کیفیت یہ ہے جو یوں ہم نے ابھی بیان کی تو اس کے تو معنی یہ ہیں کہ قرآن پتھر بنا دینا چاہتا ہے انسانوں کو۔ یہ بات تو نہیں ہے۔ وہ کہتا کیا ہے؟

انسانی جذبات کی قدر ومنزلت ان کا مقام نیز ان کا استعمال اور پھر دنیائے تصوف کا کردار

وہ کہتا ہے یہ جذبات بڑی ضروری چیز ہیں۔ لیکن جذبات چند قوتوں کا نام ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان قوتوں کو استعمال کس طرح سے کیا جائے۔ کہتا ہے انہیں استعمال یعنی دو منزلوں میں بات اگر سمجھیں اچھی طرح سمجھ میں آئے گی۔ جذبات کو عقل کی رو سے استعمال کیا جائے اور عقل کو خدا کے قوانین کے تابع رکھا جائے یہ ہے دین۔ وہ جذبات کو فنا نہیں کرتا' ناممکن ہے یہ۔ آپ کے ہاں کے تصوف والے جنہوں نے ایران کے مجوسیوں سے اور عیسائیوں کے سینٹس سے یہ بات کہیں سے سیکھ لی۔ اِدھر ہندوؤں کے سادھوؤں کے ہاں بھی یہ چیز ہوئی' ترکِ دنیا اور ترکِ آلائش اور ترکِ ترک۔ جو جی میں آئے کر دیکھئے آخر میں تو جذبہ کوئی رہتا ہی ہے۔ اور یہ بات بہت بڑی پتے

کی کہی۔ بدھوں کے ہاں یہ بات شروع ہوئی تھی کہ ہر آرزو تکلیف کا پیش خیمہ ہوتی ہے‘ اس لیے آرزو کے ترک کا نام مقصدِ انسانیت ہے۔ آرزو کے ترک کا نام‘ اس کے اوپر انہوں نے بہت زور دیا۔ اور آخر میں آ کے خود انہی کے فلاسفروں نے یہ کہا کہ یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس میں تو ایک بنیادی غلطی ہے۔ خود یہ آرزو کہ ہمارے دل میں کوئی آرزو نہ پیدا ہو‘ یہ بھی تو ایک آرزو ہے۔ تو اس نے کہا کہ یہ سارا جتنا ہمارا فلسفہ ہے‘ جتنا ہمارا مذہب ہے جو کچھ ہم اس کے لیے کر رہے ہیں‘ وہ یہ ہے کہ دل میں کوئی آرزو بیدار نہ ہو۔ تو کہا یہ سارا کچھ کرنا جو ہے یہ بھی تو آرزو کے تابع ہے۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے کہا‘ نروانہ حاصل کیا جائے۔ نروانہ کیا ہے؟ کہا ایسی حالت جس میں انسان کی عقل ہوش خرد سمجھ سوچ کوئی چیز باقی نہ رہے اس کے ساتھ‘ بالکل ختم ہو جانا۔ جیسے نشہ پینے کے بعد یا آج کل آپ کی میڈیسن سائنس کے اندر کلوروفارم کے تابع یا اس قسم کے بے ہوشی جو کر دیتے ہیں اس کے تابع ایسی کیفیت پیدا کر دینا کہ انسان اپنے آپ ہی کو بھول جائے‘ فراموش کر دے۔ نروانہ کی کیفیت ان کے ذہن میں کچھ ایسی تھی Complete Darkness جسے کہتے تھے۔ لیکن یہ محض الفاظ کا گورکھ دھندہ ہے کوئی جینے والا انسان اس مقام پہ پہنچ ہی نہیں سکتا کہ اس کے دل میں کوئی آرزو باقی نہ رہے۔ خود جینے کی آرزو‘ جینے کے لیے پانی پینے کی آرزو‘ جنگلوں میں چلے جایئے پہاڑ کی چوٹیوں میں چلے جایئے یہ چیز تو پیچھا ہی نہیں چھوڑتی۔ آپ کے ہاں بھی یہ جو ترک کا جذبہ تھا وہ ترکِ دنیا اور ترکِ لذات آخر میں انہوں نے کہا تھا کہ ترکِ ترک یعنی یہ سب کچھ چھوڑ دینے کی آرزو کا بھی ترک۔

فالج زدہ پیر دوسروں کا علاج تعویذوں سے اور اپنا ڈاکٹر کے انجکشنوں سے

شاعری ہے کوئی بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ چھوڑنا تو ایک طرف رہا محتاجی کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ اس زمانے میں تو میں نہیں کہہ سکتا تھا‘ اب کہہ سکتا ہوں مرحوم ہو گئے‘ سامنے میرے جو ہے یہ کوٹھی یہاں رہا کرتے تھے پیر فضل شاہ صاحب مرحوم۔ ذہن میں آ گیا کتنے بڑے اونچے پائے کے پیر ہیں جلالپور پیراں والے جو ہیں ان کے پیر فضل شاہ مرحوم۔ ان کو فالج تھا ایک سائیڈ پر‘ بول بھی نہیں سکتے تھے‘ چل پھر بھی نہیں سکتے۔ صبح کے وقت ان کے خدام ایک کرسی پہ ان کو اٹھاتے تھے اور ہوا خوری کے لیے لے جاتے تھے۔ ایک پاؤں کے اوپر ذرا ذرا سا ایک ایک قدم بھی وہ چل لیا کرتے تھے۔ وہ باہر جاتے تھے ہم اور ہمارے بچے بھی سامنے دیکھتے تھے کہ ان کے مریدوں کی‘ معتقد بیماروں کی‘ چارپائیاں یہاں آ کے بچھ جاتی تھیں ان کے صحن میں۔ دور دور سے وہ علاقہ جو ہے ان کے ہاں کا جھنگ وغیرہ کا وہاں سے آتے تھے وہ لوگ اتنی اتنی دور سے۔ چارپائیوں پہ مریضوں کو لٹا کے لا کے رکھ دیتے تھے ان میں فالج کے مریض بھی ہوتے تھے۔ وہ آتے تھے اور وہ آ کے ایک ایک مریض کو کسی پہ ہاتھ رکھتے تھے‘ کسی پہ شو کرتے تھے‘ تعویذوں کا ڈبہ ساتھ ہوتا تھا‘ کسی کو تعویذ نکال کے وہ اشارہ کر دیتے تھے کسی کو تعویذ دیدیتے تھے۔ وہ یہ کرتے جاتے تھے اور وہ پھر چارپائیاں لے کے چلے جاتے تھے اور اتنے میں کوئی آٹھ ایک بج جاتے تھے تو وہ حضرت صاحب پھر بیٹھ جاتے تھے تو اتنے میں ڈاکٹر صاحب تشریف لے آتے تھے انجکشن لے کے تو وہ انہیں

انجیکشن لگاتے تھے۔اسی فالج کا انجیکشن جس کے لیے تھپتھپا کے' دعا دے کے' تعویذ دے کے' مریضوں کو اپنے مریدوں کو چلتا کرتے تھے۔اس کے لیے خود انجیکشن لگواتے تھے۔ پانچ چھ برس وہ یہاں رہے اسی میں ان کی پھر وفات ہوگئی۔ اندازہ لگائیے کہ ہم کہاں ہیں۔ لیکن آپ سر کے ٹھیکرے پھوڑ دیجیے اور وہ جو آنے والے ہیں' ان کو یہ بات کہیں سمجھا دیجیے کہ صاحب! جس فالج کے لیے آپ ان سے دعا کراتے ہیں' تعویذ لیتے ہیں' دم کراتے ہیں' اس کے لیے یہ ڈاکٹر سے ٹیکہ لگواتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ جی یہ بھید ایسے ہیں کہ یہ حضرت جو ہیں ظاہر داری جو ہے شریعت کی' اس کو پورا رکھنا چاہتے ہیں۔ اندر سے یہ اپنا علاج کرانا ہی نہیں چاہتے ورنہ مشکل کیا ہے ان کے لیے۔ وہ ٹھیک بات ہے۔ مشکل کیا ہے جس کی ایک پھونک جو ہے وہ دوسرے کے فالج کو اچھا کر دیتی ہے' یہ تو چوبیس گھنٹے میں پانچ سو دس ہزار اندر باہر مارتا رہتا اپنے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں جس کے لیے قرآن نے کہا تھا کہ صرف جذبات انسان کے۔ اب دیکھئے اس میں آپ دیکھیں گے ان سے بات کر کے' کبھی عقل کو دخل نہیں آئے گا۔ قرآن نے کہا کہ یہ ان کے سرکش جذبات کو ہمیشہ وہ سرکش کہتا ہے کہ جو عقل کی حدود کو پھاند جائیں اور عقلِ بیباک وہ ہوتی ہے جو قرآن کی حدود کو پھاند جائے' وحی کی چار دیواری میں نہ رہے۔ کہا اس کی کیفیت اس کی مثال اس شخص کی ہے کہ جو صرف اپنے جذبات کے پیچھے چلا ہوا ہو اور آخر الامر جذبات پھر اس مقام پہ چھوڑ جاتے ہیں انسان کو کہ جہاں کوئی راستہ نظر ہی نہیں آتا۔ عقل و فکر مفقود اور اس کے بعد اس مقام پہ کھڑا ہے۔ لَهٗۤ اَصۡحٰبٌ يَّدۡعُوۡنَهٗۤ اِلَى الۡهُدَى ائۡتِنَا (6:71)

جنگل میں کھڑا ہے لق و دق صحرا' راستہ گم کردہ' عقل مفلوج وہ کہتا ہے کہ اس کے پہلے ساتھی جن سے یہ الگ ہٹ کے ادھر آیا ہے' وہ اُسے آوازیں دے رہے ہیں۔ لیکن اس کی کیفیت یہ ہے اپنے جذبات کی کہ وہ سنی کو ان سنی کر دیتا ہے۔ ان کی آواز پہ بھی ان کی طرف مڑ کے نہیں دیکھتا۔ وہ سوچتا بھی نہیں کہ کہاں سے یہ آواز آ رہی ہے۔ بلکہ کیفیت تو یہ ہوتی ہے کہ یہ ان کا مذاق اڑا رہا ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہر دیوانہ' سمجھدار کا مذاق اڑا رہا ہوتا ہے۔ یعنی آپ دیوانے پہ یہ کرتے ہیں' دیوانہ آپ کو اُو اُو کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک آپ پاگل ہوتے ہیں۔ یہ جتنے بھی اس میں سے آپ کے ہاں سے نکل کے کوئی گئے ہوئے ہوں' کبھی ان سے بات کر کے دیکھئے گا وہ آپ کی ان سمجھ کی عقل کی' فکر کی باتوں کا مذاق اڑائیں گے۔

قندیل آسمانی کے بغیر لق و دق صحرا میں کرہ ارض پر قومِ مسلم کی تباہی و بربادی کی صورت گری

وہ کہیں گے تمہیں کیا پتہ ہے یہ مقام ہی اور ہیں روحانیت کے میاں۔ کہتا ہے کہ جنگل میں کھڑا ہے راستہ گم کردہ' کہیں سمجھ میں نہیں آتا جاؤں کدھر سے' ساتھی پرانے آواز دے رہے ہیں کہ ہم ادھر ہیں آ جاؤ ادھر۔ سنی کو ان سنی کر دیتا ہے۔ جذبات اتنے زیادہ طاری ہوتے ہیں اس کے اوپر۔ اس کے بعد قرآن ایک دو مقام پہ یہ چار الفاظ قرآن لاتا ہے عزیزانِ من! اگر یہی چیز کہیں مسلمان اپنے ہاں

رکھ لیتے' آج کبھی یہ اس کیفیت میں نہ ہوتے جو قرآن نے کہا ہے۔ یہ افراد نہیں پوری کی پوری قوم آج اس کیفیت میں ہے کہ لق ودق صحراء کے اندر ہے اور اسے راستہ نہیں مل رہا۔ ساری قوم دنیا کا سارا پورا مسلمان' خواہ یہ ساٹھ کروڑ ہے یا ستر کروڑ ہے' اس مقام پہ ہے جو قرآن نے کہا تھا کہ حیران کھڑا ہے اور اس کو راستہ نہیں مل رہا۔ کہیں سے اگر کوئی قرآن کی آواز اٹھتی ہے' کبھی' اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے' کبھی اس کی مخالفت کی جاتی ہے اس طرف آتا کوئی نہیں ہے صاحب۔

کاش جہنمی ماحول کے تدارک کے لیے ہم صراطِ مستقیم سے آگہی دلوا سکتے

کہا اعلان کر دیجیے۔ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (6:71) اب سوال یہ ہے کہ یہاں سے سیدھا راستہ کونسا اختیار کیا جائے۔ کہا یہ کہ یاد رکھو! ہدایت یا راہنمائی صرف وہ ہے جو خدا کی طرف سے ملی ہوئی ہو۔ اس ایک اصول کے اوپر اگر مسلمان پابند رہتا اس کے ہاں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہوتا' کوئی فرقہ پیدا نہ ہوتا' نہ آپ کی شریعت میں بہتر تہتر فرقے ہوتے' نہ تصوف کے اس قدر مفلوج کر دینے والے تصورات آپ کے ہاں آتے' نہ آپ میں افتراق ہوتا' نہ اختلاف ہوتا' نہ غلط جذبات کی پیروی ہوتی' نہ معبودانِ باطل کو خدا بنایا ہوا ہوتا۔ یہ اِنَّ هُـدَى الـلّٰـهِ هُـوَ الْهُـدٰى (6:71) اَلْهُـدٰى (6:71) دنیا کے اندر The only guidance , Absolute guidance مطلق راہنمائی صرف ایک ہے جو خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ یہ راہنمائی جو قرآن کے اندر ہے یہی ہے الْهُدٰى اس کے باہر کہیں راہنمائی نہیں۔ اس کے خلاف تو بہر حال سوال ہی نہیں راہنمائی کا' اس کے باہر کہیں راہنمائی نہیں ہے۔ وہ اگر جانا چاہتا ہے منزلِ مقصود پر تو اس کے لیے ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ الْهُدٰى (6:71) کی راہنمائی کا اتباع کرے۔

الھدیٰ کی تعلیم سے فائدہ اُٹھائے جانے کا طریق ربوبیت عالمینی کی ذمہ داری کو قبول کرنا ہے

اب یہ تو ہو گیا یہ الھدیٰ اس کے اندر ہے۔ اس الھدیٰ کا فائدہ کس طرح سے اٹھایا جائے گا' کیا طریقہ ہے اس کا؟ یہ کہ روز اسے پڑھ لیجیے بس ہدایت ہے اس کے لیے بس ٹھیک ہے کیا اتنا ہی کیا جائے؟ سنئے قرآن کیا کہتا ہے کتنا بڑا اصول ہے جو دیا ہے۔ پہلے یہ چیز دی ہے کہ غلط جذبات کا اتباع کرنے والا کس مقام پہ کھڑا ہو جاتا ہے آگے یہ دیا ہے کہ اس کے لیے صحیح راستے کی طرف آنے کا طریقہ صحیح راستہ کونسا ہے؟ الھدیٰ۔ کیا یہیں بات ختم کر دی؟ قرآن ایسے تو نہیں ختم کرتا۔ اس کا طریقہ یہ ہے وَ اُمِـرْنَـا لِـنُـسْـلِمَ لِـرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (6:71) اور ہمیں حکم یہ دیا گیا ہے کہ ہم اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ اس الھدیٰ کے سامنے جھک جانا یہ ہے صحیح راستہ انسانیت کے لیے۔ اور راستہ وہ بتایا ہوا اس خدا کا جو ربوبیتِ عالمینی کا ذمہ دار ہے۔ پوری نوعِ انسانی کی ربوبیت اس کے اندر آ جائے گی یہ ہے الھدیٰ۔ اور جب ہر فردِ انسانیہ کی ربوبیت اس کے اندر آ جائے گی تو احتیاج اٹھ گئی کسی انسان کی دوسرے انسان سے۔ یعنی جب

کوئی ذمہ لے لے کسی دوسرے کی تمام ضروریات پورا کرنے کا' تو وہ تو محتاج رہتا ہی نہیں پھر' اس کی کوئی ضرورت رکی ہی نہیں رہتی۔ کہا جو تم جاتے تھے ٹکریں مارنے کے لیے ایک ایک دوارے کے اوپر' ایک ایک آستاں کے اوپر' ایک ایک درگاہ کے اوپر اس لیے جاتے تھے کہ تمہاری ضرورتیں نہ رکی رہیں۔ اور اگر یہ الھدیٰ اختیار کرو جو رب العٰلمین کی طرف سے دی ہوئی ہیں تمام نوعِ انسانی کا بلکہ تمام جتنی بھی موجودات ہیں ان کی نشو ونما کا ذمہ دار۔ وہ ہدایت اگر ایسی ہو جائے کہ اس کے سامنے جھکی ہوئی ہو مخلوق تو کسی کی ضرورت رکی ہی نہیں رہے گی۔ ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی کہ آپ ان درگاہوں کے اوپر سجدہ ریز ہوں۔

حضرت عمر فاروقؓ کا احساسِ ذمہ داری کہ جب تم اپنی ضرورت کے لیے خدا کو پکارتے ہو تو یہ تو میری شکایت ہو جاتی ہے

آپ اس وقت وہاں جا کے سجدہ ریز ہوتے ہیں جب آپ کی کوئی ضرورت رکتی ہے۔ اتنی عظیم حقیقت تھی جسے حضرتِ عمرؓ نے ان چار الفاظ میں بیان کیا تھا جس کے سمجھنے کے لیے بڑا گہرائی میں جانے کی ضرورت ہے۔ عجیب شخصیتیں تھیں یہ' عرب کے ان پڑھ لوگ۔ قرآن کی ہدایت ان کے سامنے آئی' ان کی سیرتوں کی بلندیاں تو ایک طرف رہیں' ان کی فکر کی بلندیوں کی طرف جب ہم دیکھتے ہیں تو حیرت ہو جاتی ہے کہ کتنی بڑی قلبِ ماہیت کر دی تھی قرآنِ کریم نے ان لوگوں کے اندر۔ وہ جب خلافت پہ آئے ہیں' ذمہ داریاں سنبھالی ہیں تو انہوں نے کہا تھا کہ مجھے خلافت اس لیے دی گئی ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک نہ پہنچنے دوں۔ بڑی گہری بات ہے جو وہ کر گیا۔ تم دعا تو اس وقت مانگو گے جب کوئی ضرورت رکی ہوئی ہوگی۔ اور اگر یہ صورت ہو میں اپنی ذمہ داری جو مجھے سونپی گئی ہے' مجھے اس کا خیال ہو اور میں پورا کروں تو تمہاری ہر ضرورت کو پورا کرتا چلا جاؤنگا' میری تو ذمہ داری یہ ہے۔ تمہاری دعا اگر خدا تک پہنچ جائے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ میں اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے میں قاصر رہا ہوں' جبھی تمہیں ضرورت پیش آئی ہے' کہا وہ تو میری شکایت لگ گئی۔ تو وہ تو میری شکایت ہو جائے گی۔ میں اپنی ذمہ داری کے پورا کرنے میں قاصر ہو جاؤنگا میں اس کا مستحق نہیں رہونگا کہ اس منصب کو سنبھالوں۔ میں چھوڑ دونگا اس دن جس دن تم میں سے کسی کو ضرورت پیش آ گئی کہ وہ خدا سے کچھ دعا کرے۔ اللہ اکبر۔ یہ ہے ان کو جو پتہ تھا لِنُسۡلِمَ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (6:71) اس کے معنی کیا تھے؟ ربوبیتِ عالمینی کی ذمہ داری اس شخص نے اپنے اوپر لے لی تھی۔ اس نے کہا میرا کام یہ ہے' کسی کی کوئی ضرورت رکی نہ رہے۔ اس لیے کسی کو ضرورت ہی نہ رہے کہ خدا سے شکایت کرے میری' دعا جسے کہتے ہیں آپ۔ اور جب یہ کچھ ہونے لگ جائے تو آپ دیکھئے کہ شرفِ انسانیت کی بلندیاں کہاں تک پہنچ جائیں گی۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔

قوموں کی مفقود الحالی انہیں قبر پرستی کا گرویدہ بنا دیتی ہے

یہ وجہ تھی کہ ان لوگوں کو جب یہ مقام حاصل ہو گیا۔ اپنے ہاتھوں سے ان بتوں کو کعبے سے نکال کے توڑ کے باہر پھینک دیا۔ کیوں پھینک دیا تھا؟ یعنی یہ نہیں کہ بتوں سے نفرت ان کے دل میں پیدا ہو گئی تھی' ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ جنہیں خدا کے پاس دعا کرنے کی ضرورت نہ رہے' وہ ان بتوں کو کیا رکھیں گے کعبے کے اندر۔ بت شکنی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ کو بڑا جذبہ نفرت کا اور دشمنی کا ان کی طرف سے آیا کہ ہیں! یہ صاحب ان کی پرستش کرتے ہیں اور لیا ہاتھ میں ہتھوڑا اور توڑ دیا ان کو۔ اس توڑ دینے سے کیا ہوتا ہے عزیزانِ من! وہ صنم کدہ تو دلوں کے اندر ہوتا ہے' میں ابھی بات کروں گا چل کے۔ وہ توڑے اس لیے جاتے ہیں کہ ان کی ضرورت باقی نہیں رہتی' کسی کی ضرورت رکی ہوئی نہیں ہوتی' اسے ضرورت ہی نہیں ہوتی کسی آستاں کے اوپر جاکے' کسی مندر پہ جاکے' کسی درگاہ پہ جاکے سجدہ کرتا پھرے۔ غور کیا آپ نے ربوبیتِ عالمین کے معنی کیا ہیں جو قرآن پہلا لفظ یہ دیتا ہے **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (1:1)۔ **لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (6:71) یہ کیفیت پیدا کر دی جائے تو پھر وہ جو چیز پہلی ہے ایک ایک دروازے پہ جاکے سجدہ ریز ہونا اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی عملاً یہ ہے بت شکنی۔ یہ آپ اس دور میں بھی دیکھیں گے جن قوموں کے اندر نظام ایسا ہے کہ وہاں ہر کام قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا جاتا ہے' آپ دیکھیں گے وہاں پیر پرستی قبر پرستی نہیں ہوتی۔

مملکت پاکستان میں شدت کے ساتھ قبر پرستی کی آبیاری کی وجہ جواز

خود آپ کے ہاں ابتدائی دور جو تھا پاکستان کا آپ کو یاد ہو گا جن کی عمریں اتنی ہیں اس زمانے میں اتنا چرچا نہیں ہوتا تھا ان حضرت صاحبان کا۔ یہ دن بہ دن کیوں بڑھتا چلا جا رہا ہے کیوں اتنا ہجوم ہو رہا ہے کہ وہ اتنی سی جو قبر ہے اب اس کے اردگرد پتہ نہیں کتنے ایکڑ زمین جائیدادیں لوگوں کی ان کو خرید لیا گیا ہے' ان کو مسمار کیا جا رہا ہے۔ کیوں یہ وسعتیں' کیوں ضرورت پڑ رہی ہیں؟ جانے والوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے۔ یہ کیوں تعداد بڑھ گئی ہے؟ کسی کا کوئی کام قاعدے قانون کے مطابق نہیں ہوتا' رکی ہوئی ضرورتیں' مفقود احتیاجیں۔ ہر دروازے پہ وہ ٹکر مار لیتا ہے کہ کوئی چیز قاعدے قانون کے مطابق ہو جائے۔ جب وہاں سے مایوس ہوتا ہے تو مایوس انسان کی انتہا یہ ہے کہ وہ وہاں جاکے ٹکر مارے کہ یا حضرت! تمہیں کچھ کر دو' یہاں سے تو کچھ نہیں ہو رہا۔ جن قوموں کو یہ کہتے ہیں جی مادہ پرست ہو گئے اور یہ کچھ ہو گیا ان قوموں کے ہاں جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے جہاں جہاں بھی یہ نظام ہے کہ انسانوں کی ضرورتیں کم از کم رکتی ہیں یا قاعدے قانون کے مطابق کام ہوتے چلے جاتے ہیں' وہاں ان کو درگاہ شریفوں پہ جانے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔

مملکت کے ہر شعبہ میں قانون کی پاسداری یا حکمرانی کا دوسرا نام نظام صلوٰۃ ہے

یہ نظام جو قرآن قائم کرنا چاہتا ہے عملاً دنیا میں کہ کسی شخص کی ضرورت رکی نہ رہے اور باہمی معاملات کے جتنے کام ہیں وہ قاعدے قانون کے مطابق ازخود ہوتے رہیں۔ آپ نے دیکھا شرک کس طرح سے مٹ جاتا ہے پھر۔ یہ یونہی کوئی انفرادی چیزیں نہیں ہیں۔ یہ آستانے بنے بھی اسی دور میں تھے جب استبداد کہیں اتنا آیا تھا کہ قاعدے قانون کی حکمرانی نہیں رہی تھی تو پھر لوگوں نے اس قسم کے تراشے تھے اپنے سامنے یہ بت۔ قرآن یہ کیفیت پیدا کرتا ہے اور یہ ہے راز اس کا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ وَ اَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّقُوْہُ (6:71-72) یہ کہ ہم ایسا نظام قائم کریں کہ جس میں ہر شخص قانون کا اتباع کرتا چلا جائے۔ صلوٰۃ کے معنی یہ ہیں عزیزانِ من! ہر شخص قانون کی پیروی کرتا چلا جائے وَاتَّقُوْہُ(6:72) اور قانون کی نگہداشت کرتا چلا جائے۔ یہ ہم چاہتے ہیں کرنا۔ وَ ھُوَ الَّذِیْۤ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ (6:72) یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی تو یہ مختلف مراکز جتنے بھی آستانوں کے' ان کو سب کو چھوڑ کے انسان اس مرکز کے اوپر آ کے جمع ہو جائے گا جسے ہم نے قیامت تک اٹھا کے رکھ دیا کہ حشر کے دن کی باتیں ہو رہی ہیں۔

دین کے برعکس مذہب کی دنیا میں مختلف آستانوں پر سجدہ ریز ہونے کا نتیجہ قرآنی مرکز سے دوری ہے

غور فرمایا یہ توحید کتنی بڑی چیز ہے اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ (6:72)۔ ہر حاجت مند نے اپنا ایک قبلہ الگ الگ بنایا ہوا ہوتا ہے۔ کوئی یہاں جا رہا ہے' کوئی وہاں جا رہا ہے' کوئی وہاں جمع ہو رہا ہے۔ کتنے حشر ہو رہے ہیں آپ کے ہاں۔ حشر کے معنی ہیں جمع ہونا۔ کہا یہ غلط ہے۔ ایک ربوبیتِ عالمینی کا عملاً قیام اگر ہو جائے تو اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ایک ہی نقطے کے اوپر انسانیت جمع ہو گی ان کو ضرورت ہی نہیں رہے گی مختلف آستانوں پہ جمع ہونے کی۔

کائنات کے بالحق ہونے کا تصور

اور یہ کون ہے جس کے اس مرکز کے اوپر انسانیت یوں جمع ہو گی۔ کہا یہ وہی ہے وَ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ (6:73) کہتا ہے ایک دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ کائنات یونہی اتفاقیہ کسی طرح وجود میں آ گئی ہے اس کے لیے نہ کوئی پلان ہے' نہ کوئی اس کا مقصد ہے' نہ کوئی منزل ہے۔ بائی چانس کسی طرح سے وجود میں آ گئی اور اس کے بعد یہ اس طرح سے خود بخود چلی جا رہی ہے۔ قرآن اس نظریے کی تردید کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ اسے پیدا کیا گیا ہے پہلی چیز تو یہ ہے یہ خود بخود یونہی وجود میں نہیں آ گئی۔ دوسری چیز یہ ہے کہ یونہی نہیں ہے کہ چلو پیدا تو ہو گئی یونہی الل ٹپ سی بات ہے' بالحق ہے یہ الحق اتنا جامع لفظ ہے اس زبان کا کہ ترجمہ تو ایک طرف رہا اس کا مفہوم بیان کرنے کے لیے بھی بڑا وقت چاہیے۔ ایک پلان کے مطابق' سوچی سمجھی ہوئی سکیم کے مطابق' ایک منزلِ مقصود کی

طرف جانے کے مطابق، ٹھوس عملی نتائج پیدا کرنے کے لیے ایسے نتائج کہ جو انسان کے واقعات وحوادث وضروریات کے اندرفٹ ہو جائیں۔ یہ ساری چیزیں الحق کے اندر آتی ہیں۔ وہ جو Inreality Exist کرے واقعتاً موجود ہو۔ اب اگر وقت ہوتو میں آپ کو بتاؤں کہ اس الحق میں قرآن نے کتنے غلط نظریوں کی تردید کردی ہے۔ اور سب سے بنیادی نظریہ تو وہی جس پہ تصوف کی عمارت قائم ہے اور جو سب سے پہلے Plato کے دماغ نے ایجاد کیا کہ یہ ساری کائنات جتنی بھی ہے فی الحقیقت موجود نہیں ہے یہ انسان کا خیال ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

وہاں سے یہ بات چلی تھی۔ اس کی چلائی ہوئی بات اور آپ کے ہاں پھر روحانیت کی دنیا کا عروۃ الوثقیٰ بن گئی۔ تصوف کی ساری عمارت اس پہ قائم ہے کہ یہ کوئی چیز وجود میں نہیں ہے بس صرف خدا کا وجود ہے۔ بہر حال یہ اور بات آ گئی۔

کائنات کا وجود کس طرح ظہور پذیر ہوا عقل انسانی اس حقیقت کو جاننے سے قاصر ہے

ایک لفظ میں قرآن ان تمام عقائد اور تصورات اور فکر جو باطل ہے فلسفے کا اس کی تردید کر جاتا ہے کہ یہ بالحق پیدا کی۔ باقی رہا یہ کہ Origin اس کی کیا تھی کہتا ہے اوریجن کے لیے وہ یہ کہیں گے کہ یہ اتفاق سے آ گئی۔ قرآن کہتا ہے وَ یَوۡمَ یَقُوۡلُ کُنۡ فَیَکُوۡنُ (6:73) اوریجن کی بات تو یہ ہے کہ ایک صاحبِ امر ایک صاحبِ ارادہ ہستی ہے جس کا Plan تھا اس Plan کے بعد ابتداء کی شکل تو اسی طرح سے ہوسکتی تھی کہ اس کا ارادہ عمل کے اندر آ گیا ہے۔ اس سے زیادہ نہ تم سمجھ سکتے ہو نہ کسی کو سمجھا سکتے ہو۔ کائنات کا اوریجن کس طرح سے ہوا، یہ ابتداء میں کس طرح وجود میں آ گئی ذہنِ انسانی جو محدود ہے اس لامحدود شے کا تصور نہیں کرسکتا۔ لہٰذا قرآن بھی وہاں یہی کہہ کے چلا جاتا ہے کہ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (35:1)، بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (6:101) کہ وہ جو کسی پہلے سے موجود شدہ مسالے کے بغیر کسی چیز کو وجود میں لے آئے یہ اس کا پلان ہے اور اس طرح سے آگے بات چلی ہے۔ اور وہ کہتا ہے آگے بات چلاؤ تم اس کو چھوڑو۔

خدا تعالیٰ کی قوت اور اقتدار کو اس کے قائم کیے گئے نظام کے نتائج سے ہی اُخذ کیا جا سکتا ہے

قَوۡلُہُ الۡحَقُّ وَ لَہُ الۡمُلۡکُ (6:73) قوت اس کے پاس ہے۔ اب یہ قوت اور اقتدار یہ کہتا ہے کہ تم اپنے سامنے دیکھنا چاہتے ہو کہ اس کا قول کس طرح سے الحق ہے، قوت اور اقتدار کیسے ہے۔ کہا کہ اس کے مطابق ایک نظام قائم کر کے دیکھو، پھر ہوگا کیا؟ یَوۡمَ یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ (6:73) وہ ہمارے ہاں وہ جو ہے قیامت کے لیے صور پھونکا جائے گا اور پھر اس کے بعد مردے جی اٹھیں گے۔

ٹھیک ہے میں نے عرض کیا ہے کہ قیامت پر ایمان برحق ہے ہمارا' مردوں کا جی اٹھنا اس کے بعد کی زندگی' یہ تو جز وِایمان ہے' جز وِایمان کیا خدا اور آخرت یہ ہیں بنیادیں حقیقت میں ایمان کی۔ یہ جو ہے کتاب اور رسل اور ملائکہ یہ تو اس مقصد کے ذرائع ہیں۔ حقیقت میں کہ خدا کے دیے ہوئے قانون پہ عمل کرنے سے انسان کا مستقبل سنور جاتا ہے۔ یہ ہے چیز۔ اس پہ تو ایمان ہے۔ لیکن قرآن کی ہر بات قیامت کے اوپر اٹھا رکھنا اور اس دنیا سے اس کا تعلق ہی کوئی نہ رکھنا' اس نے تباہ کیا ہے ہمیں۔ کہتا ہے اس کا اقتدار جو ہے اس کو دیکھنا چاہتے ہو عملاً۔ نُفِخَ کے معنی ہوتا ہے توانائی کسی کے اندر پیدا کر دینا۔ اب بھی یہ جو پانی میں ڈوب جاتے ہیں' سانس نہیں آ رہا ہوتا' اس کے منہ میں منہ ڈال کے ڈاکٹر پھونک مارتا ہے۔ اس سے پھر سے زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ زندگی پھر سے تو نہیں کہتے' مردہ تو وہ ہوتا نہیں ہے ابھی' زندگی یوں کہیے کہ بیدار ہو جاتی ہے اس کے اندر سے۔ نُفِخَ کے معنی ہوتا ہے کسی میں توانائی بھر دینا۔ یہ جو الصُّوْرِ کا لفظ ہے' یہ صورت کے معنی پیکر ہوتا ہے فارم ہوتی ہے۔

قرآنِ حکیم کا عطا کردہ نظامِ حیات انسانیت کے پیکر میں زندگی بن کر فارم کی شکل اختیار کر جاتا ہے

اس کی جمع ہے صور کہ یہ جو پیکرانِ آب وگل تمہیں نظر آتے ہیں' صرف چلتی پھرتی ہوئی جولاشیں' یہ نظام قائم کرو ان کے اندر زندگی کی توانائیاں بھر جائیں گی یاد رکھو۔ یہ جو صورتیں ہی صورتیں نظر آتی ہیں' کیا چیزیں کہہ گیا ہے' میں نے عرض کیا ہے کہ یہ نصاب کی باتیں ہیں کوئی کلاسز سامنے ہوں تو ان کو سمجھایا جا سکتا ہے کہ فارم کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ ارسطو کا سارا فلسفہ اس کے اندر آ جاتا ہے ایک لفظ صورت کے اندر' فارم کے اندر عزیزانِ من! جیسا الحق کے اندر قرآن نے Plato کے سارے فلسفے کی تردید کر دی تھی۔ یہ فارم کا جو فلسفہ ہے ارسطو کا وہ اس کے اندر لے آیا ہے۔ جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے' میں سامنے لاؤں تو نظر آئے کہ قرآن کہہ کیا گیا ہے۔ بہرحال یہاں تو وہ کہتا ہے کہ اے پیکرانِ آب وگل۔ وہ جو اقبالؒ نے بھی یہ اصطلاح استعمال کی ہے

حلقہ گل بہ من کشید اے پیکرانِ آب وگل
آتشِ در سینہ دارم از نیاگانِ شما

قرآنِ حکیم کی روشنی میں علامہ اقبال ملتِ اسلامیہ کی اس خام فکر کے پیکروں میں "نفخ فی الصُّوْر" چاہتا تھا

"اے مٹی دے مادھو" یہی اس کا ترجمہ ہو سکتا ہے۔ کیا بات یہ کہہ گیا ہے۔ یہ جتنے بھی یہ کوچ گر کہتے تھے ہمارے ہاں' اصل میں وہ کوزہ گر کا بگڑا ہوا لفظ تھا؟ مٹی کے برتن بنانے والا' مٹی کے کھلونے بنانے والا۔ "آ لگھو گھوڑیاں والیاں جیہڑیاں آندیاں ہیگیاں نیں" جس شکل میں یہ مٹی سے بنتی ہیں یہ ان کی فارم ہوتی ہیں' یہ صُوَر ہوتی ہیں۔ اقبالؒ نے کہا ہے کہ یہ کچی مٹی کے بنے ہوئے "لگھو گھوڑے

او‘‘۔اس کے بعد وہ کیا کرتے ہیں وہ کمہار یا یہ کوچ گر؟ ’’فیر او آوی پکاندے نیں نا‘‘ آگ میں ان کو دباتے ہیں پھر وہ پختہ ہوتی ہیں۔ وہ کہہ یہ رہا ہے کہ اے کچی مٹی کے بنے ہوئے پیکرو! آؤ میں کھڑا ہوں میرے اردگرد اس طرح اکٹھے ہو جاؤ۔ میرے سینے کے اندر ایک آگ ہے جو تمہاری کچی مٹی کو پختہ کر دے گی۔ فطرت نے اس شخص کو بات سمجھنے اور اسے پھر سمجھانے کا انداز بڑا ہی عجیب عطا کیا تھا۔

نفخ فی صور کی پوشیدہ توانائیوں کے مشہود ہونے پر نہ جانے یہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

یہ ہے یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ (6:73) یہ کچے پیکر صورتیں، فارمز جو تمہیں نظر آتی ہیں، ان کے اندر زندگی کی توانائیاں جس دن بھری جائیں گی اس نظام سے یہ ہوگا۔ کس کا نظام ہے یہ؟ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّھَادَةِ (6:73) کیا باتیں کرتا جاتا ہے!!!۔ الشَّھَادَةِ (6:73) تو اتنی سی چیز ہی ہے جو تم صرف دیکھ سکتے ہو۔ اتنی سی چیز چلتے پھرتے یہ سارا کچھ۔ ان کے اندر Potentialities کتنی ہیں، چھپی ہوئی، مضمر کتنی صلاحیتیں ابھی ان کے اندر ہیں، تمہیں ان کا پتہ نہیں، اسے پتہ ہے۔ ان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو، مضمر توانائیوں کو مشہود بنانے کے لیے، ان پیکروں کے اندر توانائی کی پھونک ماری جاتی ہے اسے قیامتِ موجود کہا جائے گا۔ کہا آؤ رب العالمین کے نظام کی طرف اور پھر دیکھو ’’اے مٹی دے مادھو فیر کی بن جاندے ہیگے نیں‘‘۔ بنا کے اس نے دکھا دیا تھا، تاریخ آپ کو بتا رہی ہے۔ دنیا کا کوئی تاریخ دان کوئی پولیٹکل فلاسفر سمجھ ہی نہیں سکا کہ چند دنوں کے اندر یہ عرب کی قوم ہو کیا گئی تھی۔ نفخ فی صور ہوا تھا، ان پیکروں کے اندر توانائیاں پھونکی گئی تھیں، عالم الغیب والشہادت کی سکیم کے مطابق۔

جسم انسانی کی شکل میں خاک کے ذروں کے اس معراج کمال کے بعد معراج انسانیت کے لیے تو ابھی سیکڑوں منازل اور باقی ہیں

وہ جانتا تھا کہ کتنی توانائیاں ان کی مشہود ہوئی ہیں، کتنی ابھی مضمر ہیں چھپی ہوئی ہیں جنہیں Potentialities کہتے ہیں۔ Potentiality کو Actualize کرنا یہ ہے اصطلاح اس کے لیے۔ کہتا ہے یہ چیز ہو جائے گی۔ کون کرے گا؟ وَھُوَ الْحَکِیْمُ الْخَبِیْرُ (6:73) جانتا بھی ہے کہ اس کے اندر کیا کچھ بننے کی صلاحیت ہے اور پھر حکیم بھی ہے، کرنا بھی جانتا ہے۔ علم بھی رکھتا ہے اور وہ طریق بھی جانتا ہے کہ جس سے یہ کچھ کیا جائے گا۔ اس کے نظام کی طرف آؤ۔ کہا کہ یہ جو کشمکش ہے کہ انسانوں نے اپنے تصورات میں ایسی مورتیں گھڑ لی ہیں کہ جن کو اپنی مرادوں کا ماؤیٰ و ملجا سمجھتے ہیں اور اس طرح سے انسانیت کے مقام سے بہت نیچے گر جاتے ہیں۔ یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے، بہت پرانی بات ہے۔ تاریخ کے اوراق الٹ کے دیکھو یہ چیزیں بہت پرانے دور سے چلی ہوئی آپ کو نظر آئیں گی۔ اور یہ کشمکش بھی کہ اس قسم کا پھر آنے والا بھی آتا ہے جو ان سے آ کے کہتا ہے کہ تم کن چیزوں کے سامنے اپنی انسانیت کی تذلیل کر

رہے ہو۔ یہ کشمکش بھی پرانی ہے اور اس کا وہ آغاز کرتا ہے محسوس شکل میں حضرت ابراہیمؑ سے۔

حضرت ابراہیم کی شخصیت جسے قرآن حکیم نے انسانیت کے لیے اسوہ قرار دیا ہے

ابراہیمؑ کی شخصیت بڑی عجیب نمایاں قرآن میں ہے۔ایک تو وہ کچھ چلتے پھرتے بزرگِ خاندان سے نظر آتے ہیں ''اٹھو اوبچہٗ چل اوپتر'' یہ کچھ کہنے والا باپ جیسے ہوتا ہے نا ابراہیمؑ کا کچھ اس قسم کا تصور آتا ہے۔پہلا ٹکراؤ وہ کہنے لگا اور کہاں سے بات شروع ہوئی؟ خود اپنے گھر سے بات شروع ہوئی۔وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهِيۡمُ لِاَبِيۡهِ اٰزَرَ (6:74) خود اپنے باپ سے یہ چیز کہی۔میں کئی دفعہ یہ عرض کر چکا ہوں کہ قرآن نے حضرتِ ابراہیمؑ کی زندگی کو ہمارے لیے اسوہ کہا ہے۔دو ہی شخصیتیں ہیں اسوہ کہہ کے جن کی زندگی کو پکارا ہے: حضرت ابراہیمؑ اور نبی اکرم ﷺ۔حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کا آغاز کس بات سے ہوتا ہے۔

رامائن کے کارنامہ کی اہمیت اور رام کے مقام بلند کی وجہ

ایک اسوہ ہندوؤں کے سامنے ہے وہ رام کا اسوہ ہے۔اسے وہ خدا مانتے ہیں۔کونسا کارنامہ ان کا ایسا تھا جی؟ رامائن میں پڑھیئے کہ ان کا باپ بوڑھا ایک جوان لڑکی سے شادی کر لیتا ہے اس کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہو جاتا ہے۔رام پہلے کا لڑکا بڑا بہادر' یہ ولی عہد تھا۔وہ بیوی اس بڈھے خاوند سے ایک دن کہتی ہے کہ مجھے کوئی قول دیجیے۔اسوہ دیکھئے کیا بنتا ہے وہاں۔قول کے معنی ہوتا ہے کہ جو تم کہو گی میں مان لونگا۔یعنی پہلے تو یہی بات آپ دیکھئے کہ اگر یہ اسوہ بنا دیا جائے انسانوں کے لیے کہ جو تم کہو گے میں کر دونگا' شام تک ستیاناس ہو جائے۔قول دیدیا جی انہوں نے کہ اچھی بات ہے کر دونگا۔بیوی نے کہا کہ رام کو جلاوطن کر دو اور میرے بیٹے کو ولی عہد بنا دو۔اب قول دے چکے ہیں بڑے میاں' رو رہا ہے کہ رام جیسا شخص ولی عہدِ سلطنت اور وہ پبلک میں عوام میں ہر دل عزیز ہے دنیا جانتی ہے کہ یہ کل کو جب راجہ ہوا تو کتنی حالت بہتر ہو جائے گی' بڑا ہر دلعزیز اس کو بتایا گیا ہے۔یہ قول دے چکے ہیں۔اب خطرہ بھی نظر آتا ہے بیٹے کی طرف سے' بیٹے سے بات کرتے ہیں۔باپ بھی رو رہا ہے' بیٹا بھی رو رہا ہے وہ یہ کہ میں کیا جھک مار بیٹھا۔بیٹے کے متعلق تصور یہ کہ ماں باپ کی اطاعت ہر حال میں فرض ہے' اس لیے باپ جو کچھ کہے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو۔تو رام نے یہ کہا کہ ہاں پتا جی! آپ قول دے چکے ہیں تو میں ایسا نہیں کرونگا کہ آپ اس قول سے ہار جائیں۔میرا زندگی کا فریضہ آپ کے حکم کی تعمیل ہے۔اور یہ اتنا بڑا کارنامہ اس شخص کا دسرتھ کے بیٹے کا کہ اسے انہوں نے کہا کہ یہ کوئی انسان کا بیٹا کر ہی نہیں سکتا۔کہ صاحب باپ کا حکم مان کے چلے گئے رام: ہزار ہا سال سے پرستش ہو رہی ہے۔پہلے تنقید بھی یہ کر رہے ہیں کہ بڈھے نے کہیں کی بات یوں مان لی اور وہ فریب دے گئی ان کو اور اس کے بعد ان کے متعلق یہ کہہ رہے ہیں۔

فرعون کے مقابلے میں ہامان کے مقام کی نوعیت

اور ایک بیٹا یہاں پیدا ہوتا ہے آزر کے گھر میں۔ کون تھا آزر؟ تاریخ میں اس دور میں دیکھیے بادشاہ یا راجہ ان کی اپنی حیثیت کچھ نہیں ہوتی تھی۔ یہ جو چیف پریسٹ ہوتا تھا' ہیڈ پریسٹ پروہت سب سے بڑا یہ Virtually حاکم ہوتا تھا' فرعون کی نہیں مانی جاتی تھی ہامان کی مانی جاتی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ مجھے شکست ہو رہی ہے موسیٰؑ کے ہاتھوں تو اس نے ہامان کو اپنے جنود کے ساتھ بلایا تھا' لشکر ہوتا تھا ان کا' بہت بڑی پوزیشن ہوتی تھی۔ یہ آزر اس دور کا ہیڈ پریسٹ تھا تو آزر کا بیٹا تو آپ جانتے ہی ہیں وراثت میں یہ ساری چیز آ رہی تھی۔ باپ اور اس کی پوزیشن یہ ہے اور اس کے ساتھ اتنے مفاد وابستہ نظر آتے ہیں اس بیٹے کو۔ لیکن یہ بیٹا جب یہ دیکھتا ہے کہ یہ کیا کر رہا ہے باپ۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً (6:74) کہا کہ یہ کیا کر رہے ہو اپنے ہاتھوں سے گھڑتے ہو ان مورتیوں کو اور پھر ان کے سامنے جھک جاتے ہو کیا ہو گیا ہو گیا تمہیں۔ اور یہ ہے بیٹا جس کے لیے کہا کہ ابراہیمؑ کی زندگی میں تمہارے لیے اسوہ ہے' رام کی زندگی میں اسوہ نہیں ہے۔

ملت اسلامیہ کے ذہنوں پر تیرہ سو سال سے سلفِ صالحین کی حکومت برسرِ اقتدار ہے

غلطی کرنے والا سوال ہی نہیں ہے کہ وہ باپ ہے یا دادا ہے یا بیٹا ہے یا چچا ہے۔ حق حق ہے خواہ اس کو بیٹا کیوں نہ کہے' باطل باطل ہے' اسلاف میں کوئی بھی کیوں نہ کہہ دے۔ اور یہاں تو مصیبت یہ ہے کہ ایک اپنے ہی باپ کا حکم نہیں یہاں سے لے کے تیرہ سو سال تک راستے میں جتنے ابیکم بنا دیے نا جتنے اسلاف بنا دیئے پتہ ہی نہیں ان کا ہمیں' ان کے نام سے کچھ منسوب ہے۔ یہ چیز کیوں کرتے ہو؟ سلفِ صالحین کا اتباع کر رہے ہیں' اسلاف کے راستے کے اوپر چل رہے ہیں۔ ''اک پیؤ مت مار جاندا ہیگا اے۔ اے او تھے کروڑاں ایناں نیں بنا چھڈے ہوئے ہیگے نیں''۔ اور وہ جن کے متعلق قرآن کہتا ہے وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ (36:68) کہ جن کی عمر زیادہ ہو جاتی ہے ان کی عقل اوندھی ہو جایا کرتی ہے۔ قوم کی یہ حالت اسی لیے ہوئی کہ چل رہے ہیں ان کے راستوں کے اوپر جن کی عقلیں قرآن کہتا ہے' اوندھی ہو گئی ہوتی ہیں۔

اولاد کے سلسلہ میں والدین کی ذمہ داری

عزیزانِ من! سوال ہی نہیں ہے نہ باپ کا بیٹے کے لیے' نہ بیٹے کا باپ کے لیے۔ یعنی جہاں تک زندگی کے معاملات کا تعلق' اس کی نشو و نما کا تعلق جب تک بیٹا اس قابل نہیں ہے کہ اپنے معاملات کا آپ فیصلہ کرے ٹھیک ہے' ماں باپ کے پاس وہ رہتا ہے' ان کی ہدایات کے مطابق اسے چلنا چاہیے' وہی اس کی خبر داری کر سکتے ہیں' وہی اس کی نشو و نما کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ لیکن اب یہ چیز کہ وہ بیٹا

خود بیٹیاں پوتیاں والا ''ہویا ہویا ہیگا'' اب اس کی بدقسمتی سے کہ وہ بڑا بوڑھا چارپائی نہیں چھوڑتا۔ تو اس کو اگر کہا جائے کہ خدا کا حکم ہے کہ یہ اس کا فیصلہ مانتا چلا جائے ابراہیمؑ جو اپنے باپ سے یہ کہہ رہا ہے کہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ دیکھتے ہیں آپ۔

بخاری شریف کی ایک وضعی حدیث جو حضرت ابراہیم کے متعلق ہے

اسی ابراہیمؑ کے متعلق اب ہمیں پھر یہ بتایا جاتا ہے' بخاری شریف کی حدیث دیکھئے کہ اپنے اس بیٹے کو شیرخوار اسماعیل اور اس کی ماں کو (بات یہ دوسری طرف نکل جائے گی) وادیٔ غیر ذی زرع میں جنگل میں چھوڑ آتے ہیں۔ پانی تک بھی ان کے پاس نہیں ہے' کوئی بستی بھی نہیں ہے۔ بچے کو پیاس لگتی ہے تو ماں ان کو لٹا کے بھاگتی بھاگتی اوپر بیچاری جاتی ہے دیکھنے کے لیے کہیں پانی ہے۔ یہ باپ چھوڑ گیا ہے۔ چلئے اس کو تو چھوڑیئے۔ آگے بات آتی ہے جوان ہو گیا بیٹا۔ یہ کبھی کبھی ملنے کے لیے آتے تھے۔ گھر میں آئے تو حضرت اسماعیلؑ گھر میں نہیں ہیں' ان کی بیوی تھیں۔ تو اس نے ان کی خاطر مدارات کی لیکن یہ گھوڑے سے اترے نہیں ہیں۔ جاتے ہوئے کہہ گئے کہ آئے بیٹا تو کہنا کہ باپ تمہارا یہ کہہ گیا ہے کہ یہ چوکھٹ بدل دو۔ وہ چلے گئے۔ بیٹے نے آ کے سنا اور اسی وقت بیوی کو طلاق دیدی۔ کیونکہ باپ نے یہ جو کہا ہے' چوکھٹ بدل دو اسکے معنی یہ ہیں کہ بیوی کو طلاق دیدو۔ کیا اسوۂ ابراہیمیؑ یہ ہے کہ یہ بیٹے پہ اس قسم کا حکم چلائیں نہ کوئی وجہ' نہ کوئی دلیل' نہ کوئی قاعدہ۔ اب اسوۂ ابراہیمیؑ ہمارے سامنے تو یہ آ گیا۔ سینکڑوں گھروں کے اندر زندگی جہنم بنی ہوئی ہے میاں بیوی اچھے بھلے بستے رستے ہوئے کہ باپ نے کہا ہے کہ بیوی کو طلاق دیدو' ماں نے کہا ہے کہ اس کو میکے بھیج دیجیے۔ یہ رو رہا ہے کہ بڑی عمدہ زندگی ہے بڑی محبت پیار ہے آپس میں' وہ بھی رو رہی ہے یہ بھی رو رہا ہے۔ کیا ہو رہا ہے؟ کہ صاحب! اطاعت فرض ہے ان کی' کیا کیا جائے۔ یہ روتے ہوئے اطاعت عجیب چیز ہے۔

قرآن حکیم کی روشنی میں اطاعت صرف خدا کے احکامات کی ہے اس کے علاوہ ہر قسم کی اطاعت شرک ہے

آپ نے دیکھا ہے کہ کہاں سے کہاں بات پہنچا دی جاتی ہے۔ یہ اسوۂ ابراہیمیؑ اور وہ آپ کے ہاں جو چوکھٹ بدل دو' وہ روایت اس پہ عمل ہے مسلمان کا اِس پہ عمل کسی کا نہیں ہے اس لیے کہ بچپن سے ہی پہلا سبق جو وہاں پڑھایا جاتا ہے۔ اب تو بہرحال ہمارے آنے والی اگلی نسل کو ضرورت ہی نہیں رہی۔ پڑھایا یہ جاتا تھا کہ

؎ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

یعنی بزرگوں کی غلطی کو پکڑنا جو ہے یہ خود بہت بڑی غلطی ہے۔

قرآن اسوۂ ابراہیمیؑ کہتا ہے کہ باپ بھی اگر غلطی کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ کیا کر رہے ہو تم۔ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّیْٓ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ

فِـیُ ضَـلٰـلٍ مُّبِیۡـنٍ (6:74) میں دیکھتا ہوں کہ تو اور تیری ساری قوم کھلی ہوئی گمراہی کے اندر چلے جا رہے ہو۔ یہ ہے اسوۂ ابراہیمیؑ عزیزانِ من! بدتمیزی نہیں ہے بداخلاقی نہیں ہے' جو غلطی ہے اس کو غلطی کہنا ہے۔ یہ کہا اس نے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہاں جو اصنام تھے' وہ واقعی انہوں نے تراشے ہوئے تھے جیسا ہر قوم کے اندر ہوتا ہے۔ بنیادی اعتبار سے عربی زبان میں صنم ایک تراشیدہ بت ہی کو نہیں کہتے ہر وہ جاذبیت جو آپ کو صحیح بات سے دوسری طرف لے جائے' اسے عربی زبان میں صنم کہتے ہیں۔ اس کی ایک محسوس شکل صرف یہ ہوتی ہے جسے آپ پتھر کا بت کہتے ہیں۔ ہم نے اس بت پرستی کے متعلق تو یہ کچھ کہا کہ بت شکنی تھی لیکن بت وہی تو نہیں تھے جو سامنے توڑ دیے گئے تھے۔ عجیب عجیب انداز میں اقبالؒ یہ باتیں کر گیا ہے صاحب۔

برہمن بہ غزنوی گفت کرامتن بہ بیں

جب محمود غزنوی نے کہتے ہیں تاریخ میں سومنات کے بت توڑے تو برہمن نے اس سے یہ کہا 'کرامتن بہ بیں' ذرا میری کرامت دیکھ

تو کہ صنم شکستہٴ بندہ شدی ایاز را

پتھر کے بتوں کو توڑ کے ایاز کا غلام بن گیا ہے میری کرامت ہے یہ کہ تیرے جیسے بندے کو اتنا مشرک بنا کے رکھ دیا میں نے۔ پتھر کے بت کعبے سے سارے نکال دیے۔ وہ کہتا ہے کہ

رہ مدہ اقبالؒ را در کعبہ اے شیخِ حرم

اسے کعبے میں مت جانے دینا اس لیے کہ

ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

طواف کر رہا ہے' کعبے میں پھر رہا ہے' ذرا اس کی آستیں کو دیکھو اس کے اندر ہر دائرے کے وقت میں ایک نیا خدا ہوتا ہے۔ یہاں پتھر کا خدا تو ایک رکھا ہوا تھا' ایک ہی تھا۔ کہاں ہے یہ خدا

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر

یہ ہے وہ بت خانہ بلکہ بت خانہ نہیں کہ جہاں تراشے جاتے ہیں بت' بت سازی کا کارخانہ' ہر آن میری فکر ایک نیا بت تراشتی ہے۔

رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

ایک جکڑ بندی سے کسی طرح سے نکلتا ہوں تو دوسری کے اندر الجھ کے رہ جاتا ہوں۔ یہ کیفیت ہے آپ کے ہاں کی پوری امتِ مسلمہ کی اور یہ وہ چیز ہے جسے قرآنِ کریم نے چودہ سو برس پہلے کہہ دیا تھا۔ ہمارے حالات سے' وہ خدائے خبیر و بصیر کیوں نہیں واقف تھا کہ وَمَا یُؤۡمِنُ اَکۡثَرُهُمۡ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمۡ مُّشۡرِکُوۡنَ (12:106) تم دیکھو گے کہ ان میں اکثریت کی یہ کیفیت ہوگی کہ ایمان کا دعویٰ کر

رہے ہونگے اور مشرک کے مشرک رہیں گے۔ اللہ اکبر۔ اَصۡنَامًا اٰلِهَةً (6:74) اپنی ہی جاذبیتوں کو اپنا خدا بنا کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ تو اور تیری قوم' کتنی کھلی ہوئی گمراہی کے اندر ہیں۔ یہ بات تھی جو انہوں نے یہاں کہی۔ آگے ایک چیز بڑی عجیب و غریب آ رہی ہے۔

لفظ ایمان کا مفہوم اس کی ماہیت، اس کے لوازمات اور پھر اس کے لیے کائناتی قوانین کی شہادت

یہ حقیقت ہے کہ ایمان خود ایک Conviction کا نام ہوتا ہے۔ Convince ہوتا ہے انسان لیکن اپنی Conviction کے لیے انسان کو ساری عمر' دلائل کی ضرورت پڑتی ہے۔ جتنا زیادہ علم ہوتا چلا جائے گا اتنے ہی زیادہ اپنی Conviction کی تائید میں اس کو دلائل ملتے چلے جائیں گے۔ یہ جو Conviction کی تائید میں دلائل ملتے ہیں' جو کیفیت اس کے بعد پیدا ہوتی ہے اسے عربی زبان میں یقین کہتے ہیں۔ یقین کس طرح سے پیدا ہوتا ہے؟ یہ چیز کہ کائنات کا ایک خالق ہے جس کے قوانین تمام کارگہ کائنات کے اوپر محیط ہیں۔ ہر شے ان قوانین کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ یہ بڑی بڑی مہیب قوتیں جو ہمیں نظر آتی ہیں یہ بھی بجائے خویش کچھ قوت نہیں رکھتیں' یہ خود اس کے قوانین کی قوتوں کے تابع چل رہی ہیں۔ یہ ایک ایمان ہے' اس ایمان میں یقین کی کیفیت کیسے پیدا ہوتی ہے۔

کاش اگر سائنٹسٹوں کے سامنے خود ساختہ مذہب کی بجائے خدا کا دین پیش کیا ہوتا

میں کہتا ہوں آج بیسویں صدی میں یہ جو بڑے بڑے سائنٹسٹ ہمارے ہاں کہتے ہیں اور ان کا بھی کوئی قصور نہیں ہے' ہم نے مذہب ان کے سامنے پیش ہی ایسا کیا ہے جو توہّم پرستیوں کا مجموعہ ہے۔ ورنہ ان سے پوچھئے کہ اس سے زیادہ کہہ سکے ہیں آج تک وہ جو یہ کہہ گیا ہے قرآن کہ اس Conviction کے لیے یقین کیسے حاصل ہوتا ہے۔

یقین محکم حاصل کرنے کے لیے کائناتی نظام کا بصیرت افروز مطالعہ کرنا اشد ضروری ہے

وَكَذٰلِكَ نُرِيۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ مَلَـكُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (6:75) ابراہیمؑ نے پھر غور و فکر کیا' کارگہِ کائنات کے مختلف مناظر ہم نے دکھائے۔ نُرِیۡ: محسوس چیزوں کو دکھانے کے لیے یہ لفظ آتا ہے' محسوس چیزوں کو دیکھ کے غور و فکر کرنا ایک لفظ ہے اس کے لیے ان کے ہاں۔ ہم نے اس طرح سے کائنات کے اندر جس طرح ہمارے قانون کی کارفرمائی تھی' اسے ابراہیمؑ کو' ہم نے دکھایا۔ کاہے کے لیے دکھایا؟ وَلِيَكُوۡنَ مِنَ الۡمُوۡقِنِيۡنَ (6:75) تاکہ اس کو یقین حاصل ہو جائے۔ خدا کی ذات' اس کی کارفرمائی' کائنات میں اس کا نظام کس طرح چلتا ہے۔ ایمان ہے' اس پہ یقین صرف اس صورت میں آ سکتا ہے کہ کائنات کے ایک ایک گوشے کے اوپر آپ ریسرچ کریں' تحقیق کریں اور اس کے بعد اس نتیجے پہ پہنچیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا (3:191) اے ہمارے نشوونما

دینے والے، تو نے کارگہِ کائنات کے کسی ذرے کو بھی تخریبی مقاصد کے لیے پیدا نہیں کیا ہوا۔ اس طرح سے یقین حاصل ہوتا ہے۔

ہماری دیدۂ کور نے مقام نبوت کو واعظ کی محدود چار دیواری میں مقید کر رکھا ہے

ہم نے ان انبیائے کرامؑ کو یا ان مسلمین کے متعلق یہ سمجھا کہ یہ واعظ تھے زیادہ سے زیادہ، بس یہ تصور ذہن میں آتا ہے۔ مولوی نے تصور ہی یہ پیدا کیا ہے۔ کبھی ذہن میں نہیں یہ آتا کہ یہ سائنٹسٹ تھے، بڑے بڑے مفکر تھے، بڑے ریفارمر تھے، بہت بڑے Politician تھے۔ یعنی دین کی سیاست کے اعتبار سے فرماں روائی اور جہاں بانی اس کے بہت بڑے ماہر تھے۔ یہ تصور کبھی نہیں آتا ان کے متعلق۔ اللہ والے تھے ''او اللہ والے ساہڈے سامنے جیہڑے آندے نا او منگ کے کھان والے'' ان کا بھی کچھ ایسا ہی تصور آتا ہے ذہن میں۔ آپ غور فرمایئے یہ ابراہیمؑ کے متعلق کیا جا رہا ہے۔ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (6:75) اجرامِ فلکی اور سماوی' کارگہ کائنات کے یہ گوشے' اس میں قانون کی کارفرمائی کس طرح سے ہو رہی ہے' اس کا ہم نے مشاہدہ کرایا ابراہیمؑ کو۔ پھر وہ کس مقام پہ پہنچا۔ قوم اس کی ستاروں کو پوجتی تھی' چاند کی پرستش کرتی تھی' سورج کی پرستش کرتی تھی۔ یہ ہماری ہمسایہ قوم ہندو' اسی قسم کی وہ قوم تھی۔ وہ انہیں بھی یہ دعوت دیتے تھے کہ یہ ہے معبود۔

تصریف آیات کے قرآنی فارمولے کے برعکس روایات کی رو سے قرآن حکیم کو سمجھنے کا نتیجہ اور اس کی اصل حقیقت

اب یہ ہیں وہ چار آیتیں جو کہا جاتا ہے ہم سے کہ روایات کی رو سے قرآن سمجھ میں آتا ہے' ویسے آنہیں سکتا۔ یہ چار آیتیں سامنے رکھئے۔ کوئی تفسیر پرانی اٹھا کے دیکھئے پھر اس میں دیکھئے کہ بھانت بھانت کی بولیاں کیا ہیں اور ابراہیمؑ کا تصور کیا آپ کے سامنے اس کی رو سے پیش آتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن کی آیت میں ہے۔ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّىْ (6:76) یعنی یہ کہا جاتا ہے کہ ابراہیمؑ نے یہ کچھ کیا۔ ستارہ نکلا تو ابراہیمؑ نے کہا کہ اچھا! یہ ہے میرا رب۔ ابراہیمؑ نے گھر میں باپ سے یہ کہا ہے' واقعہ کی ابتداء اس سے ہو رہی ہے اور اس کا اپنا یہ کردار بتایا جا رہا ہے کہ ستارہ نکلا تو اس نے کہا کہ اچھا یہ ہے میرا رب۔ پھر اس کے بعد فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّىْ ۚ (6:76) چاند نکلا تو اس سے زیادہ روشن تھا اس نے اس کو معبود بنا لیا ''او ہدے سامنے وی متھا ٹیک دتا''۔ پھر اس کے سامنے فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّىْ هٰذَاۤ اَكْبَرُ (6:78) سورج نکلا ہے تو اس کے سامنے اس نے ماتھا ٹیک دیا۔ یعنی یہ تصور دیا جا رہا ہے' خدا کے ایک نبی کا اس کے پیغمبر کا جو کھلا ہوا چیلنج تھا اس قسم کے شرک کا۔ وہ کہتا ہے هٰذَا رَبِّىْ (6:78) . اتنا حسین انداز ہے قرآن کے بات کرنے کا کہ وہ انہیں کہتے ہیں کہ یہ دیکھئے یہ ستارہ اس آسمان کے اندر اتنی بڑی چمک اتنی بڑی دمک'

اس کی درخشندگی تابندگی اندازہ لگایئے' اس کے سامنے وہ جھکتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ ہے جسے خدا بننے کا حق حاصل ہے یہ ہے ہمارا رب یہ ہے بڑا۔ ابراہیمؑ سے کہتے ہیں کہ یہ دیکھو نکلا ہوا ہمارا معبود۔ ابراہیمؑ کہتا ہے کہ اچھا! یہ ہے جسے تم کہتے ہو کہ یہ میرا رب ہے۔ اس کے بعد کہتے ہیں ذرا ٹھہر جایئے انتظار کر لیجیے۔ اور انتظار کے بعد فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (6:76) اور اس کے بعد اس سے کہا کہ وہ دیکھئے وہ جو تمہارا رب تھا' وہ کہاں گیا' ڈوب گیا وہ تارا تھوڑے سے عرصے کے بعد۔ وہ ڈوب گیا اور کہا کہ یہ کہو کہ جو ایک وقت میں نمودار ہوا اور دوسرے وقت میں وہ خود غائب ہو جائے یوں مرنے والا کسی کا رب ہو سکتا ہے ''فٹے منہ تہاڈا''۔ یعنی کیا انداز ہے بات کرنے کا!! کوئی لمبی چوڑی مناظرانہ بحثیں نہیں ہیں۔ کسی مولوی کلہاڑے کو کھڑا کر کے بتایئے ''ساری رات او جناب دلیلاں دیندا رہے گا اتھے'' اور ساری بیہودہ۔ نبی کا طریقہ یہ نہیں ہے۔ انہیں پتہ ہے کہ جہالت میں قوم ہے' ایک ہی دلیل اس کے لیے ہوگی۔ کہا کہ اچھا یہ ہے جو تم کہتے ہو کہ میرا رب ہے' ذرا ٹھہر جایئے۔ یہاں بیٹھے ہوئے آسمان کے تارے کے متعلق اس دور میں دلیلیں وہ کیا دیتا ہے۔ فَلَمَّآ اَفَلَ (6:76) جب وہ غروب ہو گیا تو کہا کہ یہ بھی رب ہو سکتا ہے؟ کہ ہم اور تم اس وقت بھی موجود تھے' جب یہ نمودار ہوا ہم اور تم اب بھی موجود ہیں اور وہ نہیں رہا۔ کم بختو! جو موجود ہے وہ اس کی پرستش کرے جو نہ ہی موجود ہے اس وقت۔ ہم سے بھی گیا گذرا ہے یہ تو صاحب۔ پھر چاند چڑھا تو انہوں نے کہا کہ یہ بہت مہا دیوتا ہے اس کی بڑی پرستش ہونی چاہیے۔ انہوں نے کہا دیکھئے کتنا چمکتا ہے۔ کہا ٹھیک ہے ھٰذا ربی اچھا! یہ بات ہے۔ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِىْ رَبِّىْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ (6:77) کہا کہ ٹھیک بات ہے اگر میں بھی تم میں سے ہی ہوتا اور یہ ہدایت یہ راہنمائی مجھے نہ ملتی خدا کی طرف سے تو میں بھی پھر انہی کو خدا بنا لیتا جو آج نمودار ہوتے ہیں' کل کو ڈوب جاتے ہیں۔ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّىْ هٰذَآ اَكْبَرُ (6:78) یہ بہت بڑا ہے سب سے' مہا دیوتا ہے' پرماتما جی آ گئے ہاتھ جوڑے ان کے سامنے کھڑے ہو کے پانی میں گنگا جی کے جا کے۔ فَلَمَّآ اَفَلَتْ (6:78) جب وہ بھی ڈوبا تو قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِىٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (6:78) آگے ضرورت نہیں تھی سورج سے آگے تو کوئی چیز اور چڑھنی نہیں تھی جس کو انہوں نے دیوتا بنانا تھا۔

حضرت ابراہیم کا اپنی قوم سے خطاب

آخری مہا دیوتا صاحب بھی جب آ گئے تو اس کے بعد یہ بھاگ گئے ''فٹے منہ تہاڈا''۔ کم از کم میں بری الذمہ ہوں۔ اِنِّىْ سَقِيْمٌ (37:89) جو وہاں آیا ہے قرآن میں' وہاں آؤں گا تو بتاؤں گا کہ روایت نے وہاں کیا بات بنا دی ہے۔ نَظْرَةً فِى النُّجُوْمِ (37:88) وہاں کہا ہے نَظَرَ کے معنی ہوتا ہے تنقید کرنا۔ انہوں نے ان کے اوپر ان الفاظ میں تنقید کی اور ان سے کہا کہ I am sick of these idols of yours میں تو تنگ آ گیا ہوں تمہاری اس روش سے اور تمہارے ان خداؤں سے۔ میں سخت بیزار ہوں ان سے جن کو تم

خدا بنائے بیٹھے ہوئے ہو۔ اب نمودار ہوا ہے' اب غائب ہو گیا ہے' ارے اس پہ تو بادل آ جائیں تو وہ چھپ جاتا ہے۔ اس کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ (6:78)۔ اور اس کے بعد عزیزانِ من! وہ جو ایک مومن کا قول ہونا چاہیے اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (6:79) میں ان تمام جاذبیتوں سے منہ موڑ کر' اپنی توجہات کا رخ صرف اس ایک خدا کی طرف کرتا ہوں۔ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (6:79) جس کا اپنا چڑھنا اور ڈوبنا تو ایک طرف رہا' وہ کہ جس میں قوت ہے' ان تمام چیزوں کو عدم سے وجود میں لانے والی طاقت ہے۔ کچھ نہیں تھا نہ چاند نہ ستارہ نہ زمین نہ آسمان نہ فلک' کچھ نہیں تھا اور اس کچھ نہیں سے وہ سب کچھ جس نے بنایا ہے اسے کیوں نہ خدا مانا جائے۔

حضرت ابراہیم کے اسوہ حسنہ کے متعلق قرآن حکیم کی طرف سے دی گئی شہادت

میں اس کی طرف توجہ دیتا ہوں ہر طرف سے رخ موڑ کے حَنِیْفًا' حنیف کے معنی ہوتا ہے ناک کی سیدھ چلے جانے والا' اِدھر اُدھر دیکھنے والا بھی نہیں۔ اور میں ان مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ سورۃ الانعام کی آیت 79 تک ہم عزیزانِ من! پہنچ گئے 80 سے آئندہ اس کو ہم شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

دسواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 79 تا 90)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1971ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی آیت 80 سے ہو رہا ہے۔

تعمیرِ ملت کی بنیاد ہمیشہ قوم کی اجتماعی سوچ پر استوار ہوتی ہے

سلسلۂ کلام پیچھے سے چلا آ رہا ہے اور جیسا کہ میں نے ضمناً پچھلے درس میں عرض کیا تھا بات شرک اور توحید کی چلی آ رہی ہے۔ بنیاد ہے دین کی توحید۔ آج تو ہمارے سامنے دین کا تصور نہیں، اس لیے دین کی بنیادیں یا اس کے اوپر اٹھی ہوئی عمارت کا بھی تصور ہمارے سامنے نہیں ہے۔ توحید کے معنی ہیں، ہمارے ذہن میں خدا کا ایک ماننا۔ کبھی آپ نے کسی سے یہ پوچھا یا خود سوچا کہ یہ ماننا معنی کیا رکھتا ہے۔ ہم خدا کو ایک مانتے ہیں یعنی بس پھر معاملہ ختم 'مانتے ہیں'۔ یہ بڑی اہم چیز ہے جو میں عرض کر رہا ہوں کبھی اس پہ غور کیجیے گا کہ 'ہم مانتے ہیں' اس کا کوئی عملی مفہوم نہیں ہے۔ مشرک بتوں کو پوجتے ہیں پھر بھی ہم سے ایک قدم آگے بات ہوئی۔ وہ کچھ کرتے ہیں، ہم تو فقط

مانتے ہیں۔توحید تو ہمارے نزدیک ہوئی خدا کو ایک ماننا اس کا کوئی عملی مفہوم نہیں ہے اور شرک کا مفہوم ہوا بتوں کا پوجنا۔

شرک کے سلسلہ میں ہم نے اپنے آپ کو خود فریبی میں مبتلا کر رکھا ہے

آپ کو پتہ ہے ہم نے اس کو یہاں تک ہی کیوں محدود رکھا ہوا ہے؟ اس لیے کہ ہم بتوں کو پوجتے نہیں لہٰذا اپنے آپ کو یہ فریب دینے کے لیے کہ ہم مشرک نہیں ہیں۔ کیونکہ شرک کی تو ایک ہی چیز تھی جو ہم نے سامنے رکھی 'بتوں کا پوجنا' ہم بتوں کو نہیں پوجتے اس لیے ہم مشرک نہیں ہیں۔اور اس نے کہا یہ تھا کہ وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ (12:106) تم ان میں سے اکثر ان لوگوں کو دیکھو گے کہ جو خدا کو مانتے تو ہیں لیکن مشرک ہوتے ہیں۔'ہم خدا کو مانتے ہیں' وہ کہتا ہے اسکے باوجود مشرک ہوتے ہیں۔تو نہ تو صرف خدا کو مان لینے سے توحید پرست ہوسکتا ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ اسکے باوجود مشرک ہوتے ہیں اور نہ ہی شرک بت پرستی کا نام ہے۔اس لیے تو بت تو مسلمان نے کبھی پوجا نہیں۔ یہ خدا کو ایک ماننے والے مشرک ہوتے ہیں۔معلوم ہوا کہ بات کچھ اس سے الگ ہے۔ یہ ہم نے ہی اپنے آپ کو فریب دینے کے لیے ایک تصور توحید کا اپنے ذہن میں قائم کیا 'خدا کو ایک مانتے ہیں' اور شرک کا ایک تصور سامنے رکھا 'بتوں کو پوجتے ہیں' لہٰذا ہم مشرک نہیں ہیں۔وہ کہتا ہے کہ اکثر تم دیکھو گے خدا کو ماننے والے مشرک ہوتے ہیں۔ بڑی اہم چیز ہے۔

حضرت ابراہیم کے نزدیک توحید کی عملی وضاحت اور ہیگل کا فلسفہ حیات

توحید میں قرآن نے جو اسوہ پیش کیا ہے ہمارے سامنے' جو نمونہ پیش کیا ہے زندگی کا' حضرتِ ابراہیمؑ کا ہے۔اور یہاں گفتگو ہو رہی ہے ان کے نظریۂ توحید کی' ان کے تصورِ توحید کی۔اس کے لیے مجھے چند لفظوں میں کچھ تھوڑی سی فلسفیانہ بات کرنی پڑ گئی کہ اسکے بغیر چارہ نہیں ہے۔میں عام فہم الفاظ میں سمجھانے کی کوشش کرونگا' آپ اسے ذرا زیادہ غور سے سنئے گا۔

یہ جسے مارکس ازم آج کل کہتے ہیں' عام طور پر کمیونزم اسے کہتے ہیں۔ان کا ایک فلسفہ ہے وہ فلسفہ' جس کا بانی جرمنی کا ایک فلاسفر ہیگل تھا جس کا شاگرد مارکس تھا۔ہیگل کا تو فلسفہ یہ ہے کہ کوئی تصور کوئی' عقیدہ کوئی نظریہ' کوئی فکری چیز جسے انگریزی میں یا فلسفے کی زبان میں آئیڈیا کہتے ہیں' ان میں کوئی شے غیر متبدل نہیں ہے۔ ہر چیز بدلتی رہتی ہے' تغیر پذیر ہے۔وہ کہتا ہے کہ Change ہے' تغیر ہے جس پہ سارا دار و مدار ہے اس کائنات کا۔اور وہ جتنے تصورات فکر انسانی یا نظریاتِ زندگی' عقائد جنہیں آپ کہتے ہیں' آئیڈیاز جو آتے ہیں' کوئی بھی غیر متبدل نہیں ہوتا۔ ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔آپ اسی حد تک اسی فلسفے پہ چلئے' آگے جانے کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ اس کا یہ شاگرد تھا مارکس' اس نے کہا کہ سوال آئیڈیاز کا' تصورات کا نہیں ہے بلکہ کائنات کی کوئی شے غیر متبدل نہیں ہے ہر چیز میں ہر آن

تغیر واقع ہوتا رہتا ہے۔ یہ چیز جو اس نے کہی' ان دونوں نے کہ تغیر ہے ہر چیز کے اندر' یہ ایک واقعہ ہے تھوڑی سی Exception کے ساتھ۔ یہ ٹھیک ہے ہر شے میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ یہ آج کی انسان سے متعلق جو سائنس ہے' وہ بھی یہ بتاتی ہے کہ ہر سانس میں انسان کے اندر کروڑوں Cells (جرثومے) ہیں جو تلف ہوتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے جرثومے بنتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلۂ تغیر و تبدل Change & Substitution' ہر سیکنڈ میں ہر سانس میں جاری رہتا ہے۔ اور وہ تو اب اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ کوئی قریباً تین سال کے بعد انسان کا سارا جسم نیا ہو جاتا ہے۔ پہلے میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ یہ بنا ہوا ہی سارا ان Cells کا ہے' یہ فنا ہوتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے بنتے رہتے ہیں۔ تو گویا Change اتنا اہم ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ کوئی شے بھی یہاں' نہ کوئی تصور ہیگل کی رو سے' نہ کوئی شے مارکس کے فلسفے کی رو سے کہ جو غیر متبدل ہو۔

زندگی کے ابتدائی دور میں عقل انسانی کی کیفیت اور یہ سلسلہ کائنات

اب انسان یہ سوچے کہ اس نے اس کائنات میں کن چیزوں کو اپنے سے بڑا سمجھا۔ ابتدائی زندگی میں جب ابھی اس کا علم بڑا محدود تھا' فطرت کی قوتوں سے نا آشنا تھا اور یہ اپنے آپ کو بالکل بے کس' بے بس نہتا کمزور ضعیف پاتا تھا تو Nature کا ہر Phenonenon فطرت کی ہر قوت کو اپنے سے بالا سمجھتا تھا۔ اور انہیں یہ دیوی دیوتا بنا کے ان کے سامنے جھکتا تھا ان کو راضی کرنے کی کوشش کرتا تھا ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑا کر' اس کے سامنے سجدے کر کے۔ بجلی چمکی' یہ سجدے میں گرا' بادل گرجا' یہ ڈنڈوت بجالایا' بارش ہوئی اس نے اسے اندر دیوتا کہا' بہت بڑے بڑے دریا یہ گنگا اور جمنا یہ اسی زمانے کی مائیاں بنی ہوئی ہیں ان کی۔ کہیں انہوں نے درخت دیکھا بڑ کا یا پیپل کا اسے دیوتا بنایا' شیر دیوتا' سانپ دیوتا' آگ دیوی۔ اس لیے کہ ان چیزوں کو وہ اتنا غالب سمجھتا تھا کہ یہ ہر آن اسے فنا کرتی چلی جاتی تھیں' تباہ کرتی چلی جاتی تھیں۔ علاج اس کا ابھی اس کے پاس نہ تھا۔ ذہن میں نہیں آتا تھا تو اس نے یہ سمجھ لیا کہ یہ قوتیں مجھ سے بہت زیادہ بڑی طاقتور ہیں' ان کو راضی رکھنا بڑا ضروری ہے۔ یہ ہے ابتدائی تصور جو Worship کا آیا ہے انسان کے ذہن میں' پرستش کا تصور آیا ہے۔ گڑ گڑا کے کسی کے سامنے' جھک کے سجدہ کر کے' ہاتھ جوڑ کے راضی کر لینا۔ اے اندر دیوتا! یہ نہ کرنا' اے اگنی مائی! مجھے بچا لینا' یہ دیکھتے ہیں خوف۔ اس پہ غور کیجیے گا جو میں نے لفظ کہا ہے خوف۔ اور خوف کو دور کرنے کے لیے جھکنا' گڑ گڑا کر راضی کرنا اگلے کو کیونکہ مقابلے کی تو قوت ہے نہیں۔ اور جس کے مقابلے کی قوت نہ ہو' آپ سمجھتے ہیں اس کے سامنے آپ جھک جاتے ہیں' اسے راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے کو اپنے سے زیادہ قوت والا سمجھ کے اس سے ڈرنا اور اس کا علاج ہاتھ جوڑ کے اس کی پرستش کرنا' یہ ہے ابتدائی تصور جو انسان کے ذہن کا ہے۔ خوف اور خوف کو دور کرنے کے لیے پرستش۔ یہ ہے جو تصور انسان نے اپنے ذہن میں رکھا ہوا ہے چلا آ رہا ہے۔

خوف وحزن کے عالم میں یہ قندیل آسمانی کا احسانِ عظیم تھا جس نے انسان کو اس کے حقیقی مقام سے آگاہ کیا

قرآن نے آ کر ایک بنیادی کام یہ کیا کہ انسان کو اس کے مقام سے آشنا کرایا۔ یہ بات انسان سے شروع ہوتی ہے خدا سے نہیں' وہ آگے بات آتی ہے۔اس نے انسان کو اس کے اپنے مقام سے آشنا کرایا۔ وہ مشہور کہانی کہ ایک شیر کا بچہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی کسی طرح سے بھیڑوں میں آ ملا' اسی میں اس نے پرورش پائی۔ وہ بھی انہی کی طرح ممیاتا پھرتا تھا جنگلوں میں۔ کہیں سے اس نے شیر کی آواز سنی تو جیسے بھیڑیں بھاگتی تھیں' وہ بھی بھاگ اٹھتا تھا' وہ بھی سر چھپا کے بیٹھ جاتا تھا' بھیڑ ہی اپنے آپ کو سمجھتا تھا۔ تو ایک شیر نے دیکھا کہ ہمارے جیسا ایک شیر کا بچہ ہے کیفیت اس کی یہ ہے کہ بھیڑ بنا ہوا ہے اور اگر شیر کی دھاڑ سنتا ہے تو بھیڑوں کی طرح بھاگ اٹھتا ہے اور سر دیدیتا ہے کسی جھاڑی میں اور اس طرح سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے' اسے ہو کیا گیا۔ تو اس کا کوئی استاد تھا اس نے بات سمجھائی۔ اس نے کہا اسے پتہ نہیں کہ میں شیر ہوں' وہ بھیڑ سمجھتا ہے۔ اس کا علاج ہم کرتے ہیں۔ وہ گیا اور اس نے جا کے جھٹ سے جھپٹا مارا وہ بھیڑ تو تھی جو شیر کا بچہ تھا' اس نے جھپٹ لیا اور اس کو وہ کھینچتا ہوا لے آیا۔ پانی کا ایک شفاف چشمہ تھا جس میں سے عکس نظر آتا تھا۔ اس شفاف چشمے پہ خود بھی کھڑا ہو گیا' ساتھ اس کو بھی کھڑا کیا اور اس کے اندر جو اس نے تصویریں دیکھیں' تو اس سے پوچھا کہ ان دونوں میں تمہیں کوئی فرق نظر آتا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ اس نے کہا میں تو شیر ہوں' کہنے لگا ہاں' تو جب دونوں میں فرق نہیں آتا' تو تو بھی شیر ہے۔ اس کو جو کچھ وہ تھا' اس کا عکس دکھا کے اسے بتایا کہ یہ ہے تیرا مقام۔ اور دوسری ہی آن میں جہاں یہ شیر جو تھا' جھپٹا بھیڑوں کے اوپر' وہ بھی ساتھ ان کے مل کے جھپٹا بھیڑوں کے اوپر ایک ثانیہ میں یہ بھیڑ سے شیر ہو گیا۔ شیر تو تھا اپنے مقام سے واقف نہیں تھا۔ قرآن نے کیا یہ آ کے کہ یہ جو انسان نے اپنے آپ کو بھیڑ سمجھ رکھا تھا اسے یہ صاف وشفاف چشمے کے اوپر لے گیا اور اس کے عکس میں اس کو دکھایا کہ تو حقیقت میں یہ ہے۔ یہ ہے جی ساری بات جو قرآن نے کی ہے۔

کائنات کی ہر شے انسان کے تابع تسخیر کر دی گئی ہے

کہا اس سے یہ کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (45:13) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں خواہ وہ اس صفحۂ ارض پہ ہو یا باہر کے اجرام فلکی میں ہو کہیں بھی کوئی شے بھی ہو' وہ تیرے تابعِ تسخیر ہے۔ سارے ملائکہ آدم کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔ بہت بڑی چیز ہے یہ۔ آپ نے دیکھا ہے کہ ایک ہی جھلک میں جو اس نے پانی کے اندر اس کو دکھایا اس کا چہرہ اس کو کس مقام سے کہاں پہنچا دیا۔ یہ ساجد تھا' اسے مسجود بنا دیا۔ کائنات کی ہر قوت سے ڈرتا تھا' اس کے سامنے جھکتا تھا' اپنے آپ کو اس سے بہت

زیادہ ذلیل سمجھتا تھا' اسے اس کے مقامِ خویش سے جو آگاہ کیا تو ایک ہی ثانیہ میں یہ تمام کائنات کی اشیاء کا مسخر کرنے والا ہو گیا۔ یہ گنگا جمنا بڑ اور یہ پیپل اور یہ شیر اور یہ اگنی اور یہ بادل یہ تو شے کچھ نہیں ہیں' اس نے تو کمندیں ڈال دیں چاند اور سورج کے اوپر۔

حسبِ سالقہ وحی کے آئینہ نے مقامِ انسانیت کو روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا کہ ہر انسانی بچہ واجب التکریم ہے

یہ صدقہ ہے قرآنِ کریم کا۔ اس سے پہلے انبیائے کرامؑ کی وساطت سے بھی تعلیم آیا کرتی تھی۔ لیکن چونکہ وہ اپنی اصلی شکل میں رہی نہیں' اس لیے ہم خدا کی وحی کی جب مثال پیش کرتے ہیں تو قرآن ہی کو پیش کرتے ہیں کیونکہ یہ ہے وہ وحی جو اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ وحی نے آئینہ دکھایا انسان کو اور اس میں اس کا حقیقی مقام اس کے سامنے لے آیا۔ اور پہلا مقام اس کا یہ تھا کہ کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں ہے جس سے تجھے ڈرنے کی ضرورت ہے اور اس کے سامنے جھکنے کی ضرورت ہے۔ باقی رہے انسان' انسان انسان کے سامنے!!!

اس نے کہا وَ لَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ (17:70) ہر انسانی بچہ پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہے اس لیے کسی انسان کو حق حاصل نہیں کسی دوسرے انسان کو اپنے سامنے جھکائے۔ اور جونہی انسان دوسرے انسان کے سامنے جھکا' مشرک ہو گیا۔ یہ شرک تھا کیا؟ ۔فطرت کی قوتوں کو تو یوں مسخر کر کے ان کا اسے مسجود بنا دیا۔ یہ آدم کے جو ملائکہ جھکے ہیں سامنے' بات کیا ہے یہ؟ انسان کو اس کے مقام سے آشنا کرایا گیا ہے۔ اور باقی رہے انسان!! یہی دوسری چیز تھی جو دنیا کے اندر چلی آ رہی تھی۔ ایک فرعون بنا ہوا ہے' دوسرا اس کا محکوم بنا ہوا ہے۔ ساری تاریخ اسی چیز کی ہے۔ اس کے متعلق اس نے یہ کہہ دیا: ہر انسان کا بچہ یکساں طور پہ واجب التکریم ہے۔ جیسے ہر شیر کا بچہ پیدائشی اعتبار سے شیر ہوتا ہے' آدم کا بچہ پیدائشی اعتبار سے آدم ہوتا ہے۔ اس نے آدم کی وہ تعریف کرائی اور اس کے بعد انہیں بنی آدم کہا' اسی آدم کے بیٹے جو اس کائنات میں سب سے اونچا ہے اور سارے یکساں۔ تو سوال ہی ختم ہو گیا۔ وہ ان کے سامنے جھکنا جو تھا تذلیل انسانیت' یہ برابر کے جو ہیں ان کے سامنے یہ وجہ تحقیرِ انسانیت۔ کبھی کوئی اپنے برابر والے کے سامنے نہیں جھکتا۔ آپس میں تعاون ان کا ہوتا ہے۔ آپس میں تعلقات ہوتے ہیں' روابط ہوتے ہیں' جھکنے والی بات نہیں ہوتی۔ کوئی سی ایس پی اپنے آپ کو دوسرے سی ایس پی کا محکوم نہیں سمجھتا۔ یہ دو باتیں اس نے کہیں۔

قرآنِ حکیم اپنے حقائق کو بیان کرتے ہوئے اربابِ فکر و نظر کے لیے ایک حقیقت کشا انداز اختیار کرتا ہے

اب وہ آیا فلسفیانہ طور پہ سمجھانے کے لیے۔ عجیب کتاب ہے عزیزانِ من! یعنی یہ جو بات میں نے سمجھائی' دیکھا عام سطح پہ کیسے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ لیکن ایک فلسفہ بھی تو چلا آ رہا ہے یہ اربابِ فکر کے لیے بھی تو کتاب ہے' اربابِ علم کے لیے کتاب ہے۔ علم کی بارگاہ کے

اندر اس نے یہ بات کہی کہ یہ ٹھیک ہے کائنات کی ہر شے میں تغیر آتا چلا جاتا ہے' ہر آن تغیر آتا چلا جاتا' ہے کوئی شے ایسی نہیں ہے جو تغیر پذیر نہ ہو۔ بات یہاں سے شروع کیجیے اور آگے میں تغیر کی مثالیں قرآن کی دونگا۔ بڑی اہم چیز ہے میں نے عرض کیا ہے نا کہ اس دور میں جو مارکس ازم کا فلسفہ ہے' وہ چھایا ہوا ہے اس وقت ذہنوں کے اوپر کہ ہر شے تغیر پذیر۔ ٹھیک ہے۔ دیکھئے تو سہی ایک توحید پرست کہتا کیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی بات قرآن کہہ رہا ہے۔ کہا انہوں نے یہ کہ یہ ہیں ستارے' وہی پہلے دور کا انسان جو چاند سورج ستارے' دھرتی ماتا ان سب کو اپنا دیوتا سمجھتا تھا یہ وہ دور ہے نا۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہے جس کے سامنے جھکنا چاہیے۔ انہوںؑ نے کہا کہ اچھا! یہ ہے جو تم کہتے ہو کہ اس کے سامنے مجھے جھکنا چاہیے۔ ذرا انتظار کرو۔ اور اس کے بعد پہلے وہ دھندلا سا ہوا وہ جو تابانیاں اس میں تھیں' درخشندگی تھی' چمک تھی اتنی بڑی' وہ کم ہوئی ماند پڑی اور اس کے بعد وہ غروب ہو گیا۔ آپ نے دیکھا کہ یہ کیا ہوا؟ اس میں Change آیا اس میں تغیر آیا۔ اور انہوں نے کہا کہ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (6:76) افل کے معنی یہ ہیں کہ جو ایک وقت میں نہایت درخشندہ اور چمکدار ہو' دوسرے وقت میں دھندلا جائے' تیسرے وقت میں سامنے ہی نہ رہے۔ Changes اس کے اندر آتی چلی جا رہی ہیں۔ کہا کہ ہر وہ چیز جس کے اندر Change آتی ہے' وہ خدا نہیں ہو سکتی۔ قرآن کے دو اور مقام ہیں جن کو سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (55:26) جو کچھ بھی ہے اس کائنات کے اندر۔

ہمارے ہاں کے غلط تراجم قرآنی حقائق کی شکل وصورت کو زنگ آلود کر دیتے ہیں

اب یہاں آئی وہ بات جو میں کہا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں کا غلط ترجمہ بات کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ کہیں بھی آپ دیکھیں اس کا ترجمہ آپ کو نظر آئے گا' کائنات کی ہر شے فنا ہونے والی ہے۔ ایک دن آخر میں جا کے فنا ہو جائے گی' ٹھیک ہے اس میں ابدیت تو ہے نہیں جیسے خدا کی ابدیت ہے' اس کو تو چھوڑ دیجیے۔ قرآن نے خود کہا ہے اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (31:29) سارا کارگہ کائنات چل رہا ہے ایک مدت کے لیے۔ وہ بات نہیں۔ قرآنِ کریم نے لفظ وہاں جو انہوں نے اَفَلَ (6:76) کہا' یہاں فَانٍ کہا اور تیسرا مقام كُلُّ شَىْءٍ هَالِكٌ (28:88) اس کا ترجمہ بھی آپ کہیں دیکھیں گے وہ یہی کہے گا کہ ہر شے آخر میں ہلاک ہو جانے والی ہے' تباہ ہو جانے والی ہے' ختم ہو جائے گی' ہر شے بالآخر ختم ہو جائے گی۔ گویا جسے یہ کائنات کا انجام کہتے ہیں اس کے متعلق یہ ہے کہ بالآخر یہ چیز ختم ہو جائے گی۔

لفظ افل یا فان کا لغوی مفہوم تغیر پذیر ہونا ہے

یہاں عربی جاننے والے احباب اس چیز کو Appreciate کریں گے کہ اٰفِلٌ ہو یا فَانٍ جو قرآن نے کہا ہے یا هَالِكٌ (28:88) جو کہا ہے یہ فاعل کے صیغے ہیں۔ عربی زبان میں یہ ہیں فاعل کے وزن کے اوپر۔ بڑی عجیب Scientific

Language ہے عزیزانِ من! ۔اس زبان میں اسمِ فاعل کو جب تک خاص طور پر Future یا مستقبل کے ساتھ مخصوص نہ کر دیا جائے اس کے معنی ہوتے ہیں کہ اس وقت بھی وہ کچھ ہو رہا ہے۔ جب خدا کو عالم کہا جائے گا تو اس کے معنی یہ نہیں ہونگے کہ وہ کبھی اس کا علم رکھے گا' اس کے معنی ہیں کہ اب بھی اسے علم ہے اس چیز کا۔ جب خدا نے کہا تھا **اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً** (2:30) تو جاعل فاعل کے وزن کے اوپر ہے اس کے یہ معنی نہیں تھا کہ میں بناؤنگا' یہ تھا بنا رہا ہوں۔ یعنی حال میں بھی وہ چیز واقع ہو رہی ہوتی ہے جس کے لیے یہ صیغہ استعمال کیا جاتا ہے فاعل کے وزن کے اوپر۔ حضرت ابراہیمؑ نے لفظ جو استعمال کیا قرآن نے کہا ہے وہ کیا تھا **لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِیۡنَ** (6:76) فاعل کے وزن کے اوپر جس میں ہر آن تغیر واقع ہو رہا ہے۔ **کُلُّ مَنۡ عَلَیۡہَا فَانٍ** (55:26) وہی ہے صیغہ۔ فنا کے معنی بھی معدوم ہو جانا نہیں' بقاء کے مقابل میں یہ لفظ آتا ہے بقاء کے معنی ہوتا ہے غیر متغیر جس میں تغیر نہ آتا ہو اور فنا کے معنی ہوتا ہے جس میں تغیر آ رہا ہو۔

کائنات کے ذرے ذرے میں ہر آن ایک تغیر واقع ہو رہا ہے

ہر شے یہاں کی **فَانٍ** ہر آن اس میں تغیر آ رہا ہے۔ **کُلُّ شَیۡءٍ ہَالِکٌ** (28:88) وہی صیغہ ہے۔ یہ تو عجیب کتاب ہے۔ ہر شے میں ہر آن ہر ثانیہ ہر سانس میں' ہلاکت واقع ہو رہی ہے۔ ہو رہی ہے اور اس میں پھر تخریب اور تعمیر کا سلسلہ جاری ہے۔ ہر آن اس میں یہ ہو رہا ہے' اس میں سے پھر تعمیری پہلو اوپر ابھر رہا ہے۔ جہاں یہ تخریبی پہلو غالب آ جاتا ہے وہ شے وہ شے جو نہیں رہتی' تعمیری پہلو غالب رہتا ہے تو وہ باقی رہتی ہے۔ لیکن یہ کائنات کی ہر شے میں سلسلۂ تغیر وہ **اٰفِلٌ** کے لفظ میں ہو' وہ **فَانٍ** کے لفظ میں ہو' وہ **ہَالِکٌ** (28:88) کے لفظ میں ہو' ہر شے میں تغیر آتا ہے۔ اور اصول یہ اس نے دیا کہ کوئی تغیر پذیر شے ایسی نہیں ہے کہ جسے آپ خدا مان لیں' اپنے سے بڑا مان لیں۔ کائنات کی ہر شے میں تغیر انسان کے اپنے آپ میں تغیر۔ کہا کہ جس میں تغیر آتا ہے۔ جو **فَانٍ** ہے' جو **ہَالِکٌ** (28:88) ہے' جو **اٰفِلٌ** (6:56) ہے' وہ معبود نہیں ہو سکتا' وہ مجھ سے بڑا نہیں ہو سکتا۔ اب وہ جو میں نے کہا تھا Exception ہے۔

انسان میں ایک چیز ایسی بھی ہے جو تغیر پذیر نہیں ہوتی' قرآن حکیم نے اسے نفس کہا ہے

یہ چیز میں نے کہی جو ہیگل بھی کہتا ہے' جو مارکس نے بھی کہی ہے' جو آج کا فلسفہ کہتا ہے' اسے سب تسلیم بھی کرتے ہیں۔ لیکن ایک چیز ہے جب ہم آگے جاتے ہیں اور وہ الّا' **کُلُّ مَنۡ عَلَیۡہَا فَانٍ** (55:26) ہر شے میں ہر آن تغیر واقع ہوتا ہے **وَّ یَبۡقٰی وَجۡہُ رَبِّکَ ذُو الۡجَلٰلِ وَ الۡاِکۡرَامِ** (55:27) فنا کے مقابلے میں بقاء کا لفظ آیا ہے یہ **یَبۡقٰی** (55:27) وہاں سے فعل ہے۔ **فَانٍ** کے معنی ہر آن جس میں تغیر آ رہا ہے لیکن ایک ذات ایسی ہے جو تغیر آشنا نہیں ہے' اس میں تغیر واقع نہیں ہو سکتا۔ یہاں سے ہم الگ ہٹ گئے اس فلسفے سے' وہ

فلسفہ خالص مادیت کا رہ گیا۔ ھَالِکٌ (28:88) میں اس نے کہا کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ (28:88) دیکھا یہ اِلَّا۔ ایک شے ایسی ہے جس کے اندر تغیر پذیری نہیں ہے۔ حضرتِ ابراہیمؑ نے جب یہ اُفل کے متعلق کہا کہ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ (6:76) نہیں بالکل نہیں بالکل نہیں میرا جی نہیں رچتا ان کے اوپر۔ تغیر پذیر شے جو ہے میں اس کو نہیں بڑا سمجھتا۔ اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (6:79) میں تو اپنی توجہات کا رخ' اس ذات کی طرف کرونگا جو اس سارے سلسلے جو تغیر پذیر ہے' اسے بھی عدم سے وجود میں لانے والی ذات ہے۔ سیدھی سی بات ہے' وہ تو تغیر آشنا ہو ہی نہیں سکتی۔ وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (6:79) یہاں لفظ آیا شرک۔ کسی تغیر پذیر شے کو اپنے سے بڑا سمجھ لینا' یہ شرک ہے۔

مادیت سے ہٹ کر نظریات زندگی میں کلمات اللہ کے تحت اِلَّا کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا

کسی شے کے متعلق یہ کہنا کہ وہ تغیر پذیر ہے ہی نہیں اس کائنات کے اندر' یہ کفر ہے Materialism ہے' مارکس ازم ہے۔ اس میں یہ جو الاّ نے کیا ہے وہ اِلَّا سے پہلے تک جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہی قرآن کہہ رہا ہے کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ Exception (28:88)' کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ (55:26)' افِل (6:76) ٹھیک ہے۔ وہ الاّ پہ نہیں آتے اور جب تک لا کے ساتھ یہ اِلَّا نہیں' آتا تخریب ہی تخریب ہوتی ہے۔

لا و الّا برگ و سازِ کائنات

خود انسانی جسم یا سسٹم کے اندر اگر لا ہی لا وہ ہو یعنی ہر آن وہ جو سیلز ہیں' وہ فنا ہی ہوتے' رہیں تباہ ہی ہوتے رہیں' ختم ہی ہوتے رہیں اور اس کی جگہ تعمیری سلسلہ اِلَّا کا نہ ہو تو یہ ختم ہوگیا' شے ہی نہیں رہتی۔ اِلَّا۔ اب ان کے فلسفے میں ہم جہاں سے الگ ہٹے ہیں' وہ اس اِلَّا سے الگ ہٹے ہیں کہ نہیں! ایک ذات ایسی بھی ہے' جس میں تبدیلی نہیں ہے۔ یہ تو ساری چیز کہی اس نے اس سارے کائنات کے متعلق۔ اب جہاں تک انسان کا تعلق ہے' میں نے عرض کیا تھا کہ ہیگل نے کہا تھا کہ کوئی تصور کوئی نظریہ کوئی فکر کوئی آئیڈیا ایسا نہیں ہے کہ جس میں تغیر نہ آتا ہو' ہر آن اس میں تغیر آتا چلا جاتا ہے۔ قرآن نے کہا کہ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (6:34) خدا کے دیے ہوئے نظریاتِ زندگی وہ ہیں جس میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ ہیگل کے فلسفے کے بعد بھی اِلَّا' مارکس کے فلسفے کے بعد بھی اِلَّا اور یہ اِلَّا ہے جو دین تک ہمیں لے جاتا ہے۔ صرف خدا کے متعلق اگر یہ مانا جائے کہ اس میں Change نہیں ہوتا' تغیر نہیں ہوتا وہ کہیں ہے' کچھ فرق نہیں پڑتا۔ صرف یہ چیز ہے کہ کائنات کا یہ جو میٹریل سلسلہ ہے اس سے ایک چیز کی Exception آپ کر رہے ہیں' ٹھیک ہے۔ فرق کہاں جاکے پڑتا ہے؟ جہاں آپ نظریاتِ زندگی میں سے کسی کے متعلق یہ کہیں کہ یہ غیر متبدل ہے' یہ کبھی نہیں بدل سکتی۔ وَتَمَّتْ کَلِمَتُ

رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ (6:115) مکمل ہوگئے کسی اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔اصل چیز ہے لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (6:34)' لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (10:64) یہ غیر متبدل ہیں ان میں Change نہیں آ سکتا۔اور یہ کلمات اللہ یہ قرآن کے دیے ہوئے اصولِ حیات ہیں جن کا تعلق ہمارے ساتھ ہے۔یہ خدا کے ماننے والی بات جو میں نے عرض کی تھی نا اس کی نہیں' یہ جو خدا کا دیا ہوا ضابطۂ زندگی یہ اصولِ حیات یہ ہدایت راہنمائی جو ہے اس کے متعلق یہ چیز کہ یہ غیر متبدل ہے' اس میں Change نہیں آ سکتا۔ہیگل کا فلسفہ یہاں غلط ہے' مارکس کا فلسفہ وہاں غلط تھا کہ ایک ذات ایسی ہے جس میں Change نہیں' ہیگل کا فلسفہ یہاں ہے۔

ایمان لانے کا تمام تر دارومدار خدا کی طرف سے ملنے والے غیر متبدل اصولوں کو تسلیم کرنے پر موقوف ہے

یہاں سے ایک انسان مومن ہوتا ہے ایمان لانے والا' یہاں سے وہ کہہ سکتا ہے کہ میں توحید پرست ہوں۔اس لیے توحید کے معنی ہیں ایک شے' اس جیسی دوسری نہ ہو۔یہ جو غیر متبدل ہستی ہم نے کہا ہے' وہ صرف ایک ہے' وہ جسے خدا کہا جاتا ہے' دو نہیں ہیں۔اسے کہتے ہیں توحید۔اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے' یہ صرف قرآن کی وحی ہے کہ جو غیر متبدل ہے اس کے ساتھ کوئی اور نہیں ہے جو غیر متبدل ہو یہ توحید ہے ہمارے لیے۔اب آپ نے سمجھا کہ توحید کیا ہوتی ہے اور شرک کسے کہتے ہیں۔یہ تھی چیز جو حضرتِ ابراہیمؑ نے پیش کی۔آپ دیکھئے کہ یہ جو عملی تعلق ہے توحید کا وہ ہم سے کیا ہے۔

دل ونگاہ کی ہم آہنگی کے بغیر ایمان ایمان ہی نہیں کہلاتا

یہی سورۃ قصص کی آیت جو 88 ہے اسے پھر سامنے لائیے۔بات یہاں سے شروع ہوتی ہے وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ (28:88) خدا کے ساتھ کوئی ایسی ہستی نہ شامل کرو جسے تم اپنے سے بڑا تصور کرو۔لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (28:88) کوئی نہیں کائنات کے اندر ایسی ہستی سوائے اس کے۔دیکھا آپ نے ان کی نفی کر کے اس کا اثبات کرتا چلا جا رہا ہے اِلَّا ھُوَ۔کیوں نہیں ایسی بات اور کیوں وہی ہے ایسا جیسا کہا جاتا ہے۔اس لیے کہ کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ (28:88) ہر شے تغیر پذیر ہے صرف اس کی ذات ہے جو تغیر پذیر نہیں ہے۔اچھا جی! وہی لفظ 'مان لیا'۔کہا 'مان لیا والی بات نہیں ہے! لَہُ الْحُکْمُ (28:88) حکومت تمہارے اوپر صرف اس کی ہو سکتی ہے۔یہ ہے توحید۔اتنی سی بات جو ہے 'مان لیا' ہوتا کیا ہے اس سے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل

فلسفیانہ بحث چلی آ رہی تھی کہ تغیر پذیر ہے ہر شے کائنات کی' ہر تصور لیکن ایک ہستی ایسی ہے جو تغیر پذیر نہیں ہے خالصتاً فلسفیانہ بحث تھی جسے یہ شخص کس انداز میں کہہ جاتا ہے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مسلماں کے کیا معنی ہیں؟ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (40:66) ہم خدا کے بتائے ہوئے ان کلمات کے سامنے جھکتے ہیں۔ مسلم کے معنی یہی ہوتا ہے، ماننا نہیں صرف وہ بات رہی۔ ماننا جو ہے وہ ٹھیک ہے، ذہن کی تطہیر بھی نہایت ضروری ہے یعنی فکری طور کے اوپر بھی کوئی باطل نظریۂ زندگی جو ہے وہ آپ کے ذہن میں نہیں ہونا چاہیے۔ بالکل صداقت ہونی چاہیے۔ لیکن اس سے انسان کی عملی زندگی جب تک اگلا قدم نہ ہؤا اس کا فائدہ کچھ نہیں ہوتا۔ اگلا قدم یہ ہے کہ وَ اَنَـا اَوَّلُ الْـمُسْـلِمِیْنَ (6:163) رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (6:163)۔ یہ ماننے کے بعد کہ ہر شے افل ہے خدا کی ذات کے سوا یہ مان لیا ہے، یہ کافی نہیں ہے مان لینا۔

خدا تعالیٰ اجتماعی طور پر احکام خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی تاکید کرتا ہے

اَنَـا اَوَّلُ الْـمُسْـلِمِیْنَ (6:163) یہ تین لفظوں کے اندر بھی میں کیا کہوں کیا کیا چیزیں وہ کہہ گیا ہے۔ سب سے پہلا اس پیغام کو دینے والا، پیغام کا دینے والا جب تک اس پیغام کے سامنے خود نہیں جھکتا، کوئی اس کی بات نہیں مانتا۔ اَوَّلُ الْـمُسْـلِمِیْنَ (6:163)۔ آپ نے یہ دیکھا کہ یہ یہاں مسلمین جمع کا صیغہ کیوں لایا ہے؟ اس لیے کہ مذہب انفرادی چیز نہیں ہے۔ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا مانتا ہوں میں خدا کو واحد، ایک فرد اپنے طور پہ جنگل میں بیٹھا ہوا، غار میں بیٹھا ہوا، پہاڑ کی چوٹی پہ بیٹھا ہوا، دریا میں کھڑا ہوا، وہ مذہب کی جتنی بھی ریاضتیں آپ کے ہاں کی ہیں، انفرادی ہیں۔ لیکن خدا کے دین کے سامنے جھکنا یہ انفرادی نہیں ہے یہ جماعتی چیز ہے یہ اجتماعی چیز ہے یہ نظام ہے زندگی کا جو مل کے بنتا ہے اس لیے اَنَـا اَوَّلُ الْـمُسْـلِمِیْنَ (6:163) کہا ہے۔ اللہ اکبر۔ میں اکیلا ہی اگر مسلم رہونگا ساری عمر تو کچھ بات نہیں بنے گی۔

خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد نبی اکرم ﷺ کا اگلا قدم ہم آہنگ افراد کی بنیاد پر جماعت کی تشکیل

اب میرا اس کے بعد اگلا کام یہ ہے کہ ایک جماعت کی تشکیل ہو جائے۔ اسی لیے اسے کہا یٰٓـاَیُّهَـا الْـمُزَّمِّلُ. قُمِ (73:1-2)، یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ. قُمْ (74:1-2) اگلا فریضہ عائد ہو گیا پہلا مسلم ہونے کے بعد: اب ہم آہنگ ساتھی ڈھونڈو۔ اجتماعی چیز اس پہ آ گئی۔ کا ہے کے لے؟ لَهُ الْحُكْمُ (28:88) یہ ہے عملی نتیجہ توحید کا۔ لہٗ صرف اسی کا حکم۔ انفرادی طور پہ تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جنگل میں بیٹھا ہوا غار میں بیٹھا ہوا ایک فرد وہاں گناہ ہی نہیں کر سکتا، ثواب کا تو تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ فریب ہے اپنے آپ کو دیے چلا جائے۔ یہ پُن کے کام ہو رہے ہیں آتما بڑھ رہی ہے، پرماتما قریب آ رہا ہے، قربِ الٰہی ہو رہا ہے، روحانیت جاگ رہی ہے۔ اپنے ذہن کے تصورات ہیں

کرتا چلا جائے۔ لَہُ الْحُکْمُ (28:88) حکومت قائم ہوگی اس کی۔ پھر یہ ذہنی بات ہوگئی۔ عملاً یہ کیا چیز ہے؟ وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (5:44) ہم نے یہ جو نازل کیا ہے ضابطۂ ہدایت' جو اس کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے' انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ وہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (6:163) کی بات یہاں آ گئی۔ اب یہ تو ایک فرد نہیں کرسکتا۔ یہ تو ایک جماعت کرے گی۔ یہ ہے توحید عزیزانِ من! اور یہ ہے شرک۔ کائنات کی کسی شے کو انسانوں سمیت ایسا سمجھنا کہ ان کے سامنے جھکا جائے' یہ شرک ہے۔

سب سے بڑا ظلم' شرک ہے جو انسان کو انسانیت کے مقام سے گرا دیتا ہے

شرک سے ہوتا کیا ہے؟ انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے' یہ اپنے مقام سے گر جاتا ہے۔ ان اشیاء کا جو اصل مقام ہے' اس سے اونچا لے جاتا ہے اور خود اپنے مقام سے نیچے گر جاتا ہے۔ یہ وجہ' تذلیلِ انسانیت ہے' جسے شرک کہا جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ لفظِ ظلم جو ہے' ابھی آتا ہے اس لیے میں نے کہا آپ کو سمجھا دوں۔ اشیائے کائنات یا خود انسانوں کو ان کے مقام سے اونچا لے جانا' یہ شرک ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ Natural اس کا جو نتیجہ ہے وہ یہ کہ انسان اپنے مقام سے نیچے گر جاتا ہے۔ کسی شے کا اپنے اس اصلی مقام پہ نہ رہنا جہاں اسے رہنا چاہیے خواہ اس سے اونچا آپ کردیں خواہ اس سے نیچا کردیں' اسے ظلم کہتے ہیں۔ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (31:13) قرآن کہتا ہے سب سے بڑا ظلم دنیا کے اندر شرک ہے۔ شرک کیا ہے؟ کسی شے کو اس کے صحیح مقام پہ نہ رکھنا۔ اشیائے کائنات ساری تمہارے تابع تسخیر ہیں' ان کو اپنے سے بڑا دیوی دیوتا سمجھنا' شرک ہے۔

انسانی مدارج کی بنیاد انسان کے کریکٹر سے مشروط ہوتی ہے

سارے انسان یکساں طور پہ واجب التکریم ہیں۔ کسی ایک کو اپنے میں سے اتنا بڑا سمجھنا اور اس کے سامنے جھکنا' یاد رکھئے اس کے جو جوہر ہیں' اس کی بناء پہ اس کی عزت کرنا' اس کی تکریم وہ اور شے ہے لِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (6:132) قرآن کہتا ہے یاد رکھو! مدارج قائم ہوتے ہیں انسان کے کریکٹر کے اعتبار سے' جوہر کے اعتبار سے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (49:13) جو سب سے زیادہ فرائضِ خداوندی کے اوپر عمل کرنے والا ہے' سب سے زیادہ واجب العزت ہے۔ یہ معاشرے کے اندر ایک دوسرے کی عزت' تعظیم' تکریم اس کے پہلو ہیں۔ جھکنا اور بات ہوتی ہے۔ محکومیت ہے اپنے آپ کو اس کے سامنے ذلیل سمجھنا' اس کو حاکم سمجھنا۔ یہ وجہ' تذلیلِ انسانیت ہے' یہ شرک ہے عزیزانِ من!۔ اب انسان کو اس کے صحیح مقام سے آشنا کرنا جو قرآن نے آ کے کیا ہے یہاں۔ اسی لیے انہوں نے کہا کہ اَفَلَ (6:76) کو اپنے سے بڑا سمجھنا یہ وجہ' تذلیل انسانیت ہے اس لیے میں نہیں اسے پسند کرتا۔ اور جب میں نے اس چیز کو جھٹک کے رکھ دیا تو پھر مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (6:79) میں اب مشرک نہیں ہوسکتا۔ وَ حَآجَّہٗ قَوْمُہٗ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ

فِی اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰنِ (6:80) اس قوم نے ان کے ساتھ یہ۔ حَآجَّهٗ کے معنی عام لفظ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کچھ حجت بازی کی' کچھ بحث کی۔ اس کے معنی کسی کو اس کے ارادے سے باز رکھنا ہوتا ہے۔

اچھا! تو تم یہ کوشش کر رہے ہو کہ جو میں کہہ رہا ہوں کہ کسی دوسرے کے سامنے نہیں جھکا جائے گا' تم اس سے مجھے روکنا چاہتے ہو۔ باپ نے روکا تھا کہ اگر تم باز نہ آئے اپنی اس روش سے تو میں تمہیں سنگسار کرا دونگا' جلاوطن کر دونگا۔ بادشاہ نے یہ چیز کہی تھی کہ میرے اختیار میں ہے کسی کو زندہ رکھنا اور کسی کو مار دینا' موت اور زندگی میرے اختیار میں ہے۔ یاد ہے بادشاہ کے ساتھ مکالمہ (2:258)۔ قوم نے کہا تھا کہ اس نوجوان کو جو اس قسم کا زہر پھیلا رہا ہے پکڑو' زندہ جلا دو اس کو۔ دیکھ رہے ہیں کیا چیزیں سامنے آتی ہیں' اس کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے۔ کہا کہ میں اپنے ارادے سے باز آ جاؤں وَ قَدْ هَدٰنِ درآں حالیکہ خدا نے مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے۔

تیرہ سو سال سے بے ہنگم مسائل میں الجھی ہوئی ملتِ اسلامیہ کی حالت زار

عزیزانِ من! جس کے سامنے سیدھا راستہ آ جائے وہ کبھی بھی اپنے ارادے سے باز رہ نہیں سکتا یہ ہیں ہدایت کے معنی۔ کھڑے ہیں ہم مسجد میں باوضو' خدا کے کعبے کی طرف منہ کیے ہوئے کہہ رہے ہیں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5) ''نالے کُھر کن ڈئے نیں''۔ بات ساری یہ ہے کہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنی چاہیے یا نہیں پڑھنی چاہیے' ساری بحث تیرہ سو سال میں اس پہ چلی ہوئی ہے کہ باجماعت امام کے پیچھے مقتدیوں کو یہ سورۃ فاتحہ پڑھنی چاہیے یا نہیں پڑھنی چاہیے۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ ہم کہہ کیا رہے ہیں کچھ نہیں ان کو علم کہ جب ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ (1:4) ہم تیرے سوا کسی اور کی حکومت نہیں برداشت کریں گے تو کتنا بڑا اعلان ہے انقلابی' اہلِ حدیث ہیں تو انہوں نے فاتحہ پڑھ لی' انہوں نے کہا سبحان اللہ نماز ہو گئی' تیری نہیں ہوئی' کیوں؟ انہوں نے امام کے پیچھے فاتحہ پڑھی نہیں ہے۔ انہوں نے کہا ان کی نہیں ہوئی' کیوں جی؟ انہوں نے امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھ لی ہے۔ اس کی ہو گئی اس کی نہ ہوئی۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (107:4-5) تباہی اور بربادی ہے ان نمازیوں کے لیے جو نماز کی غرض و غایت سے تو غافل ہیں هُمْ يُرَآءُوْنَ (107:6) اور جو چیزیں یوں بظاہر نظر آتی ہیں بس اسی کو ثواب سمجھے ہوئے ہیں تباہی ہے ان کے لیے۔ عملاً شرک ہو رہا ہے۔ قَدْ هَدٰنِ۔

شرک کا عمل انسان کے دل و دماغ پر غلامی و پستی اور خوف کے گہرے بادل مسلط کر دیتا ہے

سنئے عزیزانِ من! اگلی بات۔ ذرا سوچئے کہ کائنات میں ایک شخص یہ مانتا ہے کہ کائنات کی کوئی بڑی سے بڑی قوت بھی مجھ سے بڑی نہیں ہے۔ کوئی انسان ایسا نہیں ہے کہ محض اس کے انسان ہونے کی جہت سے اپنا اس کو حاکم تصور کر لوں' اس کا محکوم بن جاؤں۔ قطعاً کوئی انسان ایسا نہیں۔ اب ان کے دل میں کبھی خوف پیدا ہو سکتا ہے ان چیزوں کا؟۔ اور وہ ابھی صرف اس مادی دنیا تک کے لیے ہیں۔

یہ اگلی چیز اگر آ جائے کہ حکومت کا حق بھی کسی کو حاصل نہیں ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ پھر یہ جو چیز کہا ہے اس نے وَ لَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ (6:80) میں ان سے ڈروں!! کیا کہہ رہے ہو۔شرک سے کیا ہوتا ہے انسان کے ساتھ' کہاں گر جاتا ہے؟ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ (22:31) صرف اس ایک ذات کو ایسا ماننا' شرک نہ کرنا۔اور اگلے الفاظ سنئے۔ابھی میں نے کہا ہے کہ شرک سے انسان اپنے مقام سے گر جاتا ہے' ہوتا پھر کیا ہے؟ خوف ہر شے سے خوف۔کہا کہ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ (22:31) جو خدا کے ساتھ شرک کرتا ہے یعنی اس کے علاوہ بھی کسی کو ایسا مانتا ہے کہ مجھ سے بڑا ہے اس سے مجھے ڈرنا چاہیئے' جو ایسا مانتا ہے کہا یوں سمجھئے فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (22:31) یوں سمجھو کہ وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پہ آ گرا ہے۔یہ آسمان کی بلندیاں کیا ہیں؟ یہ انسان کا مقام ہے اپنا' آسمان کی بلندیوں پہ ہے' یہ ساری کائنات سے اونچا۔شرک کیا یعنی کسی اور ہستی کو اس نے اپنے سے زیادہ بڑا سمجھا' اس سے ڈرا' قرآن کہتا ہے آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پہ گر گیا۔پھر گر گیا تو کیا ہوا صرف چوٹیں ہی آئیں' کہنے لگے نہیں! کہا' تم نے کبھی چڑیا کے نوزائیدہ بچے کو گھونسلے سے نیچے گرتے ہوئے دیکھا ہے' کہا کیا ہوتا ہے اس سے؟ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ (22:31) جونہی وہ اپنے گھونسلے سے نیچے گرتا ہے چیل آتی ہے' جھپٹ کے لے جاتی ہے اس کو' کہتا ہے اس کی حالت یہ ہو گئی ہے۔ہر شکاری اس انسان کو جھپٹ کے لے جاتا ہے جو اپنے مامن سے گر جاتا ہے۔مامن کے معنی گھر ہی نہیں' جائے امن ہے۔جس مقام میں اسے امن ہی امن تھا وہاں سے یہ نیچے گرا' پہلے تو بلندی سے نیچے پستی پہ گرا' یہی کوئی چھوٹی چیز نہیں تھی اور اس کے بعد یہ کہ اتنی بے کسی اور بے بسی کہ گرا تو چڑیا کے نوزائیدہ بچے کی طرح پڑا زمین پہ اور چیل آئی اور جھپٹ کے لے گئی۔یہ تو پھر بھی اس سے زیادہ ایک قوت والا ذی حیات تھا کہ جس نے جھپٹ لیا۔کہا اس سے بھی زیادہ ذلیل اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (22:31) یہی نہیں' اس کی کیفیت اس گھاس کے تنکے کی سی ہوتی ہے کہ ہوا کا تیز جھونکا جدھر کا آئے اُدھر اڑا کے لے گیا۔یہ آیا اُدھر لے گیا اُدھر جھونکا آیا ادھر لے گیا۔کشتی کا لنگر ٹوٹ گیا' ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ' یعنی یہ نہیں کہ ہر جھونکے کے ساتھ اڑ گیا' ہوا کا ہر جھونکا اس کو اڑا کے لیے چلا جاتا ہے۔اڑنے میں بھی بے بسی ہے اس کی۔شرک سے یہ ہوتا ہے۔تم سمجھتے ہو کہ شرک میں خوف کتنا بڑا ہوتا ہے' انسان کا کچھ اپنا رہتا ہی نہیں ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک شرک کا ماحصل اور لفظ تقویٰ کا مفہوم

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
جب جھکا تو غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (22:31)

کہا وَ لَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ (6:80) مجھے خوف؟ تمہارے نزدیک یہ بڑے بڑے معبود ہونگے میں ان کو پرکاہ جتنی حیثیت نہیں دیتا۔ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْئًا (6:80) ٹھیک ہے ڈرنے کی ایک چیز ہے اور وہ یہ کہ قانونِ خداوندی کے خلاف کوئی چیز نہ ہو جائے' اس سے نقصان پہنچتا ہے۔ وہاں ڈر کے معنی محتاط رہنا ہوتا ہے۔ جب اگنی کو دیوی سمجھا تھا ہندو نے یا جن قوموں نے' وہ اس آگ سے ڈرتا تھا۔ ہم آگ میں انگلی نہیں ڈالتے۔ ہم آگ سے ڈرتے نہیں محتاط رہتے ہیں۔ یہ جو قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی سے احتیاط برتنا ہے' اسے عربی زبان میں تقویٰ کہتے ہیں۔ اس کے بنیادی معنی ہی احتیاط برتنے کے ہیں' اپنے آپ کا بچاؤ کرنے کے ہیں۔ دیکھئے اس میں خوف نہیں ہوتا' اس میں احتیاط ہوتی ہے۔ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْئًا (6:80) میں نے عرض کیا ہے نا تراجم سے نہ دیکھا کیجیے قرآن کو' مفہوم سے تو بات کچھ سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اصل شے تو یہ ہے کہ براہِ راست آپ اس پہ آئیں لیکن اس پہ تو ایک عمر صرف کرنی پڑتی ہے عزیزانِ من! یونہی نہیں بات بن جاتی۔ مفہوم سمجھ لینے سے بات بن جاتی ہے۔

مذکورہ تراجم اور قرآن حکیم کی آیات کے حقیقی مفہوم کی واضح اور دوٹوک مثال

ترجمے آپ دیکھیں تو لکھا ہوا ہوگا کہ جن چیزوں سے تم شرک کرتے ہو میں ان سے ڈرتا نہیں مگر ہاں! جو اللہ چاہے تو۔ یعنی اللہ اگر چاہے کہ میں ڈر جاؤں تو پھر تو میں ڈر جاؤنگا۔ یعنی جنہیں تم معبودانِ باطل بنائے ہوئے ہو' میں تو نہیں ڈرونگا "سیدھی جئی گل اے' لیکن اگر وہ کہے گا تو پھر تو ڈرنا ہی ہوگا۔ یہ آیت کا ترجمہ ہے۔ عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ اِلاّ یہاں جو ہے اس استثنائے منقطع ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو پیچھے کہا جا رہا ہے بالکل وہ نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے۔ یہ ہوتا ہے اس سے مفہوم۔ جن چیزوں کو تم اس کے ساتھ معبود بنا رہے ہو' میں قطعاً اس سے نہیں ڈرتا البتہ یہ چیز ہے کہ قانونِ مشیت کی خلاف ورزی سے ضرور ڈرتا ہوں اس کے نتائج سے خائف ہوں اس سے محتاط رہتا ہوں کہ نہ کروں۔ دیکھا آپ نے کہاں سے کہاں بات گئی۔ وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا (6:80) اس لیے کہ یہ جتنی چیزیں تم کہہ رہے ہو' یہ خود تغیر پذیر ہیں' ان کا علم بھی تغیر پذیر ہے۔ ایک وہ ذات ہے جس کا علم چھایا ہوا ہے ہر شے کے اوپر۔ اس لیے وہ اگر یہ کہتا ہے کہ یہ نقصان دہ ہے تو وہ واقعی نقصان دہ ہوگی۔ اور اگر اسے میں کرونگا تو پھر مجھے واقعی ڈرنا چاہیے اس کے نتائج سے' اس لیے میں محتاط رہونگا۔ پتہ ہے آگے بات کیا کرتا ہے اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ (6:80) کیا اس پہ غور و فکر کر کے تم بات سمجھتے نہیں ہو میں کیا کہہ رہا ہوں تمہیں۔ اور اب دیکھئے کیسے مخاطب کرتے ہیں آپ کو۔ وَ كَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَ لَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا (6:81) میں ان سے کیا ڈرونگا' شے کیا ہیں یہ تمہارے یہ بڑے بڑے بت جن کو تم نے خدا بنا لیا ہے۔ تم دیکھو گے کل ہی ایک فرد آئے گا اور ان تمام کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے گا۔ ان سب سے بڑا تمہارا جو خدا ہے' وہ بیٹھا ہوا ٹک ٹکی باندھ کے دیکھ رہا ہے نہ بچا سکتا ہے اپنے چھوٹوں کو' نہ اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ ڈروں!! ان سے ڈروں اس باپ سے

ڈروں، قوم سے ڈروں، اس بادشاہ سے ڈروں یہ۔کوئی قوت نہیں۔ بادشاہ کو کیا کہا تھا اس نے؟ کہا یہ تھا کہ قوت کے مالک ہو تم، ہاں بہت بڑی قوتوں کا مالک ہوں۔ کہنے لگے سیدھی سی بات ہے کہ یہ سورج ہر صبح مشرق کی طرف سے نکلتا ہے اس کو مغرب کی طرف سے نکال دو۔کاٹ کے رکھ دیا۔قوم نے کہا تھا ان بتوں سے، کہا چار دن کے لیے ذرا ٹھہر جاؤ، سامنے آ جائے گا۔مانو ان کو یہ جو سامنے ہیں تمہارے ان کو معبود، کہنے لگا یہ تو دس منٹ کی بات ہے ابھی ڈوب گیا، ان سے ڈروں!!۔وہی دیکھئے۔

عبدِ مومن قلبی اور ذہنی طور پر ہمیشہ مطمئن ہوتا ہے

عزیزانِ من! شرک اور خوف کی بات جو ہے۔شرک کا لازمی نتیجہ خوف ہے۔توحید کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عبدِ مومن کا قلب جو ہے اس میں خوف نہیں ہوتا وہ احتیاط برتتا ہے قانونِ خداوندی سے۔مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِهٖ عَلَیۡکُمۡ سُلۡطٰنًا (6:81) خدا کی طرف سے اس کے لیے کیا سند تمہارے پاس آئی ہے کہ ان کے پاس واقعی کوئی قوت ہے۔آگے ہے کہنے لگے سوچو جو میں کہہ رہا ہوں فَاَیُّ الۡفَرِیۡقَیۡنِ اَحَقُّ بِالۡاَمۡنِ (6:81) سوچو کہ یہ جو دو جماعتیں دو فریق ہیں، ایک وہ ہے کہ جو کائنات میں چھوٹی سی چھوٹی چیز کے سامنے بھی جھکتا ہے ڈرتا ہے گڑگڑاتا ہے، اس کی پرستش کرتا ہے، بادشاہ کو ظل اللہ سمجھ رہا ہے۔اور ایک وہ ہے جو ان تمام چیزوں کے متعلق کہہ رہا ہے کہ ان میں کوئی قوت نہیں ہے، کائنات کی ہر شے میرے تابع تسخیر ہے، انسان سب برابر کے ان میں سے کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے۔کہا بتاؤ تو سہی ان دونوں فریقوں میں سے کون ہے جو مستحق ہے اس چیز کا کہ اسے خوف نہ ہو۔امن کا مستحق ہے۔آپ کو پتہ ہے کہ یہ لفظ ایمان جس کا ترجمہ ہم نے Faith اور Belief رکھ لیا ماننا اردو میں کہہ دیا۔اس کا تو مادہ ہی امن ہے ا م ن۔ایمان سے بھی امن اگر نہیں نصیب ہوتا تو پھر شرک سے امن نصیب ہوگا؟۔خدا کی ایک صفت المؤمن بھی ہے۔کیجیے ترجمہ ایمان لانے والا یعنی اللہ میاں ایمان لانے والے۔ المؤمن: امن دینے والا۔صرف اس کے قوانین کی اطاعت سے امن مل سکتا ہے اور کسی سے نہیں اور وہ اگر کی جائے تو اس کے بعد امن نصیب ہوتا ہے خوف نہیں۔اور جونہی خوف آپ کے ذہن میں آیا، سمجھ لیجیے کہیں شرک واقع ہوگیا۔اور آپ دیکھتے ہیں کہ اپیل کس چیز کو کر رہا ہے یہ قرآن۔حضرتِ ابراہیمؑ کی بات ہو رہی ہے فَاَیُّ الۡفَرِیۡقَیۡنِ اَحَقُّ بِالۡاَمۡنِ (6:81) کونسا دونوں میں سے گروہ ہے جو زیادہ مستحق ہے امن کا۔یہاں امن بطور بخشش یا خیرات کے نہیں مل رہا۔آپ نے لفظِ احق پہ غور کیا، یہ کیا معنی ہیں؟ حقدار ہے As of right وہ امن لیتا ہے۔او میرے عزیزو! قرآن کے لفظوں پہ غور کیا کرو یوں نہ گذر جایا کرو۔احق اس کو As of right امن ملے گا۔بتاؤ دونوں میں سے کون ہے جو کہہ سکتا ہے کہ ہم مستحق ہیں، میں ہوں امن کا مستحق۔کہا کس طرح سے بات سمجھ آئے گی؟ کہا سیدھی سی بات ہے میں تمہیں کوئی Belief , faith ایسا نہیں کہتا۔اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ (6:81) علم کی بارگاہ سے جا کے پوچھ لو میں بھی پوچھتا ہوں تم بھی پوچھ لو دیکھو تو سہی کس کے حق میں وہ فیصلہ دیتا ہے۔علم کی بارگاہ سے۔

پرویزؒ کے نزدیک نوجوان نسل کے لیے کالج کا وہ خواب جو پورا نہ ہوسکا

عزیزانِ من! آپ کو یہ جو فلسفہ تھا مغرب کی مادیت کا' ہیگل کا بھی اور اسکے بعد مارکس کا بھی وہ اس ضمن تک میں نے بیان کیا کہ وہ ہر شے کے اندر تغیر کو مانتے ہیں' ثبات نہیں مانتے۔ یہ درس ایسا مقام نہیں ہوتا کہ میں آگے اس کی تردید کر کے آپ کو بتاؤں کہ فلسفیانہ اعتبار سے وہ کتنا غلط ہے اور صحیح کیا ہے۔ میرے ذہن میں ہے یہ بات اور شاید کوئی موقع ملے جس میں پورے کا پورا یہی چیز ہو۔ میرے ذہن میں یہ بھی ہے کہ میں کچھ مارکس ازم کے متعلق بات بتاؤں کہ یہ ہے کیا گورکھ دھندا' یہ سوشل ازم شے کیا ہے۔ لیکن اصل مقام تو اس کا وہ نصاب ہوگا' خدا کرے کہ میری زندگی میں مجھے وہ نصیب ہوجائے وہ کالج' وہ طلباء کی جماعت جس کو میں دو چار سال تک ساتھ رکھوں۔ انہیں یہ بھی بتاؤں کہ مارکس ازم کیا ہے اور ہیگل ازم کیا ہے اور یہ فلاسفی کیا ہے' انہیں یہ بھی بتاؤں کہ قرآن کیا کہتا ہے پھر قرآن سمجھ میں آئے گا۔ اور یہ جو اس طرح سے سمجھنے والے ہونگے قرآن کو وہ ہونگے جو کہیں گے فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (2:38)۔ سنئے عزیزانِ من! اگلی بات کیا کہہ گیا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ظلم کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ یہاں تک پہنچ کے حضرت ابراہیمؑ کہتے ہیں اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا (6:82) وہ لوگ جو اس حقیقت کے اوپر ایمان لے آئے کہ انسان کا مقام کیا ہے' کائنات میں اس سے اونچا کوئی نہیں' غیر متبدل ذات ہے صرف ایک خدا کی۔ اور جہاں تک میرا تعلق ہے خدا کے ساتھ اس کے وہ کلمات ہیں وہ اس کے نظریاتِ حیات ہیں' وہ ہدایت اس کی طرف سے ہے لَا مُبَدِّلَ جس میں تبدیلی نہیں ہے۔ یہ ہے میرا ایمان اور اس ایمان کی بناء پر میں اپنے آپ کو توحید پرست یا مومن کہہ سکتا ہوں۔ کہا سنو الذين اٰمنوا وہ لوگ جو اس صداقت کے اوپر ایمان لے آئے۔ اگلے الفاظ ہیں وَ لَمۡ يَلۡبِسُوۡۤا اِيۡمَانَهُمۡ بِظُلۡمٍ (6:82) لفظی ترجمہ جو کیا جاتا ہے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ ملبس نہ کیا۔ لبس کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کو لپیٹ دینا کسی دوسری چیز کے ساتھ۔ ایمان کو ظلم کے ساتھ التباس نہیں اس نے کیا' خالص ایمان کو رکھا' ظلم کے ساتھ التباس نہیں کیا۔ محض یہ لفظ ظلم کا ترجمہ تو ہمارے ہاں ظلم ہی ہوتا ہے یہ ترجمہ کر دیجیے اور پھر دیکھئے تو سہی کہ اس آیت کا کیا مفہوم آپ کے سمجھ میں آتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو کہا جاتا ہے۔

کائنات کی ہر شے انسان کے سامنے ساجد ہے لہٰذا اسے اسی مقام پر رکھنا ہوگا

آپ کے ہاں ایک حدیث میں بھی آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ظلم کے معنی شرک ہے۔ لفظ تو ظلم ہے اب وہ ظلم کے معنی میں نے ابھی عرض کیے تھے جس شے کو جس مقام پہ ہونا چاہیے اسے اس مقام پہ نہ رکھنا۔ اشیائے کائنات تمہاری ساجد ہیں' انہیں اس مقام پہ نہ رکھنا اپنے سے اونچا سمجھ لینا' یہ ظلم ہے۔ تیرا مقام یہ ہے کہ تو ان تمام چیزوں سے اونچا ہے۔ انسانوں کی جہت سے بھی ہر انسان یکساں ہے۔ اپنے آپ کو اس سے نیچے لے آنا یہ بھی ظلم ہے۔ کسی شے کو وہاں نہ رکھنا جہاں اسے رہنا چاہیے' جو اس کا مقام ہے اس مقام سے

اونچا لے جانا بھی ظلم، اس سے نیچا لے جانا بھی ظلم۔ دیکھئے یہاں کیا کہا گیا ہے کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور پھر انہوں نے اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کو نہیں چھونے دیا یعنی ہر شے کو اس کے اپنے اپنے مقام کے اوپر رکھا۔ **اُولٰٓئِکَ لَهُمُ الْاَمْنُ** (6:82) انہیں امن نصیب ہوگا۔ **وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ** (6:82) یہی ہیں جو کہہ سکتے ہیں کہ ہم صحیح راستے کے اوپر ہیں۔ یہ ساٹھ ستر کروڑ کی دنیا جو آج مسلمان کے نام سے موسوم ہے اس کائنات میں، پوری کسی قوم کو اس کے کسی حصے کو تو ایک طرف رہا، میں پوچھتا ہوں کہ کتنے فرد ان میں نکلیں گے کہ جن کو یہ امن نصیب ہوگا۔ پہلے تو جو ایمان یوں لائے ہونگے پھر اس ایمان کے ساتھ ظلم کو ملوث نہیں کیا ہوگا۔ اور پھر ان کو **اُولٰٓئِکَ لَهُمُ الْاَمْنُ** (6:82) اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ انہیں امن نصیب ہو اس لیے کہ وہ صحیح راستے کے اوپر ہیں۔ یہ ہے توحید اور یہ ہے شرک عزیزانِ من!۔ یہ تھی حضرت ابراہیمؑ کی وہ داستاں یا ایک واقعہ جو چلا آ رہا تھا۔ **وَ تِلْکَ حُجَّتُنَآ اٰتَیْنٰهَآ اِبْرٰهِیْمَ عَلٰی قَوْمِهٖ** (6:83) یہ تھے وہ دلائل جو ہم نے ابراہیمؑ کو دیے تھے۔ دیے تھے خدا نے یہ دلائل لیکن ان کے اوپر ایک یقینِ محکم حاصل ہوا تھا ابراہیمؑ کو۔ عجیب شخصیت تھی۔ یہ یقین کیسے ہوا تھا حاصل؟ چار آیتیں پیچھے چلے جایئے **وَ کَذٰلِکَ نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (6:75) ہم نے ابراہیمؑ کو اس کارگہ کائنات کا نظم و نسق، جو قوتیں اس میں کارفرما ہیں، کیسے چل رہا ہے، اس میں اقتدار کس کا ہے، قانون کی کارفرمائی کیا ہے، ہم نے یہ چیزیں ابراہیمؑ کو دکھا دی تھیں۔ صحیح یقین رکھنے والا تو ایک سائنٹسٹ ہو سکتا ہے جسے **مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (6:75) کا معلوم ہو۔ یہ کیا تھا، پتہ نہیں کن کن وادیوں میں سے یہ حضرات گذرتے تھے۔ ایمان کے بعد وہ یقین والی بات ہے **وَ لِیَکُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ** (6:75) کہا ہے کہ وہ یقین والوں میں سے ہو جائیں۔ یہاں یہ کیفیت ہے ابراہیمؑ کی کہ وہ یونہی نہیں بات کو مانتے تھے جھک جاتے تھے۔

خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں حضرت ابراہیم کا اپنی قوم کے بارے میں ایک سوال اور پھر خدا تعالیٰ کا جواب

جب ان سے کہا گیا کہ جاؤ اس قوم مردہ میں زندگی پیدا کرو۔ بہت کچھ غور خود کیا کہا کہ نہیں **رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی** (2:260) یہ ار کا لفظ آتا ہے قرآنِ کریم میں محسوس طریقے کی کسی چیز کو سمجھانے کے لیے۔ مجھے بتا، تو جو کہہ رہا ہے کہ اس قوم کو زندہ کر جاؤ، مردوں کی قوم ہے قبرستان میں وعظ کہوں۔ وہاں ہے **کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی** (2:260) پوچھا تھا آگے جا کے کہ **اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ** (2:260) اس بات پہ تجھے ایمان ہے یا نہیں کہ زندہ ہو سکتے ہیں، اسؑ نے کہا کہ ایمان تو ہے مجھے کہ ہو تو سکتا ہے **کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی** (2:260) پوچھتا میں یہ ہوں کہ وہ طریقہ کیا ہے جو میں اختیار کروں جس سے یہ مردہ زندہ ہو جائیں یہ بات سمجھنا چاہتا ہوں۔ **وَ لٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ** (2:260) اس سے مجھے اطمینان ہو جائے گا کہ راستہ صحیح میں نے اختیار کیا ہے۔ جس بچے کو وہ حساب کا قاعدہ یا گر جسے کہتے ہیں، وہ یقینی طور پہ معلوم ہو، جب اسے آپ دیتے ہیں حساب کس یقین اور اطمینان کے ساتھ وہ چلا آ رہا ہوتا ہے اس

کے اوپر۔ایک ایک سٹیپ جو ہے اطمینان کے ساتھ کرتا ہوا کھٹ سے آتا ہے جواب کے اوپر۔اسے کَیۡف کہتے ہیں۔وَ تِلۡکَ حُجَّتُنَآ اٰتَیۡنٰهَآ اِبۡرٰهِیۡمَ عَلٰی قَوۡمِهٖ (6:83)

خدا کے حضور درجات کی بلندی ہمیشہ عمل سے مشروط ہوتی ہے

اگلی بات سنئے عزیزانِ من! نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ (6:83) تم سمجھتے ہو کہ یونہی کسی کے مدارج بلند ہو جاتے ہیں۔ان لوگوں کے متعلق یہ تھا کہ خدا نے سب کچھ یوں دیا' ان کے درجات بلند ہو گئے۔تم نے دیکھا کہ بلندئ درجات حاصل کرنے کے لیے کن کن مراحل میں سے گذرنا پڑتا ہے۔یوں اونچے درجے پہ انسان چڑھتا ہے عملاً ٹکرا و لے کر' پہلے تو اپنے لیے یقین پیدا کرے' ایمان پیدا کرے' یقین پیدا کرے' اطمینان پیدا کرے' سکون پیدا کرے' ٹکراو لے باپ سے ٹکراو لے' بادشاہ سے ٹکراو لے' قوم سے ٹکراو لے۔ اس طرح سے درجات کی بلندی ہوتی ہے۔اِنَّ رَبَّکَ حَکِیۡمٌ عَلِیۡمٌ (6:83)۔یونہی نہیں ہے کہ کل صبح جو بادشاہ مر گیا تھا اور ولی عہد چھوڑ نہیں گیا تھا تو بعد میں سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کریں کیا۔انہوں نے کہا کہ کل صبح سب سے پہلے جو شخص دروازے میں داخل ہو' اس کے سر کے اوپر تاج رکھ دیا جائے۔

مقام نبوت کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ کے احوالِ زندگی

وہ جو ہمارے ذہن میں بھی ایک شاعرانہ تصور ہے کہ خدا کی دین کا۔موسیٰؑ سے پوچھئے احوال کہ آگ لینے کو جائیں' پیغمبری مل جائے۔اور جس نے وہاں دی تھی پیغمبری اس نے ادھار نہیں کیا' انہوںؑ نے کہا کہ آپ کا بڑا شکریہ' انہوں نے کہا موسیٰؑ! یہ یونہی شکریہ نہیں' تجھے پتہ ہے کہتے ہیں یہ جو سنار کی کٹھالی ہوتی ہے وہ آگ جلنے والی جس میں بار بار اس سونے کو یا دھات کو ڈالا جاتا ہے' پگھلایا جاتا ہے' کھوٹ کو الگ کیا جاتا ہے' پھر ڈالا جاتا ہے' ایک Shape دی جاتی ہے' پھر ڈالا جاتا ہے' ہتھوڑے سے کوٹا جاتا ہے پھر دوسری Shape دی جاتی ہے۔اس کو کہتے ہیں۔کہا موسیٰؑ تمہیں پتہ ہے کتنی کٹھالیوں میں سے نکل کے تم اس مقام پہ آئے ہو جو ہم نے سمجھا ہے کہ اب یہ بوجھ تم برداشت کر سکتے ہو۔آگ لینے کو جائیں پیغمبری نہیں وہاں مل جاتی' ان کٹھالیوں میں سے گذرنا پڑتا ہے۔نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ حَکِیۡمٌ عَلِیۡمٌ (6:83) علم والا دانش و حکمت والا ہے' ہر چیز اس بناء پر ہوتی ہے' یہ مقام یوں حاصل ہوتے ہیں۔اور پھر اس کے بعد اس مقام کے اوپر پہنچا تو وہ پھر ذریتِ ابراہیمؑ میں آ گئے۔

نبوت کا دارومدار وراثت کا رہینِ منت نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کا تعلق کسب و ہنر سے ہوتا ہے

یہ عجیب بات تھی کہ حضرت ابراہیمؑ کی آگے ذریت میں بھی نبوت بھی رہی' حکمت بھی رہی' حکومت بھی رہی' ضابطۂ قوانین بھی رہے۔وَ وَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ ؕ کُلًّا هَدَیۡنَا (6:84) دیکھئے یہ نہیں ہوا کہ وہ ابراہیمؑ کے بیٹے تھے' پھر پوتے تھے یہ سارے

تھے تو بس ''فیر ایس طراں جس طراں او مجاور بیہہ جاندا ہیگا'' سوائے اس کے کہ وہ ان کے بیٹے ہیں اور کچھ نہیں' باقی ساری چیزیں وراثت میں آئیں۔ یہ کوئی چیز وراثت میں نہیں آتی۔ ذکر کیا ہے اسحاق و یعقوب کا اور ساتھ ہی یہ بات کہی' کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ بڑے باپ کا بیٹا ہونے کی بناء پہ یہ خود بھی بڑے تھے' كُلًّا هَدَيْنَا (6:84) ہر ایک کو ان میں سے ہم نے صحیح راستے کے اوپر لگا دیا۔ انفرادی طور پہ ان کی کیفیت یہ تھی۔ وَ نُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ (6:84) انبیاء کے نام گنتے چلے آ رہے ہیں۔ یہاں اتنے گننے کے بعد پھر ذہن میں پیدا ہوا کہ یہ پڑھنے والا آیا اس کے ذہن میں یہ کہ ہاں یہ تو موہبت ہے' وہبی طور پہ نبوت ان کو ملی ہے۔ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (6:84) یوں ہم ان لوگوں کو جو Balanced زندگی بسر کرتے ہیں' ان کے اعمال کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ نبوت تو اس میں شبہ نہیں کہ وہبی چیز ہے۔ وہ کوئی اپنے کسب و ہنر سے خدا سے وحی پانا نہیں ہے۔

مقامِ نبوت سیرت و کردار کے آئینہ میں

عزیزانِ من! جنہیں وحی ملتی ہے یہ ریڈیو کا سیٹ نہیں ہوتے' ٹیلی ویژن کا سیٹ نہیں ہوتے کہ خود ان کے اندر کوئی جوہر نہیں' کسی طرح سے کچھ پرزے سیٹ کر دیے ہیں اور پھر اس کے بعد وحی آتی ہے وہ بولتے چلے جاتے ہیں' یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ سیرت اور کردار کی بناء پر بھی ان کا مقام بہت اونچا ہوتا ہے۔ یونہی نہیں نبوت دیدی جاتی کسی کو۔ بڑا اونچا مقام ہوتا ہے ان کا' ان کے جوہرِ ذاتی' ان کی صلاحیتیں' ان کی سیرت' ان کے کردار کی کیفیت۔ سیرت و کردار کی ایک ہی آیت ہے وہ بتا رہی ہے کہ وہ کیا ہے کہ وہ مخالفین کے گروہ میں کھڑا ہو کے یہ کہتا ہے کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (10:16) میں نے تمہارے اندر اپنی زندگی بسر کی ہے کہو کہ یہ زندگی جو ہے عقل و فکر کی رو سے یہ بات کرو جو میں تم سے کہتا ہوں کہو یہ زندگی سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی۔ یہ تو زندگی ہوتی ہے اس کی قبل از نبوت۔ اور اس کی صلاحیتوں کا اور جوہروں کا کیا کہنا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (6:84)۔ وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ (6:85) پھر نام لیے کچھ پھر وہی بات آئی پڑھنے والے کے ذہن میں۔ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (6:86) یہ تمام کے تمام ایسے تھے جن کی صلاحیتیں بڑی بیدار ہو چکی ہوئی تھیں۔ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ يُوْنُسَ وَ لُوْطًا ؕ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (6:86)۔ وَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ اِخْوَانِهِمْ وَ اجْتَبَيْنٰهُمْ وَ هَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (6:87) یہ بھی ان میں انبیاء بھی ہیں ان کی نسل میں ان کے آباؤ اجداد میں سے جن کو نبوت نہیں ملی ہے ان کی بھی یہ کیفیت تھی' صحیح راستے کے اوپر چلتے تھے۔ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (6:88) لیکن یہ نہ سمجھئے کہ یہ ہدایت وہبی طور پہ انہی کو ملی تھی۔ یہاں مَنْ يَّشَآءُ (6:88) کا ترجمہ پھر وہ ہو جائے گا کہ جسے اللہ چاہتا ہے دیدیا۔ یہ سارا کچھ کہ ہم محسنین کو یوں کرتے ہیں' صالحین یہ تھے متقی تھے' یہ

ان کے کریکٹر تھے اور آخر میں ترجمے کا یہ کہ مَنْ يَّشَآءُ کہ جسے ہم چاہتے ہیں پھر ہدایت دیتے ہیں ''تے گل تے اوتھے ای آ گئی''۔ اس چیز کو ذہن سے نکالنے کے لیے تو وہ تین تین چار چار نام لے کے' قدم قدم پہ یہ کہتا تھا کہ کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔ دیکھا آپ نے ترجمہ کہاں لے جاتا ہے۔ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (6:88) ہمارے بندوں میں سے جو چاہتا ہے ہدایت لینا' ہدایت دیتے ہیں کھلی ہوئی ہے یہ چیز جو ہے۔ اور آگے پھر وہی بات آ گئی۔ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (6:88) لیکن یاد رکھو! کہ جو پھر شرک کرتا ہے حَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (6:88)۔

شرک کے مرض میں مبتلا مریض کا علاج اور اس کا انجام

ایک تو وہ ہے کہ جو کچھ کرتا ہی نہیں' افیون کھائی ہے اور لیٹے ہوئے ہیں ان کی زندگی بھی حسرت ناک ناکامیوں کی ہوتی ہے لیکن ایسی نہیں ہوتی جیسی ان کی کہ جو صبح سے شام تک دوڑ دھوپ کرتا رہے' چلتا رہے اور شام کو دیکھے کہ نتیجہ کوئی نہیں نکلا۔ اس کی زندگی بہت زیادہ حسرت ناک ہوتی ہے حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (3:22) مشرک کی زندگی یہ ہے سارا کیا کرایا غارت ہو جاتا ہے۔ وہ بڑے پیمانے کے اوپر تو جو ہوتا ہے' چھوڑ دیجیے' صبح کو ایک Doze ڈاکٹری دوائی کی دی پانچ منٹ کے بعد کہا کہ کچھ فرق نہیں پڑا' ایک گولی حکیم کی بھی ساتھ لے لی' دوپہر تک ہومیوپیتھی آ گیا ''شام نوں پہلوان سدلیا' فیر رات نوں جو کچھ ایس مریض نال بیتے گی او تہانوں پتہ اے''۔ یہ لا علاج نہیں مر رہا' یہ شرک کے ہاتھوں مر رہا ہے۔ حبط اعمال' کیا بات ہے اس لفظ کی بھی!! جانوروں میں مویشیوں میں ایک بیماری ہوتی ہے جو کچھ ان کو دیا جاتا ہے یہ دانہ وانہ وہ جزوِ بدن نہیں بنتا لیکن جھوٹے طور کے اوپر ان کا پیٹ پھولا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی نظر آتے ہیں کہ بہت موٹے ہو رہے ہیں اصل میں جو ان کی غذا ہوتی ہے وہ جزوِ بدن بن نہیں رہی ہوتی۔ یہ کیفیت کہ غذا تو جزوِ بدن نہ بنے اور کسی بیماری کی بناء پہ وہ نظر ایسا آئے جیسے بڑا طاقتور ہے۔ بعض انسانوں کو بھی آپ نے دیکھا ہوگا ''او یار او نظر تے بڑا چنگا موٹا تازہ اوندا ہیگا سی اے دو دن تاپ چڑھیا' ختم ہو گیا''۔ یہ ایک مرض ہوتا ہے غذا جزوِ بدن نہیں بنتی نظر یوں آتا ہے کہ بہت تگڑا ہے' اسے حبط کہتے ہیں عربی زبان والے۔ اور قرآن نے یہ کہا ہے کہ اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا (35:8) یہ وہ لوگ ہیں جن کے برے کام ان کو بڑے اچھے بن کے دکھائی دیتے ہیں۔ وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (18:104) اور وہ اس فریبِ نفس میں مبتلا رہتے ہیں کہ بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ کام کرنے والوں کی کیفیت ہے۔ مشرک کام کرتا ہے لیکن نتیجہ اس کا آخر میں یہ نکلتا ہے۔ کہا یہ لوگ مشرک نہیں تھے۔

نبوت کا مقصد وحی کے عطا کردہ نظامِ حیات کی عملی تشکیل ہے

اُولٓـئِکَ الَّـذِیۡـنَ اٰتَیۡنٰھُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحُکۡمَ وَ النُّبُوَّۃَ (6:89) یہ تھی وہ جماعت جن کے انبیاء کو ہم نے نبوت دی۔ نبوت کے معنی ہیں خدا کی طرف سے وحی ملی جو ایک کتاب تھی۔ انہوں نے یہ کتاب اپنی قوم کو دی۔ وَ الۡـحُـکۡـمَ (6:89) دیکھئے یہ لازم وملزوم چیز ہے کتاب اور حکم۔ نبوت نبی کو ملے اور اس کی عطا کردہ کتاب اس کی امت کے پاس ہو' کتاب کے ساتھ حکم ضروری قرار دیا ہے یہاں۔ اس لیے کہ عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد' پھر یہ چیز وعظ رہ جاتی ہے۔ دو گھنٹے تک یہ کچھ کراتے' ڈراتے بھی ہیں کہ وہاں جہنم میں جاؤ گے بلکہ جہاں سے یہ مرجاتا ہے قبر میں شروع ہو جاتے ہیں ''اودھروں پہلاں نئیں'' وہ ہو گا وہ ہو گا۔ اور سارا کچھ کہنے کے بعد کہ دیکھو بھئی خدا کے لیے تم ان چیزوں کو چھوڑ دو۔ وعظ کہہ رہے ہیں' منتیں کر رہے ہیں۔ وَ الۡـحُـکۡـمَ وَ النُّبُوَّۃَ (6:89) سوال یہ نہیں یہاں' یہ تو قانون ہے اس کو تو رائج کرنا پڑے گا۔ یہ ہے دین۔ ضابطۂ قوانین دیا حکومت کی صلاحیت دی ان کے انبیاء کو نبوت دی۔ کہا یہ کچھ چلا آ رہا تھا یہی کچھ اے رسول تو اس قوم کو دے رہا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ اب ذکر للعالمین کی نظام حیات کو عملی شکل دینے کی سعادت کس کے حصے آتی ہے

فَـاِنۡ یَّکۡفُرۡ بِھَا ھٰۤؤُلَآءِ (6:89) اگر یہ تیرے سامنے کی قوم اس سے انکار کرتی ہے تو کوئی بات نہیں یہ اسی قوم کے لیے تھوڑا ہے۔ یہ تو ذکر للعالمین ہے' یہ تو پوری کائنات کے تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے۔ اگر یہ اس سے انکار کرتی ہے تو کوئی بات نہیں۔ فَقَدۡ وَکَّلۡنَا بِھَا قَـوۡمًا لَّیۡسُوۡا بِھَا بِکٰفِرِیۡنَ (6:89) بڑی عظیم چیز ہے۔ نبی اکرم ﷺ اور حضور ﷺ کے ساتھیوں کے متعلق جماعتِ مؤمنین کے متعلق بہت بڑی شہادت ہے کہ اگر یہ لوگ تمہاری قوم یہ قریش اس سے انکار کرتے ہیں تو کوئی بات نہیں ہے ہم نے اس کتاب کو اس گروہ کے سپرد کر دیا ہے جو اس سے کبھی کفر نہیں برتیں گے۔ شہادت ہے قرآن کی کہ جن کے سپرد یہ کیا تھا انہوں نے ان کے ساتھ کفر نہیں برتا۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ ہم نے اس کو اس قوم کے سپرد کر دیا جو اس سے کبھی کفر نہیں برتے گی۔ اُولٓـئِکَ الَّـذِیۡـنَ ھَـدَی اللّٰـہُ فَبِھُدٰھُمُ اقۡتَـدِہۡ (6:90) یہ وہ لوگ ہیں جو حقیقت میں صحیح راستے پہ ہیں اے سننے والو! انہی کے راستے کے اوپر تم چلو۔ اللہ کی ہدایت کے اوپر تم چلو۔ اور پھر رسول سے کہا وہی بنیادی چیز۔ قُـلۡ لَّاۤ اَسۡـئَـلُـکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا (6:90) جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس میں میرا ذاتی فائدہ کوئی نہیں ہے میں اس کے لیے تم سے معاوضہ نہیں مانگتا۔

ہم نے صدیوں سے قرآن حکیم کے احکام کو بیچنا شروع کر رکھا ہے

یہ ہے آپ کے ہاں کوئی وعظ کہنے والا جو معاوضہ نہیں مانگتا؟ پھر بات دہرانی پڑتی ہے جو ابھی کل پرسوں میں نے کہی تھی ان کے

معاوضے کی کیفیت یہ ہے کہ خود نماز پڑھنے کے لیے وہ آتے ہیں' یہ جسے آپ امام کہتے ہیں جو رکھا ہوا ہوتا ہے ڈیڑھ سو روپے مہینے کا۔ اس کا کام کیا ہوتا ہے' وہ آتا ہے مسجد بھری ہوئی ہے' گرمی کے دن ہیں باہر دھوپ بھی ہے' ان کے لیے پہلے سے ایک ریزرو کرایا ہوا جیسے ڈبے میں ایک سیٹ ہوتی ہے' وہ وہاں ریزرو رکھی ہوئی ہوتی ہے خواہ آخر میں آئے۔ وہ وہاں کھڑے ہو کے کرتے کیا ہیں' یہ نماز جو اس نے خود پڑھنی تھی' وہی پڑھ رہا ہے وہ "اوہنوں آپ وی تے نماز پڑھنی سی نا" وہ مقتدی اگر چار رکعت پڑھتے ہیں تو وہ آٹھ تو نہیں پڑھتا' وہی پڑھنی ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ذرا اونچی آواز میں پڑھنی ہے وہ بھی تین نمازوں میں' یہ کرتے ہیں دو میں وہ بھی نہیں ہوتا۔ یعنی جو چیز اس نے خود کرنی ہے' وہ آ کے کرتا ہے اور Advantageous پوزیشن میں کرتا ہے کہ مقام بھی اس کو ایسا اچھا ملتا ہے۔ اپنی نماز پڑھتا ہے اور "پڑھن دے بعد کیندا' سٹو ٹکے ایتھے' او کاہدے سٹو"۔ لَّآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا (6:90) میں کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔

آخر کار انسان کو وحی کی طرف سے عطا کردہ ضابطۂ حیات تسلیم کرنا ہی پڑے گا

جب مذہب پروفیشن ہو جائے گا عزیزانِ من! دین نہیں رہے گا۔ اور اگر تم نہیں مانتے ان چیزوں کو اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٰى لِلۡعٰلَمِيۡنَ (6:90) کوئی بات نہیں! یہ تو ساری اقوامِ عالم کے لیے' قیامت تک کے لیے' ایک ضابطۂ ہدایت ہے۔ تم نہیں مانتے نہ مانو اور مانیں گے۔ یہ تو کائنات کے قانون کی طرح بکھرا ہوا ہے تم اگر ان قوانینِ کائنات جو فطرت کے قوانین ہیں' ان کو نہیں اپناتے نہ اپناؤ' اور قومیں اپنا لیں گی۔ قرآن کے قوانین کو تم نہیں اپناتے نہ اپناؤ' اور اپنا لیں گے کوئی شرط تھوڑی ہے کہ تمہارے ہی لیے ہے۔ اور آگے ہے وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖۤ (6:91) کہتا ہے بات ساری یہ ہے کہ انہوں نے خدا کا صحیح اندازہ لگایا ہی نہیں ہے "اوہدی قدر ای نئیں پیچانی پئی او ہے کی"۔ لیکن یہ بات اگلے درس پہ ہم اٹھا رکھتے ہیں وقت ہو گیا ہے۔ سورۃ الانعام کی آیت 91 تک ہم آ گئے عزیزانِ من! 92 آیت سے ہم اگلی دفعہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

گیارھواں باب **سورة الانعام** (آیات 91 تا 92)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1971ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی آیت 92 سے ہوتا ہے (6:92)۔

مذہب کی پوری تاریخ ہمیشہ مافوق الفطرت زاویہ نگاہ کی حامل رہی ہے

آپ کو یاد ہوگا میں نے ایک دفعہ یہ عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم مختلف مقامات پر جہاں کوئی بڑا اہم سنگِ میل آتا ہے، مذہب اور دین میں نمایاں طور پر فرق کر کے دکھاتا جاتا ہے اور یہ بڑی بنیادی چیز ہے۔ آج جس آیۂ جلیلہ سے درس کا آغاز ہوتا ہے اس میں بھی یہی نمایاں بات ہمارے سامنے آتی ہے۔ مذہب میں خدا کا تصور یہ دیا جاتا ہے کہ وہ یا اس کے انسانوں کے ساتھ جو معاملات ہیں وہ کچھ مافوق الفطرت طریقے سے ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی قاعدہ قانون نہیں ہوتا۔ کوئی ربط و ضابطہ نہیں ہوتا، کوئی Cause & Effect کی صورت نہیں ہوتی۔ کیفیت یہ ہوتی ہے کہ بس اللہ میاں نے ایسا کر دیا ہمیں تو کچھ معلوم نہیں، اس کا کیا ہے بس وہ جس طرح سے چاہے کر دیتا ہے۔ خدا کے متعلق تصور ہی یہ ہے۔

مذہب کے مقابلے میں دین میں خدا کا تصور بالکل الگ نوعیت کا حامل ہے

خدا کے متعلق ایک تو یہ چیز ہے کہ اس کائنات کی ابتداء اس نے کی۔ اس کو Create کیا، اس کے لیے قوانین بنائے۔ وہ قوانین کو اپنی قوت سے چلاتا ہے۔ اس کے اختیار و ارادہ اور مشیت سے یہ سب کچھ سرگرمِ عمل ہے۔ یہ چیزیں واقعی ایسی ہیں جن کے لیے یہ

اصطلاحیں جو ہمارے ہاں ہیں Super Natural , Supra Physical ماورائے فطرت' طبیعی قوانین سے بلند۔ میں کہتا ہوں یہ اصطلاحیں نہیں استعمال کرنی چاہئیں بلکہ کہنا چاہیے کہ قوانینِ فطرت سے پہلے یہ وہ دور ہے' جب ابھی قوانینِ فطرت کا آغاز ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ دور ہے کہ جس میں وہ بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (2:117) ہے فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (6:14) ہے اس کائنات کو وہ عدم سے وجود میں لایا ہے۔ تو اس کے لیے تو ظاہر ہے کوئی قاعدہ قانون ہو ہی نہیں سکتا۔ تو جیسا میں نے عرض کیا ہے اس کو سمجھنا یوں چاہیے کہ یہ اس دور کی بات ہے جب ابھی اس نے قوانینِ فطرت متعین ہی نہیں کیے تھے وہ عالمِ امر کا دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں اس کی مشیت کارفرما ہوتی ہے۔ اِذَآ اَرَادَ شَيۡـًٔا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ (36:82) یہ وہاں کی بات ہے کہ اس نے ایک شے کا ارادہ کیا' اس کے علم میں ایک چیز آئی اس کی سکیم ایک ہوئی اور وہ عدم سے وجود میں آ گئی۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے تو کوئی قاعدہ اور قانون ہو نہیں سکتا۔ لیکن جب یہ چیز ہو گئی' کائنات کی تخلیق ہو گئی اور اس کے لیے اس نے قوانین مقرر کر دیے تو پھر اس کے بعد اس نے یہ کہا کہ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا (33:62) اب ان قوانین میں تم کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ تو اب جہاں تک انسانی دنیا کا تعلق ہوا یا انسان کے علم کا تعلق ہوا یا ہمارا خدا کے ساتھ جو رابطہ ہوا وہ اس کی اس سنت کی رو سے ہوا' ان قوانین کی رو سے ہوا جن میں اس نے خود کہا کہ میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا۔ تبدیلی کر سکنا اور بات ہے' اس کا تو ہر وقت اسے اختیار ہے' قادرِ مطلق ہے۔ کسی چیز کا اختیار ہونا اور بات ہے اور اس اختیار کو Exercise کرنا اور بات ہے۔ اس نے کہا کہ ہم ایسا کریں گے نہیں۔ اور اس نے کہا کہ ہم وعدہ خلافی کبھی نہیں کیا کرتے وَمَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيۡلًا (4:122) خدا سے بڑھ کر بات کا سچا کون ہے۔ اس نے کہا ہم خلاف نہیں کریں گے۔

میں نے عرض کیا کہ مذہب کی دنیا میں خدا کا تصور ہی وہ ہے کہ وہ ہمارے ساتھ کچھ اس طرح سے کرتا ہے کہ جو نہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے' نہ اس کے لیے قاعدہ قانون مقرر ہوتا ہے۔ جہاں ہمارے قاعدے اور قانون کی باتیں فیل ہو جاتی ہیں تو اس کی طرف سے کوئی چیز ایسے نمود ہو جاتی ہے' وہ یہ چیز کر دیتا ہے۔ مذہب کی دنیا خدا کا یہی تصور لیتی ہے۔ دین میں خدا کا یہ تصور نہیں ہے۔ اور اس آیۂ جلیلہ میں اور یہ آیت دو تین مقامات پر اور بھی آئی ہے۔ اس حقیقت کے بیان کرنے کا جو انداز ہے وہ بجائے خویش خود ایک اعجازی کیفیت لیے ہوئے میں کہوں گا' کیونکہ اس چیز پہ جب بھی غور کیا جائے یہ نظر آتا ہے کہ یہ بات جس انداز سے کہی گئی ہے وہ بھی قرآن ہی کا حصہ ہو سکتا ہے۔

سورج کی روشنی پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے جو چاہے اس سے استفادہ کرے

بات پیچھے سے یہ آ رہی تھی کہ اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٰى لِلۡعٰلَمِيۡنَ (6:90) قرآن پوری انسانیت کے لیے ایک ضابطۂ ہدایت ہے۔ اے رسول! اگر یہ تمہاری مخالف قوم' اس کو Accept نہیں بھی کرتی تو اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ انہی کے لیے نہیں ہے یہ تو اب

پوری نوعِ انسان کے لیے قیامت تک کے لیے ذِکْرٰی (6:90) ہے۔اس لیے اگر یہ اس کو Accept نہیں کرتے' نہ کریں۔ یہ تو قوانینِ فطرت کی طرح بکھرا ہوا ہے کائنات میں' جو قوم چاہے گی اس کو Accept کر لے گی۔ جو قوم بھی اس کے مطابق اپنی زندگی کو متشکل کر لے گی' اس کے نتائج اس کے سامنے آتے چلے جائیں گے۔ اس لیے اس میں سوال ہی نہیں کہ فلاں قوم اس کو Accept کرتی ہے یا نہیں کرتی۔ بات یہ تھی کہ یہ جو ضابطہ خدا کی طرف سے دیا گیا۔ اب آتی ہے وہ اگلی آیت' آیت کے الفاظ ہیں وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ (6:91) لوگوں نے خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا' اسے انہوں نے پہچانا ہی نہیں۔ اس کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا۔ قدر کے معنی پیمانے اندازے یا Measure کے ہوتے ہیں۔ اسے صحیح پیمانے سے ماپا ہی نہیں اس کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا۔ تو اب نظر آتا ہے کہ آگے بات یہ ہونی چاہیے تھی کہ خدا جو چاہے کر سکتا ہے' جس طرح سے چاہے کسی چیز کو بنا سکتا ہے۔ یہ ان کا کیا وہ اپنے انسانوں کے اوپر خدا کا اندازہ لگا رہے ہیں کہ خدا کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ یعنی اس کے بعد کوئی چیز فوق الفطرت سی' محیر العقول سی ایسی بات آنی چاہیے جو عام طور پہ ذہنوں میں نہ آ سکتی ہو تو پھر کہا جائے گا کہ انہوں نے خدا کا اندازہ ہی نہیں لگایا۔ خدا کو بھی یہ اپنے ہی جیسا سمجھ رہے ہیں۔ یہی ذہن میں آتا ہے کہ اس کے بعد یہ ہونا چاہیے تھا۔ جیسے کوئی یہ کہتا ہے کہ او انہیں میرا پتہ ہی نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ انہوں نے مجھے بھی اپنے جیسا عام لوگوں جیسا سمجھ رکھا ہے۔ میرے متعلق ان کو صحیح اندازہ نہیں ابھی ہوا۔ یعنی جو کچھ ان کے ذہن میں ہے وہ اس سے بالکل الگ تھلگ ایک چیز ہوگی۔ تو کہا یہ کہ انہوں نے خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا۔ کنہوں نے نہیں لگایا؟ انہوں نے اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ (6:91) یعنی یہ جو اس بات پہ تعجب کر رہے ہیں کہ کیا خدا ایک عام انسان کے اوپر اپنی یہ وحی کرے گا یعنی یہ کہنے والے۔ یعنی انہیں تعجب اس بات کے اوپر ہے کہ یہ عام انسان کس طرح سے ایک رسول بن جائے۔ تو گویا ان کے ذہن میں یہ تھا کہ خدا وہ خدا ہو سکتا ہے جس کا رسول عام انسانوں جیسا ہو ہی نہ' خدا خود ایسا کہ جو انسان کے عقل و ذہن و فہم و قیاس میں نہ آ سکے اور اس کا رسول بھی کچھ عام انسانوں سے الگ تھلگ کچھ Super-natural کس قسم کا ہونا چاہیے۔ کہا ان کے ذہن میں یہ تھا کہ ایسا ہونا چاہیے۔ یعنی ایسا تصور کرنے والے ذہن میں یہ رکھنے والے کہ خدا کو کچھ اس قسم کا ہونا چاہیے کہ وہ اپنا رسول عجوبے کی قسم کا بھیجے۔ کہا انہوں نے خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا۔ دنیا کے ہر مذہب میں جسے انہوں نے خدا کا رسول کہا یا مذہب کا بانی کہا' اسے ہر مذہب میں Super-Human قرار دیا' فوق البشر قرار دیا اس کو۔ عام انسانوں جیسا نہیں' عام انسانوں سے الگ تھلگ۔ کہا کہ یہ ٹھیک ہے نا خدا بھی ایسا کہ جو ذہنِ انسانی اور فطرت کے قوانین سے منزہ ہو اور اس کا بھیجا ہوا رسول' اس کی طرف سے جو لاتا ہے یہ پیغام' وہ بھی ایسا ہونا چاہیے عام انسانوں جیسا ہونا ہی نہیں چاہیے۔ کہا کہ یہ تصور کرنے والے جو لوگ ہیں انہوں نے خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا۔

خدا کے متعلق صحیح اندازہ اس کے مقرر کردہ قوانین کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے

خدا کے متعلق صحیح اندازہ اب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیا میں انہی قاعدے اور قوانین کے مطابق سب کچھ کرتا ہے جو اس نے تمہیں دیدیے ہیں۔ اب کوئی چیز نہ خلافِ فطرت ہوگی' نہ فوق البشر ہوگی۔ یہ خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہوا صاحب۔ دیکھتے ہیں آپ کہ مذہب کی دنیا کے تصورات کو بنیادوں سے اکھیڑ کے رکھ دیا۔ خدا کے متعلق صحیح اندازہ یہ ہے کہ اب جو وہ یہاں کرے گا' جو کچھ کرتا ہے وہ ان قوانین کے مطابق کرتا ہے جو اس نے ان کے لیے بنا دیے ہیں یہ ہے خدا کے متعلق صحیح اندازہ۔ اور جونہی یہ اندازہ ہوا کہ نہیں وہ قاعدے قانون کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس کے خلاف جو کچھ جی میں آئے کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ خدا کے متعلق صحیح اندازہ نہیں ہے۔ دیکھا آپ نے خدا کا تصور کیا دیا جا رہا ہے قرآن میں۔ لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ یہ وہ تصور ہے جس کا تعلق ہم سے ہے۔

قوانین فطرت سے ہٹ کر کسی رسول کو کوئی مافوق الفطرت چیز عطا نہیں کی گئی تھی

کائنات کو وہ عدم سے وجود میں لایا' قوانین اس نے متعین کیے' وہ چیزیں تو ایسی ہیں کہ وہ قوانینِ فطرت اور کارگہ' کائنات سے پہلے کی بات ہے۔ یہ کچھ کرنے کے بعد یہاں وہ ہر شے اس قانون کے مطابق کرتا ہے جو اس نے متعین کر دیے ہیں۔ اب یہ تصور کہ خدا ان قوانین سے الگ ہٹ کے کوئی چیز سپر نیچرل' فوق الفطرت فوق البشر رسولوں کو وہ بھیجتا ہے یہ خدا کے متعلق صحیح اندازہ نہیں ہے۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖۤ اِذۡ قَالُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنۡ شَىۡءٍ (6:91) کہ وہ ہمارے جیسا ایک انسان سمجھ کے اپنا رسول بنا رہا ہے۔ کہا جسے اس بات پہ تعجب ہو رہا ہے وہ خدا کے متعلق صحیح اندازہ نہیں اس کا رہا۔ قرآن کا دیا ہوا جو تصور ہے خدا کا صحیح تصور' صحیح اندازہ یہ ہے کہ اب وہ اس کائنات میں جس کا تعلق ہم سے ہے' جو کچھ بھی کرتا ہے' جو کچھ کرے گا' وہ ان قوانین کے مطابق کرے گا Nothing Super Naturel جسے ہم کہتے ہیں۔

ایک اہم قرآنی آیت جس پر غور وفکر سے خدا کے صحیح تصور کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے

اسی سورۃ انعام میں ذرا آگے چل کر ایک آیت آتی ہے شاید وہ آج کے درس میں ہی آجائے لیکن چونکہ اس کا تعلق اس موضوع سے ہے اس لیے میں یہاں بھی اسے دہرا دیتا ہوں۔ یہی جو تھی وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖۤ (6:91) (اپنی واردات بیان کرتا ہوں) اس پہ جب میں نے اس انداز سے غور کیا کہ یہ عجیب وغریب چیز ہے کہ خدا کے متعلق یہ اندازہ کہ وہ فوق الفطرت چیزیں کرتا ہے یہ خدا کے متعلق صحیح اندازہ نہیں ہے۔ یہ جب ذہن میں میں نے سوچا اور میں گذارش کروں کہ یہ وہ مقامات ہیں جن پہ شاید برسوں سوچنا پڑا تھا کہ قرآن بات کیا کہہ گیا ہے۔ اس سے آگے یہ جو آیت آئی اس کے اوپر جب میں آیا ہوں تو وہ عجیب وغریب چیز تھی جو سامنے آئی۔ مَا

قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِہٖٓ (6:91) بات ذرا مشکل سی ہے میں اس لیے دہرائے چلا جا رہا ہوں کہ اس دنیا میں جو انسانوں کی دنیا ہے اس میں خدا کا صحیح تصور یہ ہے کہ یہاں کوئی چیز وہ خلافِ فطرت نہیں کرتا۔ فطرت کے معنی ہیں وہ قوانین جو خود اس نے اس کائنات اور انسانوں کی دنیا کے لیے متعین کیے ہیں۔ خدا کا صحیح تصور یہ ہے کہ وہ اب ان کے خلاف کچھ نہیں یہاں کرتا۔ اس نے کہا یہ کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عام انسانوں جیسا اس نے رسول کیوں بھیج دیا کچھ فوق البشر اور فوق الفطرت ہونا چاہیے تھا وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِہٖٓ (6:91) وہ خدا کے متعلق صحیح اندازہ نہیں کر رہے، وہ کچھ عجوبہ سا سمجھ رہے ہیں اپنے ذہن میں، اب عجوبے والی بات نہیں ہے۔ یہ ہے نا جو مسلمہ میں نے ابھی عرض کیا ہے۔ تو اس پہ غور کرتے ہوئے گہرائی میں آگے بڑھا تو یہ آیت سامنے آئی۔

لفظ بدیع کے متعلق محدود انسانی سوچ، تصورات، قیاس وگمان اور وہم سے ہی بالاتر ہے

عجیب آیت ہے عزیزانِ من! دیکھیئے دو ٹکڑے اس نے کس طرح سے ملائے ہیں۔ کہا کہ اس کو جسے تم کہتے ہو فوق الفطرت ہونا، کہتا ہے فوق الفطرت تو بڑی چھوٹی سی چیز ہے ایک مقام وہ ہے کہ جہاں تمہارا ذہن عاجز آجائے Think نہ کر سکے۔ کس چیز کو نہیں Think کر سکتا؟ آغاز کائنات کو۔ یہ کائنات کس طرح سے وجود میں آگئی عجز ہے ذہنِ انسانی کا، کچھ نہیں اس کے متعلق انسان سوچ سکتا۔ کہا خدا کے متعلق تو یہ تصور ہے کہ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (6:101) وہ اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ بدیع کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ یعنی یہاں آپ دیکھیئے خدا کا تصور برتر از خیال و قیاس وگمان و وہم جو کہہ گیا ہے سعدی۔ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ (6:100) جو کچھ بھی تم اس کے متعلق انسانی ذہن کی رو سے کہو وہ اس سے بلند ہے اس سے دور ہے وہ۔ دیکھا آپ نے کہ یہ کیا چیز کہی بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (6:101) ذہنِ انسانی بداعت کو ذہن میں لا ہی نہیں سکتا کہ کوئی شے عدم سے وجود میں کیسے آ سکتی ہے، جو ہے ہی نہیں وجود میں کیسے آ گئی۔ یعنی بہت پیچھے لے گئے ہمارے ہاں کے یہ سائنٹسٹ فزکس، آج تو یہ انہوں نے Matter کو یہ جو Solid (ٹھوس) ہمارے سامنے نظر آتا ہے اس کو بہت لے گئے پیچھے تو ایٹم تک لے گئے ہیں، اٹامک انرجی تک لے گئے ہیں۔ بہر حال انرجی تک ہی سہی، کسی شے کا وجود تو ہے۔ اور یہ کہہ رہے ہیں کہ وہاں سے یہ چیز آ گئی۔ یہ چیز تو ہو گئی۔ انرجی کے متعلق جب پوچھا جائے کہ وہ کہاں سے آ گئی؟ ذہنِ عاجز آ جاتا ہے یہاں۔ ذہنِ انسانی تصور نہیں کر سکتا کہ کوئی عدم (Nothingness) سے وجود میں آ سکتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کے متعلق تو یہ کیفیت ہے بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (6:101) یہ آیت کے پہلے تین لفظ ہیں۔ اب آگے چلئے بڑی عجیب آیت ہے۔ کہتا ہے اب آئی انسانوں کی دنیا۔ انسانوں کی دنیا میں عقیدہ انہوں نے یہ رکھا ہے۔ عیسائیت کے عقیدے کے متعلق ہے کہ حضرت مسیحؑ خدا کے بیٹے تھے ابن اللہ۔

عالمِ عدم سے عالمِ خلق کی تخلیق اور پھر اس کے لیے قدرت کے غیر متبدل اصولوں کی اہمیت

صاحب! جس خدا کی یہ تعریف ہے کہ وہ بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (6:101) ہے' کائنات کو عدم سے وجود میں لاسکتا ہے وہ اپنے ہاں بیٹا اس کا کیوں نہیں ہوسکتا یعنی کونسی چیز اس میں محال ہے' ناممکن ہے۔ او اتنی بڑی ناممکن کو اس نے ممکن بنا دیا' کائنات کو عدم سے وجود میں لے آیا تو اتنی سی بات کہ اس کا ایک بیٹا ہے' کون سا یہ امرِ محال ہے اس خدا کے لیے جو بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (6:101) ہے۔ لیکن اب اگلا عقیدہ تمہارا یہ ہے کہ اس کے بیٹا ہے۔ کہا کہ یہ بیٹے والا تصور جو ہے' اب یہ آ گیا فطرت کے قوانین کے دائرے کے اندر اور اس کے لیے خدا نے ایک قانون بنایا ہوا ہے اور قانون یہ ہے کہ یہ میاں بیوی یا مرد اور عورت کے اختلاط سے پیدا ہوسکتا ہے۔ کائنات تو عدم سے وجود میں آ سکتی ہے لیکن اب جو کائنات کے قانون ہیں' اس میں یہ ہے کہ بیٹا یا بچہ جو پیدا ہوگا وہ مرد اور عورت کے' نر اور مادہ کے اختلاط سے پیدا ہوگا یہ ہے اس کا قانون۔ عزیزانِ من! سنئے اور وجد میں آ جایئے۔ کہا کہ بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (6:101) بالکل صحیح ہے لیکن یہ جو تم کہتے ہو کہ اس کے ہاں بیٹا ہے اَنّٰی یَکُوۡنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمۡ تَکُنۡ لَّهٗ صَاحِبَةٌ (6:101) جس کی بیوی نہیں ہے اس کے بیٹا کیسے ہوسکتا ہے۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔ بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (6:101) ساری کائنات کو بغیر کسی قاعدے اور قانون کی پابندی کے' عدم سے وجود میں تو وہ لے آ رہا ہے وہ تو ہے۔ لیکن جب اس نے بچہ پیدا ہونے کے لیے قانون بنایا ہے تو اپنے آپ کو اس قانون کا پابند کہہ رہا ہے' کہتا ہے میرے بیوی نہیں ہے' بچہ کیسے ہوگا۔ آ ہاہاہاہا!!۔ تو ہم کہیں گے کہ اتنی بڑی کائنات کو تو وجود میں لے آیا بغیر کسی پہلے Material (مادے) کے' کچھ بھی نہیں تھا تو لے آیا اور بعد میں کہا یہاں ہمارے قانون کی دنیا شروع ہوجاتی ہے اور اس قانون کی دنیا میں ہم بھی اپنے آپ کو اس قانون سے ماوراء تصور نہیں کرتے۔ اللہ اکبر۔ بیٹا میرے ہاں کیسے ہوسکتا ہے' کہا میرے ہاں بیوی نہیں ہے۔

عالمِ عدم کو ماورائے فطرت کہنا درست نہیں

عزیزانِ من! جہاں نظر آتا ہے کہ قرآن ہے یہ۔ دو دنیائیں کس طرح سے الگ کر رہا ہے۔ ایک آیت ہے۔ بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (6:101) یہ تصور بھی خدا کا' کوئی قاعدہ قانون نہیں یہاں۔ جیسا میں نے عرض کیا نا کہ اس کے لیے اصطلاح خلافِ فطرت نہ کہیے' ماورائے فطرت نہ کہیے' بلکہ یہ کہ فطرت کی ابتداء سے پہلا دور جب ہنوز فطرت ہی وجود میں نہیں آئی تھی اس کے قوانین وجود میں نہیں آئے تھے' اس سے پہلا دور۔ اسی لیے اس نے عالمِ امر اور عالمِ خلق دو الگ دائرے بنائے ہیں۔ عالمِ امر وہ دائرہ ہے جہاں خلق سے پہلے سب کچھ ہوتا ہے۔ وہاں یہ قاعدے قانون نہیں ہیں اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَهٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ (36:82) ٹھیک ہے ہوجاتا ہے۔ تو کیا اس طرح سے بیٹا نہیں ہوسکتا؟ اس نے کہا اس کا تعلق وہاں سے نہیں ہے یہ جو آگے اب تولید کا سلسلہ ہے۔

وہ تو ابداع تھا' وہ فاطر تھا' وہ بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (6:101)۔اب جہاں سلسلہ تولید کا شروع ہوا۔اس کے لیے قانون مقرر ہوا۔ قانون یہ مقرر ہوا کہ بچہ پیدا کرنے کے لیے میاں بیوی کا ہونا ضروری ہے۔کہتا ہے کہ خواہ خدا ہی کیوں نہ ہو اس کے لیے بھی یہ قانون ضروری ہے۔میرے اللہ!!!۔یہ ہے خدا جو قرآن پیش کرتا ہے۔عزیزانِ من! دیکھتے ہیں آپ کہ گلے سے لگا لینے کو' ماتھا چوم لینے کو دل چاہتا ہے۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (6:101) ٹھیک ہے۔لیکن جب قانون بنا دیا کہ بچے کے لیے مرد اور عورت کے اختلاط کی ضرورت ہے اس سے ہم بھی ماروا نہیں ہو سکتے۔اور جب تم یہ مانتے ہو کہ ہماری بیوی نہیں ہے تو پھر کیسے یہ تم مان سکتے ہو کہ ہمارے ہاں بیٹا ہو سکتا ہے۔وَخَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ (6:101)۔

لفظ امر اور خلق کی بنیادی خصوصیت اور اس کا مفہوم

یہ امر اور خلق میں نے کہا ہے دو چیزیں ہیں اگرچہ استعمال تو یہ لفظ ہو سکتے ہیں ایک کی جگہ دوسرے میں لیکن عربی قاعدے کی رو سے بھی' قرآن کی رو سے بھی بڑا لطیف فرق ہے اس کے اندر۔امر وہ چیز ہوتی ہے جس میں قاعدے اور قانون کے دور سے پہلے کی باتیں ہیں' اس سے بلند باتیں ہیں' اس سے ماوراء باتیں ہیں۔خدا کا ارادہ' خدا کا علم' وہاں کا قانونِ مشیت' عدم سے وجود میں اشیاء کا آنا' یہ ساری چیزیں وہاں کی ہیں اس کو امر کہا جاتا ہے۔یہ جو خلق ہے خ ل ق اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں صحیح Proportion' کسی چیز کا صحیح تناسب۔

عدم سے وجود میں آنے والی اس کائنات میں ہر آن نت نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں

یہ اخلاق جسے آپ کہتے ہیں' خُلق جسے کہتے ہیں۔یہ کیا ہوتا ہے؟ یہ وہی مادہ ہے اس کا' Balanced Personality جو ہوتی ہے اسے کہتے ہیں خلقِ عظیم۔خلق کے معنی ہوتا ہے صحیح Proportion سے چیزوں کو جمع کرنا۔اب ایک تو وہ شے ہے کہ جو عدم سے وجود میں آ گئی کائنات۔اب اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ (35:1) یہ کائنات جو عدم سے وجود میں آئی ہے A finished & complete entity نہیں ہے پہلے ہی دن سے بالکل مکمل نہیں کر دی گئی کہ بس یہ جیسی بنی تھی' بن گئی' نہ۔اس کے اندر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اس میں Improvement ہوتی رہتی ہے یہ حسین سے حسین تر بنتی چلی جاتی ہے۔یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ (35:1) وہ اس کے اندر اپنے قانونِ مشیت کے مطابق' اضافے کرتا رہتا ہے۔یہ جو خلق میں اضافے ہیں وہ مختلف چیزوں کے اندر مختلف Proportion سے مختلف چیزوں کو اکٹھا کرنا اور ترتیب سے ایک نئی چیز پیدا کرنا۔یہ چیز انسان بھی کر سکتا ہے اس لیے کہ خدا نے بدیع اور فاطر تو صرف اپنے آپ کو کہا ہے اور خالق کے متعلق کہا ہے کہ وہ احسن الخالقین ہے۔خالق اور بھی ہو سکتے

ہیں اس کی جو خلق ہے پیدا کی ہوئی چیز' جو وہ تخلیق کرتا ہے وہ حسین ترین ہوتی ہے اس کی Proportion صحیح ترین ہوتی ہے وہ اتنا ہے لیکن خالقین وہ کہتا ہے کہ اور بھی ہیں انسان بھی تو خالق ہے روزنت نئی چیزیں بناتا ہے۔ عدم سے تو وجود میں نہیں لاسکتا۔ جو چیزیں موجود ہیں ان میں الگ الگ ترتیب سے اِدھر سے اُدھر' اُدھر سے اِدھر کر کے یہ روز سائنٹفک چیزیں' ایجادات جن کو آپ کہتے ہیں۔ ایک تو انکشافات ہوتے ہیں Discover کرتا ہے انسان Laws کو وہ Already ہیں وہ موجود ہیں۔ ایک چیزیں ہیں جن کو ایجاد کرتا ہے۔ مختلف چیزیں کائنات کی جو پڑی ہوئی Matter کی ان میں نئی نئی ترتیبوں سے نئی نئی چیزیں بناتا چلا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے انسان بھی خالق ہے خدا نے اپنے آپ کو خالق کہا ہے۔ تو یہ خلق والی چیز تو قانون کے تابع آئے اور وہ جو امر والی چیز ہے جہاں بَـدِيْـعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (6:101) ہے وہ قوانین سے پہلے کا دور ہے۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (6:101) کہا ٹھیک ہے جس دور میں ابھی ہم نے قاعدے قانون نہیں بنائے تھے اس دور کی بات یہ ہے کہ ہم عدم سے وجود میں لے آئے تھے۔ اور جب ہم نے یہ نیا دور شروع کر دیا قاعدے اور قانون کا' مثال ملاحظہ فرمائیے یعنی خدا ہی تھا یہ کہہ گیا ہم تو جرآت ہی نہیں کرتے یہ کہتے کہ اللہ میاں کی بیوی نہیں ہے' اس لیے بچہ نہیں پیدا ہوسکتا۔ لیکن بات کیسی عجیب سمجھا گیا ہے کہ یہ قاعدہ ہم نے مقرر کر دیا جب کہ یہ Male & female کے جوز وجین ہیں ان کے اختلاط سے آگے یہ تخلیق ہوگی۔ اب ہم بھی اپنے آپ کو اس سے مستثنیٰ نہیں قرار دیتے۔ اور جب تم اس کو مانتے ہو کہ ہمارے بیوی نہیں ہے۔ یہ تصور آج تک نہیں انہوں نے بھی دیا عیسائیوں نے جو ابن اللہ تو مانتے تھے لیکن خدا کی بیوی نہیں مانتے تھے حضرتِ مریمؑ کو تو کہا کہ یہ تو سوال نہیں ہے جب اس کی بیوی نہیں ہے تو پھر بچے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ خَـالِـقُ كُلِّ شَىْءٍ (6:102) اب تو جو چیز بھی یہاں پیدا ہو رہی ہے وہ تو قانونِ تخلیق کے مطابق ہو رہی ہے قانونِ تولید کے مطابق ہو رہی ہے۔ لَـمْ يَـلِـدْ وَلَمْ يُوْلَدْ (112:3) یہ ہے Originally وہ بھی کسی تولید کے قاعدے سے وجود میں نہیں آیا۔ اب اس کے بعد وہ جو کچھ آگے کر رہا ہے عملِ تخلیق ضرور ہے عملِ تولید نہیں ہے وہاں آگے جو کچھ ہو رہا ہے۔ خَـلَقَ كُلَّ شَىْءٍ وَ هُوَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْم (6:102) معلوم ہے آگے کیا کہا ہے ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ (6:102) اور یہ ہے تمہارا رب جسے تم اللہ کہتے ہو۔ تو ایک طرف بَـدِيْـعُ السَّـمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (6:101) جیسا میں نے کہا ہے کہ خیال و قیاس و گمان و وہم سے بالا کوئی قاعدہ قانون نہیں جس کے اندر وہ آتا ہو وہ Originate کرنے والا۔ اور اس کے بعد جب یہ چیز اس نے کر دی اور مقرر کر دی تو اس کے بعد پابند اتنا ہے کہ وہ بتاتا یہ ہے کہ کائنات کو تو ہم وجود میں لائے تھے۔ اب ایک بیٹا نہیں ہم اپنے ہاں پیدا کرتے اس لیے کہ اس کے لیے ہم نے قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔ اور ضمناً یہ بھی دیکھئے کہ جب یہ قاعدہ ہے کہ بیوی یا عورت کے بغیر مرد بچہ نہیں پیدا کرسکتا تو مرد کے بغیر عورت بھی تو نہیں کرسکتی۔ حضرتِ مسیحؑ کی پیدائش کے متعلق بات صاف ہو جاتی ہے۔

ذات خداوندی کے متعلق غلط تصورات عقل انسانی کو حقیقت کی طرف آنے ہی نہیں دیتے

یہ بات دوسری جگہ آئے گی میں یہاں یہ کہہ رہا تھا وہ کہتا ہے وَ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖٓ (6:91) انہوں نے خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا جو ہر وقت ذہن میں یہ تصور کیے بیٹھے ہیں کہ خدا کی طرف سے اب جو کچھ یہاں ہوگا بالکل عجوبہ ہوگا' شعبدہ ہوگا چیستاں ہوگی۔ نہ کوئی قاعدہ ہوگا نہ کوئی قانون ہوگا۔ یہی ہے نا تصور عزیزانِ من! خدا کے متعلق ہمارا۔ جہاں قاعدے قانون کے مطابق کوئی چیز نہیں ہوتی اس وقت ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اب خدا کچھ اس طرح سے کرے گا کہ اس میں قاعدہ قانون والی بات نہیں۔ ''اللہ ولوں ای کچھ ہو گیا یعنی جیہڑی چیز نظر آئے کہ قاعدے قانون دے مطابق نئیں ہوئی او اللہ ولوں ہو جاندی اے'' وہ بے پرواہ ہے جی وہ جو جی چاہے کرے۔ کہتا ہے وَ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖٓ (6:91) عزیزانِ من! دنیا کے کسی مذہب میں خدا کے متعلق یہ تصور آپ کو مل رہا ہے اور دنیا کا کوئی مذہب بھی ہے جس نے اپنے بانی کو مافوق البشر نہیں قرار دیا؟؟۔ اور یہ چیز کہی کہ یہ کہنے والے کہ یہ مافوق البشر ہونا چاہیے۔

خدا کا کوئی رسول مافوق البشر خصوصیات کا حامل نہ تھا

رسول ہے کہا' خدا کے متعلق انہوں نے صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی طرف سے جو کچھ ہونا چاہیے بس وہ کچھ عجوبہ ہونا چاہیے۔ ارے بابا کچھ نہیں۔ ہم نے قاعدے قوانین اپنے بنائے' ہم خود ان کی پابندی کرتے ہیں کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہٖ اس نے اپنے اوپر واجب قرار دے لیا ہے یہ۔ ہمارا رسول بشر ہے اور اسی لیے اس رسول سے وہ بار بار کہلوا تا چلا جاتا ہے قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ (18:110) عربی جاننے والے جانتے ہیں اِنَّمَآ (18:110) کیا معنی ہیں اس کے۔ یعنی اس کے سوا کوئی بات نہیں ہے This is exactlly what it is کہ میں ایک انسان ہوں۔ اتنا ہی نہیں کہلوایا مِّثْلُکُمْ (18:110) او تمہارے ہی جیسا انسان ہوں۔ مذہب کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا وہ تو یا اسے خدا کا اوتار بنائیں گے یا خود خدا بنائیں گے۔ مافوق البشر تو ضرور بنائیں گے۔ اور پھر وہ جو معجزات اس سے سرزد ہوتے ہیں تو سیدھی سی بات ہے' فوق البشر تو وہ خود ہی ہو گیا جب اس سے اس قسم کے فوق الفطرت چیزیں سرزد ہو گئیں' فوق البشر تو ہوا۔

قوانین فطرت سے ماوارا کوئی نبی نہ تو اچنبھے کی بات کہتا ہے اور نہ ہی عملی طور پر کچھ ایسا کرتا ہے

تو کہا ان کے ذہنوں میں یہ ہے کہ خدا ایسا ہونا چاہیے ہر روز اچنبھے کرتا چلا جائے' اس کا رسول ایسا ہونا چاہیے کہ ہر وقت اس سے عجوبے کی چیزیں ہونی چاہئیں۔ اور جب یہ صورت ہے کہ خدا اس کے خلاف نہیں کرتا' رسول بھی انہی جیسا ایک انسان ہے تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں! کچھ اس ٹائپ کا خدا تو ہمارا جچتا نہیں ہے' کچھ اُس ٹائپ کا ہونا چاہیے۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖٓ (6:92) خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں انہوں نے لگایا۔ جب یہ اس بات پہ تعجب و اعتراض کرتے ہیں کہ یہ رسول عام انسانوں جیسا رسول کیوں ہے اسے تو کچھ

فوق البشر ہونا چاہیے خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں انہوں نے لگایا۔

مذہب کی دنیا میں حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کے متعلق نظریاتی فرق کی نوعیت کیوں؟

اعتراض یہودیوں کی طرف سے تھا۔ اعتراض کا جواب ان کو دیا جاتا ہے کہ حضرتِ موسیٰؑ کے متعلق وہ یہودی جو کچھ بھی پیش کریں بہر حال ان کے متعلق ان کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ وہ Super Human تھے۔ عیسائیوں کا عقیدہ تو حضرتِ عیسیٰؑ کے متعلق یہ ہے کہ وہ فوق البشر تھے۔ یہودیوں کا یہ عقیدہ نہیں تھا ان کے متعلق۔ کہا قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِىْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ (6:91) کہا یہی صورت ہے تو ذرا تم یہ بتاؤ اپنے پیغمبر حضرتِ موسیٰؑ کے متعلق تو تم یہ کہتے ہو کہ وہ بہر حال ایک انسان تھا۔ اس کی طرف جو کتاب نازل ہوئی تھی۔ اس کے متعلق ان کا بھی عقیدہ تھا کہ خدا کی طرف سے ہے۔ کہا اسے تو تم مانتے ہو کہ حضرتِ موسیٰؑ انسان تھے۔ ان پر خدا کی طرف سے کتاب نازل ہوئی اور اسی طرح سے اگر آج یہ کہا جاتا ہے کہ محمدﷺ ایک انسان ہیں' ان پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوئی تو تم یہ اعتراض کرتے ہو کہ نہیں! اسے فوق البشر ہونا چاہیے تھا۔ اُسےؐ بھی تو فوق البشر ہونا چاہیے تھا۔ لیکن مذہب میں پہنچ کے تو آپ لاکھ کہتے رہیں بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ 'بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) وہ تو اس کو عجوبہ اور اچنبھا بنا دیتے ہیں۔

قرآنی تعلیم کے برعکس بشر اور فوق البشر کے ضمن میں مسلمانوں کی عجوبہ سازی کی دو تین مثالیں

آپ کے ہاں روز بحثیں ہوتی ہیں کہ رسول اللہﷺ بشر تھے یا نور تھے۔ آپ غور فرماتے ہیں کس بات کے خلاف جا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے خدا کے متعلق تمہارا اندازہ غلط ہے جو یہ کہتے ہو کہ بشر نہیں تھے۔ کچھ عجوبہ بنانا چاہتے ہو تم' ایسا خدا اچھا ہے تمہیں۔ اور پھر یہ ساری معجزات کی دنیا! ہر بات خلافِ فطرت۔ ہمارا بھی تو اپنا تصور' جہاں کوئی کام اٹک جاتا ہے' اڑ جاتا ہے۔ کوئی چیز ذہن نہیں فیصلہ کر سکتا قاعدے قانون کے مطابق نہیں ہوتی وہاں کچھ یہ ہوتا ہے کہ اب کچھ خدا ہی کر دے تو کر دے اور خدا نے ہی ایسا کیا۔ وہیں ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ان رسولوں کی زندگی میں بھی جہاں ایسا کوئی مقام آجاتا ہے جہاں آ کے کوئی اڑوتی پڑ جاتی ہے جسے آپ کہتے ہیں کہ عام حالات قاعدے قانون کے مطابق ذہن میں تمہارے نہیں آتا کہ یہ کیسے مسئلہ صاف ہوگا تو وہاں تم لے آتے ہو کہ وہ چیز خلافِ فطرت ہو گئی۔ ذہن میں پہلے تصور کر لیا کہ سامنے سمندر آ گیا' پیچھے سے آ گیا فرعون کا لشکر اس کے بعد کریں کیا' قوم نے کہا کہ مرے بس سیدھی سی بات ہے۔ یعنی اب وہ موسیٰؑ یا وہ پیغمبر جو تھا اب وہ بشر نہیں رہا اس نے سمندر کو Touch کیا اور سمندر پھٹ کے دو ٹکڑے ہو گیا اور بیچ میں سے یہ سارے گذر گئے۔ یعنی آیا نہ وہ مقام جہاں تمہارے ذہن نے فیصلہ کیا کہ اب عقل و فکر کی رو سے' قاعدے قانون کی رو سے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب کوئی چیز خلافِ فطرت ہونی چاہیے' دماغ ان مقامات کے اوپر ماؤف۔ ساحرین کی رسیاں سانپ بن کے دکھائی

دے رہی ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ! یہاں تو شکست ہو رہی ہے عام قاعدے کی رو سے۔ ڈال دیا ایک عصا اور اس نے اژدھا بن کے نگل لیا ان سب کو۔ متعجب نہ ہوئیے عزیزانِ من! کہ قرآن میں یہ چیزیں آئی ہوئی ہیں جب یہ چیزیں آئیں گی تو آپ دیکھیں گے قرآن میں کیا آیا ہوا ہے۔ یہ ہمارے ذہن کا پیدا کردہ قرآن ہے جب خدا کا نازل کردہ قرآن سامنے آئے گا تو آپ دیکھیں گے کہ یہ کیا چیزیں ہیں۔ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ ہمارا ذہن چاہتا ہے' کیا چاہتا ہے؟ خدا اور اس کے رسولوں کو اس قسم کا جس قسم کا ہمارا ذہن چاہتا ہے فوق البشر سی کچھ چیز۔ ہم عام حضرت صاحب جو ہمارے ہوتے ہیں' ان کو ہم بشر نہیں مانتے ان سے بلند لے جاتے ہیں اور پھر خدا کا رسول اور خدا جو چاہے وہ کرے۔ وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖۤ (6:91) بڑی عظیم چیز ہے! اِذۡ قَالُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنۡ شَیۡءٍ (6:91) ایک عام انسان' کہا بتاؤ تو سہی اسے مانتے ہو کہ ایک انسان تھا اس پہ نازل ہوئی تھی کتاب۔

انسانوں کی کتب فروشی کی سوچ نے آسمانی کتابوں کو ورق ورق کر دیا

اب الگ بات ہے کہ اس کے بعد ہے کہ تَجۡعَلُوۡنَهٗ قَرَاطِیۡسَ تُبۡدُوۡنَهَا وَ تُخۡفُوۡنَ كَثِیۡرًا (6:91) تم نے اس کے بعد کیا یہ۔ یہ نہیں کہ ہمیں چاؤ آتا ہے کہ ہر دو چار سو سال کے بعد نیا رسول بھیج دیتے ہیں' ایک نئی کتاب بھیج دیتے ہیں' ایک نیا ایڈیشن شائع کر دیتے ہیں' یہ ہمارے ہاں تو (معاف رکھئے گا) کتب فروشی کا بزنس نہیں ہے کہ یہ کچھ ہم کرتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ تم اس کتاب کو اصلی شکل کے اندر رہنے ہی نہیں دیتے اور یہاں جو بات کہی وہ بڑی عجیب و غریب چیز ہے!!! تم نے اس کو ورق ورق کر دیا۔ ایک جگہ مجلد کتاب ورقوں کے انداز سے رکھی ہو تو وہ غلط ہوتا ہے کہ اس میں سے کچھ آپ چھپا لیں اور کچھ اس میں سے ظاہر کریں۔ یہ محسوس مثال ہے ورق ورق کرنے کی۔ اور اگر اس کے ورق ورق ہو گئے ہوئے ہوں' تو ہو سکتا ہے کہ کچھ ورق چھپا دیے جائیں' ضائع ہو جائیں' کچھ رکھ لیے جائیں۔ یہ معنی ہیں اس کے۔ پھر کیا تم نے یہ کہ کچھ حصہ اس کتاب کا جو تمہارے مفاد کے خلاف جاتا تھا اس کو چھپا لیا۔ جو حصہ اپنے مفاد کے مطابق تھا' اس کو رہنے دیا۔ کتاب اپنی مکمل شکل میں نہ رہی اس لیے ہمیں پھر ایک مکمل شکل میں وحی بھیجنی پڑی۔ مسلمان خوش ہیں کہ یہودیوں کے متعلق یہ بات کہی جا رہی تھی اس لیے کہ یہ مجبور اور پھنسا ہوا ہے کہ اس کی کتاب قرآن اس کی حفاظت کا ذمہ اس نے لے لیا ہے۔

ہمارے ہاں قرآن حکیم کے محفوظ نسخہ کیمیا کو ورق ورق کرنے کی ناکام کوشش قرآنی آیات کو منسوخ کرنے کا اعلان

بڑا زچ پڑتا ہے مسلمان اس سے جو اس نے کہہ دیا ہے کہ ہم نے اسے نازل کیا ہے ہم اس کے محافظ ہیں۔ اگر اس کو پتہ ہو کہ چوکیدار ہر وقت کھڑا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کبھی ادھر اُدھر ہو کسی وقت سو ہی جائے تو موقع مل جاتا ہے نا۔ تو اس قسم کے چوکیدار سے چور بڑا

زچ پڑتا ہے۔ حفاظت کا ذمہ خدا نے لے لیا اب یہ تو اس میں ہو نہیں سکتا۔ ورق تو ایک طرف رہا' اس کا ایک حرف ادھر اُدھر نہیں ہو سکتا۔ کیا کیا جائے؟ اس نے کہا کوئی بات نہیں! ہمارا بھی تو ہاتھ اٹھتا ہے گریباں تک' ہم کر کے دکھاتے ہیں۔ عقیدہ وضع کر لیا کہ یہ قرآن کی سینکڑوں آیات ہیں تو سہی اس کے اندر جگہ منسوخ ہو گئی ہوئی ہیں۔

تورات کے پرانے نسخہ کی بازیابی کا قصہ

عزیزانِ من! یہ وہی چیز نہیں؟ اس سے بھی بدتر۔ وہ تو ہو سکتا تھا کہ کوئی محقق کوئی ریسرچ سکالر کہیں سے کوئی تورات کا پرانا نسخہ لے آئے اور کہہ دے کہ اس میں یہ ہے جیسے کہ وہ Scrolls نکلے ہیں اب Dead Sea کے' ہسٹری یہ کچھ کر دیتی ہے۔ وہ لے آئے انہوں نے کہا او تمہارا ستیاناس تم نے کیا کر دیا اس میں۔ Scrolls لے آئے اور آپ کو پتہ ہے ان Scrolls کے متعلق کیا چیز ہے۔ یعنی جب پہلے نکلی ہے بات تو وہاں کچھ ریسرچ کرنے والے تھے یہ امریکن ان کے ہاتھ میں کوئی ایک دو صراحیاں سی ہیں وہ انہوں نے ان بچوں سے گڈریوں سے لے لیں وہ تو وہاں پہنچیں۔ اس کے بعد جب پوپ کو پتہ چلا کہ کچھ اس قسم کی چیز ہے آپ کو شاید علم نہیں' وہاں جا کے انہوں نے پوری کھدائی کر کے جتنے Scrolls تھے وہ سارے کے سارے پوپ خرید کے لے آیا ہوا ہے اور آ کے اپنے تہ خانے کے اندر بند رکھے ہوئے ہیں' باہر نہیں آنے دیتا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا (6:91) چھپا کے رکھتے ہیں۔ وہ جو دو چار نکل گئے ہیں وہی سامنے آئے ہیں یہ عجیب وغریب ہسٹری آ رہی ہے سامنے اس دور کی کہ انہوں نے کیا کچھ کیا تھا۔

قرآنِ حکیم کی آیات کو منسوخ قرار دینے کی سازش کا نتیجہ دراصل Date of expiry کے مترادف تھا

تو میں نے کہا ہے کہ اس طرح سے چھپانے سے تو یہ ہو سکتا تھا لیکن اگر یہ دھڑلا ہو کہ ٹھیک ہے قرآن کا ایک ایک لفظ ایک ایک حرف اپنی جگہ موجود ہے۔ ہم تو ایک رات میں پورا اس کو دہرا دیتے ہیں' کروڑوں کی تعداد میں اس کو دہراتے ہیں لیکن اس میں سے ایک حصہ منسوخ ہے۔ تلاوت تو اس کی ہو گی' احکام منسوخ ہیں۔ یہ تو اس تُبْدُوْنَهَا وَ تُخْفُوْنَ(6:91) سے بھی بدتر چیز ہے۔ بلیک مارکیٹ کرنے والے کیمسٹ سے جا کے کہیے کہ یہ دیدیجئے' چھاپہ بھی مار لیا جائے اور اس کے بعد وہ انجیکشن نکل آئیں' انجیکشن جو وہ نکلیں اندر سے ڈبیاں تو ان پہ لکھا ہوا ہو Date of expiry: 30 August 1969 تیس اگست 1969ء کو Expire ہو گیا تھا' وہ بیکار ہو جاتا ہے اس کے بعد۔ موجود ہے بیکار رہے' بیکار ہی نہیں بلکہ خطرناک ہوتا ہے۔ انہوں نے اس کتابِ عظیم کی ابتداً جس سے ہوئی تھی' قریباً پانچ سو آیات کے اوپر لکھ دیا Date of expiry ختم ہو گیا ہے یہ۔ ٹھیک ہے جی ڈبیہ بھی ٹھیک ہے اس کے لیے وہ شیشی بھی ٹھیک ہے اندر اس کے Contents بھی موجود ہیں' لیکن وہ منسوخ ہو گئے ہیں Date of expiry ہو گئی ہے۔ رکھے رکھو

ڈاکٹر صاحب اپنے ہاں یہ سٹاک سارا انجیکشنوں کا' کہہ دوان سے چھاپہ مارنے والوں سے کہ مارلیں چھاپہ' کرلو کیا کرتے ہو۔ انسانی ذہن کی سازش بھی عجیب شے ہے صاحب کیا کیا چیزیں یہ کرتا ہے شیطان۔ یہ کیا آپ نے اس قرآن کے ساتھ تُبۡدُوۡنَهَا وَ تُخۡفُوۡنَ كَثِيۡرًا (6:91) ۔حالانکہ وَ عُلِّمۡتُمۡ مَّا لَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اَنۡتُمۡ وَ لَاۤ اٰبَآؤُكُمۡ (6:91) حالانکہ ہم نے اس میں وہ کچھ تمہیں بتایا تھا جو نہ تمہیں معلوم تھا' نہ تمہارے آباؤ اجداد کو معلوم تھا۔ وہ تعلیم اس کے اندر تمہیں ہم نے دی تھی تم نے اس کے ساتھ یہ کچھ کیا۔

مذہبی پیشوائیت کے مناظروں کو قرآنِ حکیم نے لعب قرار دیا ہے

ہم نے اس کے ساتھ یہ کچھ کیا ہے عزیزانِ من!۔ پوچھا یہ گیا تھا کہ بتاؤ وہ کتاب کس نے نازل کی تھی؟ قُلِ اللّٰهُ (6:91) کہو کہ اللہ نے ہی کی تھی۔ تو جب اس میں کوئی چیز عجوبے کی نہیں نظر آئی تو اس میں یہ تم کیوں ڈیمانڈ کر رہے ہو' مطالبہ کر رہے ہو کہ اس رسول کو کچھ فوق الفطرت سا ہونا چاہیے' اس کتاب کو بھی کچھ عجوبے کی بات ہونی چاہیے۔ کہا یہ چیز اتمامِ حجت کے لیے دلیل یہ ان کو دو جواب ان کے پاس کچھ نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود یہ کریں گے کیا؟ بحثیں شروع کر دیں گے۔ ثُمَّ ذَرۡهُمۡ فِىۡ خَوۡضِهِمۡ يَلۡعَبُوۡنَ (6:91) تو پھر ان کی ان بحثوں میں مناظروں میں مباحثوں میں چھوڑ دو ان کو' یہ کھیلتے رہیں اپنی ان داستانوں سے کہانیوں سے۔ کیا بات ہے يَلۡعَبُوۡنَ (6:91) کی اور يَلۡعَبُوۡنَ (6:91) بھی کیا لفظ ہے یہ لعب کا' یہ قوم تھی۔ وہ کے بچوں کے کھیل آپ کو پتہ ہے' لعاب دہن ہوتا ہے ''ایہو جئے بچے جناں دیاں لالاں وگدیاں ہون''۔ آ ہاہاہا۔ کہاں سے پھر انہوں نے عقل و فکر کی بات کرنی ہے ''اینہاں نوں تے لالاں وگن ڈیاں نیں''۔ وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِىۡ بَيۡنَ يَدَيۡهِ (6:92) اسی قاعدے کے مطابق یہ کتاب ہے خدا کی طرف سے جو ہر چیز قاعدے قانون کے مطابق ہے۔ ایک انسان کی طرف جو تمہاری طرح کا ایک انسان ہے۔ البتہ کتاب کی کچھ خصوصیات ہیں۔

لفظ برکت اور مبارک کا حقیقی مفہوم ثبات اور تغیر کے حسین امتزاج سے نشو و نما دینے والا

دو لفظوں میں دیکھئے کیا کہہ گیا ہے قرآن۔ مُبٰرَكٌ (6:92) اب ہمارے ہاں تو یہ لفظ ہے ہی کہ کتاب مبارک ہے' وہ مبارک بھی ذرا اور کثرتِ استعمال سے پنجابی میں آئی ''تے مبارخ ای رہ گئی' نی بہن مبارخ ہووے' میں کیا جی مبارخ ہووے''۔ لیکن نہ بھی ہو تو بہر حال مبارک تو آپ کے ذہن میں آتا ہے' تصور آتا ہے وہی مافوق الفطرت سا مقدس سا' مبارک کا ترجمہ Sated کیا جاتا ہے Blessing کچھ اس میں ہوتی ہے۔ عجیب لفظ ہے اور کونسا لفظ قرآن کا عجیب نہیں ہے یہی تو اعجاز ہے اس کا۔ اور خود ان عربوں کی زبان کے اوپر پہلے تو وجد آتا ہے پھر اس زبان میں سے جو انتخاب کیا ہے۔ کیا بات ہے!!!۔ برکت' مبارک: کسی ایسی شے کا تصور کیجیے کہ اپنے مقام پہ قائم بھی ہو' ذہن میں آپ کے شاید پتھر کا تصور آ گیا اپنی جگہ بالکل قائم' ! اور اس کے ساتھ اس میں نشو و نما بھی ہو

رہی ہو Develope بھی ہورہی ہو' درخت جیسے ہوتا ہے۔ اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرۡعُهَا فِی السَّمَآءِ (14:24) جڑیں پاتال کے اندر' اپنے مقام پہ اس قدر محکم کہ بڑے سے بڑا جھکڑ بھی آئے تو اس کو اٹھا نہ لے۔ پتھر کی طرح جامد نہیں ہے کہ اس میں زمانے کے بڑھتے ہوئے حالات اور تقاضوں کو Meet کرنے کی صلاحیت اس کے اندر نہ ہو۔ اپنے مقام کے اوپر ثابت اور درخت کی طرح نشو و نما پانے والی بڑھنے والی پھولنے پھلنے والی' پھیلنے والی شاخیں آسمان تک جانے والی عربی زبان میں اس قسم کی شے جو اپنے مقام کے اوپر قائم مستحکم ہو اور اس میں نشو و نما بھی ساتھ ہوتی چلی جائے' اس کو مبارک کہتے ہیں۔ قرآن کے متعلق کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ مُبٰرَكٌ (6:92) اس کے لیے کہنا۔ خدا کرے اس قوم میں یا کسی قوم میں کوئی پیدا ہو جو قرآن کے ان الفاظ کو اس طرح سے لائے سامنے۔ کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ مُبٰرَكٌ (6:92) ابدیت کی یہ کیفیت ہے کہ محکم اپنے مقام کے اوپر ہے' ہل نہیں سکتی' جامد نہیں ہے Development کی پوری صلاحیتیں اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ جو قوم بھی اس کتاب کو اپنے لیے ضابطۂ ہدایت بنائے گی اس کی کیفیت بھی یہ ہوگی کہ وہ بھی Permanence and Change جسے اقبالؒ نے کہا ہے ثبات اور تغیر کے حسین امتزاج سے اس زندگی کو بسر کرے گا۔

کتاب مبارک کے برعکس مذہبی دنیا کی خودساختہ شریعت نے قوم مسلم پر صدیوں سے جمود طاری کر رکھا ہے

ثبات یہ کہ ایک مقام کے اوپر ابدی قوانین جن میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی ان کا Foot-hold ہوگا اس کے اوپر تو جم کے کھڑے ہونگے۔ قوانینِ الٰہیہ میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی نہ زمانے کے آگے بڑھنے سے' نہ کسی قوم کے حالات کے تغیر سے۔ وہ ابدی حقائق (Permanent Values) اپنے مقام کے اوپر قائم ہیں۔ لیکن وہ شریعت کے جامد قوانین نہیں ہیں وہ آپ کو اصول دیتی ہے جس بارڈر لائن کے اندر رہتے ہوئے آپ اپنے اپنے زمانے کے مطابق خود اس کے لیے قوانین وضع کرتے ہوئے ان حالات کو Meet کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جائیں۔ یہ جو ثبات و تغیر کا امتزاج ہے آپ غور کیجیے کہ ایک لفظِ مبارک میں یہ کس طرح کھلکھلا کر ہنس رہا ہے۔ کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ (6:92) ہم نے اسے نازل کیا ہے۔ مبٰرک : ایک چیز کہ چودہ سو سال پہلے کی آئی ہوئی کتاب وہ کہتے ہیں کہ اس دور کے لیے ٹھیک تھی۔ وہ دور چلا گیا' دنیا کتنی آگے بڑھ گئی اس کے بعد Much water has passed below the bridge آپ اب پرانے قصوں کو لاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں! دنیا میں حقائق جو ہیں Truth جو ہوتا ہے' وہ ہمیشہ ابدی' غیر متبدل ہوتا ہے لَا تَبۡدِیۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (10:64) لیکن وہ جامد نہیں ہوتا ہے کہ جو جوتا آپ نے چھ سال کے بچے کے پاؤں میں پہنایا تھا' بیس سال کے بچے کو بھی کہیں کہ اسی میں پاؤں اپنا رکھے۔ پاؤں سکڑ کے رہ جائے گا جیسے وہ جو پہلے چینی عورتوں کے ہوتے تھے۔ کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیۡ بَیۡنَ یَدَیۡهِ (6:92)۔

سابقہ آسمانی کتابوں کی تصدیق کا حقیقی مفہوم

اب یہ دوسری اس کی تعریف آئی' عجیب چیز ہے۔اس کا بھی ہمارے ہاں یہ تصور لیا جاتا ہے کہ وہ تصدیق کرتی ہے ان تمام کتابوں کی جو پہلے آئیں۔تو وہ کتابوں والے ان سے کہا کرتے ہیں کہ! یہ اگر تصدیق کرنے کے لیے آئی ہے اس کی جو ہمارے پاس ہے تو اس کو پھر الگ منواتے کیوں ہیں آپ' یہ تو اس کی تصدیق کرتی ہے اصل تو وہ ہے جو ہمارے پاس ہے۔ یہ تو صرف اس کی تصدیق کررہی ہے تو جس کی یہ تصدیق کرتی ہے اسے ماننا چاہیے یا اسے ماننا چاہیے جو اس کی تصدیق کررہی ہے۔اور اس کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں ہوتا۔ یہ کہتے ہیں کہ! وہ تو محرف ہوگئی ہیں تمہاری کتابیں۔کہتے ہیں جب وہ محرف ہوگئی ہیں تو یہ پھر اس کی تصدیق کیسے کرتی ہے۔جب اس نے تصدیق کردی ان کی کہ وہ سچی کتاب ہے تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں محرف ہے۔محرف ہے وہ اسی میں لکھا ہوا ہے قرآن میں۔وہ کہتے ہیں ایک طرف آپ کہتے ہیں یہ اس کی تصدیق کرتی ہے دوسری طرف کہتے ہیں کہ وہ محرف ہے وہی کتاب ہے۔یہ عجیب کتاب ہے۔آپ نے دیکھا ایک لفظ کا جو مفہوم ہم اپنے طور پہ لے لیتے ہیں اس پہ پھر کس طرح 'رفت از یک بندتا افتاد در بندِ دگر' چلے جاتے ہیں یہ کرتے ہوئے۔بات کچھ اور تھی مصدق: اس کے معنی ہوتے ہیں 'تصدیق کرنے والا' یوں لفظ نہ لیجیے اس کے معنی ہوتے ہیں کسی دعوے کو سچ کرکے دکھا دینے والا' یہ معنی ہوتے ہیں مصدق کے۔کہا کہ تمہارے ہاں یہ دعوے ہیں۔دعویٰ یہ تھا کہ جیسی تیری بادشاہت آسمان پہ ہے ویسی زمین پر بھی قائم ہو۔یہ دعویٰ ہے میں مثال دے رہا ہوں دعویٰ ہے انجیل کے اندر۔قائم نہیں ہے' ویسی بادشاہت زمین کے اوپر کیونکہ ایک تو وہ تعلیم ہی تمہارے ہاں نہ رہی تم نے اس کو مذہب میں بدل دیا پھر وہ قوم نہ رہی۔یہ کتاب وہ آئی ہے کہ جس میں یہ دعاوی یہ Truths یہ حقائق یہ صرف Abstract طور پر نہیں دیے گئے نظری یا Theoratical طور پر ہی نہیں دیے گئے کہ ان کو یوں بیان کردیا ہے۔

موجودہ انجیل میں سوائے ایک قانون کے کوئی قانون موجود نہیں جب کہ اسے بھی ختم کردیا گیا ہے

انجیل نے تو یہ کہہ دیا صرف کہ اس دنیا میں انسانوں کا نظم ونسق بھی ویسا ہونا چاہیے جیسا تیری کائنات کے اندر چل رہا ہے۔یہ ہے وہ بات جو کہی۔اس کے بعد ساری انجیل میں کہیں نہیں بتایا گیا کہ یہ کیسے قائم ہوگا۔انجیل میں تو کوئی Law ہی نہیں ہے' کوئی قانون ہی نہیں ہے۔ساری انجیل میں ایک قانون ہے جو چل ہی نہیں رہا۔وہ جو کہتے ہیں ''اگوں چلے تین سالانی دوانہے اک نوں نظر ای نئیں اوندا''۔ ایک قانون چل ہی نہیں سکتا' قانون یہ ہے کہ شادی یہ ٹوٹ ہی نہیں سکتی تاوقتیکہ زنا کے جرم کا ارتکاب نہ ہوجائے۔ یہ قانون ہے۔ مصیبت میں پڑی ہوئی ہے ان کی دنیا۔پہلے تو انہوں نے یہ کیا کہ اچھا بھئی! پیچھا چھڑانے کا طریقہ یہ ہے میاں بیوی آپس میں صلاح

کر کے جنہوں نے طلاق لینی ہوتی تھی' وہ الزام لگا دیتے تھے کہ چلو پیچھا چھوٹے۔ اب یہ چیز جو تھی بڑی الجھنوں کا موجب تھی انہوں نے کہا "سیاپا ای مکاؤ" نہ رہے بانس نہ بجے بانسری' انہوں نے کہا کہ نہیں! یہ قانون ہی غلط ہے قانون وہ ہے جو ہم خود بنائیں گے' سیکولر ہونی چاہیے حکومت۔ ایک قانون تھا وہ بھی ختم ہوا۔ تو اس میں تو یہ بتایا ہی نہیں گیا کہ انسانوں کی زندگی میں کس طرح سے بادشاہت وہ نظام قائم ہو جو اس حسن وخوبی سے چلے جیسا کائناتی نظام چل رہا ہے۔ کہہ تو دیا تھا انجیل نے' بتایا نہیں تھا کیسے ہوگا۔

قانون پر عمل پیرائی کے لیے جذبہ صادقہ کی اہمیت اور جہد مسلسل لازم ہے

خدا کہتا ہے کہ یہ کتاب وہ ہے جو تمہارے اس دعوے کو سچ کر دکھائے گی کہ یوں قائم ہوتا ہے۔ یہ ہوتا ہے مصدق۔ Abstract نظری طور پہ Theoratically قوانین کا دیدینا' کچھ مشکل نہیں ہے۔ یعنی اب میں یہ کہہ رہا ہوں اس لیے کہ یہ عالمگیر Ethics جسے آپ کہتے ہیں اخلاقیات کی باتیں ہر جگہ موجود ہیں: دیانتدار رہنا چاہیے' چوری نہیں کرنی چاہیے' برائی نہیں کرنی چاہیے' فریب نہیں کسی کو دینا چاہیے' زنا نہیں کرنا چاہیے۔ ساری دنیا میں یہ ساری چیزیں موجود ہیں اس کے باوجود ساری دنیا میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ یہ نظریات وقوانین Theoratically تو دیدیے گئے' عملاً بتایا نہیں کہ کیا کیا جائے جس سے یہ کیفیت پیدا ہو جائے کہ کوئی شخص کسی کو فریب دے نہ سکے۔ یہ کتاب یہ کچھ دیتی ہے ایک نظریہ ایک تھیوری ایک صداقت Truth ایک قانون دیتی ہے اور پھر یہ بتاتی ہے کہ یہ کس طرح سے عملاً متشکل ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ کے عہد میں قائم کیے گئے نظامِ حیات کی کیفیت

یہ قوانین دینے کے بعد نبی اکرم ﷺ نے جو ان سے بحث کی ہے یا کہہ دیجیے کہ ان کو دلائل سے منوایا ہے۔ دلائل دینے کے بعد انہوں نے کہا کہ نہیں! ہم سمجھتے ہیں کہ جس روش پہ ہم چل رہے ہیں' وہی صحیح ہے۔ اس کے بعد پتہ ہے آپ ﷺ نے پھر آگے کیا کہا قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (6:135) کہ بہت اچھا! جھگڑے کی کوئی بات نہیں' تم اپنے پروگرام پہ عمل کرو میں اپنے پروگرام پہ عمل کرتا ہوں نہ میں Interfere کرونگا نہ تم Interrupt کرو تھوڑے ہی دنوں کے بعد نتائج بتا دیں گے کہ کس کا دعویٰ سچا ہے۔ اسے مصدق کہتے ہیں۔ دعوے کو سچ کر کے دکھا دینا۔ جس معاشرے میں پیدا ہونے والی حقیقی بیٹی باپ کے ہاتھوں محفوظ نہیں تھی' اس معاشرے کے اندر یہ کیفیت عملاً کر کے دکھا دی کہ یمن سے ایک عورت تنہا ان صحراؤں کے اندر سے سفر کرتی ہوئی شام تک پہنچ جائے اور اس کو کسی کا خطرہ نہ ہو۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (2:97)۔ جرم مٹ جائے گا۔ ایک مجسٹریٹ کی اسامی Sanction کر دی تھی نا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے' ہونا چاہیے تھا کہ جرائم ہوں ان کا فیصلہ کر دیا جائے' حضرت عمرؓ کو مقرر کر دیا تھا

مجسٹریٹ۔سال بھر کے بعد انہوںؓ نے کہا کہ خوامخوہ کے لیے کاغذ کے اوپر یہ اسامی آپؓ نے رکھی ہوئی ہے اس کو Abolish کیجیے سال بھر تک کوئی مقدمہ ہی نہیں آیا۔مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (2:97)۔عملاً وہ نظام متشکل کر کے دکھا دیا یعنی اس کا طریقہ بتا دیا کہ یوں متشکل ہوتا ہے۔مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَيْنَ يَدَيْهِ (6:92) دیکھا دولفظ قرآن نے جو کہے ہیں اس قرآن کی تعریف میں خود کہ یہ کیا ہے۔کس قدر جامع ہیں کس قدر Practical ہے Pragmatic test جسے آج کہتے ہیں مذہب کی دنیا میں Pragmatic test۔

ہر چیز آخرت پر ہی موقوف نہیں ہوتی بلکہ زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے

مذہب کی دنیا میں ہر عمل کا نتیجہ قیامت میں جا کے سامنے آتا ہے ''ثواب دا کم ہووے بھاویں پُن دا کم ہووے'' اس دنیا میں اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔یہ وہ کتاب ہے کہ جو کچھ یہ کہتی ہے' وہ یہاں کر کے دکھاتی ہے۔پھر جامد نہیں ہے کہ اس زمانے کے جتنے لوگ ان کے لیے تو یہ کچھ کیا' اس کے بعد دنیا آگے بڑھ گئی' مبارک ہے۔پھر یہ نہیں ہے سیکولر ہے کہ جس قسم کی پارٹی In-power آ گئی اسی قسم کا Law بن گیا۔کسی قسم کی نہیں' اسی پارٹی میں آج آپ قانون پاس کرتے ہیں رات کو کسی طرح سے ایک ممبر اُدھر سے اِدھر فلور کراس کر کے آ جاتا ہے دوسرے دن اس قانون کو آپ خود ہی بدل دیتے ہیں۔تو نہ تو یہ جامد ہے کہ زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ ہی نہ دے سکے نہ یہ اس قدر تبدیل ہونے والی ہے کہ ایک ووٹ دوسری طرف چلا جائے اور آج جو Truth ہے یہ کل آپ کے ہاں یہ بن جائے۔

عملی طور پر قرآنی نظام کی ابتدا تو مکہ میں ہی کر دی گئی تھی

مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَيْنَ يَدَيْهِ (6:92)۔کہا چلئے اب اس پر شروع کیجیے پروگرام۔اب خدا کی کتاب ہے' خدا کا رسول ہے' بس اس نے آواز دی اور ساری دنیا مسلمان ہو گئی۔اس نے کہا کہ نہیں! اس کے لیے تو ایک پروگرام مقرر کرنا ہوگا اور پروگرام یہ ہے کہ بتدریج ایسا ہوگا۔ابتداء کرنے کے لیے یہاں تم ہوا ے رسول! یہاں سے اس کی ابتداء کرو۔وَ لِتُـنْـذِرَ اُمَّ الْـقُـرٰى وَ مَـنْ حَـوْلَهَـا (6:92) سب سے پہلے تو یہی جو مکہ ہے' اہلِ مکہ اور اس کے اردگرد کے کچھ لوگ اسے یہیں تک ابھی محدود رکھو۔Practical Program ہے ایک عملی نظام ہے محض وعظ نہیں کہتے پھرنا۔بیٹھ جاؤ اور یہ شروع کر دو یہاں۔وہاں سے ابتداء کرو اور پھر اس ابتداء کے بعد جو پھر انتہا ہے وہ تو آپ کے سامنے ہے۔نبی اکرم ﷺ کے خود دورِ مبارک کے اندر دس لاکھ مربع میل کے اوپر ایک عملاً مملکت قائم ہو گئی تھی کہ جیسی تیری بادشاہت آسمان پہ ہے' زمین پہ بھی ہو۔اور اس کے بعد پھر جو بڑھی ہے بائیس لاکھ مربع میل تک حضرت عمرؓ کے زمانے میں پہنچ گئی تھی اور پھر اس کے بعد تو آپ پوچھئے نہیں۔اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا (6:92) سے بات شروع کرو۔یہاں سے

عزیزانِ من! جو بھی قرآن کے اوپر عملاً شروع کرے گا' وہ ابتداء اس طرح سے اس کی کرے گا۔ ایک جماعت سے' ایک مقام سے اس کی ابتداء ہوگی۔ اس کے عملی نتائج جب سامنے آئیں گے تو اس کے بعد اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ o وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا (2-1:110) اس کے نتائج کو دیکھ کر یہ مناظروں سے نہیں کرنے کی بات' یہ تو عملی نتائج دکھانے کی بات ہے۔ ہجوم ہوتا ہے اس ڈاکٹر کی دوکان پر جس کے متعلق ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے۔ ڈگریوں کو بھی نہیں دیکھتے لوگ اس وقت' نتائج کو دیکھتے ہیں۔

مملکت اسلامیہ میں ایمان والوں کے لیے بنیادی شرط

اب بنیاد ہے اس چیز کی وَ الَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ (6:92) پہلی چیز یعنی ایمان کے اجزاء ویسے تو قرآن نے خود بتائے ہیں خدا پر ایمان' ملائکہ پہ ایمان' رسولوں پہ ایمان' کتابوں پہ ایمان' آخرت پر ایمان (4:136)۔ لیکن اس نے بنیادی طور پر بتایا یہ ہے خدا پہ ایمان اور آخرت پر ایمان۔ درمیان کی چیزیں وہ واسطہ ہوجاتی ہیں اس کا۔ میں بتاؤں گا ٹھہر کے۔ آخرت پر ایمان اس کی اہمیت کیا ہے۔ بات ہی یہاں سے دین کی شروع ہوتی ہے۔

انسانی زندگی کے دو الگ الگ پہلو الگ الگ تصورات اور اصولِ حیات

زندگی کا ایک تصور تو یہ کھایا پیا افزائش نسل کی مر گیا اسے کہتے ہیں Materialistic concept of life (مادی تصورِ حیات) حیوانی سطح زندگی۔ اس زندگی کے تصور کے مطابق معاشرہ یا سوسائٹی کے جو قوانین ہیں ان کو جو شخص مانتا چلا جائے بس وہ ٹھیک ہے اس سے بلند کوئی قانون ہی نہیں۔ اور معاشرے کے قانون تو یہ خود بیٹھ کے اکیاون ووٹ سے طے کرلیں گے۔ یعنی جو کچھ کرنا ہو اس پارٹی نے' اگر وہ یونہی اس پارلیمنٹ کے ایوان سے باہر یہ کچھ کرے تو اسے ڈکٹیٹرشپ کہا جاتا ہے اگر یہ اناؤنس کرکے ڈیٹ' اندر جا کے بیٹھ جائے اور وہاں 51 ووٹ سے وہی کچھ پاس کرآئے تو یہ Constitutional ہوجاتا ہے۔ روز بدلتے جاؤ۔ یہ دوسری پارٹیاں جھپٹے کیوں مارا کرتی ہیں کہ یہ اقتدار اس کے نہیں' ہمارے ہاتھ میں آنا چاہیے؟ اس لیے کہ وہ قانون ایسا بناتے ہیں جو ان کے فائدے میں ہوتا ہے' ان کے نقصان میں ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا اچھا بچہ ٹھہر جاؤ ذرا' چار ممبر ساتھ ملائے' الٹ کے رکھ دیا۔ یہ جو مادی تصورِ زندگی کہ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے' مرنے کے ساتھ زندگی کا خاتمہ' جس طریقے سے بھی یہ زندگی امن امان سے دولت سے امارت سے خوشحالی سے گذرتی ہے بس ٹھیک ہے۔ بس اتنی سی بات ہے کہ معاشرے کے قانون کی گرفت میں نہ آجایئے۔ گرفت میں آجایئے تو اس سے چھوٹنے کے طریقے کچھ اختیار کرلیجیے' رشوت دیدیجیے' سفارش پہنچادیجیے معاملہ ختم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس تصورِ زندگی کے ماتحت نہ

خدا کو ماننے کی ضرورت پڑتی ہے نہ ابدی قوانین کو نہ کسی رسول کو نہ کسی کتاب کو' سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لیے سیکولر سٹیٹ اور Atheism جو ہے لازم وملزوم ہوتی ہے یعنی خدا سے انکار۔

خدا کا تصور آخرت کے تصور کو تسلیم کیے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتا

خدا کے ماننے کے معنی یہ ہیں عزیزانِ من! صرف سوچ رکھئے معنی یہ ہیں کہ ابدی قوانین ہیں جن میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ یہ تو ہوا خدا پہ ایمان۔ اور اگلی بات کہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے سے یہاں کسی کی گرفت میں آؤ یا نہ آؤ' زندگی یہاں ختم نہیں ہوجاتی' یہ آگے بھی چلتی ہے اور ہر عمل کا نتیجہ میرے سامنے آکر رہے گا اس زندگی کے اندر آجائے یا اس کے بعد کی زندگی کے اندر آجائے۔ یہ ہے جی تصور ایمان بالآخرت' وہ ہے تصور خدا کا۔ دیکھئے کتنی بڑی عجیب چیز قرآن نے کہی ہے۔ کہا ہے کہ اس کتاب کے اوپر صرف وہ لوگ ایمان لائیں گے جو یہ مان لیں کہ زندگی یہیں ختم نہیں ہوجاتی' زندگی آگے چلتی ہے۔ جو یہ نہیں مانتا اس کو ضرورت ہی نہیں' نہ اس پہ ایمان لانے کی نہ وہ ایمان لائے اس پہ فائدہ ہی کچھ نہیں ہے۔ یہ جو روز تلاوت کے باوجود آپ کا معاشرہ ہر وہ کام کرتا ہے جس سے اس نے منع کیا ہوا ہے اس کے معنی یہ ہیں' کیا ہیں؟ کیوں یہ ہو رہا ہے؟ ایمان بالآخرت نہیں ہے آج۔ دلوں کو کوئی ٹٹول کہ دیکھ لے' ہے یہ بات کہ جو کچھ میں کرتا ہوں اس کے اوپر میری گرفت ہوگی Accountability ہے میں اس کا ذمہ دار ہوں اس کا نتیجہ میرے سامنے آئے گا۔ چوراہے پہ پولیس والا دور سے دیکھ لیا جائے' سائیکل کے اوپر آپ سوار ہوں کبھی Right کی طرف نہیں گھومتے آپ' کوئی دیکھنے والا ہے' کوئی گرفت کرنے والا ہے' وہاں تک میں نے پہنچ جانا ہے' اس نے پکڑ لینا ہے سزا ملنی ہے' دیکھا قانون کی پابندی کیسے ہو رہی ہے۔ اور اگر یہ ہو کہ کوئی سپاہی ہے ہی نہیں آگے ڈیوٹی پہ' ہے بھی تو وہ دونی والا ہے سارا' سوال ہی نہیں کہ پھر آپ دائیں اور بائیں کا امتیاز کریں سیٹی بجاتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ یہ ایمان بالآخرت ہے زندگی کے تسلسل' ایمان مکافاتِ عمل سے کہ میرے ہر ایکشن کا ری ایکشن ہی نہیں بلکہ قرآن کی رو سے' دل میں گذرنے والے خیالات کا بھی ایک نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور میرے سامنے آنا ہے میں نے اسے بھگتنا ہے نہ رشوت چھڑا سکتی ہے نہ سفارش چھڑا سکتی ہے نہ کوئی دوسرا اسے بھگت سکتا ہے۔

قرآن حکیم کی تعلیم کے مطابق تصور حیات کا بدلنا ہی آخرت پر ایمان لانے کا ثبوت ہے

ابھی آتی ہے وہ آیت' خدا کرے آج وہ وقت ہو وہاں تک میں پہنچ جاؤں بڑی عجیب آیت ہے۔ کوئی نہیں اس سے بچا سکتا۔ یہ ہے اگر ایسا ہی ایمان جیسا کہ ایک دیانتدار آدمی کا پولیس والے کے متعلق ایمان ہوتا ہے تو پھر تو وہ کہتا ہے کہ قرآن پہ ایمان لانا' کچھ بات ہے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر اس کے بعد اسے لاکھ پڑھئے' اسے لاکھ سر پہ اٹھایئے' اسے لاکھ طاق میں رکھئے' اس پہ ایمان نہیں ہوسکتا۔

بڑی عظیم آیت ہے۔وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (6:92) یعنی یہ نہیں کہا کہ جو اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ آخرت پر ایمان رکھیں گے' جو تصورِ حیات یہ بدل لیں گے جیسا یہ کہتا ہے' جب وہ اس تصور کو لے آئیں گے پھر اس کے اوپر ایمان لانے کی ضرورت پڑے گی انہیں ورنہ ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔عجیب چیز ہے قرآن۔میں پھر دہرا دوں یہ نہیں کہا ہے کہ جو اس پر ایمان لائیں گے' آخرت پر ایمان لے آئیں گے۔اس پہ وہی ایمان لائیں گے جو پہلے یہ تصور Concept of life جس کے ذہن میں یہ بدلے گا' وہ اس پہ ایمان لائیں گے۔کوئی شخص جسے آپ قرآن کی ان جتنی بڑی بڑی چیزیں ہیں' اچھے قوانین ہیں' دلائل ہیں' ان کا قائل بھی کر لیجیے اگر وہ مادی نظریۂ حیات رکھتا ہے تو وہ یہ کہے گا کہ ہاں! اچھی چیز ہے' عمدہ دلیل ہے' اسے ضابطۂ حیات بنانے کے لیے' وہ تیار نہیں ہوگا۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (6:92)۔اور وہ آگے پروگرام دیا۔اس کے لیے۔وَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (6:92) عام تصور بھی عام ترجمہ بھی کہ وہ پھر نماز کی پابندی کرتے ہیں۔یعنی سارا مسئلہ ان کے نزدیک حل ہو گیا۔

ہمارے ہاں صلوٰۃ کے محدود ترجمے نے قرآنی نظامِ حیات کے تصور کو ہی ختم کر دیا

اتنی عظیم چیز مصدق ہے یہ' سچ کر کے دکھا دینے والی ہے ان دعاوی کو جو پہلے ہوتے چلے آ رہے ہیں زندگی میں۔یہ ایمان ہے اور اس کے بعد ایک ہی بات کہی ہے' صلوٰۃ کی محافظت کرتے ہیں۔عزیزانِ من! صلوٰۃ کے متعلق جو کچھ اور بہت کچھ کہا ہے قرآن نے' اسے نظر انداز بھی کر دیجیے یہ آیت تو آپ کے ہر جمعہ کے خطبہ میں بھی دہراتے ہیں اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (29:45) یہ عام وعظوں میں بھی کہتے ہیں کہ صلوٰۃ فحشا اور منکر سے روکتی ہے۔فحشاء کے کچھ ہی ترجمے کیجیے بہر حال بے حیائی کی باتیں فحش باتیں بخل کی چیزیں' منکر کہتے ہیں ہر وہ چیز کہ جس سے صداقت اِباء کرے' اس کے خلاف جائے۔بڑی جامع چیز ہے۔قرآن کہتا ہے کہ صلوٰۃ ان چیزوں سے روک لیتی ہے۔ Test Pragmatic کیا یہ صلوٰۃ ہماری جسے ہم نماز کہتے ہیں' یہ روکتی ہے ان چیزوں سے' کیا نماز کی پابندی کرنے والوں کا کردار ایسا ہے' کیا روک رہی ہے یہ صلوٰۃ اس کو؟۔اس کے لیے کسی بحث کی ضرورت نہیں صورت بیں' حالش میپرس نظر آ رہے ہیں' نمازی ہمارے سامنے۔کیا یہ کرتی ہے؟ ان سے بھی جب پوچھئے تو وہ کہیں گے کہ جی "بندہ بشر گنہگار ہوندا ہیگا"۔او کیسے گنہگار رہوتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ صلوٰۃ یہ نہیں کرنے دیتی۔کس نتیجے پہ آپ پہنچتے ہیں (معاذ اللہ) کیا اس پہ کہ جس نے یہ بات کہی تھی یونہی شاعری کر دی تھی کہ یہ روکتی ہے' اس سے' کیونکہ یہ تو نہیں روکتی۔تو اگلی بات یہی ہے نا کہ وہ جو اس نے کہا ہے روکتی ہے یہ وہ نہیں ہے۔کیونکہ یہ تو مصدق ہے جب اس نے کہا ہے' یہ روکتی ہے تو وہ جو چیز دے گا صلوٰۃ جو اس نے کہا ہے' اس کا ذریعہ ہے وہ سچ کر کے دکھائے گی اس دعوے کو۔اور اگر یہی سچ کر کے نہیں دکھاتی تو یہ سارا قرآن اور چیزوں کا مصدق کیا ہوگا۔یہ ہے۔دین کو مذہب میں لے آنا۔

قرآنِ حکیم کا نظامِ صلوٰۃ پوجا پاٹ یا پرستش سے بہت بلند ہے

ہر مذہب میں پوجا پاٹ' بندگی' پرستش' Worship یہ چیزیں آ گئیں۔ یہ جتنی چیزیں ہیں پوجا پاٹ' بندگی' Worship' پرستش آپ دیکھتے ہیں' ان کے کوئی محسوس عملی نتائج نہیں سامنے آتے۔ خدا کی بھگتی خدا کی بندگی' زیادہ سے زیادہ یہی کہیں گے کہ آگے چل کے اس کا نتیجہ نکلے گا' یہاں کوئی نتیجہ نہیں۔ کسی بندگی بھگتی کا نتیجہ یہاں نہیں نکلتا۔ اسی زمرے میں آپ کے ہاں کی نماز آ گئی۔ وہ اس کے لیے کہتا ہے کہ یہ کچھ ایسی چیز ہے کہ وہ یہ کرے گی۔ کبھی آ گئی یہ چیز صلوٰۃ کے متعلق تو میں' ایک درس نہیں' پتہ نہیں کتنے درس اس پہ دونگا۔ قرآن کی آیات ایک ایک کر کے آپ کے سامنے لاؤنگا۔ صلوٰۃ یہ کرتی ہے' صلوٰۃ یہ کرتی ہے' صلوٰۃ یہ کرتی ہے۔ اور آپ کی یہ نماز اس میں سے کچھ بھی نہیں کرتی۔ تو یہ جو چیز کہی ہے وَ هُمۡ عَلٰی صَلَاتِهِمۡ یُحَافِظُوۡنَ (6:92) عزیزانِ من! صلوٰۃ قرآنِ کریم کی رو سے وہ پورا نظام ہے جو قرآن دیتا ہے جس میں ہر فرد قوانینِ خداوندی کے پیچھے پیچھے چلتا چلا جاتا ہے۔ یہ ایک جامع نظام کا نام ہے۔ اس نے یہ کہا ہے۔ پہلی چیز یہ Concept life کا جو ہے وہ بدل لیا جائے گا' زندگی یہی طبعی زندگی نہیں جو یہاں ختم ہوتی ہے' زندگی آگے چلتی ہے۔ میرے ہر عمل ہر خیال اور ارادہ جو ہے اس کا نتیجہ میرے سامنے آنا ہے۔ اب اس کے لیے مجھے یہ زندگی ایسے بسر کرنی چاہیے کہ وہ جرائم کی زندگی نہ ہو۔ کچھ ایسا ہو جو ان چیزوں سے روکے۔ اس نے کہا کہ وہ نظامِ صلوٰۃ ہے۔ صلوٰۃ کے معنی یہ ہیں کسی کے بالکل پیچھے پیچھے چلتے جانا۔ یہ جسے آپ نماز کی الحمد میں اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ (1:5) کہتے ہیں کہ صراطِ مستقیم کی طرف میری راہنمائی تو کر دے' یہ آرزو ہے۔ یہ کونسا راستہ ہے؟ قرآنِ کریم میں ہے اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (11:56) خود خدا صراطِ مستقیم پہ چل رہا ہے۔ وہ آگے آگے چل رہا ہے' تم پیچھے پیچھے چلو' اسے صلوٰۃ کہتے ہیں۔ تفصیل اس کی لمبی چوڑی ہے۔ یہ اجتماعات بھی نہایت ضروری ہونگے اس میں کیونکہ زندگی اجتماعی ہے' بھگتی اور پوجا پاٹ کے لیے نہیں ہے' اس نظام کے متشکل کرنے کے لیے ہے۔ جہاں صلوٰۃ کے قیام کا ذکر آیا ہے سورۃ شوریٰ میں' اس میں آپ دیکھئے قیامِ صلوٰۃ کے ساتھ ہے وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ (42:38) صلوٰۃ کا نظام قائم کرتے ہیں کیونکہ ان کے معاملے باہمی مشورے سے طے ہونے ہیں۔ بات میں نے عرض کیا ہے کہ تفصیل سے سامنے آئے گی جب صلوٰۃ کے متعلق کوئی درس ہوگا۔ تو تین ہی چیزیں قرآن نے بتائی ہیں: زندگی کے متعلق یہ تصور بدلو کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے۔ اس کے بعد قرآن کے اوپر پھر ایمان لایا جائے گا' غیر متبدل قوانین جن میں زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت ہے۔ مصدق ہے جو دعویٰ کرتا ہے' عملاً اس کے لیے پروگرام دیتا ہے جس سے وہ دعویٰ سچ بن کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس کے لیے ایک نظام دیتا ہے' جسے نظامِ صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ اس کی حفاظت اسکی محافظت جب تک کی جائے گی' یہ سارا کچھ ہوتا چلا جائے گا۔ جب وہ نظام نہیں رہے گا' یہ دین مذہب میں بدل جائے گا۔ پھر اس کا Pragmatic Test نہیں رہے گا' یہ نہیں ہوگا کہ اس کے عملی

نتائج آپ کے سامنے آئیں۔ پھر ہر فرد کے اپنے اپنے سکون اور اطمینان کی بات ہو جائے گی۔ ہر مذہب میں جو کچھ انسان جسے اچھے کام کہتا ہے' اس سے اپنا اطمینان ہو جاتا ہے اس میں بھی یہ چیز ہو گی۔

میری انفرادی نماز میں بھی نظام صلوٰۃ کے قیام کی آرزو کو زندہ کرنے کا مقصد' ہمیشہ میرے پیش نظر رہتا ہے پرویزؒ

میں یہیں یہ بات عرض کردوں عزیزانِ من! کہ یہ انفرادی طور پہ بھی جواب ہم یہ نماز پڑھتے ہیں' یہ نہ کہیے کہ میں اس کی مخالفت کر رہا ہوں۔ بہر حال اپنی حد تک تو احباب کو پتہ ہے' میں خود نماز پڑھتا ہوں۔ یہ ایک انفرادی چیز ہے اور یہ اس لیے ہے (اپنے متعلق میں عرض کر رہا ہوں اوروں کے متعلق تو اور چیز ہے) کہ انسان کے قلب اور ذہن میں ایک رشتہ ضرور رہنا چاہیے ہر وقت اس چیز کا کہ جب بھی یہاں یہ حالات درست ہونگے' تیرے دیے ہوئے قوانین کے ماتحت ہونگے۔ آج نہیں درست ہو رہے تو اس لیے نہیں ہو رہے کہ تیرے ساتھ وہ تعلق اور رشتہ باقی نہیں رہا۔ اس چیز کے متعلق انفرادی طور پہ اپنے آپ کے متعلق یہ آرزو' دعا اس چیز کی کہ مجھ میں ہی اتنی توفیق پیدا ہو جائے کہ میں ہی اس کے لیے کچھ Contribute کر سکوں کہ کسی طرح سے وہ نظام تیرا یہاں قائم ہو جائے۔ یہ وعدے یہ آرزوئیں' یہ خدا سے اس کی توفیق اپنے اندر طلب کرنا' ایک امنگ کو اپنے اندر بیدار کرنا' اس مقصد کو اپنے سامنے ہر وقت بیدار رکھنا' ایک تعلق قائم رکھنا اس کے ساتھ۔ میں اوروں سے نہیں کہہ سکتا کم از کم میں جو انفرادی نماز ادا کرتا ہوں اس میں مجھے تو یہ نتیجہ جو میرے سامنے آتا ہے' میرا تو یہ مقصد ہے۔ یہ نظامِ صلوٰۃ نہیں ہے۔ یہی افراد اس نظام کو قائم کریں گے۔ میں اس نظام کا ایک فرد بن سکتا ہوں کیونکہ میں نے اس آرزو کو زندہ رکھا ہوا ہے' اپنے ہاں تابندہ رکھا ہوا ہے۔ میں اس خدا کے ساتھ تعلق کو نہیں توڑنا چاہتا۔ یہ اجتماعی نظام نہیں ہے تو اس میں پورے کا پورا میں ذمہ دار نہیں ہوں ایک حد تک ہوں' فرد ہونے کی حیثیت سے۔ لیکن اس کے باوجود میں اس تڑپ اور آرزو کو مردہ نہیں ہونے دینا چاہتا' اس کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ خدا کے ساتھ یہ تعلق رکھنا چاہتا ہوں کہ تیرے ہی دیے ہوئے نظام کے ماتحت کائنات سنور سکتی ہے انسانیت سدھر سکتی ہے' اس کے بغیر نہیں کچھ ہو سکتا۔ جو کچھ ہم پہ گذر رہی ہے اس کی بھی وجہ یہ ہے کہ تجھ سے تعلق ٹوٹ گیا ہوا ہے' اس تعلق کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں اس احساس کو بیدار رکھتا ہوں عزیزانِ من! اس چیز سے جسے انفرادی نماز کہتا ہوں اور میں اس کو بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ لیکن کبھی اس دھوکے میں اپنے آپ کو نہیں رکھتا کہ یہ وہ اجتماعی نظام' انفرادی طریق کے اوپر پورا ہو جاتا ہے جو قرآن نے کہا تھا۔ وہ فریضہ اسی وقت ہو گا' جب امت پوری اس نظام کو یا کسی ایک ٹکڑے میں ایک خطۂ زمین میں جیسا قرآن نے کہا ہے وَ لِتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰی وَ مَنۡ حَوۡلَهَا (6:92) کسی ایک خطۂ زمین کے اندر اگر یہ نظام قائم ہو جائے گا' اس دن نظامِ صلوٰۃ ہو گا۔ اس

وقت میری طرح سے اور بھی افراد ہونگے یہ ان کی انفرادی تمنائیں اور آرزوئیں ہیں؛ جن کے اظہار کا ذریعہ یہ انفرادی نماز ہو جاتی ہے مقصود وہ ہے۔ یہ اس نہ ہونے کا نام ہے جس کے لیے ہم یہ کرتے ہیں بشرطیکہ اس فریب میں نہ ہم آ جائیں کہ اس سے اُس فریضے کی تکمیل ہوگئی ہے جو قرآن کہتا ہے کہ نظامِ صلوٰۃ میں یہ کچھ ہوگا۔ وہ اپنے مقام پہ ہے اس کا یہ چیز ہے۔ **وَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ** (6:92)۔ سورۃ الانعام کی آیت 92 تک عزیزانِ من! ہم آ گئے 93 سے آگے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

بارھواں باب **سورۃ الانعام** (آیت 93)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1971ء کی 17 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی 94 آیت سے ہوتا ہے (6:94)۔

سابقہ آیت میں قرآنِ کریم کے متعلق کہا گیا تھا وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ (6:92) اور میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اس کتابِ عظیم کی یہ جو دو بنیادی خصوصیات بتائی گئی ہیں مبارک اور مصدق اس کا مفہوم کیا ہے اس کے معنی کیا ہیں۔ وہ آپ کے پیشِ نظر ہونگے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اس سے پہلے یہودیوں کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ ہم نے تمہاری طرف بھی ایک ایسی ہی کتاب نازل کی تھی اس میں بھی خدا کی طرف سے نوعِ انسانی کے لیے ہدایت آئی تھی تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ (6:91) تم نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور وہ ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا جو عملی مفہوم تھا وہ یہ تُبْدُوْنَهَا وَ تُخْفُوْنَ كَثِیْرًا (6:91) وہ اس لیے کر دیا تم نے کہ کچھ حصہ اس کا جو تمہارے مفاد کے خلاف ہؤا اسے چھپاؤ جو تمہاری منشاء کے مطابق ہؤا اسے ظاہر کرو۔ پوری کی پوری کتاب اگر سامنے آئے گی تو اس میں پھر اس کی تو گنجائش نہیں ہو سکے گی کہ کچھ حصوں کو چھپا دیا جائے اور باقی کچھ حصے کو ظاہر کیا جائے۔ تو اس کے لیے کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

قرآنِ حکیم کے خلاف ایک گہری سازش کہ اس کے کچھ حصے کو تو منسوخ کر دیا جبکہ باقی کو ثواب کے لیے مختص کر دیا

آپ کو یاد ہوگا جو مذہبی ذہنیت کارفرما تھی کہ کتاب کا وہی حصہ سامنے آئے جو ان کے مفاد کا تحفظ کرتا ہو اور دوسرا حصہ چھپا دیا جائے۔ Physically طبعی طور پہ محسوس طور پر قرآن کے متعلق وہ ایسا کر نہیں سکتے تھے اس لیے کہ اسکی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا تھا۔ تو یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ کتاب کا کچھ حصہ کسی طرح سے بھی یہ چھپا دیتے۔ تو اس کے لیے ان کے ذہن نے ایک اور تدبیر سوچی اور وہ اس

سے بھی زیادہ کارگر ثابت ہوئی۔اور وہ یہ کہ یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ قرآنِ کریم کی بہت سی آیات اس میں موجود ہونے کے باوجود منسوخ ہیں یعنی وہ پڑھی جاتی ہیں لیکن وہ محض ثواب کی غرض سے پڑھی جاتی ہیں۔اور وہ منسوخ ہونے کے باوجود رکھی بھی اس لیے گئی ہیں کہ وہ قرآن کے متعلق تو ہے کہ اس کے ایک ایک حرف سے تیس تیس نیکیوں کا ثواب ہوتا ہے۔تو گویا اگر وہ حصہ کتاب میں سے نکال دیا جاتا ظاہر ہے کہ جو منسوخ ہو جائے اسے کتاب میں رکھنے کا فائدہ ہے۔لیکن کہتے ہیں کہ یہ اس کی رحمتِ بے پایاں ہے کہ منسوخ شدہ حصہ بھی اس نے قرآن میں رہنے دیا تا کہ یہ امت ثواب سے محروم نہ ہو جائے۔قرآن کے اس حصے سے تو محروم ہو جائے لیکن اس حصے کے ثواب سے محروم نہ ہو جائے۔جس شخص نے بھی یہ عقیدہ مسلمانوں میں رائج کیا اور یہ یہودیوں سے مستعار لیا گیا تھا۔میں سمجھتا ہوں کہ وہ اتنی بڑی سازش کر گیا ہے کہ جس میں امت آج تک الجھے ہوئے چلی آ رہی ہے۔بیکار کر کے رکھ دیا اس نے اس کتابِ عظیم کو۔

قرآنِ حکیم کے خلاف کی گئی سازش کی ابتدا دو چار فرضی ناموں کو نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر دیا گیا

اب کہا یہ جائے گا کہ یہ ناسخ و منسوخ کی روایات تو صحابہؓ سے منقول ہیں' کیسے تم نے کہہ دیا کہ کسی ایک شخص نے یہ مستعار لیا یہودیوں سے اور بڑی سازش تھی قرآن کے خلاف۔تو سازش تو اسی طرح سے یہ کامیاب ہوئی ہے ہماری کہ جو بھی عقیدہ جو بھی نظریہ جو بھی خیال وضع کیا گیا اس کے ساتھ ایک فقرہ عربی زبان کا چسپاں کر دیا اس میں پانچ چار نام درج کیے جن کو راوی کہا جاتا ہے اور کہا کہ فلاں صحابیؓ سے یہ روایت ہے۔اور صحابیؓ نہیں بلکہ یہ خود نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے۔اس کی کوئی سند نہیں اس کے سوا کہ اس وضع کرنے والے نے اس میں پانچ سات نام لکھ دیے تھے بس ان ناموں کے متعلق بعد میں یہ تحقیق انہوں نے کی۔تحقیق بھی کیا کر سکتے تھے کوئی چار پانچ سو سال کے بعد گذرے ہوئے انسانوں کے متعلق تحقیق بھی کیا ہو سکتی ہے۔بس ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ انہوں نے یہ کہا کہ یہ ثقہ سکہ ہیں' یہ غیر معتمد ہیں۔ورنہ کرنے کی بات اتنی ہی تھی کہ کوئی ایک فقرہ لیا اور آپ نے کہا کہ فلاں نے اس کو روایت کیا ہے۔اس نے اس سے سنا ہے' اس نے اس سے کہا پانچ چار نام اس میں لکھ دیے اور آپ کے ہاں وہ روایت بن گئی۔نام اگر احتیاط سے درج کیے ہیں لکھنے والے نے تو ثقہ روایت ہے ان کے معیار کے مطابق' بالکل صحیح ہے۔اس طرح سے یہ عقیدہ کہ قرآنِ کریم کی آیات منسوخ ہیں یہ اس سے بھی زیادہ خطرناک چیز ہو گئی جو کچھ یہودیوں نے کیا تھا۔جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ یہودیوں کے ہاں تو پھر بھی ہوا ہے دو اڑھائی ہزار سال کے بعد ہی سہی وہ Dead sea سے جو Scrolls نکلے ہیں اس زمانے کے وہ محفوظ کہیں رکھے ہوئے چلے آ رہے تھے تو ان میں اس زمانے کی تاریخ کا بہت سا حصہ سامنے آ گیا ہے۔گویا جو کچھ چھپایا گیا تھا ایسا ہو سکتا ہے کہ حوادثِ زمانہ سے وہ کسی طرح سے باہر آ جائے تا آنکہ اسے بالکل تلف ہی نہ کر دیا گیا ہو۔لیکن یہ جو چیز ہے کہ قرآن کے اندر وہ ساری آیتیں موجود ہوں' دن رات آپ پڑھتے ہوں' دہراتے ہوں' سنتے آپ کے ہاں ہوتے ہوں' یہ سب موجود ہوں لیکن وہ ہوں وہی جو انہوں نے کیا تھا کہ یہ حصہ منسوخ

ہے۔ایک تو یہ بڑی سازش تھی جو قرآن کے خلاف ہوئی۔

زوالِ امت کے اہم اسباب

اب اگلی آیت میں آپ آئیے۔تین گروہوں کا یہاں یا تین قسم کی ذہنیتوں کا ذکر اس میں آیا ہے۔ غور وتدبر کیا جائے تو ایک ایک چیز اس کی ایسی آتی ہے جس پہ وجد آجاتا ہے انسان کو۔آپ دیکھئے گا ان آیات میں کیا کہا گیا ہے قرآن۔قرآن کے خلاف جو سازشیں ہو رہی ہیں یا جو کچھ مذہبی پیشوائیت کرتی ہے وہ کن الفاظ میں اور کس انداز میں کہا گیا ہے۔وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا (6:93) ایک بات: اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اپنی طرف سے ایک چیز وضع کرے خدا کی طرف جھوٹا اسے منسوب کرے۔میں ابھی اس کا عام ترجمہ بیان کرتا ہوں۔یہ کیٹگریز یا یہ شقیں یا یہ گروہ جو ہیں میں آگے چل کے عرض کرونگا کہ یہ کونسے گروہ ہیں جن کا ذکر قرآن کر گیا ہے۔اَوۡ قَالَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ وَ لَمۡ یُوۡحَ اِلَیۡہِ شَیۡءٌ (6:93) یا وہ یہ کہے کہ مجھے خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے درآں حالیکہ اس کی طرف وحی ہو نہیں سکتی یا کوئی وحی نہیں ہوئی۔وَّ مَنۡ قَالَ سَاُنۡزِلُ مِثۡلَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ (6:93) اور تیسرا وہ جو یہ کہے کہ جو کچھ خدا کی طرف سے تم کہتے ہو' میں بھی ایسا کر سکتا ہو'ہر انسان ایسا کر سکتا ہے۔تراجم میں تو کیا آپ تفاسیر میں بھی دیکھیں گے تو بات اتنی سی کہہ کے آگے چلے جائیں گے کہ اس زمانے میں جھوٹے مدعیٔ نبوت تھے انہوں نے یہ کہا۔اور یہ تینوں چیزیں ایک ہی کیٹگری کے متعلق ہو گئیں کہا کہ ہمیں خدا کی طرف سے وحی آتی ہے۔نبوت کا دعویٰ کیا بہت ظالم تھے خدا کی طرف جھوٹ منسوب کیا اور خود کہا کہ جیسا خدا کا کلام ہو سکتا ہے، ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں۔گویا بس اتنا سا کہہ کے وہ آگے بڑھ گئے حالانکہ آپ کی پوری تاریخ اس کے اندر دیدی گئی ہے۔دین کے خلاف جو سازشیں ہوئی ہیں اس کی پوری تاریخ ان آیتوں کے اندر آگئی عزیزانِ من!۔جو کچھ اس کے خلاف ہوا ہے آپ دیکھیں گے کہ ان تینوں میں سے کسی ایک کیٹگری میں وہ لوگ آجاتے ہیں۔

سازش کرنے والوں کی پہلی کیٹیگری

پہلی کیٹگری اس میں کہی انسانوں کے خود ساختہ قوانین اور انہیں خدا کی شریعت بنا کر پیش کرنے والے۔یہ اربابِ شریعت ہیں۔دین تو خدا کی کتاب کے اندر ہے۔اس کے بعد آج آپ سنیں گے لوگوں سے کہ اس بارے میں اسلام یہ کہتا ہے۔اسلام تو کوئی متعین چیز نہیں ہے۔اسلام کا فیصلہ یہ ہے، کسی آدمی کا نام نہیں ہے کسی مخصوص کتاب کا ذکر نہیں ہے'اسلام یہ کہتا ہے، شریعتِ اسلامی میں یہ آیا ہے، شریعتِ حقہ کا یہ فیصلہ ہے، احکامِ شریعت کا اتباع کیجئے، بھئی کچھ بات متعین طور پہ کہیے۔متعین طور پہ جب آئیں گے تو گروہ بندانہ چیز آجائے گی۔حنفی ہیں تو فقۂ حنفی کی کسی کتاب کا حوالہ ہوگا اس میں، شیعہ ہیں تو شیعہ حضرات کی اپنی فقہ ہے' اپنی روایات کی کتابیں ہیں' ان کا حوالہ ہوگا اس میں۔اور پھر کچھ وہ بھی ہیں جو کہیں گے کہ ہمیں خود اجتہاد کا حق حاصل ہے اس لیے جو ہم کہتے ہیں وہ شریعت ہے۔کوئی

سی بھی شریعت آپ لیجیے آپ دیکھیں گے کہ کسی نہ کسی انسان تک جا کے وہ رک جائے گی' سندِ آخر کوئی نہ کوئی انسان اس میں ہوگا۔جنہیں روایات کی رو سے وہ نبی اکرمﷺ کی طرف بھی منسوب کریں گے' یہ تو کسی کو بھی دعویٰ نہیں ہے کہ رسول اللہﷺ کا یقینی طور پہ کوئی ارشاد یا کوئی قول بھی ایسا ہے جس کے متعلق کہا جائے کہ یہ یقینی اور حتمی طور پہ نبی اکرمﷺ کا ہے۔حتیٰ کہ صحیح ترین حدیث جن کو متواتر بھی کہا جاتا ہے ان کے بعد بھی یہ کہا جاتا ہے اوکما قال رسول اللہﷺ 'یہ یا جیسا رسول اللہﷺ نے فرمایا ہو' خود ہی یہ چیز کہتے ہیں کہ یقینی طور پہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضورﷺ نے بالیقین حتمی طور پہ ایسا ہی فرمایا تھا۔انہیں خود اس میں شبہ ہوتا ہے۔اور بات ہے بھی۔یہی صحیح چیز ہے کہ حضورﷺ نے تو کوئی اپنا مجموعہ اپنے ارشادات کا روایات کا احادیث کا اقوالِ مبارکہﷺ کا نہیں دیا امت کو۔تو جو بھی آپ کے ہاں یہ مجموعے جمع ہوئے ہیں جنہیں یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب رسول اللہﷺ نے یہ فرمایا حالانکہ جہاں یہ چیز آئی ہے ان کتابوں میں اس میں ہر ایک کے بعد یہ لکھا ہے کہ یہ یا جیسا رسول اللہﷺ نے فرمایا ہو۔تو حتمی اور یقینی طور پہ تو اس میں بھی نہیں کہا جا سکتا وہ بھی بات یہی ہوگی کہ بخاری میں یوں آیا ہے' مسلم میں یوں آیا ہے۔کسی ایک انسان کی کوشش کہ اس نے ان روایات کو لوگوں سے سن کے جمع کیا ایک انسان کے اوپر بات ہے۔روایات کے آگے آپ کے ہاں فقہ آتی ہے تو فقہ تو ہوتی ہی آئمہ کی ہے' وہ کہاں کی ہے؟ انسانوں کی ہے۔بعض کے نزدیک اجتہاد کا دروازہ ان فقہا تک بند ہو گیا وہ انہی کی سند لاتے ہیں۔بعض یہ کہتے ہیں کہ نہیں اس کے بعد بھی اس کی اجازت ہے وہ خود مجتہد بن جاتے ہیں وہ ان کی سند ہے بات تو کسی نہ کسی انسان کی ہوئی۔لیکن ان میں سے کوئی یہ نہیں کہتا کہ میں ایسا کہتا ہوں تم مانو' کہا یہ جاتا ہے کہ یہ شریعتِ حقا ہے' یہ اسلام کا فیصلہ ہے' یہ احکامِ خداوندی ہیں۔غلط ہے۔دین خدا کی کتاب کے اندر ہے۔احکامِ خداوندی وہی ہیں' جو خدا کی کتاب میں ہیں۔البتہ اس کتاب نے اپنا نہج یہ رکھا ہے کہ کچھ متعین احکام دیے ہیں اور باقی احکام کے لیے اصول مقرر کر دیے ہیں' حدود مقرر کر دی ہیں۔اور اس کے لیے عملی طریقہ یہ بتایا ہے کہ ایک نظام ہوگا' ایک مملکت ہوگی اسلامیہ وہ ان حدود کے اندر ان اصولوں کے تابع اپنے اپنے دور کے تقاضوں کو Meet کرنے کے لیے جزوی قوانین خود بنائے گی۔ان قوانین کے متعلق کہیں گے کہ فلاں اسلامی سلطنت نے قرآن کی روشنی میں یہ قوانین نافذ کیے تھے۔انہیں نہ ابدی حیثیت حاصل ہوگی نہ وہ غیر متبدل ہونگے۔وہی مملکت خود ہی تھوڑے سے عرصے کے بعد' اگر حالات بدل جائیں تو ان میں خود تبدیلی کر دے گی۔وہ نہ کرے گی تو اس کے بعد آنے والی اسلامی حکومت ان کے اندر تبدیلی کر دے گی۔انہیں بھی یہ سند دینی پڑے گی کہ ہم نے قرآن کے فلاں اصول کے تابع یہ قوانین وضع کیے ہیں۔اصل سند تو خدا کی کتاب کی ہوگی' ان کے تابع یہ جزوی اور عملی احکام' قوانین کی حیثیت سے ہم نے وضع کیے ہیں اور ان کو ہم نے نافذ کیا ہے۔یہ حیثیت ہوگی صحیح اسلام کی۔

کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی پوری انسانیت کے لیے کوئی غیر متبدل اصول دینے کی مجاز نہیں ہوسکتی

خدا کی طرف یا تو اس کے وہ معین احکام منسوب کیے جائیں گے جو قرآن میں ہیں یا وہ اصول وشرائط وحدود جو قرآن نے دی ہیں یہ تو خدا کی طرف نسبت صحیح ہوگی۔لیکن یہ کہنا کہ شریعتِ حقا میں یہ آیا ہے اسلام نے یہ کہا ہے اور جب اس کے بعد پہلے تو ضرورت ہی نہ سمجھی جائے کہ کچھ متعین طور پر کسی کو بتایا بھی جائے۔اور اگر کسی جگہ ضرورت بھی ہے تو کسی نہ کسی انسان تک بات جا کر رک جاتی ہے۔کسی انسان کا قول وہ کتنی بڑی شخصیت دنیا میں کیوں نہ ہو عزیزانِ من! دین نہیں آپ کو دے سکتی۔دین صرف خدا کا دیا ہوا ہوتا ہے۔اس لیے کسی انسان کے متعلق یہ بات کہنی کہ اس کا دیا ہوا قانون اس کا وضع کردہ کوئی اصول دین ہو جاتا ہے یہ جھوٹ ہے اور خدا کی طرف افتراء ہے۔دین ابدی ہے غیر متبدل ہے صرف خدا کی طرف سے دیا ہوا ہے۔کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے لیے دین نہیں دے سکتا۔یہی تو بنیادی لم ہے اس کے اندر کہ کوئی انسان دوسرے انسان کا محکوم وغلام نہیں ہوسکتا عبودیت صرف خدا کی ہے۔اس لیے جنہیں ہم قوانینِ شریعت کہتے ہیں اربابِ شریعت کے فیصلے جنہیں ہم کہتے ہیں' ان کے فتاوے جنہیں ہم کہتے ہیں' وہ سارے انسانی اقوال ہوتے ہیں۔ دین ایک نظام تھا اول تو اس کے اندر افراد کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے کسی فرد کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ اپنے طور پہ وہ اجتہاد کر کے لوگوں سے اسے شریعت کے طور پر منوائے' کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں ہے۔مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے خواہ خدا اسے کتاب ونبوت اور رسالت اور حکومت بھی کیوں نہ عطا کردے کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم میرے احکام کی اطاعت کرو۔کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہے' جائز نہیں کسی کے لیے۔

قرآن حکیم کی روشنی میں کیے گئے استنباط کو ہمیشگی کا درجہ حاصل نہیں ہوسکتا

جسے آپ شریعتِ اسلامی یا قانونِ خداوندی یا شریعتِ حقا کہتے ہیں آپ کا فرض ہے کہ اس کے لیے سند دیں۔یا تو متعین طور پہ قرآنی نقطہ نگاہ بتائیں اور اگر ایسا نہیں تو یہ کہیں کہ قرآن کے اس اصول کی روشنی میں یہ استنباط کیا تھا۔اور جو چیزیں استنباط کی ہونگی Inferences سے Draw کی ہونگی کسی دور کے اندر کی ہونگی' ابدی شریعت نہیں بن سکتی۔لیکن جیسا میں نے عرض کیا ہے افراد کو اس کا حق حاصل نہیں ہے۔جیسے اس دور میں حق حاصل نہیں تھا' آج بھی کسی فرد کو اس کا حاصل نہیں ہے کہ وہ یہ کہدے کہ یہ چیزیوں نہیں جیسے میں کہتا ہوں قرآن ہی کی روشنی میں' وہ کیوں نہ کہے کہ یہ چیز دوسروں کے لیے حکم بن جائے گی۔وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ چیزیں جو آپ کے ہاں آئی ہیں قرآن کی رو سے غلط ہیں یہ صحیح اسلام نہیں ہے' وہ یہ کہہ سکتا ہے۔اس کی جگہ کیا صحیح قانونِ اسلامی ہے کسی فرد کو اس کا حق حاصل

نہیں ہے۔اور یہ ہے وہ پوزیشن جو میں عرض کر رہا ہوں کہ میں نے چالیس سال سے اختیار کی تھی۔یہ چیزیں میں نے کہیں قرآن کی روشنی میں اپنی بصیرت کے مطابق؛ جس میں غلطی کا بھی امکان ہوسکتا ہے کہ یہ یہ مروجہ جو کچھ ہمارے ہاں مذہب کے نام پہ اسلام کے نام پہ ہورہا ہے' اس میں فلاں فلاں فلاں چیز عقیدہ نظریہ حکم مسلک موقف قرآن کے خلاف ہے۔

قرآنِ حکیم کے غیر متبدل اصولوں کے برعکس مملکت کے قوانین میں تبدیلی کا امکان ہر وقت ممکن ہوگا

ہر اس شخص کا جو قرآن میں بصیرت حاصل کرے' اللہ اس کو توفیق دے' اس کا فریضہ ہے کہ وہ کہے یہ چیز قرآن کے خلاف ہے۔لیکن یہ کہ اس امت کے لیے اور اس کی بجائے پھر کیا ہوگا' یہ میرا کام نہیں ہے۔کسی فرد کا کام نہیں ہے' نظام کا کام ہے۔کرنے کا کام یہ ہے کہ ایک اسلامی نظام' اسلامی مملکت قائم کرو' وہ مملکت قرآن کی روشنی میں یہ قوانین وضع کرے اور انہیں وہ نافذ کرے' وہ بھی وقتی ہونگے۔وہ قوانین اس مملکت کے کہلائیں گے جو یہ کہے گی کہ ہم نے تو خدا کی کتاب کی روشنی میں ان احکام کو مستنبط اور وضع کیا ہے۔یہ ہے صحیح پوزیشن اسلامی احکام کی۔نہ یہ کہ یہاں جس کا جی چاہے' اٹھ کے یہ کہہ دیتا ہے کہ اسلام کا حکم یہ ہے اسلام نے یہ کہا ہے' اسلام کی رو سے یہ جائز نہیں' اسلام کی رو سے یہ نہیں ہے وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا (6:93) جھوٹ ہے افتراء ہے یہ خدا کی طرف کہ انسانوں کے' خواہ وہ وہ انفرادی ہوں یا مملکت کے خواہ وہ اجتماعی ہو' ان کے مستنبط کردہ وضع کردہ ان کے اجتہاد کی رو سے جو قوانین یا احکام کسی وقت نافذ ہوں' ان کو خدا کے احکام کہنا جھوٹ ہے افتراء ہے خدا کے خلاف۔خدا کی بات صرف اس کی کتاب کے اندر ہے۔

مذہبی پیشوائیت کی پہلی کیٹیگری کا عمل دخل یہودیوں کی شریعت تالمود کی بنیاد پر صحف موسوی کی پانچ کتب کی تالیف

تو پہلی کیٹگری ہے ہمارے ہاں کے اربابِ شریعت کی کہ جو انسانوں کے فیصلوں کو شریعتِ خداوندی کہہ کے دنیا کے اندر نافذ کرتے ہیں اور مذہبی پیشوائیت ہمیشہ یہی کرتی چلی آئی ہے۔انہوں نے کتاب کی کتاب یا کتاب کے حصوں کو چھپا دیا اس میں تحریف کردی۔اصلی کتاب ہی باقی نہ رکھی اور اس کے بعد پھر جو کچھ جاری کیا انسانوں کا وضع کردہ۔جسے صحیفۂ یا صحفِ موسیٰ کہتے ہیں پانچ کتابیں وہ تو اتنی سی ہیں جو ہیں بھی۔سارا مدار یہودی شریعت کا تالمود کے اوپر ہے' ان روایات کے اوپر ہے کہ جنہیں وہ منسوب کرتے ہیں آلِ ہاروںؑ کی طرف۔وہ ساری کی ساری ان کے ہاں کے احبار و رہبان جو ہیں بلکہ وہ احبار کہیے رہبان کی بات تو آگے چل کے آئے گی' یہ ان کی وضع کردہ ہیں۔

قرآن حکیم کی سند کے بغیر اُمت مسلمہ کی سوچ کا معیار

بعینہٖ آپ کے ہاں یہ کچھ ہوگئی ہیں۔قرآن کا اتنا حصہ منسوخ' اب زندگی کے کاروبار کے لیے تو آپ کو احکام اور ہدایت کی ضرورت تھی وہ کہاں سے لی جائیں گی؟ وہ انسانوں کی بنائی ہوئی آپ کے ہاں نافذ ہورہی ہیں۔اس لیے عزیزانِ من! کوئی شخص جو اسلام کی طرف کسی بات کو منسوب کرے' اسے کہیے کہ اس کی سند دیجیے اور سند خدا کی کتاب کی مانگئے کوئی اور سند جو ہے اسلام میں خدا کے سوا کسی کی نہیں ہوسکتی۔دیکھئے کس طرح سے ان کی یہ تھیوکریسیاں اور ان کے یہ دعویٰ اقتدار ختم ہوجاتے ہیں۔مَنۡ اَظۡلَمُ (6:93)اس سے زیادہ ظالم کون ہے مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا (6:93) یہ ایک کیٹگری ہے۔

ختم نبوت کے بعد تو وحی کے نزول کا دعویٰ ہی باطل ہے

اگلی کیٹگری۔بڑی غور طلب چیزیں ہیں جو قرآن کہہ گیا ہے۔آنے والے دور کی تصویریں دھندلی سی نہیں' کتنی نمایاں واضح طور پہ وہ کھینچ جاتا ہے۔خدا کی کتاب ہے علیم ہے خبیر ہے۔اَوۡ قَالَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ وَ لَمۡ یُوۡحَ اِلَیۡہِ شَیۡءٌ (6:93) اس سے زیادہ؟؟ کون ہے کہ جو یہ کہے کہ مجھ پر خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے حالانکہ وحی اب ہو نہیں سکتی۔پہلی چیز تو یہی لیجیے کہ ہر ایک کا یہ دعویٰ کرنا ہی غلط ہے اور پھر ختمِ نبوت ﷺ کے بعد تو جب یہ ہو کہ ہو ہی نہیں سکتی۔اور ایک باریک سا فرق ہوتا ہے عربی زبان میں لَا اور لَمۡ میں لَمۡ عام طور پر وہاں آتا ہے جہاں کوئی چیز ہو سکتی نہ ہو۔لیکن قطع نظر اس گرامر کی بات کے' جب ختمِ نبوت ﷺ آپ مانتے ہیں تو وحی تو اس کے بعد پھر ہو سکتی نہیں۔اب ان کے ہاں یہ ہے کہ وحی کا دعویٰ کرنے والے جو ہیں وہ ہیں دعویٰ نبوت کرنے والے۔

وحی کی بنیادی خصوصیات اور عقلِ انسانی کے تجرباتی علم میں فرق

میں نے عرض کیا ہے کہ جو سازشیں ہمارے خلاف ہوئی ہیں اس میں بڑی احتیاط یہ برتی گئی ہے۔وحی کیا ہوتی ہے؟ ایک علم ہم حاصل کرتے ہیں اپنے مطالعہ سے تجربے سے مشاہدہ سے غور و فکر سے تدبر و تفکر سے اشیائے کائنات پر غور کرکے۔وہ سارا علم پہلی چیز تو یہ کہ ہمارے اپنے جو حواس ہیں Sense Perception جسے آپ کہتے ہیں اس کی رو سے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ان معلومات کی بناء پہ ہم کچھ فیصلے کرتے ہیں اپنے دل سے۔اس کی یہ حیثیت ہوتی ہے۔انسان جتنا بھی علم حاصل کرتا ہے یا تو وہ دوسروں کا حاصل کردہ علم ہے جو اس کی طرف منتقل ہو کے آتا ہے' جسے آپ تاریخ کہتے ہیں یا کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں دوسروں کے افکار کو سنتے ہیں۔یا خود اسی طرح سے آپ علم حاصل کرتے ہیں خود تجربے سے مشاہدے سے۔اس میں بہرحال آپ کے حواس (Senses) کام دیتی ہیں آپ کا مائنڈ' جو معلومات ان کے سامنے جاتی ہیں' ان سے جو فیصلہ کرتا ہے۔یہاں بیٹھے ہوئے' باہر سے ایک آواز آتی ہے' وہ زور

سے جو بریک لگا کرتی ہے۔ہم نے موٹر کو دیکھا نہیں ہے' کان سے ایک آواز سنی' دل نے یہ فیصلہ کیا کہ کوئی موٹر ہے جس کی یا ٹکر لگی ہے یا Accident ہوا ہے بڑے زور سے بریک اس نے باندھی ہے' ایک فیصلے پہ پہنچے۔اس کے بعد ایک چیخ کی آواز آئی ہم نے دیکھا نہیں ہے آواز سنی ہے صرف' ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ کوئی انسان ہے جس کی ٹکر ہوئی ہے حادثہ ہو گیا اس کے ساتھ Accident ہوا اسکے ساتھ۔اسے کہتے ہیں' مائنڈ انسان کا ان معلومات سے جو ان ذریعوں سے اس کے پاس آتی ہیں کسی نتیجے پہ پہنچتا ہے۔اور اگر وہ آواز اس طرح سے پہچانی ہوئی ہو کہ آپ کے کسی عزیز یا دوست کی ہو تو اب دیکھئے آگے آپ کا دل کیا فیصلہ کرتا ہے۔یہ طریقہ ہے انسان کا علم حاصل کرنے کا۔اس کے علاوہ ایک اور طریقہ بتایا گیا کہ جس میں نہ انسان کے حواس کام کرتے ہیں' نہ اس کی فکر کام کرتی ہے' نہ اس کے اپنے خیالات کام کرتے ہیں' وہ خدا کی طرف سے براہِ راست ایک علم اسے ملتا ہے۔اس میں اس شخص کا کوئی دخل نہیں ہوتا' اس کے کسب و ہنر کا اس کی محنت کا اس کی فکر کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔یہ جو اس طرح سے براہِ راست خدا کی طرف سے علم ملتا ہے اسے وحی کہا جاتا ہے۔یہ وحی مخصوص تھی ان حضرات تک جنہیں انبیائے کرامؑ کہا جاتا ہے۔جسے بھی اس انداز سے یہ علم ملتا تھا' اسے نبی کہتے تھے۔یہ ہر انسان کو نہیں مل سکتا تھا' ہر انسان حاصل کر نہیں سکتا تھا۔وہ نبی بھی اپنی کوشش سے حاصل نہیں کر سکتا تھا۔اسے کہتے ہیں وہبی طور پر خدا کی طرف سے یہ علم ملتا تھا' اسے وحی کہا جاتا ہے۔تو آپ نے دونوں میں دیکھ لیا فرق یہ ہے۔انسان کے کسب و ہنر کا۔اس میں انسان کی Senses حواس' اپنا مائنڈ فکر کی قوتیں کام کرتی ہیں۔دوسرے علم میں یہ نہیں ہوتا' براہِ راست خدا کی طرف سے اس کے اوپر القاء ہو جاتا ہے اسے یہ مل جاتا ہے یہ علم اسے وحی کہا جاتا ہے۔وحی کے متعلق طے ہو گیا کہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارک ﷺ پر یہ ختم ہو گئی یعنی یہ سلسلہ خدا نے اس کے بعد خود ختم کر دیا کہ اب ہم اس طرح سے علم نہیں کسی کو دیں گے۔بات ختم ہو گئی۔

الہام اور کشف کے متعلق وضع کردہ عقیدہ جو وحی کی مہر کو توڑنے کے مترادف ہے

اس کے بعد یہ چیز کہ کوئی یہ کہے مجھ پہ وحی آتی ہے' لفظ یہ کہے' اسے تو آپ نے کہا کہ ختمِ نبوت ﷺ کے منافی اور مدعی نبوت قرآن کی رو سے یہ مرتد کافر سب کچھ' ٹھیک ہے۔لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے یہ جو سازشیں ہوئی ہیں اس میں بڑی احتیاط برتی گئی۔انہوں نے کیا کیا؟ وحی کا لفظ استعمال نہیں کیا کہا الہام ہوتا ہے بذریعۂ کشف یہ چیز خدا کی طرف سے مجھے ملی ہے۔بعینہٖ وہ چیز جو وحی کی ہے۔صاحب! علم کی کیٹگریز ہی دو تھیں یا وہ فکرِ انسانی سے حاصل شدہ ہے یا وہ خدا کی طرف سے براہِ راست مل رہا ہے۔الہام و کشف کے متعلق یہ ہے کہ یہ انسان کی اپنی Senses کا اپنے حواس کا اپنے مائنڈ کا پیدا کردہ نہیں ہے اس میں اس کے فکر کا کوئی تعلق نہیں ہے یہ اس کا پیدا کردہ نہیں ہے خدا کی طرف سے یہ علم ملتا ہے۔میں پوچھتا یہ ہوں کہ اسے وحی نہیں کہا جائے گا تو اور کیا ہوگا یہ تیسری تو کیٹگری کوئی نہیں علم کی۔کہ نہیں صاحب! یہ وحی نہیں ہے الہام ہے۔

وحی کی مہر کو توڑنے والوں کا مرتبہ مقربِ بارگاہِ الٰہی قرار پایا

چلئے جی۔یعنی لفظ ایک بدل دیا اور وہ ساری خصوصیات جو تھیں وحی کی ان کو اپنا لیا۔وحی کہنے والا مرتد کافر دائرہ اسلام سے خارج' الہام کہنے والا مقربِ بارگاہِ الٰہی۔اللہ اکبر۔اُن کی پرستش ہوتی ہے۔ارادت اور عقیدت ان کے ساتھ وابستہ کی جاتی ہے۔وہ توہین و تکریم کو تو پوچھو ہی نہیں کہ کیا معیار اور ان کے مدارج ہوتے ہیں۔جیتے جی تو ایک طرف رہا' مرنے کے بعد ان کے ساتھ جو منسوب ہو جاتے ہیں پتھر' ان کی پرستش ہوتی ہے۔وحی کے مدعی نہیں تھے الہام ہوتا ہے حضرت صاحب کو' کشف کے ذریعے سے یہ چیز ہوتی ہے۔ذرا صاحب! فرق تو بتا دیجیے دونوں کے اندر۔کہ جی وہ فرق تو ہے نا وہ وحی ہوتی ہے الہام الہام ہوتا ہے۔ٹھیک ہے جی فرق ہو گیا۔غور کیجیے آپ کو کہاں لے گئے یہ۔میں عرض کر رہا ہوں یہ بالکل دعویٰ نبوت ہے نام صرف بدلا ہے۔میں نہیں کہہ رہا عزیزانِ من! ان لوگوں کے خود یہ دعوے ہیں' اسے تصوف کہتے ہیں ان حضرات کو صوفیائے کرام اولیاء عزام مشائخ کرام۔

تصوف کے خدوخال کی وضاحت کے سلسلہ میں علامہ پرویزؒ کے دل و دماغ میں کالج کے حسین خواب کی اہمیت

یہ تاریخ تو شاید میں کسی اور وقت بیان کروں جب پھر بار بار وہی میرا حسین خواب سامنے آتا ہے کہ میری وہ کالج کی درسگاہ ہو گی تو وہاں یہ چیزیں آئیں گی۔اس وقت میں یہ عرض کر دوں کہ یہ بات تو بہت پہلے سے شروع ہو گئی تھی لیکن اس کو ایک منظم فلسفے کی حیثیت جو دی وہ شیخِ اکبر محی الدین ابنِ عربی جن کا نام تصوف کی بارگاہ میں بہت بلند مقام ہے۔وہیں سے یہ سندیں لاتے ہیں ساری۔فتوحاتِ مکیہ ان کی کتاب بہت مشکل سی ہے مجذوبانہ انداز کی' فصوص الحکم وغیرہ ان کی کتابیں ہیں۔آپ سنئے کہ وہ کیا کہتے ہیں اس الہام کے متعلق یا اس کشف کے متعلق۔فصوص الحکم وہ عربی زبان میں تو ذرا مشکل ہو جائے گی' اس کا ترجمہ اتفاق سے شائع ہوا تھا حیدر آباد دکن میں' یہ میری اپنی کتاب جو ہے' سلیم کے نام خطوط غالباً تیسری جلد' اس میں میں نے تصوف کی تاریخ بھی دی ہے اور ان حضرات کی باتیں بھی دی ہیں۔یہ فصوص الحکم کا اقتباس ہے شیخِ اکبر کی تصنیف ہے۔ایک فقرہ تو وہ پہلے یہ لکھتے ہیں یا سمجھئے کہ عنوان ہے۔جس مقام سے نبی لیتے تھے اسی مقام سے انسانِ کامل صاحب زمان' غوث قطب لیتے ہیں۔غور فرمائیے آپ۔

تصوف کی ساری بنیاد اس پر ہے کہ جس مقام سے نبی لیتے ہیں اسی مقام سے انسان کامل صاحبِ زمان' غوث قطب لیتے ہیں

اب اس عنوان کے تابع دیکھئے کہ اس کی توضیح اور تشریح کیا ہوتی ہے۔کہتے ہیں کہ اربابِ شریعت تو وہ ہیں جو قرآن وحدیث سے

حکم لیتے ہیں قرآن وحدیث میں اگر حکم نہیں ملتا تو قیاس کرتے ہیں؛ اجتہاد کرتے ہیں۔ مگر اس اجتہاد کی اصل وہی منقول قرآن وحدیث ہوتے ہیں۔ یہ تو اربابِ شریعت ہوگئے۔ اس کے برعکس ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف والہام کے ذریعے خود اللہ تعالیٰ سے لیتے ہیں۔ او بابا! وحی اور کس کو کہتے ہیں؟؟۔ قرآن اور حدیث سے نہیں لیتے' خود اللہ تعالیٰ سے لیتے ہیں لہٰذا خود اس حکمِ شریعت میں خلیفۃ اللہ ہوتے ہیں۔ اور اگلا فقرہ ہے پس ایک طور پر مادۂ کشف والہام اور مادۂ وحی رسول ایک ہے۔ کشف' اللہ تعالیٰ سے لینے کے طریقے سے واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النبین ﷺ کے موافق ہے۔ یہ سارے رحمتہ اللہ علیہ' رحمتہ اللہ علیہ تو بہت نزدیک کی بات ہے پوچھو ہی نہیں کہ یہ کیا ہیں۔ یہ سارے ان مقامات کے اوپر فائز اور وحی نبوت کا دعویٰ کرنے والا' مرتد دائرہ اسلام سے خارج' پھانسی پہ لٹکا دینے کے قابل' اس کی سزا موت ہے۔ عزیزانِ من! آپ سوچتے ہیں کہ ہوا کیا ہے آپ کے ساتھ۔ اور پھر اگلے الفاظ بھی اس فقرے کے سن لیجیے۔ واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النبین ﷺ کے موافق ہیں ان کا اللہ تعالیٰ سے لینا' عین رسول اللہ ﷺ کا لینا ہے۔ غور فرمایا آپ نے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوگیا اور آپ ﷺ نے منصوص اور معین طور پر کسی کو خلیفہ نہ بنایا کیونکہ آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ ان کی امت میں ایسے لوگ ہونگے جو خلافت کو اللہ تعالیٰ سے لینگے۔ یہ طریقہ جو ہے۔ میں کیا یہ جو قرآن نے کہا تھا کہ اس سے زیادہ ظالم کون ہے اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَ لَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ (6:93)۔

یہ ہے تعلیم ان حضرات کی' جن کا مقامِ اربابِ شریعت سے بلند تصور کیا جاتا ہے

الہام کا تو لفظ ہی قرآن میں نہیں آیا نہ کشف کا آیا ہے اس طرح سے' وحی کا ہی لفظ آیا ہے وہاں تو۔ دو ہی اس نے طریقے بتائے تھے یا انسانوں کا علم حاصل کرنا انسانی ذریعے سے یا خدا سے براہِ راست علم ملنا جسے وحی کہا جاتا ہے۔ اب جیسے وہ کتاب کے حصوں کو چھپایا نہیں یہودیوں کی طرح' منسوخ کردیا اور خوش ہوئے کہ ہم نے تحریف کی ہے نہ ہم نے کتمانِ حقیقت کیا ہے' نہ خدا کی کتاب کو چھپایا ہے۔ اور کر گئے اتنی بڑی سازش۔ اسی طرح سے یہ چیز کہ ختمِ نبوت ﷺ کے قائل بھی ہیں وحی خدا کی طرف سے بند ہے کوئی دعویٰ نہیں کرسکتا دعویٰ کرے تو اسے دار پہ کھینچ دیجیے۔ اور اس کا نام صرف الہام اور کشف رکھ کے سارے کا سارا وہی کچھ۔ میں نے تو ان کے الفاظ آپ کے سامنے پیش کردیے ہیں۔ کوئی فرق ہے ان دونوں کے اندر؟ ان کی جرأتیں ملاحظہ فرماؤ وہ کہتے ہیں کہ بالکل وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کا مقام ہے' وہیں سے وہ لیتے تھے خاتم النبین ﷺ کے موافق ہیں وہ۔ اور یہ حضرات جو ہیں آپ کے نزدیک یعنی وہ اربابِ شریعت سے ان کا مقام کہیں اونچا ہے۔ مدعی تو وہ یہ ہیں کہ ہم نے مغزِ دین لیا ہے' مغزِ قرآن' مغز را برداشتن' یہ مغزِ دین کے مدعی ہیں۔ اور آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کے ذہن میں بھی جو ان کا مقام ہے وہ اربابِ شریعت کا بھی نہیں ہے۔ یہ دوسری کیٹگری ہے۔

قرآن حکیم نے اپنے ہاں احبار و رہبان دونوں شعبوں کا ذکر بالتفصیل کر رکھا ہے

اب دونوں آ گئے عزیزانِ من! اربابِ شریعت جو انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو خدا کی شریعت کہہ کے دنیا کے اندر پیش اور نافذ کریں۔ اربابِ طریقت جو اپنے خیالات کو نام تو کشف اور الہام کا دیں لیکن اسے بعینہٖ وحی خداوندی کی طرح پیش کریں اور کہیں کہ یہ مقام ہمارا وہی ہے جو رسول کا مقام تھا۔ اور یہ دونوں ہی' پھر یہی نہیں کہ چلئے عام سطح کے مسلمان' مسلمانوں میں سے اربابِ شریعت ہوں علمائے کرام ہوں یا یہ ہوں قرآن نے انہیں احبار کہا تھا' انہیں رہبان کہا تھا۔ یہ دونوں کیٹگریز مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ (6:93) کتاب کے خلاف سازش کرنے والی کیٹگریز ہیں' غلط نظریہ۔ تیسرا ٹکڑا ان کا ہے وَّ مَنۡ قَالَ سَاُنۡزِلُ مِثۡلَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ (6:93) عام طور پہ ذہن میں نہیں آتا کہ یہ تو دہرانے والی بات ہے جو کہے اس کی طرف وحی نہیں ہوتی اور وہ کہے وحی ہے اسی طرح وہ کہے کہ ہاں صاحب! خدا جو کچھ آپ کہتے ہیں کہ نازل کرتا ہے خدا کی طرف سے یہ جو کچھ آتا ہے میں بھی ایسا کر سکتا ہوں۔ لیکن بڑا باریک فرق ہے دونوں کے اندر۔

تیسری کیٹیگری فلاسفروں کی خصوصیات کا ذکر

ایک تیسری چیز ہے ہمارے ہاں وہ کشف اور الہام کو تو نہیں کہتے وہ اس کو اور زیادہ عام پھیلاتے ہیں۔ فلاسفروں کا ایک گروہ' وہ کہتے یہ ہیں کہ انسان کے اندر ایک قوت ہے جسے Intuition کہتے ہیں انگریزی میں' وجدان کہتے ہیں عام طور پر انسان کو بیٹھے بٹھائے ایک خیال آتا ہے اور وہ اس کی اپنی فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ یعنی سوچ بچار کے بعد وہ اس بات پہ نہیں پہنچتا' یونہی بیٹھے آپ کہتے ہیں نا بیٹھے بیٹھے یونہی میرے جی میں آیا کہ ذرا اٹھ کے دیکھوں تو سہی' او یار عجیب بات ہے میں اٹھ کے باہر گیا تو آگے دیکھا تو۔ عام طور پہ آپ یہ کہتے ہونگے تو یہ آپ روزمرہ کہتے ہیں اس کو کچھ اہمیت نہیں دیتے۔ یہ ایک بڑی اہم چیز بن گئی ہے فلاسفرز کے ہاں جاکے' اسے Intuition کہا جاتا ہے۔

وجدان کی خصوصیات اور اس کا عملی مظاہرہ

وہ کہتے ہیں کہ یہ انسانی فکر تو Logic یا منطق کے ذریعے ایک چیز سے دوسری چیز دوسری سے تیسری چیز' کڑی کہلاتی ہے۔ بریک کی آواز آئی ہم نے کہا کہ موٹر کا کوئی حادثہ ہوا ہے' چیخ کان میں پڑی ہم نے کہا کہ کوئی انسان ہے جس کے ساتھ ایکسڈنٹ ہوا ہے۔ چیخ مانوس نکلی ہم نے کہا کہ ہمارا وہ دوست یا عزیز جو ہے وہ باہر گیا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کڑیاں ملتی ہوئی آپ کسی نتیجے پہ پہنچتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ Intuition یا وجدان ایک ایسی چیز ہے جس میں کڑیاں نہیں اس طرح سے ملتیں بلکہ خود بخود ایک خیال آجاتا ہے انسان کے ذہن میں۔ بات یہ پھر ایک Technical سی ہو جائے گی' میں سائیکولوجی میں چلا جاؤں گا اور درس تو اس کے لیے صحیح مقام نہیں ہوتا۔ میں

صرف سمجھا رہا ہوں کہ یہ Intuition یا وجدان کہتے کسے ہیں۔ عام طور پہ شاعروں کے ہاں یہ چیز بڑی پائی جاتی ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

وحی کسی شکل میں بھی وجدان کا پرتو نہیں ہو سکتی

شعراء نے سروش فرشتہ جبریل سے الگ کر دیا۔ یہ ایرانی تصورات ہیں یہ لفظ بھی ایرانی ہیں۔ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں، عام طور پہ وہ یہ چیز کہتے ہیں کہ صاحب! ایک شعر تو آورد ہوتا ہے جو فکر سے محنت سے زور سے کہا جاتا ہے اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ خود بخود خیالات آتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے ایک لفظ رکھا ہوا ہے جسے وجدان کہتے ہیں جسے Intuition کہتے ہیں۔ تو فلاسفر کا ایک گروہ ایسا ہے جو یہ کہتا ہے کہ یہ وحی نبوت جو ہے اصل میں یہ بھی Intuition ہی کی ایک لطیف سی چیز ہوتی ہے۔ Intuition تو ہر انسان کو ہو سکتی ہے اس میں تو کوئی خصوصیت نہیں ہوئی۔ تو وہ یہ کہتے تھے کہ یہ جسے ملکۂ نبوت کہا جاتا ہے یہ وہی چیز ہے اصل میں جسے Intuition کہا جاتا ہے۔ عام طور پہ سطحی طور پہ ہوتی ہے ہم اس پہ غور نہیں کرتے۔ اس پہ ذرا اور غور کر لیا جائے، ذرا اس کو اور Concentrate کر دیا جائے۔ اس کے اوپر تو یہ وہی چیز ہو جاتی ہے۔ تو انبیاء کے لیے یہ چیز تھی۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ یہ جو چیز ایک نبی کے خیال میں آتی ہے یا جسے وہ وحی کہہ کے پکارتا ہے یہ عام انسانی چیز ہے جسے ہم وجدان کہتے ہیں یا Intuition کہتے ہیں۔ وَ مَنۡ قَالَ سَاُنۡزِلُ مِثۡلَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ (6:93) بات سمجھ میں آئی آپ کے کیا کہہ گیا ہے قرآن، کیسے تیسری کیٹگری آئی ہے اس میں کہ یہ فلاسفر کا گروہ ہوگا وہ وحی کے متعلق یہ کہہ دے گا۔ اور اتنا کہہ کے میں آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ اب سائیکولوجی آگے بڑھ رہی ہے اور ان کی خود تحقیق یہ ہے کہ جسے Intuition کہا جاتا ہے۔

Conscious اور Unconscious یعنی شعوری اور غیر شعوری نفس کا قابلِ غور تجزیہ

اصل میں انسان کے بہت سے خیالات فکر کی چیزیں، بہت سی خبریں، بہت سی معلومات ایسی ہوتی ہیں کہ اس کا ایک Unconscious Mind ہے، تہ خانہ اس کے اندر ایک اس کے اوپر تو ایک Conscious Mind ہے شعوری نفس جسے کہتے ہیں یہ روزمرہ کی باتیں جو ہم جانتے ہیں جو ہمارے حافظے میں ہوتی ہیں، ہماری فکر سے جن کا تعلق ہے۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ بے شمار انسان کی باتیں خیالات فکر تصورات، آرزوئیں تمنائیں اس قسم کی ہوتی ہیں کہ وہ انسان کے Conscious Mind میں نہیں رہتیں، وہ نیچے تہ خانے میں چلی جاتی ہیں جسے Unconscious Mind کہا جاتا ہے۔ اور یہ فکری طور پہ ان کو بھولا ہوا ہوتا ہے، یاد نہیں اس کو

ہوتیں۔ وہ وہاں جمع ہوتی رہتی ہیں۔ اور جب یہ کسی چیز پہ Concentrate کرتا ہے کسی معاملے میں تو وہ Conscious Mind سے نیچے اتر کر اپنے تہ خانے کے اندر جا پہنچتا ہے یوں کہیے Unconscious Mind کے اندر اور وہاں یہ جو چیزیں ہوتی ہیں جو اس کے ذہن میں بھی نہیں ہوتا کہ ایسی کوئی بات تھی' وہ ابھر کے آ گے آ جاتی ہیں اور انہیں Intuition یا وجدان کہا جاتا ہے۔ وہ چیز جوان کے ہاں گاسٹ ایک بہت بڑا ریاضی دان تھا تو اس کا ایک قول ہے۔ بہت بڑا کوئی مشکل سوال آ تا تھا تو وہ یہ کہا کرتا تھا کہ I know the answer but do not know how to interpret it اس سوال کا جواب تو مجھے پتہ ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ کس طرح اس جواب تک پہنچا جائے۔ وہ جو طریقہ اور قاعدہ ہے نا وہ نہیں معلوم' جواب مجھے معلوم ہے۔

وہ اس کے Unconscious Mind کے اندر جا کے جمع ہو جاتا ہے وہاں Concentrate ہوتا ہے مرتکز ہوتا ہے بھولا ہوا ہوتا ہے اور پھر کسی وقت میں جب یہ بہت زور سے گہرائی سے کسی چیز کے اوپر سوچتا ہے تو وہ اندر سے ابھر آ تا ہے۔ یہ اس دور کے سائیکولوجسٹ جو ہیں ان کی تحقیق ہے۔

خدا کا نبی خدا کے دیئے ہوئے نور سے دیکھتا ہے

ملکۂ نبوت یہ بھی نہیں ہوتا عزیزانِ من!۔ وہ ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو ایسے ماحول میں جنم لیتا ہے کہ جن کے خیالات نظریات معتقدات بالکل اور ہوتے ہیں۔ انہیں میں وہ تعلیم پاتا ہے اگر وہ تعلیم یافتہ ہے' انہیں میں وہ تربیت حاصل کرتا ہے۔ وہی اس کے اسلاف ہوتے ہیں' وہی اس کا ماحول ہوتا ہے' یہی اس کے خیالات اس زمانے میں ہو سکتے ہیں' خیالات انسان کے تو اس سے ماوراء ہوتے نہیں۔ لیکن وہ ایک دن اٹھ کر ایسی باتیں کہنے لگ جاتا ہے جو اس کے اپنے ماحول سے اپنے گردونواح سے' اس سے تو الگ رہی اپنے زمانے سے مختلف ہوتی ہیں۔ وہ اس کی فکری پیداوار نہیں ہوتی وہ Intuition بھی نہیں ہوتی۔ اسے کہتا ہے خدا کہ ہم براہِ راست اس شخص کو یہ علم دیتے ہیں جس میں اس کی اپنی فکر کا جذبات کا' کسی چیز کا دخل نہیں ہوتا وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى (53:3) اپنے خیالات سے وہ بات ہی نہیں کرتا اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (53:4) یہ وحی ہوتی ہے۔ اور یہ وحی جو تھی جب خدا کی طرف سے آتی تھی تو صرف انبیاء تک مخصوص ہوتی تھی اور جب اللہ کے پروگرام نے یہ کہا کہ اس کو ختم کیا جائے تو نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارک ﷺ پر یہ ختم ہوگئی۔ اب علم حاصل کرنے کا طریقہ ایک ہی رہ گیا: انسانی غور و فکر سے' مطالعہ مشاہدہ تجربے کے بعد' فکر سے تدبر سے بصیرت سے۔ عام کائنات کے اوپر کوئی فکر کی جائے یا غور کیا جائے یا خود خدا کی کتاب کے اندر کیا جائے۔ اب کوئی اور ذریعۂ علم نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اس کا مدعی ہے کہ اس کے علاوہ ایسے مجھے علم ملتا ہے جس میں میری فکر وجدان Intuition مشاہدے تجربہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا' خدا کی طرف سے براہِ راست میں پاتا ہوں وہ مدعی نبوت ہے یہ کہنا اس کا وحی ہے' یہ جھوٹ بولتا ہے خدا کے خلاف افتراء کرتا ہے۔ اب مجھے اس پہ فیصلہ

دینے کی ضرورت ہے کہ یہ Self Deception ان کا ہوتا ہے یا دوسروں کو Deceive کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے دونوں چیزیں اس کے اندر ہوں۔ لیکن خود فریبی ہو یا ابلہ فریبی ہو' جہاں تک مسلمان کا تعلق ہے' نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ اِسے منوایا جاتا ہے کہ ختمِ نبوتﷺ کے بعد بھی خدا کیطرف سے علم ملتا ہے اور وہ ساری غرض و غایت جو ختمِ نبوتﷺ کی تھی' وہ سب ختم ہو کے رہ جاتی ہے۔

دنیا میں سب سے زیادہ آزاد اور عظیم قوم وہ ہے جو کسی انسان کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتی

عزیزانِ من! ختمِ نبوتﷺ کے معنی یہ تھے کہ اب کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے شخص سے یہ کہے کہ میری بات تم اس لیے مانو کہ مجھے خدا نے یہ بات دی ہے' کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہے۔ سوچئے کہ جس قوم میں یہ عقیدہ ہو کہ اب کوئی شخص مجھ سے اپنی بات خدا کی بات کہہ کے نہیں منوا سکتا' کتنی بڑی آزاد قوم ہوگی وہ دنیا میں۔ ختمِ نبوتﷺ کے معنی یہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے سمجھ لیا کہ انسانیت اب جوانی پہ پہنچ گئی ہے۔ اب اسے ایک ایک بات کے اندر بڑے بوڑھوں کا پابند نہیں بنایا جاتا۔ زندگی کے ابدی اصول' مستقل اقدارِ حیات اس کو دیدیں اور اس کے بعد اسے کہا کہ جاؤ! اپنے راستے آپ طے کرو۔ سڑکوں کے اوپر ہر موڑ کے اوپر ایک سائن پوسٹ لگا ہوا تمہیں مل جائے گا' اس کی روشنی میں اپنے لیے آپ فیصلہ کرو۔ انسانیت جوان ہوگئی۔ اور جیسے کہ ہر جوان انسان کو آزادی ملنی چاہیئے انسانیت کو آزادی دی خدا نے۔

وہ جو نبی اکرمﷺ کے متعلق قرآن میں کہا ہے کہ وَ يَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ (7:157) کہ یہ آیا ہے اس کی ختمِ نبوتﷺ یہ کرے گی کہ وہ زنجیریں جن میں انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی' ان کو توڑ دے گا' وہ سلیں جن کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے تھے انسان' ان کو اٹھا کے پھینک دے گا۔ ختمِ نبوتﷺ نے ان اغلال کو توڑا ہے' ان سلوں کو اس کے سر کے اوپر سے ہٹایا ہے اس کو صحیح آزادی کی فضا میں موقع دیا ہے انسان کو۔

ہر کسی کو اپنی بات منوانے کے لیے کتاب اللہ سے ثبوت پیش کرنا ہوگا

کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اب اس سے اپنی بات خدا کی بات کہہ کے منوائے خواہ وہ اربابِ شریعت ہوں یا اصحابِ طریقت ہوں' کسے باشد۔ خدا کی بات اگر کوئی کہتا ہے تو اس کو سند دینی پڑے گی خدا کی کتاب کی۔ اور جو اس میں سند نہیں ملتی تو وہ خدا کی نہیں ہوگی وہ اس انسان کی اپنی ہوگی یا کسی اور انسان کی ہوگی اور میں اس کا پابند نہیں ہوں کہ کسی دوسرے انسان کی بات کو خدا کی بات مانوں۔ مجھے آزادی حاصل ہے حق حاصل ہے کہ اسے مانوں یا اس سے انکار کردوں۔ حکومت کے قوانین کی تو کیفیت اور ہوتی ہے نا اسے تو تمدنی قوانین کی رو سے ماننا ہوتا ہے۔ لیکن کسی انسان کی یہ بات کہ جو میں کہتا ہوں یہ میرا کہا نہیں' یہ خدا کی بات ہے۔ خدا کی بات

سمجھ کے تم مانو' میری آزادی کو وہ سلب کرتا ہے' اُسے کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ختمِ نبوت ﷺ کے معنی یہ ہیں کہ میں یہ تصور بھی نہیں اب کر سکتا کہ یہ شخص خدا کی بات کہے گا۔ کہہ سکتا نہیں ہے۔ یقین یہ ہے' عقیدہ یہ ہے کہ ختم ہوگئی خدا کی بات جو تھی وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (6:115) مکمل ہوگئی خدا کی بات صدق وعدل کے ساتھ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115) اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اور جو ختم ہوگئی بات اب کس کو حق حاصل ہے یہ کہے کہ میری بات خدا کی بات سمجھ کے مانو۔ عزیزانِ من! دیکھا آپ نے کہ آیت کے تین ٹکڑوں میں قرآنِ کریم اس پوری سازش کو یا وحی کے خلاف جو تصورات ابھر سکتے تھے کس انداز سے بات کر گیا ہے۔ پھر دہرا دوں وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (6:93) اپنے بنائے ہوئے قوانین کو خدا کے قانون کہہ کے نافذ کرنے والا' اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا۔ ظلم کے معنی میں نے آپ کو بتایا تھا ناعربی زبان میں جس شے کو جس مقام پہ ہونا چاہیے اسے وہاں نہ رکھنا۔ انسان کی بات مانو' سیدھی سی بات ہے' جب بھی اسے آپ نے خدا کی بات کہہ دیا' ظلم ہوگیا۔ پہلی کیٹگری۔ اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ (6:93) یا یہ کہے کہ خدا کی طرف سے مجھے براہِ راست علم حاصل ہوتا ہے (یہ معنی کرو نا وحی کا لفظ کیوں کہتے ہو) درآں حالیکہ خدا کی طرف سے کسی کو اس طرح براہِ راست علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ کتنا بڑا ظلم ہے یا وہ یہ کہے کہ ملکۂ نبوت بھی Intuition ہی ہوا کرتا تھا اور Intuition تو بہر حال ہر انسان کو ہوتی ہے' فرق اس کے اندر Degrees کا ہے Quantitative فرق ہے کوالٹی کا فرق نہیں ہے' وہ ذرا زیادہ لطیف شکل میں ہوسکتی ہے اور ایسی لطیف شکلیں اور بھی ہوسکتی ہیں۔ کہا یہ ہیں وہ لوگ۔ زندگی میں یہ لوگ کبھی تو اپنے فریب خوردہ نفس کی وجہ سے یہ چیز کریں گے اور کبھی اسی نفس کو جسے Ego کہتے ہیں اپنی انانیت جو ہے اس کی Satisfaction کے لیے اس کی تسکین کے لیے یہ چیز کہیں گے۔

وحی کی راہنمائی سے ہٹ کر اپنے نفس یا Ego کی کارفرمانیوں کی اقسام

عجیب بات آگے آتی ہے۔ قرآنِ کریم نے جو نفس کہا ہے اب ترجمہ اس کا ایک لفظ میں نہیں ہوسکتا' Personality ترجمہ کیا جاتا ہے' Self ترجمہ کیا جاتا ہے اب اس دور میں اس کو Psyche کہا جاتا ہے۔ کچھ بھی ہے' یہ شے جو ہے اندر انسان کے' یہ اس کی کارفرمائیاں ہیں۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ کہیں Self Deception ہوتی ہے اور کہیں ارادے اور نیت سے دوسروں کو فریب دینا ہوتا ہے یہ دونوں چیزیں اس نفس کی کارفرمائیاں ہوتی ہیں۔ ولیم جیمز نے ایک کتاب لکھی ہے وہ ہمارے دور کا سائیکولوجی میں گویا امام مانا جاتا ہے' ابتداء اس نے کی ہے "Varieties of religious experience" مذہبی واردات کے اقسام۔ تو یہ جتنے مدعی ہیں' اس چیزوں کے جسے آپ روحانیت وغیرہ کہتے ہیں' اس نے یہ چیز کہی ہے کہ یہ سارے Psychological Cases ہوتے ہیں۔ اور اس کی پھر اس نے قسمیں گنائی ہیں۔ یہ لوگ تو پوچھو نہیں' پھر تحقیق کرتے ہیں تو کتنی محنت کرتے ہیں۔ وہ سائیکولوجسٹ ہے لیکن

وہ تحقیق کر رہا ہے لوگوں کی روحانی واردات کے جو دعوے ہیں کہ ان کی حقیقت کیا ہے' ایک سائیکولوجسٹ کے Point of view سے ۔ بڑی محنت کی ہے اس شخص نے ۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ یہ جو بڑی بڑی کرامات بتائی جاتی ہیں اور حضرت صاحب کے شعبدے ہوتے ہیں اور روحانیت کے مدارج ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ ہیں ایک سائیکولوجسٹ کے Point of view سے اس نے کس طرح سے یہ نفسِ انسانی کی کارفرمائیاں بتایا ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ بات ساری نفس کی تھی ۔ یہ چیز آج ہمارے بیسویں صدی کے اندر سامنے آئی کہ یہ ہے۔ دیکھئے کہ چودہ سو سال پہلے یہ چیزیں تینوں کہہ کے قرآن کہتا گیا ہے۔

موت کے وقت پھر فرشتے پوچھیں گے کہ بتاؤ کہاں ہے تمہاری وہ انانیت جس کا تمہیں اتنا غرور تھا

وَ لَوۡ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوۡنَ (6:93) یہ ظالم کہا تھا کہ یہ ظالم سارے۔ وَ لَوۡ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوۡنَ فِیۡ غَمَرٰتِ الۡمَوۡتِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوۡۤا اَیۡدِیۡہِمۡ (6:93) ٹھیک ہے زندگی بھر تو یہ سارا کچھ کرتے رہیں گے۔ کہتا ہے اے کاش تیری آنکھیں دیکھ سکتیں کہ موت کے وقت (قرآن کے سمجھانے کا طریقہ ہوتا ہے جہاں یہ کہتا ہے کہ فرشتے آ کے پھر یہ کہتے کہ) فرشتے آ کے پھر ہاتھ پھیلائیں گے' کاہے کے لیے؟ یہ ہے بات اَخۡرِجُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ (6:93) نکالو وہ Psyche اپنے نکالو وہ انانیت والی بات' نکالو وہ Ego اپنے کہ جن کی وجہ سے یہ سب کچھ کرتے تھے تم۔ نکالو کیا معنی؟ آؤ اب تمہیں مشاہدہ کرائیں کہ وہ تمہارا نفس کیا کرتا تھا۔ جب یہ قیامت یا حشر کے اندر اعمالنامے مکافاتِ عمل کی رو سے انسان کے اعمال و کردار کے سارے نتائج سامنے آنے والے' اس میں قرآن کا یہ اندازِ بیان کہ انسان خود اپنے آپ سے جھگڑتا ہوا آئے گا۔ کہا جائے گا اس سے کہ تیرا اعمالنامہ لپٹا ہوا تیری گردن میں تھا' اب اسے کھول خود پڑھ' آپ حساب کر' کوئی دوسرا نہیں تو خود اپنے خلاف شہادت دے۔

ظہورِ نتائج کے وقت انسان کے Conscious Mind کی کیفیت کہ جب تمام حقائق سامنے آ جائیں گے

پھر وہی بات میری آ جائے گی کہ یہ بات نصاب کی ہے درس کی نہیں۔ تو اپنے خلاف خود' یہ کون ہے تو جو اپنے خلاف ہے' تو اپنا اعمالنامہ آپ پڑھ۔ یہ کون آپ ہے جو اپنا اعمالنامہ پڑھ رہا ہے' یہاں تو یوں دو نظر آتے ہیں' کیا چیز ہے؟ وہی جو انسان کا Conscious Mind & Unconscious Mind ہے یہ اس کی Conflict اور کشمکش کا بیان ہو رہا ہے۔ غیر شعوری نفس کے اندر جتنی وہ ساری ابھر کے سامنے آ جائیں گی اور شعوری طور پہ ان کو اب وہ دیکھ لے گا۔ خود گواہ ہوگا ان کے اوپر خود شہادتیں دے گا اس کے خلاف۔ یہ اعمالنامہ ہے جو دبا ہوا ہے اس کے تحت الشعور کے اندر' وہ ابھر کے سامنے آ رہا ہے۔ نفسِ شعوری جو ہے اس کو یہ معلوم

ہو رہا ہے کہ ہاں میں نے یہ بھی کیا تھا' مجھ سے یہ بھی ہوا تھا۔ اور جب یہ چیزیں جن کو یہاں اس نے دانستہ نہ سہی' نفسِ غیر شعوری بھلائے ہوئے اس کے ذہن کے سامنے آنے نہیں دیتا کہ اس جرم کا احساس معلوم نہیں کہ اس میں کیا کیفیت پیدا کرے گا۔ وہ فریب کرتا ہے' نفسِ غیر شعوری اس کے شعور کے ساتھ کہ ان چیزوں کو سامنے نہیں آنے دیتا۔ قرآن کہتا ہے کہ پردے اٹھ جائیں' حقیقتیں سامنے آجائیں گی۔ یہ ہے اعمالنامہ۔

قرآن حکیم قدم قدم پر انسانی سائیکولوجی کے نئے نئے گوشے بیان کرتا ہے

قرآن سمجھنا ہو تو سائیکولوجی بڑی ضروری ہوگئی ہے۔ یہ بحث ہی انسان کے نفس سے کرتا ہے یہ سب کچھ اس سے ہوتا ہے۔ وہ کیوں نہیں اس کو اس طرف آنے دیتا کہ یہیں اگر اعترافِ جرم کرلے' ہلکا ہو جاتا ہے آئندہ کے لیے' اس Regret کے دو آنسو دھو دیتے ہیں۔ اس میں پھر اصلاحِ خویش کی صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس سے وہ جو لفظ ہے پندارِ نفس کی شکست ہوتی ہے' جو انا ہے نا اس کا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) دیکھا انا کتنے زور سے قرآن کہتا ہے۔ وہ انا جو ہے اس کا اس کو شکست اس سے ہوتی ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ یہ اس طرح سے اپنی نظروں میں ہی آپ ذلیل ہو جائے۔

غلط اعمال کے نتائج انسان کو غیر شعوری طور پر سانپ کی طرح ڈستے رہتے ہیں

کرتا کیا ہے؟ اس کو چھپائے رکھتا ہے تحت الشعور کے اندر' باہر نہیں آنے دیتا سامنے نہیں آنے دیتا اور یہ بڑے مزے سے پھرتا ہے۔ لیکن مزے سے نہیں پھرتا۔ سائیکولوجسٹ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ایک Contradiction جو ہے اندر اس کے Conflict وہ جاری رہتی ہے' وہ پھانس ہوتی ہے اس کے اندر۔ وہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ پتہ نہیں لیکن کچھ یونہی مضطرب و بے چین کرب کی زندگی ہے۔ یہ جتنے لوگ Over-night Millionaire بننے والے ہیں نا اس دور کے اندر آپ نے دیکھا ہوگا یہ اتنے اتنے بڑے نو دولتیے' ان کی زندگی آپ دیکھتے ہیں اتنی کرب کی زندگی ہے قرآن کے لفظ میں سانپ نے ڈس لیا ہو جیسے۔ کبھی ان کے قریب جا کے دیکھئے گا' ایک سانس سکون کا نہیں آ رہا۔ باہر کا ڈر نہیں ہوتا اس کا تو انہوں نے انتظام کر رکھا ہوتا ہے بہت پکا' گرفتاری کا ڈر نہیں ہوتا پکڑے جانے کا ڈر نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود اگر ان سے پوچھو کہ پھر ہوتا تمہیں کیا ہے' پتہ ان کو بھی نہیں ہوتا۔ یہ جو نفسِ غیر شعوری کے اندر ایک سانپ بیٹھا ہوا ہے' ہر وقت وہ ڈستا رہتا ہے اس کو۔

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار

کہ وحی کی رو سے عطا کردہ مستقل اقدار بھلا بیٹھا اور حالت اپنی عقل کی زور سے اپنی تدبیریں جو کرتا ہے وہ ہر آن سانپ کی طرح

اس کو ڈستی رہتی ہیں۔

؎ عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا

توبہ یا استغفار کا نفسیاتی پہلو اور پھر اعترافِ حقیقت میں مثبت انداز کا ثمر

یہ کشمکش جاری رہتی ہے۔ قرآن کرتا یہ ہے (آج بات چلی ہے تو آنے دیجیے سامنے) جسے آپ توبہ کہتے ہیں وہ نفسِ غیر شعوری کے اندر چھپی ہوئی یہ جو چیزیں ہیں' وہ ان کو ابھار کے باہر لے آتا ہے۔ یہ استغفار کیا ہے جسے آپ مغفرت کہتے ہیں؟ وہ انسان یہ ہر وقت ڈسنے والے سانپ سے حفاظت چاہتا ہے کہتا ہے اس سے بچالے کوئی۔ کہتا ہے کوئی بات نہیں! اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ (7:56) بچایا جائے گا۔ یہ صلاحیت تیرے اندر ہم نے رکھی ہے۔ انسان اپنے اس نفس کی چیزیں جن کو اس کی خود فریبی نے بھلا کے اس تہ خانے میں چھپا رکھا ہے ان کو لے آئے باہر' ڈرے نہیں اس سے' اعتراف کرلے اس کا' اپنے آپ سے ہی اعتراف کرلے۔ لیکن اعتراف کسی دوسرے کے سامنے کیا جاتا ہے' اسے کہتے ہیں کہ خدا کے سامنے اعتراف کرلے۔ وہ اپنے نفسِ شعور یہ کے سامنے ایک اعتراف کرنا ہوتا ہے۔ جب یہ اعتراف کرلے گا تو پھانس نکل جائے گی۔ پھانس ہوتی کیا ہے؟ نظر بھی نہیں آتی کم بخت لیکن ساری رات سونے نہیں دیتی۔ وہاں سے یہ Dig-out کرتے ہیں۔ سامنے اپنے لے لے Facts کو اپنے Face کرے اپنا اعمالنامہ آپ پڑھ لے کیوں اسے قیامت تک اٹھا رکھتا ہے۔

ہزار حیف نہ بنی قیامتِ موجود

عزم راسخ کی اہمیت اور اس کے حصول کا طریق

قیامت تو ہر سانس میں تمہارے ہوتی ہے عزیزانِ من! اسے پڑھ لے' اعتراف کرلے اس چیز کا' ٹھیک ہے غلطی ہوگئی۔ خود اس کی ہمت نہیں کہ آگے اصلاح کے لیے کیا کرنا ہے' کسی مشفق کے سامنے اس چیز کے متعلق لے جا۔ قرآن بتائے گا کہ پھر اس کے بعد کیا کرنا ہے۔ اس چیز کا تو بوجھ اتر جاتا ہے آئندہ کے لیے پھر ایک عزم کرلیتا ہے انسان۔ اور عزم بھی عزمِ راسخ' اس وقت ہوتا ہے' جب اندر کشمکش دونوں کی' مٹ جائے باقی نہ رہے۔ ورنہ جو انسان کا شعوری عزم ہوتا ہے آپ نے دیکھا ہے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر وہ ختم ہوجاتا ہے۔

ارادے باندھتا ہوں باندھ کر پھر توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہوجائے' کہیں ایسا نہ ہوجائے

یہ کون کہہ رہا ہوتا ہے اندر' ایسا نہ ہوجائے' ایسا نہ ہوجائے' وہ شعوری طور پہ تو سب کچھ سوچ بچار کے اس نے ایک فیصلہ کیا ہوتا

ہے۔ یہ وہ ہوتا ہے اندر جسے قرآن نے کہا ہے کہ وہ اثـم پیدا کرتا ہے۔ اثـم کے معنی ہیں کہ توانائیوں کو سلب کرتا ہے' کمزور کر دیتا ہے تمہارے ارادوں کو۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ یہ پھانس نکال دیجیے' قرآن سے راہنمائی لیجیے' کوئی اندر پھر یہ نہیں کہنے والا رہتا' کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ اور یہ ہے وہ مردِ مومن جس کی توانائیوں کے متعلق وہی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا' نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔ یعنی تقدیر پہلے اپنی بدلتی ہے عزیزانِ من! پھر دوسروں کی بدلتی ہے۔ اَخۡرِجُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ (6:93) لاؤ سامنے۔ وہ اَخۡـرِجُـوۡا کے معنی یہ نہیں کہ اندر کہیں بند ہوتا ہے کہتا ہے نکالو اس کو۔ وہ الفاظ ہماری زبان کے ہی تو استعمال اس نے کرنے ہیں لیکن کس قدر باریکیوں میں جا کے قرآن کہتا ہے کہ ساری بات یہ تھی نفسِ غیر شعوری کی۔ اَخۡـرِجُوۡۤا(6:93) کہتا اس لیے ہے کہیں جیسے چھپا کے رکھا ہوا ہو' وہ اندر جا کے ہاتھ یوں ڈال کے لانے والی جو بات ہوتی ہے کہ لاؤ باہر اس کو۔ دیکھا لفظ کیا استعمال کر رہا ہے قرآن' نکالو باہر' چھپا ہوا مال جیسے چور کے ہاں سے لیا جاتا ہے۔ جنہوں نے یہ چیزیں کرنے کے اوپر تمہیں آمادہ کیا ہوا تھا نکالو ان کو۔ اَلۡیَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡهُوۡنِ بِمَا کُنۡتُمۡ تَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ غَیۡرَ الۡحَقِّ (6:93) ہاں ٹھیک ہے اپنی نگاہوں میں ذلت تو اس سے ہو گی۔ دیکھا عَذَابَ الۡهُوۡنِ (6:93) کیوں کہا اس نے؟ ذلت آمیز عذاب' اپنے جرم کے اعتراف سے اپنی نگاہوں کے اندر آپ انسان اس وقت ذلیل محسوس کرتا ہے۔ ''آ جیہڑا اپھنے خاں بنیا ہویا ہوندا اے نا'' سارے طرے جتنے ہیں عزیزانِ من! جھک جاتے ہیں اس کے بعد۔ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡهُوۡنِ بِمَا کُنۡتُمۡ تَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ غَیۡرَ الۡحَقِّ (6:93) خدا کے متعلق جو بات کہو الحق کہو' الحق تو خدا کی کتاب کے اندر ہے' اس سے باہر اس کے خلاف جو چیز بھی تم کہو گے اور اسے خدا کی طرف منسوب کرو گے' وہ غیر الحق ہے' خدا کے خلاف افتراء ہو جائے گی۔

تنہائی کا اعتراف جرم انسان کو بری محفل کی ذلت سے بچالیتا ہے

یہ جو کچھ بھی تم کہا کرتے تھے آ ؤ باہر نکالو۔ کیا تھے وہ جذبات جس کے ماتحت یہ کچھ کرتے تھے؟ یہ ہے انسان کی اپنی نگاہوں میں آپ ذلت۔ اور قبل اس کے کہ برادرانِ عزیز! وہ بھری محفل کے اندر' جسے محشر کہا جاتا ہے' وہاں یہ ذلت نصیب ہو' تنہائیوں میں اپنے آپ ہی کیوں نہ ذلت نصیب کر لے۔ تو اور صرف تیرا خدا دیکھنے والا ہے۔ مقام ہی یہ ہے کہ یہاں جب پہنچے' احساس ہوا تو پوچھا آدم سے کہ کیا کیا تم نے؟ رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا(7:23) اس قدر جھکی ہوئی نگاہیں ہیں۔ کس قدر اپنے متعلق اعتراف ہے' کس قدر خود انسان اپنے اندر محسوس کر رہا ہے کہ میں نے زیادتی کی اپنے اوپر۔ یہی بات ابلیس سے پوچھی اس نے' کیوں ہمارے حکم کی نافرمانی کی؟ اس نے کہا میں کون ہوں نافرمانی کرنے والا' میں بندۂ مجبور تو صاحبِ اختیار' جو کچھ تو چاہتا ہے۔ وہ ہوتا ہے۔ میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے تو مجرم ہے۔ اس نے کہا کہ ہمیشہ کے لیے اصلاح کے دروازے بند کر لیے تو نے اپنے اوپر۔ اصلاح کا دروازہ اس کا کھلنا تھا' جس نے کہنا تھا کہ ظَلَمۡنَاۤ

اَنْفُسَنَا(7:23) ۔

اپنی کمزوری کا اعتراف نہ کرنا اور ہر بات کو معاشرے کا جرم قرار دینا' ابلیسیت کی چال ہے

جو ذمہ داری ہی لیتا نہیں ہے اپنے جرم کی وہ اصلاح کیسے کرسکتا ہے اپنی۔ یہ ہے آدم وابلیس کا قصہ۔ ایک ایک سانس میں ہمارے ساتھ یہ بیتتی ہے۔ جرم سرزد ہوتا ہے۔ عقلِ حیلہ جو پھر اس کے لیے تلاشتی ہے یہ چیزیں کہ میری وجہ سے نہیں ہوا' دیکھنا وہ یہ نہ کرتا تو میں یہ ایسے کرنے کو تیار تھا۔ اور پھر اس دور میں جو آپ کے ہاں ایک نیا فلسفہ آیا ہے کمیونزم کا اس نے جو تباہی مچائی ہے۔ جو جرم بھی کسی فرد سے ہوتا ہے' یہ سارا کچھ وہ بیان کرنے کے بعد کہ یہ ایسا ہے ایسا ہے ایسا ہے' آخری فقرہ اس میں یہ ہوتا ہے کہ نہیں یہ دیکھئے فرد کا اس میں جرم نہیں ہے' معاشرے کا یہ پیدا کردہ فرق ہے۔ چل بھئی! ساری ذمہ داریاں ڈھل گئیں۔ یہ جو اتنی ڈھٹائی سے جرم ہو رہے ہیں' وہ ذرا سا بھی اشکِ ندامت نہیں آتا کسی کی آنکھ میں' یہ کیوں ہو رہا ہے؟ کہا یہ گیا ہے کہ افراد اس کے لیے ذمہ دار نہیں ہوتے معاشرہ غلط ہے غلط معاشرے میں پیدا ہی اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور پھر معاشرے کی مجبوریوں سے یہ کچھ کرنا پڑتا ہے سارے کا سارا۔ فرد ذمہ دار ہی نہیں رہتا۔ اور یہ اتنا خطرناک طریقے سے زہر پھیلائے چلے جا رہے ہیں آج کل' حیرت ہو جاتی ہے۔ ٹی وی پہ ایک سیریز چلی آ رہی تھی ''رات کی آنکھیں''۔ اس قسم کی چیزیں جو ہیں ان کے لیے کبھی کبھی یہ چیزیں میں ضرور دیکھ لیتا ہوں۔ اس میں انہوں نے بتایا یہ تھا کہ یہ سمگلر کیا کرتے ہیں۔ زندگی ان کی کیا ہے۔ کس طرح سے ایک غریب آدمی اس لائن میں آتا ہے اور پھر اس کے بعد وہ کیا کچھ کرتا ہے۔ بڑے لمبے چوڑے سلسلے تھے۔ ساری سیریز نہایت عمدہ چلی آ رہی تھی کہ ان کی زندگی' کتنے کرب کی زندگی بے چینی کی زندگی۔ ساتھ ہی اس کے یہ کہ ایک جرم کو چھپانے کے لیے کس طرح سے دس جرم اور کرنے پڑتے ہیں۔ پھر یہ ایک فرد' فرد نہیں رہتا ایک پورا گروہ بن جاتا ہے جو اس کے اندر پھنسا ہوا رہتا ہے جال ایسا ہے اس میں سے نکل نہیں سکتا وہ شخص۔ یہ ساری چیزیں اس میں دی ہوئی تھیں' نہایت عمدگی سے چلی آ رہی تھیں۔ میں بھی مطمئن تھا کہ یہ چیز تو بڑا عمدہ چلی آ رہی ہے اس میں کہیں تھوڑی تھوڑی وہ جھلک تھوڑی سی سرخی کی' نظر آتی تھی اس میں لیکن نمایاں نہیں تھی کہ بات یہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ آخری سیریز' آخری اس کا ٹکڑا اور اس کے بعد انجام اس کا' انجام بھی یہ کہ وہ کسٹم والوں نے چھاپہ مارا اور اس میں یہ سمگلر اور اس کے ساتھی جو تھے' گولی کا نشانہ بنے اور یہ وہاں ہلاک ہوئے۔ وہ انجام بھی ٹھیک تھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ بچوں کو آنے والی نسلوں کو تاثر دینے کے لیے کہ

؎ مندے کے جد کرمندا ہو

کہ ان چیزوں کا انجام یہ ہوتا ہے۔ زندگی کرب سے گذرتی ہے' انجام ہلاکت ہوتا ہے بڑا ٹھیک تھا۔ تو میں حیران تھا کہ یہ کیا بھول گیا ہے یہ دینے والا یہ تو آخری بات ہوگئی۔ لیکن وہ بھولا نہیں۔ آخری بات وہ مر رہا ہے بلکہ وہ مر ہی چکا ہے اس کا ایک دوست ہمدرد اس کا

ایک کردار بتایا ہوا تھا' فلاسفر کا شراب وراب کے نشے میں رہتا ہے لیکن ہے وہ بڑا فلاسفر قسم کا' بات صاف کرنے والا۔ وہ اس کے سرہانے آتا ہے اور اس سے آ کے کہتا یہ ہے کہ تیری آدھی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں وہ اس لیے ہیں کہ اس کے بعد جو شخص تمہاری لاش کو دیکھے گا تمہاری آنکھوں میں اپنا عکس اس کو نظر آئے گا۔ چلئے ٹھیک بات ہے' شاعری ہے۔

ڈرامے کے اہتمام نے زاویہ نگاہ ہی بدل دیا

اس کے بعد کہا کہ اب سوال یہ پیدا ہوگا اس کے ذہن میں کہ تو تو ایسا نہیں تھا' وہ ابتداء میں ایسا نہیں تھا یہ کریکٹر' گھر بار والا شریف آدمی' تو تو ایسا نہیں تھا تو ایسا کیوں بن گیا؟ اور اس کا جواب اس کو مل جائے گا کہ اس میں تیرا قصور کوئی نہیں ہے' معاشرے نے جیسا چاہا تمہیں بنا دیا اور ختم ہوا ڈرامہ۔ چل بھئی۔ پتہ نہیں تین مہینے تک رہا یہ کچھ ہوا۔ ایک فقرہ عزیزانِ من! یہ Technique ہوتی ہے یاد رکھئے ان کی' بڑی خوبصورت چیز آتی ہے سطح بیں نگاہیں پہچان نہیں سکتیں۔ ایک ذرا سا اس کے اندر یہ دیا ہوا ہوتا ہے نگاہوں کا زاویہ الٹ کے رکھ دیتا ہے۔ تین مہینے یہ جو کچھ دیکھتے رہے بچے کہ یہ کیا ہوتا ہے یہ کیا کرتا ہے یہ کیا ہو رہا ہے اور روز ان کے ذہن میں یہ تھا کہ یہ کس قدر ظلم کس قدر جرم۔ ایک فقرے میں نگاہ کا زاویہ ان کا بدل دیا کہ اس کا جرم نہیں تھا' معاشرہ یہ کچھ بنا دیتا ہے۔ ٹھیک ہے۔

قرآن حکیم کی تعلیم تو یہ ہے کہ ہر فرد اپنے لیے خود ذمہ دار ہے

وَ لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا فُرَادٰی (6:94) قرآن کہتا ہے معاشرے کو جرم کا ساتھ دیتے ہو' فرد کی حیثیت سے سامنے آؤ گے۔ آج وقت ہو گیا عزیزانِ من! یہ بات اگلے درس پہ اٹھا رکھتے ہیں۔ کہاں لایا ہے قرآن اس چیز کو وَ لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا فُرَادٰی (6:94) کیوں فریب دیتے ہو اپنے آپ کو۔ انفرادیت تمہاری یہ ہے جس سے تم انسان کہلاتے ہو۔ لیکن یہ میں نے عرض کیا ہے کہ اگلی دفعہ سہی۔ سورۃ الانعام کی ایک ہی آیت آج آئی 93 آیت۔ خدا کرے کہ جو بات قرآن اس میں کہنا چاہتا تھا' وہ کہہ سکا ہوں۔ 94 آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

تیرہواں باب: **سورۃ الانعام** (آیت 94)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسانی زندگی کا اہم مسئلہ میرٹ کی بنیاد کا مہیا کرنا ہے اضافی تصورات کا نہیں

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1971ء کی 24 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی آیت 95 سے ہو رہا ہے (6:95)۔

سابقہ آیت میں کہا یہ گیا تھا کہ یہ خدا پر افتراء باندھنے والے' انسانوں کی خود ساختہ شریعت کو خدا کی شریعت بتانے والے' یہ کشف والہام ووحی کے مدعی' یہ کہنے والے کہ وحی بھی Intuition یا وجدان ہی کی قسم کی ایک چیز ہے' انہیں تم دیکھو گے کہ جب پھر موت کے بعد ان کی کیفیت کیا ہوگی جب ان کے Unconscious اور Conscious Mind کی کشمکش نکھر کر باہر آ جائے گی۔ یہ بات پچھلی آیت میں آ رہی تھی اسی کے تسلسل میں اب آگے بات چلتی ہے۔ اور جیسا کہ میں نے آخر میں اشارتاً عرض کیا تھا اتنی عظیم حقیقت اس آیت کے اندر بیان کر دی ہے۔

خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں تنہا پیش ہونے کا حقیقی مفہوم

چودہ سو سال پیشتر تو شاید کسی کے قیاس وگمان وخیال اور وہم میں بھی نہ آ سکتی ہوگی۔ ہمارے دور میں یہ چیز کچھ ابھر کر سامنے آ رہی ہے اگرچہ وہ اس Reality اور حقیقت کے مقام تک ابھی نہیں پہنچی جہاں تک قرآن پہنچاتا ہے لیکن اس کے قرآئن اور شواہد ضرور سامنے آ رہے ہیں۔ آیت ہے وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ (6:94) عام ترجمہ تو اس کا یہی کیا جاتا ہے کہ تم ہمارے حضور تنہا آؤ گے جیسا کہ تمہیں پہلی بار پیدا کیا گیا۔ یہ تنہا آنے کا جو تصور ہے یعنی یہ کہ وہاں صرف اللہ میاں ہونگے اور ایک ایک آدمی تنہا وہاں جائے گا جیسے ہمارے ہاں انٹرویو میں عام طور پہ یا Interogation کے وقت میں ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے کہ یہ چیز قرآن کے تصور کے خلاف ہے۔ بات اگر یہی ہو کہ میں ہوں اور صرف خدا ہو کوئی اور وہاں سننے والا ہو نہ دیکھنے والا نہ جاننے والا کہ میں

نے کیا کیا اور وہ کہ جسے آج بھی معلوم ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کیا چھپا رہا ہوں' جو دل میں گذرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے اگر معاملہ تنہا اسی سے ہے اور خلوت میں یہ سب کچھ ہونا ہے ''کمرے اچ جوتیاں وی پے گیاں چار تے تاں کی ہوگیا' بازو جھاڑ دے باہر آ گئے''۔

انسانی زندگی کے سب سے بڑے جہنم کی نوعیت

قیامت تو عزیزانِ من! یہ ہے کہ وہاں یہ سب ہونگے جو آج ہمارے سامنے ہیں جن سے ہمارا معاملہ پڑا' جن سے ہم نے بہت کچھ چھپایا کہ جو ہم ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جن میں ہم بڑے معتبر بنے رہے' بڑے دیانتدار بنے رہے' بڑے ایماندار بنے رہے' بڑے شریف انسان بنے رہے جن سے بڑے گہرے دوستانہ مخلصانہ تعلقات کے دعوے کرتے رہے' جن میں اس طرح سے زندگی گذاری کہ خود کچھ تھے' انہیں کچھ بن کے دکھایا۔ قیامت تو یہ ہے کہ وہ سب وہاں سامنے ہونگے اور جو کچھ چھپایا ہوا ہوگا' وہ بالکل سامنے آجائے گا اس طرح کہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکے گا۔ جیسا کہ میں اس سے پیشتر بھی کئی بار کہہ چکا ہوں' اس سے بڑا جہنم کا عذاب اور کیا ہوسکتا ہے۔ یہاں زندگی بھر میں کسی کی ایک بات ایسی چھپائی ہوئی جو کسی دوست سے کسی معاملے والے سے چھپا کے رکھی ہو' منافقت برتی ہو وہ اگر کسی وقت کھل جائے اس کے سامنے' باقی زندگی انسان اس کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ اور جہاں یہ صورت ہو کہ ہر شے ہر بات جو کسی سے چھپائی اسے کچھ بن کے دکھایا تھا کچھ اور' وہ ہر شے سامنے آجائے اور وہ وہاں ہو موجود اور انکار کی وہاں گنجائش نہ ہو جہنم تو یہ ہے۔ اور پھر قرآن تو خود بتاتا ہے وہاں کہ ہر امت اپنے امام کے ساتھ بلائی جائے گی۔ (17:71) مجرم جیسے آئے گا وہ بالکل نقشہ اس قسم کا ہے کہ ایک شہید ہوگا ایک سائق ہوگا پیچھے سے ہانکنے والا' دھکیل دھکیل کے آگے لے جانے والا (50:21)۔ وہاں یہ سب ہونگے ایک دوسرے کو پہچانتے ہونگے ان کی باہمی گفتگو ہوگی ان کے مکالمات ہونگے۔ قرآن تو یہ سارا کچھ دیتا ہے۔ اس لیے یہ مفہوم کہ تنہا ایک ایک فرد ایک مجرم تنہا خدا کے ہاں اور بند کمرے کے اندر جائے گا وہ قرآن کی شہادات کے بھی خلاف ہے اور جس مقصد کے لیے قیامت برپا کی جارہی ہے' وہ اس مقصد کے بھی خلاف ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک ہر انسان کی ذات ایک انفرادی حیثیت کی حامل ہے' جسے آگے جانا ہے

بات یہ نہیں ہے۔ فُرَادٰی (6:94) کے معنی دوسرے مقام پر اسے فردًا بھی کہا گیا ہے وَ كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا (19:95) حیوانی زندگی جسے اس دور میں مادی تصورِ حیات کہا جاتا ہے Materialistic Concept of life کہا جاتا ہے' اس میں ایک فرد یا انسان کی انفرادیت یا Individuality کا تصور نہیں ہوتا۔ Individuality کا بڑا صحیح ترجمہ ہمارے ہاں

انفرادیت ہوا ہے اور وہ قرآن سے لیے ہوئے لفظ سے ہے جسے فَرْدًا (19:95) قرآن نے کہا ہے۔ قرآن ایک انسان کو ایک فرد کو ہر ایک فرد کو الگ الگ Individuality یا انفرادیت کا حامل سمجھتا ہے جسے انسانی ذات یا اس کی Personality کہا جاتا ہے۔ میں ایک Self contained entity ہوں' انفرادیت ہے میری۔ میرے ہر عمل کا ہر ارادے کا ہر خیال کا اثر مرتب ہوتا ہے میری اپنی ذات پر' اس میں اور نہیں شریک ہوتا۔ ابھی میں اس کی تفصیل بیان کرونگا۔ میری اپنی ذات پر اس کا اثر مرتب ہوتا ہے اور مجھے ہی اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔

قرآن حکیم نے کرہ ارض پر انسانی پیدائش کو خلق جدید کہہ کر پکارا ہے جو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہوتی ہے

یہ جو قانونِ مکافاتِ عمل ہے' ہر فرد جواب دہ ہے اپنے خیالات کا ارادوں کا خواہشات کا آرزوؤں کا اعمال کا کردار کا۔ ایک تو صورت یہاں معاشرے کے اندر ہے' سوسائٹی کے قوانین ہیں۔ ان میں تو وہ صورت ہے کہ سوسائٹی کے قانون کی اگر خلاف ورزی کی' سوسائٹی نے اس پہ گرفت کی۔ لیکن ایک شے انسان کی اپنی انفرادیت ہے کہ میں نے جو خیال بھی کیا' جو ارادہ بھی کیا خواہ وہ عمل میں نہیں بھی آیا اس کا بھی اثر میری ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اور یہی ان اعمال کی ترتیب دی ہوئی وہ شے' وہ ذات جسے کہتے ہیں' وہ آگے جائے گی مرنے کے بعد اور یہ ہے جسے قرآن نے فرمادیا فُرَادیٰ یا انفرادیت کا حامل کہا ہے۔ کہا یہ ہے کہ تمہاری ایک اپنی ذات Individuality انفرادی حیثیت سے آئے گی سامنے اور وہ اپنے ہر عمل کی جوابدہ ہوگی۔ یہ جو قرآن نے کہا ہے کَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (6:94) پہلے تو وہی چیز ہوئی کہ وہ جو ہے بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ (50:15) پہلی پیدائش تو وہ ہے جو اس دنیا کے اندر ہوتی ہے بچے کی اور اسے قرآن نے کہا ہے خَلْقًا اٰخَرَ (23:14) ایک اور پیدائش اسے کہہ کے پکارا ہے۔ ایک تو اس میں تردید کردی اس نے اَوَّلَ مَرَّةٍ (6:94) کہہ کر۔ کہ ہندوؤں کے ہاں یہ تصور کہ ہر بچہ اپنے سابقہ جنم کے کرموں کا اثر اپنے اوپر لے کر پیدا ہوتا ہے' اسی کے مطابق اس کی پیدائش ہوتی ہے۔ اول تو یہ کہ ہوسکتا ہے کہ حیوان کے پیکر میں اس کی پیدائش ہو اور حیوان کے پیکر میں' نہیں انسان کے پیکر میں بھی ہے تو وہ کوئی شودر پیدا ہوگا کہیں ویش پیدا ہوگا کہیں کھشتری ہوگا کوئی برہمن ہوگا۔ یعنی ان کے ہاں جب پیدا ہوتا ہے تو غیر ملوث نہیں ہوتا وہ آلائشوں اور پچھلے جنم کے کاموں کی ساتھ لے کر آتا ہے۔ قرآن پہلے تو اس کی تردید کرتا ہے' قطعاً غلط ہے۔ ہر بچہ ایک Clean Slate لے کر پیدا ہوتا ہے۔ عیسائیت نے یہ کہا کہ ہر بچہ اپنے اولیں ماں باپ آدم اور حوا کے گناہ کی آلائش اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور وہ کسی طرح سے دھل ہی نہیں سکتی بجز اس کے کہ وہ حضرتِ مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان نہ لائے۔ یعنی یہ بھی آلائش لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھئے

کہ یہ بچہ یوں پیدا ہوتا ہے یا اس طرح سے پیدا ہوتا ہے یہ جو بوجھ لے کر پیدا ہوتا ہے اس میں اس کا تو کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

قرآن حکیم پیدائش کے اعتبار سے کسی اضافی چیزوں کو اہمیت نہیں دیتا

قرآن اس تصور کی تردید کرتا ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ بالکل Clean Slate لے کر پیدا ہوتا ہے سابقہ کوئی آلائش اس کے ساتھ نہیں ہوتی۔ اور جہاں کسی گناہ کی آلائش نہیں ہوتی جتنا چیزیں آپ اس کے بعد اضافی یا Relative اسکے ساتھ نسبت اس کی ہوتی ہے وہ ان نسبتوں سے بھی پاک اور صاف ہوتا ہے۔ پہلی نسبت تو اس خاندان کی ہے جس میں وہ پیدا ہوا۔ سیدوں کا گھرانہ ہے تو سب سے پہلے ہی سید ثروت حسین اس کا نام آ گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ اضافی چیز ہے جو تم نے دی' جب وہ پیدا ہوا تھا تو اس پہ تو کہیں نہیں لکھا ہوا تھا کہ یہ شیخ ہے یہ سید ہے یہ پٹھان ہے یہ مغل ہے۔ وہ تمہاری معاشرے کی نسبتیں ہیں جو تم نے اس کے ساتھ دیں۔ اول مـرةٍ جو ہم نے پیدا کیا تھا یہ نہیں ہوگا اور یہ نسبت ختم ہوجائے گی دوسری تخلیق ہے اس کے اندر بھی' جتنی چیزیں اضافی تم اس کے ساتھ لگاؤ گے' وہ ساری ختم ہوجائیں گی اس کے بعد۔ پھر یہ کہ وہ امیر گھرانے میں پیدا ہوگیا اتنی کوٹھیاں' اتنی مربع زمین' اتنے کارخانے اس کے باپ کے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ وہ پیدا ہوا تھا تو کوئی دستاویزیں اسکے ہاتھ میں نہیں تھیں کہ اس کی ملکیت کے حقوق اس کو دیدیے ہیں اور یہ ان کو لے کے آ گیا ہے۔ کچھ بھی نہیں تھا اسکے پاس تو' اس نے تو کچھ کرنا تھا' جس کا معاوضہ اسے یہاں ملنا تھا۔ یہ ساری چیزیں بھی اضافی نسبتیں ہیں جو تم نے اس کے ساتھ کردی ہیں۔ پھر انہیں نسبتوں کے اندر آ گے چلے آئے۔ یہ حضرت صاحب ہیں یہ ہمارے پیر صاحب ہیں یہ ہمارے لیے یہ کریں گے اور وہ ہمارے لیے یہ کرے گا۔ کچھ دوست ہیں' کچھ ہمدرد ہیں۔ اور جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے مذہب کی دنیا کے اندر تو بخشوانے والے' فساد کرنے والے' یہ ساری اضافی نسبتیں ہیں جو بعد میں آپ دیتے چلے آ رہے ہیں۔ آپ دیکھیں گے اس ایک آیت کے اندر قرآن نے کس طرح سے ان سب کی نفی کی ہے۔ انفرادی ہر فرد اپنے اپنے اعمال کا واحد ذمہ دار اور Accountable ہے۔ یہ قرآن کا یا دین کا بنیادی اصول ہے وہ ستون ہے جس کے اوپر ساری عمارت کھڑی ہوتی ہے کہ ہر فرد اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَ عَلَيۡهَا مَا اكۡتَسَبَتۡ (2:286) ہر فرد جو بھی اچھے کام کرتا ہے' اس کا اچھا بدلہ بھی اسی کے لیے ہے یا وہ غلط کام کرتا ہے' اس کا نقصان دہ نتیجہ بھی اسی کو بھگتنا ہوگا۔

قانون مکافات عمل کسی اضافی چیز کو کسی ترازو میں نہیں تولتا

یہ ہے جسے Individuality یا انفرادیت کہتے ہیں۔ یہی فُرَادیٰ جو ہے میں اس کی تشریح کیے چلا جا رہا ہوں۔ یہ وہ اصول ہے جیسا میں نے عرض کیا' بنیادی اصول کہ قرآنِ کریم تو شروع سے آخر تک اسی اصول کو دہرائے چلا جا رہا ہے جسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے

ہیں۔اس لیے میں اس کی تائید میں آیات پیش کروں تو آدھا قرآن پیش کرنا پڑ جائے گا۔دوایک آیات سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی۔مَنۡ كَفَرَ فَعَلَيۡهِ كُفۡرُهٗ ۚ وَ مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فِلِاَنۡفُسِهِمۡ يَمۡهَدُوۡنَ (30:44)

جو بھی صداقتوں سے انکار کرتا ہے اس کا نقصان اسی کو اٹھانا پڑے گا اور جو بھی صلاحیت بخش کام کرتا ہے وہ خود اپنی ذات کے لیے اچھی زندگی کی تیاریاں کرتا ہے۔اپنی ہی ذات کے لیے۔

ایصالِ ثواب کا عقیدہ ایک سازش کے تحت دوسروں سے مستعار لیا گیا' تصور ہے

جس طرح سے کسی دوسرے کے برے کاموں کا نقصان دہ نتیجہ اس کی طرف منتقل نہیں ہوسکتا اسی طرح اس کے اچھے کاموں کا خوشگوار نتیجہ بھی کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوسکتا۔یہ جو ہمارے ایصالِ ثواب کے تصورات ہیں اور اس کے لیے یہ سارے پھر یہ قل اور جمعراتیں اور چالیسویں اور ختم اور یہ سارا کچھ جو ہے یہ سارے غیر قرآنی تصورات' دوسروں کے ہاں سے ہم نے مستعار لیے ہوئے ہیں۔کسی کا کوئی ثواب کسی دوسرے کو نہیں پہنچ سکتا۔یہ انفرادیت کا جو قرآن نے اصول دیا ہے' یہ اس کے خلاف ہے۔آپ کسی دوسرے کے لیے یعنی جو چیزیں اس کی ذات پہ جو اثرات مرتب ہوئے ہیں' ان کے ازالے کے لیے' ان کے دھونے کے لیے آپ کسی دوسرے کے لئے' کچھ نہیں کر سکتے۔جو کچھ وہ کر کے اپنے ساتھ لے گیا ہے' اسے آپ بدل نہیں سکتے۔وَ مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فِلِاَنۡفُسِهِمۡ يَمۡهَدُوۡنَ (30:44) اچھے کام جو ہیں ان کا نتیجہ بھی اپنی ذات کے لیے ہے' کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِهٖ (41:46) جو بھی اچھے کام یا نیک کام جسے آپ کہتے ہیں جو بھی ایسے کام کرتا ہے وہ اپنی ذات کے لیے کرتا ہے وہ منتقل نہیں ہوسکتے کسی دوسرے کی طرف نہیں منتقل ہوسکتے۔وَمَنۡ اَسَآءَ فَعَلَيۡهَا (41:46) اور جو برا کام کرتا ہے اس کا نقصان بھی اسی کو بھگتنا ہوتا ہے کوئی اس کی جگہ آگے جا کے یہ نہیں کہہ دے گا کہ اسے چھوڑ دیجیے اور اس کی سزا مجھے دیدیجئے۔نہ ہی یہ وہاں ہوگا کہ برے کام اس نے کیے اور اس کے لیے کسی دوسرے کی گرفت ہوگئی۔

کفارہ اور پھر کفارے کی بگڑی ہوئی شکل صدقہ دینے کے تصور کی اصلیت

جسے آپ کفارہ کہتے ہیں کیا ہے وہ تصور؟ کہنے کو تو یہ بہت بڑی بات اور ہمارے ہاں بھی یہ جو صدقے دیے جاتے ہیں یہ بھی کفارے کی ہی بگڑی ہوئی شکل ہیں کہ ان کے گناہ اس نے اپنے ذمے لے لیے اور ان کے بدلے میں اپنی جان دیدی۔اس کے گناہ ان لوگوں کے اپنے ذمے لے لئے' یہ انفرادیت کے تصور کے خلاف ہے۔وَمَنۡ اَسَآءَ فَعَلَيۡهَا (41:46) یہ بات کہ کوئی جرم کرے اور کوئی دوسرا اس کو بھرے وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ (41:46) خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی' یہ ہو ہی نہیں

سکتا۔ جیسے یہ نہیں ہوسکتا کہ کرے کوئی' اور بھرے کوئی اسی طرح سے یہ تصور بھی غلط ہے کہ کسی کے اپنی ذات کے اچھے کام کے نتائج کسی دوسرے کی طرف منتقل کر دیں۔ یہ منتقل ہونے والی بات نہیں ہے۔ وہ جو میں ایک مثال دیا کرتا ہوں سمجھانے کے لیے اچھی چیز ہے کہ جو شخص صبح سیر کے لیے نکلتا ہے اور اس کے بعد جب واپس آتا ہے تو اس سیر سے اسے ایک نفع پہنچتا ہے جو وہ ورزش کرتا ہے اس سے اس کی صحت بنتی ہے۔ کبھی یہ ممکن ہے کہ وہ یہ کچھ کرنے کے بعد سیر یا ورزش کرنے کے بعد گھر میں آئے اور بھائی صاحب جو لیٹے ہوئے ہیں اور اٹھے ہی نہیں ہیں بستر سے تو یہ جو صحت اس کو اچھی ملی ہے اس میں سے کچھ حصہ ان کو بھی منتقل کر دے کہ لیجیے صاحب! سارا نہیں آپ بڑے بھائی ہیں ہمارے اور بڑا تعلق ہے آپ سے' بڑی مہربانی ہے آپ کی آپ ہمیں چیز دیا کرتے ہیں' لیجیے ہم اپنی اس صحت میں سے کچھ حصہ آپ کو دیدیتے ہیں۔ یہ عام Physical Life کے اندر یہ چیز بھی جو انفرادیت کی ہے دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوتی تو وہ شے جس سے انسان کی ذات سنورتی ہے' اسے دوسرے کی طرف منتقل کیسے کر دے' بڑا ہی غلط تصور ہے۔ کچھ نہیں کسی کے لیے کوئی دوسرا کر سکتا یا دے سکتا' یا درکھیے۔

انسانیت کے اندر یہ ذاتیں اور...... قطعی طور پر اضافی چیزیں ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں

اس کے بعد اضافی رشتے آتے ہیں اور یہ بچے کی پیدائش کے ساتھ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ اضافی رشتے کچھ یوں چپکتے ہیں کہ یہ چلتے ہیں آخر تک۔ پہلی چیز تو یہ کہ جس خاندان میں پیدا ہوا ہے ان کی ذاتیں ان کی گوتیں یہ ساری اس کے ساتھ آجاتی ہیں۔ یہ مسائل جو قرآن دیتا ہے اس کو سائیکولوجی ہی صحیح معنی میں سمجھتی ہے۔

عمل انسانی کی برومندی کے ساتھ ساتھ انسانی ذات کی حقیقت اور اس کی اہمیت اور زیادہ نکھر کر سامنے آتی جائے گی

میں تو عرض کر رہا ہوں کہ قرآنِ کریم کا جتنا حصہ انسان کی ذات کے متعلق ہے اور آخر میں اس کی تعلیم نچڑ کے یہاں آجاتی ہے انسانی ذات کے سنورنے اور بگڑنے پر۔ سائیکولوجی کا سٹوڈنٹ اسے بہترین طور پر سمجھ سکتا ہے۔ وہ تو جو قرآن نے کہا تھا کہ سَنُرِيهِمْ ءَايَٰتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِيٓ أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) کہ ہم خارجی کائنات میں اور خود تمہاری اپنی Self کے اندر تمہاری ذات کے اندر' اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں تا آنکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ قرآن واقعی سچا ہے۔ اس کے سچے ہونے کے لیے دلیل یہ ہے کہ أَنفُسِهِمْ (41:53) انسان کی Personality (ذات) اس کا Self اس کے متعلق بھی' جس قدر مطالعہ انسان کا وسیع ہوتا چلا جائے گا' اسی قدر یہ قرآن کے حقائق کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہوگا۔ اور اس دور میں ہمارے ہاں یہ جو نئی چیز شروع ہوئی

ہے جسے سائیکولوجی کہتے ہیں اس کی آگے شاخیں Psycho Analysis وغیرہ جو ہیں قرآن کے بڑے حقائق اس کی رو سے سمجھ میں آتے ہیں۔ بہرحال یہ نسبت جوتھی خاندان کی' یہ ٹھیک ہے سیدوں کے گھر میں پیدا ہوا یہ جنہیں آپ اونچی ذاتیں یا اونچی گوتیں کہتے ہیں' پٹھان کے پیدا ہوگیا' راجپوت کے ہاں پیدا ہوگیا جو عام طور پہ کہا جاتا ہے بڑے فخر سے وہ یہ اپنے نام کے ساتھ لگاتا ہے۔

ذات برادری کی اندھیری رات نے ملتِ اسلامیہ کو صدیوں سے نفسیاتی تقلید پرستی کی تباہ کن بیماری میں مبتلا کر رکھا ہے

یہ چیز غلط ہے اس کا ثبوت اس طرح سے ملتا ہے کہ جو بدقسمتی سے کسی ایسے خاندان میں پیدا ہوگیا کہ جنہیں کمین یا قابلِ تحقیر سمجھتا ہے معاشرہ' آپ دیکھئے گا کہ یہی نہیں کہ وہ اپنی نسبت ان کی طرف کرتا ہوا باہر جائے اور لوگوں کو بتاتا پھرے وہ ساری عمر چھپاتا پھرتا ہے۔ میں کسی ذات اور گوت پہ حملہ نہیں کرنا چاہتا۔ مثلاً ہمارے ہاں یہ حجام نائی یہ سقے کمہار ان کو قابلِ تحقیر گوتیں یا ذاتیں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ تصور ہم نے ہندوؤں سے لیا ہوا ہے۔ غیروں سے لیا ہوا ہے قرآن کے یکسر خلاف ہے۔

قرآن حکیم کی روشنی میں ذات برادری کے اضافی تصورات سے پیدا ہونے والے ضمیر کے بوجھ کا یقینی علاج

میں کہہ یہ رہا ہوں کہ اضافی نسبت کرتی کیا ہے انسان کے ساتھ۔ اب اس بچے کا کوئی قصور نہیں کہ یہ مثلاً نائیوں کے گھر میں پیدا ہوگیا۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ وہ ساری عمر بیچارہ اس اضطراب میں مرتا رہتا ہے کہ کسی کو معلوم نہ ہو جائے کہ نائی ہے۔ کہیں وہ بہت بڑا بنا ہوا ہو بڑا معتبر ہو اپنے ذاتی میرٹ کے اعتبار سے بھی بہت اونچا ہو مجلس میں بیٹھا ہو کھڑا ہو بات کر رہا ہو قابلِ فخر قابلِ عزت' ہر وقت اس کے ذہن میں یہ رہتا ہے کہ سامنے سے کوئی یوں تو نہیں کر دیتا۔ اندازہ لگایئے کہ کس قدر یہ شرفِ انسانیت کی تذلیل ہے یہ چیز' یہ تصورات جو ہیں۔ کیا چیز ہے یہ؟ اضافی چیز ہے ایک' وہ پیدا نائی نہیں ہوا ہے ایک اضافی چیز اس کے ساتھ لگ گئی۔ لیکن اس اضافی چیز نے اس پہ نفس یا سائیکولوجی پہ جو اثر کیا ہوا ہے لوگوں کو اس کا پتہ نہیں ہے۔ اس سے اتنے Complexes پیدا ہو جاتے ہیں اس کے اندر' گھٹن پیدا ہو جاتی ہے ساری عمر وہ اس میں گھٹا ایسے جیسے کوئی بہت بڑا جرم کر بیٹھا ہے وہ' کسی کو پتہ نہ چل جائے۔ ارے پھر جرم جو ہے اس کے متعلق تو چلئے صاحب! کئی اس قسم کے قاتل اس قسم کے بہت بڑے جرائم کے مرتکب مفرور ہو جاتے ہیں' چھپے رہتے ہیں' برسوں تک مفرور رہتے ہیں۔ اس کے بعد خود تنگ آ جاتے ہیں جب اس زندگی سے تو ایک شکل تو ہوتی ہے بچنے کی کہ وہ آ کے اقرار کر لیتے ہیں اس کا۔ وہ کہتے ہیں نا بھاگا ہوا مجرم خود کبھی آ کے سرنڈر کر جاتا ہے' آ جاتا ہے' آ گیا آ کے اقرار کیا اس جرم کی سزا ملی وہ Complex

جو ہے وہ جو بوجھ ہے ضمیر کے اوپر وہ تو اتر گیا' اس کے ازالے کی کوئی شکل ہے۔ لیکن یہ جو اس کے Unconscious Mind کے اوپر اس کے ضمیر کے اوپر بوجھ ہے کہ یہ نائی ہے یعنی اگر اس کے لیے وہ یہ کرے کہ چھپایا ہوا تھا اس وقت تو اس نے بتایا نہیں تھا مجلس میں معاشرے میں آ کے اعلان کرو تو دہرا مجرم ہو جاتا ہے' جسے نہیں پتہ اسے بھی پتہ۔ یعنی یہ ایسی چیز ہے کہ ساری عمر اس کا بوجھ اس کے ضمیر سے ہٹ ہی نہیں سکتا۔ آپ نے اس ایک مثال سے سوچا قرآن کیا کہہ گیا۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (6:94) تم جب پیدا ہوئے تھے تو نہ تو نائی تھے نہ کمہار تھے نہ سید تھے نہ پٹھان تھے' ہم ان Complexes کو دور کرنے کے لیے آئے ہیں۔ قرآن ان Complexes کو دور کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ معاشرے میں کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ بچے کی پیدائش کے اعتبار سے کوئی اضافی نسبت اس کی طرف چپکا دے' جرم ہوگا اسلامی معاشرے کے اندر عزیزانِ من! یہ بات۔ نہ کسی کے لیے کوئی قابلِ فخر اضافت ہوگی کہ یہ سید ہیں یہ شاہ صاحب ہیں یہ خان صاحب ہیں اور نہ باعثِ ذلت اضافت ہوگی کہ یہ کمہار کا بیٹا ہے یا نائی کا بیٹا ہے۔ فرادیٰ اس فرد کو دیکھا جائے گا کہ وہ کیا ہے یہ نہیں کہ اس کے ساتھ نسبتیں کیا چمٹی ہوئی ہیں۔ دیکھئے قرآن کس انداز میں یہ باتیں کرتا ہے۔ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (60:3) اس قرآنی انقلاب کے اندر یاد رکھو کہ یہ چیزیں کہ ماں باپ تمہارے سید تھے یہ پٹھان تھے یہ نسبتیں اضافی' بڑے امیر تھے بڑی کوٹھیوں اور کارخانوں کے مالک تھے' کسی کو یہ اضافی چیز کچھ فائدہ نہیں دے سکتی نہ ماں باپ نہ اولاد فائدہ دے سکتی ہے۔ فرد اپنی Individuality لے کے آئے گا۔ ابھی میں عرض کرونگا قرآن جو کہتا ہے بڑی خوبصورت بات کہتا ہے۔ یہ ساری نسبتیں پیچھے رہ جائیں گی کچھ فائدہ نہیں دیں گی یہ ہے Individuality۔ اولاد اگر کسی کی کچھ بدنکل آتی ہے اس میں خرابیاں ہوتی ہیں تو کسی حد تک ماں باپ سے کہا جاتا ہے کہ تم نے ان کی تربیت اچھی نہیں کی' اس واسطے یہ ایسے ہو گئے۔ تو کسی حد تک اسے ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے کہ یہ جو غلط تربیت انہوں نے دی ہے یہ ان کا جو جرم ہے اس کا خمیازہ ان کو بھی کچھ بھگتنا پڑتا ہے کہ انہوں نے یہ کیا۔ لیکن اگر کسی لڑکے کا باپ شراب پیتا ہے' اس میں اس کا کیا جرم ہے بیچارے کا۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ غلط معاشرے کے اندر جہاں اضافی نسبتوں کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے' یہ بھی چھپتا پھرتا ہے۔ اگر کہیں یہ ہو جائے کہ اس کی ماں بڑی جھوٹی ہے' یہ منہ چھپاتا پھرتا ہے حالانکہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔

تحت شعور میں چھپی ہوئی اضطراری کیفیات کے نتائج اور ان کا علاج

سائیکولوجی کے اندر جب Psycho Analysis کے اعتبار سے Complexes کو کریدتے ہیں نیچے سے تو ان کے اندر یہ اس شخص کے اپنے ہی جرائم یا اپنی ہی غلطیاں اس کے تحت الشعور گرہ گیر نہیں ہوتیں' یہ جو اس قسم کے احساسات ہوتے ہیں کہ اس کی ماں اس قسم کی ہے اس کا باپ اس قسم کا ہے اس سے جو اس کے اندر ایک Inferiority پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہے جو کشمکش رہتی ہے اس کے

دل میں، ساری عمر کے لیے وہ اس کشمکش میں گرفتار رہتا ہے۔ اور اس کے تجربے تو عام طور پہ ہم لوگوں کو ہو جاتے ہیں منہ چھپائے پھرتا ہے آدمی اگر یہ کہے کہ اس کا باپ یہ ہے، وہ ہے ہی نہیں وہ تھا بھی اگر کہا جائے تو۔ یہ سارا تصور غلط ہے قرآن کی رو سے۔ میں کہتا ہوں اس کا یہ جرم جو تھا محض اس لیے کہ یہ اس کے گھر میں Biologicaly پیدا ہو گیا اس واسطے اس بیچارے پہ ساری عمر Complex اس کے Unconscious Mind کے اندر اس کے تحت الشعور کے اندر یہ Complexes پیدا ہوتے رہیں کہ اسکا باپ یہ تھا، وہ یہ کرتا تھا اس کی ماں جھوٹ بولتی تھی۔ آپ غور کر رہے ہیں کہ یہ ایک لفظ میں یا ایک تصور میں قرآن کہاں لے جا رہا ہے۔ آپ میں سے جو احباب Psycho Analysis سے کچھ دلچسپی رکھتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ کتنی دشواری ہوتی ہے ان Complexes کو نکالنے میں۔ اس فرد کے متعلق وہ دیکھتے ہیں کہ کوئی ایسا جرم اس نے زندگی میں نہیں کیا جس کی وجہ سے یہ اضطراب اور یہ Complexes اس کے اندر، یہ کشمکش پیدا ہوئی ہے۔ بات ایسے نکلتی ہے کہ بچپن میں جب ذرا سا شعور اس کا بیدار ہوا تھا تو اس نے طعنہ سنا تھا اپنی ماں کے متعلق یا اپنے باپ کے متعلق اور اس سے جو اس کو خفت اور ندامت کا احساس ہوا ہے وہ اس کے تحت الشعور کے اندر ایک گونج کی طرح سے ایک ذرے کی طرح سے چپک کے رہ گیا ہے اور وہ ساری عمر اس بیچارے کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ قرآن کہتا ہے غلط ہے۔ جب یہ کہتا ہے کہ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ (60:3) وہ فیصلے ہو جائیں گے تمہارے اور ان کے درمیان۔ وہ فیصلہ ہونا چاہیے۔ میں اپنے کام کا ذمہ دار ہوں اپنے اعمال و افعال کا ذمہ دار ہوں۔ لیکن یہ اس لیے ہوتا ہے غلط معاشرے میں کہ یہ جو بڑی بڑی نسبتوں والے ہیں ناسیدوں کے گھر میں پٹھانوں کے گھر میں ان کے گھروں میں پیدا ہونے والے وہ جب بڑے فخر سے اس کو اپنے ساتھ لیے پھرتے ہیں، وہ نہیں چھوڑنے کو تیار ہوتے۔ یا امیروں کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ کبھی نہیں بڑا ہو کے کہتا کہ نہیں میرا کوئی حق نہیں ہے اس دولت کے اوپر، میں نے نہیں یہ کمائی تھی۔ یہ چیزیں ہیں جن کے ساتھ اضافی طور پہ ہم چمٹے رہتے ہیں اس لیے جن کے خلاف وہ چیزیں جاتی ہیں وہ بھی ان کو نہیں چھوڑ سکتے۔ چھوٹی ذات والے کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ، غریب کے گھر میں پیدا ہونے والا، بچہ ساری عمر باپ کے اس جرم کی سزا بھگتتا ہے کہ وہ غریب کیوں تھا۔ نہ اسے تعلیم ملتی ہے نہ اسے Opportunities ملتی ہیں نہ مواقع ملتے ہیں، نہ اس کے بعد معاشرے کے اندر اسے مقام ملتا ہے۔ آن میرٹ اگر اپنے جوہرِ ذاتی کی بناء پہ کچھ حاصل بھی کر لیتا ہے تو ہر وقت یہ چیز کہ یہ آج بن بیٹھے صاحب، دیکھئے باپ ''بوریاں ڈھوہندا پھرداسی''۔ یعنی اندازہ لگایئے۔

ہر فرد کو اس کے انفرادی عمل اور کردار سے جاننا اور دیکھنا ہوگا

آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن ایک لفظ سے کیا اصلاح کر رہا ہے آپ کے معاشرے کی، کہاں لے جا رہا ہے۔ کہتا ہے ہر فرد کی انفرادیت دیکھنی پڑے گی تمہیں کوئی اضافی نسبت نہیں ہوگی۔ اور یہاں تو یہ کہا ہے کہ تمہیں فائدہ ہی نہیں دے سکیں گی تمہاری یہ نسبتیں اور

آ گے چلئے کیسے عجیب انداز میں بات بیان کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ جب یہ چیز ہوگی ہر ایک کو اس کے اپنے اعمال کا Responsible یا ذمہ دار قرار دیا جائے گا اس وقت کیفیت یہ ہوگی یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ (80:34) وہاں بھائی بھائی سے دوڑ جائے گا دور' الگ تھلگ نہیں' بھاگ جائے گا دور بھاگ جائے گا۔ وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ (80:35) ماں باپ سے۔ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ (80:36) بیوی خاوند سے' خاوند بیوی سے۔ بیٹا باپ سے' اولاد ماں باپ سے' ماں باپ اولاد سے بھاگ جائیں گے ایک دوسرے سے۔ آپ سوچئے تو سہی کہ کوئی پھر نسبت باقی رہتی ہے۔

غیر قرآنی معاشرے کی تصویر کشی اور اس کا علاج

کیوں یہ کچھ ہوگا؟ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ (80:37) اس دن تو ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ہوگی اپنا ہی معاملہ اتنا زیادہ ہوگا کہ اسے فرصت ہی نہیں ہوگی کسی دوسرے کی طرف دیکھنے کی۔ اور اس خیال سے کہ کہیں اس کا چھینٹا مجھ پہ نہ پڑ جائے' اس سے بھاگ رہا ہوگا۔ ایک Graphically تصویر کھینچی ہے قرآن نے یہ بتانے کے لیے کہ کیوں تعلقات باقی نہیں رہتے انفرادیت جب آتی ہے۔ انسان خود ذمہ دار ہوتا ہے اس چیز کا۔ آپ سوچئے کہ جب قرآن یہ تصور دیتا ہے ذمہ داری کا' تو معاشرے کے اندر پھر جو بیچارے بچے کے ساتھ محض ان نسبتوں کی وجہ سے یہ Complexes inferriority کے اور یہ کمتری کے جذبات جو ہیں یہ احساسات جو ہیں اسکے شعور میں آجاتے ہیں جن کی وجہ سے وہ ساری عمر کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ قرآن ان کو نکال دیتا ہے وہ معاشرہ ایسا بناتا ہے جس میں ان چیزوں کو کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اگر اس میں یہ معیار ہو جائے کہ کسی کو اس کی بناء کے اوپر کسی قسم کی بھی اس کے خلاف De-moralize کی چیز یا تذلیل کی بات کی جائے۔ اسلامی معاشرے کے اندر جرم ہوگا۔

صاحب حیثیت افراد کے علاوہ برسراقتدار لوگوں کے کردار کے معاشرے پر اثرات اور قرآنی راہنمائی

اب اگلی بات آئی معاشرہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسانی بچوں پر ماحول کی تربیت کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ غلط تربیت کا بڑا اثر پڑتا ہے اور بڑا بنیادی اثر ہوتا ہے اس کا۔ پھر اس کے بعد آگے بڑھتے ہیں معاشرے کے اندر یہ جو بڑے بڑے لوگ جنہیں لیڈرز کہتے ہیں ان کی زندگیوں کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ اوپر ارباب نظم ونسق یا ذمہ دار ہیں وہ اگر اچھے کریکٹر کے اچھے کردار کے ہو جائیں وہ اگر کرپٹ نہ رہیں وہ اگر صلاحیت بخش کام کریں تو اس کا اثر قوم پہ پڑتا ہے یہ ٹھیک ہے۔ قوم پہ پڑتا ہے۔ اور اگر اوپر کرپٹ ہو جائیں یا ان کے اندر بدکرداریاں آجائیں تو اس کے اثرات بھی متعدی ہوتے ہیں' جراثیم کی طرح آگے پھیلتے ہیں۔ لیکن میں ابھی آگے چل کے عرض کروں گا قرآن اس پہ بھی فرد سے کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ یہ جراثیم عام ہوتے ہیں۔ لیکن جب وبائی امراض پھوٹتی ہیں' جراثیم مرض

کے عام ہوتے ہیں' ان سے بچنے کے لیے بھی تو تم احتیاطی تدابیر اختیار کرتے ہو یا نہیں' بھاگے بھاگے پھرتے ہو ڈاکٹروں کے ہاں جاتے ہو ان سے کہتے یہ ہو کہ ٹھیک ہے کسی کو اگر یہ لگ گیا مرض تو اس کے بعد Curative تو آپ دیں گے آپ یہ بتائیے کہ Preventive کیا چیز ہے' بطورِ حفظِ ماتقدم مجھے کیا کرنا چاہیے تا کہ یہ جراثیم لگیں ہی نہیں مجھے۔ اور اسی معاشرے میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس قسم کی تدابیر اختیار کر لیں تو انہیں یہ جراثیم کچھ نہیں کہتے۔ اور اسی وقت اختیار کرنا تو ایک طرف اگر اس کی صحت اچھی ہے قوتِ مدافعت اندر اچھی اس نے پیدا کی ہوئی ہے تو پھر یہ چیز وبائی امراض کے جراثیم بھی اسے کچھ نہیں کہتے۔ وہ تو جب ان کو Inhale بھی کرتا ہے سانس کے ذریعے بھی اندر جاتے ہیں تو اندر اس کے ان جراثیم کے مارنے والی قوتیں اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ ان سب کو وہ تلف کر کے رکھ دیتا ہے۔ تو جس طرح سے طبعی امراض کے اندر یہ کیفیت ہے اخلاقی امراض کی بھی یہ صورت ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب وباؤں کی طرح عام ہوتی ہیں بداخلاقیاں تو اس کے جراثیم معاشرے میں عام ہو جاتے ہیں۔ لیکن قرآن یہ بتاتا ہے ہمیں کہ فرد کے اندر اتنی بڑی قوت ہم نے رکھی ہے کہ اگر وہ تہیہ کر لے اس کے متعلق تو یہ جراثیم اسے بھی اثر نہیں کر سکتے۔ دو چار آیتیں اس کے متعلق میں سامنے لاؤں گا۔ پہلے یہ چیز معاشرے کے اندر یہ بڑے بڑے لوگ جو ہیں وہ جب بدکرداریاں کرتے ہیں تو عوام ان سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

مادیت کی بنیاد پر مارکس ازم کے سوشلسٹ فلسفے کے تحت معاشرے میں جرائم کی بھرمار کی بنیادی وجہ

آپ کو یاد ہے پچھلی دفعہ میں نے یہ کہا تھا کہ یہ جو ہمارے ہاں تصور ہے مادیت کا جو مارکس ازم یا سوشلسٹ فلسفہ کے راستے سے عام ہو رہا ہے ان کی Technique یہ ہے۔ معاشرے میں جرائم کو وہ عام کرتے ہیں' فسادات کو تخریبی کاروائیوں کو عام کرتے ہیں۔ افراد کے خیال میں یہ چیز یا دل میں یا Conscious Mind میں یہ چیز آتی ہے کہ یہ تو جرم ہے' یہ تو نہیں کرنا چاہیے' ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ تو میں نے آپ کے ٹی وی کے ایک ڈرامے کے انجام کے آخری فقرے سے یہ بتایا تھا کہ ان کی Technique اشتراکیوں کی کیا ہوتی ہے۔ ایک فقرہ نشتر کی طرح خاموشی سے یوں چھو کے آگے چلے جاتے ہیں۔

فلاسفروں کی طرف سے سمگلر کے کریکٹر کی تمام ذمہ داری معاشرے پر ڈال دی جاتی ہے

وہ آخر میں اس سمگلر سے یہ کہتا ہے کہ جس نے اتنی دھاندلیاں مچائی تھیں اور اس کا انجام یہ تھا کہ جب کسٹم والوں نے چھاپہ مارا ہے اس کو گولی لگی ہے وہ مر گیا ہے تو اس کی لاش پہ وہ آتا ہے ہمدرد فلاسفر اس کا۔ تو وہ آ کے یہ کہتا ہے (کریکٹر کا نام اس نے خالد رکھا ہوا سمگلر کا) کہ خالد تم کیا تھے اور کیا بن گئے تم نے کیا کچھ کیا۔ یہاں تک ٹھیک ہے۔ یاد رکھئے ٹی وی سے سب سے زیادہ متاثر بچے ہوتے ہیں

ہمارے اور یہ بات تھی جو بچوں نے مجھ سے پوچھی تھی۔ کہ تم کیا تھے کیا بن گئے تم نے کیا کیا (اور آگے وہ بات آ گئی) لیکن خالد! اس میں تمہارا کیا قصور ہے تم جو کچھ بن گئے اور معاشرے نے تمہیں وہ کچھ بنا دیا' اور چلا گیا۔ بری الذمہ ہو گیا' اب ہر مجرم کو ایک اطمینان مل گیا کہ میرا جرم نہیں ہے' مجھے معاشرے نے بنا دیا جو کچھ بنا دیا۔ اور یہ چیز آج اتنی عام ہو رہی ہے کہ جو بھی اس قسم کی بات کرتا ہے اس سے پوچھو تو کہتا ہے کہ اس غلط معاشرے کے اندر یہ کچھ کرنا پڑتا ہے انسان کو' مجبور ہو جاتا ہے انسان' رہ ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک معذرت (Excuse) اپنے لیے لے آتا ہے کہ فرد اپنے آپ کو ذمہ دار نہیں سمجھتا پھر۔ میں نے عرض کیا کہ یہ ٹھیک ہے کمزور افراد جو ہیں' وہ اس طرح سے اس لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ قرآن نے اس شر کو شرِ مستطیر کہا ہے کہ چنگاریاں اڑ کے لگتی ہیں۔ لیکن پھر سوچ لیجیے فرد کو اتنا مجبور پیدا نہیں کیا ہے' وہ اس قسم کے جراثیم کی Resistance کر سکتا ہے' مدافعت کر سکتا ہے۔ قرآن پہلے لیڈروں کی اور عوام کی گفتگو' مکالمے بتاتا ہے جہنم میں۔ خوب انداز ہے اس کا بات کرنے کا۔

جہنم میں قوم کے لیڈر' رہنما اور عوام آمنے سامنے ایک دوسرے کو مجرم قرار دیں گے

بات یہی ہے کہ اوپر جو لیڈر رہنما اربابِ نظم و نسق ذمہ دار افراد جو معاشرے کے کہلاتے ہیں وہ کرپٹ ہو چکے ہوئے ہیں ان کی وجہ سے وہ جہنم میں ہیں اب ان کے ساتھ ہی وہ عوام بھی جہنم میں ہیں۔ جو یہاں اپنے آپ کو کہہ کے اطمینان دلا لیتے تھے کہ ہم نہیں ذمہ دار' یہ ہیں سارے جو کچھ کرتے ہیں ان کی وجہ سے یہ ساری برائیاں عام ہو رہی ہیں۔ اپنے آپ کو اطمینان دلا لیتے تھے۔ یہ یوں اطمینان دلا لیتے تھے اور وہ کیا اطمینان دلا لیتے تھے؟ کہ جس قسم کا دودھ ہو گا اسی قسم کی بالائی اوپر آئے گی۔ وہ کہتے ہیں قوم ہی اس قسم کی ہے اس قوم میں سے جو لیڈر ابھریں گے وہ بھی اسی قسم کے ہونگے۔ یعنی اِنہوں نے بھی اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے لیا اور عوام نے بھی اپنے آپ کو اطمینان دے لیا۔ فریبِ نفس ہے کہ جس قسم کے اوپر اربابِ نظم و نسق ہونگے اسی قسم کا معاشرہ ہو گا اور اُنہوں نے یہ کہہ لیا کہ جس قسم کی قوم ہو گی اسی قسم کے اس کے لیڈر ہونگے۔ اب اس میں نہ یہ ذمہ دار رہے اور نہ وہ ذمہ دار رہے۔

جہنم کے اس منظر نامے کے متعلق قرآن حکیم کا ایک بصیرت افروز فیصلہ

قرآن نہیں مانتا عزیزانِ من!۔ جہنم میں ان کی باہمی گفتگو ہو رہی ہے۔ یہ ایک مقام پہ قرآن نے نہیں کہا' متعدد مقامات میں ہے بڑی دلچسپ ہے۔ زیادہ تفصیل معلوم کرنی ہو تو میری کتاب ''جہانِ فردا'' میں یہ بڑی تفصیلی چیزیں دی ہوئی ہیں اسی میں سے میں دو ایک آیتیں سامنے لاتا ہوں۔ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ (37:27) وہ جو میں نے کہا تھا نا کہ وہاں تنہائی کمرے کے اندر یہ بات نہیں ہو گی' وہ سب ہونگے۔ قرآن کہتا ہے کہ اب وہ ایک دوسرے کے سامنے ہونگے اور ایک دوسرے کو مطعون کر رہے ہونگے

کہ تم نے یہ کیا ہمارے ساتھ' وہ کہیں گے کہ تم نے یہ کیا ہمارے ساتھ۔ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ (37:28) یہ جو عوام ہیں انہوں نے کہا لیڈروں سے یا بڑے بڑے ذمہ دار ارباب سے یہ کہہ رہے ہیں کہ تم تھے' جو اتنے زور وشور سے ہماری طرف آیا کرتے تھے' اتنے شدومد سے کہیں تقریریں کیا کرتے تھے' کہیں غلط قانون بنایا کرتے تھے کہیں دباؤ دیا کرتے تھے تم تھے جنہوں نے ہمارا بھی بیڑہ غرق کیا کم بختو۔ وہاں وہ ان کو یہ کہہ کے الزام دیں گے۔ یہ اُنہیں کہیں گے کہ ہم نے کیا کیا تمہارے ساتھ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (37:29) تم خود ہی مومن نہیں تھے اس لیے ذرا سی ہم نے بات کی اور تم ہمارے پاس چلے آئے۔ اگر تم اپنے مقام کے اوپر کھڑے رہنے والے' مومن کی صفت اپنے ساتھ رکھتے ہمارے پاس کونسی قوت تھی۔ اور یہ لفظ میرے نہیں ہیں' کونسی قوت تھی'۔ کہا وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ (37:30) ہمارے پاس وہ کونسی قوت تھی جس کی بناء پہ ہم نے تمہیں مجبور کیا تھا تم خود ہی دل کے اندر یہ چاہتے تھے کہ ہمیں بھی کسی طرح سے بائیں ہاتھ سے Overnight Millionaire بننے کے طریقے آ جائیں۔ تمہارے دل میں یہ خیال خود چٹکیاں لے رہا تھا۔ تم اگر مومن ہوتے' یہ ہے چیز قرآن جو کہہ رہا ہے۔ تم اگر اپنے اصولوں کے اوپر قائم رہنے والے ہوتے' اول تو یہ جتنا لالچ تھا وہ ترغیب وتحریص تھی اس کی Resist کرتے کہ نہیں! ناجائز طریقے سے کوئی ایک چیز نہیں لی جائے گی' حرام طریقے سے میں کچھ نہیں لونگا بھوکا مر جاؤنگا' غربت کی زندگی بسر کر لونگا' ناجائز طریقے سے نہیں لونگا کچھ۔ کہا اگر تم اس مقام کے اوپر قائم رہتے' کون دنیا کی ایسی طاقت ہے جو تمہیں مجبور کر دیتی حرام کھانے کے اوپر۔ تم ہی مومن نہیں تھے طٰغِيْنَ (37:30) تمہارے دل کے اندر خود سرکشی کے جذبات اور جراثیم پرورش پا رہے تھے۔ ہم نے تو بس ذرا سی یہ چیز کی' ہمارے پیچھے لگ گئے۔ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ o فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ (37:31-32) ٹھیک ہے ہم گمراہ تھے غلط راستے پہ چل رہے تھے غلط راستے پہ چلنے کی چٹکیاں تمہارے دل میں یہ جذبات لے رہے تھے تم کونسا تہیہ کر کے بیٹھے تھے کہ ہم نے نہیں چلنا اس راستے پہ۔ ہم نے پہل کی تم پیچھے ہو لیے' ہوا تو اتنا ہی ہے۔ کہا کہ ہمارے پاس طاقت وہ کونسی تھی۔ عزیزانِ من! یہ جو بڑے ہوتے ہیں ان کی طاقت تو عوام ہوتے ہیں۔

تمہیں تو تم کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا

جناب ہم نے بنایا حضور ہم نے کیا

کہتا ہے تم نے ان کو بڑا بنا رکھا تھا۔ ان کی قوتِ بازو تم تھے۔ اس لیے ان کے جرائم سے تم بری الذمہ کس طرح سے ہو سکتے ہو۔ اس لیے فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ (37:33) سب کو اس کا حصہ ملے گا سارے مشترک ہوا س عذاب کے اندر تم۔ جب جہنم آتا ہے۔

جہنم کی وہ محسوس شکل جس میں ملتِ اسلامیہ کی موجودہ حالتِ زار کی عکاسی کی گئی ہے

عزیزانِ من! وہاں کا جہنم تو وہاں جاکے دیکھیں گے یہاں کا جہنم جب آتا ہے تو کبھی ہوتا ہے کہ اس جہنم میں صرف آپ کے لیڈر گرفتار ہوں اور عوام اس سے بچ جائیں یہ سب سے پہلے اس جہنم کے عذاب میں ماخوذ ہوتے ہیں۔ آئے ہیں جہنم میں' بہرحال محسوس و مشہود شکل کے اندر مشرقی پاکستان میں۔ یہاں کونسا کم جہنم تھا کون بچا ہوا ہے اس کے اندر۔ فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ (37:33) اور قرآن کہتا ہے اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ (37:34) ان دونوں کو مجرم قرار دیتا ہے قرآن۔ یہ عذر قابلِ قبول نہیں اس کے نزدیک۔ پھر کہیں یہ معذرت ہوتی ہے کہ میں غلط سوسائٹی میں پڑ گیا' فلاں دیکھئے اس قسم کا تھا۔ وہ دوست کوئی ساتھی کوئی مصاحب جو ہیں' انہیں مطعون کیا جاتا ہے' انہیں ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ قرآن تو کوئی رخ چھوڑتا ہی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ وہاں یہ کہے گا کہ یا اللہ! نہیں' میں نہیں ذمہ دار ہوں یہ میرا دوست اس نے مجھے بہکایا تھا یہ لے گیا مجھے' ٹھیک ہے آپ بھی جوا کھیلتا تھا' مجھے بھی ادھر لے گیا تھا۔ میں تو بالکل حقہ بھی نہیں پیتا تھا یہ مجھے لے گیا اس نے مجھے شراب بھی لگا دی چوری کی لت بھی لگا دی مجھے نہیں جی اس کو پکڑیے۔ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِىْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ (50:27) وہ کہے گا کہ نہیں میرے رب! میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں اس کے اندر خود یہ جراثیم موجود تھے یہ تو تلاش کر رہا تھا کسی ایسے کی جو ذرا سا اکسائے اس کو اور اس کے کندھے پہ رکھ کے یہ بندوق چلائے۔ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَىَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ (50:28) ہم اس سے کہیں گے کہ ہمارے ہاں جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہم نے تم سے کہہ دیا تھا کہ ہمارے ہاں اس قسم کی کوئی معذرت قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ ہر فرد اپنے جرم کا ذمہ دار ہوگا۔ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَىَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (50:29) ہماری بات ہمارا قانون بدلا نہیں کرتا اور یہ نہ سمجھو کہ ہم تم پہ ظلم کر رہے ہیں' ہم کسی پہ ظلم نہیں کیا کرتے۔

تہذیب فرنگ جو ایک ہجوم کی شکل میں عرصہ سے ہمارے ہاں وارد ہو رہی ہے اس کا انداز اس کے اثرات اور قرآن حکیم کا فیصلہ

افراد سے آگے بڑھئے قوموں تک کو قرآن لیتا ہے۔ آج ہمارے ہاں ہو رہا ہے' تہذیبِ مغرب نے ہمیں تباہ کر دیا۔ ہمارے لونڈوں کو یہ ساری مادہ پرستی وہاں سے آ رہی ہے' یہ سارے فیشن ادھر سے چلے آ رہے ہیں اب امریکہ سے سیلاب کی طرح ہجوم کی طرح' بلا کی طرح یہ سارا کچھ چلا آ رہا ہے۔ نوجوان بہے چلے جا رہے ہیں اس کے اندر' ان کی شکلیں ان جیسی' ان کے کرتوتیں ان جیسی' اخلاق و اطوار ان جیسے۔ یعنی یہ قوم اپنے اوپر ذمہ داری نہیں لیتی' کہہ یہ رہی ہے کہ وہاں سے یہ چیزیں آ رہی ہیں اور وہ ہمیں متاثر کیے جا رہی ہیں۔

قرآن ان کو بھی نہیں چھوڑتا قرآن ہے' عزیزانِ من! وہ تو کسی گوشے سے آپ کو نکلنے دیتا ہی نہیں ہے۔قومیں کہتا ہے جہنم میں داخل ہونگی۔ **كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا** (7:38) کیفیت یہ ہوگی کہ یہاں تو آپس میں دوستی کے معاہدے بھی' ہونگے تعلقات بھی خوشگوار ہونگے' جہنم میں جب وہ قومیں داخل ہونگی' ایک قوم داخل ہوگی تو اس کی بہن جو پہلے داخل ہوگی' اس پہ لعنت برسائے گی مطعون قرار دے گی۔ **حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ** (7:38) یہ جو متاثر ہونے والی قوم تھی وہ یہ کہے گی کہ یا اللہ! یہ تھی وہ قوم جس نے ہمارا بیڑہ غرق کیا۔یہ ہے تباہ کرنے والی مغرب کی تہذیب کی آمد' یہ یہی جو وہاں سے آتے تھے امریکہ والے' ان کو پکڑ یئے اور اگر ہمیں آپ نے مجرم قرار دینا ہی ہے تو بہرحال خیر' لیکن ان کو تو دہرا عذاب دیجیے کم بختوں کو کہ خود بھی یہ خراب ہوئے تھے اور ہمیں بھی انہوں نے خراب کیا تھا۔

ملت اسلامیہ کی بربادی میں ہمارا زاویہ نگاہ اور قرآن حکیم کا ارشاد

سن لیا ان کا کہ ان کو تو دہرا عذاب دیجیے۔اور ہم سب اول تو اپنے آپ کو مجرم ہی قرار نہیں دیتے' ہمارے نوجوانوں کو تباہ کر دیا تہذیبِ مغرب نے۔یعنی یہ نہیں تباہ ہوئے' انہوں نے کر دیا۔اور اگر زیادہ سے زیادہ آئیں گے بھی تو اس دعوے پہ آئیں گے کہ کسی حد تک تو یہ بھی ہے' لیکن بڑی حد تک وہی ذمہ دار ہیں یعنی دہرا عذاب انہی دے۔پتہ ہے قرآن کیا کہتا ہے۔**قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ** (7:38) ان سے کہا ہے کہ دونوں کو دہرا عذاب ملے گا۔دہرا مانگتے ہو۔ٹھیک ہے انہیں تو دہرا عذاب ملے گا کہ انہوں نے اپنی اس غلط تہذیب کو غلط تصورات کو عام کیا نشر و اشاعت کے ذریعے سے' یہ کیا۔لیکن تم نے جو اسے قبول کیا تو تم ان کے ساتھی بن گئے ان کے گروہ میں اضافہ ہوا ان کے خیالات رکھنے والی قوم جو تھی دنیا میں اور بڑھ گئی اور یہ بڑھنا ان کے لیے تقویت کا موجب بن گیا۔جتنی ہم خیال قومیں اس دنیا میں ہیں وہ ایک جتھہ بنا لیتی ہیں۔کہا یہ اختیار کر کے ان کی تقویت کا موجب تم بن گئے دنیا میں۔لہٰذا تمہیں اپنے جرم کی سزا اور اس کی کہ تم اس کے لیے وجۂ تقویت بنے' دہری تمہیں اور ان کی یہ کہ اپنا جرم انہوں نے پھیلایا اس چیز کو عام کیا۔دونوں کو دہری سزا قرآن دے رہا ہے۔میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ جو چیزیں آج ہم کہہ کے اپنے آپ کو کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم ذمہ دار نہیں ہیں' اس کے وہ دوسرے ذمہ دار ہیں۔قرآن برابر کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔اور اس کے بعد عزیزانِ من! جیسا میں نے عرض کیا تھا وہ فرد کو بڑی قوت کا مالک قرار دیتا ہے اس کی Will power اس کی قوتِ ارادی اس کا عزم' وہ کہتا ہے کہ یہ دنیا میں ہر شر کا مقابلہ کر سکتا ہے۔یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس شر کو مغلوب نہ کر سکے تنہا' لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ اس شر سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔

قرآن حکیم میں ابلیس کا خدا کے ساتھ مکالمہ انسان کو اپنی اصلاح کی ترغیب دیتا ہے

بڑی خوبصورت چیز ہے جو قرآن میں ہے۔ ابلیس کا خدا کے ساتھ مکالمہ ہو رہا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ تم نے اپنے اوپر جو دروازے باز آفرینی کے اور اصلاح کے بند کر لیے تو جاؤ پھر قیامت تک تم اسی طرح سے سرگرداں رہو گے۔ اور ضمناً میں عرض کر دوں کہ یہ دروازہ بند کس طرح سے ہوتا ہے۔ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں لیکن بات چونکہ اس آیت میں آ گئی وہ میں عرض کرتا ہوں۔ آدم کو بھی ایک حکم دیا گیا' کچھ کہا گیا اس نے بھی معصیت کی' ابلیس کو بھی ایک حکم دیا گیا اس نے بھی معصیت کی۔ دونوں کا جرم ایک جیسا ہے۔ آدم سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا' اس نے کہا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23) میرے پروردگار! میں ذمہ دار ہوں اپنی غلطی کا' میں نے غلطی کی۔ کہا کہ جب تم نے ذمہ داری کو قبول کر لیا ہے اپنی غلطی کا' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اصلاح کے دروازے تم پہ کھل گئے۔ اب تم اپنی اصلاح کر سکتے ہو کیونکہ تم نے اپنی غلطی کو مان لیا۔ اپنے اوپر اس کی ذمہ داری کو لے لیا۔ پہلی چیز ہے۔ اصلاح کے لیے غلطی کا اعتراف اور یہ بات کہ اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار قرار دیا جائے۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23) ہم نے اپنے آپ پہ زیادتی کی ہے' ہم اعتراف کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کوئی بات نہیں! فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) ٹھیک ہے اس وقت غلط راستے پہ پڑ گئے۔ اس کے بعد ہماری ہدایت تمہارے ساتھ ہوگی' صحیح راستے پہ چلنا' کچھ نہیں بگڑا۔ ابلیس سے پوچھا کہ تم نے یہ کیوں کیا رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ (15:39) میں نے کہاں کیا' میں تو مجبورِ محض ہوں' اختیارِ مطلق تو تمہارے ہاتھ میں ہے' تمہارے حکم کے بغیر پتا نہیں ہل سکتا۔ مجھ میں ایسی طاقت کہاں تمہارے حکم کے بغیر کوئی بھی اس قسم کی بات کروں۔ تم نے مجھے گمراہ کرایا تھا۔ انہوں نے کہا تم غلطی کا نہ اعتراف کرتے ہو نہ اس کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہو' اس لیے اب اصلاح تمہاری ہو ہی نہیں سکتی۔ جو اپنے آپ کو جرم کا ذمہ دار ہی نہیں قرار دیتا' لغزش کا اعتراف ہی نہیں کرتا' دوسرے کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا کتنی بڑی بات کہہ دی ہے قرآن نے۔ یہ ابلیسیت ہے یہ کہنا کہ میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ اس کے بعد اس نے کہا کوئی نہیں! بھیجو ان کو بھی اور ہمیں بھی۔

غلط اعمال کو نگاہوں میں حسین بنا کر پیش کرنے کے ابلیسی خاصے کی وضاحت اور علاج

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ مکالمے یہ گفتگوئیں جو ہیں' یہ سمجھانے کے لیے قرآن تمثیلی انداز سے بیان کیا کرتا ہے۔ ٹھیک ہے اسے بھیجئے' پھر میں کیا کروں گا؟ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (15:39) دیکھو تو سہی کہ میں غلط باتوں کو کتنا مزین اور حسین بنا کے ان کی نگاہوں میں پیش کرتا ہوں۔ کیا بات قرآن نے کہی ہے!!۔ کرتا کیا ہے وہ؟ وجد آ جاتا ہے۔ غلط باتوں کو کتنا حسین بنا

کے ان کی نگاہوں میں رکھتا ہے۔بس یہ ہے جو میں نے کرنا ہے اور پھر دیکھو کہ میں کس طرح سے ان سب کو غلط راستے کے اوپر ڈالتا ہوں۔جھنجھنا دے کے بچے کو مٹھائی دکھا کے ''بڈھی مائی دا جھاٹا (لچھ) والا او جیہڑا گھنٹی وجاندا پھردا' سارے منڈے سکولوں نٹھ جاندے نیں ایہدے پیچھے پیچھے''۔کہتا ہے دیکھو پھر کس طرح سے یہ غول درغول میرے پیچھے آتے ہیں۔کہا ٹھیک ہے تمہاری Technique اور تمہارے عزائم ہمیں پتہ ہیں تم کروگے' گھنٹیاں بجاؤ گے' سیٹیاں بجاؤ گے' مزین کرکے دکھاؤ گے۔لیکن (یہ ہے عزیزانِ من! بات جو یاد رکھنے کی ہے) اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (15:42) جو میری عبودیت اختیار کیے ہوئے ہونگے ان کے اوپر تیرا کوئی کسی قسم کا اقتدار وغلبہ نہیں ہوسکتا۔اس نے بھی کہا تھا اِلَّا عِبَادَکَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ (15:40) کہا تھا کہ ٹھیک بات کہدی۔یہ جو چیز قرآن نے کہی ہے مذہب کی دنیا میں کہیں نہیں ملے گی۔انسان شر کے سامنے جسے ابلیس کہا جاتا ہے' بدکرداری کی قوتوں کے سامنے فرد مجبور ہوتا ہے وہاں۔قرآن یہاں یہ چیز کہتا ہے خدا نے یہ اسی وقت کہہ دیا کہ ٹھیک ہے جاؤ' جو جی میں آئے کرلو' میرے بندوں پر تیرا کسی قسم کا کوئی اقتدار نہیں ہوسکتا۔اس انسان کے اندر یہ قوت رکھ دی گئی ہے کہ وہ شر کی بڑی سے بڑی قوت کی مدافعت کرسکتا ہے۔جیسا میں نے عرض کیا ہے ایک تو شر کو مغلوب کرنا ہے' وہ تو ایک اجتماعی حیثیت سے ہوتا ہے۔یہ افراد ایک جماعت بناتے ہیں ایک تنظیم بناتے ہیں پھر وہ اپنے ان اخلاق حسنہ کے زور پر (یاد رکھیے قرآن حسنات کے زور پہ کہتا ہے کہ سیأت جاتی ہیں) وہ اس طرح سے مدافعت کرتے ہیں شر کی۔لیکن ایک فرد اگر شر کا ازالہ نہیں کرسکتا توڑ نہیں سکتا اس کو' اپنے آپ کو اس سے محفوظ ضرور رکھ سکتا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ ہم نے یہ اتنی بڑی قوت دیدی فرد کے اندر کہ وہ شر کا مقابلہ یوں کرسکتا ہے۔

مومن کے لیے عزم راسخ کا ملکہ ہی تو ایک گوہر تابدار ہے

یہ قرآن کا بڑا دعویٰ ہے کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (15:42)۔اور یہی ہے وہ مقام اور یہی ہے وہ پوزیشن جو انسان کی قرآن نے بتائی کہ جس سے اس کے لیے مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔شر کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو' کرپشن یا اخلاقی بدکرداریاں کتنی ہی وبائی امراض کی طرح' جراثیم کی طرح کیوں نہ فضا میں پھیل چکی ہوئی ہوں' ٹھیک ہے ان کے ازالے کے لیے اس کے پاس اتنی قوت خواہ نہ ہو' فرد اپنے آپ کو ان سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔قوت کی تو ضرورت ہے شر کے اندر پھیلنے کی' اپنے آپ کو اس سے روکنے کے لیے تو تقویت کی ضرورت ہے۔لیکن بڑی چیز اس کے اندر وہ ایمان کی بات' اس نے کہی ہے کہ یہ یقین کہ جتنی اقدارِ خداوندی ہیں' مجھے ان سے اِدھر اُدھر نہیں ہٹنا۔پہلی یہ یقین کی چیز اور اس کے بعد پھر عزم راسخ۔عزم بڑی چیز ہے Determination جو ہے قرآن نے جو کہا تھا آدم کے متعلق کہ وہ لغزش کھا گیا تو کہا یہ تھا کہ ہم نے اس میں عزم نہیں پایا۔عزم بڑی چیز ہے اور اس کی مثالیں تو آپ کو آج کے اس معاشرے کے اندر بھی جہاں واقعی اس قدر بدکرداری اور کرپشن عام ہوگئی ہے کیونکہ وہ وبائی امراض کے جراثیم کی

طرح سانس کے ذریعے سے بھی اندر جارہی ہے' اتنی عام ہورہی ہے۔اب بھی خدا کے بندے آپ کوایسے ملیں گے کہ جواپنی ذات کوکم از کم ان چیزوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔انہوں نے رکھا ہوا ہے۔ایسے لوگ میرے علم میں ہیں۔تکلیفیں توبڑی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ پہاڑ کی گھاٹی ہے یہ جسے چڑھنا پڑتا ہے۔ٹھیک ہے ندی کے اوپر کی طرف جورخ ہے اس طرف جانا ہوتا ہے کشتی کولے کے۔بہاؤ کے ساتھ جانے کے لیےتوبڑی آسانیاں ہوتی ہیں۔چڑھاؤ کی طرف کشتی کولے جانا ہوتا ہے۔لیکن اس کے اندروہ قوت ہوتی ہے۔وہ افراد دیکھے ہیں میں نے جن کے اندر یہ قوتیں ہیں' وہ مومن ہیں کہ جوشر کا مقابلہ کرتے ہیں۔تکلیفیں آتی ہیں' مشکلات آتی ہیں' عزم کی یہاں ضرورت آکے پڑتی ہے۔وہ ہاتھ سےنہیں جانے دیتے اپنی اس چیز کواوراس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فی الواقعہ فرد کے اندر یہ قوت رکھی ہے خدا نے کہ وہ اپنی ذات کوکم ازکم محفوظ کرسکتا ہے اس شر سے۔اور یہ تھی وہ چیز جس کے لیے کہا تھا کہ یہ ساری اضافی نسبتیں' یہ تمام معذرت کوشیاں جن کوتم یہاں کررہے ہو' یہ ساری کی ساری جتنی بھی ہیں' وہ سب یہاں رہ جائیں گی۔وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ (6:94)

خدا کے پاس اکیلے جانے کامفہوم ہی یہ ہے کہ انسان کی کوئی اضافی چیز اس کے ساتھ نہیں جائے گی

ایک فقرے میں سارامفہوم یہ ہوگا کہ جوکچھ تم ہوگے' وہ آؤ گے ہمارے سامنے' جوکچھ تمہارا ہوگا وہ سارا پیچھے رہ جائے گا۔جسے بھی آپ میرا کہہ کر پکارتے ہیں' وہ سارا پیچھے رہ جائے گا' وہ کچھ کام نہیں دے گا۔میں کیا ہوں میں کیا بنا ہوں یہ چیز آگے جائے گی۔پھر سن لیجیے کہ جسے انسان میرا کہتا ہے یا میری کہتا ہے' یہ اضافی نسبتیں ہیں: میرے ماں باپ' میرا خاندان' میرا گروہ' میری پارٹی' میرا مال و دولت' میرے دوست واحباب' میرا معاشرہ' میرے لیڈر' میری جائیدادیں۔آپ دیکھتے ہیں میرا ہے یہ سب کچھ۔جب آپ کہتے ہیں کہ میں نے یہ کب کہا تھا' اس میں میرا کچھ نہیں ہوتا' میں نے یہ کہا تھا' میں نے یہ کیا ہے' میں وعدہ کرتا ہوں آپ سے۔دیکھا آپ وہ میں اور میرے میں فرق کیسے کرتے چلے جاتے ہیں۔یہ میرا جوکچھ ہے' یہ سب رہ جائے گا۔میرا مال ودولت' میں یہاں تک آیا تھا اور آگے چلیے' آپ کہتے ہیں یہ میرا جسم' یہ بھی یہاں رہ جائے گا اب میں ہی آگے جائے گی۔میں یہ جسم بھی نہیں ہے صاحب۔

انسانی ذات کی تعمیر انسان کے اپنے اعمال سے ہوتی ہے اضافی چیزوں سے نہیں

یہ جو میں جسے آپ کہتے ہیں اور یہ وہی چیز ہے کہ جسے آپ انسان کی قوتِ ارادی کا حامل کہتے ہیں فیصلہ کرنے والی اندر ایک شے جو ہے اسی کوانسان کی انفرادیت کہا جاتا ہے۔وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى (6:94) تمہاری انفرادیت (Individuality) ہمارے پاس آئے گی۔میری کی چیزیں' کوئی نہیں آئیں گی۔وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ (6:94) سب پیچھے رہ جائیں گی۔فرادیٰ کے معنی Individuality ہے تمہاری انفرادیت تمہارا فرد تمہاری ذات' یہ آئے گی ہمارے سامنے۔اور وہ یہ نہیں کہ کوئی بوجھ اٹھائے ہوئے

ساتھ لاتی ہے وہ تو جو کچھ آپ کرتے ہیں سوچتے ہیں ارادے آپ کرتے ہیں' ان سب سے وہ کچھ بنتی جاتی ہے۔ غلط چیزوں سے بگڑتی جاتی ہے' اچھی باتوں سے بنتی جاتی ہے۔ یہ بگڑی ہوئی بنی ہوئی جو کچھ بھی ہے' وہ کہتا ہے یہ تو آئے گی ہمارے سامنے اور جسے تم نے میرا کہا تھا' یہ سب پیچھے رہ جائیں گے۔ آپ سوچئے عزیزانِ من! کہ انسان اس میں کے لیے کیا کرتا ہے اور جنہیں یہ میرا کہتا ہے' ان کے لیے کیا کرتا ہے۔ قرآن نے جو کہا تھا کہ یاد رکھو! یہ بیوی بچے تمہارے دشمن ہو جاتے ہیں (64:14) دوسری جگہ کہا تھا یہ فتنہ ہوتے ہیں تمہارے لیے (64:15)۔ بیوی بچوں کو قرۃ العین بھی کہا ہے اس نے (25:44)' آنکھوں کی ٹھنڈک بھی ہوتے ہیں۔ لیکن فتنے کا موجب ہو جاتے ہیں' دشمن ہو جاتے ہیں۔ یہ میرے ہیں' ان کی خاطر کتنا کچھ انسان کرتا ہے اپنی ذات کے لیے تو اس کو بہت تھوڑی سی ضرورت ہوتی ہے جسم کی پرورش کے لیے' یہ اس سے آگے پھر جو میرا' ہوتے ہیں یہ اس کے لیے سارا کچھ کرتا ہے۔ میری زمینیں اور میرے کارخانے اور میری یہ سکیمیں اور میرا مال و دولت اور میرے بچے اور میرے یہ کچھ' سارا کچھ میرا ہو رہا ہوتا ہے۔ کبھی اس کو سوچنا چاہیے کہ یہ میرے کی خاطر تو میں اتنا کچھ کر رہا ہوں' میں کی خاطر میں کیا کر رہا ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوتا کہ یہ میرے جو ہیں ان کو سنوارتے سنوارتے' میں بھی بہہ جائے اس کے اندر' بس یہ تباہ ہوا۔ قرآن نے کہا ہے کہ حقیقی نقصان اٹھانے والے وہ ہیں خَسِرُوْٓا اَنْفُسَھُمْ (7:53) جن کی ذات نقصان میں رہتی ہے جن کی مَیں نقصان میں رہتی ہے خسارہ یہ ہے۔

دراصل زندگی کا مقصد اضافی چیزوں کے محاسبے کی بجائے انسانی ذات کا محاسبہ ہے

جسے آپ اعمالنامہ کہتے ہیں' محاسبۂ خویش کہتے ہیں۔ اسے ہرات سونے سے پیشتر یوں اس کا محاسبہ کرنا چاہیے۔ ہم محاسبہ کرتے ہیں میرے کے متعلق' میں نے کاروبار کتنا کیا آج' نفع کتنا ہوا' میرا مال کتنا بڑھا' اس میں کتنا نقصان ہوا' میں نے بیٹے کے لیے کیا بنایا' یہ سارا کچھ حساب کتاب کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ کبھی یہ بھی حساب کر لینا چاہیے کہ یہ سارا کچھ جو میں نے' میرے کے لیے کیا ہے' اس میں مَیں جو ہے اس کو میں نے کیا کر لیا ہے۔ وہ بھی ضروری ہے کرنا بشرطیکہ اس کو نقصان نہ اس سے پہنچے۔ سب کچھ کیجیے۔ لیکن اگر اس کے لیے جو کچھ کیا ہے' اس سے اسے نقصان پہنچ گیا ہے۔ یہ ہے سودا خسارے کا عزیزانِ من!۔ اس لیے کہ وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی (6:94) ہمارے سامنے تو تم جو کچھ بن گئے ہوئے ہو وہ آئے گا۔

نبی اکرمؐ نے تو اپنی بیٹی سے کہہ دیا تھا کہ روزِ محشر تم یہ نہ سمجھنا کہ میں آپ کی بیٹی ہوں

وَّ تَرَکْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰکُمْ وَرَآءَ ظُھُوْرِکُمْ (6:94) وہ سارا کا سارا جو کچھ یہ مال و دولت میرا تھا وہ سارا پیچھے رہ جائے گا ترکتم چھوڑ جاؤ گے اپنے پیچھے۔ کہا اور اس کے بعد وہ جن کے بڑے بڑے دعوے تھے کہ ہم تمہاری شفاعت کر کے تمہیں چھڑا لیں گے'

ہم بچائیں گے تمہیں اس میرے کے لیے بھی تو تم بہت کچھ کرتے تھے میرے پیر و مرشد' میرے حضرت صاحب' یہ سب کچھ تم کرتے تھے۔وَ مَا نَرٰی مَعَکُمۡ شُفَعَآءَکُمُ الَّذِیۡنَ زَعَمۡتُمۡ اَنَّهُمۡ فِیۡکُمۡ شُرَکٰٓؤُا (6:94) کہا جن کے متعلق تمہارا زعمِ باطل یہ تھا کہ یہ وہاں چھڑالیں گے اور اس اعتبار سے تم نے ان کو ہمارا برابر کا شریک بنا دیا تھا۔خدا پکڑے گا' یہ چھڑائیں گے۔ دیکھا یہ کچھ خدا سے بھی بڑا۔ذہن میں تو بڑے بڑے شعر اور مصرعے آ رہے ہیں جن کو بڑے جوش و خروش سے تکیے دائروں میں نہیں' مسجدوں کے اندر بھی اسی طرح سے گایا جاتا ہے جس میں خدا کی گرفت ہوتی ہے اور یہ چھڑانے والے وہاں ہوتے ہیں۔لیکن کیا ضرورت ہر ایک کو اس کا زعم ہے۔ کہا وہ زعم سنئے جن کے متعلق تمہارا زعم یہ تھا کہ یہ چھڑالیں گے' انہیں بھی ہم تمہارے ساتھ نہیں دیکھ رہے بھئی۔ یہ انداز دیکھئے ''اوئے او وی نئیں ہیگے'' وہ بھی نہیں ہیں۔تم نے انہیں نہیں چھوڑ دیا تھا' وہ تو وہ کچھ تھا نا' انہوں نے ہی تمہیں چھوڑ دیا ہے۔وہ اس لیے کہ ''او ہناں نوں تے اپنی پئی ہوئی ہووے گی''۔وہ جو قرآن نے کہا تھا کہ اس دن ہر فرد کو اپنی پڑی ہوگی (80:37)۔اتنا کچھ ہوگا کہ اسے فرصت ہی نہیں ''ویہل ای نئیں لبھے گی کسے دُوئے دی گل سنن دی وی۔او تھے اپنی اپنی پئی ہوئی ہووے گی'' ان کی تو یہ کیفیت ہوگی۔ہم دیکھتے نہیں ہیں کہ وہ کہاں گئے۔لَقَدۡ تَّقَطَّعَ بَیۡنَکُمۡ وَ ضَلَّ عَنۡکُمۡ مَّا کُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ (6:94) وہ سارے رشتے جو میری کی وجہ سے تم نے قائم کیے ہوئے تھے جن چیزوں سے' کٹ گئے وہ رشتے آج۔اللہ اکبر۔کبھی آپ نے تیز ہوا میں اس گڈی کو دیکھا جس کی ڈور کٹ گئی ہو پھر وہ کس طرح سے ہواؤں کے رخ کے اوپر' بے بسی کے عالم میں اِدھر سے اُدھر پھر رہی ہوتی ہے۔وہ جو رشتہ ہوتا ہے وہ کٹ جاتا ہے۔کہا کہ وہ جو ''میرے'' ہونے کے رشتے تھے' وہ آج کٹ گئے اور جو کچھ تم زعمِ باطل اپنے دل میں رکھا کرتے تھے سب کا سب ختم ہو گیا۔کچھ اس میں سے باقی نہیں ہے۔

انسان کی تمام نفسیاتی پریشانیوں کی بنیادی وجہ اس کا اپنا میرٹ ہوتا ہے

عزیزانِ من! جو کچھ میں نے عرض کیا ہے بار بار اس پہ غور کیجیے گا قیامت کا حساب کتاب اور وہاں کا عذاب و ثواب برحق ہے اور وہاں جا کر ہوگا۔جیسا کہ قرآن بھی بتاتا ہے اور یہاں سے شروع ہو جاتا ہے وہ۔یہ آپ اب کسی سائیکولوجسٹ سے پوچھئے کہ یہ جو انسان کی میں کے اندر یہ اتنے Complexes اور گرہیں اور اضطراب انگیز چھپی ہوئی کیفیتیں یا نشتر ہوتے ہیں وہ یہ جو ''میرا'' جن چیزوں کو کہا جاتا ہے یہ ان کی وجہ سے اس کے دل کے اندر یہ پیدا ہوئی ہوئی چیزیں ہیں اور ان کو اس کا نفسِ شعوری بھلا بھی چکا ہوتا ہے یاد بھی نہیں اس کو ہوتا۔لیکن قرآن جب یہ ایمان دیتا ہے کہ تم تو صرف اپنے ذمہ دار ہو۔اس اس میں دونوں طرح کی نسبتوں کو کاٹ دیتا ہے۔ یہ وجۂ تفاخر جو نسبتیں تمہارے پاس ہیں یعنی آن میرٹ تم ایسے نہیں ہو بلکہ کسی کی طرف نسبت کرنے سے تم نے اپنے آپ کو خود اونچا اتنا بنا لیا ہے۔وہ جو اقبالؒ نے کہا ہے

تو قدرِ خویش ندانی بہا ز تو گیرد
وگرنہ لعلِ درخشنداں بدخشاں محض سنگ است

کیا لعل و گوہر انسانی ذات سے زیادہ قیمتی ہیں؟

کہتا ہے یہ لعل و گوہر جواہرات یہ موتی جو ہیں بڑی قیمت ان کی ہوتی ہے' لاکھوں روپے اتنے اتنے سے ٹکڑے کے۔ کہتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہ ان کے اندر کوئی ذاتی ان کی قیمت ہے یہ' ان کے اندر ذاتی طور پہ ایسی چیز ہے۔ کہتا ہے بالکل غلط ہے۔ یہ ان کی اتنی قیمت تیری وجہ سے ہے۔ اے وہ جو تیری وجہ سے ان کی قیمت ہے کبھی اپنی قیمت پہچان تو سہی کہ کتنی ہوگی۔ اضافی نسبتوں کی بناء پہ اپنے لیے وجۂ تفاخر' اس کو قرار دے لینا بڑی بھول ہے' بڑی غلطی ہے اس سے مَیں نہیں سنورتی' بڑے فریب میں انسان رہتا ہے اس میری کی نسبت میں۔ فلاں ذات کا' فلاں گوت کا سید ہے اور پٹھان ہے فلاں خاندان کا' چلا آ رہا ہے۔ کسی زمانے میں مغلوں کے زمانے کے اندر کوئی قاضی صاحب ہونگے۔

ذات کی پختگی کے برعکس قدم قدم پر جھوٹی انا کے تفاخر کی حفاظت کی فکر بڑی اذیت ناک ہوتی ہے

آج کسی سے پوچھیئے کہ اسمِ گرامی آپ کا جی؟ قاضی ثناء اللہ ''اوتوں تے اوتھے کلرک ہیگا ایں''۔ کہیں عباسیوں کے دور میں کوئی ان کے ہاں مفتی ہونگے' کون صاحب ہیں صاحب؟ مفتی رشید الدین ''او تینوں تے افتا' دے لفظ دے معنی وی نئیں اوندے ہیگے' کہنداتاں کی ہویا' مفتی تے ہونے آں''۔ دیکھا لفظ کتنے فریب انگیز ہوتے ہیں ''کہندا مفتی ہیگا نئیں میں' اسی مفتی ہونے آں''۔ ''اوہ پوچھدا اے'' وَ لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا فُرَادٰی (6:94) ''او پوچھدا اے' توں کی ہیگا ایں''۔ کتنی دور سے یہ چیز آتی ہے عزیزانِ من! کتنا بڑا فریب ہے انسان جو اپنے آپ کو دیتا ہے۔ فخر تو کہتے ہی اس خالی ڈھول کو ہیں جس کی آواز زیادہ ہوا سے کہتے ہیں عربی زبان میں فخر۔ یہ تو ہوئی تفاخر کی طرح سے' Psychologically یہ بھی بڑے عیب پیدا کرتا ہے انسان کہ جو میرٹ اپنا نہیں ہے' اضافی زَعَمۡتُمۡ (6:94) سے بزعمِ خویش اس کو اپنے لیے Meritorious تصور کر کے پھولے سمانا نہیں کہ ہم یہ ہوتے ہیں۔ یعنی سید کہلا کے یونہی خوامخوہ کے لیے یہ اپنے آپ کو یہ کنجڑوں اور نائیوں کے متعلق سمجھنا کہ ہم بڑے ہیں' ہم سید ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف Complexes جو ہوتے ہیں یہ جنہیں ہم نے معاشرے کے اندر کمین یا کم ذات کے یا چھوٹی ذات کے بنا دیا۔ لفظ نکل گیا منہ سے' گالی ہوگئی ہے کم ذات۔ دیکھا آپ نے! ہم نے کیا کر دیا ہے معاشرے کے اندر۔ وہ انسانی بچہ جو اس ماں باپ کے گھر میں Biologically صرف پیدا ہوا طبعی طور کے اوپر' وہ کوئی نسبت اپنے ساتھ نہیں لایا ہے نہ اپنے ماں باپ کے نائی ہونے کی' نہ کمہار

ہونے کی، نہ سقہ ہونے کی، نہ کنجڑا ہونے کی۔ شروع سے ہی آپ نے اس اضافت سے اس کے اندر ایک تذلیلِ خویش کا احساس ابھار کے رکھ دیا ہے اس کی ساری Self اور انا اور Ego وہ ساری اس سے متاثر ہوئی عمر بھر رہتی ہے۔ یہ گرہیں نہیں نکلتیں اندر سے۔ یہ اضافت ہے۔ پھر اس کے بعد جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ وہ باپ اگر اتنا بڑا امیر ہے، اتنا بڑا صاحبِ عزت ہے یعنی یہ لڑکا اس کا میٹرک تک پاس نہیں کر سکا لیکن اپنے آپ کو پوچھو نہیں سمجھتا کیا ہیں۔ ٹھیک ہے اتنی بڑی مرسڈیز کے اندر جاتا ہے، طرہ اتنا بڑا ہوتا ہے، میں اس کا کچھ نہیں ہے، میرے کی وجہ سے یہ ساری چیز ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف وہی جو میں نے عرض کیا تھا غریب آدمی مزدور کا بیٹا ہے آن میرٹ کتنا بڑا کیوں نہ ہو جائے، وہ جو باپ کی نسبت چلی آ رہی ہے، معاشرہ بھی اس کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اس کی وجہ سے اس کے دل کے اندر بھی Complex پیدا ہو گیا ہوا ہے۔

انسانی دنیا میں قرآنی معاشرے کی خصوصیات

میں نے عرض کیا ہے کہ وہاں کی جنت اور جہنم برحق ہے۔ قرآن اس زندگی میں تمہیں جنت دینا چاہتا ہے کہ یہ جتنی چیزیں یہ زعـــمتـــم یہ معاشرہ ایسا پیدا کرتا ہے جس میں ان نسبتوں کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہاں صرف فرد کی انفرادیت کو دیکھا جاتا ہے کہ یہ آن میرٹ کیا ہے، اس کی عزت بھی آن میرٹ ہوتی ہے۔ وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (6:132) سوسائٹی میں ان کے مدارج کا تعین ان کے جوہرِ ذاتی کی بناء پہ ہوگا۔ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (49:13) سب سے زیادہ واجب العزت جو سب سے زیادہ جوہرِ ذاتی سے متصف ہے۔ اور کسی کو اسی طرح سے یہ غلط نسبتیں جو ہیں ماں باپ کی، یہ ذات اور گوت کی، یہ تمام کی تمام وہ مٹا دیتا ہے۔ یہاں تو کیفیت یہ ہے کہ

بندہِ عشق شوی ترکِ نسبتم جامی
کہ دریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

تمدنی لحاظ سے اضافی طور پر باپ بیٹے کا بھائی بہن کا رشتہ بھی تو بعد کی معلومات پر ہی استوار ہوتا ہے

یہ جو عزیزانِ من! کہ فلاں باپ ہے فلاں بھائی ہے آپ کو معلوم ہے کہ یہ بنیادی طور پہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ جو آپ پیدا ہوتے ہیں کسی کے گھر میں اور اس کے بعد جب آپ بڑے ہوتے ہیں جوں جوں سمجھنے لگ جاتے ہیں کسی کو جو وہاں ہوتا ہے، یہ ابا تمہارے آئے، یہ بھیا ہیں۔ آپ کو یہ بتایا جاتا ہے پھر وہ باپ بنتا ہے وہ بھائی بنتا ہے۔ اس بچے کو پیدا ہونے کے ساتھ ہی کہیں چھوڑ آیئے آسٹریلیا میں اور کچھ نہ بتایئے کہ تمہارا باپ کونسا تھا۔ ہیں ایسے بچے۔ وہ بڑا ہو جائے وہاں، وہاں اس کا باپ بھی موجود ہو کوئی تعلق ہی آپس میں نہیں

ہو گا ان کا جیسے اور افراد باقی لوگ' اسی قسم کا وہ ہو گا۔ بھائی کے متعلق بھی اگر نہ بتایا جائے یہ تمہارا بھائی ہے' بالکل یہی صورت ہو گی۔ بہنوں کے متعلق نہ بتایا جائے' کچھ بات ہی نہیں ہے۔ یہ تو سارا کچھ اس کو بتایا جاتا ہے کہ یہ نسبتیں اس کے شعور میں ڈالی جاتی ہیں۔ یہ نہ بتانے کی چیزوں کے بعض اوقات ایسی صورتیں آ جاتی ہیں۔ انگلینڈ کے دو بچے' جو اس جنگ کے دوران انہوں نے اپنے بچوں کو بھیج دیا تھا آسٹریلیا وغیرہ میں' وہ بچے وہاں بڑے ہوئے سب کچھ ہوا۔ ایسا اتفاق ہوا پتہ کسی کو کسی کا نہیں تھا کون کس کا بیٹا ہے' کون کس کا بھائی ہے۔ اور اس کے بعد وہ کوئی ینگ لڑکا اور لڑکی تھے۔ انہوں نے شادی کر لی آپس میں ان کے ہاں بچے بھی پیدا ہوئے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد کسی طرح سے کوئی چیز اِدھر اُدھر ہوتی ہوائی۔ یہ معلوم ہو گیا کہ یہ تو بہن بھائی ہیں۔ کل تک کوئی ان کے دل کے اندر کسی قسم کا Complex نہیں تھا۔ آج جو یہ پتا بتایا ہے' چیخ اٹھے۔ یہ کیا ہے؟

ایک اچھے انسانی معاشرے کی بنیاد صرف میرٹ پر استوار ہوتی ہے

یہ نسبتیں ذاتی طور پہ کچھ حیثیت نہیں رکھتیں یہ تمدنی چیزیں ہیں معاشرے کی چیزیں ہیں۔ یہ ہونی چاہئیں' بڑی ضروری ہیں۔ انہی تعلقات سے معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ یہ زندگی کے لیے روابط ہیں' رشتے ہیں تاگے ہیں جن سے یہ زندگی کے صفحات اور یہ ورق اکٹھے ہو کے ایک کتاب بنتے ہیں۔ لیکن جو قرآن کہہ رہا ہے وہ یہ کہ ان نسبتوں کی بناء پر ایک فرد کو کسی طرح متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ فرد کو صرف اس کے ذاتی کردار و اقدار اور اعمال و افعال کے متعلق ذمہ دار قرار دینا چاہیے۔ میرٹ ہے اس کا اعتراف کیجیے عزت دیجیے' ڈی میرٹ ہے اس کا وہ جرم ہے۔ جرم کے متعلق جو بھی سزا ہے وہ دید یجیے۔ وہ ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں کسی فرد کو کسی اضافی نسبت کی بناء پہ نہ کوئی بے جا عزت ملتی ہے' نہ وہ چیز وجہِ تذلیل ہوتی ہے۔ تو آپ دیکھئے کہ کوئی معاشرہ جس میں کسی نسبت کی بناء پہ مجھے کسی قسم کی خفت محسوس نہ ہو' ندامت محسوس نہ ہو' شرمندگی محسوس نہ ہو' کتنی بڑی چیز ہے جو مجھے ملے گی۔ اور یہ اس نے کہا ہے کہ وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی (6:94) ہماری بارگاہ میں ہماری عدالت میں ہمارے میزان میں فرد آتا ہے۔ اور یہ جو Materialistic Concept of life ہے ان کے نزدیک فرد Individual یا Individuality ہوتی نہیں ہے۔ حیوانوں کے اندر Individuality نہیں ہوتی اس میں ایک فرد نہیں ہوتا۔ وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ سارے کا سارا ایک معاشرہ ہی ہوتا ہے فرد کی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔ اور اسی نے یہ تباہیاں ساری پیدا کی ہوئی ہیں۔

قرآن حکیم کا فلسفہ حیات انفرادی ذمہ داری اور مرنے کے بعد کی زندگی کا برحق ہونا

قرآن بالکل اس کے برعکس ایک فلسفۂ حیات دیتا ہے جس میں ہر فرد کی انفرادیت کا اعتراف کرتا ہے' اس کی Respect کرتا ہے اور اسے اپنے ہر ایکشن کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ ایک ہی آیت تھی 95 جسے آج ہم سامنے لائے۔ لیکن بڑی بنیادی بات تھی۔ اب

سوال یہ پیدا ہوگیا کہ مرنے کے بعد کی زندگی جو اس نے کہہ دی ہے' یہ کس طرح سے ہے کیسے ہوگی۔ آپ دیکھئے گا قرآن میں ربط' بات یہ ہوئی ہے کہ وہ جو تخلیقِ جدید ہے وہ کیسے ہوگی۔ فوراً آگے کہا کہ تم اس کے متعلق تو متعجب ہوتے ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم آج تمہیں دکھا تو نہیں سکتے آنکھوں سے کہ یہ دیکھو اس طرح سے مردہ وہ زندہ ہوا۔ لیکن اگر تم یہاں کائنات کے نظام کے اوپر' اپنے گردوپیش پہ غور کرو تو تمہیں یہ نظر آج آجائے گا کہ یہ جو زندگی سے مردہ اور مردہ سے زندگی کے یہ جو تغیرات ہیں یہ تو روز' ہر سانس میں تمہارے سامنے ہوتے رہتے ہیں ان پہ غور وفکر کرو گے تو یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ انسان بھی مرنے سے' مرتا نہیں ہے اس میں سے زندگی آگے پھوٹتی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَ النَّوٰی (6:95) لیکن یہ بات ہم اگلے درس پہ اٹھا رکھتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

چودھواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 95 تا 103)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عقلِ انسانی کے لیے ہزاروں سال پیشتر مادی دنیا میں ہر آن موت سے زندگی اور زندگی سے موت کا انکشاف

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1971ء کی 31 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی آیت 96 سے ہوتا ہے (6:96)۔

خدا پر ایمان لانے کی اہمیت انسانی ذات پر ایمان لانے سے مشروط ہے

سابقہ درس میں ایک ہی آیت ہمارے سامنے آئی اور وہ آیت تھی کہ درحقیقت جس میں جو تصور دیا گیا ہے وہ دین کی بنیاد ہے۔ دین کی بنیاد ہے انسان کا اپنی ذات پر ایمان' اس چیز پر ایمان کہ زندگی محض طبعی زندگی (Physical Life) ہی نہیں جو موت کے

ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔انسان کے اندر ایک اور شے بھی ہے جو مرنے کے بعد باقی رہتی ہے اور آگے چلتی ہے۔اور یہ وہ شے ہے کہ انسان کے تمام اعمال وافعال بلکہ ارادوں تک کے اثرات کا مجموعہ ہوتی ہے' ان سے ترتیب پاتی ہے۔ان اثرات کے نقوش کو اپنے اندر محفوظ رکھ کر آگے جاتی ہے اور جس قسم کے یہ اثرات یا یہ اعمال ہوتے ہیں اسی کے مطابق اس کا مستقبل ہوتا ہے۔یہ ہے بنیاد دین کی۔اگر اسے نہ مانا جائے تو پھر خدا کا ماننا بالکل بے سود ہوتا ہے۔اور خدا ہی کا ماننا ہی بے سود ہو گیا تو اس کے بعد یہ وحی اور نبوت اور سلسلۂ رشد و ہدایت یہ تمام چیزیں بیکار ہوتی ہیں۔پھر انسان کی طبعی زندگی (Physical Life) اس کے لیے زیست کے سہارے' سامانِ نشو ونما اور سوسائٹی کے قوانین اللہ اللہ خیر سلا' باقی کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

انسانی ذات کے علاوہ وہ تمام چیزیں جسے انسان ''میری'' کہتا ہے یہ سب کی سب یہیں رہ جائیں گی

ان چیزوں کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے کہ انسان کی ایک ذات ہے اور یہ جتنی چیزیں ہم گنا رہے ہیں' یہ ایمان جتنے ہیں یہ اقدار جتنی ہیں' یہ سارے درحقیقت ذرائع ہیں اس ذات کی نشو ونما اور تکمیل کے۔تو بنیادی چیز انسان کی ذات ہے اور اسی کے متعلق پچھلا درس ہمارا صرف ہوا تھا اور اس میں ماحصل یہ تھا کہ قرآن کہتا یہ ہے کہ جو کچھ بھی ''تمہارا'' ہے' وہ سب یہاں رہ جائے گا اور جو کچھ ''تم'' ہو وہ آگے آجائے گا۔وَ لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا فُرَادٰی (6:94) تمہاری انفرادیت ہے جو کچھ تم ہو' وہ ہمارے پاس آجائے گا اور جو کچھ تمہارا ہے وہ پیچھے رہ جائے گا۔اور یہی چیز جسے ہم اپنے طور پہ کہیں گے کہ 'میں' ہے۔یہ 'میں' ہے کہ جسے انسان کی ذات کہا جاتا ہے اور یہ ہے جو آگے چلے گی۔اس زندگی کے اعمال اور ارادوں تک کے اثرات کو اپنے اندر محفوظ کیے ہوئے آگے جانے والی بات۔وہاں سے پھر بات شروع ہوگئی مرنے کے بعد کی زندگی کی کہ زندگی طبعی' زندگی نہیں ہے اور جسے ہم Death یا موت کہتے ہیں وہ انسان کے جسم کی موت ہے۔وہ شے کہ جس نے آگے چلنا ہے' جس میں زندہ رہنے کی آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے' وہ مرتی نہیں ہے اس کے مر جانے سے۔یہ پھر بنیادی چیز آگئی حیاتِ آخرت۔انسانی ذات پہ ایمان اور حیاتِ آخرت پہ ایمان تو ایک ہی بات ہوگئی۔فوراً اگلی آیت میں قرآن اس طرف آگیا کہ یہ جو کچھ کہا ہے اس کے متعلق یہ ہوگا کہ حیاتِ آخرت کی کوئی دلیل' اس کا کوئی ثبوت۔

عبد کی زندگی کی ماہیت کو محسوس طور پر نہیں دکھایا جا سکتا

اب یہ ایسی چیز ہے جسے محسوس طور پر تو دکھایا نہیں جا سکتا۔خدا کے قوانین میں ان کی رو سے 'جا سکتا' تو میں نہیں کہہ سکتا کہ نہیں دکھایا جا سکتا۔خدا نے جو قوانین ہمارے لیے متعین کر دیے ان کی رو سے یہ اس طرح سے محسوس طور پر تو نہیں دکھاتا کہ جتنی چیزیں سامنے نہیں آتیں' ان کے لیے بہرحال دلائل دیے جاتے ہیں۔اور قرآن کے دلائل کی کیفیت یہ ہے کہ وہ محسوس چیزوں سے دلائل دیتا ہے۔یعنی وہ فلسفے کی رو سے دلائل نہیں دیتا کہ جس میں Abstract Talk ہوتی ہے تجریدی گفتگو ہوتی ہے۔وہ محسوس چیزوں کی طرف توجہ دلا کے

وہاں سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ جس سطح پہ بھی انسان کا علم ہو' وہ بات یہاں سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ ابھی ابھی جو بات آگے یہ سمجھائے گا مثال دے کر آپ دیکھیں گے کہ ایک ہل چلانے والا کسان وہ بھی بات کو سمجھ لے گا اور جب وہ آگے کہے گا کہ اس کے اندر اس قوم کے لیے جو علمی تفکر سے کام لے' حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں تو گویا ایک ہی مثال ہے وہ ایک عام انسان کے لیے بھی کافی ہو جاتی ہے اور علم کی بلندیوں تک جو جانے والا ہے اس کے لیے بھی یہ کافی ہوتی ہے۔ قرآن کی تشبیہات کا یا اس کی مثالوں کا انداز ہی یہ ہے۔

انسان کو زمین میں دفن کر دینے کے بعد بیج کی مانند زندگی کی نمود کی قرآنی مثال

وہ کہتا ہے کہ تم یہ سمجھنا چاہتے ہو کہ ایک شئے' جسے مردہ کہا جاتا ہے' پھر اس میں سے زندگی کی نمود کیسے ہو سکتی ہو' جسم کو تم مردہ کہتے ہو' زندگی کی نمود کیسے ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الۡحَبِّ وَ النَّوٰی یُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَ مُخۡرِجُ الۡمَیِّتِ مِنَ الۡحَیِّ (6:95)

وہ کہتا ہے تم نے یہ کہا ہے کہ یہ بات ناممکن سی نظر آتی ہے کہ ایک شے جو مردہ ہے اس میں سے زندگی کی نمود ہو جائے۔ کہا یہ جو بیج ہے گیہوں کے دانے' مکئی کے دانے' گیہوں کے دانوں کو تم اپنے سامنے ہتھیلی پر لے کر کسی جگہ رکھ چھوڑیے سینکڑوں برس رکھ چھوڑیۓ وہ مردہ ہے اس میں تمہیں زندگی نظر نہیں کہیں آتی۔ لیکن اسی دانے کو تم جب مٹی میں ملا دیتے ہو اور پھر اس کے لیے جو مناسب چیزیں ہیں وہ مہیا کر دیتے ہو وہاں وہ شے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے مردہ تھی تم دیکھتے ہو اس میں سے زندگی کی نمود کس طرح سے ہوتی ہے۔ یہ زندگی کہاں تھی؟ تمہاری نگاہوں کے سامنے نہیں تھی۔ اس شے کو تم نے اپنے سامنے رکھا' برسوں تک رکھ چھوڑیے وہ مردہ کی مردہ نظر آئے گی۔ اب یہ جو اس میں سے زندگی کی نمود ہوئی یہ اناج کے دانے پھلوں کے بیج (یہ دونوں چیزیں اس میں آ گئیں حب اور نوٰی میں) یہ دونوں چیزیں تمہارے سامنے' مردہ ہوتی ہیں۔ کہا کہ یہ ٹھیک ہے تمہاری محسوس نگاہیں اس میں زندگی نہیں دیکھتیں زندگی ان کے اندر خوابیدہ ہوتی ہے۔ وہ شے کہ جسے تم مردہ کہہ رہے ہو۔ مثال آپ دیکھئے کہ ہل چلانے والا کسان بھی سمجھ جائے۔ اور روز ہم اس کو دیکھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی ہم نے غور نہیں کیا اس پہ۔ لیکن ذرا سا بھی غور کریں تو نظر آجاتا ہے کہ واقعی ایک شے مردہ تھی۔ ہمارے سامنے اس میں سے لہلہاتی ہوئی زندگی نکل آتی ہے۔ اور وہ کہتا ہے نکلتی بھی کس طرح سے ہے؟ وہ جو مٹی میں تم نے بیج دبا دیا تھا ذرا کرید کر دیکھو اسے۔ وہ وہاں ریزہ ریزہ ہو گیا ہوا ہوتا ہے' اس میں ایک انتشار ہوتا ہے Disintegration ہوتا ہے وہ وہاں۔ اس Disintegration کے بعد اس کے اندر سے ایک حیاتِ تازہ ابھرتی ہے۔ نئی زندگی اور کتنی ممکنات کی دنیا اپنے اندر لیے ہوئے ہوتی ہے۔ ایک چھوٹی سی پتی نمودار ہوئی اس میں سے ننھی سی ایک سوئی جیسی نکلی' ایک پودا بنا ایک پیڑ بنا اتنا بڑا' کہیں وہ فصل بنی کہیں وہ پیڑ بنا۔

یہ کہا' یہ کہاں تھا۔تمہیں اس سے حیرت ہوتی ہے کہ یہ جسمِ مردہ انسان کا جسم ہم نے کہہ دیا کہ میت ہے' یہ لاش ہے' یہ مردہ ہے یہ تو ریزہ ریزہ ہوجائے گا' گل سڑ جائے گا' اس میں ممکنات ہیں حیات کے۔کہا وہ تو تم نہیں دیکھ سکتے۔یہ تو روز دیکھتے ہوایک شے کہ جس کو تم مردہ سمجھتے ہی نہیں' تمہارے سامنے مردہ ہوتی ہے وہ۔پھر اس میں سے زندگی جو ابھرتی ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ پہلے یہ ریزہ ریزہ ہوجاتی ہے پوری طرح سے Disintegration اس میں پیدا ہوتی ہے۔اور اس کے اندر ایک چھپی ہوئی کھوئی ہوئی زندگی مسکراتی ہوئی تمہارے سامنے آتی ہے اور کتنا بڑا شاداب مستقبل اس کے اندر ہوتا ہے جس کو یہ لیے لیے اپنے ساتھ آتی ہے۔وہ عجیب چیز ہے۔

عربی زبان میں موت کا لفظ کسی چیز کے ساکن ہوجانے کے لیے استعمال ہوتا ہے

یہ جو عربی زبان میں موت ان کے ہاں' میں نے عرض کیا۔اس قوم کی عجیب کیفیت ہے جو الفاظ یہ چنتے ہیں' یہ موت کا لفظ جسے ہم Death کہتے ہیں یعنی ہم تو اس وقت Death کہتے ہیں جب زندگی اس میں ختم ہوجائے باقی نہ رہے' اسے ہم کہتے ہیں موت۔وہ جو استعمال کرتے تھے ان چیزوں کو وہ مثلاً کہتے تھے کہ مَاتَتِ الرِّیْحُ ہوا جب ساکن ہوجاتی تھی تو وہ کہتے تھے کہ ہوا پر موت طاری ہوگئی۔یہ کیا ہوتا ہے جب ساکن ہوتی ہے ہوا؟ اس میں حرکت کے امکانات سارے موجود ہوتے ہیں وہ شے جو محرک تھی اس کی جس نے اس کو حرکت دینی تھی' وہ وہاں موجود نہیں ہوتی' ہوا ساکن ہوتی ہے اور وہ محرک جس وقت پیدا ہوجاتا ہے' ہوا متحرک ہوجاتی ہے۔آپ غور کرتے ہیں کہ یہ لوگ ان الفاظ کو کس طرح استعمال کرتے تھے کہ حرکت کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ایک محرک جو تھا' وہ نہیں ہے۔

موت کے بعد زندگی صرف محرکات کی طلب گار ہوتی ہے

وہ کہتا یہ ہے کہ تم یہ روز دیکھتے ہو کہ یہ جو گٹھلی تھی۔یہ جو بیج تھا' زندگی اس کے اندر موجود تھی' خوابیدہ تھی۔اس زندگی کی نمود کے لیے جو محرکات چاہئیں تھے' وہ نہیں اس وقت موجود تھے۔مٹی میں ملا دیا پانی دیا روشنی دی حرارت اس کو پہنچی' یہ کہیں خارج سے زندگی اس کے اندر نہیں آئی ہے۔تم نے یہ نہیں کیا ہے کہ اس کے بعد کہیں انجکشن کے ذریعے سے کچھ لائف بھی اس کے اندر تم نے کسی طرح سے داخل کردی ہو' وہ اس کے اندر موجود تھی خوابیدہ تھی سوئی ہوئی تھی اب وہ جاگ اٹھی۔کہتا ہے یہ تمہارے سامنے روز ہوتا ہے اسے تو تم ناممکن نہیں کہتے ہو اور اگر اس کے بعد ہم کہیں کہ بعینہٖ یہی کیفیت انسان کے جسم کی ہے۔تو اسے تم واقعی دیکھتے ہو کہ وہ ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے' ٹھیک ہے یہ ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے لیکن اس کے بعد بھی زندگی کے امکانات اس کے اندر خوابیدہ موجود ہوتے ہیں۔اس کے بعد جب بھی مناسب اور مساعد محرکات اس کو مل جاتے ہیں' یہ جو خوابیدہ ہوتی ہے' بیدار ہوجاتی ہے زندگی' بس اسی کا نام زندگی' اُس کا نام تم نے موت رکھا ہوا ہے۔اور یہاں سے اب آگے چلا تو اب اہلِ علم کی طرف وہ آیا۔

اہل علم کے نزدیک مادہ کی دنیا میں زندگی کی ابتداء ایک حیران کن مسئلہ ہے

اس پہ تمہیں حیرت ہوتی ہے کہ ایک مردہ Inanimate جسے آپ کہتے ہیں جس کے اندر زندگی نہیں ہے اس کے اندر سے زندگی کی نمود کیسے ہو جائے گی۔ کہا یہ جسے تم نے Inanimate کہا یہ Matter (مادہ) ہے یہ پتھر یہ مٹی ان چیزوں کو Inanimate کہتے ہیں اور جن چیزوں میں زندگی کی نمود ہوتی ہے یا محسوس کہتے ہیں وہ ہوتی ہے زندگی۔ تو وہ کہتا ہے تم اس سے حیران ہوتے ہو اس کو ناممکن سمجھتے ہو تو یہ جو لاش ہے جب جسم سے زندگی ختم ہو جاتی ہے تو یہ Inanimate ہو جاتی ہے' یہ مردہ ہو جاتی ہے۔

کہتا ہے ذرا یہ تو بتائیے تم اپنی سائنس کی تحقیقات کو لے جاؤ پیچھے کی طرف تو تم دیکھو گے کہ جب زندگی کی نمود وہاں نہیں تھی تو ہر Object یہاں Inanimate تھا مادہ تھا مٹی تھی پتھر تھے۔ ان میں تو کہیں زندگی نہیں تھی۔ یہ کہیے کہ زندگی کی سب سے پہلی بار جو نمود ہوئی ہے پہلے پہل' وہ تو اس غیر نامی چیزوں سے ہوئی ہے۔ مادے کو تم پیچھے لے جاتے ہو' اب تو وہ لائف کو بھی پیچھے لے گئے ہیں' حرکت تک پہنچ گئے ہیں' ایٹم تک چلے گئے ہیں۔ کہتا ہے کہیں چلے جاؤ تم' آخری درجے تک لے جاؤ تم Matter کو اس میں تمہیں لائف کہیں نہیں نظر آئے گی۔ یہ ٹھیک ہے۔ اٹامک انرجی تک یہ پہنچے ہیں یہ بلا کی انرجی ہے جس کے زور پہ وہ انسانوں کو اور اتنی بڑی بڑی چیزوں کو چاند تک پہنچا دیتے ہیں انرجی تو اٹامک اتنی بڑی ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ اس میں لائف تو نہیں کہیں نظر آتی۔ کہا کبھی اس پہ بھی تم نے غور کیا ہے کہ جس میں تمہیں لائف کا کوئی شائبہ تک نہیں نظر آتا اس میں سے لائف نکلی ہے۔ تو جب اس میں سے لائف نکل سکتی ہے تو یہ تو ابھی ایک سیکنڈ پہلے زندہ تھا یہ جسم جو ہے' وہ جس میں قطعاً تھی نہیں' لائف اس میں سے تو لائف کی نمود ہو گئی اور جس میں ابھی کل تک لائف موجود تھی تمہیں اس پہ حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیسے زندہ ہو جائے گا۔ کہا محض اس لیے کہ یہ تمہارے سامنے زندہ نہیں ہوتا' پہلی زندگی جو نکلی تھی وہ بھی تو تمہارے سامنے نہیں نکلی تھی۔ وہاں پہنچنے کے بعد تو تمہارے بڑے سے بڑا سائنٹسٹ بھی یہ کہہ دیتا ہے کہ Origin of the Universe یا Origin of life جو ہے زندگی کی ابتداء کیسے ہوئی' کائنات کی ابتداء کیسے ہوئی' وہ وہاں جا کے ٹھٹک کے رہ جاتا ہے کہ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہم یہاں سے چلتے ہیں کہ یہ کسی طرح سے وجود میں آ گئی۔ وہ کہتا ہے کہ جب اس سے تم چلتے ہو کہ کسی طرح وجود میں آ گئی تو اس کے بعد اگر کہا جائے کہ یہ کسی طرح وجود میں آ جائے گی یہ لائف' یہاں پہنچنے کے بعد پھر تم انکار کس طرح سے کرتے ہو۔ اور مشاہدے کے لیے میں نے عرض کیا کہ اس نے کہہ دیا کہ روز ایک بے جان دانے میں سے تم زندگی کی نمود دیکھتے ہو۔ اور آگے بڑھاؤ' اب بیسویں صدی کے سائنٹسٹ کو کہا کہ آپ آئیے جناب اب۔ یہ Theory of evolution تمہارے ہاں بہت بڑا معرکہ ہے نا۔ اور اس کے بعد انسانی جسم کے متعلق تم نے بڑی کاوش کی ہے۔

زندگی تو ایک تسلسل ہے جس کے تحت مردہ سے زندہ اور زندہ میں سے مردہ کا عمل ہر آن جاری ہے

انسانی جسم میں جہاں جہاں لائف تمہیں نظر آتی ہے اس پہ تم نے غور وفکر خود کیا ہے۔ کہاں کس نتیجے پہ پہنچے ہو؟ الفاظ ہیں **یُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَ مُخۡرِجُ الۡمَیِّتِ مِنَ الۡحَیِّ** (6:95) وہ جسے تم میت مردہ کہتے ہو اس میں سے زندگی نکالتا ہے اور جسے زندہ کہتے ہو اس میں سے مردہ یا موت نکلتی چلی جاتی ہے۔ یہ تو کوئی سلسلہ اس قسم کا ہے مردہ میں سے زندگی' زندہ میں سے پھر مردہ شئے' وہ تو ایک تسلسل قائم ہے اس قسم کا۔ یہ سمجھ میں بات مشکل آ سکتی تھی اس سے پہلے' آج کے دور میں اسے دو اور دو چار کی طرح ثابت کر دیا۔ اور اس کے لیے بھی کسی آئن سٹائن یا نیوٹن ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے ہاں جتنی چیز ابتدائی ڈاکٹری کی کلاس میں یا سائنس کی کلاس میں پڑھائی جاتی ہے وہ اب اس کی تشریح کر سکتی ہے کہ مردہ میں سے زندہ اور زندہ میں سے مردہ' یہ چیز کیا ہے اور کیسے ہو سکتی ہے۔ چودہ سو سال پیشتر عرب کی سرزمین میں یہ بات کہی گئی جو اس دور میں بھی اپنے ہم عصر اقوام کے مقابلے میں کہیں پیچھے تھا علم میں' کہنے والا ان پڑھ تھا' کہتا ہے یہ چیز۔ کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی اور اسی لیے ہمارے ہاں کی جو پہلے تفاسیر تھیں یہ ان تک پہنچ نہیں سکتی تھیں' ان کا قصور نہیں تھا۔ انسان کی علم کی سطح وہاں' ابھی نہیں پہنچی تھی۔

جسم انسانی کا ایک ایک ذرہ ہر آن موت وحیات کے عمل سے دوچار ہے

ہم بھی یہ چیز آج بیان کرتے ہیں کہ کچھ ہمارا اس میں کمال نہیں ہماری کاریگری نہیں ہے علمِ انسانی بلند ہوتا ہوا اس سطح تک آ گیا ہے کہ وہاں کھڑے ہو کے ان کے پوشیدہ معنی کو چھو لیتے ہیں' بس اتنی سی بات ہے۔ وہ تو اس دور کے اندر بھی زمانے کی تہہ میں چھپے ہوئے معنی موجود تھے ہمارے ہاتھ کی کوتاہی تھی جو وہاں تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔ اور آج بھی ہمارا ہاتھ لمبا نہیں ہے' علمِ انسانی کی سطح اتنی اونچی ہمیں لے گئی ہے جو ہم اسے چھو رہے ہیں۔ کیا پڑھایا جاتا ہے؟ کسی ڈاکٹر سے پوچھ لیجیے طالبعلم سے پوچھ لو جو میڈیکل سٹوڈنٹ ہے کہ یہ جسمِ انسانی کی مشینری کیا چیز ہے۔ وہ کہے گا کہ یہ کچھ نہیں ہے یہ ایک سلسلہ ہے جسے Metabolism کہتے ہیں۔ وہ کیا ہوتا ہے؟ تو بتائے گا آپ کو کہ یہ جسے آپ جسم کہہ رہے ہیں یہ پیکر تو آپ کو یوں نظر آتا ہے درحقیقت یہ مستعمر ہے یعنی سارے کا سارا بنا ہوا ہے لائف سیل سے جو Naked Eye سے عریاں آنکھ سے نظر نہیں آتے مائیکروسکوپ سے دیکھنا پڑتا ہے ان کو۔ پھر ہوتا کیا ہے؟

کہتا ہے ہوتا یہ ہے کہ ہر آن اس جسم کے اندر کروڑوں کی تعداد میں یہ سیلز جو زندہ ہیں یہ مردہ ہوتے ہیں اور ان کی جگہ یہ جو کچھ ہم کھاتے ہیں ان میں تو زندگی نہیں ہوتی' زندہ چیز تو ہم کھا ہی نہیں سکتے یعنی زندہ کو بھی مار کے کھاتے ہیں ہم' یہ جو ہم کھاتے ہیں اس میں زندگی نہیں ہوتی اس میں ہر آن ہر سانس میں کروڑوں کی تعداد میں زندہ سیلز بنتے چلے جاتے ہیں۔ وہ جو بنتے چلے جاتے ہیں اسے

Anabolism کہتے ہیں اور وہ جو تلف ہوتے چلے جاتے ہیں وہ Catabolism کہلاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جسے تم جسم زندہ کہتے ہو جسے تم لائف کہتے ہو یہ جو چلتا پھرتا ہوا جیتا جاگتا ہوا جسم ہے یہ یونہی نہیں ہے کہ مٹی کا کسی طرح ایک پتلا بنا دیا ہے اور وہ چل رہا ہے ہر آن اس کے اندر یُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَ مُخۡرِجُ الۡمَیِّتِ مِنَ الۡحَیِّ (6:95) کا عمل جاری ہے اس کے اندر۔ یہ جو عمل دونوں قرآن نے یہاں بیان کیے ہیں اس کے لیے جامع لفظ ہے Metabolism جو میں نے کہا ہے۔ اور یہ جو دو ٹکڑے ہیں اس میں کہ یُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ یہ ہے (6:95) Anabolism جس میں لائف نہیں اس میں سے زندہ جراثیم بنتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ زندہ جراثیم ہر سانس میں کروڑوں کی تعداد میں تلف ہو کے مردہ ہوتے چلے جاتے ہیں یہ Catabolism ہے وَمُخۡرِجُ الۡمَیِّتِ مِنَ الۡحَیِّ (6:95) کہتا ہے یہ چیز تو تم خود دیکھتے ہو کرتے ہو' آج تم نے اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر لیا ہے کہ کس طرح مردوں میں سے زندگی اور زندہ میں سے موت ہر آن نکلتی چلی آتی ہے۔

زندگی اور موت کے محرکات کے بارے عام سطح پر ایک کسان کو سمجھانے کا قرآنی طریق

عزیزانِ من! ایک کسان کو بات سمجھائی کہ یہ جو بیج ہے تمہارے سامنے رکھا ہوا' برسوں تک رکھ چھوڑیے' زندگی کی کوئی نمود اس میں نہیں ہے۔ جونہی اس کو مساعد ماحول محرکات مل جائے اور تم دیکھتے ہو کہ اس مردہ میں سے زندگی نکلتی چلی آ رہی ہے' بڑھتا ہے پھلتا ہے پھولتا ہے درخت ہوتا ہے' اس میں پھل آتا ہے۔ یہ سارا کچھ کاہے کے لیے ہوتا ہے؟ کہ اس کے اندر ایک بیج لگتا ہے۔ پھل تک آپ دیکھتے ہیں زندگی کی نمود نظر آتی ہے اگرچہ آپ آنکھوں سے نہیں دیکھتے نمود اس کی' اس میں جو روز وہ بڑھتا ہے پھولتا ہے پھل آتا ہے پھل بڑا ہوتا ہے' کچا ہوتا ہے پختہ ہو جاتا ہے' نظر آتا ہے کہ اندر یہ کچھ ہو رہا ہے۔ اور اس کے بعد منتہا اس سارے سلسلے کا اس کے اندر ایک بیج پیدا کرنا ہے' گٹھلی پیدا کرنا ہے۔ وہ جو گٹھلی پیدا ہوتی ہے اس کو نکالو وہ مردہ ہوتی ہے پھر یعنی اس کو اگر باہر رکھ دو اس کے اندر تمہیں کہیں زندگی کی نمود نہیں نظر آتی' اس میں نشو ونما نہیں ہو رہی۔ مردہ وہ ہے کہ جس میں حرکت نشو ونما نہ ہوتی ہو' زندہ وہ ہے جس میں یہ ہو رہا ہے۔ یہ نہیں کہ اس میں زندگی ہوتی ہے' اس کے امکانات اس کے اندر Potential ہوتے ہیں خوابیدہ ہوتے ہیں موجود ہوتے ہیں' تمہیں نظر نہیں آتے۔ کسان کو تو یہ سمجھایا کہ دیکھا یہ سلسلہ ایک بے جان گٹھلی میں سے جاندار درخت تناور پھل اور اس سارے سلسلۂ حیات میں سے آخر الامر ایک شے جسے تم پھر دیکھتے ہو کہ اسمیں پھر جان نہیں۔ اور اسی بے جان کو پھر تم جب دفن کر دیتے ہو مٹی میں تو اس کے اندر سے پھر حیاتِ تازہ کی نمود' یہ تو تمہارے سامنے ہوتا ہے۔ اسے یہ سمجھایا اور آج کے دور کے بڑے سے بڑے سائنٹسٹ کو یہ سمجھایا کہ یہ جو میٹابولزم ہے یہ زندہ میں سے مردہ اور مردہ میں سے زندہ ہر آن نکلتا ہے یا نہیں۔ ایک نامی کو بھی سمجھایا ایک سائنٹسٹ کو بھی سمجھایا' سمجھایا اس طرح سے کہ جرأت ہی نہیں کر سکتے انکار کی یہ۔ کہ مردہ میں سے زندگی نکلتی ہے۔ کہا یہ اقرار کرتے ہو نا تم' ہاں کیے بغیر

چارہ ہی نہیں۔ وجد میں آ جایئے ذٰلِکُمُ اللّٰہُ (6:95) یہ ہے اللہ۔ سمجھ لیا' دیکھا اپنی آنکھوں سے کہ کرتا کیا ہے' دیکھ لیا تم نے یہ کہ زندہ میں سے مردہ اور مردہ میں سے زندگی کیسے نکلتی ہے' یہ دیکھ لیا۔ کہا فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ (6:95) ''فیر تہانوں موت کی پے جاندی اے اگوں آ کے' اوتھے آ کے کھلو جاندے او'' ۔ کیا بات ہے فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ (6:95) کیا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ سیدھے راستے پہ اچھا بھلا چلا جائے اور خوامخوہ کسی ایک نقطے کے اوپر آ کے پلٹ کے پھر پیچھے چلا جائے کہنے لگا'' فٹے منہ تہاڈا'' ۔ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ(6:95) اور فانی یعنی پلٹ کر کدھر جا رہے ہو۔ پیچھے چلے جاؤ گے تو وہاں پھر نظر آ جائے گا کہ کوئی لائف نہیں تھی اس کائنات کے اندر کہیں سے اور زندگی کی نمود مردہ سے ہوئی۔ چلو تو کہاں جاتے ہو۔ پلٹ کے بھی کہاں جاؤ گے فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ (6:95) جاؤ پلٹ کے۔

فکر قرآنی کی تعلیم تو بادِ نسیم کی طرح شفاف اور صدا بہار پھول کی مانند ہے

عزیزانِ من!

؎ ایں کتاب نیست چیزے دیگر است

چودہ سو سال میں یہ تر و تازہ' آج بھی اس کی زندگی پہلے سے زیادہ درخشندہ اور تابندہ ہے۔ ہر دور میں ہر سطح کے انسان کو مطمئن کرنے کے لیے دلائل' مشاہدات کے دلائل۔ اور اس کہنے کے بعد پھر جو بات یہاں تک پہنچا تا ہے ایسی Situation بعد فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ(6:95) چلو پلٹ کے کہاں جاتے ہو پھر۔ کہتا ہے آگے کیوں نہیں بڑھتے اس میں' پیچھے کیوں لوٹتے ہو۔ اور پھر پیچھے پلٹ کے جاؤ گے کہاں' آغاز میں چلے جاؤ گے نا جہاں سے زندگی کی نمود ہوئی تھی۔ وہاں تم پھر مانو گے کہ Inanimate تھا جس میں سے زندگی کی نمود ہوئی ہے۔ کہتا ہے وہاں جو پلٹ کے جاتے ہو' آگے کیوں نہیں بڑھ جاتے کہ یہ جو انسان کا جسم ہے مردہ اس میں سے آگے زندگی پھوٹے گی۔ آگے قدم اٹھاؤ' پیچھے کیوں لوٹتے ہو' پیچھے لوٹ کے بھی تو وہیں جانا پڑے گا کہ مردہ میں سے زندگی نکل سکتی ہے۔

حق کو حق ثابت کرنے کے لیے قرآن حکیم کے روشن اور عقل و بصیرت پر مبنی دلائل

آپ غور فرما رہے ہیں مردہ کو تو آنکھوں کے سامنے زندہ کر کے وہ نہیں دکھاتا' دلائل وہ پیش کرتا ہے جو ہر آن ہم دیکھتے ہیں کہ مردہ زندہ ہو رہا ہے۔ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ (6:95) کہاں جاؤ گے اس کے بعد پلٹ کے۔ اس سے بھی اور پیش پا افتادہ چیز۔ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَ جَعَلَ الَّیْلَ سَکَنًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا (6:96) کہتا ہے یہ گردشِ لیل و نہار دن رات کی جو یہ گردش ہے یہ تم نے دیکھی ہے۔ رات کی تاریکیوں میں کیا دیکھتے ہو کہ صبح کی کرنیں کس طرح نمودار ہوتی ہیں' رات کی تاریکی کی چادر کو پھاڑ کر اس میں سے روشنی کی کرنیں کیسے نکل آتی ہیں۔ کہا جب تم رات کہتے ہو اس کو تاریکی کہتے ہو' تو صبح مر تو نہیں گئی ہوتی' تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی ہوتی

ہے۔گردشِ لیل ونہار' آپ غور فرمایئے اس دور میں یہ چیز کہنا جب ساری دنیا ابھی یہ مانتی تھی کہ زمین چپٹی ہے تخت کی طرح اور اگر کسی نے گول کہا تھا تو کہا کہ یہ ساکن ہے اپنی جگہ پر۔ بڑی دور کی کوڑی لانے والے' کوڑی کہاں ہے۔اس کے بعد زلزلہ آتا تھا تو بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ گائے کے سینگوں کے اوپر ہے یہ۔اؤزمین تو ہوئی گائے کے سینگوں کے اوپر تو یہ گائے کس کے اوپر کھڑی ہے پھر' یعنی گائے نے زمین پہ کھڑے ہونا تھا۔یعنی گائے کے سینگوں کے اوپر زمین کھڑی ہے تو گائے کہاں کھڑی ہے؟ کہنے لگے جی گائے مچھلی پہ کھڑی ہے۔اوتو مچھلی کس پہ کھڑی ہے؟ کہا جی مچھلی پانی کے اوپر ہے۔''تے او پانی کاہدے تے ہے' کہن لگا بس وی کر ہن سلسلہ اے''۔خود اپنی عقل کا نقص ہوتا ہے۔اس نے کہا کہ یہ گھوڑا ذرا تیز سا ہے' کسی کو سوار ہو کر چلنے نہیں دیتا گرا دیتا ہے۔کہا صاحب کیا کہہ رہے ہیں آپ' کوئی سوار ہو تو اس کو گرا کے بتائے کبھی۔کہنے لگے اچھی بات ہے' کہنے لگے لایئے۔اس نے ایک جمپ لگائی تو وہ کاٹھی سے لگ گئے' دوسری لگائی تو کنوتیوں پر' تیسری لگائی تو کنوتیوں سے نیچے۔کہنے لگا گرا کہ نہیں؟ کہنے لگا میں کیا کروں''گھوڑا ای مک گیا ہویا اے''۔اندازہ لگایئے عزیزانِ من! اس دور کے اندر یہ کہنا گردشِ لیل ونہار۔کہا کہ یہ صبح کی دن کی روشنی' تم تو کہتے ہو کہ ختم ہوگئی 'تاریکی چھا گئی۔کہیں نہیں جاتی' یہ تو ایک گردش ہے جو کبھی تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے' کبھی تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے' جاتی وہ کہیں نہیں ہے حقیقت میں۔جسے تم اس انسان کے جسم کی موت کہتے ہو' یہ وہ رات کی تاریکی ہے جس میں یہ روشنی تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہوگئی ہے۔

سورج کے طلوع ہونے اور غروب ہونے میں ''وقت'' کی حکمت پوشیدہ ہے

کہا اس گردش دینے سے فائدہ کیا ہے؟ یعنی یونہی چکر دیتے رہتے ہو اس کو؟ کہا نہیں! اس سے تمہارے لیے ایک عملی فائدہ ہے

وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ حُسۡبَانًا (6:96)

چاند اور سورج تمہارے لیے کیلنڈر کا کام دیتا ہے' گنتی کا کام دیتا ہے۔آپ سوچئے اور یہ وقت کیا ہے۔وہ بات دوسری طرف نکل جائے گی وہ ٹائم کا مسئلہ ہے' زمان کا وقت کا مسئلہ' بہت مشکل مسئلہ ہے۔یعنی اگر یہ دن اور رات کی تبدیلی نہ ہو آپ دیکھئے تو ذرا تصور میں لائے' ہم تصور میں ہی نہیں لاسکتے۔ایسی تبدیلی ہمارے تحت الشعور میں گئی ہوئی ہے کہ ذہن میں نہیں آتا کہ یہ نہ ہوا گر تو آپ سوچئے کہ پھر یہ زندگی کس طرح سے گذرے۔اسی لیے برگسان نے بڑی خوبصورت بات کہی ہے کہ یہ جسے آپ دن رات' ایک دو چار ہفتہ' مہینہ سال کہتے ہو یہ کچھ شے نہیں ہیں۔یہ وقت کے گز کے اوپر گرہ لگا دی ہیں کہ تم ماپ سکو۔کہاں سے لیا اس نے برگسان نے؟ ترجمہ کیا اس نے **ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ** (6:96) ''اے تے ماپ دے پیمانے نیں تہاڈے رب نے بنائے ہوئے''۔تقدیر کے معنی ہی ہوتا ہے پیمانے بنا دینا' وقت کے گز پہ گرہیں لگا دینا۔کہا عملی فائدہ تو اس کا یہ ہے کہ تمہارے لیے حساب کرنے کے لیے' ہم نے وقت کے اس گز پہ

گرہیں لگا دیں۔ سوچو تو سہی اگر گز ہو درزی کے پاس اور گرہیں نہ لگی ہوئی ہوں ''یعنی سوچو تے سہی او تہاڈا کوٹ کی بنا دے گا' چنگے بھلے بندے دا ملا بن جائے گا''۔ یہ ایک عامی کی سمجھ میں بھی بات آتی ہے کہ یہ جو گرہیں لگی ہیں پیائش کی عملی زندگی میں' یہ کتنی ضروری چیزیں تھیں۔ کہا یہ جو گردشِ لیل ونہار ہے کائنات کے پروگرام کے اندر' تو اور بڑے کام اس سے لیے جاتے ہیں' تمہارے لیے یہ ہے کہ پیائش کی یہ گرہیں لگا دیں۔ تم اس سے حساب کر سکتے ہو۔ ضمناً قرآن نے یہاں ہی نہیں اور مقامات میں سورج اور چاند دونوں کو ذریعہ بتایا ہے حساب کرنے کا۔ وہ جو ہمارے ہاں ہے کہ قمری مہینے کو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تو اسلامی ہوتے ہیں اور یہ شمسی جو ہیں سورج کے حساب سے اگر کیا جائے تو اسے یہ کہتے ہیں کہ یہ غیر اسلامی ہوتے ہیں۔ یہ ہے قمری کے ساتھ چاند کے حساب سے جو مہینے ہیں' قمری ہیں اس میں کچھ تقدس ہے ہمارے ہاں۔ قرآن دونوں کو کہتا' شمس و قمر دونوں حساب کے پیمانے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ زندگی صحرا نشینی کی' ابتدائی دور میں گاؤں والوں کی' چاند کا حساب وہ آسانی سے رکھ سکتے ہیں۔ اس کا نمودار ہونا پہلی تاریخ' آہستہ آہستہ بڑھتے چلے جانا اگر حساب داں اچھا ہو تو وہ چاند کی پیائش سے ہی بتا سکتا ہے کہ تاریخ کتنی ہے۔ چودہ تک پہنچ کے پھر نیچے ڈھلتے چلے جانا۔ ان کے لیے آسان ہے یہ۔ لیکن جب انسانی علم اتنا آگے بڑھ گیا ہو تو اس کے لیے تو یہ پھر صدیوں کا حساب ہے۔ اس میں تو تعین ایسا اچھا ہوتا ہے کہ سو سال پہلے بتا سکتے ہیں کہ یہ چاند کو یا سورج کو گرہن لگے گا کتنے سیکنڈ کے اوپر سورج نمودار ہو گا' کتنے سیکنڈ پہ وہ چھپے گا۔ مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے شمس اور قمر دونوں کو حساب کا ذریعہ بتایا ہے جونسا ذریعہ بھی آپ کے ہاں زیادہ موزوں ہو' اسے اختیار کر لیجیے وہ خدا کا ہی بنایا ہوا ہو گا۔ یہ نہیں ہے کہ چاند کا مہینہ خدا کا بنایا ہوا ہے اور یہ شمس کا سورج کا مہینہ مادہ پرست یورپ کا بنایا ہوا ہے۔ ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ (6:96) وہ تو پیائش کے پیمانے بنائے ہوئے اس خدا نے جو بڑے کنٹرول کا مالک ہے اور کنٹرول اس کا اندھا دھند کنٹرول نہیں ہے علیم ہے علم پر مبنی ہے۔ یہاں پھر یہ فَالِقُ الۡاِصۡبَاحِ (6:96) کہہ دیا کہ یہاں بھی تم دیکھتے ہو کہ یہ روشنی کہیں مر نہیں گئی ہوتی' تمہاری نگاہوں سے صرف اوجھل ہوتی ہے۔

سفر کے دوران صحرا میں رات کی تاریکی کے اندر ستاروں کی گواہی جو کبھی دھوکہ نہیں دیتے

اسی حساب اور کنٹرول کے متعلق یہ بتایا کہ وَ ہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ النُّجُوۡمَ لِتَہۡتَدُوۡا بِہَا فِیۡ ظُلُمٰتِ الۡبَرِّ (6:97) کہتا ہے پھر یہ دیکھئے رات کی تاریکیوں میں تمہیں سفر کرنا ہوتا ہے۔ سفر کرنا ہے وہاں عرب کے صحرا نشینوں نے اور انہی ریگستانوں میں جہاں کوئی سڑک نہیں' وہ سڑک تو ایک طرف رہی وہاں نشانات راہ ہی باقی نہیں رہتے' آج اگر آپ کہیں ٹیلے سے یا کسی پتھر رکھ کے نشان بنائیں' دو گھنٹے کے بعد وہاں اتنی تیز ہوا چلتی ہے کہ یہاں کا ٹیلہ وہاں پہنچ گیا ہوا ہوتا ہے۔ وہ نشان ہی گم ہو جاتے ہیں' باقی نہیں رہتے۔ راستہ ہو اس قسم کا کہ جہاں کوئی نشانِ راہ نہ ہو' رات کو وہ زیادہ سفر کیا کرتے تھے کیونکہ دن میں بڑی سخت شدت کی گرمی ہوتی ہے صحراء

میں۔ راتوں کا سفر راتوں کی تاریکیوں میں صحرا میں سفر جو نشاناتِ راہ ہی نہیں ہیں ذرا سوچیے تو سہی کہ ان کے یہ قافلے منزل تک کیسے پہنچتے ہونگے۔ کہا کس طرح سے یہ منزل تک پہنچتے ہیں؟ ستاروں کو دیکھ کے تم متعین کر لیتے ہوا پنا راستہ۔ اور کہا کہ ستاروں کی گواہی ایسی ہے کہ جس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تمہارے ساتھ' کبھی دھوکہ نہیں کیا تمہارے ساتھ' کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے تمہیں گمراہ کر دیا ہو' بدراہ کر دیا ہو صحیح راستے کے اوپر تمہیں وہ ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ خدا کے بنائے ہوئے پیمانے اس قسم کے ہیں۔ تمہارے بنائے ہوئے پیمانے تو دھوکہ دے سکتے ہیں' اُس کے بنائے ہوئے پیمانے دھوکہ نہیں دیتے۔

صحرا نشینوں کو وحی کی راہنمائی سے آگاہ کرنے کا قرآنی انداز

ضمناً یاد آ گیا کہ قرآنِ کریم میں سورۃ والنجم میں آپ دیکھئے' وہاں وحی کے متعلق یہ کہنا یا رسول اللہ ﷺ کے متعلق کہ یہ صاحبِ وحی جس راستے کی نشاندہی کرتا ہے' اس راستے پہ چل کے تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ راستہ تمہیں دھوکہ نہیں دے گا' وہ صحیح منزل تک پہنچا دے گا' یقینی بات ہے۔ ان بدوؤں کو ان صحرا نشینوں کو یہ بات بتانی ہے' آپ کو معلوم ہے انہیں کیسے بتایا گیا؟ کہا **وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى** (53:1) کہا یہ بتاؤ تم کہ اس طرح سے تاریکیوں میں صحراؤں میں جب سفر کرتے ہو کونسی چیز ہے جو تمہیں راستہ بتاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ستارہ' نمودار ہوتا ہے اپنا راستہ طے کرتا ہوا پھر غروب ہوتا ہے یہ جو اس کی مسافت کے راستے ہیں یہ ہمیں راہنمائی دیتے ہیں اور ایسی پختہ راہنمائی دیتے ہیں کہ جس میں کبھی غلطی نہیں ہوتی۔ نہ ستارہ اپنا راستہ غلط اختیار کرتا ہے' نہ وہ دوسرے کو کبھی غلط راہنمائی دیتا ہے۔ کہا یہ تمہارے روز مرہ کا مشاہدہ ہے نا زندگی بھر کا۔ ہمارے نشاناتِ راہ جو ہیں وہ تو کبھی غلطی نہیں کرتے کبھی گمراہ نہیں کرتے۔ ٹھیک ہے۔ کہا اسی طرح سے یہ جو تمہیں راستے کی نشاندہی کرتا ہے نا نہ یہ کبھی خود گمراہ ہوتا ہے' نہ دوسرے کو گمراہ کرتا ہے۔ تم نے اپنی بات کہی تھی کہ ہمارے بنائے ہوئے ستارے جو ہیں وہ یہ کرتے ہیں' یہاں بات تو تم انسان کی کہتے ہو' کہا نہیں اس کی بات نہیں کہتے **وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى** (53:3-4) یہ اپنی طرف سے نشاناتِ راہ تمہیں نہیں بتاتا ہم نے ستارے اس کے قلب کے اندر نازل کیے ہوئے ہیں یہ وہ راہنمائی تمہیں کرتے ہیں۔ کہو تو سہی تمہارا تجربہ کیا کہتا ہے کہ ہمارے بتائے ہوئے نشاناتِ راہ پختہ اور یقینی طور پہ راہنمائی کرتے ہیں یا غلطی کرتے ہیں؟ تو کہنے لگے بس آسمان پہ وہ ستارے ہیں' زمین کے اوپر یہ ایک سراجِ منیر ہے جو تمہاری راہنمائی کرتا ہے۔ وہ بھی ہمارے بنائے ہوئے' یہ بھی ہمارے دیے ہوئے۔ دیکھتے ہیں دلیل کیسے قرآن دیتا ہے۔ **جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ** (6:97) دیکھئے ہم کیسے نکھار کر بات بتاتے ہیں لیکن ان چیزوں کو وہ آیات کہتا ہے۔ یعنی یہ مقصود بالذات یہ باتیں نہیں بتانی تھیں۔ جو ہم ستاروں کا علم بتاتے ہیں' سورج چاند کا علم بتاتے ہیں' یہ اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے کچھ نشانیاں ہیں جو ہم تمہیں دے رہے ہیں۔ اسی لیے آیات کہا ہے ان تمام چیزوں کو کہ وہ جو بات ہم نے کہی تھی کہ

ہماری طرف سے دی ہوئی راہنمائی یقینی ہوتی ہے'اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے یہ علامات ہیں تمہارے پاس۔ جیسے دور سے تم دھواں دیکھتے ہوتو وہ علامت ہوتا ہے اس بات کی کہ نیچے آگ ہے۔اور جب آگ کے متعلق تم سوچتے ہو کہ ہے'تو پھر ذہن میں ہوتا ہے کہ کوئی انسان ہے۔اس کو آیات کہا ہے۔لیکن آگے ایک لفظ بڑھا دیا' آیات ہیں لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (6:97) اربابِ علم کے لیے آیات ہیں' علم کی رو سے جب ان چیزوں پہ غور کریں گے اور اصل حقیقت تک وہ پہنچ جائیں گے۔کہا اور آگے چلو۔ابھی تو صرف زندگی کے متعلق کہہ رہا تھا کہ کس طرح Inanimate Object سے'ایسے Object سے جس میں قوتِ نمو نہیں تھی' بڑھنے کی قوت ارتقاء کی حرکت کی زندگی کی کوئی نمود نہیں تھی' اس میں سے زندگی کی ابتداء ہوئی۔

قصہ آدم کی پیدائش کا

اب آیا خود انسان کی طرف۔کہا آج تو یہ بات سمجھنا بہت آسان ہے کہ بچہ کیسے پیدا ہوتا ہے؟ ٹھیک ہے ایک جوڑا ہوتا ہے اس جوڑے کے اختلاط سے آگے بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔انسان پیدا ہو گیا۔کہا پیچھے لے جاؤ اس سلسلے کو کہ یہ جوڑا پہلا کیسے پیدا ہو گیا' وہی وہ مچھلی کہاں ٹھہرتی ہے۔ یہاں پہنچ کے ''فیر گھوڑا مک گیا''۔اس سے پہلے بات سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔بات ٹھیک ہے کہ مرغی پہلے پیدا ہوئی تھی یا انڈہ۔ پہلا انسان کس طرح سے وجود میں آیا' اس سے آگے تو ٹھیک ہے کہ کسی طرح یعنی کسی طرح سے پہلا انسان اور اس کا ایک جوڑا بنا دیجیے ''کیندے نیں بس اگے تے معاملہ ٹھیک ہے نا'' چلا چل پھرتا نکہ خاندانی منصوبہ بندی نہ آجائے۔لیکن یہ پہلی بات جو ہے وہ کیسے ہوئی۔سوچیں کس مقام پہ آکے کھڑا کرتا ہے ان کو۔کہتا ہے نہیں سمجھ میں آئی نا بات کیسے ہوئی

جوں نہ بینند حقیقت رہے افسانہ زنند

پھر کسی نہ کسی طرح اس ذہنِ انسانی کے بچپن نے جوڑا بنایا' مٹی گوندھی اس کا پتلا بنایا ذہن میں سمجھا کام بن گیا۔پھر کہا کہ نہیں یہ تو اکیلا ہی ہے بنا تو نہیں کام' جوڑا بنانا ہے۔بعد میں مٹی ختم ہوگئی۔کسی نے پسلی چیری اس میں سے نکالا' کسی شیو جی اور پاروتی کو بنایا' پہلا جوڑا جو تھا کسی نہ کسی طرح سے وجود میں لے آئے اس کے بغیر چارہ ہی نہیں تھا

؎ تیرا پتہ نہ پائیں تو لاچار کیا کریں

انسانی زندگی کی ابتدا ایک جرثومہ حیات سے ہوتی ہے

یہ چیز تو علم کی بارگاہ نے دینی تھی اور علمِ انسانی ابھی بہت نیچی سطح تھی اس کی۔ بڑھتا چلا گیا' بڑھتا چلا گیا اس دور تک آ گیا اور یہاں آکے انہوں نے یہ کہا کہ زندگی کی نمود وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (21:30) کہا یہ جو بے جان مادہ تھا اس پہ پانی کا چھینٹا

دیا زندگی کا پہلا جرثومہ اس میں سے نمودار ہوا اور بس آگے کام چل گیا۔

جب وہ پہلا جرثومہ ان کے سامنے آ گیا ہے' پوچھئے نہیں کہ ڈارون کس طرح وجد و مسرت میں ناچا ہے۔ اس لیے کہ وہ پہلا جرثومہ ایسا تھا کہ اس ایک کے اندر ہی یہ دونوں چیزیں موجود تھیں۔ جوشِ نمود سے ایک جرثومہ پھٹ کے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے ان میں سے ایک حصہ خود بخود ''لاڑا بن جاندا اے تے دوئی ووہٹی بن جاندی اے'' اور اس میں سے آگے پھر سلسلہ چلتا ہے۔ اب بھی اس قسم کے ہیں موجود یہ کیڑے مکوڑے' ان سے بھی چھوٹے کہ جن میں ایک ہی کے اندر یہ چیز ابھی تک یوں چلی آ رہی ہے۔ لیکن بہرحال اس ایک نفسِ واحد سے آگے یہ جوڑا اس کا بنا اور زندگی کا کارواں یہاں سے شروع ہوا۔ پھر آگے بڑھتا ہوا بلند ہوتا ہوا مختلف پیکر تبدیل کرتا ہوا' انسانی پیکر کے اندر آ گیا۔

انسانی زندگی کی ابتدا فردِ واحد سے نہیں بلکہ نفس واحدہ سے ہوئی

یہ بات آج بہت بڑا کارنامہ کہا جاتا ہے سائنس کے انکشافات کا اور ہے بھی بہت بڑا کارنامہ۔ وہ کارنامہ بڑا اس وقت بنتا ہے جب وہ قرآن کے معیار پہ پورا اترتا ہے۔ اس سے پہلے وہ ظن و قیاس کی وادیوں میں ہوتا ہے حقیقت اس وقت وہ بنتا ہے جب قرآن کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ چیز آج بہت بڑا معرکہ آراء انکشاف ہے جو سب کچھ ہوا۔ کہا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ مرنے کے بعد کی زندگی کیسے ہوگی' ذرا ابتدائے زندگی تک پہ غور کیجیے۔ زندگی کے متعلق بھی تم نے سمجھ لیا کہ چلئے ایک جرثومہ' آگے سلسلہ جو ہے وہ کیسے چلتا ہے؟ کہتا ہے غور کیجیے اس چیز کو وَ هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ (6:98) پہلی نمود اس کی وہ نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے۔ اب یہ تھا وہ نفسِ واحدہ جسے ہم نے فردِ واحد سمجھ لیا اور آدم ہم نے اس کا نام رکھ دیا اس کو مٹی کا پیکر بنا کے اس میں جان ڈال دی۔ نفسِ واحدہ نہیں ہے یہ' یہ وہ اول Life cell ہے زندگی کا پہلا جرثومہ جو واحدہ ہے جو جوڑا نہیں ہے ابھی۔ اس واحدہ پہ زور دینے سے آپ نے دیکھا کیا کہہ دیا قرآن نے کہ وہ پہلا جرثومہ وہ ایک ہی تھا Uleteran تھا' وہاں سے تمہاری اَنۡشَاَکُمۡ (6:98) ابتداء تمہاری اے۔ یہ سامنے جو کھڑے ہوئے انسانی پیکر کے اندر ان باتوں پہ تعجب کر رہے ہو' تمہاری ابتداء ایک نفسِ واحدہ ایک جرثومۂ حیات سے ہوئی اور آگے چلی۔

ایک منزل سے دوسری منزل کا ارتقا

عزیزانِ من! دو لفظ آگے آتے ہیں فَمُسۡتَقَرٌّ وَّ مُسۡتَوۡدَعٌ (6:98) Evolutoin کی تھیوری کے متعلق بہرحال اپنی استطاعت کے مطابق بہت کچھ پڑھا ہے۔ اس میں یہ چیزیں وہ بتاتے ہیں کہ یہ کاروانِ حیات یا زندگی جس پیکر میں ہوتی ہے وہ ایک منزل میں آتا ہے۔ وہاں وہ ٹھہرتا ہے' وہاں کے ماحول سے وہ اپنے اندر اور چیزیں لیتا ہے۔ ان میں سے جن میں آگے بڑھنے کی

صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے' وہ اس منزل سے اگلی منزل کے اندر آ جاتا ہے۔ اس میں پھر وہ ٹھہرتا ہے۔ یہ اگلی منزل پچھلی منزل سے زیادہ ارتقاء یافتہ ہوتی ہے۔ اس سے پھر وہ اگلی منزل میں جاتا ہے۔ یہ ہے ارتقاء کی جو کڑیاں آج بتائی جا رہی ہیں۔ میں ان میں دیکھتا تھا کہ ان کے لیے کوئی ایک جامع لفظ انہوں نے کہیں استعمال کیا ہے' ایک جامع لفظ وہاں نہیں ملتا۔ یہی کہتے تھے کہ اس سٹیج کے اندر آ کے یہ ہوتا ہے پھر اگلی سٹیج میں چلا جاتا ہے۔

لفظ فمستقر اور مستودع کا قرآنی اور لغوی مفہوم

ان دو لفظوں کے اوپر غور کیجیے اور پھر کہیے کہ یہ کسی انسان کا کلام ہو سکتا ہے۔ نفسِ واحدہ سے شروع ہوا یہ کارواں' زندگی کا پیکر یہ آگے چلا ایک منزل میں پہنچا تو کہا مُسْتَقَرٌّ (6:98) وہاں آ کے وہ ایک منزل میں رک گیا۔ قرار کہتے ہی اس چیز کو ہیں کہ جس میں حرکت پہلے ہو اور پھر وہ رک جائے۔ یعنی جو جامد شے ہو' جس میں پہلے حرکت نہ ہو اس کے لیے یہ لفظ آتا ہی نہیں ہے۔ اس میں آ کے اس کو قرار ہوا۔ یہ رک گیا یہ ٹھہر گیا۔ ٹھہر جانے کے بعد (اس میں ایک ادب کی شان بھی آپ دیکھیے عزیزانِ من! ایک لطافت بھی دیکھیے) کہا اس میں آ کے یہ رک گیا مُسْتَوْدَعٌ (6:98) یہ درحقیقت ایک امانت تھی اس منزل کے پاس' اس نے یہ امانت اگلی منزل کے سپرد کر دی۔ کتنے Comprehensive یہ Terms ہیں فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ (6:98)۔ اس منزل نے اس پہ چھ نہیں مار لیا۔

حقائق کے برعکس لفظ امانت کا مروجہ ترجمہ' حیران کن تصور

وہ جو ہے کہ ہم نے اپنی امانت کو کائنات کی ان چیزوں کے سامنے پیش کیا اور کہتے ہیں کہ وہ ڈر گئے اٹھانے سے اور وہ کانپ اٹھے حملِ امانت سے اور اس کے بعد یہ کانپ اٹھے اور انسان آگے بڑھا۔ وہ جو کہتے ہیں 'رکھ لی میرے خدا نے میری بے کسی کی شرم' اس نے اُس کی شرم رکھ لی کہ وہ اپنی امانت لیے لیے پھرتا تھا (معاف رکھئے ان terms میں) اور جس کے سامنے لے گیا ''میاں! اے چک لے تھوڑا جیا بھار' او کہے' جا او جا میں نئیں چکدا ہیگا'' تو یہ کیفیت ہوگئی۔ تو اس نے یہ دیکھ کے کہ یہ تو کچھ معاملہ بگڑتا ہوا ہے' یہ آگے بڑھا اور اس نے کہا کہ بہت اچھا میں اٹھاتا ہوں' اس نے اٹھا لیا تو قرآن کہتا ہے اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (33:72) ''بڑا ای جاہل تے بڑا ای ظالم سی''۔ کیا باتیں قرآن کی عزیزانِ من! کیا چیزیں ہیں!!! وہاں حملِ امانت ہے۔ کہا کہ یہ امانتیں ہم نے خارجی کائنات کے ہر منزل میں رکھیں' ہر درجے میں رکھیں' ہر ایک کے سر پہ رکھیں۔ حملِ امانت کے معنی عربی زبان میں ہوتا ہے امانت میں خیانت کرنا۔ ان میں سے تو کسی نے خیانت نہ کی۔ انسان نے جب اس کو اٹھایا تو کم بخت اس میں خیانت کرتا ہے جاہل بھی ہے۔ اپنے آپ پہ ظلم بھی کرتا ہے۔ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ (6:98) حرکت میں قرار آیا وہاں اس نے اپنے Environment سے کچھ اور لیا اور یہ جب

کچھ اس قابل ہوگئی آگے پہنچنے کے تو اس نے نہایت دیانتداری سے اسے اگلی منزل کو جا کے سونپ دیا کہ یہ امانت میرے پاس ہے۔ یہاں کبھی غور بھی کیا۔ آج تم کہتے ہو کہ مرنے کے بعد زندگی کیسے ملے گی' تم یہ جو کہنے والے ہو اور اس طرح سے انکار کرنے والے یا اس طرح سے شک وشبہات میں ڈوبے ہوئے ہو' ذرا اپنی Origin کے اوپر تو غور کرو تم ایسے کیسے بنے تھے جو آگے چلنے سے انکار کر رہے ہو۔قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ (6:98) دیکھو! پھر ہم بات کیسی نکھار کر بیان کرتے ہیں۔

انسان کی ارتقائی منازل پر غور فکر کرنے کے سلسلہ میں ''لقوم یعلمون'' کے الفاظ کا استعمال معنی خیز ہے

پہلے کہا تھا لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (6:98) وہ بات تھی صرف خارجی کائنات کی عزیزانِ من! شمس وقمر کے پیمانے' ستاروں کے راستے ان کی گردشیں۔اس کے لیے صرف حساب کے علم کی ضرورت ہوتی ہے دو اور دو چار کرکے سارا کچھ پتہ چل جاتا ہے۔ یہ جو خود انسان کی زندگی کے متعلق ہے اور ارتقائی منازل میں سے یہ گذری ہیں' وہاں يَعْلَمُوْنَ (6:97) کہا تھا یہاں کہا ہے لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (6:98) اس قوم کے لیے جو تفقہ سے کام لے گی ذرا۔ یہ خالص حسابی قاعدے سے بات نہیں بنے گی اس میں ذرا گہرائی میں جانا پڑے گا۔ دو اور دو چار والی بات نہیں ہوگی' بڑی ریسرچ کرنی پڑے گی اس کے لیے' تفقہ سے کام لینا پڑے گا۔ کہتا ہے یہ کچھ تم نے دیکھا' اپنے متعلق دیکھا! تمہیں پیدا کیا۔ پیدا کرنے سے پہلے تمہارے گردونواح یہ تمام سامانِ زندگی' یہ پہلے سے مہیا کر دیا ہم نے۔ کہا ذرا اس سلسلے پر بھی غور کرو کہ تمہاری اپنی زندگی یہاں کن سہاروں کے اوپر ٹکی ہوئی ہے اور وہ سہارے کیسے وجود میں آتے ہیں۔ کہتا ہے اس زمین کے اوپر تو کچھ بھی نہیں ہوتا' اس نے زمین کو زمین مردہ کہا ہے۔

زمین مردہ میں مستور زندگی کے آثار کی وضاحت

پھر وہی مردہ کا لفظ اس نے استعمال کیا ہے۔ یہ کہتے ہوئے کہ زندگی اس کے اندر خوابیدہ ہوتی ہے موت نہیں' موت تو یہ ہوئی جو زندہ ہی نہ پھر ہو سکے۔ کہا اس کے اندر جو زندگی خوابیدہ ہوتی ہے زمین میں' کبھی غور کیا کہ اس کو حیات سے کیسے بدلا جاتا ہے اور پھر تمہارے لیے سامانِ زیست کیسے وہ پیدا کرتی ہے۔وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (6:99) اس کے لیے یہاں زمینِ مردہ' سامانِ حیات اب پیدا ہو رہے ہیں' آسمان سے بارش۔فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا (6:99) پانی برساتے ہیں۔ پانی کو الگ رکھ چھوڑیے زمین کو الگ رہنے دیجیے۔ دو چار دن کے بعد تر و تازہ پانی میں سے سڑاند آنے لگ جاتی ہے سڑ جاتا ہے پانی۔ زمین تو مردہ تھی ہی' ان دو چیزوں کو ملایا تو اس میں سے کہا دیکھتے نہیں ہو کہ کس طرح سے روئیدگی عروسِ نو کی طرح جھانکتی ہوئی ابھر آتی ہے۔ دیکھتے ہو زندگی لہلہاتی ہوئی کس طرح سے سامنے آجاتی ہے تمہارے۔ پھر اس میں

سے سبز کونپلیں نکالتے ہیں پھر انہی میں سے گتھے ہوئے دانے فصلوں کے پیدا ہو جاتے ہیں۔اسی زمین میں سے اسی پانی سے ایک طرف تم اناج کا بیج ڈالتے ہو تو اس میں سے اتنی سی فصل ہی اگتی ہے اس کے کنارے پہ کھجور کی گٹھلی بو دیتے ہو اسی پانی اسی زمین سے انہی مرکبات سے اس میں سے کھجور پیدا ہو جاتی ہے۔کھجور کے یہ خوشے دیکھیے وَمِنَ النَّخۡلِ مِنۡ طَلۡعِهَا قِنۡوَانٌ دَانِيَةٌ (6:99) جھکے ہوئے خوشے پھلوں کے۔

لفظ دانیۃ کا وہ لغوی مفہوم جس سے تمام انسان محروم ہیں

یہ دَانِيَةٌ(6:99) سے مجھے ایک بات یاد آ گئی عجیب۔قرآنِ کریم نے جنت کے درختوں کے متعلق یہ کہا ہے کہ ان کے پھلوں کے خوشے دَانِيَةٌ(69:23) ہونگے۔عام معنی اس کے یہی کیے جاتے ہیں کہ جو جھکے ہوئے ہونگے۔یہ جھکے ہوئے والی بات نہیں ہے۔یہاں تو یہ ٹھیک ہے۔جنت کے درختوں کے خوشے اور وہاں کے پھل' دَانِيَةٌ(69:23) کے معنی صرف جھکے ہوئے نہیں' آج ہم بڑے فخر سے کہتے ہیں' ہے بھی قابلِ فخر بات کہ اور کچھ نہیں پاکستان نے کم از کم پھل پیدا کرنے کے اندر بڑا کمال کر دکھایا ہے بڑی افراط سے پھل پیدا ہوتا ہے۔اس کے درختوں کے خوشے جھکے ہوئے لدے ہوئے پھلوں سے۔لیکن اس پھل کے بعد آپ کو پتہ ہے کیا ہوتا ہے؟ کیلے کے خوشے سب سے زیادہ جھکے ہوئے ہوتے ہیں' بازار میں جا کے پوچھیے کیلا سستے سے سستا بھی ہے تو تین آنے کا کیلا۔کھجوریں یہ آپ کے آئی ہیں' غریب روزہ دار بیچارہ کھجور سے روزہ کھولتا تھا' تین چار روپے سیر کھجور۔یہ جتنی ہمارے ہاں کی Majority ہے یہاں کی' اکثریت جو ہے آبادی کی یہ اتنی بہتات کے پھل جن کے خوشے جھکے ہوئے ہیں یہ ان کے With in reach ہیں؟ ان کی رسائی اس تک ہوتی ہے؟ ان کی دسترس تک ہیں؟۔دَانِيَةٌ کے معنی ہوتا ہے with in reach جو ہوں کسی کے۔کہا جنت کے خوشے ہر ایک کے with in reach ہونگے' وہ کسی کے ہاتھوں سے دور نہیں ہونگے یوں کہو جیسے ہر ایک کی جھولی میں خود آئیں گے۔

زمین کے نمکیات' پانی' سورج کی گرمی اور ہوا ان تمام کا باہمی ربط خشخاش کے دانے کے برابر بیج کو تناور درخت کی شکل عطا کر دیتا ہے

یہ ہوئی نارزاقی۔محض کثرت سے پیدا کر دینا' ٹھیک ہے یہ زمین پہ تو ہو جائیں گے پیدا' وہ جنت کے باغات نہیں ہو سکتے۔جنت کے باغات وہی ہیں جن کے خوشے لدے ہوئے بھی ہوں اور ہر ایک کی دسترس میں بھی آئیں۔دَانِيَةٌ کے یہ دہرے معنی ہیں۔بہرحال ضمنی بات تھی۔وَّ جَنّٰتٍ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّ الزَّيۡتُوۡنَ وَ الرُّمَّانَ مُشۡتَبِهًا وَّ غَيۡرَ مُتَشَابِهٍ (6:99) کہا کبھی غور اس پہ بھی تو کرو وہی زمین وہی پانی وہی اس کے نیچے نمکیات اسی قسم کی کھاد سب کچھ' ایک بیج خشخاش کے دانے کا اس کے فرق سے آپ دیکھتے ہو کہ کہاں تک

وہ فرق چلا جاتا ہے کوئی ملتے جلتے ہوئے کوئی غیر ملتے جلتے ہوئے۔ کہا اور آگے چلو۔ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ يَنْعِهٖ (6:99) کہا پھر یہ دیکھو پتے ہی پتے، شاخیں ہی شاخیں، خزاں میں تو بالکل شاخیں بھی خشک ہوئی ہوئیں۔ ان پتوں اور شاخوں میں پھل لگتا ہے۔ یہی کوئی چھوٹی بات نہیں پھل لگنا۔ کہتا ہے پھل لگتا ہے اور اس کے بعد آپ دیکھئے وہ پھل کچا ہوتا ہے، دو لفظ کہے ہیں اثمر اس میں پھل لگنا یہی کوئی کم بات نہیں ہے، کہتے ہیں پھر پھل کا پکنا۔ اگر ایسا ہوتا کہ وہ لگ گیا ہے، چھ مہینے لگا رہے اور رہے ویسے کا ویسا ہی یعنی وہی نیچے سے وہ جتنی غذا اس کو مل رہی ہے، وہی مل رہی ہے۔ پراسیس وہی ہے نیچے سے۔ اسی پراسیس نے پہلے کونپل بنائی تھی پھر تنا بنایا شاخیں بنائیں پتے بنائے پھول بنائے غنچے لگے اس میں پھل لگا پراسیس ایک ہی چلا آ رہا ہے۔ اب وہ پھل لگنے کے بعد یہ نہیں ہوتا کہ چلا آ رہا ہے وہ کچے کا پھل موٹا ہوتا چلا جائے، وہاں جاکے ایک جسامت میں رک جاتا ہے۔ پھر وہ پکنا شروع ہو جاتا ہے۔ اللہ اکبر۔

انسانی ذات کے لیے جسم انسانی کی مثال اس غنچے کی سی ہے کہ اس کے ختم ہونے میں ذات انسانی کے ثمر بار ہونے کا راز مضمر ہے

بڑی خوبصورت چیز ہے مصرع تو کسی اور کا ہے اقبالؒ اپنے ہاں لایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تم سمجھنا چاہتے ہو کہ انسان مر جاتا ہے، اس کا جسم ڈھیر ہو جاتا ہے تو پھر اس میں حیاتِ تازہ کیسے آ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم روز دیکھتے نہیں ہو کہ

شگوفہ چوں فرو ریزد بر ہست

شگوفہ یا غنچہ جب گر جاتا ہے پھل لگ جاتا ہے اس کے گرنے کا نام پھل ہے۔ ایسے ہیں پیڑ آپ کے ہاں جن میں پھول ہی آتے ہیں آخر تک پھول ہی آتا ہے وہ پھول گرتا نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے پھل لگنے کے لیے پھول کا گرنا ضروری ہے وہ گرتا ہے تو یہ نہ کہو کہ بس ختم ہوا، یہ پراسیس ضائع ہو گیا، یہیں تک بات تھی۔

شگوفہ چوں فرو ریزد بر ہست

شگوفہ تو گرتا اس لیے ہے کہ پھل لگ جائے۔ موت آتی اس لیے ہے کہ انسان کی ذات، اس میں شاید ابھی پھل نہیں آیا پھل لگے۔ پھل آ گیا ہے وَ يَنْعِهٖ پھر اس کی تکمیل ہو۔ یاد رکھئے! ذات کی تکمیل اسی سطح کے اوپر نہیں ہوتی۔ یہاں پھل تو لگتا ہے اس میں، پھل پکتا ہے وہ اگلی سٹیج میں جاکے پکتا ہے۔ کہا سن لیا۔ اب یہ دیکھئے يَّعْلَمُوْنَ (6:97) بھی آیا ہے يَّفْقَهُوْنَ (6:98) بھی آیا ہے۔ یہاں آ کے کہا بات ہم نے جو شروع کی تھی وہ اس زندگی کے بعد کی زندگی کے متعلق ہم یہ مثالیں دے رہے تھے تمہیں۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ (6:99) اس میں بھی بڑی نشانیاں ہیں۔ اب کن کے لیے یہ نشانیاں ہیں؟ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (6:99) اس قوم کے لیے جوان

صداقتوں پہ یقین رکھتی ہے۔ صداقتیں کونسی بیان کی ہیں؟ آپ نے دیکھا ہے کہ یہاں کوئی ایسی مابعد الطبیعاتی Meta-physics جسے کہتے ہیں وہ نہیں بیان کیا۔ روزمرہ کی زندگی کے شواہد سامنے لایا ہے اور اس کے بعد یہ کہا ہے کہ جو ان چیزوں پہ یقین رکھتا ہے' اس کے لیے اس سے آگے پہنچنے کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ فِیْ ذٰلِکُمْ لَاٰیٰتٍ (6:99) کہتا ہے یہ ہے اللہ' سمجھ لیا۔ اب اس کے متعلق یہ کہنا کہ یہ جو جسم مر گیا ہے اس میں زندگی کیسے پیدا ہوگی' وہ جو یہ سب کچھ کر رہا ہے یہاں تو تم کبھی نہیں کھڑے ہو کے کہتے' جب دانہ بوتے ہو تو کبھی بھی نہیں کہتے کہ نہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ اس دانے میں آم کا پیڑ' اس میں آم لگ جائیں اور آم پک گئے۔ وہاں تو نہیں کہتے یہاں آ کے کیوں کہتے ہو۔

کائنات کے ایک ایک ذرے کو کنٹرول کرنے کے لیے بتیس کروڑ دیوتاؤں کا تصور

یہاں پھر آ کے کہتا ہے کہ ایک تو تم انکار کرتے ہو بعض ایسے ہیں وہ کہتے ہیں کہ نہیں اکیلا نہیں کر سکتا وہ اس کے کوئی ساتھ ہونے چاہئیں۔

یہ سارا دیوی دیوتاؤں کا تصور' بتیس کروڑ دیوتا' یہ اسی بناء پہ تھا کہ انہوں نے کہا کہ یہ اتنا بڑا سلسلۂ کائنات اور اکیلا خدا چلائے یہ مشکل ہے' اس کے ساتھ اور ہونے چاہئیں۔ اور اب یہاں سے جو ان کے سامنے نظر آتے تھے ان میں تو کوئی ایسا تھا ہی نہیں کہ جو یہ خدائی کام کر سکتا اس کے لیے انہوں نے کہا مخفی قوتیں' ہمیں نظر تو وہ نہیں آتیں۔ لیکن ایسی دیوی دیوتا' یہ جو ان کے ہاں کے بت بناتے ہیں نا یہ اصل میں وہ نہیں ہوتے۔ یہ کہتے ہیں وہ تو ہیں اوپر ہمارے حدِ ادراک سے باہر' وہ نہیں نظر آتے ہمیں' ہم ان کے بت بنا دیتے ہیں' پیکر بناتے ہیں اپنے سامنے محسوس شکل میں رکھنے کے۔ جتنے یہ خدا کے ساتھ شریک بناتے تھے ان کے متعلق یہی تھا کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں وہ Unseen قوتیں ہوتی ہیں' غیر مرئی قوتیں ہیں' دیکھی نہیں جا سکتیں۔ عربی زبان میں ایسی چیز جو نگاہوں سے دیکھی نہ جا سکے' اسے جن کہتے ہیں جن کے معنی ہی پوشیدہ ہوتا ہے۔ کہا وَ جَعَلُوْا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ الْجِنَّ (6:100) اب وہ کہتے ہیں کہ ہے تو یہ سارا کچھ ٹھیک لیکن یہ اکیلے خدا کی بات ہو نہیں سکتی' کوئی Limited Concern ہونا چاہیے اس کے لیے۔ Limited Concern کہ ''جس طراں جوتی بازار ہوندے نیں' بالخصوص مسلماناں دا لمیٹڈ کنسرن''۔

اگر ایک قادرِ مطلق کی بجائے دو ہوتے تو کائناتی نظام میں اس قدر حسن و خوبی دیکھی ہی نہ جاتی

قرآن نے یہ دلیل دی ہے کہا سوچو کہ اتنی بڑی قوتوں کا مالک' تم تو اتنے خدا کہتے ہو نا' ذرا سوچو اگر کائنات میں دو بھی ہوتے اور دونوں کو ہوتی یہ قوتیں حاصل' کہتا ہے ہوتا کیا پھر؟ ایک کہتا ''سورج چڑھا دیؤ دوہا کہندا نئیں میری نینداچ خلل اوندا اے رہن

دے''۔سمجھے نا۔''برہمن کہندا اپئی ٹھیک ہے بارہ وجا دیؤ گرو جی کہندے بالکل نئیں صاحب! بارہ نئیں وجنے چاہیدے ہیگے''۔قرآن کہتا ہے کہ اگر دو بھی ہوتے لَفَسَدَتَا (21:22) تہس نہس ہو جاتا۔ یہ تو ایک ہی کا قانون ہے جس سے کہ فساد و انتشار و خلفشار نہیں ہوتا۔ جب تک انسانی معاشرے کے اندر بھی ایک کا قانون نہیں چلے گا' فساد نہیں مٹ سکے گا یاد رکھئے۔ کوئی سا نظام لے آیئے اور کوئی سی فارم لے آیئے' یہاں فارم اور نظام کا سوال ہی نہیں ہے سوال ایک کے قانون کے چلنے کا ہے۔ اور ایک انسان تو ہو نہیں سکتا' ایک تو وہی ہے' ساری باہر کی کائنات میں ایک قانون چل رہا ہے۔ کس حسنِ نظم و ترتیب سے کائنات کا سلسلہ جاری ہے۔ اسی ایک کا قانون انسانوں کی زندگی کے اندر چلے گا تو جیسے کائنات کا سلسلہ یہ اس طرح سے چل رہا ہے' ان کا سلسلہ بھی ایسے ہی ہو جائے گا۔ حضرتِ مسیحؑ کی زبان میں کہ تیری بادشاہت جو آسمانوں میں ہے' زمین پر بھی کسی طرح سے وہ آ جائے۔ کہتا ہے وَ جَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ (6:100) حالانکہ یہ غیر مرئی قوتیں بھی اسی کی پیدا کردہ ہیں اس کی پیدا کردہ کو اس کا شریک قرار دینا کتنی بڑی جہالت ہے۔ کبھی بھی اس کے برابر نہیں ہو سکتا' خالق کے برابر اس کی مخلوق ہو ہی نہیں سکتی۔ ایک دلیل ہے وَ خَلَقَهُمْ (6:100) کاٹ کے رکھ دیا سب کچھ۔ اس لیے کہ یہ بھی جو مانتے ہیں دیوی دیوتا کو' قدیم ان کو بھی یہ نہیں کہتے' بعد کی پیداوار کہتے ہیں۔

خدائے علیم کو نہ تو کسی نے جنا اور نہ ہی اس نے کسی کو جنا

تو جو بعد کی پیداوار ہے وَ خَلَقَهُمْ (6:100) ایک لفظ ہے عزیزانِ من! وَ خَلَقَهُمْ (6:100) بات ساری کاٹ کے رکھ دی۔ کہتا ہے یہ کرتے ہیں وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ بَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (6:100) اور پھر اس کے لیے یہ تو خیر شریک بنائے تھے' وہ بھی ہے وہ جو کہتے ہیں کہ وہ سب کچھ اس کے ہاں لڑکے لڑکیاں ہونی چاہئیں' بوڑھا ہو جائے گا تو پھر تو عصائے پیری اس کے لیے ضرورت ہے نا۔ کہتا ہے لڑکے لڑکیاں ہمارے لیے وہ کہتے ہیں۔ لفظ یہاں آیا جی خَرَقُوْا (6:100) آہاہاہا!!! حالانکہ یہ پہلے ہی خَلَقَهُمْ (6:100) تھا بناتے ہیں تخلیق کرتے ہیں۔ خَرَقُوْا (6:100) کہتا ہے یہ وہ تصور یہ وہ عقیدہ جس میں یہ کہتے ہیں کہ اس کے ہاں بیٹے بیٹیاں بھی ہیں یہ وہ چیز ہے کہ قانون' عقل' بصیرت ہر شے کی دھجیاں اڑا کر یہ تصور پیدا کرتے ہیں۔ خرق کے معنی ہیں پھاڑ پھاڑ دینا ان چیزوں کو۔ کیا کرتا ہے یہ قرآن!! کہتا ہے عقل و فکر کی علم و فضل کی فکر و دانش کی یہ دھجیاں بکھیر دیتے ہیں اس تصور کے ماتحت کہ خدا کے ہاں اولاد ہے۔ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ (6:100) خدا کے متعلق یہ جو تصورات لیے بیٹھے ہیں وہ اس سے بہت اونچا ہے' بہت منزہ ہے ان چیزوں سے مبرا ہے۔ کہتا ہے خدا کے ہاں بیٹے بیٹی۔ اب وہ آیت آ گئی آپ کو یاد ہے ایک درس میں پوری آیت آئی تھی یہ کہ خدا کا بیٹا جب یہ بناتے ہیں تو قرآن نے کس طرح سے اس کی تردید کی اور کس طرح سے پھر یہ چیز کہی کہ اس کائنات کے لیے جب ہم نے قوانین بنا دیے ہیں تو ہم ہر قانون کے خلاف کر سکتے ہیں' ہم کسی قانون کے خلاف کرتے نہیں ہیں۔

خدا کی ذات ہی وہ ذات ہے جو پوری کائنات کو کسی Cause کے بغیر وجود میں لائی ہے

دو باتیں یہاں پھر میں دہرا دوں بڑی عظیم آیت ہے' جو احباب نہیں تھے سن لیں۔ اگر چہ بات تو ایسی تھی جو شاید پورے درس میں بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (6:101) کہتا ہے ٹھیک ہے خدا تو وہ ہے اور ہونا ہی وہ چاہیے کہ اس سارے سلسلۂ کائنات کو وہ عدم سے وجود میں لایا Nothingness سے Being کے اندر وہ لایا ہے۔ اب یہاں پہنچ کے آپ کے سائنس کے سارے کلیئے قاعدے قوانین ٹھپ ہو کے رہ جاتے ہیں۔ سائنس تسلیم ہی نہیں کر سکتی کہ کوئی شے جو نہیں ہے وجود ہی نہیں ہے' کسی شے کا' کچھ بھی نہیں ہے اور اس میں سے یہ سارا کچھ آ جائے۔ یہ جو Cause & Effect علت و معلول کا کلیہ ہے سائنس کی ساری عمارت اس پہ قائم ہے تو ہر Effect کے پیچھے Cause ہونا چاہیے۔ پانی کا گرم ہونا آگ پہ منحصر ہے آگ لکڑی میں سے' کوئلے میں سے نکلتی ہے۔ اگر کوئی شے نہ ہو اور کائنات وجود میں آ جائے کہا یہاں تو وہ ہے کہ جس میں کوئی قانون نہیں ہے وہاں۔

سائنس کی ساری عمارت ہی Cause&Effect پر استوار ہوتی ہے

وہاں تو یہ ہے اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ (36:82) ہم اپنی سکیم میں جب کسی شے کے متعلق ارادہ کرتے ہیں' یوں تمہارے سمجھانے کے لیے کہہ دیا کہ ہم کہتے ہیں کن ہو جاتی ہے۔ ہر قاعدے اور قانون کی جس پہ سائنس کی عمارت قائم ہے یہاں نفی ہو جاتی ہے لیکن قرآن نے دو جہان یا دو عالم بتائے ہیں ایک عالم ہے Pre-nature اور دوسرا عالم ہے Post-nature۔ یہ جو پہلے عدم سے وجود میں لایا ہے اس وقت نیچر اور اس کے قوانین تو تھے ہی نہیں یہ عالم امر ہے یہاں قوانینِ فطرت نہیں ہیں ابھی۔

قوانین فطرت کی تشکیل کے بعد خدا نے خود کو بھی ان کا پابند کر لیا

قوانینِ فطرت تو اس وقت وجود میں آئیں گے جب یہ چیزیں وجود میں آ جائیں گی۔ کہا یہاں تک تو ہم نے ایسا کیا جس میں کوئی قاعدہ قانون نہیں تھا۔ لیکن جب ہم نے کائنات کی تخلیق کر دی' پیدا کر دیا اس کے ساتھ قوانینِ فطرت پیدا کر دیے اور اب اس کے بعد قانونِ فطرت کے خلاف کچھ نہیں کرتے۔ دلیل اس نے دینی تھی یہ کہ ہمارے ہاں بیٹا نہیں ہوتا' کیوں نہیں؟ وہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے' اپنے ہاں اسی طرح سے ایک بیٹا پیدا کر لینا یعنی ناممکن کیا تھا۔ کہنے لگے بات تو ٹھیک تم کہتے ہو لیکن (معاف رکھئے Inverted Comma میں بات یہ کہتا ہوں) ہمارے لیے اب یہ دشوار ہو گیا ہم نے کائنات کی تخلیق کی اور اس کے لیے قوانین بنا دیے اور بیٹے کے لیے قانون یہ بنایا کہ اس کے لیے مرد اور عورت کا اختلاط نہایت ضروری ہے ان دو کا وجود بڑا ضروری ہے تنہا نہیں یہ پیدا ہو سکتا۔ کائنات ساری تو اس کے ارادے سے پیدا ہو سکتی ہے اب بیٹا جو پیدا ہونے کے لیے ہم نے قانون مقرر کر دیا فطرت کا کہ یہ دو

ہونگے تو جب پیدا ہوگا۔اور سوچو تو سہی کہ اَنّٰی یَکُوْنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَکُنْ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ (6:101) خدا کے ہاں بیٹا کیسے ہوسکتا ہے جب اس کی بیوی نہیں ہے۔کیا بات ہے!!!۔بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (6:101) اوا تنا وسیع سلسلۂ کائنات تو ہوسکتا ہے' کہتا ہے ٹھیک ہے ہوسکتا ہے۔اس وقت ہم نے ابھی قانون نہیں بنائے تھے۔اور پھر یہ ہے شانِ خدائی' اتنے لامنتہا اقتدار اور اختیار کے بعد جو قانون بنایا ہے' اپنے اوپر بھی اس کو وارد کررہا ہے۔ہمارے ہاں بھی بیٹا اس قانون کے خلاف نہیں ہوسکتا جو ہم نے بنایا ہے۔کیا دلیل ہے صاحب! بیوی نہیں ہے۔وَ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ (6:101) پھر میں بتادوں تمہیں' تخلیق ہر شے کو ہم نے کیا ہے' اب بھی کرتے ہیں' قانون کے مطابق ہوتا ہے۔پہلی شے جو تھی عدم سے وجود میں آئی تھی وہاں تو نہیں تھا لیکن اب ہر بات قانون کے مطابق ہوتی ہے۔اور جب قانون کے مطابق ہے تو ہم اپنے آپ کو بھی اس قانون سے اب مبراء نہیں قرار دیتے۔

ہم نے زمین پر بادشاہ کو خدا کا ایسا سایہ بنادیا کہ جس کی شخصیت ہر قسم کے قانون سے بالاتر قرار پائی

عزیزانِ من! تصور آپ کے ہاں کی ساری سیاست کا' آپ کے ہاں کا حاکم طبقہ' حکمران طبقہ' قانون ساز طبقہ جس کے ہاتھ میں ہوتی ہے' Sovereignty اس کا قانون سے بالا ہونا تو ایک طرف' رہا خدا قانون سے اپنے آپ کو بالا نہیں قرار دیتا۔مصیبت ہمارے ہاں یہ آگئی کہ ہم نے کہا تو یہ کہ اَلسُّلْطٰنُ ظِلُّ اللّٰہِ عَلَی الْاَرْضِ کہ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔اگر یہ چیز دیانتداری سے ہم کہتے تو پھر تو یہ تھا کہ جو خدا خود اپنے بنائے ہوئے قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا' کرسکنے کے اختیارات و اقتدارات رکھنے کے باوجود' اس کا جو سایہ یہاں ہے وہ بھی کبھی قانون کے خلاف نہیں جائے گا۔ہونا یہ چاہیے تھا۔لیکن ہم نے کہا تو یہ' معنی کیے اس کے الٹ' معنی ہم نے یہ کیے کہ یہ سلطان زمین پر خدا کا سایہ نہیں' عرش کے اوپر خدا اس بادشاہ کا سایہ ہے۔جس قسم کا یہاں ہم نے سلطان یا بادشاہ بنایا بعینہٖ اسی طرح کا وہاں خدا بنالیا۔یہاں بھی اس کے اختیارات کی یہ صورت کہ' گاہے بہ سلامے برنجند وگاہے بہ دُشنامے خلعت بخشند۔

ہمارے ہاں تو خدا کا تصور بھی وہی ہے جو ہم نے بادشاہوں کے متعلق قائم کررکھا ہے

مزاجِ شاہاں ہے کہ کبھی کوئی گالی دیتا ہے تو خلعت بخش دیتے ہیں' سلام کرتا ہے تو پھانسی پہ لٹکا دیتے ہیں' کیوں؟ مزاجِ شاہاں ہے صاحب۔جو جی میں آئے وہ کہہ دے جو جی میں آئے کردے بادشاہ آپ کا' یہاں یہ صورت ہے۔یہاں اس کو اس قسم کا بنایا اور اس کے متعلق بھی پھر یہی تصور وہی جو میں ایک ہی شعر پنجابی کا پڑھا کرتا ہوں کہ

اوتھے کی پرواہ اے راکب اوتھے بے پرواہیاں
پھڑ لے عملاں والیاں نوں چھڈ دے او گنہگاراں نوں

ٹھیک ہے جیسا یہاں بادشاہ آپ کا' ویسا وہاں ۔اس بادشاہ تک پہنچنے کے لیے بھی ہزار ذرائع اور دربان اور مقربین کی ضرورت پڑتی ہے' وہاں تک پہنچنے کے لیے بھی راستے میں بیسیوں کھڑے کر لیے مقربینِ بارگاہِ الٰہی' کیوں؟ کہ جی وہ ہماری دعا تو براہِ راست نہیں سنتا نا جیسے یہاں کی وہ درخواست وہاں تک نہیں پہنچتی ''بھاویں ڈبے اچ ای پا آوے جاکے' اگے کھولن والے دی کنجی گواچ جاندی ہیگی اے''۔ وہاں بھی نہیں پہنچ سکتی وقتیکہ وہ Through proper channel نیچے اس کے پہیے لگا لگا کے' یہاں والے کے رشوت کہتے ہیں' اِن کے ہاں نذرانہ کہا جاتا ہے اس کے لیے۔ ہاں۔

خدا کا جو تصور قرآن حکیم پیش کرتا ہے وہ منزہ شکل میں صرف قندیل آسمانی میں محفوظ ہے

''اس کی قیمت کیا ہے'' تھپڑ مارتا ہے کہتا ہے ہدیہ کہو۔ وہ اسے نذرانہ نذر نیاز کہتے ہیں' یہ مقربین ہیں' یہ کچھ بھی دیا جاتا ہے اور پھر یہ جو جی میں آئے' وہاں سے کرالاتے ہیں اگر یہ تصور ہوتا خدا کا جو یہاں اس نے دیا ہے کہ بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (6:101) ٹھیک ہے قانون ساز ہم ہیں لیکن اس کے بعد اتنی بڑی قوتوں کے باوجود ہم قانون کو نہیں توڑتے۔ وَ هُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ (6:101) تخلیق بھی کرتا ہے علم بھی رکھتا ہے بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (6:101) بھی ہے۔ لیکن اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ پتہ ہے آگے کیا کہا ہے؟ آپ یہ جو کتابیں ہیں Religion کے متعلق Philosphy of Religion پہ بڑی کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ اس میں آپ God یا خدا کی Definition دیکھئے سینکڑوں کی تعداد میں آپ کو ملیں گی' کوئی بات پلے نہیں پڑے گی۔ جو کچھ خدا نے یہ کہا ہے یہ ہماری روزمرہ کی کائنات گردوپیش کے متعلق یہ ساری چیزیں کہی ہیں نا' سمجھا تا چلا جا رہا' سمجھا تا چلا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ کہنے کے بعد کہتا ہے ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ (6:102) یہ ہے رب تمہارا۔ عزیزانِ من ! بہرحال جتنا بھی کچھ مطالعہ کر سکا ہوں Comparative study of religion جسے کہتے ہیں تقابلی مطالعہ مذاہب کا' کسی مذہب کی مبینہ آسمانی کتاب میں خدا کے متعلق یہ کچھ کہنے کے بعد یہ فقرہ کہیں نہیں ملتا ذٰلِكُمُ اللّٰهُ (6:102) یہ ہے تمہارا اللہ۔ یہ ہے وہ اور جو کچھ تم کہتے ہو عَمَّا يَصِفُوۡنَ (6:100) اس سے سُبۡحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى (6:100) بلند اور منزہ ہے۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ (6:102) یہ ہے اللہ تمہارا۔ اچھا جی! یہ ہے اللہ ٹھیک ہے جی' آسمانوں پہ بھی وہ ہوا اس نے یہ کچھ پیدا بھی کر دیا پھر اولاد بھی نہیں اپنے ہاں ہو سکتی' یہ سارا کچھ نظم و نسق سب کچھ یہ کیا یہ ہے اللہ' کہنے والے نے کہا تھا کہ

ابنِ مریمؑ ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

قرآن حکیم نے تو اپنی ابتدا رب کے لفظ سے کی ہے اور اس پروگرام کی تکمیل کے لیے ایک نظام دیا ہے

یہ کرے گا تو پھر اس کا ابنِ مریمؑ ہونا کچھ میرے لیے کام آ کھائے گا۔ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ (6:102) ٹھیک ہے اللہ۔ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ (6:102) کہتا ہے تمہارے ساتھ تعلق اس کا یہ ہے رَبُّکُمۡ (6:102) تمہاری نشوونما کا ذمہ دار ہے۔ اب تو جی میں آیا کہ کیوں اس رب کو ماننا چاہیے۔ یعنی اس کا Interest Create کر دیا اس خدا کے اندر' انسان کا۔ تمہارے ساتھ اس کا تعلق ہے رَبُّکُمۡ (6:102) یہ سارا سامانِ نشوونما جو اس نے دیا ربوبیت کا ذمہ لیا یہ سب کچھ کیا۔ کہتا ہے اس کے بعد اس کے لیے شرط ہے۔ کہنے کو تو ایسی کہ صبح سے شام تک ہم ہر سانس میں Repeat کرتے ہیں۔ مشکل اتنی کہ

چوں می گویم مسلمانم بہ لرزم

جب میں کہتا ہوں کہ مسلمان ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں۔ کیوں کانپ اٹھتا ہوں؟

کہ دانم مشکلاتِ لا الہ را

خدا کو ماننے کا مقصد خدا کے دیئے گئے نظام حیات کو عملاً متشکل کرنا ہے

لا الہ کی مشکلات میں جانتا ہوں۔ کہا ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ (6:102) اس کے سوا کسی کا قانون قابل عمل نہیں' کوئی نہیں جس کے سامنے جھکنا' کوئی آستاں نہیں جس کے سامنے جھولی پھیلاؤ۔ یہ کرو تو پھر تمہارا رب بھی بنتا ہے پھر وہ اللہ کا ماننا بھی کچھ کام دیتا ہے۔ کبھی آپ نے اس پہ غور کیا یہ لفظ جو ماننا آتا ہے عزیزانِ من! 'یہ خدا کو مانتا ہے جی یہ خدا کو نہیں مانتا' بات کیا ہوئی 'مانتا ہے یا نہیں مانتا'۔ کبھی دیکھا آپ نے اس کا کوئی مفہوم ہی ذہن میں نہیں آتا' اس مفہوم پہ کبھی غور ہی نہیں کیا کہ یہ مانتا ہے تو کیا بات ہوئی اور نہیں مانتا تو کیا بات ہوئی۔ اتنی سی بات ہے کہ یہ مانتا ہے کہ خدا ہے وہ کہتا ہے خدا نہیں ہے' کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔ لَاۤ اِلٰـــہَ اِلَّا ہُوَ (6:102) جو اس پہ عمل کرتا ہے اور مانتا ہے وہ خدا کو مانتا ہے' جو اس کے ساتھ کسی اور کو بھی الہ سمجھتا ہے وہ مانتا نہیں۔ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ (6:102) پھر دہرایا اس کو' ہر شے کا خالق۔ خدا کو ماننا لَاۤ اِلٰـہَ اِلَّا ہُوَ (6:102)' کہا اس کا عملی ثبوت کیا ہے؟ فَاعۡبُدُوۡہُ (6:102) محکومیت اسی کی اختیار کرو۔ انہوں نے کہہ دیا کہ ٹھیک ہے فَاعۡبُدُوۡہُ (6:102) کے معنی پرستش اسی کی کرو' سیدھی سی بات ہے۔ اب لا الہ الا اللہ کے معنی ہو گئے وہ اذان جو آپ کے ہاں ملتی ہے۔

ہر اذان میں کلمہ شہادت کی با آواز بلند پکار ایک عظیم نعرہ ہے

اگر کسی کے ذہن میں ہو کہ لَاۤ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کیا ہے' جب وہ مینار پہ کھڑا ہو کے کہتا ہے کہ اَشۡھَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کتنا بڑا اعلان

ہے اس دنیا کے اندر' میں کسی کی حکومت تسلیم نہیں کرتا شہادت دیتا ہوں اس امر کی کہ صرف ایک ذات جس کی حکومت واجب الاطاعت ہے' میں کسی کی نہیں مانتا'۔ اتنا بڑا باغی ہوتا ہے یہ' اتنا بڑا انقلابی نعرہ ہوتا ہے' جسے یہ بلند کرتا ہے بانگ دہل کھڑا ہو کے مینار کے اوپر کہتا ہے۔ اور اب تو اس کہنے والے کو بھی پتہ نہیں ہوتا۔ کسی وقت آپ ذرا غور سے سنئے گا یہ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ عربی قاعدے کے مطابق یہ ہے' میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوائے ہرگز کوئی حکمران نہیں۔ فَاعْبُدُوْہُ وَ ھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ (6:102) بڑی شے ہے۔ اب تو یہ وکیل جو لفظ آیا نا ''اے تے جی چاہندا اے پئی یار! رب واسطے تے نہ ای اوندا تے چنگا سی آ وکیل والی گل جیہڑی اے''۔

صحیفہ فطرت پر عقل انسانی کی پرواز اور خدا کے قانون پر بھروسے کا نتیجہ

عزیزانِ من! بڑی چیز ہے یہ۔ یہ جو نیچے سے راکٹ اڑتا ہے وہ اتنا بڑا جہاز ہوتا ہے' ہمارے تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ یہ راکٹ جو ہوتا ہے جس پہ یہ جاتے ہیں' وہ کیا بلا ہوتی ہے۔ یہاں سے نیچے بیٹھے ہوئے کنٹرول روم کے اندر اڑا دیتے ہیں۔ یہاں سے اس کو جو اتنے لاکھوں میل کی مسافتیں ہیں' کنٹرول کرتے ہیں۔ راستے میں جاتے جاتے یہ انہیں کہتے ہیں جو اندر بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں کہ تمہاری آکسیجن کی ٹینکی لیک کر گئی ہے۔ وہ کہتا ہے جو چلا رہا ہے انجن کہ میں پیچھے جا کے کروں اس کو ٹھیک' کہا کہ تم ادھر چلے جاؤ گے تو یہ کنٹرول انجن کا تمہارے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا' کہنے لگا کہ وہ سو رہے ہیں' انہوں نے کہا ہمیں پتہ ہے' اس نے کہا پھر کیا' کہنے لگے ہم انہیں جگا دیتے ہیں یہاں بیٹھے ہوئے۔ چاند کے اوپر جو اترجاتی ہے گاڑی اس پہ بھی کنٹرول یہ رکھ رہے ہیں۔ یہ جو اتنا قابلِ اعتماد یہ کنٹرول ہے' اتنے بھروسے کے قابل یہ ہے کہ ایک وہ فیل ہو کے بھی آ گیا۔ تحقیق کر لی کہ کہاں نقص تھا۔ اس نتیجے پہ پہنچے کہ یہ قانون کچھ اس قسم کے ہیں یہاں کبھی تو وہ چڑھا دیتا ہے جس کو چاہے آسمان پہ کبھی جی میں آئے تو بیچ میں ہی ٹانگ توڑ کے نیچے پھینک دیتا ہے' بالکل نہیں۔ انہوں نے کہا سوال ہی نہیں یہ قانون تو کبھی کرتا ہی نہیں ہماری اپنی غلطی کہیں رہ گئی ہے اس کے اندر' اس غلطی کو انہوں نے دیکھ لیا اور ٹھیک کر لیا اور دوبارہ چلا دیا اسے۔ کس بھروسے کے ساتھ چلا دیا' یہ جو بھروسہ اس قسم کا نہ ٹوٹنے والا ہوتا ہے لَا انْفِصَامَ لَھَا (2:256) کہ جو بھروسہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا اس قسم کے بھروسے کو وکیل کہتے ہیں۔ وَ ھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ (6:102) ایک وہ ہے بھروسے والی بات ''آ اک ساڈی بجلی ہیگی جے''۔ عزیزانِ من! سورۃ الانعام کی آیت 103 تک ہم نے کہا ذٰلِکُمُ اللّٰہُ (6:102) کی بات تھی یہ ہے تمہارا اللہ اور آگے پھر اتنی بڑی چیز کہہ گیا لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ (6:103) لیکن یہ آئندہ پہ ہم اٹھا رکھتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:1270)

❀......❀......❀

پندرہواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 104 تا 111)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من ! آج نومبر 1971ء کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی آیت 104 سے ہوتا ہے (6:104)۔

خدا تعالیٰ اپنی خدائی کا صحیح تصور قدم قدم پر صحیفۂ فطرت کے مختلف گوشوں کو ابھار کر پیش کرتا ہے

آپ کو یاد ہوگا کہ سلسلۂ مضمون یوں چلا آ رہا تھا کہ پہلے یہ کہا گیا کہ وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ (6:91) ان لوگوں نے خدا کے متعلق صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ اس کے بعد وہ آیات ہمارے سامنے آئیں جن کے متعلق کہا گیا کہ ان سے خدا کی بابت صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ اور آپ کو یاد ہوگا کہ ان آیات میں کہا کیا گیا تھا۔ یہ کارگہٗ کائنات پر صحیفۂ فطرت پر غور و فکر کی تحقیق کی گئی۔ ان میں سے جتنے ان کے نمایاں گوشے ہیں انہیں ابھار کر سامنے لایا گیا۔ اور کہا گیا کہ دیکھو ان میں ہمارے قوانین کس حسن و زیبائی سے کارفرما ہیں، اس عمدگی سے کارگہٗ کائنات چلا جا رہا ہے۔ اتنے بڑے محیر العقول کارگہ کا نظم و نسق اس کا کنٹرول کہا کہ سوچئے اس کے لیے کتنی عظیم قوتوں اور

اختیارات کی مالک ہستی درکار ہوگی۔ اختیارات اتنے لامحدود اور مطلق اور اس کے بعد اپنے اوپر خود عائد کردہ پابندیاں یہ کہ جو قوانین ان کے لیے مقرر کر دیے ہیں، وہ خود بھی ان کو نہیں توڑتا۔ کہا یہ ہے خدا کا صحیح اندازہ۔ یہ سب کچھ کہنے کے بعد کہا تھا ذٰلِكُمُ اللّٰهُ (6:102) یہ ہے تمہارا اللہ۔ اور میں نے عرض کیا تھا کہ اس حتم و یقین کے ساتھ یہ بات گویا اس قسم کی کوئی Description دینا اور اس کے بعد کہنا کہ یہ ہے خدا۔ کہیں آپ کو نہیں ملے گا' یہ صرف قرآن میں آیا ہے اور متعدد مقامات پہ یہ آیا ہے 'یہ ہے تمہارا خدا'۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی دوسرے مقامات میں آیا ہے کہ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ (6:100) اس کے سوا انسان خود اپنے ذہن سے جو کچھ اسکے متعلق کہتا ہے وہ اس سے بلند بالا، مبرا اور منزہ ہے۔ خدا وہ ہے جو خود اپنے متعلق بتاتا ہے کہ میں کیا ہوں۔ اور بنیادی چیز یہی ہے۔

خدا پر وہی ایمان قابلِ قبول ہے جس کی تائید قرآن خود کرے

چند ایک دہریوں کو چھوڑ کر ساری دنیا خدا کو ماننے والی ہے پھر قرآن ان خدا کے ماننے والوں کو بھی کیوں یہ دعوت دیتا ہے کہ تم خدا پر ایمان لاؤ۔ وہ تو ایک طرف رہے وہ تو ان لوگوں کو کہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہیں، انہیں بھی یہ کہتا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (4:136) اے وہ جو دعویٰ کرتے ہو کہ ہم خدا کو مانتے ہیں خدا پر ایمان لاؤ' کیا معنی ہیں اس چیز کے؟ تم خدا کو مان رہے ہو اپنے تصورات کے مطابق، تمہارے ذہن کی کارگہ نے اس کو تراشا ہے۔ وہ خدا خدا نہیں ہے۔ خدا وہ ہے جو اس نے خود بتایا ہے کہ میں کیا ہوں۔ یہ ہے فرق جو وہ تمام دنیا کے خدا کو ماننے والوں سے بھی مطالبہ اور تقاضا کرتا ہے کہ تم خدا پر ایمان لاؤ۔ اس لیے وہ کہتا ہے فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (2:137) اگر یہ لوگ بھی اس طرح ایمان لائیں جیسے تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھو کہ یہ صحیح راستے پر ہیں۔ لہٰذا یہ چیز کہ خدا پرست ہیں دنیا کے' وہ خدا کو مانتے ہیں' قرآن اسے تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے اسے اس طرح سے مانو جس طرح سے کہ اس نے خود اپنے متعلق یہ بتایا ہے۔ یہ ہے خدا کا تصور۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ (6:102) یہ تمہارا رب نہ کہ وہ جو تم اپنے ذہن میں قائم کیے بیٹھے ہو۔ اب یہ آ گیا خدا کا تصور۔ لیکن اس سے کیا خدا کی ذات سمجھ میں آ گئی تمہارے۔ اس کو اچھی طرح سے سمجھ لیجیے کہ ایک چیز ہے ذاتِ خداوندی اور دوسری چیزیں ہیں اس کی وہ صفات کائنات میں جن کی نمود ہوتی ہے۔ وہ خالق ہے جو چیزیں اس نے پیدا کی ہیں اس سے اس کی صفت خالقیت کی نمود ہوتی ہے۔ یہ صفات ہیں اس کی' یہ جتنا کچھ بھی خدا نے اپنے متعلق بتایا ہے' وہ خدا کی صفات ہیں۔

انسان کا محدود ذہن تو خدا کی ذات کا تصور بھی نہیں کر سکتا

ذاتِ خداوندی تو کسی طرح ذہنِ انسانی میں آ ہی نہیں سکتی۔ یہ ایک بنیادی مسلمہ ہے فلسفے کا بھی کہ کوئی Finite کوئی محدود شے کسی Infinite کا تصور نہیں کر سکتی' کسی لامحدود کا تصور نہیں کر سکتی۔ اس لیے ذاتِ خداوندی جو لامحدود ہے اس کا تصور ذہنِ انسانی نہیں

کر سکتا جو محدود ہے۔ خدا خود ہے کیا کیسا ہے' ذات اس کی کیا ہے Essence جسے کہتے ہیں اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں جان سکتا' برتر از قیاس وخیال وگمان ووہم' کچھ نہیں کہا جا سکتا' ذہن انسانی میں آ ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے یہ جو دعوے ہیں خدا کی ذات کی معرفت کے وہ سب توہمات ہیں یاد رکھئے۔ ذاتِ خداوندی کی معرفت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کی صفات سے اس کی پہچان ہو سکتی ہے اور وہ پہچان ہو گی اس کی صفات کی۔ وہ خالق ہے وہ خبیر ہے وہ سمیع ہے وہ علیم ہے کہتے چلے جائیے وہ یہ ہے۔ آپ دیکھئے گا کہ وہ جو ہم کہتے ہیں تو وہ کس کو کہتے ہیں؟ ذاتِ خداوندی کو۔ وہ کیا ہے؟ وہ خالق ہے' تو یہ خالق جو ہے اس کی صفت ہوتی ہے۔ اور جسے ہم کہتے ہیں وہ خالق ہے تو کسی ذہن میں نہیں آ سکتا وہ کسی عرفان میں نہیں آ سکتا' اس کی معرفت نہیں ہو سکتی' اس کو جانا نہیں جا سکتا' اسے پہچانا نہیں جا سکتا چہ جائیکہ اسے دیکھا جا سکے۔ ساری دنیا کے خدا پرستوں نے جو اس کو دیکھنے کا شوق تھا' اسے پورا کرنے کے لیے اسے محسوس پیکروں میں خدا کو ڈھالا۔ یہ بتوں کی شکلوں میں انہوں نے ڈھالا۔ اور آگے بڑھے تو اپنے بڑے بڑے بانیانِ مذہب تھے' انہیں ہی خدا کا اوتار بنا لیا۔ انہیں خود خدا ہی بنا لیا۔ یہ جو محسوسات کا خوگر انسان ہے وہ اس ذات کو کہ جو محسوسات کے پیکروں میں آ ہی نہیں سکتی تھی' اس نے اسے محسوسات کے پیکروں میں لانے کی کوشش کی۔ اپنے ذوقِ تجلی کی تو اس نے شاید تسکین کر لی لیکن آپ سوچئے کہ خدا کو کہاں سے کہاں لے آیا یہ۔ یہ قرآن ہے جس نے یہ کہا کہ یاد رکھئے! جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے' یہ بھی ہماری صفات ہیں جن سے ہم نے یہ کہا ہے کہ ہمارے متعلق تمہیں کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ بات وَ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ (6:91) سے شروع ہوئی تھی۔ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے اس کے متعلق' اندازہ ہی ہے وہ ہے کیا یہ نہیں کوئی جان سکتا۔ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ (6:102) کہا یہ ہے تمہارا رب۔ فوراً اس طرف توجہ گئی کہ ذہن ان کا محسوسات کا خوگر ہے اس کی تلاش کرے گا کہ ہے وہ کیسا پھر' تو فوراً کہا کہ لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ (6:103) کتنی عظیم کتاب ہے عزیزانِ من! کہ اتنا کچھ ہم نے بتا دیا ہے اپنے متعلق' قرآن نے بتا دیا ہے خدا کے متعلق لیکن یہ سمجھ لو کہ نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ یہ میں نے اس کا یونہی ترجمہ 'احاطہ کر سکتی' کیا ہے یہ بھی اس کا صحیح ترجمہ نہیں ہے۔

لفظ درکات اور درک کا لغوی قرآنی مفہوم اور عربی زبان کی انفرادیت

ادراک درک: پھر وہی عربی زبان کی خصوصیت سامنے آ گئی۔ جیسا کہ میں نے کئی بار یہ بتایا ہے اور بار بار بتاتا ہوں ہر درس میں ایک آدھ مرتبہ یہ بات آ ہی جاتی ہے کہ قرآن جیسے لطیف اور بلند حقائق کی حامل یہ عربی زبان ہی ہو سکتی تھی دنیا کی کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی سی باتوں سے دیکھئے کہ یہ بلا تھے کیا۔ ایک ان پڑھ سی قوم' علم وتہذیب سے بہت دور' زمانہ بھی جاہلیت کا' باقی دنیا سے کٹا بٹا منقطع ایک ملک' وہ اتنا عرصہ اس زبان کو اس طرح سے بناتے رہے کہ ان میں آپ دیکھئے باریکیاں کتنی تھیں۔ یہی لفظِ درک میرے سامنے آیا ہے۔ سیڑھی' اس کے ڈنڈے ہوتے ہیں انگریزی میں بھی ان کو Steps کہا جاتا ہے۔ نہ ہمارے ہاں نہ انگریزی

میں نہ کسی زبان میں قطعاً اس کا فرق نہیں ہوتا کہ وہ جو اوپر کی طرف لے جانے والے ڈنڈے ہوتے ہیں ان کے متعلق کچھ اور کہا جائے اور نیچے کی طرف لانے والے جو ہیں ان کے متعلق کچھ اور کہا جائے' کہیں ہے نہیں یہ' وہ ڈنڈے ہی ہوتے ہیں اس کے' زینے کے وہ سیڑھیاں ہی ہوتی ہیں' اس کے Steps ہی ہوتے ہیں۔ لیکن یہ عرب تھے' انہوں نے کہا کہ یہ جو اوپر کی طرف لے جائیں تو ان کو وہ درجات کہتے تھے اور وہی جب نیچے کی طرف آ رہا ہو تو وہ انہیں درکات کہتا تھا۔ ایک ہی شے ہے۔ بات سمجھانے کو تو چھوٹی سی ہے اور اس کے اندر اتنی گہرائیاں ہیں فلسفے کی اور دین کی میں عرض کروں۔ یہ سیڑھی کیا ہے ایک ذریعہ ہے کاہے کا ذریعہ ہے؟ اوپر چڑھنے کا بھی ذریعہ ہے' نیچے اترنے کا بھی ذریعہ ہے۔ ذریعہ ایک ہی ہے یہ اب چڑھنے اور اترنے والے پہ موقوف ہے اس کا جی چاہے تو بلندیوں سے نیچے آ جائے اسی ذریعے سے' اس کا جی چاہے پستیوں سے بلندیوں کی طرف چلا جائے ذریعہ ایک ہی ہے۔ انسان کی ہر قوت ذریعہ ہے دولت ذریعہ ہے۔ اس دولت سے جی چاہے تو آپ غریبوں بھوکوں ناداروں کی ضروریات کو رفع کرتے چلے جایئے۔ اسی دولت سے جی چاہے تو ان کی محنت کا استحصال کر کے Exploite کرتے چلے جایئے۔ وہ درجات ہو جائیں گے' یہ درکات ہو جائیں گے۔ وہی شمشیر آپ کے ہاتھ میں ہے مظلوم کا گلا کاٹ دیجیے' ظالم کے سینے میں گھونپ دیجیے' ایک ہی ذریعہ ہے اس کا' اس کا استعمال ہے جو اس کو کہیں سے کہیں لے جاتا ہے۔ ایک ہی آپ کی قوت ہے جس طرح سے آپ اسے استعمال کرتے ہیں اس کے مطابق وہ جائز و ناجائز' غلط و صحیح' حلال و حرام ہو جاتی ہے وہ شے۔ ایک ہی ذریعہ ہے ایک ہی شے ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ کیا بلا تھے جیسا میں نے عرض کیا ہے۔ ایک ہی ذریعہ ہے۔ ایک ہی سیڑھی ہے' اب یہ آپ پہ موقوف ہے' جی چاہے تو جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے آپ پستیوں سے بلندی کی طرف چلے جایئے' جی چاہے تو بلندی سے پستی کی طرف آ جایئے' سیڑھی تو وہی ایک ہی ہے۔ ہر قوت انسان کی ہر مادی شے جو کائنات میں پیدا کی گئی ہے مقصود بالذات نہیں ہے' وہ صرف ذریعہ ہے Means ہیں کسی چیز کا' جیسے آپ اسے استعمال کر لیں گے ویسے ہی وہ بن جائے گی۔ لفظ درک اور یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جنت کے متعلق تو درجات کہا ہے جہنم کے متعلق درک کہا ہے **فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ** ایک ہی اعمال کی سیڑھی ہے۔ جی چاہے تو جنت کے درجات میں چلے جایئے جی چاہے جہنم کے درکات کے اندر آ جایئے۔ یہیں سے لفظ درک کے معنی گہرائیوں میں اترنے کے پھر لے لیے۔ اب یہ جتنی چیزیں خدا کے متعلق گنائی گئی تھیں وہ سامنے محسوسات کے عالم میں پڑی ہوئی تھیں' فلسفہ چاہتا ہے کہ ان کی گہرائیوں میں جا کے اصلِ حقیقت تک پہنچ جائے' Reality کے متعلق صحیح علم حاصل کرلے' اس کا ادراک حاصل کر لے۔ ہمارے ہاں ادراک کا لفظ Intellect کے معنی میں بولا جاتا ہے یاد رکھئے گا۔ وہ چاہتا یہ ہے کہ یہ جو چیزیں سطحی پڑی ہوئی ہیں ان کے Surface سے ان کے نیچے گہرائیوں میں جا کے معلوم کرے کہ ان کی حقیقت کیا ہے' Reality کیا ہے۔ یہ جو گہرائی میں جانے کا ہے نا یہ ہے لفظِ درک' ادراک جہاں سے لفظ آیا ہے۔

ذاتِ خداوندی کو انسانی آنکھ درکات کی حد تک بھی نہیں دیکھ سکتی جب کہ خدا تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہوتا ہے

کہا کہ تم بہت کوششیں کرو گے اس کے لیے کہ اس کی گہرائی تک پہنچ جاؤ' اس کی اصل اور حقیقت کنہ ذات تک پہنچو۔ کہا لَاتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (6:103) نگاہیں کتنی گہرائی تک ان کو لے جاؤ اس تک نہیں پہنچ سکیں گی۔ صفات کے متعلق اتنا کچھ خود بتایا وہ کچھ بتانے کے بعد کہا ذٰلِكُمُ اللّٰهُ (6:102) یہ ہے تمہارا اللہ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہا کہ اگر تم چاہو کہ تمہاری نگاہیں اس تک پہنچ جائیں جتنا جی چاہے گہرائیوں میں چلے جاؤ تم اس تک نہیں پہنچ سکتے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (6:103) نہیں پہنچ سکتے اس تک۔ اب مادی چیزوں میں تو یہ ہے کہ جسے آپ نہیں دیکھ سکتے اتنی دوری پر ہے وہ آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتی۔ جنگل میں کھڑے ہوئے اتنے دور کوئی انسان ہو کہ جسے آپ نہ دیکھ سکیں تو ٹھیک ہے کہ وہ بھی آپ کو نہیں دیکھ سکتا' یکساں ہوتی ہے دوری دونوں کے لیے۔ کہا یہاں یہ معاملہ نہیں ہے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (6:103) تم تو نہیں اس تک پہنچ سکتے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ (6:103) وہ تو ہر آن تم تک پہنچتا ہے۔ یہ بھی ایک نئی چیز ہے تم تو سامنے والے کو نہ دیکھو وہ تمہیں دیکھے۔ تم ادراک سے اس تک نہیں پہنچ سکتے اور اس سے تم پوشیدہ بھی نہیں رہ سکتے۔ اس کی کیفیت یہ ہے۔ دو لفظ ہیں عزیزانِ من! آگے۔ کہا لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (6:103) نگاہیں اس تک نہیں پہنچ سکتیں' کیوں؟ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ (6:103) اب کیا ترجمہ کروں میں اس کا۔ اس قدر لطیف اس قدر Suttle ہے۔ وہ بھی بات نہیں بنتی Suttle سے۔ بس وہ ہے کہ نگاہیں جس کا احاطہ نہیں کر سکتیں وَ هُوَ اللَّطِيْفُ (6:103) اس لیے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (6:103)۔ اور اگلی بات تھی کہ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (6:103) وہ کیسے تمہارا احاطہ کر سکتا ہے؟ کہا و هو الخبير (6:103) اس طرح سے کرتا ہے۔ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ دونوں ٹکڑے جو پہلے آئے ہیں دونوں ٹکڑوں کی تشریح کر گیا دو صفتیں بیان کرنے کے بعد۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (6:103) اس لیے کہ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ (6:103)۔ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (6:103) اس لیے کہ هُوَ الْخَبِيْرُ (6:103)۔ یہ ہے خدا۔ لہٰذا اگر اس کی ذات کا احاطہ کرنا چاہو تو وہ تو نہیں ہو سکتا۔ اتنی آیات جو بیان کی تھیں اس میں قوانینِ فطرت کارگہ کائنات' محسوس انداز میں اس کی صفات کا جس طرح سے یہاں نمود ہوتا ہے وہ ساری بیان کرتا چلا گیا تھا۔ اب آگے آیا انسانوں کی زندگی پہ۔ خدا کا احاطہ نہیں کر سکتے تو اس کے بعد ہمارا اس کا تعلق پھر کیسے ہو سکتا ہے۔ اس تک نگاہ پہنچ ہی نہیں سکتی' اس کی نگاہیں ہم تک پہنچتی ہیں ٹھیک ہے پہنچیں اس کا تو ہمارے ساتھ کوئی تعلق ہوگا ہمارا اس کے ساتھ تعلق کیسے ہوگا پھر' نگاہیں ہی نہیں پہنچ سکتیں۔ کہا قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ (6:104)۔

انسان کا ذاتِ خداوندی سے باہمی رابطے کا طریق صرف قرآن حکیم سے ہی ممکن ہے' باقی سب باطل ہے

ابصار ہی کا تو ذکر آ رہا تھا اور پھر یہ زبان ملاحظہ فرمائیے ابصار تو بصر ہے نگاہ کی جمع ہے۔ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ

(6:104) بصیرت کی جمع بصائر ہے۔ مادہ وہی ب ص ر ہے۔ بصر ہے کہ وہ نگاہیں ہیں وہ محسوسات میں وہ ابصار ہیں' وہیں سے بصیرت ہے کہ جومحسوس نگاہ کو Eye Sight کو نہیں کہا جائے گا بلکہ فکر اور شعور اور بصیرت عقل یہ تمام چیزیں' اسے بصیرت کہا جائے گا۔ کہا کہ قَدۡ جَآءَ کُمۡ بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّکُمۡ (6:104) تم یہاں ٹھٹک کے رہ گئے تھے کہ ایک ایسی ذات جس تک نگاہ ہی ہماری نہیں پہنچ سکتی' ادراک نہیں پہنچ سکتا' اس کا احاطہ نہیں کرسکتا اب اسکے ساتھ ہمارا تعلق کس طرح سے قائم ہوگا؟ کہہ دیا کہ اس طرح سے ہوگا کہ اس نے اپنی طرف سے تمہارے پاس بصائر بھیج دیے ہیں' وہ چیزیں کہ جن پر غور و فکر کرو تدبر و بصیرت سے دیکھو اس نے تمہاری طرف بصائر بھیج دیے ہیں۔ یہ بصائر قرآنِ کریم ہے۔ متعدد مقامات میں قرآن کے متعلق یہ آیا ہے کہ خدا کی طرف سے تمہارے پاس بصائر آ گئے۔ ایک تو خود قرآن کے متعلق دیکھئے کہ کوئی اس میں الجھاؤ نہیں کوئی' لاینحل مقام نہیں کوئی ایسی جگہ نہیں ہوسکتی کہ جو غور و تدبر کے بعد سمجھ میں نہ آ سکے۔ اس نے تو خود کہا ہے قَدۡ جَآءَ کُمۡ بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّکُمۡ (6:104) اور اگر وہ تاریک کا تاریک ہی رہے' الجھن کی الجھن ہی رہے' وہ بصائر کے دائرے میں آ ہی نہیں سکتی۔ بصائر آ گئے تمہارے پاس۔ اب خدا کا اور انسانوں کا تعلق ان بصائر کی رو سے ہوا۔ جو میں کہا کرتا ہوں ہمارا اور خدا کا تعلق صرف قرآن کے ذریعے سے ہے کوئی اور ذریعہ اس سے تعلق پیدا کرنے کا نہیں ہے۔ یہ جتنے اور دعوے ہیں یہ خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل کرنے کے یہ کشف کے یہ الہامات کے یہ معرفتِ ذات کے' یہ ساری چیزیں اگر ابلہ فریبی نہیں تو خود فریبی ہے اور مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں' اتنا ہی کہوں گا کم از کم قرآن کے خلاف ہے۔ اب اس کے بعد جس کا جی چاہے جو سمجھتا چلا جائے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ وہ ادراک میں نہیں آ سکتا' پہچانا نہیں جا سکتا۔ اس کے اندازے اگر اس کے متعلق لگانے ہوں تو یہ ہم نے جو قوانینِ فطرت دیے ہیں یا یہ جو تمہارے پاس بصائر آ گئے ہیں۔ بس یہ ایک ذریعہ ہے خدا کے ساتھ ہمارا خدا کے خود کلمات کے ذریعے سے اس کی وحی کے ذریعے سے جو قرآن کے اندر ہے اور قرآن سے باہر کہیں نہیں ہے۔ قَدۡ جَآءَ کُمۡ بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّکُمۡ (6:104) یہ آ گئے تمہاری طرف۔

انسان کے لیے اختیار و ارادے کی صلاحیت اور وحی کی روشنی کی اہمیت

اب اس کے بعد اگلی بات پھر انسان کے اختیار و ارادہ کی آ گئی کہ بصائر تو اس نے تمہاری طرف بھیج دیے اس نے سورج روشنی دینے والا پیدا کر دیا۔ یہ چیز کہ اس کے بعد انسان اس روشنی سے فائدہ اٹھا کے دیکھے یا نہ دیکھے' اس پہ جبر اس نے نہیں کیا۔ سورج نکلے اور آپ آنکھیں بند کر کے پڑے رہیں تو سورج آپ کو کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ نہ وہ یہ کرتا ہے جس نے سورج جیسے عظیم القدر جثّہ کو اس کنٹرول میں رکھا ہے کہ وہ ایک سیکنڈ کی دیر نہیں کرتا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ ذرا سو یا رہے کہ ذرا ٹھہر جاؤ میاں' وہ الارم بھی بجے تو اس کو ٹھک کر دے اس کے اوپر' دو منٹ کے بعد سہی ابھی نیند پوری نہیں ہوئی' وہاں یہ نہیں ہوتا۔ سورج کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ وہ جب جی

چاہے جاگے اور جب جی چاہے سویا رہے۔ یہ جن کی خاطر سورج پیدا کیا ہے انہیں اب صاحبِ اختیار کیا ہے پیدا کہ جب جی چاہے سوتا رہے۔ دس بجے تک سوئے رہتے ہیں۔ جو دس بجے تک سویا رہتا ہے اسکے لیے اتنے گھنٹے تو سورج بیکار ہوتا ہے۔ سورج کو تو یہ اس نے حکم دے رکھا ہے کہ وقت پہ چڑھے' اس کے متعلق کوئی اس نے یہ جبر نہیں کیا ہوا کہ اس کو بھی وہ عین وقت کے اوپر جگائے کہ اٹھو' اس کا جاگنا اور سونا اس کے اختیار میں ہے۔ کائنات کے ذرائع تو اس نے پیدا کیے ہیں ان میں سے کسی شے کو اپنے متعلق کوئی اختیار نہیں ہے۔ لیکن انسان نے جو ان ذرائع سے فائدہ اٹھانا ہے اس کے لیے اس کو صاحبِ اختیار بنایا۔ کہا ہمارا کام یہ تھا کہ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ (6:104) ہم یہ بصائر یہ روشنیاں تمہارے پاس بھیج دیتے۔ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ عَمِیَ فَعَلَيْهَا (6:104) اب جو کوئی آنکھیں کھول کے چلے گا اس روشنی کا اسے فائدہ ہوگا' جو آنکھیں بند کرے گا' اسے نقصان ہوگا۔ ہمارا کام یہ تھا کہ روشنی مہیا کر دیں۔ ہم تمہیں مجبور نہیں کر رہے' زبردستی آ کے تمہاری آنکھوں کے پپوٹے نہیں کھول رہے۔ جی چاہتا ہے دیکھ کے چلو نہیں جی چاہتا آنکھیں بند کر کے چلو۔ لیکن یہ سمجھ رکھو کہ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ عَمِیَ فَعَلَيْهَا (6:104) آنکھیں کھول کے چلو گے تمہارا فائدہ ہے حفاظت سے پہنچ جاؤ گے خطرات سے محفوظ رہ جاؤ گے راستہ کھوؤ گے نہیں۔ آنکھیں بند کر کے چلو گے قدم قدم کے اوپر ٹھوکریں کھاؤ گے خطرات ہیں' راستے میں کنواں آ سکتا ہے' راستہ بھی بدل سکتا ہے۔ اس کا نقصان تمہیں ہوگا۔ وَ مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (6:104) ہم داروغہ نہیں ہیں تمہارے اوپر' یہ چیز نہیں ہے کہ اس کے بعد پھر مار مار کے تمہیں صحیح راستے پہ چلائیں۔ راستہ دکھا دینا ہمارا کام تھا' آنکھیں دے دینا روشنی پیدا کر دینا' راستہ نمایاں کر کے سامنے لے آنا اور اس کے بعد پھر چھوڑ دینا۔ جی چاہے تو اسے اختیار کرو اور جی چاہے تو دوسرا راستہ اختیار کر لو۔

قرآن حکیم نے زندگی کے اصولوں کی وضاحت کے لیے تصریف آیات کے اصول کو اپنایا ہے اس میں بڑی حکمت ہے

اب دیکھا آپ نے کہ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ (6:102) کی کیا تشریح ہوتی چلی جا رہی ہے۔ باہر کی دنیا میں وہ تشریح تھی انسانوں کی دنیا میں آ کے یہ وضاحت کر دی۔ کس قدر صاف اور واضح بات ہے۔ اور اسی لیے اس کے بعد اس نے کہا وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ (6:105) کہا بظاہر تمہیں یہ نظر آئے گا اور قرآن کے متعلق عام طور پہ اس حقیقت کو نہ جاننے والے اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اس میں تکرار بہت پائی جاتی ہے بار بار بار بار یہ چیز آتی ہے وہ خود اس کا اعتراف کرتا ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ تکرار نہیں ہے ہم حقائق کے مختلف پہلو بدل بدل کر تمہارے سامنے لاتے ہیں' پھیر پھیر کر بات لاتے ہیں' لوٹا لوٹا کر بات کرتے ہیں۔ یہ ہے جس کو تم تکرار کہتے ہو'

یہ تکرار نہیں ہے بلکہ ایک بات کو سمجھانے کے مختلف انداز ہم اختیار کرتے ہیں۔ایک چیز ہم نے سمجھائی وہ ذرا اونچے ذہن والوں کے لیے تھی پھر ہم اس سے ذرا نیچے لے آئے بات کو' بھئی! یوں سمجھو نا تم جیسے۔ دیکھا کہ اب بھی نہیں سمجھ میں آیا تو اس سے کہا کہ میں تمہیں ایک مثال کے ذریعے سمجھاتا ہوں ٹھہرو ذرا! دیکھو تو سہی یوں ہوا۔آپ روزمرہ یہ کرتے ہیں ہر استاد یہ کرتا ہے۔ایک ہی شاگرد کے ذہن کی مختلف سطحوں میں یا کلاس کے اندر بیٹھے ہوئے مختلف شاگرد جو ہیں ان کی جو سطحیں مختلف ہیں ان کی رو سے وہ ایک ہی بات کو دہراتا ہے لوٹاتا ہے مختلف انداز سے بیان کرتا ہے۔یہ کیوں یہ کچھ کرتا ہے؟ وَ لِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ (6:105) تاکہ یہ اس کا اعتراف کر لیں۔

لفظ درس کا بنیادی مفہوم اور قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق

لفظ یہاں آ گیا درس کا' یہی درس جس میں ہم بیٹھے ہوئے ہیں' پتہ ہے اس کے بنیادی معنی ان لوگوں کے نزدیک کیا تھے۔یہی جو ان کو ان پڑھ اور جاہل عرب کہتے ہیں وہی جن کی زبان بار بار آئے گی۔یہ ہم شہر والے اور ہمارے خاص طور پہ یہ آگے بچے آ رہے ہیں انہوں نے تو شاید کہیں گیہوں کا درخت دیکھا ہی نہیں ہوگا' وہ درخت میں نے خاص طور پہ Inverted Comma میں کہا ہے۔وہ مشہور ہے کہ ہمارے ہاں یہ وہ پوچھتے تھے کہ صاحب گیہوں کا درخت کتنا بڑا ہوتا ہے۔پھر گیہوں کی پکی ہوئی فصلیں تو شاید دیکھی ہوں انہوں نے۔یہ کہ وہ فصلیں کاٹتے ہیں کاٹنے کے بعد اس میں ایک پروسیس آتا ہے اب تو Harvester آ گئے ہیں اس کے ذریعے سے وہ یوں نہیں آتا پہلے وہ آتا تھا۔زمین پہ اس کو پھیلا دیتے تھے اور اس کے اوپر سے بیل چلاتے رہتے تھے سارا دن وہ بیل اس کے اوپر گھومتے رہتے تھے۔بار بار اسی چکر میں وہی بیل' وہی نیچے خوشے اس کے' اسے گاہنا کہتے ہیں۔اگر کوئی فلاسفر ہو تو وہ یہ کہہ دے کہ دیکھئے تو سہی وہ ایک ہی دائرے کے اندر یہ صبح سے شام تک چلاتا رہا اس کی بجائے اگر ان بیلوں کو سیدھا لے جاتا تو شام تک بیس میل کا فاصلہ طے کر لیتا' یہ سعیِ لاحاصل سے فائدہ کیا ہوا کہ ان کو ایک ہی طرح یہ گھمائے چلا جا رہا ہے۔یہ بار بار وہ کیوں اس پہ گھماتا تھا؟ تاکہ وہ دانے جو ان خوشوں کے چھلکوں کے سٹوں کے اندر ہیں وہ چھلے اور دانے الگ الگ ہو جائیں۔یہ جو طریق تھا چھلکوں سے دانوں کو دانوں سے چھلکوں کو الگ کرنا۔چھلکوں کے اندر چھپے ہوئے دانوں کو الگ کرنا گاہنے کے طریقے سے اسے درس کہتے تھے' اسے تدریس کہتے تھے۔کہا یہ جو بار بار لوٹا کے لاتے ہیں اور تم کہتے ہو کہ وہیں گھمائے چلا جا رہا ہے پھر بیلوں کو وہیں لا رہا ہے پھر وہیں لا رہا ہے یہ اس لیے تھا کہ ان الفاظ کے چھلکوں میں معانی کچھ پوشیدہ تھے''بار بار اسی گہائی کتی ایہدی پئی چھلکے وکھ ہو جان تے دانے الگ ہو جان''۔اللہ اکبر۔ عزیزم! وجد آ جاتا اس کتاب کو پڑھ کے۔لیکن اس کے سمجھنے کا طریقہ یہی ہے ایک ایک لفظ پہ رک جایئے۔یہ شاعری نہیں ہے کہ کہیں ایک لفظ لے آئے اور وہاں دیکھا کہ نہیں شعر کا وزن ٹھیک نہیں ہوتا' شہد کہنے سے شعر کا وزن ٹھیک نہیں ہوا' انگبیں کہہ دیا وہی ایک بات ہے۔یہ بات نہیں ہے اس میں۔نگینوں کی طرح ٹکا ہوا ہے ہر جگہ وہی لفظ ہے جو اس نے کہا ہے۔کہا وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ

(6:105) بار بار لاتے ہیں لوٹا لوٹا کے لاتے ہیں تو تمہارے ذہن میں یہ آئے گا کہ یہ تکرار ہے وہیں بیلوں کا گھما دینا ہے ایک ہی جگہ یہ پھرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ کہا یہ اس لیے وَ لِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ (6:105) تا کہ یہ اس کا اعتراف کریں کہ واقعی تم نے ایسا کیا ہے اس سے کہ یہ دانے چھلکوں سے الگ کر دیے ہیں تم نے۔ دیکھا یہ تصریفِ آیات اس کا مقصد کیا ہے۔ پھر مجھے میں بیچ میں لانا پڑتا ہے اس لیے کہ عمر بھر کا طالبعلم ہوں قرآن کا۔ یہ طریقہ تھا قرآن سمجھنے کا جو قرآن نے خود سمجھایا تصریفِ آیات اور یہ درست کہا ہے۔ الفاظ قرآن نے خود یہ بار بار کہا ہے کہ لسانِ عربی مبین میں ہم نے اس کو نازل کیا تو پہلے تو یہ دیکھنا ہوگا آپ کو کہ زمانہ نزولِ قرآن میں یہ عربی جو تھی یہ الفاظ یا مفردات جو تھے ان کے معنی کیا تھے۔ بڑی ضروری چیز ہے کیونکہ قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے تمہاری زبان میں اسے نازل کیا۔ تو اس زبان کے متعلق یہ معلوم کرنا کہ اس دور میں وہ ان لفظوں سے کیا معنی لیتے تھے۔ اور دوسری چیز تصریفِ آیات کہ ایک مقام پہ ایک بات جو اس نے کہی ہے سارے قرآن میں دیکھیے کہ کہاں کہاں اس کے متعلق کچھ اور کہا گیا ہے۔ انہیں سامنے لائیے اور ان الفاظ کے معنی متعین کیجیے اور آپ دیکھیے قرآن کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے عزیزانِ من! جو سمجھ میں نہ آسکے۔ یہ تو بصائر ہیں۔ طریقہ یہ ہے اسکے سمجھنے کا۔

قرآن حکیم کی وضاحت خود خدا کے ذمہ تھی لیکن کن کے لیے اور کس طرح

دیکھا قرآن سمجھایا تصریفِ آیات سے' تصریفِ آیات ہم نے کیوں کی؟ وَ لِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ (6:105) تا کہ الفاظ کے چھلکوں میں سے معنی کے دانے نکھر کے الگ ہو جائیں۔ وَ لِنُبَيِّنَهٗ (6:105) اور اس طرح سے ہم نے اس کو واضح کر دیا ہے۔ خود خدا نے قرآن کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ ہمارے ذمہ تھا اس کا بیان' اس کو واضح کر دینا اس کو ظاہر کر دینا نمایاں کر دینا۔ اس نے اپنے ذمے لیا ہے اس کو۔ تو جو ذمے لیا ہے تو وہ قرآن کے اندر ہی کچھ اس نے کیا ہے نا' خود تو اس نے کہیں کالج کھولا نہیں کہ وہاں وہ کلاس بھی لیتا۔ اللہ میاں۔ کس طریقے سے ہوا؟ بات تو وہ یہ کر گیا اور آخری بات کر گیا اس کے بعد تو اس نے بات ہی نہیں کرنی تھی۔ تو جو کچھ اس نے دعاوی کیے ہیں وہ اسی کے اندر ہونگے اس قرآن کے اندر۔ قرآن کی تبین' قرآن کی جو کچھ وضاحت خدا نے خود کی ہے وَ لِنُبَيِّنَهٗ (6:105) ہم نے اس کو واضح کیا ہے۔ قرآن کے اندر ہی اس کی وضاحت ہے لیکن کن کے لیے یہ واضح کیا ہے؟ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (6:105) اس قوم کے لیے جو علم سے کام لیتی ہے۔ یہ بڑی ضروری چیز ہے عزیزانِ من!۔ اور علم تو آپ جانتے ہیں کسی ایک دور میں محدود نہیں ہو سکتا کسی ایک فرد میں محدود نہیں ہو سکتا' کسی ایک Age میں محدود نہیں ہو سکتا۔ ایک فرد کی عمر کے مختلف حصوں میں علم کی سطحیں مختلف ہونگی۔ ایک زمانے میں مختلف افراد میں مختلف سطحیں ہونگی اور تاریخِ انسانیت میں مختلف ادوار میں علم کی سطحیں مختلف ہونگی۔ اور ایک چیز اصولاً یہ ہوگی کہ جتنا زمانہ آگے بڑھے گا' علمِ انسانی کی سطح بلند ہوتی چلی جائے گی۔ اس لیے جتنا زمانہ آگے جائے گا

قرآن کے حقائق اس کے مقاصد اس کے معانی اتنے ہی زیادہ اورنکھر کرابھر کر سامنے آتے چلے جائیں گے کیونکہ یہ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (6:105) ہے۔ان کے لیے ہے جوعلم سے کام لینے والے ہیں اور علم کسی دور کسی فرد میں محدود نہیں ہوسکتا۔ یہ آ گئے بصائر' یوں یہ سمجھے جاسکتے ہیں ۔تو گویا یہ Acadamic Discussion ہے محض نظری بحثیں ہورہی ہیں کہ ہم نے سمجھ لیا ایک بات کو' بالکل ٹھیک ہے۔خوب سمجھ لیا ہم نے' بس سمجھ لیا۔ کہا یہ مقصود بالذات یہ بات نہیں تھی کہ سمجھ لیا تم نے۔ٹھیک ہے ڈاکٹر نے تمہیں نسخہ دیا دوائی بنا کے دیدی اس کے اوپر ہدایات لکھ کے دیدیں تم نے ڈاکٹر صاحب سے سمجھ لیا کہ مجھے ایک دفعہ پھر بتا دیجیے یہ گولیاں ہر دوسرے گھنٹے' یہ خوراک اس کی درمیان میں' یہ کھانے کے ایک گھنٹے کے بعد اور پھر آٹھویں دن بعد آپ کو دکھانا ہے ٹھیک ہے' اس نے کہا بالکل ٹھیک ہے اور اس کے بعد آ گئے آپ' نسخہ ایک جگہ رکھا شیشی دوسری جگہ رکھی اور اس کے بعد ٹھیک ہے کام کاج اپنا کرتے رہے پھر شام کو بخار اتر جائے گا نا آپ کا؟۔سمجھ تو لیا تھا' بات تو سمجھنے کی نہیں تھی' صرف سمجھنے کی نہیں تھی' سمجھنا تو نہایت ضروری تھا وہاں سے اگر آپ سمجھ کے نہ چلتے' سب کچھ خرید کے چلے آتے تو اس کے بعد آپ دیکھتے نا سمجھی سے وہی نسخہ دیا ہوا یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا (2:260) بخار اترنے کی بجائے سرسام ہوجاتا ہے۔وہاں تو یہاں تک بھی ہوتا ہے کہ کھانے سے پہلے والی چیز کھانے کے بعد دیدی جائے پھر الٹا اثر ہوجاتا ہے۔سمجھنا نہایت ضروری ہے لیکن کیا یہ سمجھنا ہی کافی تھا؟ سمجھنا ہی تو کافی نہیں ہے۔ یہاں یہ کہا لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (6:105) تاکہ وہ سمجھیں اور اس کے بعد کہا اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ (6:106)

قیامت تک کے لیے ایک محفوظ مکمل اور آسان نسخے کے ساتھ دوسرے نسخے کا استعمال ہی تو شرک ہے

بات یہ تھی جس کے لیے سب کچھ کہا گیا تھا کہ خدا کی طرف سے تمہیں ہدایات دی گئی ہیں اب اس نسخے کو استعمال کرو۔اس کا اتباع کرو'اس کے پیچھے پیچھے چلو پھر یہ تمہیں منزلِ مقصود پہ پہنچائے گا۔دیکھتے ہیں کس طرح Step by step (قدم بہ قدم) وہ خود بتاتا چلا جاتا ہے کرنا کیا ہے۔اور آخر میں وہاں تک آ گئے اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (6:106) اتباع کرو۔کس طرح سے اتباع کرو؟ ایسے ہی کہ ڈاکٹر صاحب کی دوائی دیدی اور اس کے ساتھ ہی ایک ہومیو پیتھک کی پڑیا دیدی حکیم صاحب کا نسخہ لیا اس میں بھی یہ کچھ کردیا کہیں سے دم درود بھی کرالیا یہ سارا کچھ ایک وقت میں کرتے رہے۔کہا نہ! لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (6:106) بس اتباع صرف اس کے احکام کا' کسی اور کی بات نہیں کسی اور کو کوئی اقتدار اور اختیار نہیں ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے' توحید' خالص اس کی' یہ کرو۔اور یہ جو اس قسم کے لوگ ہیں یہ بھی کیا وہ بھی کیا۔ یہاں بھی آئے' وہاں بھی آئے تو کہا کہ یہی نہیں کہ تم خود نہ کرو یہ کچھ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ (6:106) ان سے اعراض برتو کہیں ان کے کسی فریب میں نہ آ جاؤ کیونکہ یہ کہتے رہیں گے کہ بھائی صاحب! اتنے سے ہی کافی نہیں ہے کہ آپ نے یہ نسخہ دیدیا اور اس سے آرام ہوا۔ یہ بات نہیں ہے یہ دیکھئے میں وہ بھی کرتا ہوں میں یہ بھی ساتھ کرتا ہوں

میں نے یہ بھی کیا' میں نے وہ بھی کیا اور اس طرح سے یہ ہوتا ہے' اس سے نہ ہوا وہ کرلیا۔ کہا ان کی سنو ہی نہیں بہا دیں گے تمہیں۔ **لا الہ الا ھو** اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔

نظریہ پاکستان کا بنیادی مقصد اور کوئی عملی شکل دینے کا طریق

تو پھر وہی بات آجاتی ہے بار بار' نظریۂ پاکستان کیا ہے؟ چوبیس برس میں دہرائے چلے جارہے ہیں' بات سمجھ میں نہیں آتی۔ نظریۂ پاکستان کیا ہے؟ لَآ اِلٰــہَ اِلَّا ھُــوَ بات ہی ختم ہوگئی۔ یہ ہے نظریۂ پاکستان جس کے لیے یہ مملکت بنائی تھی آپ نے کہ اس خطۂ زمین میں اس کے سوا کسی کا اقتدار و اختیار نہیں ہوگا Sovereignty اس کو Belong کرے گی۔ جس کا عملی ذریعہ اور طریقہ کیا ہے؟ قَدۡ جَآءَکُمۡ بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّکُمۡ (6:104) یہ قرآنِ کریم ہے۔ قرآنِ کریم کی حکمرانی' یہ ہے نظریۂ پاکستان۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَ اَعۡـرِضۡ عَـنِ الۡمُشۡرِکِیۡن (6:106) یہی نہیں کہ خود شرک اختیار نہ کرو بلکہ ان سے اعراض برتو یہ بھی نہایت ضروری ہے۔ کبھی یہ نہ دیکھو یہ دستور بناتے وقت کہ انگلستان کی پارلیمنٹ کا انداز کیا ہے اور امریکہ کا کیا ہے' روس میں کس طرح سے یہ چیز چلتی ہے۔ ٹھیک ہے علم حاصل کرنے کے لیے تو وہ کچھ کرو' اتباع کے لیے نہیں۔ اتباع کے لیے اسی کو دیکھو۔ اس کی جزئیات ہیں' اس کی تشریحات ہیں اس کی وضاحتیں ہیں دنیا بھر کا علم اس کے لیے لاؤ۔ لیکن اتباع تو تم نے اسی کی کرنی ہے۔ اور آگے آئی پھر وہی بات۔ کہا کہ تم نے شرک نہیں کرنا' شرک کرنے والوں سے تم نے اعراض برتنا ہے۔ اور اب آپ نے سمجھ لیا کہ شرک کیا ہے؟ بت پرستی ہی شرک نہیں ہے' کسی غیرِ خداوندی حکم کی اطاعت اور اس کے علاوہ کسی اور کو صاحبِ اقتدار تصور کرنا' عملاً سیاست میں' حکومت میں' مملکت میں' یہ شرک ہے۔

ولوشاء اللہ کے غلط مفہوم کا نتیجہ خدا تعالیٰ پر تہمت ہے

عزیزانِ من! آگے آئی وہی مشکل بظاہر جو آیا کرتی ہے۔ وَ لَوۡشَـآءَ اللّٰہُ مَآ اَشۡرَکُوۡا (6:107) عام ترجمہ جہاں بھی آپ دیکھیں گے' اور اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ شرک نہ کرتے'۔ چلئے صاحب! یہ جتنا کچھ یہاں تک کہا تھا وہ لٹیا ہی ڈوب گئی' اگر اللہ نہ چاہتا تو یہ شرک نہ کرتے' تو پھر انکی ذمہ داری کیا ہے۔ یہاں پھر میں دہرادوں! اور آگے جا کے ایک بات عرض کرونگا کہ شاید آخری مرتبہ یہ الجھنیں اور یہ الجھاوے سامنے آئیں اس کے بعد' پھر نہ آئیں گے۔ وَ لَوۡشَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشۡرَکُوۡ ا (6:107) ''اگر اللہ چاہتا وہ شرک نہ کرتے' خود کہا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو یہ شرک نہ کرتے۔ یہ ہے سورۃ انعام کی 108 آیت اور ذرا آگے چلے جائیے 149 آیت اسی سورت کی سَیَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا (6:148) یہ جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ کہتے ہیں لَوۡشَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشۡرَکۡنَا (6:148) اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔ یعنی وہی الفاظ ہیں جو وہاں کہے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو یہ شرک نہ کرتے۔ خود خدا کہتا ہے یہ' وہی لفظ یہاں

کہہ رہے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے مَآ اَشۡرَکۡنَا ہم شرک نہ کرتے۔ کہنا یہ چاہیے تھا کہ ٹھیک ہے ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو شرک نہ کرتے۔ کہا کَذٰلِکَ کَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِھِمۡ (6:148) یہ بھی جھوٹ بکتے ہیں اس سے پہلے جنہوں نے ایسا کہا تھا وہ بھی جھوٹ بولتے تھے۔ ''ارے آپی تے آکھیا ہیگا تسی' اسی کہیا تے جھوٹ بولنے آں تسی کیندے او تے بڑے سچے ہیگے او''۔ عزیزانِ من! بہت گہرائی میں سوچنے کی باتیں ہیں۔ پھر سن لو وَ لَوۡشَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشۡرَکُوۡا (6:107) اگر اللہ چاہتا تو یہ شرک نہ کرتے۔ وہاں کہا ہے کہ یہ لوگ کہیں گے کہ لَوۡشَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشۡرَکۡنَا (6:148) اللہ اگر چاہتا ہم شرک نہ کرتے۔ کہا یہ مشرک ہیں جھوٹ بولتے ہیں تہمت لگاتے ہیں خدا کے خلاف۔ ایک مقام پہ ہی نہیں متعدد مقامات قرآنِ کریم میں ہے وَقَالُوۡا لَوۡ شَآءَ الرَّحۡمٰنُ مَا عَبَدۡنٰھُمۡ (43:20) یہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم کبھی بھی ان بتوں کی پرستش نہ کرتے۔ مَا لَھُمۡ بِذٰلِکَ مِنۡ عِلۡمٍ (43:20) وہ کہتا ہے یہ کس قدر جہالت کی بات کر رہے ہیں ان کو یہ علم ہی نہیں۔ ابھی آپ نے تو یہ کہا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو یہ شرک نہ کرتے' وہ بھی کہتے ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اب ان کے پیچھے پڑ رہے ہو۔ دیکھ رہے ہیں آپ ان آیات کو۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے یہ ایک دو مقام پہ نہیں ہیں لَوۡ یَشَآءَ اور لَوۡ شَآءَ یہ تو قرآن میں آپ دیکھیں گے ہر چوتھی پانچویں آیت میں یہ کچھ آتا ہے۔ اور اس قسم کی آیتیں ہیں۔

لوشاء اللہ کے سلسلے میں بظاہر قرآن حکیم میں تضاد محسوس کرنے والوں کے لیے علامہ پرویز کی ایک کوشش کا ذکر

یہی وہ مقامات تھے جہاں انہوں نے کہا کہ قرآن میں تو اتنا تضاد ہے ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو یہ کبھی شرک نہ کرتے' اگر وہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا ہم شرک نہ کرتے تو کہتا ہے ہم تمہیں جہنم میں پھینک دیں گے۔ تو پھر یہ کیا چیز ہوئی۔ یہ ہیں وہ مشکل مقامات قرآن کے جن کا تعلق مسئلہ تقدیر سے ہے کہ اگر خدا کی مشیت کے تابع یہ چیز ہے کہ جو وہ چاہتا ہے جس کو وہ ہدایت دیتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا وہ ہدایت پہ نہیں ہوتا۔ سمجھ لیا۔ تو پھر اس کے بعد انسان کا اس میں کیا دخل ہے؟ یہ مقامات ہیں کہ جہاں صرف ہدایت اور ضلالت پہ ہی نہیں' گمراہی اور ہدایت کا ہی سوال نہیں تمام مشکل مقامات۔ وہ چاہتا تو تمہیں اتنا رزق دیدیتا وہ چاہتا تو تمہیں یہ کر دیتا وہ چاہتا ہے تم بیمار ہو جاتے ہو وہ چاہتا ہے' تم صحت مند ہو جاتے ہو۔ یہ دشواریاں آپ دیکھ رہے تھے کہ چلی آ رہی تھیں اور ہر مقام پہ میں کہتا چلا آ رہا تھا کہ ذرا توقف کیجیے تھوڑا سا اور انتظار کیجیے' یہ حل ہو جائیں گے مسائل۔ معاف رکھئے گا پھر وہ میں آنا پڑا کہ اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں میری جبینِ نیاز سجدہ ریز ہے کہ یہ جو مسئلہ تھا یہ جو مشکلیں تھیں' میں نے اپنی بصیرت کے مطابق قرآنِ

کریم کی رو سے حل کر دیا وہ ''کتاب التقدیر'' میری چھپ کر آج باہر آ گئی۔اس دوران میں یہی میں کہہ کے آگے بڑھتا رہا کہ تھوڑا سا اور توقف کیجیے گا۔

ہزار برس سے تقدیر جیسے الجھے ہوئے اہم مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں علامہ غلام احمدؒ کی سعی و کاوش کی تفصیل

میں نے جب سلسلۂ معارف القرآن کی آخری کڑی کتابِ آخرت یعنی ''جہانِ فردا'' لکھ لی تو میں نے سمجھا تھا کہ اب مجھے اس سلسلے میں کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔لیکن اس کے بعد میں نے یہ دیکھا جتنے میرے پاس سوالات آتے تھے اس میں سے کم از کم نوے فیصد اسی کے متعلق ہوتے تھے کہ پھر یہ کیا چیز ہے' انسان کی ذمہ داری اور خدا کی مشیت میں کیا تعلق ہے۔تو اسی لیے میں نے عزیزم پھر ضروری سمجھا کہ نہیں! یہ کچھ کرنا چاہیے۔بڑا ہی مشکل مسئلہ ہے مسلمانوں کے نزدیک ہی نہیں بلکہ اہلِ علم جانتے ہیں کہ یہ سقراط اور Plato کے زمانے سے بات چلی ہوئی آ رہی ہے۔دنیا کے ہر مذہب اور فلسفے میں یہ الجھنیں چلی آ رہی ہیں۔اور پھر ہمارے ہاں بھی اس ہزار برس میں مسلمانوں نے بھی تقدیر کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔لیکن آپ ان میں سے جہاں بھی دیکھیں گے اور میں نے تو انہیں دیکھا ہی تھا' کچھ تو وہ گذرے جنہوں نے یہ کہہ کے پیچھا چھڑا لیا کہ یہ آیتیں منسوخ ہیں۔یہ تو تصور بنیادی طور پہ غلط ہے یعنی یہ اپنے عجز کا اعتراف ہے جس کے متعلق ہم خدا کی طرف ایک طعن دیتے ہیں کہ اس نے ایسا کچھ کیا ہے قرآن میں آیتیں لکھ دی ہیں یہ خود کہا نہیں' منسوخ ہیں۔لیکن کیا کریں یعنی یہ تضاد رفع نہیں ان سے ہوتا تھا۔تو اس کا انہوں نے طریقہ یہ سوچا اپنے ذہن میں کہ ان کو منسوخ قرار دید یا جائے کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔لیکن بانس تو ہے موجود ہے۔کہتے ہیں یہ بانس بانسری بجانے کے لیے نہیں ہے''ثواب واسطے رکھیا ہویا ہے''۔نہیں عزیزانِ من! وَ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدۡرِہٖۤ (6:91) خدا کے متعلق انہوں نے اندازہ ہی صحیح نہیں لگایا۔بعض تھے وہ جو اس میں گھبرائے' ہمارے ہاں ایک مسلک چلا آتا ہے کہ نہ جبر نہ اختیار اس کے بین بین۔ارے کچھ تو بات صاف کرو یعنی کیا تمہارا خدا یہ تعلیم دے رہا ہے۔وہ پوچھتے یہ ہیں کہ بتائیے ہم صاحبِ اختیار ہیں کہ مجبور ہیں۔لیکن وہ کہہ یہ رہے ہیں کہ نہ مجبور ہیں' نہ صاحبِ اختیار ہیں بین بین ہیں کچھ اس کے۔می نہ سزد خدائے را۔اعتراف کرو کہ ہم نہیں بات سمجھ سکے۔خدا کی طرف منسوب کرتے ہو اس قسم کی تعلیم کو!!۔کسی انسان کی کتاب میں یہ بات اگر آپ کو ملے کہ اٹھا تھا اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اور آخر میں جا کے کہا یہ کہ نہ یہ نہ یہ نہ الا الذی بین بین لٹکے چلے جاؤ' یہ کیا کتاب اس نے دیدی ہمیں۔انسان کی تصنیف کے متعلق آپ یہ نہیں کہتے خدا کی کتاب اور کتاب بھی وہ کہ جس کے متعلق میں کہا کرتا ہوں کہ 'ترا کشید او دست از قلم کشید خدا' آخری کتاب جس کے بعد قلم رکھ دیا کہ اب مجھے ضرورت نہیں انسانوں کے لیے کچھ اور لکھنے کی۔اس کتاب کے متعلق یہ چیز کہ ہر چوتھی پانچویں آیت میں یہ وہ مسئلہ لے کے آتا ہے لو یشآء کا اور آخر میں جا کے آپ کہتے ہیں کہ اس نے بتایا یہ ہے کہ نہ جبر ہے نہ اختیار ہے۔می نہ سزد خدائے را۔عزیزانِ من! یہ مشکلات

تھیں قرآن کی ان آیات کی۔ بہرحال اب اپنے منہ سے کچھ کہنا تو زیادتی ہے وہ چیز تو سامنے آ گئی اب مجھے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔سوائے اسکے کہ بہرحال جہاں تک میرے اپنے قلب کی تسکین کا تعلق ہے' اس کے لکھنے کے بعد فی الواقعی میں قدم قدم پہ خدا کی بارگاہ میں سجدہ کرتا ہوں کہ وہ مسئلہ جو کم از کم میں نے بھی دیکھا' نہ بقراط اور سقراط کے زمانے سے فلسفے کی رو سے سمجھ میں آ رہا تھا' نہ ہمارے ہاں سے جو کچھ لکھا لوگوں نے۔قرآن کی رو سے اس سے بات سمجھ میں آئی تھی۔کم از کم میری تسلی اس میں یہ ہوگئی ہے کہ کوئی آیت قرآن کی ایسی نہیں اس کے اندر جس میں تطبیق پیدا نہ ہوگئی ہو اور جس کے اندر دونوں چیزیں اکٹھی کر کے یہ دوٹوک بات سامنے نہ آ گئی ہو کہ انسان مجبور ہے یا صاحبِ اختیار ہے۔اس کتاب میں ساڑھے نو سو آیات ہیں یا آیات کے حوالے' ایک ہی تقدیر کے مسئلے کے اوپر اور ساری متضاد آیات ہیں۔اس قسم کی آیتیں وَمَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ مُّضِلٍّ (39:37) مَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ (7:186) ہر خطبے میں آپ دیکھیں گے یہ دہرائے جاتے ہیں الفاظ۔جس کو خدا ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا جس کو خدا گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔یعنی اتنی Definetly حتمی طور پہ یہ چیزیں قرآن کے اندر ہیں۔ہے مشکل مسئلہ یا نہیں۔اور اسکے بعد اس کو یہ کہنا کہ جو غلط راستے پہ چلے گا ہم جہنم میں ڈال دیں گے اسے۔میں کہہ یہ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا کرمِ بے پایاں ہے بہرحال میرے حال پہ کہ میں جو دیکھتا تھا کہ اتنی دشواری قرآن کے سمجھنے میں آ رہی ہے' مجھے کہا جا رہا تھا کہ Suggest کرو کوئی کتاب جہاں سے اس مسئلے کو دیکھیں۔کوئی کتاب میں Suggest نہیں کر سکتا تھا۔تو وہ ایک بات بہرحال اس کا کرم ہے اور وہ چاہے تو وہ میں یہ بھی Inverted Commas میں کہتا ہوں کہ سوکھی ہوئی لکڑی کو ایک اژدھا بنا دے جس سے وہ کام لینا چاہے۔تو یہ چیز جو ہے یہ بہرحال میں نے کر دی ہے۔تو اب مجھے درس میں بھی ہر مقام پر یہ نہیں کہنے کی ضرورت ہوگی کہ ذرا توقف کیجیے پھر اس کو بھی سمجھایا جائے گا۔یہ باتیں صاف ہوگئیں۔

لفظ ولوشآء کا قرآنی اور لغوی مفہوم

وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشۡرَكُوۡا (6:107) ہم چاہتے تو (یہ ترجمہ میں کر رہا ہوں وہاں لکھا ہوا ہوتا ہے) یہ بات نہیں ہے۔بات وہی ہے جو میں اس کا مفہوم بیان کرتا ہوں کہ اگر ہماری مشیت میں یہ ہوتا ان کی تخلیق سے پہلے کہ یہ سارے کے سارے انسان ایک ہی راستے پہ چلتے تو ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ ہم ان کو بناتے ہی بھیڑوں بکریوں کی طرح اس طرح سے کہ جس راستے پہ چلنے کے لیے ان کو بنایا جاتا یہ اسی کے اوپر چلتے جاتے ان کو اختیار ہی نہ ہوتا دوسرا راستہ اختیار کرنے کا۔وَ لَوۡ شَآءَ (6:107) کے معنی ہیں تخلیقِ فطرت سے پہلے جب ہم طے کر رہے تھے کہ کسے کس قسم کا بنائیں۔اس لیے یہ بات نہیں ہے۔بات ہو رہی تھی وَ مَاۤ اَنَا عَلَيۡكُمۡ بِحَفِيۡظٍ (6:104) خدا نے کہا تھا ہم تمہارے اوپر داروغہ نہیں ہیں ہم نے یہ روشنی دیدی تمہیں آنکھیں دیدیں۔فَمَنۡ اَبۡصَرَ فَلِنَفۡسِهٖ

وَ مَنۡ عَمِیَ فَعَلَیۡهَا (6:104) جو دیکھ کر چلے اپنا فائدہ کرے جو آنکھیں بند کر کے چلے اپنا نقصان کرے۔ ہم اس کے اوپر داروغہ اس کے بعد نہیں ہیں کہ مار مار کے تمہیں ایک راستے پہ چلائیں۔ یہ چیز تھی جو کہی تھی۔ یہاں پھر یہ کہا کہ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشۡرَکُوۡا (6:107)۔

رسول خداؐ کی ذمہ داری دوسروں تک پیغام پہنچانا ہے کسی سے حکماً کسی چیز کا منوانا نہیں

جب ہم یہ طے کر رہے تھے کہ کس مخلوق کو کس قسم کا بنایا جائے' وہاں طے یہ کیا تھا کہ انہیں ایسا نہ بنایا جائے کہ ان کے اختیار کو سلب کر کے ایک ڈنڈے والا پیچھے ان کے وہ مار مار کے ان کو چلائے۔ وَ مَا جَعَلۡنٰکَ عَلَیۡهِمۡ حَفِیۡظًا (6:107) وہاں تھا وَ مَآ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِحَفِیۡظٍ (6:104) ہم تمہارے اوپر داروغہ نہیں ہیں۔ رسول سے کہا گیا اے رسول! تو بھی ان کے اوپر داروغہ نہیں ہے تیرا کام صرف ان کو پہنچا دینا ہے کہ یہ ہیں خدا کی طرف سے جو بصائر آئے ہیں۔ وَ مَآ اَنۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِوَکِیۡلٍ (6:107) نہ تو داروغہ ان کے اوپر نہ ان کی وکالت کے لیے تو ان کے اوپر ہے۔ یہ ہم نے نازل کر دیا' ہم بھی اتنا ہی کرتے ہیں' تم نے پہنچا دیا تمہارا بھی یہ فریضہ تھا۔ اب خود یہ ان سے فائدہ اٹھائیں ان کی مرضی ہے' نہ اٹھائیں ان کا نقصان ہو جائے گا۔ نہ تم ذمہ دار نہ ہم ذمہ دار اس چیز کے۔ سب کچھ ہم نے ان کو دیدیا اب تم ان کے لیے ذمہ دار نہیں ہو۔ اب یہ دوسرے آ گئے بتوں کو پوجنے والے غلط راستے پہ چلنے والے۔ غلط تو ہیں وہ' اب یہ دیکھئے انسان کی تمدنی زندگی میں کس قسم کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ ہم تو بڑے فخر سے کہتے ہیں بت شکنی جسے ہم کہتے ہیں آیا اور اس نے مار مار کر کے جناب ان کے بتوں کو توڑ دیا۔ توڑ دینا تو ایک طرف قرآن کہتا ہے کہ اب یہ چیز تو ہم نے بتا دی کہ یہ بالکل غلط ہے کہ یہ اس قسم کے محسوسات کے پیکروں کو' اپنے ہاتھوں کی تراشیدہ مورتیوں کو پوجتے ہیں' ان کو خدا بناتے ہیں' بالکل غلط اور باطل ہے۔ لیکن اس کے باوجود وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (6:108)۔

دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانے کا طریق' انہیں گالیاں دینے میں نہیں ہے

یاد رکھو! یہ غلط ہے باطل ہے لیکن انہیں گالی نہ دینا۔ چاہتے تو یہ ہو نا کہ غلطی ان کی ان پر واضح ہو جائے' قائل ہو جائیں' صحیح راستے پہ آ جائیں' کبھی کوئی شخص گالی دینے سے بھی تمہارے ساتھ صحیح راستے پہ آتا ہے' اس کو تو اور چڑ ہو جاتی ہے۔ تم اسے گالی دیتے ہو وہ تمہارے باپ کو گالی دیتا ہے۔ گالیاں دے کے کسی کو آپ اپنے ساتھ متفق کر سکتے ہیں؟ طریقہ ہی غلط ہے' اسے اور نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور انتقام کا جذبہ ابھر آتا ہے۔ قرآن میں اس کی مثال ہے کہ تم اسے گالی دو گے' وہ جو کہتے ہیں کہ تو بے ایمان ''اگوں کہندا اے توں بے ایمان' تیرا پیو بے ایمان''۔ تو بے ایمان کہنے سے تو برابر ہوا تو وہ جو تھا اندر کا غبار وہ تو نہیں' نہ نکلا ''تیرا پیو بے ایمان''۔ کہتا ہے کہ ان کو

گالی نہ دینا اس لیے کہ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (6:108) تم ان کو گالیاں دے رہے ہو یہ جہالت میں خدا کو گالیاں دینے لگ جائیں گے۔ ''پڑے گی نا مصیبت فیر''۔اور بات اس کی تو ہے نہیں کہ اس سے تم ان کو قائل کرلو گے اس سے غلط راستہ چھڑا دو گے۔

اس قسم کے ناگفتہ بہ حالات میں محفوظ رہنے کا قرآنی طریق' جہالت کو ختم کرنے میں ہے

غلط راستہ چھڑانے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔یہ مناظرے اور یہ مباحثے ہمارے ہاں جو ہوا کرتے تھے کبھی کسی مناظرے میں یہ نہیں ہوا تھا کہ آخر میں آ کے کسی فریق نے یہ مان لیا ہو اکہ ہاں بالکل ٹھیک ہے آپ سچے ہیں' ہم جھوٹے تھے۔کبھی یہ نہیں ہوا' بیس برس تک تو ہم بھی مناظرے کرتے رہے تھے۔انجام کیا ہوتا تھا؟ ہم ان کو گالیاں دیتے تھے۔وہ ہمارے ماں باپ کو گالیاں دیتے تھے' گالیاں ہی انجام ہوتا تھا ہمیشہ۔آ ہاہاہا!! کیا تعلیم ہے صاحب قرآن کی۔غلطی پہ ہیں باطل ہیں ٹھیک ہے تو داروغہ تو نہیں ہے اور یاد رکھنا یہ بات بھی غلط ہے' منانے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ان کو گالیاں دینا شروع کرو۔تم ان کو گالیاں دو گے یہ تمہارے خدا کو گالیاں دیں گے۔کہا کیوں ہے یہ چیز؟ کہا جہالت ہے۔اور جہالت میں ہوتا یہ ہے كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ (6:108) جب تک حقائق سامنے نہیں آتے' ہر شخص جہالت کی بناء پر جو کچھ کرتا ہے' اچھا سمجھ کے کرتا ہے۔سمجھ کی بھول ہے' نگاہ کی غلطی ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک کسی کی عقیدت کا معیار بذاتِ خود ایک قابلِ غور مسئلہ ہے

ذرا دیکھو تو سہی تم اس عقیدت سے شاید مسجد کی طرف نہیں آتے جس عقیدت سے یہ بت پوجنے کو جاتے ہیں۔اور اب تو وہ ہندو ہیں نہیں ورنہ آپ دیکھتے یخ سردی دسمبر جنوری کی راتوں میں تاروں کی چھاؤں میں یہ خود لالے ہی نہیں ان کی عورتیں چار بجے آدھی رات کو اٹھ کے ایک ململ کی سی دھوتی ہوتی تھی جس میں انہوں نے اوڑھا ہوا ہوتا تھا اور جاتی تھی دریا پہ اشنان کرنے کے لیے۔کیونکہ ان کے ہاں بھگتی اور پوجا کے لیے اشنان کرنا ضروری تھا۔اس وقت اس ٹھنڈے پانی سے اشنان کر کے اور وہ یوں کانپتی ہانپتی آتی تھی۔لیکن اس انتظام کے ساتھ ان کی وہ بھگتی پھر وہ پھول لانا' وہاں سے پانی وہ لاتی تھی دریا کا آ کے وہ چھڑکتی تھی۔یعنی جہاں تک عقیدت کا تعلق ہے وہ ان نمازیوں سے کہیں آگے ہوتے تھے ان چیزوں کے اندر جو میں کہہ رہا ہوں۔یہاں والے تو اس سردی کے موسم میں چار بجے اٹھ کے نہانا' وہ تو یہاں کہا کرتے تھے یا رٔ یہ کراڑ جو ہیں یہ گندے کہیں کے نہ ہوں' یہ اب نہائے ہیں نا صبح تو پھر یہ دوپہر کو نہیں نہائیں گے شام کو نہیں نہائیں گے رات کو نہیں نہائیں گے پھر کل کہیں جا کے اور صبح کو نہائیں گے اور ہم لوگ روز جمعہ جمعہ روز جمعہ جمعہ۔''تے آپ روز جمعہ جمعہ روز جمعہ جمعہ''۔میں کہہ یہ رہا تھا عزیزانِ من! ٹھیک ہے نگاہوں کی غلطی ہے جو کر رہے ہیں۔لیکن وہ اس حسنِ عقیدت سے کرتے تھے کہ واقعی خدا کو پوجنے والوں کو بھی وہ کم نصیب ہوتی تھی۔اس لیے کہا کہ اگر تم ان کو گالی دو گے تو وہ شے تو ان کی نگاہوں میں اتنی

مزین اور حسین ہے کہ اس سے وہ نہیں چھوڑیں گے۔ **كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُم** (6:108) بات ساری ہوگی یہ کہ آخرالامر **ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِم مَّرْجِعُهُم فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (6:108) اعمال کے نتائج جب سامنے آئیں گے تو اس وقت یہ پتہ چل جائے گا کہ یہ غلط تھا یہ صحیح تھا۔

قرآن حکیم باہمی طور پر مباحثہ یا مناظرہ کرنے کی بجائے' دلائل کی بنا پر عمل کی دعوت دیتا ہے

طریقہ یہ ہے کہ تم بھی اپنی بات کے سچا ہونے کو یوں نہیں ثابت کر سکتے کہ یا ان کو گالیاں دینا شروع کر دو یا یونہی دعوے کرتے چلے جاؤ۔ طریقہ ایک ہی ہے عزیزانِ من! جسے Pragmatic Test کہتے ہیں۔ **قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ** (6:135) کتنی عجیب چیز ہے۔ کوئی مناظرہ نہیں کوئی مباحثہ نہیں' تم یہ چیز کہتے ہو کہ میں یہ بیج بوؤں گا اس کھیتی کے اندر' تو پچاس من گیہوں آئے گا' میں یہ کہتا ہوں کہ اس سے دس من بھی نہیں ہوگا بیج لیجیے اور یہ کھاد ڈالیے سو اسو من ہوگی۔ کہتا ہے نہ تو غصے میں آ کے اس کو گالیاں دینے کی ضرورت ہے نہ یہ کوئی ایسی چیز ہے کہ ان کو فلسفے کے دلائل سے سمجھاؤ۔ کہو کہ اپنے کھیت میں تم اپنا بیج بوؤ اور مجھے میرے کھیت میں بیج بونے دو۔ شرط یہ ہے کہ نہ میں اس میں مداخلت کروں گا نہ تم اس میں مداخلت کرو۔ مجھے اپنے طریق سے یہ کرنے دو تم اپنے طریق سے یہ کرو۔ چھ مہینے کے بعد بات سامنے آجائے گی کون سچا ہے کون جھوٹا ہے۔ قرآن نے یہ طریق بتایا ہے (39:39)۔

خدا کا دین تو آج بھی اپنی جگہ سچا ہے البتہ ہم ہی سچے نہیں ہیں

عزیزانِ من!۔ یہ جو آپ دعویٰ آج کر رہے ہیں ساری دنیا میں کہ اسلام ہی سچا دین ہے اور تمام نوعِ انسان کی مشکلات کا حل اس کے سامنے ہے۔ یہ جو اس نے Pragmatic Test بتایا تھا' پیش کر سکتے ہیں اپنے آپ کو ان کے سامنے؟۔ ہم اپنے آپ کو جو پیش کرتے ہیں' اس کا نتیجہ ہے کہ دنیا اس وقت اسلام سے دور بھاگی ہوئی ہے۔ ''اسی نہ ہوندے جوٹھاں وچ' تے ساری دنیا مسلمان ہوئی ہوئی ہوندی''۔ انسانیت کو تو کوئی دوسرا راستہ مل ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ آتے ہیں اس راستے کی طرف' جب یہ دیکھتے ہیں اس کو ذہنی طور پہ کہ کتنے عجیب اصول دیتا ہے پھر وہ اس کے بعد دیکھتے ہیں ہمیں کہ یہ قومیں ہیں۔ وہ تو یہ سمجھتی ہیں کہ یہ ان اصولوں کے اور پر عمل کرنے والے ہیں' یہ وارث ہیں' یہ ہیں اس کے نام لینے والے' جیسے ہم کمیونزم یا سوشل ازم کے لیے چائنا کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہ ہماری طرف جب دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ''اے روٹی تو ساتھوں منگ کے کھاندے ہیگے'' اور دعویٰ ان کا یہ ہے کہ ہم دنیا کی مشکلات کا حل دیتے ہیں تمہیں۔ ہمیں دیکھ کے وہ اسلام سے برگشتہ ہو جاتے ہیں۔ تو قرآن نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں آؤ گے تم تو یاد رکھو! ایسے لوگ آئیں گے کہ جو اپنے جرموں کا بوجھ بھی لادے ہوئے ہونگے اور دوسروں کے جرائم کا بوجھ بھی اپنی گردن پہ لادے ہوئے ہونگے (16:25)۔ ہم

ہیں وہ جو اپنا بوجھ بھی لادے ہوئے ہیں اور یہ قومیں جو ہمیں دیکھ کے اسلام سے برگشتہ ہو رہی ہیں اور دور ہٹ رہی ہیں' ان کے جرائم کا بوجھ بھی ہماری گردن کے اوپر ہے۔ کہا اس لیے گالیاں والیاں نہ دو اس سے نہیں کام چلے گا۔ Pragmatic Test ہے' بن کے دکھاؤ ان کو خود چلے آئیں گے۔ Pragmatic Test تھا۔

ملتِ اسلامیہ کے لیے لازم ہے کہ وہ آج ایک بار پھر وحی کے عطا کردہ خالص بیج کو اپنے ہاں دوبارہ کاشت کرے

بعد قرآن نے کہا کہ **اِذَا جَـآءَ نَـصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ** (110:1) دیکھتے ہیں کہ کیا صورت ہوگی **وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْـنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا** (110:2) تو دیکھ رہے ہے کہ دنیا گروہ در گروہ آ رہی ہے تمہاری طرف۔ کونسے مناظرے اور مباحثے کیے تھے جس کی وجہ سے یہ دنیا آ گئی تھی؟ صرف اس پہ عمل کر کے دکھا دیا تھا۔ پہلی دفعہ محکمہ زراعت کو یہ مشکل پیش آئی تھی یہ بتانے کے لیے یہ جو بیج لائے ہیں ہم یہ اتنی فصل دیدے گا۔ قائل کرنے کے لیے دشواری ہو رہی تھی تجربہ اس پہ ہوا نہیں تھا یہ ایمان بالغیب کا مرحلہ تھا جس نے ان پہ یقین کر لیا اور بو دیا اصل چیز تو اس کے بعد کی تھی۔ پہلے سال جب بونے کے بعد انہوں نے بتایا ہے اس کے بعد آپ دیکھیں گے اب وہ پرانا گیہوں کسی کسان کو نہیں مل رہا' چپہ چپہ زمین میں وہی بیج بو رہا ہے۔ یہ محکمہ زراعت کے دعاوی کی صداقتوں کا ثبوت کیا ملا؟ وہ جو ایک سال کی فصل تھی سو من ہوگئی۔ اور اگر وہ ان کے کہنے کے مطابق جو وہ بوتے تو وہ ساری کی ساری فصل ماری جاتی ''تے جوتیاں مار کے پنڈوں کڈ دیندے اوہناں نوں''۔ جو ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ **ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِـمْ مَّـرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (6:108) جہاں یہ آیتیں آئیں ہم نے اٹھا رکھا قیامت پر' نہ آج یہاں بیٹھے ہوئے وہاں کا ہم دیکھ سکتے نہ' وہاں سے کوئی لوٹ کے آئے۔ ایمان ہے اس کے اوپر ہمارا کہ وہاں یہ ہے لیکن جہاں قرآن اس کی دلیل کہتا ہے یہ **اِعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ** (6:135) وہ تو کہتا ہے کر کے دکھاؤ ابھی نتیجہ نکل آئے گا۔ یہاں بھی یہ نتائج نکلتے ہیں۔

اقبال کے الفاظ میں حقیقی علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

عزیزانِ من! اس سے دنیا آتی ہے آپ کی طرف۔ لیکن ہم ہیں کہ فریب دیے ہوئے ہیں کہ یہ جو نتائج ہمارے یہاں نکلے ہوئے ہیں یہ جو کچھ ہوا ہوا ہے اس کے لیے یہ دنیا جو یہ ان کتوں کی ہے کافروں کی ہے' مسلمان کی دنیا وہاں رکھی ہوئی ہے۔ اور وہ کہتا ہے کہ **وَمَـنْ كَانَ فِىْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى** (17:72) یاد رکھو! جو یہاں کا اندھا وہی وہاں اندھا ہوگا' یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہاں اندھا ہو' اوتھے جا کے سجا کھا ہو جائے''۔ **بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (6:108) کہا بصائر آ گئے' حقائق آ گئے' دلائل سے عملی طور پر ان

چیزوں کو سامنے لانے سے ان کے ثبوت ملیں گے۔ بات وہاں شروع کی تھی کہ یہ خدا کے متعلق صحیح اندازہ نہیں لگا رہے۔ کہا کہ چاہتے یہ ہیں کہ خدا ہر بات کچھ اچھنبے سے' شعبدہ بازی سے کر کے دکھایا کرے۔ کہا اندازہ نہیں انہوں نے صحیح لگایا خدا کے متعلق۔ سوال یہاں اچھنبے اور شعبدہ بازی کا نہیں ہے۔ جو کچھ کرنا ہے اس میں قوانینِ فطرت کا تعلق ہے۔ یہ کرو گے تو یہ نتیجہ نکلے گا۔ سمجھنا ہے تو علم کی رو سے سمجھنا ہوگا دلائل کی رو سے سمجھنا ہوگا' دونوں ہی طریقے ہیں۔

پستی کی انتہا ہم قرآن حکیم میں سے نبی اکرم ﷺ کے بال نکال رہے ہیں جب کہ قرآن حکیم نے حقائق سے آگاہ کیا ہے

اس میں شعبدہ بازی کا کوئی مقام ہے ہی نہیں کوئی گنجائش ہی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ کہتے ہیں وَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ لَئِنۡ جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ لَّيُؤۡمِنُنَّ بِهَا (6:109) یہ بار بار آ کے کہتے ہیں کہ یوں نہیں' ایک دفعہ کسی طرح سے تم بالوں سے دودھ نکال کے بتاؤ دیکھو ہم کس طرح سے ایمان لاتے ہیں بار بار آ کے یہ کچھ کہتے ہیں۔ ہم یہ کہہ رہے ہیں اور یہ پھر یہی کچھ کہہ رہے ہیں کہ نہیں یہ کچھ کر کے دکھاؤ پھر ہم ایمان لائیں گے۔ ہم اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ ان کی باتیں ہیں وہ یہ چیزیں مانتے تھے' ہم یہ کچھ نہیں کرتے۔ یعنی غیر معمولی باتیں' خلافِ فطرت باتیں' شعبدہ بازی کی باتیں' نہ سمجھ میں آنے والی باتیں ہم نہیں وہ تھے۔ حالت ہماری یہ ہے کہ یہ سارا کچھ عقل و فکر کی رو سے ہو رہا ہے' جو کچھ ہم سمجھ رہے ہیں دلائل و بصیرت کی رو سے ہے Arguments ہیں قرآن کے حقائق ہیں۔ یہ سارا کچھ ہو رہا ہے۔ اور اس کے بعد کرتے کیا ہیں ہم اسی قرآن کے متعلق جس میں سے یہ دلائل لیے جا رہے ہیں' قرآن نے حقائق دیے ہیں' بصائر دیے ہیں۔ پرانی باتوں کو چھوڑ دیجیے آج کل کیا ہو رہا ہے۔ ایک شخص کے خواب میں وہ آیا پتہ نہیں وہ روایت میں ہے بابا آدم تھے یا اماں حوا جس کے خواب میں یہ آیا۔ خواب میں یہ آیا رسول اللہ ﷺ نے فرما دیا ہے کہ جنگ ہوگی اور جنگ تو بڑی سخت ہوگی لیکن آخر الامر پاکستان کی فتح ہوگی۔ تو انہوں نے کہا خواب دیکھنے والے نے کہ حضور اس کے لیے کوئی نشانی دیتے جایئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ کہہ دو میری امت سے' پاکستان والوں سے کہ وہ جب قرآن شریف کھولیں گے اس میں سے میرا بال نکلے گا۔ آپ کو پتہ ہے آج کل سارے قرآن کھل رہے ہیں یہ قرآن کے حقائق نہیں ''اووال لبھن ڈہے ہوئے نیں اوہدے اچ''۔ ہنسنے کی بات نہیں سوچنے کی بات ہے۔ سب کھول رہے ہیں۔ اب اس میں ایک تماشہ ضرور ہو جاتا ہے کہ ایک قرآن شریف ''نانی اماں وی پڑھدی سی' ماں وی پڑھدی سی' اے وی پڑھدی ہیگی اے' نہا دھو کے پڑھنا ہویا۔ والاں دا حال اے ہوندا ہیگا پئی کوئی روٹی نئیں ہوندی جیہدے اچ وال نئیں لبھ لیندا ہیگا آٹا گوندی دا تے وال اوہدے اچ ڈگ پیندا اے' تے آجیہڑا تین پشتاں تو قرآن پڑھدیاں کڑیاں

آیاں سن کسے' دا وال ای نہ ڈ گا ہوگا' ایہنوں پہلا لبھیا نئیں سی ہن لبھنا شروع کتا۔ اوہدے اچوں وال لبھ جاندا ہیگا' پئے چُمن ڈیے ہوئے نیں''۔ یہ کیا ہے عزیزانِ من! اس سے ان کو اس کی صداقت کا ثبوت مل رہا ہے۔ خدا کہتا ہے ان کی کیفیت یہ ہے کہ ہم نے دلائل و براہین سے ان کے سامنے رکھا۔ کہا عقل و ہوش سے کام لو علم سے کام لو' اِدھر نہیں آئے۔ کہتے ہیں نہیں' قرآن میں سے حقائق نہیں ''ایہدے اچوں وال نکلنا چاہیدا ہے۔ اے تے اپنے گھر دا قرآن اے نا کسے نائی دی ہٹی دا قرآن کتھے لے آن۔ او ہنے ایہدے اچ حرف نہ ہون جنے ایہدے اچوں وال نکلن جناب' کی پتہ وچوں جواں وی نکلن''۔ اس پہ اطمینان ہوتا ہے آپ کی امت کا۔ عزیزانِ من! ہنسئے نہیں روئیے اس قوم کے اوپر' اس قرآن میں سے یہ چیزیں نہیں بلکہ اس قرآن سے بال تلاش کرتے ہیں پھر ان کو ایمان آتا ہے۔ وَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰہِ جَہۡدَ اَیۡمَانِہِمۡ (6:109) خدا کی قسمیں کھا کھا کے کہتے ہیں کہ اس میں سے کسی طرح بال نکال کے دیکھو' دیکھو ہم کیسے ایمان لاتے ہیں۔ اللہ اکبر۔

قرآن حکیم کتاب فطرت ہے اور اس کا ایک ایک لفظ اپنی اپنی جگہ ایک عظیم معجزہ ہے

کہتا ہے کہ یہ معجزے دیکھنے چاہتے ہیں جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئے وہ چاہتے ہیں۔ قُلۡ اِنَّمَا الۡاٰیٰتُ عِنۡدَ اللّٰہِ (6:109) کہا جاؤ ان سے کہو بکھرے ہوئے معجزے دیکھو۔ کہو کہ اگر کوئی پہلی دفعہ ان سے آ کے یہ کہدے ایک دانہ خشخاش کے برابر ایک بیج کہ صاحب یہ دیکھئے اور ایسی قدرت حاصل ہے کہ اس کے اندر وہ سامنے درخت کھڑا ہو کہ اس کے اندر سے وہ درخت جو ہے یہ نکل آئے گا۔ سنتے ہیں آپ۔ کوئی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ اور وہ درخت اس کے اندر سے نکلا ہوا ہوتا ہے' اسی بیج کے اندر تھا بڑ کا وہ درخت۔ او پوچھتا ہوں' اس سے بڑا کوٹڈ کہتا ہوں شعبدہ بازی اگر آپ کوئی چیز ایسی چاہتے ہیں جو عقل فکر میں ہی نہ آئے میں پوچھتا ہوں یہ عقل فکر میں آنے والی بات تھی آپ کے۔ یہ کیوں ہوا؟ اس نے بھی اپنے معجزے عام اتنے کر دیے ہیں کہ وہ پھر معجزہ ہی نہیں رہا۔ آپ یہ کہتے ہیں کہ ایسے نہیں جو پہلے اس طرح سے تم نے یہ عام کر دیے۔ وہ ہوتے ہیں' سرکس والے کہ کچھ باہر وہ کر رہا ہوتا ہے وہ تو ہر ایک دیکھ رہا ہوتا ہے ''مفت دیکھدا پیا اے ٹکٹ ای کوئی نہیں لگی ہوئی'' اسکے بعد وہ یہ کہتا ہے کہ یہاں جو تم نے آدمی دیکھا ہے اور یہ مچھلی دیکھی ہے اندر تم دیکھو گے ایک ایسی شے آدھا دھڑ آدمی کا' آدھا مچھلی کا لیکن روپیہ لگے گا ''جاندے نیں روپیہ دے کے اندر''۔

قدرت کی یہ پوری کی پوری کائنات ایک ایسا عظیم معجزہ جس نے عقلِ انسانی کو جلا تو بخشی لیکن اسے سلب نہیں کیا

یہ باہر جو بکھرے ہوئے معجزے ہیں یہ اب ان کو اطمینان نہیں دلا سکتے وہ کہتے ہیں اس قسم کا کوئی اور ہو جو اس طرح سے نہ ہو۔ کہتا ہے کہ بکھرے ہوئے معجزے۔ لیکن وَ مَا یُشۡعِرُکُمۡ اَنَّہَاۤ اِذَا جَآءَتۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ (6:109) یہ بھی ان کی کہنے کی باتیں ہیں' سوال

ہی نہیں ہے کہ اس طرح سے ایمان لے آئیں۔اس طرح سے ایمان لانا ہوتو قدم قدم کے اوپر جو معجزے ہیں ان سے ایمان کیوں نہ لے آئے۔ان میں اگر ایک کا اور اضافہ ہوگیا تو پھر کیا ہوجائے گا۔اور اب چھپا کے تو کچھ کریں گے نہیں' وہ بھی عام ہوگا۔تو جہاں یہ سو پہلے ہیں اس میں ایک اور ہوجائے۔کہا یہ طریقہ نہیں ہے۔ہم نے انسان کو عقل وفکر دی ہے' علم وشعور کی صلاحیتیں دی ہیں' معجزہ دکھانے کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیزیں سلب کرلی جائیں۔وہی معجزہ ہوتا ہے کہ جس سے عاجز ہوجائے آپ کی عقل' بات سمجھ میں نہ آئے۔کہا کہ ہم نے تو اس کو سمجھ دی تو پھر ہم ہی ایسی باتیں کریں کہ جس سے ان کی سمجھ مفقود ہوجائے۔می نہ سزد خدائے را۔''جے ایناں دی مت مارنی ہوندی اسی' تے مت دیندے کیوں''۔کیا عجیب باتیں کر جاتا ہے' یوں سمجھا جاتا ہے بات کو۔یہ نہیں بات۔افوہ! دے کے واپس لینا تو یہ تو چھوٹی سی چیز ہے۔کتنے انداز میں وہ اقبالؒ کہہ گیا ہے

جانے کہ داند دیگر نہ گیرند

وہ دینے والا تو ایسا دینے والا ہے کہ جان جو اس نے تمہیں دی ہے' جان جو دی ہے انسان سے وہ بھی واپس نہیں لیتا۔

آدم بمیرد از بے یقینی

انسان تو اپنی بے یقینی سے مرجاتا ہے وہ تو واپس نہیں لیتا۔

قدرت کا انسان کو عقل وشعور جیسا لازوال تحفہ عطا کرنے کے بعد اسے واپس لینا شان ربوبیت کے خلاف ہے

وَ مَا يُشۡعِرُكُمۡ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ (6:109)۔غلط ہے۔عقل وشعور کی صلاحیتیں دے کے عقل وشعور کو مسلوب کرکے کوئی بات منوانا خدا کے شایانِ شان نہیں ہے۔یہ چاہتے یہ ہیں کہ ایسا کچھ کردو جس سے ہماری عقل وفکر مفقود ہوجائے۔کہا یہ جو باتیں کررہے ہیں کیا یہی نہیں بتارہا ہے کہ ان کی عقل وفکر پہلے ہی مسلوب ہوچکی ہوئی ہے۔وَ نُقَلِّبُ اَفۡـِٕدَتَهُمۡ وَ اَبۡصَارَهُمۡ كَمَا لَمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ (6:110) کہتا ہے اتنے واضح دلائل روشن حقائق ان کے سامنے آئے اس پہ ایمان نہیں لارہے تو یہی کہ عقل وفکر کو مفقود کرکے منوائے' منوانے کا اگر یہ طریقہ ہوتا تو عقل وفکر تو ان کی پہلے ہی مفقود ہے' مت تو ان کی پہلے ہی ماری گئی ہوئی ہے۔

تباہی کے واضح آثار دیکھنے کے باوجود سبق حاصل نہ کرنے والوں کا انجام انسانیت کی سطح سے محروم ہونا ہے

وَّ نَذَرُهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ (6:110) کہتا ہے جو شخص بھی اپنے آپ کو پانی کے بہاؤ پہ چھوڑ دیتا ہے اپنی کوشش سے تیر کے' کنارے دوسرے کی طرف نہیں جانا چاہتا' کودتا ہے اور کودتا ہے طوفان والے دریا کے اندر' چڑھے ہوئے دریا میں' ان کی لہروں میں

اور پھر چھوڑ دیتا ہے اپنے آپ کو۔ کہتا ہے وہ اپنے آپ کو چھوڑ تا ہے وہ لہریں اور زور سے بہا کے لے جاتی ہیں۔ انہوں نے اپنی عقل وفکر کو یوں چھوڑا اور ہمارا قانونِ فطرت جو ہے اس نے پانی کے بہاؤ کی طرح ان کو اور تیز کیا اب تیزی سے بہے جا رہے ہیں **یَعۡمَهُوۡنَ** (6:110)۔ یہاں وہاں یہ کہا تھا **عـمی** آنکھوں کا اندھا ہونا۔ یہ ان کی زبان ہے۔ ع م ی آنکھوں کا اندھا ہونا ہے ع م ہ بصارت کا اندھا ہونا ہے۔ کہا آنکھوں سے اندھے نہیں ہوئے ہوئے' دیکھ رہے تھے۔ پانی بھی نظر آ رہا تھا اس کی بڑی بڑی طغیان آمیز موجیں بھی نظر آ رہی تھیں' موت بھی دکھائی دے رہی تھی' عقل کا اندھا ہو گیا جو اس نے چھلانگ لگا دی۔ اب بہائے لیے چلی جا رہی ہیں موجیں۔ یہ آج کے معاشرے میں ہو کیا رہا ہے عزیزانِ من! کون ہے جو عقل وشعور کی رو سے یہ نہیں جانتا کہ سب کچھ غلط ہو رہا ہے اور پھر وہ کون ہے جو ان کے اندر اس طرح نہیں بہے جا رہا جس طرح کہ لہروں میں مردہ بہے جا رہا ہو۔ سورۃ الانعام کی آیت 111 تک آ گئے ہم اور ساتواں پارہ بھی آج ختم ہو گیا آٹھواں پارہ آگے آئے گا۔ **وَ لَوۡ اَنَّنَا نَزَّلۡنَاۤ اِلَیۡهِمُ الۡمَلٰٓئِکَةَ وَ کَلَّمَهُمُ الۡمَوۡتٰی** (6:111) یوں کرنا ہوتا تو مشکل کیا تھی فرشتے پُروں کے پُرے لے آتے' مردے جی اٹھتے ان کے سامنے باتیں کرتے سب کچھ۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ عقل وفکر سے مفقود ہو جاتے۔ اور عقل وفکر سے مفقود کرنے کے بعد یہ کہنا کہ یہ سطحِ انسانیت پہ آ جاتے' یہ تو حیوان سے بھی نیچے چلے جاتے (7:179)۔ کیا ہم سے یہ توقع کرتے ہیں ہم ایسا کریں گے؟۔ ان کو مطالبہ کرنے دو ہم ایسے مطالبے ان کے مانا نہیں کرتے۔ یہ آگے چل کے ہم کہیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

سولھواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 111 تا 115)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج نومبر 1971ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی 112 آیت سے ہوتا ہے (6:112)۔

معجزات کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی دوٹوک وضاحت کے باوجود ہماری تقلید پرستی کی نوعیت

سابقہ آیت میں بتایا یہ گیا تھا کہ یہ لوگ تقاضا کرتے ہیں کہ اگر کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو پھر یہ ایمان لے آئیں گے۔ قرآنِ کریم نے کہا یہ ہے وہاں اتنی سی بات کہی تھی کہ تم اگر عقل وشعور سے کام لو اور سوچو تو تم اس نتیجے پہ پہنچ جاؤ گے کہ اس کے بعد بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ زیرِ نظر آیت میں اسی کی تشریح ان الفاظ میں کردی گئی کہ وَ لَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَ كَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ حَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَىْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا (6:111) کہ چھوٹا موٹا معجزہ تو ایک طرف رہا۔ ان پر اگر فرشتے بھی اترنے شروع ہو جائیں۔ مردے ان کے سامنے بولنے لگ جائیں۔ دنیا بھر کی چیزیں جو یہ مانگتے ہیں ان کے سامنے لاکھڑی کردی جائیں تو یہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ سطحی طور پہ تو ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ پہلے ہی فیصلہ کردیا گیا یہ کچھ بھی کیا جائے یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ان کی ایک شرط ہے ان کا ایک تقاضا ہے پورا کردیا جائے۔ اور اس سے گہرائی میں جایا جائے تو پھر یہ اعتراض سامنے آتا ہے۔ بڑی غور

طلب چیز ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے متعلق معجزات کا منسوب کردہ مسلمہ تصور

ہمارے ہاں یہ چیز گویا مسلمہ کی حیثیت سے چلی آ رہی ہے کہ انبیائے کرامؑ کو معجزات دیے گئے تھے۔اور نبی اکرم ﷺ کے متعلق تو پھر ہمارے ہاں کیا یہ گیا ہے کہ سابقہ انبیائے کرامؑ کے معجزات کو گنایا گیا اور ان سے دوگنے معجزے آپ ﷺ کی طرف منسوب کیے گئے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ کے متعلق تو یہ ہے کہ آپ ﷺ سید المرسلین ہیں تمام انبیائے کرامؑ میں بڑے ہیں تو اس لیے اسی نسبت سے کہا یہ گیا کہ آپ ﷺ کو اتنے معجزے دیے گئے۔اور پھر دلائل النبوت میں یعنی نبوت کی دلیل بیان کی گئی۔ یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جو بطور مسلمہ کے ہمارے ہاں آتی ہے۔ پھر قرآنِ کریم سے یہ چیز ثابت کی جاتی ہے کہ یہ دیکھئے معجزات ہیں۔تو میں نے عرض یہ کیا تھا کہ ذرا غور کیجیے اس بات پہ کہ قرآن یہاں یہ کہہ رہا ہے کہ اگر اس قسم کے مشہود محسوس مرئی معجزات بھی ان کے سامنے آجائیں اور یہ تو بڑی معجزوں کی تفصیل ایسی دیدی ہے بلکہ ایسی جامعیت سے بیان کیا ہے کہ دنیا جہان کی چیزیں جو یہ مانگتے ہیں ان کے سامنے لاکھڑی کی جائیں مردے بولنے لگ جائیں، فرشتے اترنے لگ جائیں تو یہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔تو اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اگر صورت یہ ہے کہ معجزات کے بعد بھی ایمان نہیں لائیں گے تو یہ اللہ تعالیٰ نے معجزات انبیائے کرامؑ کو دیے کاہے کے لیے۔ان معجزات کا فائدہ تو مصلحت ہم یہی گناتے ہیں کہ جب یہ لوگ دلائل و براہان سے ایک بات نہ مانیں تو پھر اس کے بعد ان کو ایک معجزہ دکھا دیا جائے اور اس کے بعد کہا جائے کہ دیکھو! اب بھی مانتے ہو یا نہیں۔لیکن جب وہ خود خدا یہ کہہ رہا ہے کہ اتنے معجزات بھی اگر دکھا دیے جائیں تو پھر بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔تو پھر دہرا دوں اس کو کہ سوال یہ پیدا ہوگا، اگر وہ مسلمہ درست ہے کہ خدا نے انبیائے کرامؑ کو معجزات دیے تو وہ ایک طرف، یہ کہہ رہا ہے کہ اتنے معجزوں کے باوجود یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ جانتے ہوئے، یہ اعتراف کرتے ہوئے، یہ اس طرح اظہار کرتے ہوئے کہ یہ نہیں لائیں گے اس کے بعد یہ کہ پھر معجزے دیئے کاہے کے لیے دیے۔ آپ سوچتے ہیں کہ ایک چیز جو مسلمہ کی طریق پہ بھی آتی ہو یا بعض مسلمات بھی جو چلے آ رہے ہوں ان پہ کھڑے ہو کے کبھی کسی نے غور نہیں کیا اور بڑے فخر اور اعزاز سے یہ بات پیش کی جاتی ہے۔ پہلے تو سابقہ انبیائے کرامؑ کے معجزات اور پھر نبی اکرم ﷺ کے معجزات، کسی وعظ کی مجلس میں سنئے۔اور یہ عام ملا کا کام نہیں ہے بڑے بڑے علمائے کرام، آئمہ عزام ایسی کتابیں آپ کے ہاں جو بڑی معتبر مستند سمجھی جاتی ہیں، ان میں یعنی کتابوں کی کتابیں اسی موضوع پہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے معجزات جو گنائے جاتے ہیں۔ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ معجزہ دینے سے فائدہ کیا ہے اس کے باوجود یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ بڑی غور طلب چیز ہے۔ بہرحال یہ چیز کہ جہاں تک قرآنِ کریم میں ذکر ہے وہ آیات جن سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ معجزے ہیں یعنی محسوس شکل کے معجزے۔ ایک تو دلیل معجزہ ہوتی ہے ایسی قاطع دلیل جسے کہتے ہیں ایسی دلیل کہ جواب نہ بن پڑے اگلے سے۔ معجزہ وہی ہے

جس کے بعد انسان عاجز آ جائے ایک بات سے۔ تو دلیلِ محکم بھی ایک ایسی چیز ہے کہ واقعی اس کے بعد پھر اعتراض سوجھتا نہیں' جواب سوجھتا نہیں۔ اسے چھوڑیئے۔ معجزے سے مراد لی جاتی ہے محسوس معجزہ Physical چیز کا معجزہ طبعی چیز کا معجزہ جو عام طور پہ نہ ہوتا ہے' وہ کر کے دکھا دیا جائے مثلاً یہ کہ مردے بولنے لگ جائیں۔ تو قرآن یہ کہہ رہا ہے یعنی خدا یہ کہہ رہا ہے کہ اس کے باوجود یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ بات ساری صاف ہوجاتی ہے اگر سمجھ لیا جائے کہ ایمان کہتے کسے ہیں۔ میں نے کئی دفعہ آپ کو بتایا ہے کہ کسی شے کی Definition اگر کر دی جائے اس کو Define کر دیا جائے تعریف اس کی متعین کر دی جائے کہ یہ کیا ہے تو آدھا مسئلہ اسی سے حل ہو جاتا ہے۔ یہ بڑی اہم چیز ہے Define کیا جائے کسی چیز کو۔ ایمان کہتے کسے ہیں؟ ایمان کہتے ہیں دل اور دماغ کی پوری رضا مندی سے' کامل تسکین سے' پورے اطمینان سے' دلیل و برہان کی رو سے' کسی بات کو صحیح اور سچا ماننا۔ یہ ہے Definition قرآن کی رو سے ایمان کی' جس میں کسی قسم کے اکراہ کا جور کا دخل نہ ہو۔ کسی حیثیت اور کسی نوعیت کا' بھی اس میں اگر جبر آ جائے' تو وہ ایمان نہیں رہتا۔ جبر کے کیا معنی ہونگے؟ کہ آپ کا دل اور دماغ تو کچھ اور مانتا ہو اور اس کے خلاف کسی طریق سے آپ سے کوئی اور بات منوالی جائے' اسی کو اکراہ اور جبر کہیں گے۔ جبر میں ایک تو Physical جبر ہوتا ہے' طبعی جبر ہوتا ہے کہ تلوار سر پہ لے کے کھڑے ہو گئے کہ پڑھئے کلمہ' لایئے ایمان۔ اب ظاہر ہے کہ اس طور پہ جو کچھ آپ زبان سے کہہ دیں گے' آپ دل اور دماغ کے اطمینان اور رضا مندی سے تو ایسا نہیں کریں گے۔ یہ اکراہ ہے۔

کسی چیز پر کھلی آنکھوں کے ساتھ دل و جان کی پوری رضا مندی کے ساتھ بغیر لالچ اور بغیر کسی جبر کے تسلیم کرنا ہی ایمان کی بنیادی شرط ہے

اکراہ کیا ہے؟ کہ عقل و فکر کے خلاف کوئی چیز آپ سے منوالی جائے۔ نشہ پلا کے اگر آپ سے کسی چیز کو منوالیا جائے' وہ بھی ایمان نہیں' اقرار ہی نہیں ہوتا' اسے تو شہادت بھی نہیں مانا جاتا۔ اس لیے کہ وہ آپ نے اپنے عقل و شعور کی رضا مندی سے نہیں کہا' ماؤف ہو گئی تھی وہ چیز۔ انڈر کلوروفارم کچھ کرا لیا جائے' تو وہ بھی اقرار نہیں ہے۔ ہپناٹائز کرتے ہیں آج کل' یہ بڑی پرانی چیز ہے نام اس کا کچھ اور تھا اس سے پہلے' اس کا نام کرامات رکھا ہوا تھا۔ ہپناٹائز کرتے ہیں دوسرے کو' اب یہ سائنس ہو چکی ہے اور خاص طور پہ امریکہ میں اس کو بڑا Develop کیا گیا ہے وہاں تو ہسپتالوں میں علاج ہوتا ہے اس طریق سے۔ خاص طور پہ وہ بچوں کو کلوروفارم نہیں دیتے کہ یہ کلوروفارم بچوں کے لیے بڑی نقصان دہ چیز ہوتی ہے۔ ہپناٹائز کرتے ہیں دوسرے کو' محسوس کرنے کی جو صلاحیت ہے اندر اسے اتنا ماؤف کر دیتے ہیں دوائیوں سے نہیں' وہ ایک طریق ہے قوتِ ارادی سے' آپریشن کر دیتے ہیں بغیر کلوروفارم کے اور درد محسوس نہیں ہوتا۔ وہ تو وہاں ہیں

امریکہ میں اس کے باوجود وہ ڈاکٹر ہی کہلاتے ہیں' انہیں ہسپتال ہی کہتے ہیں۔ یہاں کہیں حضرت صاحب کے ہاں سے ایک دفعہ یہ کچھ ذراسی چیز ہونے لگ جائے تو وہ حضرت صاحب تو ایک ڈاکٹر صاحب تو ایک طرف رہے' پھر پشتوں تک ان کی قبروں کو پوجا جائے گا۔ لیکن میں کہہ یہ رہا تھا کہ اگر ہپناٹائز کر کے بھی کسی سے کوئی بات منوائی جائے' اسے بھی ایمان نہیں کہا جاتا۔ ایمان کی Definition یہ ہے کہ اس میں انسان کا عقل و شعور مطمئن ہو' دل و دماغ کی کامل رضامندی اس کے اندر ہونی چاہیے۔ اور اگر آپ کہیں باہر سے کسی کا کوئی شعبدہ دیکھ لیں' وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ سڑک پہ کھڑا ہوا' اٹے ہوئے بال پھٹے ہوئے سے کپڑے' سرخ انگارے کی طرح آنکھیں اور اس کے بعد آپ کو اس میں کھڑا کر لیا اس نے کہا کہ نکالو جو کچھ تمہاری جیب کے اندر ہے اور دیکھو میں کیا کرتا ہوں اور بالوں کو نچوڑا اس میں دودھ ٹپکنے لگ گیا۔ آپ کانپنے لگ گئے' جو جیب میں ہوتا ہے آپ نکال کے دیدیتے ہیں اسے۔ آپ بقائمی حواسِ خمسہ تو کبھی ایسا نہیں کر سکتے کہ اپنی جیب کا بٹوہ نکال کے اسے دیدیں' یہ کیوں دیا؟ آپ کی عقل کو ماؤف کر دیا اس نے۔ اور جب ماؤف ہوگئی عقل تو جو اس نے کہا آپ نے کر دیا۔ اور اسی کو ذرا اور آگے بڑھا دیجیے۔ الفاظ ہی کا فرق ہے اسی کا نام آپ نے معجزہ رکھ لیا ہے کسی کے سامنے کوئی ایسی بات کر کے دکھا دینا جو اس کی عقل میں نہ آتی ہو' عقل اس کی ماؤف ہو جائے' عاجز ہو جائے وہ۔ اور اس وقت تک اگر اس نے اس طرح سے کلمہ پڑھ لیا قرآن کی Definition کے اعتبار سے وہ ایمان نہیں ہے۔ یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ یہ سارا کچھ بھی کر دیجیے۔ مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا (6:111) تو اس کے بعد اگر انہوں نے اقرار بھی کر لیا زبان سے' تو ایمان نہیں ہو سکتا وہ' یہ معنی ہیں اس کے۔ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) وہ اس کیٹگری میں آ گئے کہ ایسے لوگ تمہیں ملیں گے جو کہیں گے کہ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر آخرت پر' ایمان والے وہ پھر نہیں ہوتے اس کے باوجود وہ ایمان والے نہیں ہیں۔ تو اگر آپ نے عقل و شعور کو ماؤف کر کے کسی سے چند الفاظ کہلوا لیے تو قرآن تو خود کہتا ہے کہ یہ ایمان نہیں ہے۔ یہ ماؤف کرنا عقل و فکر کا یہ تو ایک طرف رہا کسی مصلحت کے تابع بھی اگر کسی نے اسلامی مملکت کو جوائن کر لیا' مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو گیا اس نے ان کا مذہب بھی اختیار کر لیا کسی مصلحت کی بناء پہ۔ سنئے قرآن اس کے متعلق کیا کہتا ہے۔

صدرِ اوّل کے عرب قبائل کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد اور پھر ہماری حالت

صدرِ اول میں جب مسلمانوں کی مملکت قائم ہوگئی مدینے میں تو بہت سے قبائل تھے عربوں کے' وہ اسلام لے آئے اور وہ اس ملت میں شامل ہو گئے۔ ان کے ایمان میں ہمارے آپ کے معیار کے مطابق شبہ کیا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے بھی یہ کہا کہ ہاں ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قرآن ان کے متعلق کہتا ہے قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا (49:14)

یہ بدو کہتے ہیں یہ ان قبائل کے لوگ کہ ہم ایمان لے آئے۔ وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ قُلْ (49:14) کہا ان سے کہو لَّمْ

تُـؤْمِـنُـوْا (49:14) تم ایمان نہیں لائے۔غور کیجیے! ہمارے آپ کے معیار کے مطابق یہ کیا بات تھی جو کہا تھا کہ ایمان نہیں لائے' یہ ایمان نہیں تو اور کیا ایمان ہوتا ہے۔جس طرح سے آپ ہر روز ایک غیر مسلم کو مسلمان کرتے ہیں یہ تو پھر بھی کسی مولوی صاحب کے ہاتھ پہ وہ اسلام لاتا ہے' وہ تو میں سمجھتا ہوں حضور نبی اکرم ﷺ کے دستِ مبارک پہ آج کی اصطلاح میں وہ ایمان لائے یا صحابہ کبارؓ کے۔ قرآن کہتا ہے کہ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا (49:14) تم ایمان نہیں لائے وَلٰـكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا (49:14) یہ کہو کہ ہم اس مملکت کے سامنے جھک گئے ہیں ہم نے اس کا یہ نظام یہاں کا آئین اسے قبول کرلیا ہے یہ جو انگریزی میں کہتے ہیں کہ Surrender کر دینا ان سے کہو کہ تم سرِ دست صرف یہ کہو۔اور پھر فرق کیا ان دونوں میں۔وَلَـمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ (49:14) اس لیے کہ ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا ابھی۔قرآن اس وقت ایمان کہتا ہے Definition ایمان کی اس وقت ہے اس کے نزدیک جب وہ قلب کی گہرائیوں میں اتر جائے۔وہ ان کے ایمان کو کہتا ہے کہ ان سے کہو یہ نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔پھر کیا کہیں ہم' کافر تو رہے نہیں آپ میں آ کے ملے ہیں۔کہا ان سے کہو اَسْـلَـمْـنَـا (49:14) ٹھیک ہے آ ملے ہیں تم میں' سرنڈر کرلیا' قبول کیا تمہارا نظام' ایمان نہ کہو۔وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ (49:14)۔آپ نے غور کیا کہ کیا Definition ہے قرآن کی رو سے ایمان کی۔ یہی وہ Definition ہے جس کی رو سے سورۃ بقرہ کی ابتداء میں یہ چیز کہی گئی ہے وَ مِـنَ الـنَّـاسِ مَـنْ يَّـقُـوْلُ اٰمَـنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِـرِ وَ مَـا هُـمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8)۔اب ان میں دو تین کیٹگریز ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ یہ لوگ ایسے منافق جو محض دھوکہ دینے کے لیے ایسا کہیں۔ایک یہ کیٹگری ہے یہ لوگ دھوکہ دینے کے لیے ایمان نہیں لائے تھے بلکہ اس مملکت اس حکومت اس سلطنت کی شان وشوکت کو دیکھ کر قوت وثروت کو دیکھ کر ان کی عظمت اور بلندیوں کو دیکھ کر ان کے غلبہ اور استیلاء کو دیکھ کر اس وجہ سے بھی وہ ان کے اندر شامل ہوگئے تھے' دھوکہ دینے کے لیے نہیں۔لیکن وہ چیز جو تھی وہ دونوں میں مشترک ہے وہاں بھی زبان سے کہا جا رہا تھا' دل میں نہیں اترا تھا یہاں بھی کہہ رہا ہے قرآن وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ (49:14) تمہارے دل کے اندر ایمان نہیں اترا۔اس لیے ابھی اپنے آپ کو تم مؤمن نہ کہو۔تو قرآن نے خود Definition کر دی ایمان کی۔

ہم صرف مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے کی نسبت سے ایک قومی مسلمان ہیں جب کہ ایمان تو ہمیں ابھی لانا ہے

اور پھر جو میں بار بار یہ کہا کرتا ہوں کہ اس کے بعد آپ سوچیے کہ ہم لوگ جو اپنے آپ کو مؤمن کہلاتے ہیں' ہم تو ان میں سے کسی کیٹگری میں بھی نہیں آ رہے۔ دلوں کے اندر ایمان کا اترنا تو سوال ہی نہیں' ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا کہ یہ ہے ایمان کیا۔

اَسۡلَمۡنَا (49:14) کی صورت بھی نہیں ہے ہمارے ہاں کی۔ہم تو Accidental ہیں یعنی مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوگئے' اتفاقی چیز ہے یہ' اسمیں ہمارے انتخاب واختیار وارادے کو تو دخل ہی کوئی نہیں ہے۔اس کے گھر میں بچہ کوئی پیدا ہوگیا اور ہم مسلمان ہوگئے۔ ٹھیک ہے قومی اعتبار سے ایک قوم کو ہم Belong کرتے ہیں جو مسلمان کہلاتی ہے اپنے آپ کو۔لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ایمان ہے ہمارا' قرآن کی Definition کے مطابق تو ایمان والی بات ہے نہیں' ایمان تو لانا پڑے گا۔میں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں پھر دہرادوں قرآن نے اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (85:11) کہا ہے وہ لوگ جو ایمان لائے۔یہ کچھ کرنے کا کام ہے' وہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے والے کے متعلق پہلے سے طے نہیں کر لیتا کہ یہ ایمان والا ہے' کسی بچے کے متعلق بھی وہ یہ نہیں کہتا۔ایمان بھی کچھ کرنا ہے اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (85:11) ایمان لاتے ہیں۔کچھ کیا جائے گا۔کیا کیا جائے گا؟ پرکھا جائے گا' سوچا جائے گا' غور کیا جائے گا' تحقیق کی جائے گی' اپنے آپ کو مطمئن کیا جائے گا۔دل اور دماغ جب مطمئن ہوجائیں کہ ہاں واقعی یہ صداقت ہے پھر اس اعتراف واقرار کا نام یعنی دل کے اندر اتری ہوئی بات کا زبان سے اقرار' یہ ہوگا جسے ایمان کہا جائے گا۔یہ کچھ کیا جائے گا۔اب بات سمجھ میں آگئی کہ اگر کسی کو یہ جسے معجزہ کہتے ہیں' معجزہ بھی دکھا دیا جائے تو اس کی عقل وفکر کی صلاحیتیں ماؤف ہوگئیں' مسلوب ہوگئیں ختم ہوگئیں۔اور اس کے بعد اگر اس نے زبان سے کچھ کہہ بھی دیا' قرآن کہتا ہے وہ ایمان کی Definition پہ پورا ہی نہیں اترتا تو اس لیے اسے آپ کیسے کہیں گے کہ یہ ایمان لے آیا۔یہ معنی ہیں لَمۡ تُؤۡمِنُوۡا (49:14) کے۔کیونکہ یہ چیز جو تھی اگر معنی اس کے وہی لیے جائیں' جو ہم عام طور پر سمجھتے چلے آرہے ہیں کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ صاحب! معجزے دکھا بھی دیے جائیں' اس کے باوجود یہ نہیں کہیں گے کہ ہم ایمان لائے' یعنی زبان سے نہیں کہیں گے وہ فوراً اس کی تکذیب کردیتے۔یہ غور طلب چیز ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔وہ مخالفین تھے انہیں چیلنج دیا جارہا تھا ایک چیز کا' کہا جارہا تھا کہ یہ نہیں ایمان لائیں گے وہ یہ کہتے کہ آپ دکھایئے معجزہ۔اور ہم جو کہہ رہے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے تو پھر سینکڑوں معجزے دکھائے' وہ اس بات کی تکذیب کرسکتے تھے عملاً کہ تم کہتے ہو کہ مَا کَانُوۡا لِیُؤۡمِنُوۡۤا (6:111) معجزے کے بات ایمان نہیں لائیں گے ان میں سے دو آدمی باہر نکل آتے کہتے اَشۡهَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَا شَرِیۡکَ لَهٗ اور اس کے بعد کہتے کہ خدائے خبیر وعلیم تو کہہ رہا تھا کہ یہ معجزے کے بعد ایمان نہیں لائیں گے دیکھئے ہم ایمان لائے۔دیکھتے ہیں کتنی Dangerous چیز ہے یہ' کتنی خطرناک بات ہے یہ۔لیکن وہ اسی صورت میں ہے کہ جب قرآن کو ہماری سطح پہ سمجھا جائے۔

قرآن حکیم کے معیار کے مطابق معجزات کو دیکھ کر ایمان لانا' کوئی معنی نہیں رکھتا

قرآن کو قرآن سے سمجھئے جس قرآن نے پہلے یہ کہہ دیا تھا ان اعراب کے متعلق جو کسی قسم کے اکراہ کے بغیر لائے تھے ایمان کہ اب بھی فرق ہے ان کے اَسۡلَمۡنَا اور اٰمَنَّا (49:14) میں۔یہ اس مملکت کی شان وشوکت کو دیکھ کر تمہارے اندر شامل ہوگئے ہیں۔آگے

ان سے کہا ہے کہ ان سے کہو اطاعت کرو تم خدا اور رسول کی' آہستہ آہستہ پھر یہ ایمان دل میں تمہارے اتر جائے گا اس دن کہنا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں (49:13-15)۔ لہٰذا اگر بفرضِ محال کوئی معجزہ بھی دکھا دیا جائے اور اس کے بعد پورے کے پورے ایمان بھی لے آئیں تو قرآن کی Definition کی رو سے اسے ایمان کہا نہیں جائے گا۔ اس میں اکراہ شامل ہے' عقل وفکر کو کسی طرح سے ماؤف کر کے کوئی کام جو کرایا جائے گا' وہ ایمان نہیں کہلائے گا۔ یہ معنی ہیں اس کے مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا کے' یہ نہیں ہیں کہ اس وقت یہ اَشْهَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ نہیں کہیں گے وہ تو میں نے جیسا ابھی عرض کیا ہے وہ تو مخالفت تھی مقابلہ تھا وہ تو اس کو جھٹلانے کے لیے یہ فوراً کر دیتے کہ لیجیے صاحب! لے آئے ایمان۔ ابھی میں عرض کرتا ہوں یہیں قرآن نے بات واضح کی مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا (6:111)۔ اس کے بعد ہے اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (6:111)۔

ہمارے قرآنی تراجم نے نوجوان نسل کو اسلام سے بیگانہ کر دیا

پھر آگے وہی يَّشَآءَ اللّٰهُ (6:111) والی آیت' لیجیے ترجمہ دیکھئے تفاسیر اور پھر دیکھئے کہ کن الجھنوں میں نہیں آپ پڑ جاتے کہ معجزہ دکھانے سے بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے بجز اس کے جس کے لیے اللہ چاہے۔ ایمان اگر اسی نے لانا ہے جس کے متعلق اللہ چاہے تو کیا وہ معجزے کے بغیر چاہ کے ان پر ایمان لا سکتا۔ یعنی یہ ضرور آپ کو ایسے لگ رہی ہے کہ معجزہ دیا جا رہا ہے پھر اس کے بعد بھی یہ نہیں لائیں گے بجز اس کے کہ جس کے متعلق اللہ چاہے کہ وہ ایمان لائے۔ اور اگر بات آخر میں یہیں آ کے Pin-down ہوتی ہے کہ جسے اللہ چاہے وہ ایمان لائے تو جو نہ لائے ان کو جہنم میں کیوں پھینکا چلا جا رہا ہے۔ وہی اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (6:111) کی بات۔ آپ نے غور کیا ہے برادرانِ عزیز! آپ کو زیادہ واسطہ نہیں پڑتا مجھے واسطہ پڑتا ہے۔ ہمارا نوجوان طبقہ تعلیم یافتہ پہلے جو چیزیں ان کے سینے کے اندر گھٹی ہوئی تھیں' ہم نے ان کو آہستہ آہستہ اتنا بے باک کر دیا کہ اب وہ کھل کے بات کرتے ہیں یہاں آ کے وہ بات کرتے ہیں۔ انہیں اسلامیات پڑھائی جاتی ہے اگر وہ پہلے جو بیگانہ رہتے تھے وہ بڑے اچھے تھے کم ازکم ان کے دل میں ایک احترام تھا اسلام کا۔ اب جو انہیں یہ پڑھایا جاتا ہے وہاں' ایک طرف تو ان کو فلسفہ پڑھایا جاتا ہے' فزکس پڑھائی جاتی ہے' عقل وفکر سے کام لینا' تجربے سے کام لینا 'مشاہدے سے کام لینا' دوسری طرف انہیں اسلامیات میں یہ پڑھایا جاتا ہے۔ وہاں تو وہ بات نہیں کرتے' فیل ہونے کا ڈر ہوتا ہے کرتے بھی ہونگے تو بہرحال مذاق میں بات اڑ جاتی ہوگی' پڑھانے والے بھی تو اسی قسم کے ہوتے ہیں خود ان کا بھی تو ایمان نہیں ہوتا۔ انہوں نے بھی اس طرح نہیں بیچاروں نے سوچا ہوتا۔ یہاں آ جاتے ہیں وہ' یہی اعتراضات ہوتے ہیں جو وہ آ کے کرتے ہیں۔ تو میں پھر دہرادوں یہ يَّشَآءَ اللّٰهُ (6:111) والی بات تو میں نے جیسا پچھلی دفعہ کہا تھا اور معاف رکھئے یہ نہ سمجھئے گا میں اپنی کتاب کے متعلق ذکر بار بار کرتا ہوں اس لیے کہ قرآنِ کریم میں مشکل ترین مقامات یہ ہیں۔ جن آیات کا ترجمہ ہمارے ہاں یہ کیا جاتا ہے کہ جو اللہ چاہے

اگر اللہ چاہے اگر اللہ نے چاہا تو پھر یہ ہوگا۔ وہ تمام عمارت دین کی ڈھے جاتی ہے یہاں پہنچنے کے بعد کہ ہونا اگر وہ ہے جو اللہ نے چاہنا ہے تو پھر ہمیں مکلّف کا ہے کے لیے بنایا جارہا ہے۔ میں اس لیے اس کا ذکر کرتا ہوں کہ بہرحال توفیقِ ایزدی یہ ہوگئی اتنی سی بات کہ میں نے ان مقامات کو اس میں حل کیا ہے لیکن اس میں کوئی میری کاریگری نہیں ہے۔

نہیں اس میں شک کوئی تاجور کہ تڑپ ہے تیرے کلام میں
مگر اس میں تیرا کمال کیا غمِ دوست دردِ نگار ہے

علامہ غلام احمد پرویزؒ کی آدھی عمر انہی روائتی تراجم اور تفسیروں میں الجھی رہی

بات صرف اتنی ہے کہ میں نے قرآن کو آدھی عمر ایسے ہی پڑھا تھا اس کے بعد قرآن نے مجھے بتایا تھا کہ یوں نہیں آگے گذرتے' ایک ایک آیت پہ ایک ایک لفظ پہ کھڑے ہو جاؤ۔ وہ کہتا ہے تدبر کرو' تفکر کرو اس میں اس طریقے سے جو اس نے کہا ہے۔ یہ کرو اور دیکھو کس طرح سے منہ سے بولتا ہے قرآن۔ اِلَّآ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَھُمۡ یَجۡھَلُوۡنَ (6:111) یہ جی وہ آیت کا باقی حصہ' دوسری آیت نہیں ہے' اسی آیت کا باقی حصہ ہے یہ' ایک سانس میں ایک Sentence میں پورا ہوا ہے یہ۔ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَھُمۡ یَجۡھَلُوۡنَ(6:111)۔

قرآن حکیم پر ایمان لانا ہو تو پہلے خدا تعالیٰ کے قانونِ مشیت کو سمجھنا ہوگا

بات اصل میں یہ ہے کہ اکثر لوگ وہ ہیں جو جہالت سے کام لیتے ہیں۔ تو بات سمجھ میں آ گئی جہالت سے کام لیتے ہیں یعنی عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔ اور اگر سوال ہو جائے وہ معجزے دکھا کے ایمان لانے والی بات تو کہا جائے کہ اللہ میاں! عقل وفکر تو آپ نے پہلے خود مفلوج کر دی ہماری معجزے دکھا کے' اور پھر یہ کہ یہ جہالت سے کام لیتے ہیں' عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔ ہم تو عقل وفکر سے کام لے رہے تھے آپ نے یہ چھو منتر جو سامنے کیا تو عقل وفکر تو مفلوج کر دی۔ ہم تو اچھے بھلے کام لے رہے تھے آپ نے ایسا بنا دیا ہم کو۔ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَھُمۡ یَجۡھَلُوۡنَ(6:111) یہ آ گئی وہ key اس میں' وہ کلید آ گئی وہ چابی آ گئی جس سے معنی صاف ہو جاتے ہیں آ گئی وہ چابی جس سے اِلَّآ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ (6:111) کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَھُمۡ یَجۡھَلُوۡنَ (6:111) جہالت سے کام لیتے ہیں یعنی بات یہ ہوگئی کہ جہالت کی بناء پہ کوئی چیزیں کی جائیں تو وہ تو نہ ایمان ہوتا ہے نہ تقاضا ہوتا ہے' یہ نہیں بات۔ یَّشَآءَ اللّٰہُ (6:111) کے معنی کیا ہو گئے؟ خدا کا قانونِ مشیت جو ہے ایمان لانے کی بابت اس کے مطابق ایمان لایا جائے تو ایمان ہوگا۔ جو خدا نے قانون بنا دیا تھا اس کائنات کی تخلیق کے وقت انسانوں کو پیدا کرنے کے وقت جو قانون بنا دیا گیا ہے اسے کہتے ہیں قانونِ مشیت۔ قانون کیا ہے؟

نکال لیجئے عزیزانِ من! (10:99) اور اس سے آپ دیکھئے گا قرآن سمجھنے کا طریقہ کیا ہے۔ یہاں اس نے کہا تھا **اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ** (6:111) اب دیکھنے کی بات یہ تھی کہ قرآن میں کہاں کہاں یہ چیز کہی گئی ہے ایمان کے سلسلے میں کہ قانونِ مشیت ہمارا جو ہے اس کے مطابق ایمان لاؤ تو ایمان ہوگا' ورنہ ایمان نہیں ہوگا۔ یہ ترجمہ نہیں ہے کہ بجز اس کے کہ جسے ہم چاہیں وہ ایمان لے آئے۔ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ ایمان وہ ایمان کہلائے گا جو ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق لایا جائے۔ اب یہ قرآن سے ہم نے متعین کرنا ہے کہ ایمان کے سلسلے میں قانونِ مشیت خدا نے کیا مقرر کیا ہوا ہے۔ یہیں آ جایئے اور پھر میں نے کہا ہے **يَجْهَلُوْنَ** (6:111) جو تھا اس نے یہیں سے اشارہ دیدیا ہے کہ بات اس میں عقل وفکر کی ہے۔ یہ آیتیں نکال لیجیے سامنے۔ **وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا** (10:99)

نبی اکرم ﷺ کی ایک مقدس آرزو اور قرآن حکیم کا جواب کہ خدا کسی انسان کی آزادی کو سلب نہیں کرنا چاہتا

نبی اکرم ﷺ کے دل میں ایک مقدس آرزو تڑپ تھی ایک شفیق طبیب ہونے کی حیثیت سے کہ یہ سارے لوگ سچائی کو کیوں نہیں مان لیتے' حقانیت پہ کیوں نہیں آ جاتے غلط روش کیوں نہیں چھوڑ دیتے' صحیح راستے پہ کیوں نہیں چلتے۔ ایک غمگسار ہمدرد ناصح مشفق' قرآن جو کہتا ہے کہ تو تو اپنی جان گھلا لے گا کہ یہ لوگ صحیح راستے پہ کیوں نہیں آتے۔ اس سے نظر آیا نا کہ حضور ﷺ کا دلِ دردمند کیا چاہتا تھا۔ تو اب اس چاہنے میں یہ چیز بھی دعائیں مانگی جاتی ہونگی' آرزوؤں کا اظہار کیا جاتا ہوگا' مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہونگے کہ کسی طرح سے یہ صحیح راستے پہ آ جائیں۔ دیکھئے یہ کیفیت ہے۔ کہا کہ کیوں اس قدر بے تاب اور بے کل ہو رہے ہو' اگر مشیت یہی ہوتی یعنی ہمارا قانون جو ہم نے بنایا تھا یہ ہوتا کہ سارے انسان ایک راستے کے اوپر چلیں' مجبوراً چلیں تو ہم ان کو پیدا ہی ایسا کر دیتے کہ سارے کے سارے مومن ہوتے' مشکل کیا تھا ہمارے لیے۔

اختیار ارادے کی صلاحیت کے بغیر انسان پھر انسانوں کے زمرے میں آتا

وَ لَوْ شَآءَ (10:99) یہ آئی بات کہ اگر ہم چاہتے یعنی وہ جس وقت ہم نے تخلیق کیا انسان کو کہ کس قسم کا اسے بنانا ہے اگر یہ چیز ہوتی کہ یہ سارے انسان بغیر اپنے اختیار و ارادے کے مجبوراً ایک ہی راستے پہ چلتے جیسے ساری بھیڑیں ایک ہی راستے پہ چلتی ہیں' کائنات کی ہر شے ایک راستے پہ چلتی ہے' انہیں اختیار ہی نہیں دوسرا راستہ اختیار کرنے کا۔ اگر یونہی کرانا ہوتا ہمارے لیے مشکل کیا تھا کہ ہم انسانوں کو پیدا ہی ایسا کرتے۔ تو اس میں اختیار و ارادے کی بات تو نہ رہتی' عقل وفکر کی بات بھی نہ رہتی۔ وہ انسان مجبوراً حیوانوں کی طرح ایک راستے پہ چلنے کے لیے پیدائشاً مجبور ہوتا تو اس میں جبر کا پہلو آ جاتا نا اختیار کا پہلو نہ رہتا۔ کہتا ہے **اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى**

یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (10:99) اے رسول! ہم نے تو یہ طریقہ اختیار کیا کہ جبر نہیں کرنا۔ اختیار وارادہ ان کو دیا' عقل وفکر ان کو دی' راستہ دکھا دیا اور کہہ دیا کہ تمہارا جی چاہے فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (18:29) جس کا جی چاہے اس راستے پہ چلا جائے جس کا جی چاہے اُس راستے پہ چلا جائے۔ ہمارا قانونِ مشیت انسانوں کے متعلق یہ تھا۔ تو کیا تو ہمارے قانونِ مشیت کے خلاف مجبور کرنا چاہتا ہے ان لوگوں کو کہ کسی طرح سے یہ ایمان لے آئیں۔ غور فرمایئے! رسول سے کہا جا رہا ہے۔ مجبور کر کے ایمان لانے کی بات ایمان نہیں ہوتی۔ اگر مجبور کرنا ہوتا تو پھر ضرورت ہی نہیں تھی' اس لمبے چوڑے پروگرام کی سلسلۂ رشد وہدایت' انبیاء کا آنا' کتابوں کا بھیجنا ضرورت ہی نہیں تھی۔ بکریوں کی طرف کوئی نبی نہیں آتا۔ بھیڑوں کی طرف کوئی کتاب نازل نہیں کی' ہم نے۔ تو کیا ہم نے تو اس کو چھوڑا ہے صاحبِ اختیار وارادہ آزاد پیدا کیا ہے تو کیا ان کو مجبور کر کے ایمان کے راستے پہ لانا چاہتا ہے۔ رسول سے کہا جا رہا ہے جس رسول کی طرف ہم سینکڑوں معجزے منسوب کر رہے ہیں اس سے قرآن کہہ رہا ہے کہ کیا تو مجبور کرنا چاہتا ہے۔

ایک اور الجھاؤ کہ ''خدا کے حکم کے بغیر کوئی شخص ایمان نہیں لا سکتا''

اب آگے بات آئی وَ مَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ (10:100) پھر اس ترجمے نے آپ دیکھیں گے یہاں پھر الجھاؤ پیدا کیا۔ بِاِذْنِ اللّٰہِ (10:100) کا ترجمہ کیا جاتا ہے خدا کا حکم۔ خدا کے حکم کے بغیر کوئی شخص ایمان نہیں لا سکتا۔ یعنی اس کے حکم سے ہی ایمان لانا ہے تو اس میں تو پھر جبر ہی جبر ہو گیا اس میں تو اختیار رہا ہی نہ۔ اس سے بڑا اکراہ کیا ہے کہ وہ حکم نہیں دیتا تو انسان مجبور کافر ہے۔ وہ حکم دیتا ہے' ایمان لے آتا ہے یہ یعنی یہ تو خالصتاً اکراہ ہے۔ پھر اذن کے اس ترجمے نے ڈال دیا ادھر۔ اس کتاب میں میں نے اذن کے مفہوم دیے ہیں۔ کہا یہ ہے کہ ایمان جو لایا جاتا ہے خدا کے قانون کے مطابق لایا جاتا ہے۔ Sentence ختم نہیں ہوا۔ فقرہ پورا نہیں ہوا' دیکھئے پورا کیسے ہو رہا ہے اذن کے معنی کیسے آ رہے ہیں۔ وَ یَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (10:100) اور ہمارا قانون یہ ہے کہ جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتا' اس پہ معاملہ مشتبہ رہتا ہے۔ بات ختم ہو گئی۔ رجس کے معنی ہوتے ہیں گدلا پن۔ یہ جس طرح سے ''پانی اچ کچولا گھول دیندے نیں نا'' یہ ہے ترجمہ اس کا' بالکل اس معنی میں وہ لیتے ہیں۔ کنویں میں وہ اس قسم کا ڈول ڈال کے زور زور سے ہلا کے۔ ایمان لایا جا سکتا ہے ہمارے قانون کے مطابق اور قانون ہمارا یہ ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ان پہ معاملہ Confuse رہتا ہے' صاف نہیں ہوتا ان کے اوپر۔

قرآن حکیم کا خاصا یہ ہے کہ اپنے الفاظ کی تشریح خود کرتا ہے

اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ (6:111) معجزات کے ذریعے سے اگر انہوں نے زبان سے اقرار کر بھی لیا ہماری Definition کے مطابق وہ ایمان نہیں کہلا سکتا مَّا کَانُوْا لِیُؤْمِنُوْٓا (6:111) ایمان نہیں ہو گا وہ۔ تو جب اس کے بعد وہ ایمان ایمان ہی نہیں ہونا تو یہ

چیز کارِ عبث ہم کیوں کریں کہ کرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ یہ کہیں گے کہ ہم ایمان لے آئیں گے' ہوسکتا ہے زبان سے یہ اقرار بھی کریں ہم تو اسے ایمان تسلیم ہی نہیں کریں گے۔ تو اتنا کچھ کرنے کے بعد جو ہم نے ان سے کہنا ہے کہ نہیں بھئی! تم اب بھی ایمان نہیں لائے تو یہ کچھ ہم کرائیں ہی کیوں ان سے۔ دیکھا بات کیسے صاف ہوتی ہے۔ می نہ سزد خدائے را۔ قانون یہ ہے ہمارا وَ یَجۡعَلُ الرِّجۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یَعۡقِلُوۡنَ (10:100) اب اَکۡثَرَھُمۡ یَجۡھَلُوۡنَ (6:111) جو تھی اس نے نگاہ کا رخ پھیر دیا کہ کوئی بات عقل و فکر کی کہیں آنی ہے۔ یَّشَآءَ اللّٰہُ (6:111) یہاں آ گیا وَ لَوۡ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ دیکھ لیجیے اس کی خود تشریح کر رہا ہے۔ قرآن اپنے ہر لفظ کی اپنی ہر آیت کی تفسیر آپ بیان کرتا ہے۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب' سورج کو چراغوں سے ڈھونڈا نہیں جاتا' ضرورت ہی نہیں اس کی ہوتی۔ دعویٰ ہے قرآن کا' خدا نے خود کہا ہے کہ ہم اس کی تشریح کرتے ہیں ہم اس کی تفسیر کرتے ہیں۔ اور وہ ہے تصریفِ آیات سے کہ ایک مقام پہ کوئی چیز آئے' قرآن کے دوسرے مقامات متعلقہ جو ہیں وہ سارے سامنے لے آؤ بات صاف ہو جائے گی۔

قرآن حکیم کے ان حقائق کے برعکس ہمارا مروجہ لٹریچر

اب یہ جو چیز ہے اس قسم کے تقاضے کرنے والے' ان کو اہمیتیں دینے والے' ہر وعظ کی مجلس میں ہر میلاد کی محفل میں اور بڑی بڑی مستند کتب میں دلائل النبوت کے متعلق منہاج السنۃ کے متعلق یہ بڑی بڑی اہم کتابیں ہیں آئمہ کرام کی لکھی ہوئی ان میں معجزات۔ تو آپ دیکھتے ہیں کہ معجزات کا ذکر تو بڑا ہی دلکش ہوتا ہے۔ پھر کچھ وہ معجزہ ہوتا ہے پھر اس کے ساتھ زیبِ داستاں ہوتی ہے۔ تو یہ باتیں بڑی دلکش ہوتی ہیں۔ کہا یہ جو اس قسم کی باتیں کرنے والے ہیں' خدا کی طرف سے معجزات دیے گئے پھر معجزات میں وہ عجوبے شامل کیے گئے پھر اس کے ساتھ ملمع سازی کی باتیں شروع کی گئیں بڑی دلکش بڑی حسین۔ کہا وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیۡنَ الۡاِنۡسِ وَ الۡجِنِّ (6:112) ایسا کرنے والے ان نبیوں کے دوست نہیں ہیں یہ ان کے دشمن ہیں کہ جو وہ دین لے کے آئے تھے جو اس کی بنیاد تھی اس دین کی' اس کو مسمار کرنے کے لیے' منہدم کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ دشمن ہیں یہ۔ ابھی ابھی عرض کرونگا۔ آیت ختم نہیں ہوئی۔ جن و انس کئی دفعہ یہ بات آ چکی ہے۔

قرآن حکیم کے آئینہ میں جن و انس کا حقیقی تصور اور لفظ جن کا لغوی مفہوم

عربوں کی اس زمانے میں جتنی شہری آبادیاں ہوتی تھیں آپس میں مل جل کر رہنے والے' ان کو وہ انس کہتے تھے۔ اور بیشتر ان کی آبادی صحراء نشین قبیلے تھے خانہ بدوش' وہ صحراؤں میں رہتے تھے عرب میں آج بھی جا کے دیکھئے' سینکڑوں میل تک ایسے ریگستان آتے

ہیں جہاں آبادی ہی نہیں ہوتی۔ کہیں نخلستان کے اندر دو تین ٹینٹ لگے ہوئے ہیں اس میں دو چار گھر آباد ہیں' یہاں پانی ختم ہوا گھر کو کندھے پہ رکھا اور پھر چلے گئے آ گئے' آج یہاں ہیں کل وہاں ہیں۔ وہ آبادیوں میں آتے ہی نہیں تھے کبھی کبھی آتے تھے ''جس طراں اے تہاڈے لگھو گھوڑے والے اوندے نا کدی کدی''۔ اب تو انہوں نے بھی قریب آنا شروع کر دیا ہے شہروں کے ورنہ ہم نے دیکھا ہے بچپن کے زمانے میں ان کی عورتیں بھی آتی تھیں ''اوزیارتاں وکھان والیاں' ڈراونداسی'' اب آپ لوگوں کو تو پتہ نہیں دیکھی تھیں کبھی' وہ آ کے ہماری عورتوں میں خاص طور پہ رمضان کے مہینے میں ایک کتاب ہوتی تھی ان کے پاس اور اس میں وہ عذابِ قبر اور عذابِ جہنم کی تصویریں بڑی بھونڈی سی ویسے بنی ہوئیں' بیچ میں وہ بیٹھی ہوئی ہیں ارد گرد عورتیں ہماری بٹھائی ہوئی ہیں ''نزلہ ہو جانداسی رورو کے' نک سونج دی پیاں تے اکھاں پونجدیاں پیاں' تے اوہدے بعد جناب کوئی کڑا لا کے دیندی اے کوئی مندری دیندی اے''۔ یہ آتے تھے یہ سانپ والے سپیرے' ان کا پتہ کچھ نہیں ہوتا تھا کہ یہ کہاں رہتے ہیں بڑی دور رہتے تھے یہ آبادیوں سے۔ ریگستان میں رہنے والے خانہ بدوش' سینکڑوں میل تک آبادی نہیں ہوتی تھی وہ کبھی ادھر آتے ہی نہیں تھے۔ کبھی کبھار کوئی چیز وہاں کی کوئی ان کے ہاں کی کوئی کھجوریں فالتو ہوئیں تو لے گئے بیچ گئے۔ یہاں آنے کے بعد وہ نمک وغیرہ لے گئے۔ انہیں وہ کہتے تھے جن' جن کے معنی عربی زبان میں ہوتا ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ رہیں' دور رہیں۔ تو یاد رکھئے! انس اور جن جہاں قرآن میں آتا ہے ''آ چنبڑ جان والا جن نئیں ہوندا او' اوتو وچارے بڑی دور رہندے سن اے چنبڑن والے ہوندے ہیگے سوری دے''۔ یہ یہاں کے ہوں یا وہاں کے ہوں' افسانہ گو جسے قرآن نے سامری کہا ہے' سامری کے معنی ہیں داستاں گو' بڑی دلچسپ کہانیاں کہنے والے۔ یہ ہیں عَـــــدُوًّا ہر نبی کے اس قسم کے دشمن پیدا ہوتے رہے۔ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ (6:112) کہا یہ شہروں میں رہتے ہیں وہ جنگلوں میں بستے ہیں اور یہاں بھی جب دیکھئے تو سب ایک قسم کی بات کرتے ہیں یہاں سنئے وہی معجزہ ہرنی کا' وہاں سنئے وہی معجزہ اس چیز کا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بھی ان کی ایک تنظیم ہے وہ ایک دوسرے کو یہ ساری چیزیں Pass-on کرتے رہتے ہیں یہاں سے وہاں' وہاں سے وہاں' ایک تنظیم کے ذریعے یہ سارا کچھ ہوتا رہتا ہے۔ کیا کرتے ہیں؟ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (6:112) یہ کرتے ہیں۔ پھر وہی بات آ گئی' کاہے کے لیے کرتے ہیں درمیان میں ایک ٹکڑا آیا ہے وہ بعد میں لوں گا تسلسل یوں قائم رہتا ہے اس کا' اگلی آیت۔ وَ لِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ لِيَرْضَوْهُ وَ لِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ (6:113) کیوں یہ کچھ کرتے ہیں؟ اس لیے کہ یہ لوگ جو عقل وفکر کی رو سے ایمان نہیں لائے اللہ اور آخرت پہ پیدائشی مسلمان' سنے سنائے ہوئے' یونہی اسلام لائے ہوئے یہ جو لوگ ہیں تاکہ وہ ان کی طرف مائل رہیں۔ کہیں اُن کی طرف رخ نہ کر لیں جو انہیں قرآنِ خالص اور عقل وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ غور فرمایا آپ نے عَـدُوًّا دشمن ہیں یہ دین کے' رسول کے۔ تاکہ ہماری طرف لوگ آئیں۔

دین کی آڑ میں مذہب کا پرچار اور پیٹ کے دوزخ کا علاج

آپ دیکھتے ہیں کہ وعظ کی مجلسوں میں ان محافل میں جہاں یہ معجزات بیان ہوتے ہیں یہ اس قسم کے وعظ' کتنی خلقت وہاں گئی ہوتی ہے' جھوم رہی ہے' ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ بڑا مولوی وہی کہلاتا ہے' دو چیزیں اس میں ہونی چاہئیں ایک تو لاؤڈ سپیکر اس کے گلے میں ہونا چاہیے باہر نہیں اور دوسری چیز یہ ہے کہ وہ اس قدر افسانوی باتیں کرتا چلا جائے کرتا چلا جائے بالکل وہ امیر حمزہ کی داستان کی طرح۔ جتنا زیادہ اس قسم کی باتیں کرنے والا ہوگا اتنا ہی زیادہ جاذب مولوی کہلائے گا' دور دور سے بلاتے ہیں اس کو۔ وہ کہتا ہے یہ اس لیے یہ کرتے ہیں کہ لوگوں کا ہجوم ان کے گرد رہے اور جو کچھ وہ کہیں وہ اس سے مطمئن رہیں' سبحان اللہ سبحان اللہ صاحب! اسلام کی عظمت اسلام کی خوبیاں ایسی بیان کیں انہوں نے سچی بات ہے اللہ کا کلام ہے یہ۔ وہ فلاں نے پھونک دیا اس پہ اور درد دور ہوگیا۔ فلاں نے ہاتھ پھیر دیا یہ ہوا' حضور نے یہ کر دیا تو مردہ بولنے لگ گیا' کنکریوں نے آوازیں دیدیں۔ یعنی وہ اس سے مطمئن ہوجائیں اور اصل چیز وَ لِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ (6:113) کہ جو کچھ یہ کمائیاں کرتے ہیں اسی قسم کی یہ کرنے لگ جائیں' بات تو ساری اتنی سی ہے ''ست پیسے''۔ شہر میں گول باغ جو ہیں ان میں جس قسم کی وعظوں کی مجلسیں لگتی ہیں۔ سحری کے بعد یا نماز فجر کے بعد شروع ہوجاتی ہیں (سنا ہے میں نے دیکھا نہیں ہے) کہ وہ دس دس گیارہ گیارہ بجے تک (عام طور پہ عورتیں زیادہ ہوتی ہیں اس میں) اور اس کے بعد پھر وہ کہتے ہیں کہ نوٹ اور زیور اور روپے یہ اتنا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ اس لیے کہ جو کمائی وہ کرتے ہیں اس میں ان کا بھی حصہ آجائے۔ مطلب یہ ہوا یہ سب اس لیے کیا جا رہا ہے۔ اور یہ دشمن ہیں دین کے' دشمن ہیں نبی کے۔ یہ اتنا کچھ کہنے کے بعد اس کلائمکس پہ پہنچنے کے بعد سوال پیدا ہوا کہ پھر دین کیا ہے کہاں سے یہ بات لیں ہم دینِ خالص جسے کہا گیا ہے۔ یہ ساری چیزیں وراثتاً عقائد چلے آ رہے ہیں مسلمات مانے جا رہے ہیں' ان کو کہا جا رہا ہے یہ دشمن ہیں نبی کے۔ افوہ۔ سب سے بڑے محبان رسول ﷺ جو اپنے آپ کو کہہ کے بتاتے ہیں قرآن ان کو کہہ رہا ہے دشمن ہیں۔ شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ (6:112) عوام نہیں ان کے' ان کے شیاطین ہیں یہ دشمن ہیں نبی کے یہ کرنے والے۔

دین میں حکم خداوندی کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہوتا اسی کا نام قرآنی حکومت الٰہیہ ہے

سوال پیدا ہوا پھر اس کے بعد یہ تو نفی ہوگئی حصہ لا ہے Negative ہے یہ غلط ہے یہ دین نہیں ہے۔ کہاں سے دین لیا جائے؟ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا (6:114) ہر معاملے میں فیصلہ کن بات' کہا کیا خدا کے سوا میں کسی اور کو اپنا فیصلہ دینے والا مان لوں۔ بات یہ کہی خدا کے سوا کسی اور کو فیصلہ دینے والا تسلیم کرلوں' کیا ایسا کروں میں۔ فیصلہ دینے والا' حاکم جس کا ترجمہ اب کرلیا جاتا ہے صرف خدا

ہے۔اب یہاں سے دیکھئے یُضِلُّ بِہٖ کَثِیۡرًا وَّ یَھۡدِیۡ بِہٖ کَثِیۡرًا (2:26) آپ دیکھئے گا کہ کس طرح سے یعنی یہ جوعلمبردار ہیں بڑے بڑے مذہب کے نام کے وہ کیسے فائدہ اٹھاتے ہیں ان چیزوں سے۔ یہ بڑی چیز تھی خدا کے علاوہ کسی اور کو حاکم تسلیم کرلوں؟۔

ہمارے ہاں ایک سلوگن چلا ہے' حکومت صرف خدا کی ہے حکومتِ الٰہیہ قائم ہوگی اقتدارِ مطلق صرف اس کو حاصل ہوگا اسلامی مملکت وہ ہوتی ہے جس میں خدا کو Sovereign Authority مانا جائے حاکم اسے تسلیم کیا جائے'۔ یہی ہے نا سارا کچھ' تو یہ تو ٹھیک ہے قرآن یہ کہتا ہے بالکل یہ دین کے مطابق بات نظر آتی ہے۔خدا کے علاوہ اور کسی کو ہم حاکم نہیں مانتے' اگلی بات یہ ہے کہ خدا تو ہمارے سامنے کرسی پہ بیٹھا ہوا نہیں ہے۔کیسے پتہ چلے کہ یہ خدا کا فیصلہ ہے کہاں سے معلوم کیا جائے' کہا جو ہم کہیں وہ خدا کا فیصلہ ہے۔ چلئے جی۔آپ دیکھتے ہیں کہ کس فریب سے بات وہیں لے کے چلے آئے' جو ہم کہیں وہ ہے فیصلہ'۔حکومت خدا کی ہے' پھر؟ اقتدار ہمیں دیدو۔

مذہبی پیشوائیت کا انداز' حکمرانی جو خدا کے نام پر کی جاتی ہے

اس طرح فریب دیا جاتا ہے قرآن کے ہی الفاظ سے۔ہم حکومتِ خداوندی قائم کریں گے' اچھا جی!!۔سمٹ سمٹا کے تھیوکریسی پہ آپ آ گئے یعنی خدا کے نام پر مذہبی پیشوائیت کی حکومت۔ کسی چنگیز اور ہلاکو کی حکومت میں بھی وہ مظالم نہیں ہوتے۔ جو خدا کے نام پہ یہ کرتے ہیں۔تاریخِ انسانیت اس کی شہادت دیتی ہے جتنا خون خدا کے نام پہ حکومت قائم کرنے والوں کے پنجوں سے ٹپکتا ہے' شیطان کے پنجے سے اتنا نہیں ٹپکتا۔اس لیے کہ اس کے خلاف کوئی ایک لفظ نہیں کہہ سکتا' کہا نہیں تو مرتد قرار دیا نہیں۔ یہاں پھر ہم ٹھٹک گئے کہ بات تو قرآن نے یہ کہی تھی۔اب خدا تو سامنے نہیں ہے ٹھیک ہے۔خدا کی بات کہتے ہیں کہ ہم تمہیں جو کچھ کہتے ہیں وہ خدا کی بات ہے۔ میں نے عرض کیا ہے۔قرآن ہے افسانہ نہیں ہے Sentence ختم نہیں ہوا' فقرہ ابھی شروع ہوا ہے سنئے کیا جواب ملتا ہے۔اَفَغَیۡرَ اللّٰہِ اَبۡتَغِیۡ حَکَمًا (6:114) کیا خدا کے سوا میں کسی اور اپنا حاکم تسلیم کرلوں وَّ ھُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ اِلَیۡکُمُ الۡکِتٰبَ مُفَصَّلًا (6:114) اس نے ہمارے لیے کہ خدا کا فیصلہ کسے کہتے ہیں ایک کتاب بھیج دی۔بات ختم ہوئی۔اقتدارِ مطلق اقتدارِ اعلیٰ (Sovereign Authority) خدا کی کتاب ہے بات صاف ہوگئی۔سوال ہی نہیں کسی انسان کا اس میں۔

مختلف خودساختہ تفسیروں کی تعبیرات کا نتیجہ اور اس کے برعکس قرآن حکیم کا دعویٰ

بڑی پیچیدہ ہے بڑی مشکل ہے بڑی الجھنیں ہیں اس کی Interpretations بڑی مختلف ہیں تعبیرات بڑی مشکل ہیں۔یعنی پہلے اپنے ہاں تفسیروں میں ایسا کچھ کردیا ایک کی دوسرے کے ساتھ ملتی نہیں اور اس کو دلیل بنالیا کہ قرآن کی تفسیرات قرآن کی تعبیرات

میں اختلاف ہے۔یعنی ''تیلی وی کیتا تے رکھاوی کھادا'' یہاں تک آ بھی گئے کسی طرح سے قرآن تک پھر بھی نہیں آنے دینا کہ تعبیرات میں اختلاف ہے پھر کیا کرو گے۔یعنی یہاں تک نہ آ جائے کوئی کسی طرح سے۔اور قرآن یہ کہتا ہے کہ میرے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے۔کہا اس میں اختلافی بات نہیں ہے تو یہ مختلف مفسروں کی تفسیریں کیوں مختلف ہیں۔یعنی اس کا الزام قرآن پہ ہے۔قرآن کے ان دعاوی کو کیا کریں گے 'کتاب ہے مفصل' ۔مفصل کہتے ہیں عربی میں نکھار کے الگ الگ کر کے جو بات کہی جائے۔تفصیل کے معنی ہوتا ہے الگ الگ بات کہنا۔یہ جو جوڑ ہوتے ہیں اس طرح سے الگ الگ آپ کو پتہ ہے یہ وجہ المفاصل کہتے تھے جوڑوں کے دردکو عربی زبان میں۔فصل کے معنی ہوتا ہے الگ الگ چیز کرنا' فاصلہ اسی طرح سے لفظ آیا ہے۔الگ الگ کر کے نکھار کر بات کر دینا کوئی کسی قسم کی پیچیدگی نہ جس میں ہو۔وَ لَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا (18:1) قرآن نے کہا ہے کوئی پیچیدگی نہیں اس کے اندر۔جتنے آپ اختلافات دیکھتے ہیں یہ سارے لوگوں کے اپنے خیالات ہیں جن میں اختلاف ہوتا ہے ورنہ

میرے ساقی نے عطا کی ہے مے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں

یہ سارے جو رنگ کے اختلافات نظر آتے ہیں یہ انسانی خیالات کے پیمانوں کے رنگ ہیں۔اس میں تو کوئی بات ایسی اختلافی نہیں ہے۔اب بات صاف ہوگئی کہ ان کی نہیں ماننی' ماننی کس کی ہے؟ خدا کی ماننی ہے۔کیسے مانیں۔خدا تو اب کسی سے ہمکلام ہوتا نہیں؟ کہتا ہے وَّ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (6:114) اور اب تمہیں کیا ضرورت رہ گئی اس نے ایک ضابطۂ قوانین نازل کر دیا۔جسے آپ حکومت کی اطاعت کہتے ہیں وہ کیا ہوتی ہے؟ اس کے ضابطۂ قوانین کی اطاعت ہوتی ہے۔اول تو حکومت کا لفظ ہی ایک Abstract ہے یعنی اگر آپ چٹھی حکومت کو لکھ کر ڈاک خانے میں ڈال دیں کسی کو بھی نہیں ملے گی وہ۔کیا چیز ہے جسے آپ کہتے ہیں؟ یہ حکومت کے فیصلے حکومت کے احکام کی اطاعت' وہ کوئی لکھی ہوئی کتاب ہوتی ہے کوئی آرڈیننس سہی کوئی قانون سہی کچھ بھی سہی۔ہیئت حاکمیہ اس چیز کو حاصل ہوتی ہے جس میں قوانین ہوتے ہیں۔تو خدا کی حکومت کے معنی یہ ہیں وَّ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (6:114) اور اسی لیے قرآن نے دوسری جگہ جو کہا ہے وَ مَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ہیں' انہیں کافر کہا جاتا ہے۔دیکھا آپ نے خدا کی اطاعت یا اس کی حکومت کے معنی کیا ہیں۔اب اگر خدا کی کتاب کی طرف ان کو لے کے آیئے تو ان کا کوئی قول تو ایک طرف رہا سرے سے مذہبی پیشوائیت ہی غائب ہو جاتی ہے' پریسٹ ہڈ کا نام ہی نہیں رہتا۔

قرآن حکیم کے بدترین دشمن ملوکیت قارونیت ہامانیت کی چابک دستیوں کی وضاحت

قرآن نے تین ہی تو چیزیں ہیں جن کو انسانیت کا بدترین دشمن قرار دیا ہے ملوکیت: یعنی کسی انسان کا فیصلہ دوسرے انسان سے منوانا یہ ہے ملوکیت عزیزانِ من! خواہ وہ پارلیمنٹ کی کیوں نہ ہو Democracy کیوں نہ ہو۔ قارونیت: سرمایہ داری' محنت کشوں کی محنت کو غصب کر کے لے جانا۔ اور ہامانیت: پریسٹ ہڈ' خدا کے نام پہ اپنا اقتدار قائم کرنا۔ جب ان سے کہا جائے' قرآن کی طرف آؤ تو چونکہ اس میں پریسٹ ہڈ ختم ہو جاتی ہے' قارونیت بھی ختم ہو جاتی ہے اس میں فرعونیت بھی ختم ہو جاتی ہے اور تینوں ہی تو یہ اوپر بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جمہوریت کے پردے میں اپنی پارٹی کو اکثریت میں لا کے قانون سازی کا اختیار اسے دیدینا اس سے بڑی ملوکیت اور کیا ہے۔ کیا حق حاصل ہے اس کو کہ جو آج کسی طرح سے بھی اکیاون ووٹ لے گیا ہے وہ اپنے فیصلے کو اپنے حکم کو باقی سارے ملک سے منوائے۔ او میرے اللہ!!۔

وہ تو آپ کہیے کہ قسمت اچھی تھی آپ بچ گئے اس کی عقل پہ پردہ پڑ گیا جسے مجیب کہتے ہیں آپ' میں نے تفصیل سے اس دفعہ لکھا ہے اپنے کنونشن کے ایک باب میں' ورنہ جس قسم کی Absolute Majority وہ لے گیا تھا الیکشن میں وہ اگر اس قسم کی فساد انگیزیوں کے خیالات نہ برپا کرتا اس قسم کی بغاوتوں والی بات جو تھی وہ میں نے کہا ہے کہ قدرت نے بچانا تھا' ورنہ آئینی طریقے سے پرامن طریق سے یہاں آ کے بیٹھ جاتا' 51 ووٹس نہیں Absolute Majority یعنی Constitutionally ہر چیز جو چاہتا کرتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر آپ نے تو جمہوریت کو عینِ اسلام بھی کہہ دیا۔ انسان کا فیصلہ ملوکیت' کسی کی محنت کو عقب کر کے لے جانا قارونیت اور خدا کے نام پہ اپنی بات منوانا کسی سے بدترین قسم کی غلامی جو ہے یہ مذہبی پیشوائیت۔ قرآن کی طرف آنے سے عزیزانِ من! یہ تینوں چیزیں ختم ہو جاتی ہیں اس لیے نہیں آنے دینا چاہتے۔

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے باہمی طور پر تحریک طلوع اسلام کی مخالفت کا انداز

پھر معاف رکھیے گا اگر میں درمیان میں آ جائے۔ اس تیئیس چوبیس سال میں آپ دیکھیں گے یہ جتنے مذہب کے اربابِ وغیرہ تھے انہوں نے مختلف پارٹیوں سے مفاہمت کی آج اس سے میل اس سے جوڑ اس سے توڑ آج اس سے بگاڑ کل اس سے مصالحت یعنی مفاہمت بھی ہوئی مخالفت بھی ہوئی' ادل بدل رہا۔ لیکن ایک مخالفت ایسی ہے جو مستقل طور پہ ہوتی رہی اور ان کے ہر فرقے کی طرف سے ہوتی رہی۔ آپ دیکھیں گے تو دیوبندی بریلوی تک کی بھی آپس میں' حنفی اور اہلِ حدیث کی بھی آپس میں اتنی زیادہ چلتی ہے۔ لیکن ایک مخالفت ہے جس میں مسلسل چلے آ رہے ہیں سارے' متحد چلے آ رہے ہیں یہ جتنی مذہبی پیشوائیت ہے' کس کی مخالفت ہے وہ؟ قرآن

کی مخالفت۔ آپ کہیں گے یہ کیا کہہ دیا۔ پاکستان میں ایک ہی تحریک ہے، جو قرآنِ خالص پیش کر رہی ہے وہ طلوعِ اسلام کی تحریک ہے، وہ پرویزؒ کا نام ہے۔ آپ دیکھیں گے چوبیس سال میں ہر فرقے نے مخالفت کی، مسلسل مخالفت کی۔ کہتے ہیں کہ اطاعت صرف قرآن کی ہے۔ یہ کہہ کے مخالفت کر رہے ہیں۔ اب آپ نے دیکھ لیا قرآن کیا کہتا ہے۔ **وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ** (6:112) دیکھا کس طرح دشمن ہیں یہ اس کے۔ نبی کے دشمن کیا معنی ہیں؟ وہی چیز جو نبی پیش کرتا ہے۔ **وَّ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ** (6:114) میں عرض کروں یہ جو چیز تھی کہ نہایت ملمع دار باتیں بڑی دلکش بڑی جاذب افسانے یہ کیا چیز ہے۔ دوسرے مقام پہ قرآن نے اس کی تفصیل دی ہے یہ ریفرنسز آپ لکھتے جایا کیجیے گا بڑے کام کی چیزیں ہیں پتہ نہیں دوبارہ موقعہ یا نہ ملے۔ (22:52)۔ کہا کہ یہ کرتے کیا ہیں یہ ملمع ساز باتیں کرتے کیا ہیں۔

کتاب اللہ کی روشنی میں خدا تعالیٰ کا پروگرام اور اس کے ساتھ ہونے والے سلوک کی حیثیت

ایک بہت بڑی خدائی پروگرام کی تدبیر تھی کہ قرآن کو اس نے محفوظ رکھا۔ ٹھیک ہے۔ اس سے پہلے کرتے یہ تھے یہ مذہبی پیشواء کہ خود خدا کی کتاب کے اندر خود ہی کچھ ملا دیتے تھے۔ محفوظ وہ ہوتی نہیں تھی اس کے اندر کچھ گڑبڑ کر دیتے تھے۔ **يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ** (2:79) اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے کہتے تھے خدا کی کتاب ہے، رکھتے تھے گپت ودیا۔ آپ کو پتہ ہے ویدوں کے متعلق ان کی اصطلاح ہے گپت ودیا مخفی علم۔ وہ جو آپ کے ہاں طریقت میں چلتا ہے سینہ بہ سینہ۔ عوام کو معلوم نہیں ہوتا تھا خود اس کے اندر اضافے کرتے تھے، ترمیم و تنسیخ کرتے تھے۔ خدا نے اس کتاب کو محفوظ کر دیا کہ اس میں یہ ہو نہیں سکتا۔ انہوں نے کہا بہت اچھا جناب! ہمارا بھی تو آخر ہاتھ اٹھتا ہے گریباں تک، کر لیجیے محفوظ اس کو۔ اب اس کے بعد یہ چیز تھی کہ جو بھی اپنی طرف سے یہ کرتے وہ اس سے الگ رہتا کہا جا سکتا تھا کہ خدا کی وحی یہ ہے اور یہ وحی نہیں ہے کچھ بھی کہہ لو اسے وہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ یوں کام نہیں چلتا۔ کہا وحی دو قسم کی ہوتی ہے اس کا ایک حصہ قرآن کے اندر ہے اور دوسرا حصہ ہماری ان کتابوں کے اندر ہے وہ بھی وحی ہے یہ بھی وحی ہے۔ اور وہ ایسی وحی ہے اس کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ جبریل اسی طرح سے اس کو لے کے نازل ہوتے تھے جیسے قرآن کو لے کے۔ یہ ان کے الفاظ میں دہرا رہا ہوں عزیزانِ من!۔ اور اس کے بعد یہ عقیدہ ہے کہ بخاری اور مسلم کے جو حدیثوں کے مجموعے ہیں ان کی کسی ایک حدیث کے انکار سے کفر لازم آ جاتا ہے کیونکہ وحی ہے۔ غور کیا آپ نے پھر کیسے منوایا۔ اب وہ جو جتنی بھی تفسیروں میں اختلافات جسے وہ Different Interpretations کہہ دیتے ہیں آج، وہ ذرا ماڈرن الفاظ استعمال کرتے ہیں، وہ سارے اس حصے کی وجہ سے ہیں کہ جس کو برابر کی وحی قرار دیدیا۔ سنئے قرآن کیا کہتا ہے کہ یہ لوگ کرتے کیا ہیں۔ **وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ** (22:52) ہوتا یہ تھا کہ رسول آتا تھا جو بھی وہ خدا کی وحی تلاوت کرتا تھا۔ ان کو دیتا تھا یہ

جو شیطان تھے یہ اس کے اندر کچھ ملاوٹ کر دیتے تھے۔ یہ تھا ان کا طریقہ۔ پھر خدا کرتا یہ تھا کہ **فَیَنۡسَخُ اللّٰہُ مَا یُلۡقِی الشَّیۡطٰنُ ثُمَّ یُحۡکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ** (22:52) تو پھر خدا کرتا یہ تھا کہ ایک اور رسول بھیجتا تھا وہ آ کے جو کچھ انسانوں کی آمیزش ہوتی تھی وحی خداوندی میں، اس کو الگ کر دیتا تھا اور خالص وحی پھر دے جاتا تھا۔ کہا کہ یہ ہوتا چلا آ رہا تھا **مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ** (22:52)

کتاب اللہ کے متعلق جناب مودودی صاحبؒ کا ایک انوکھا فرمان اور قرآن حکیم کا واضح ارشاد

اے رسول تمہاری طرف جو ہم نے وحی بھیجی اور اس کے لیے ہم نے انتظام کر دیا **اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ** (15:9) ہم نے اسے نازل کیا ہم اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیتے ہیں اب اس کے اندر کوئی نہیں ملا سکتا کچھ۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے جی بٹھا دیجیے سارے، کر دیجیے بند دروازے ہمارے ان پہ نہیں جا سکتے۔ تو انہوں نے اس کے ساتھ عقیدہ ہی یہ بنا دیا کہ وحی قرآن کے اندر تو (مودودی صاحب نے کہا تھا) 1/10 حصہ ہے 9/10 حصہ دین جو ہے ان میں ہے۔ اور ہے بھی، قرآن تو انکے مقابلے میں بڑی چھوٹی سی کتاب ہے یہ، زیادہ ضخامت وحی کی 9/10 حصہ جو ہے وہ ان کے اندر ہے۔ بچا لیجیے اس کو، کر لیجیے محفوظ!!!۔ کہا کہ یہ کرتے تھے۔ لیکن **وَ الَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہٗ مُنَزَّلٌ مِّنۡ رَّبِّکَ بِالۡحَقِّ** (6:114) یہ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے۔ اس کے معنی یاد رکھئے قرآن میں جہاں جہاں آیا ہے جس کو ہم نے کتاب دی، عام طور پہ سمجھا جاتا ہے جو پہلے اہلِ کتاب تھے ان کے متعلق کہا گیا ہے یہی نہیں ہے، اسلام لانے کے بعد بھی یہ کتاب کے وارث امت جو قرار پائی ہے۔ قرآن نے ان کو بھی کہا ہے وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی ہے جنہوں نے کتاب لی ہے۔

قرآن حکیم کو سمجھنے میں دو مختلف مدارج کے لوگ اور قرآن حکیم کی طرف سے راہنمائی کی کیفیت

میں دوسرے مقام پہ عرض کرونگا اس نے جماعتِ مؤمنین کے بھی دو درجے بنائے ہیں ایک تو وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ایک وہ ہیں جو واقعی اس کتاب کے اوپر غور و فکر کرتے ہیں۔ ان میں سے ہی جن کو کتاب دی گئی ہے **یَعۡلَمُوۡنَ** (6:114) وہ علم و حقیقت سے کام لیتے ہیں تو وہ جانتے ہیں کہ یہ واقعی تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے یہ لوگ ہیں جو یقیناً اس کو جانتے ہیں۔ اب رہے وہ لوگ جو کٹ حجتیاں کرتے تھے معجزات لائیے جب ہم مانیں گے اس دلیل سے نہیں وہ کچھ کیجیے۔ جب ہم کریں گے افسانے کچھ اس کے اندر بڑھائیے ہماری مرضی کے مطابق مفاہمت کیجیے کچھ Compromise کیجیے سب ہے، قرآن میں یہ۔ کہا اب یہ لوگ جو رہ گئے یہ محض کٹ حجتیاں کر رہے ہیں۔ بات بڑی صاف ہے جو ہم نے کہہ دی ہے لہٰذا **فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ** (6:114) ان کے ساتھ جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں ہے کتاب موجود ہے ان سے کہو عقل و فکر سے اس کے اوپر غور کریں غور کرنے کے بعد بات سمجھ

میں آ جائے گی۔اور اسکے بعد! اس کتاب کی قرآن نے جو خصوصیتِ کبریٰ بتائی ہے وہ ہے جو حرفِ آخر ہے۔ مفصل کتاب پہلے کہہ دیا' محفوظ کہہ دیا اس آیت میں اور کہا کہ لو بھئی! وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (6:115) تیرے خدا کی باتیں اس میں آ کے مکمل ہو گئیں' سچائیوں کو لیے ہوئے' عدل کو لیے ہوئے۔ تَمَّتْ مکمل ہو گیا ختم ہو گیا وہ سلسلہ اس کے اندر آ کے' مفصل ہو گئی کسی تفسیر کی ضرورت نہیں' محفوظ ہو گئی' اس کے اندر کچھ داخل نہیں ہو سکتا' مکمل ہو گئی تکمیل تک پہنچ گئی۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115) مکمل میں بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی اضافہ تو نہ ہو کوئی ترمیم ہو جائے اس کے اندر' ایک کی جگہ دوسری چیز لائی جائے' کہا کہ اب اس میں کوئی اس میں تبدیلی پیدا کرنے والا بھی نہیں آئے گا۔ اس لیے کہ یہ اس خدا کی کتاب ہے وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (6:115) جاننے والا سننے والا ہے۔ کتاب مفصل' محفوظ' مکمل' غیر متبدل۔

نبی اکرم ﷺ کے سر پر ختم نبوت کا تاج سجانے کا ثبوت' کتاب اللہ کی تکمیل ہی تو ہے

عزیزانِ من! ختم نبوت ﷺ کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو گی۔ رسول کتاب ہی تو لے کے آیا کرتا تھا اب جب کتاب وہ ہو کہ خدا یہ کہے کہ یہ حرفِ آخر ہو گئی تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ (6:115) ''ساڈیاں گلاں ای ایہدے اچ آ کے مک گیاں فیر ایہدے بعد''۔ محفوظ بھی ہو گئی ''ایہدے اچ تبدیلی دی وی لوڑ نئیں پینی''۔ نظر آتا تھا کہ انسانوں نے تو قیامت تک ابھی زندہ رہنا ہے زمانے کے تقاضے بدلتے چلے جانے ہیں کوئی اور چیزیں ہوتی جائیں گی اس کے مطابق اس کے اندر کچھ تبدیلی پیدا کرنا کچھ ایسا ہونا چاہیے۔ اس نے کہا کہ یہ کسی یونہی اندھے گونگے مصنف کی یا انسان کی نہیں کہ محدود اس کی عقل ہو وہ علیم ہے جس نے یہ کتاب دی۔ مکمل ہو گئی سارے کلمات ہمارے اس کے اندر آ گئے صدق و عدل کے ساتھ' محفوظ کر دی گئی کسی تبدیلی کی ضرورت اس کے بعد پیش نہیں آئے گی۔ اور اس کے بعد پھر آنے والے کا تصور غلط ہے یعنی وہ کا ہے کے لیے آئے گا۔ کتنے جامع انداز سے خدا نے اس کتاب کی خصوصیاتِ کبریٰ بتائیں ختمِ نبوت ﷺ جو ہے کہ ختم کر دیا۔

نبوت کی مہر کو توڑنے کی ناکام کوشش

لیکن جیسا انہوں نے کہا تھا کہ وحی یہی نہیں ہے اس کے بعد اتنا حصہ 9/10 اور بھی ہے' انہوں نے کہا کہ ہاں ٹھیک ہے رسول نہیں آئے گا جناب اسکے بعد' انہوں نے کہا کہ جی! مجدد آیا کریں گے جی وہ سو سال کے بعد۔ دوسروں نے کہا کہ جی ٹھیک ہے رسول نہیں آئیں گے' نبی آیا کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں نبی آیا کریں گے اصل میں۔ اگلے آئے انہوں نے کہا کہ وہ اس طرح سے کتاب میں تو نہیں لیکن خدا کی باتیں اس میں تو ختم ہو گئی ہو نگی لیکن باتیں بہت ہیں اس کے ساتھ' پھر جی؟ وہ حضرت صاحب ہر روز جا

کے ان سے باتیں کر کے آتے ہیں، سینہ بہ سینہ علم چلا آ رہا ہے۔ یعنی انہوں نے تو نبوت کا دروازہ بند کیا انہوں نے اس کمرے میں بیس کھڑکیاں کھول لیں کہ ''کر لے بند!!''۔ چلا ہوا ہے قصہ آنے والا، آنے والا۔ اواس کتاب کی موجودگی میں پھر؟؟۔ اتنی بڑی عداوت **عدوًا** جو قرآن نے کہا تھا اتنی بڑی حفاظت ہے ختم رسالت کے ساتھ۔ ختم نبوت ﷺ کا عقیدہ مانتے ہوا اور اس کے ساتھ یہ ساری چیزیں منوار ہے ہو۔ قرآن جیسی کتاب جس کو یہ کہا مکمل ہے ختم ہو گئے کلمات رب، غیر متبدل ہے، محفوظ ہے۔

وحی کے متعلق یہ عقیدہ کہ اس کا 9/10 حصہ قرآن سے باہر ہے، حکم خداوندی کے ساتھ عداوت ہے

کہتے ہیں مفصل نہیں ہے، مجمل ہے، تَـمَّـتْ نہیں ہیں، مکمل نہیں ہوئی ہیں اس کے بعد وہ 9/10 حصہ اس میں آیا ہوا ہے۔ یہ غیر مبدل والی بات بھی نہیں ہے! وہ آتے ہیں انہوں نے آن کے کہہ دیا کہ ٹھیک ہے۔ قرآن میں جہاد کا حکم تو ہے لیکن مجھے بھیجا اس لیے گیا ہے کہ میں آ کے کہہ دوں کہ نہیں۔ وہ جو حکم ہے وہ بدل گیا ہے اب جہاد کا حکم نہیں رہا ہے۔ یہ ہے دین۔ پھر سن لیجیے **اَفَغَيْـرَ اللّٰـهِ اَبْتَغِىْ حَـكَـمًـا وَّ هُـوَ الَّـذِىْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا.وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَـدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ هُوَ السَّـمِيْـعُ الْعَلِيْمُ** (6:114-115) دین مکمل ہو گیا۔ سورۃ الانعام کی آیت 115 تک ہم آ گئے 116 سے آگے لیں گے اور اس میں یہ آپ کو بتائیں گے یہ جمہوریت Democracy وہ کیا ہے اور قرآن کیا اس کے متعلق کہتا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

سترہواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 116 تا 120)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج نومبر 1971ء کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی آیت 116 سے ہو رہا ہے (6:116)۔

چودہ نومبر کے اتوار کو یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اکیس نومبر کو عید کی تقریب کی وجہ سے درس کا ناغہ ہوگا اور 28 تاریخ کو طلوعِ اسلام کنونشن کیوجہ سے ناغہ ہوگا درس کی جگہ کنونشن کا اجلاس ہونے والا تھا اس کی ساری تیاریاں ہو چکی تھیں کہ 23 تاریخ کو ہنگامی حالات کا اعلان ہو گیا اور ان حالات میں یہی مناسب سمجھا گیا کہ کنونشن کو ملتوی کر دیا جائے تو کنونشن ملتوی کر دیا۔ تو اس کے بعد پھر دوستوں نے یہ کہا کہ پچھلے اتوار کو بھی ناغہ رہا ہے اس اتوار کو اب کنونشن نہیں ہو رہا تو درس ہو جانا چاہیے۔ اس کی اطلاع تو ہم نے اخبارات میں شائع کر دی تھی لیکن نظر یہ آتا ہے کہ اکثر احباب پہلے اعلان کے مطابق یہی سمجھتے ہیں کہ آج درس نہیں ہوگا اس لیے وہ نہیں تشریف لا سکے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ ان کی شکایت کچھ بجا ہوگی ان سے معذرت چاہتا ہوں۔

درس کا آغاز جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے سورۃ الانعام کی 116 آیت سے ہو رہا ہے۔

تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ پچھلی آیت میں قرآنِ کریم نے زندگی کی راہنمائی کے لیے ایک مستقل غیر متبدل' ابدی

اصول دیدیا تھا اور وہ یہ کہ انسانوں کو اپنی زندگی کے لیے جن اصولوں کی ضرورت ہے وہ اس کتاب کے اندر مکمل طور پر دیدیے گئے ہیں وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (6:115) اس کتاب میں وہ تمام اصول جو خدا نے انسانوں کی راہنمائی کے لیے دینے تھے، وہ مکمل طور پر دیدیے۔ اور دوسرے مقام پہ ہے کہ پھر اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اس نے خود لے لیا۔ اور اس سے ذرا پہلے یہ کہا گیا کہ اَنْزَلَ اِلَیْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (6:114) تو گویا کتاب مفصل ہے، محفوظ ہے، لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115) ناقابلِ تغیر وتبدل ہے اور مکمل ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکے بعد تو پھر ضرورت ہی باقی نہیں رہتی، نہ کسی آنے والے کی، نہ کوئی چیز لانے کی۔ اور یہی زندگی کے وہ ضوابط اور اصول ہیں کہ جن کو اگر راہنما بنا لیا جائے تو پھر اس کارواں کو نہ رہزنوں سے خطرہ ہوتا ہے اور نہ ان راہنماؤں سے جو درحقیقت رہزن ہوتے ہیں لیکن نقاب راہنماؤں کا اوڑھا ہوتا ہے۔ اب اس کے بعد کسی کی اطاعت کی، کسی کے اتباع کی، کسی کی فرماں پذیری کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ زندگی کے اصول ہیں ان کے مطابق چلنا ہے۔ زندگی، اس میں شبہ نہیں کہ دین کے اعتبار سے اجتماعی زندگی ہے، اجتماعی طور پر ان اصولوں کی پیروی ہم نے کرنی ہے۔ اس کا نام آپ کا نظامِ مملکت ہوگا۔ اسی کو آپ کا اسلامی دستور کہا جائے گا۔ یہی اصول سازی کے حدود ہونگے۔ اسی کے اندر محصور ہوگی آپ کی ساری زندگی۔ وہ جو میں مثال دیا کرتا ہوں پلے گراؤنڈ کی وہ حدود وہ قواعد کہ جن کے اندر رہتے ہوئے ٹیم کو اجازت ہوتی ہے کہ اپنے گیند کو گول کے اندر لے جائیں مقابل کی ٹیم کے ٹکراؤ کا مقابلہ کرتے ہوئے۔ یہ حدود غیر متبدل رہیں گی۔ ان کے اندر رہتے ہوئے آپ کو نقل وحرکت کی اجازت ہوگی ان اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزوی احکام وقوانین خود آپ متعین کریں گے۔ اور اس طرح سے یہ کاروانِ انسانیت منزل بہ منزل اپنے آخری مستقر تک پہنچ جائے گا۔ یہ ہے دین جو قرآن نے دیا ہے۔

انسانی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ باہمی طور پر ہر قسم کے تمدنی اور معاشرتی اصولوں کا متعین کرنا ہے

انسانوں نے جب سے تمدنی زندگی شروع کی یہ سوال ان کے لیے سردردی کا موجب رہا کہ باہمی نزاعات کے فیصلے کس طرح سے کیے جائیں۔ اس کے لیے انہوں نے بہت سے تجارب کیے۔ ابتدائی زندگی کے اندر وہی جو بعد میں ہمارے ہاں بھی پنچائیت سسٹم ہوتا تھا، وہ سسٹم انہوں نے Introduce کیا۔ ایک قبیلے کے اندر جو پنچ تھے بڑے لوگ وہ بیٹھ کے باہمی مشاورت سے متنازع فیہ مسائل کا حل دیدیتے تھے۔ اس سے ذرا آگے بڑھے تو کچھ لوگ جو ان میں ذرا زیادہ زیرک تھے، انہوں نے اس فیصلے کی قوت اور اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا تو اس سے آپ کے ہاں مذہبی پیشوائیت وجود میں آئی۔ انہوں نے یہ فریضہ سنبھالا۔ اس میں لذت تو بڑی ہوتی ہے کسی دوسرے سے اپنا حکم منوانا۔ اسی نے آگے چل کر ایک شخصی حکومت کی Autocracy کی شکل اختیار کی، اس کا نام بادشاہ رکھ لیجیے، آج کے دور میں ڈکٹیٹر رکھ لیجیے۔ پھر یہ گٹھ جوڑ ہوا مذہبی پیشوائیت کا اور اس حکمران کا۔ انہوں نے اس کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا کہ اسے

خدائی حقوق حاصل ہیں بلکہ کہا یہ کہ وہ خود خدا کا اوتار ہوتا ہے۔ راجہ خدا کا اوتار بنایا گیا۔ اور وہی چیز جو آپ کے ہاں السّلطان ظِلُّ اللہ علی الارض کہا گیا کہ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ اسے حقوقِ الوہیت دیے گئے' خدائی اختیارات دیے گئے Divine Rights of the King آپ کے ہاں آج تک چلا آ رہا ہے۔ پھر یہ تصور ان کے ہاں انہوں نے قائم کیا اور اس طرح سے زندگی اپنی چلائی۔ لیکن جو طریقہ بھی انہوں نے وضع کیا' چند قدم پر چلنے کے بعد انہوں نے دیکھا کہ نہیں! تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی۔ پھر اس کو توڑا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا عقیدہ وضع کیا۔

عقل انسانی کا طویل سفر مختلف راہوں سے گزرتا ہوا جمہوریت تک پہنچا

اس کے بعد ہمارے دور میں وہ پرانا تصور جو دیا تھا' یہ تصور کوئی نیا نہیں Plato کا تصور ہے جسے ڈیماکریسی کہتے ہیں۔ یہ تو خود یونانی لفظ ہے۔ طے یہ کیا کہ لوگ خود اپنے معاملے آپ طے کریں۔ بظاہر الفاظ کے اعتبار سے تو اصول بڑا درخشندہ نظر آتا ہے۔ لیکن جب یہ سوچا گیا کہ کریں کس طرح سے' لوگ کوئی دو چار دس تو ہیں نہیں' کروڑوں کی تعداد ہے ان کی' ایک مملکت ایک Territory کے اندر رہنے والے بھی کروڑوں کی تعداد میں ہیں تو پھر یہ اپنے معاملات خود کس طرح سے طے کریں۔ تو اس کے لیے ایک مشینری وضع کی گئی۔ یاد رکھئے ڈیماکریسی یا جمہوریت کا اصول اور ہے اور اس کے تابع اس کی مشینری وضع کی گئی' جسے ہم جمہوریت کہتے ہیں۔

جمہوریت کے خدوخال اور اس کا نتیجہ

جمہوریت کی مشینری ہوتی ہے کہ لوگوں کے نمائندے چنے جائیں۔ کیسے چنے جائیں؟ پھر اس کے لیے طریقے وضع کیے گئے انتخابات کے ذریعے سے چنے جائیں۔ پھر جب وہ چنے گئے' اکٹھے ہو جائیں تو پھر کیا کیا جائے؟ پھر یہ کیا جائے کہ ان میں سے اکثریت جو فیصلہ دے' وہ فیصلہ باقی سب کے لیے قابلِ اطاعت ہونا چاہیئے' وہی ملک کا قانون ہونا چاہیئے' اس کی خلاف ورزی قانون کی خلاف ورزی سمجھی جائے' مستوجب سزا ہو جائے۔ پھر یہ اکثریت کس طرح سے طے کرے کہ وہ جو نمائندے اکٹھے ہوئے ہیں ان میں سے اکیاون کے ووٹ جس طرف جائیں اسے حق قرار دیا جائے' اسے عدل قرار دیا جائے' اسے انصاف قرار دیا جائے' اسے Right کہا جائے اور جو انچاس والے کہیں اس کو Wrong قرار دیدیا جائے۔ اگر ایسا اتفاق ہو جائے کہ اکیاون والے کہہ دیں کہ خدا نہیں ہے تو اسے حق قرار دیا جائے اور راتوں رات وہ کسی طرح دو ممبر اپنی طرف کھینچ کے لے جائیں تو دوسرے دن پھر یہ چیز کہ نہیں! خدا ہے اسے Right قرار دیدیا جائے۔ تو وہ صبح اور شام مداری کے نکلتے دھاگے اور چل بے ڈورے' یہ سلسلہ جاری رہے اور اس کا نام آپ کے ہاں ڈیماکریسی کی مشینری قرار پائے۔ آخری جو طریقہ انسان کے ذہن نے وضع کیا ہے اپنی تمدنی زندگی کے لیے اور جس پہ یہ بڑا ہی نازاں اور

فرحاں ہے۔

ہم نے اس بے لگام مغربی جمہوریت کو اسلامی جمہوریت قرار دے دیا' جو سراسر شرک پر مبنی ہے

یہ ہے طریقِ جمہوریت جسے کہا جاتا ہے۔ اور پھر غلامانہ ذہنیت تو ہماری ایسی ہے کہ جو چیز بھی وہاں سے آتی ہے' مذہب چونکہ ہمارے تحت الشعور میں ابھی ہے اس لیے اس کو فوراً ہم اسلامی کہہ دیتے ہیں۔ جمہوریت کا یہ طریق اسلامی ہے۔ اب اسلامی جمہوریت آپ کے ہاں ایک چیز آئی۔ یعنی جمہوریت جو اپنے اصل کے اعتبار سے یکسر شرک ہے' یکسر خلافِ اسلام ہے اس کے اوپر ایک لیبل لگ گیا اور جمہوریت اسلامی قرار پا گئی۔ جمہوریت اسلامی کی بنیاد یہ ہے کہ اقتدار یا Sovereignty جسے کہتے ہیں' قانون سازی کا آخری حق یا اختیار' یہ عوام کو حاصل ہے' اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں' یہ ہے بنیاد۔ Demo کے معنی ہوتا ہے عوام اور Cracy کے معنی ہوتا ہے حقِ اقتدار یا حکومت کا حق۔ یہ عوام کو قوم کو حاصل ہے' لوگوں کو حاصل ہے Government of the people by the people for the people ' People کو اس کا حق حاصل ہے۔ قرآن کی رو سے یہ بنیادی طور پہ شرک ہے وہ کہتا ہے کہ یہ اقتدار' اقتدارِ مطلق جسے کہا جاتا ہے Sovereignty جسے کہا جاتا ہے یعنی جس کے فیصلے کے بعد کسی اور کا فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ حرفِ آخر قولِ فیصل جس کا کہا جائے' اسے کہتے ہیں Sovereignty یا حقِ مطلق اقتدارِ مطلق' قانون بنانے کا' فیصلہ کرنے کا۔ کسے حاصل ہے؟ یہ ڈیما کریسی جو آخری نظام آپ نے وضع کیا ہے اس میں یہ عوام کو حاصل ہے' People کو حاصل ہے' قوم کو حاصل ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یکسر غلط ہے۔ خدا کے سوا کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ انسان انسان ہونے کی جہت سے سب برابر ہیں اور کسی برابر والے کو حق ہی نہیں ہوتا کہ کسی دوسرے پر اپنا حکم چلائے۔ اسی کو تو غلامی کہا جاتا ہے خواہ وہ اکیاون چھوڑ کر سو کے سو کیوں نہ ہو جائیں۔ اس نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ کفر اور ایمان کے مابہ الامتیاز خط یہ ہے کہ وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (5:44)

انسانی زندگی کے غیر متبدل عملی اصولوں کے لیے اقتدارِ مطلق صرف خالقِ کائنات کو حاصل ہے

یعنی میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ اقتدارِ مطلق جو Sovereignty حق آخری وہ خدا کو حاصل ہے۔ قرآن تو محض نظری یا ذہنی چیزیں نہیں دیتا وہ تو عملی زندگی کے متعلق عملی طریقے بتاتا ہے۔ تو سوال یہ پیدا ہوا کہ خدا تو ہمارے اندر ہے نہیں' نہ سامنے آتا ہے نہ کرسی پہ بیٹھتا ہے نہ فیصلے دیتا ہے تو اسکے فیصلے کہاں سے لیے جائیں؟ اس نے کہہ دیا کہ ہم نے تمہاری طرف اپنی کتاب نازل کردی ہے۔ فیصلے یا قانون بھی تو بالآخر قانون کی ایک کتاب ہوتی ہے ضابطۂ فوجداری' تعزیراتِ پاکستان قوانین کا ایک ضابطہ ہوتا ہے جس کی رو سے وہ

اقتدار بروئے کار آتا ہے۔تو اس نے کہا کہ یہ طریقہ ہے کہ ایک ضابطے کی کتاب ہوتی ہے جس کے مطابق اقتدار عملی طور پہ سامنے آتا ہے۔تو یہ ضابطے کی ایک کتاب ہم نے تمہیں دیدی ہے اس کے مطابق جو حکومت قائم کرے گا' اسے مومن کہا جائے گا جو اس کے مطابق نہیں کرے گا' اسے کافر کہا جائے گا۔تو اس کتاب اس نے کہا کہ یہ اقتدار اعلیٰ حقِ مطلق Sovereignty جو ہے' وہ اس ضابطۂ قوانین کو حاصل ہے۔اس کے مطابق اگر نظامِ حکومت قائم کیا جائے گا اور مطابق کے معنی ہونگے کہ یہ وہ حدود اور اصول ہیں' ان میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں ہے۔محفوظ ہیں یہ مٹ نہیں سکتے' غیر متبدل ہیں ان میں تغیر اور Change نہیں لایا جاسکتا Ammendment کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

وقت کے تقاضوں کے تحت غیر متبدل اصولوں کے نفاذ کی خاطر جزئیات کا تعین باہمی مشاورت سے کیا جائے گا

یہ ہیں یہ اصول' ایک ایک چیز کی جزئیات اس کے اندر نہیں دی گئیں کیونکہ جزئیات زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق بدلتی رہتی ہیں۔اصول تو یہ ٹھیک ہے کہ ننگے پاؤں نہیں پھرنا چاہیے جوتا ہونا چاہیے۔لیکن عمر کے اعتبار سے اس میں تبدیلی آتی جاتی ہے چھ سال کی عمر کا جوتا بیس سال کی عمر میں تو فٹ نہیں آتا۔یہ اتنی سی آزادی دی' باہمی مشاورت سے یہ چیزیں آپ طے کر لیجیے۔اصول نہ بدل سکتے ہیں نہ ان میں اضافہ ہوسکتا ہے نہ وہ مٹ سکتے ہیں' ابدی طور پر یہ باقی رہیں گے' مکمل ہیں غیر متبدل ہیں۔ان اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی امور اپنے طے کرلیا کرو۔کہا کہ یہ ہے نظام تمدنی زندگی کا تمہارے۔اب ہمارے سامنے ایک تو وہ انداز آیا جس میں کسی ایک فرد' ڈکٹیٹر کی' یا کسی پنچ کے گروہ کی اطاعت جو تھی' اسے پہلے نظام تصور کیا گیا تھا۔اس نے کہا کہ یہ بھی غلط ہے' سوال ہی نہیں ایک فرد ہو یا فرد سے زیادہ۔فرد کے متعلق تو یہ چیز کہہ دی کہ وَ لَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰهُ وَ كَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا (18:28) کہا کہ کسے باشد جس نے ہمارے قوانین سے تغافل برتا' اس کی اطاعت قطعاً نہ کرو۔بنیاد یہ ہوگئی۔یہ اطاعت اس فرد کی نہیں ہو رہی' وہ فرد عملاً ان قوانین کی اطاعت کراتا ہے۔

اسلامی مملکت قرآن حکیم کے مطابق ہماری آزادی اور پابندی کی حدود کا نفاذ کرتی ہے

فرد ہی نہیں بلکہ قائداعظمؒ کے الفاظ میں' نظریۂ پاکستان ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور ان کو ملتا نہیں ہے' اس شخصؒ نے کتنے جامع الفاظ میں یہ نظریہ دیدیا تھا جب یہ کہا تھا کہ اسلامی مملکت ایجنسی ہے قرآن کے قوانین کو نافذ کرنے کی۔کیا بات کہہ گیا ہے یہ شخص!!!۔اپنی حیثیت اس کی ایک ایجنسی کی ہے' ایک ذریعہ ہے۔اس نے کہا تھا کہ اسلامی حکومت کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اس میں

اطاعت نہ کسی فرد کی ہے نہ گروہ کی ہے نہ پارلیمان کی ہے‘ اس میں اطاعت خدا کی ہے جس کی عملی تعمیل کا ذریعہ اس کی کتاب ہے۔ 1941ء تک اس شخص نے یہ چیز کہی تھی جس کے متعلق اسی 1941ء میں اعلان ہو رہا تھا آپ کے اسلام کے دعویدار کی طرف سے کہ اس شخص میں اسلام کا کہیں چھینٹا تک نظر نہیں آتا‘ یہ شخص کہہ رہا تھا 1941ء میں۔ اور اس کے بعد اس نے یہ الفاظ کہے تھے کہ آپ جسے اسلامی مملکت کہتے ہیں اس کی حیثیت اس سے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ قرآن کے احکام و اصول کے عملاً نافذ کرنے کی ایجنسی ہے۔

قرآنی حکومت اور مغربی جمہوریت کا تقابلی جائزہ

یہ ہے نظریۂ پاکستان۔ تو قرآن نے یہ کہا کہ جو ہمارے قوانین سے تغافل برتتا ہے‘ اس کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ اس سے تغافل برتتا ہے تو پھر وہ کرتا کیا ہے؟ قرآن ہے عزیزانِ من! وَ اتَّبَعَ هَوٰهُ (18:28) اپنی مرضی چلاتا ہے‘ اپنی خواہشات کا اتباع کرتا ہے‘ اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے اسکے مطابق چلتا ہے۔ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (18:28) نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ جو ہم نے حدود مقرر کی تھیں ان کو پھاند جاتا ہے‘ ان سے تجاوز کر جاتا ہے۔ بس جونہی ان حدود سے کسی نے تجاوز کیا‘ قرآن کی رو سے اس کی اطاعت کفر قرار پا گئی۔ اب آیا یہ نظامِ جمہوریت جسے آپ نے کہا ہے کہ Majority is always right اکثریت حق پہ ہوتی ہے۔ سنئے یہ آپ نے ملوکیت یا جسے آٹوکریسی کہتے ہیں‘ ایک فرد کی اطاعت یا حکومت‘ اسلامی فرد کی بات تو سن لی آپ نے‘ اب نظامِ جمہوریت کی طرف آتا ہے۔ سنئے! یہ چودہ سو سال پہلے کی باتیں کہی ہوئی ہیں۔ جمہوریت اس انداز میں تو ابھی اس زمانے میں سامنے ہی نہیں آئی تھی۔ کتنا جامع ہیں قرآن کے یہ اصول یا تعلیم۔ ایک فرد کی بات آ گئی اب آپ کا نظامِ جمہوریت یہاں سے آج کا درس شروع ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک سوال اکثریت یا اقلیت کا نہیں بلکہ قرآنی اصول کا ہے

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (6:116) اگر تم نے اصول یہ قائم کیا کہ اکثریت کا فیصلہ حق کے اوپر ہے اور تم نے اتباع کر لیا تو یاد رکھو یہ بھی تمہیں خدا کے راستے سے گمراہ کر دے گا۔ یہاں سوال ہی نہیں ہے اکثریت اور اقلیت کا‘ یہاں ایک فرد کا سوال نہیں ہے۔ یہاں فرد کی حیثیت یعنی افرادِ کائنات میں سے وہ ہستی کہ جس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر‘ اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کے متعلق کہہ دیا کہ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (3:144) رسول کی پوزیشن بھی یہ ہے کہ ہمارا پیغام پہنچانے والا ہے۔ اس سے پیشتر بھی رسول آئے اپنے اپنے وقت میں چلے گئے۔ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ (3:144) کہ کل کو اگر یہ مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو تم کہو گے کہ بس معاملہ ختم ہو گیا وہ تو اس کی ذات سے تھا تو پھر ہم اپنے نظامِ کہن کی طرف پلٹ جائیں۔ تو کہا جو پلٹ جائے گا اپنا نقصان کرے گا۔

نبی اکرم ﷺ کی وفات پر حضرت ابوبکرؓ کا ایک عظیم اعلان

یہ نظام شخصیتوں کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ یہ اس خدا کا دیا ہوا ہے جو حی و قیوم ہے۔ اور یہ الفاظ بھی میرے نہیں ہیں' یہ اس کے ہیں' اس دست پروردہِ رسالت ﷺ کے کہ جو اس نظام کی گہرائیوں تک پہنچے ہوئے تھے۔ نبی اکرم ﷺ کی وفات پر' ظاہر ہے کہ صحابہ کبارؓ پر جو قیامت گذری ہوگی اس کا ہم تصور بھی نہیں آج کر سکتے' کہرام مچ گیا تھا۔ لیکن ان جذبات کے بحرِ متلاطم میں روشنی کا ایک مینار تھا وہ صدیقِ اکبرؓ ' منبر پہ کھڑے ہوئے اور انہوںؓ نے کہا کہ میں جانتا ہوں تمہارے دل پہ جو گذر رہی ہے۔ لیکن ہمیں تو تعلیم یہ دی گئی تھی کہ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ (3:144) یہ تو بہت پہلے بتانے والے نے بتا دیا تھا کہ یہ وقت کل کو آنے والا ہے' کہیں اس وقت یہ کیفیت نہ تمہاری ہو جائے کہ اس کے جانے کے ساتھ نظام ختم ہو گیا۔ اور اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا کہ لوگو سن لو! جو محمد ﷺ کی عبودیت اختیار کیے ہوئے تھا' وہ جان لے کہ اس کا معبود واقعی مر گیا ہے اور جو اس خدا کو اپنا معبود بنائے ہوئے تھا' جو حی و قیوم ہے' وہ قیامت تک نہیں مر سکتا اور وہ خدا کی اس کتاب کے اندر زندہ ہے۔ یہ لوگ تھے جنہیں معلوم تھا اسلام کیا ہے۔ اور یہ کوئی ایسا باطنی علم نہیں تھا کہ سینہ بہ سینہ انہی کے کان میں وہ پھونک گئے اور یہ آگے کسی کے کان میں پھونک گئے۔ اس طرح سے کہا جیسے سورج چڑھتا ہے دنیا کے اوپر۔ وَ اِنۡ تُطِعۡ اَکۡثَرَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ یُضِلُّوۡکَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ (6:116) ایک فرد کی کیفیت بتا دی اور یہ آپ کی جمہوریت اور آپ کی ڈیما کریسی' یہ اکثریت کے فیصلوں کی اطاعت جسے حق قرار دیا جاتا ہے۔ عقلِ انسانی فکرِ انسانی جسے آخری تدبیر اختیار کر چکی ہے اس وقت تک' اس سے آگے عقلِ انسانی جا ہی نہیں سکی۔ ٹھوکریں کھا رہی ہے اس جمہوریت کے ہاتھوں' کچھ سوجھ ہی نہیں رہا اس کے بعد کہ کیا کریں۔

چودہ سو سال پیشتر اعلان عام کہ حکومت فرد کی ہو یا افراد کی' حکومت صرف قندیل آسمانی کی قبول ہوگی

مغرب خود چیخ اٹھا ہے اس جمہوریت کے ہاتھوں لیکن اس کے بعد آگے کچھ سمجھ میں نہیں آتا' کیا کریں۔ چودہ سو سال پہلے کہنے والے نے کہا تھا اس کے نزدیک تو پہلے اور بعد کی بات ہی نہیں ہے خدا علیم ہے وہ' وہ تو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہے پہلے اور پیچھے تو ہم کہتے ہیں کہ محدود ہیں جن کی نگاہیں۔ اس نے چودہ سو سال پہلے کہا تھا کہ وَ اِنۡ تُطِعۡ اَکۡثَرَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ یُضِلُّوۡکَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ (6:116) اگر تم نے ایک فرد کی حکومت سے منہ موڑ کے اکثریت کی Majority والے نظام کو بھی اپنے ہاں رائج کر لیا تو یاد رکھو یہ بھی تمہیں گمراہی کے راستے کے اوپر لے جائے گا۔ سوال یہ بھی نہیں ہے اصولی طور پر کہ Majority جو کچھ کہہ دے وہ حق اور Right اور Just ہو جائے۔ Right اور Just ہونے کی وہی صورت ہے وَ تَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا (6:115) خود نبی

اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے قرآن نے کہلوایا اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا (6:114) کیا تم چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم تصور کرلوں۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ خدا کو حاکم تصور کرنے کے بعد عملی دنیا میں دشواری پیش آتی تھی کہ اس کی حکومت محسوس طور پہ کس طرح مرئی طور پہ کس طرح قابلِ عمل ہوگی۔ وہیں یہ کہا' فقرہ ختم نہیں ہوا اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِىْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (6:114) بات ختم ہوگئی' ایسی کتاب اس نے تمہاری طرف نازل کردی ہے۔ دیکھتے ہیں قرآن عزیز ان من! یہی چیز نہیں کہ اصولی اور نظری تعلیم دی ہے کہ عملاً اس کو کیسے نظام میں رائج کیا جائے اس کی بابت کچھ نہ کہا جائے۔ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِىْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (6:114)۔ اور یہی کتاب ہے کہ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115) دیکھتے ہیں۔ اور اس کے بعد ہے وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ (6:116) دیکھتے ہیں کڑی کے ساتھ کڑی کیسے ملتی چلی آتی ہے۔ دیکھتے ہیں ربط کیسا ہے اس کے اندر۔ یہ بھی غلط ہے۔

حق ہمیشہ حق ہوتا ہے وہ کسی کا محتاج نہیں ہوتا خواہ اس کو ایک بھی تائید کرنے والا نہ ہو

یہ اکثریت کی اطاعت بھی کیوں ضروری نہیں کہ حق کے اوپر ہی ہو؟ اس لیے کہ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (6:116) دو چیزیں ہیں ایک دوسرے کے سامنے ایک تو ہے الحق' حق ہی نہیں بلکہ الحق (The Truth, Absolute Truth) حقِ مطلق۔ یہ نہیں کہ آج ایک چیز حق ہے اور کل وہ باطل قرار پا گئی' وہ کہ جو ہمیشہ حق رہے۔ اور اس کے مقابل میں چیز قرآن نے ظن کہا ہے کہ یہ جن کے پاس حق نہیں یا جو حق کے مطابق اپنا نظامِ حکومت قائم نہیں کرتے' وہ ظن کے اوپر چلیں گے۔ اور ظن کے اوپر تو اگر سو فیصد بھی چلیں گے تو وہ چیز ظنی رہے گی' حق نہیں ہوسکتی۔ حق تو اس دن بھی حق تھا کہ جس دن آج کی اصطلاح میں کہوں گا کہ جب اس پکارنے والے نے آواز بلند کی تو اس کا سیکنڈ کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا' جس دن کہا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6:163) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ کیا بات ہے اس اعلان کی!!۔ سیکنڈ کرنے والا بھی نہیں تھا اس آواز کا' اس دن بھی حق حق تھا' الحق تھا اس لیے کہ یہ آراء کا محتاج نہیں ہے۔ کہا جو الحق کے اوپر نہیں' وہ بہرحال ظن کی پیروی کرے گا' اٹکلیں دوڑائے گا اور وہ روز بدلتا چلا جائے گا۔ اس لیے یہ طریق بھی غلط ہے یاد رکھو! اصولاً جمہوریت اسلامی نہیں ہوسکتی۔ جمہوریت کا اصول یہ ہے کہ فائنل اتھارٹی حقِ مطلق Sovereignty اقتدار فیصلہ کرنے' قانون بنانے کا حق' عوام کو حاصل ہے' اکثریت کو حاصل ہے۔ ساری دنیا کے انسانوں کو بھی حاصل نہیں ہے۔

حق کے لیے بنیادی اصول یہ ہے کہ کسی کو دوسرے پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہوسکتا اور یہی حقیقی آزادی ہے

کسی ایک ملک کی اکاون فیصد آبادی تو ایک طرف رہی۔ اور اصول اس کے اندر کیا ہے؟ اصول یہ ہے کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ یہ ہے آزادی۔ Minority تو چیخ اٹھتی ہے جب اکیاون والا اس سے اپنی مرضی منواتا ہے۔ یہ روز جو جوڑ توڑ آپ کے ہاں پارلیمنٹ کے اندر ہوتے رہتے ہیں ایک کو کھینچ کے اِدھر لانے کے لیے اور اُدھر لے جانے کے لیے۔ یہ کیوں ہوتا ہے؟ کہ Minority اس کو برداشت نہیں کرتی کہ یہ لوگ اپنا حکم ہم سے منوائیں کوئی انسان بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ اسی کو غلامی کہتے ہیں۔ خوئے غلامی میں پختگی تو اور شے ہے وہاں تو گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے' وہاں تو آرام مل رہا ہوتا ہے خواہ وہ ذلت کی روٹی کیوں نہ مل رہی ہو۔ لیکن اگر کوئی انسان بھی خوددار ہے جو آزادی چاہتا ہے وہ کسی دوسرے انسان کے حکم اور فیصلے کی اطاعت کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اور اس جمہوریت میں اکاون منواتی ہے اپنے فیصلے کو انچاس سے۔ کہا غلط ہے۔ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعۡلَمُ مَنۡ یَّضِلُّ عَنۡ سَبِیۡلِهٖ وَ هُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِیۡنَ (6:117) صرف خدا اس چیز کو جانتا ہے یہ علم کسی انسان کو نہیں ہوسکتا۔

سوائے خدا کی ذات کے' کوئی بھی انسان کے ابدی تقاضوں سے واقف نہیں ہوسکتا

ابدی طور پر انسانوں کے تقاضوں کے مطابق علم کس کو ہوتا ہے اور کہا یہ صرف خدا کو ہوسکتا ہے۔ اور اسی لیے خدا کے دیے ہوئے اصول اور قوانین جو ہیں وہی ابدیت در کنار ہوسکتے ہیں' وہی انسانوں کی زندگی کے تقاضوں کو ہمیشہ کے لیے پورا کرسکتے ہیں' ان کا اتباع کرو۔ تو دیکھا عزیزانِ من! کہ انسانوں نے اس وقت جتنے بھی نظام اپنے لیے وضع کیے ہیں کس طرح قرآن ایک ایک کی تنقیض اور تردید کرتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ اور کہا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّؤۡتِیَهُ اللّٰهُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحُکۡمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوۡلَ لِلنَّاسِ کُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّیۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے خواہ خدا نے اس کو ضابطۂ قوانین یعنی خواہ اسے ضابطۂ قوانین حاصل ہو' خواہ اسے حکومت حاصل ہو اور خواہ اسے نبوت بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ کسی دوسرے انسان سے کہے کہ تم میری غلامی اختیار کرو۔ کس مقام پہ لے جا رہا ہے۔ قرآن کی بنیادی تعلیم یا بنیادی اصول یا اس کا مطمحِ نگاہ یہ ہے کہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے آشنا کردے۔ اور وہ صحیح مقام یہ ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کسی دوسرے انسان کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنائے۔ اسے کہتے ہیں آزادی۔ بات آگے چل پڑی۔ یہودیوں کے ساتھ تکرار کی بات چلی آرہی تھی جس کے درمیان میں یہ چیزیں قرآن نے دیں' اصولاً بتایا کہ یہ ہے چیز۔ آپ دیکھیں گے مذہب کی دنیا میں یہ مابہ الامتیاز چیز جو ہے عقائد کی بات ماننے کی چیز تو ذہنی لفظی نظری

ہوتی ہے' عملی دنیا میں کھانے پینے کا معاملہ ایسا ہے جہاں امتیاز ہو جاتا ہے' حرام اور حلال کا مسئلہ جو ہے۔

ہندو ہونے کی تعریف گائے کا گوشت نہ کھانے تک محدود ہے

آپ نے میری کتاب ''آسمانی کتابیں'' میں دیکھا ہوگا جہاں میں نے ہندومت کے متعلق لکھا ہے کہ ہندو آج تک بتا ہی نہیں سکے' ہندو کسے کہتے ہیں۔ بالآخران کے سیانوں نے یہ کہا کہ کم از کم اسی چیز پہ آ جایئے کہ جو گائے کو حرام سمجھتا ہے یعنی گائے کے گوشت کھانے کو حرام سمجھتا ہے' اسے ہندو قرار دیا جائے۔ اگرچہ ان کے ہاں ایسے لوگ موجود ہیں اور تھے کہ جو گائے کا گوشت بھی کھاتے تھے' انہیں بھی انہوں نے پھر ہندو شمار کیا۔ وہ تو ایک سیاست تھی مسلمانوں کے مقابلے میں اس زمانے میں جب ہم وہاں ہوتے تھے تو اس آبادی کو اتنے زیادہ بڑھانے کے لیے انہوں نے سارے شودر' شودروں میں بیشمار ایسے تھے وہ گائے کا گوشت بھی کھایا کرتے تھے' اُسے بھی انہوں نے شمار کیا۔ لیکن بہرحال یہ ایک Definition تھی ان کے ہاں۔ آپ کے ہاں بھی دیکھئے کہ کتنا ہی کوئی شخص مذہب سے Indifferent کیوں نہ ہو جائے گناہگار بھی کیوں نہ ہو' جرم بھی کر رہا ہو اب بھی یہ چیز کہ ''اوئے سور کھانا ہیگا ایں'' یعنی یہاں پہنچنے پر اب بھی یہ چیز چلی آتی ہے۔ کتنا ہی بھوکا کیوں نہ ہو وہ کھائے اور اس کے بعد کہا جائے کہ صاحب! یہ سور ہے۔ بہرحال ابھی مستثنیات ایسی ہیں جن میں یہ چیز بھی سنا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ڈھیل دی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں کہہ یہ رہا تھا کہ حرام کھانے کا سوال ابھی اگلی آیت تک پہنچونگا۔

عدالت میں ایک سوال پر غالب کا ایک دلچسپ جواب

جو غالب نے اپنے انداز میں Defintion بتائی تھی وہ جو اس سے پوچھا تھا' کمشنر نے کہ کیا تم مسلمان ہو' اُس نے کہا تھا کہ جی آدھا مسلمان ہوں' انہوں نے کہا آدھا کیسے ہو؟ کہنے لگا جی! شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا۔ تو حرام چیز کا کھانا جو ہے یہ بڑی امتیازی چیز ہو جاتی ہے اور اسی پہ وہ زور دے رہے تھے یہودی سارے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر یہ دین وہی ہے جسے تم کہہ رہے ہو کہ یہ حضرتِ نوحؑ سے لے کر آج تک چلا آیا' تمام انبیاء نے یہی دیا تو یہ بتاؤ ہمارے ہاں تو اونٹ حرام ہے تم اس کو حلال کیسے قرار دیتے ہو۔ یعنی اور عقائد کی بحث نہیں انہوں نے چھیڑی تھی۔ یہ ایک بات محسوسات کی چھیڑی تھی۔ یہ بات ان سے چل رہی تھی۔

حرام کیا ہے اور حلال کیا' مسلمانوں میں ایک ایسی چیز جسے قرآن حکیم نے حرام قرار دیا ہے لیکن ہمارے ہاں وہ حلال مقدس ہے

مسلمانوں کو حرام چار چیزیں واضح طور پہ بتا دی گئیں: لحمِ خنزیر' مردار' بہتا ہوا لہو تین چیزیں یہ محسوس۔ چوتھی وہ جو مسلمانوں نے

اپنے ہاں شیرِ مادر کی طرح حلال ہی نہیں بلکہ حلال مقدس' مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (2:173) ہر وہ چیز جسے خدا کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف منسوب کر دیا جائے چوتھی چیز حرام ہے' قرآن کی رو سے ''آ جنوں نذر نیاز تسی کیندے اوہن'' میں نے کہا تھا کہ وہ حلال ہی نہیں ''مقدس ہوندی اے تہاڈے'' یہ چوتھی بھی قرآن نے حرام قرار دی ہے۔ بہرحال یہ حرام قرار دیا اور اس کے بعد کہا کہ یہ ہیں جو خدا نے حرام قرار دیں اور کہا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ کسی شے کو اس طرح سے حرام قرار دے۔ یہ انسانوں کی آزادی کو سلب کرنے کی بات ہے۔ یعنی کسی شخص کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ فیصلہ دیدے قیامت تک کے لیے انسانوں کے ایک گروہ کے اوپر جنہیں مسلمان کہا جاتا ہے کہ یہ یہ یہ یہ چیزیں حرام ہیں۔ فہرستیں بنی ہوئی ہیں آپ کے ہاں حرام اور حلال کی۔

قرآن حکیم نے حلال کے ساتھ طیب کا لفظ بھی شامل کیا ہے

قرآن نے تو یہ چار ہی چیزیں گنائی ہیں بار بار گنایا ہے' یہی کچھ گنایا ہے۔ البتہ ان میں یہ بات کہی ہے قرآن ہے!! کہ ان کے علاوہ باقی سب چیزیں حلال ہیں حلال میں سے جو طیب ہیں' وہ کھاؤ جو خوشگوار نظر آئے' تمہیں پسندیدہ ہو تمہارے لیے مفید ہو تمہارے نقطۂ نگاہ سے' فرض نہیں ہر چیز جسے حرام نہیں کہا گیا وہ بالضرور کھائی جائے۔ ٹھٹھہ میں ایک بہاری وکیل صاحب آئے ہوئے تھے ہم کراچی میں تھے تو وہاں ان کو ملنا تھا۔ تو وہ یہ کہتے تھے کہ حرام حرام ہے اس کے علاوہ جو حلال ہے وہ تو کھانا پڑے گا لوگوں کو بلا بلا کے دوستوں کو تو کتا کھلایا کرتے تھے۔ بات ذرا سی ہے لیکن قرآن ہے جہاں بھی آپ دیکھیں گے حَلٰلًا طَيِّبًا (2:168) اس نے ساتھ کہا ہے۔ پتہ ہے یہ ساتھ کیوں کہا ہے؟ یہ تو گوشت کی بات ہے یہ سبزیوں والی بات چڑ ہوتی ہے لوگوں کی یہ بینگن اور کریلا ''تہانوں پتہ ہیگا اے'' نہیں جی چاہتا کھانے کو۔ کہتا طَيِّبًا جو چیز خوش آئند ہو' خوشگوار ہو' حلال میں سے وہ کھاؤ۔ بہرحال حرام کی چیز تو یہ رہی۔ اب رہا حلال' یہ جانور ان کے علاوہ باقی سارے حلال۔ اس حلال میں بھی آپ دیکھئے کہ ایک قید لگائی ہوئی ہے اور عجیب قید ہے۔

انسان کا خدا کے ساتھ تعلق صرف اس کی کتاب کے ذریعے ہی ہے

وہ زندگی کے ہر قدم پہ خدا کے ساتھ ایک تعلق قائم رکھتا ہے۔ یاد رکھئے جب میں تعلق کہتا ہوں تو وہ باطنی تعلق نہیں ہے۔ وائرلیس والا جو کام ہو جاتا ہے حجرے میں بیٹھے ہوئے۔ خدا کے ساتھ ہمارا تعلق صرف اس کی کتاب کے ذریعے سے ہے۔ اسے وہ دہراتا رہتا ہے' یاد دہانی کراتا رہتا ہے۔ بکرا حلال ہے ٹھیک ہے۔ اسے بہرحال ذبح کر کے کھایا جائے گا' ٹھیک ہے جی۔ ذبح کرتے وقت پھر یہ یاد دہانی دلادی کہ خدا نے اسے حلال قرار دیا ہے اس لیے یہ حلال ہے میرے لیے' یہ یاد دہانی ہے جو ذبح کے وقت آپ اس پہ تکبیر یا تسمیہ کہتے ہیں۔ ایسے عمدہ یہ الفاظ اس کے لیے تجویز ہوئے ہیں بسم اللہ اللہ اکبر۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے بسم اللہ کے متعلق تو پہلے ہی درس میں

یہ بتایا تھا۔

بسم اللہ کا حقیقی مفہوم اور لفظ رحیمیت کی بنیادی خصوصیت

یہ عام طور پہ جو اس کے متعلق کہا جاتا ہے میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ' یہ بات نہیں ہے۔ بڑی گہری چیز ہے اس ب کے معنی ہیں اس لیے اس مقصد کے لیے' یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یہ اس لیے ہے کہ خدا کی صفتِ رحمانیت اور رحیمیت کا ظہور ہو جائے۔ یہ رحیمیت خدا کی صفتِ رحم جسے کہتے ہیں' رحمت جسے کہا جاتا ہے اس کے معنی ہوتا ہے نہایت لطیف انداز سے پرورش کرنا۔ یہ رحمِ مادر میں جس طرح بچے کی پرورش ہوتی ہے' اسے رحم کہا اس لیے جاتا ہے۔ کیا بات ہے اس زبان کی اور کیا بات ہے قرآن کی صاحب!!۔ پرورش میں بھی اس کے سارے تقاضے پورے ہو رہے ہیں کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا' لچک اور لوچ اتنی ہے کہ اس کے اندر وہ بچہ سوتا بھی ہے لیٹتا بھی ہے کھاتا پیتا بھی ہے سب کچھ ہو رہا ہے''پاسے وی ماردا ہیگا اے'' کس قدر اس میں لطافت ہوتی ہے کس قدر لوچ ہوتی ہے اس کے اندر جسے رحم کہا جاتا ہے۔ اور یہی اس کا انداز ہے خدا کا انسانوں کی پرورش اور نشوونما کے لیے کہ اس میں ربوبیت تو ہے نشوونما دینا لیکن اس ربوبیت میں ساتھ یہ لطافت کا پہلو ساتھ رکھا ہوا ہے۔ بہرحال بات دوسری طرف نکل گئی۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1)' ربوبیت' کس انداز کی؟ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ رحمت کو لیے ہوئے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں یہ اس لیے کر رہا ہوں کہ خدا کی صفت رحمت کی نمود ہو جائے۔ اور اسکے بعد ہے اللہ اکبر۔

جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ اکبر کے الفاظ دہرانا اپنی Ego کی سطح کو خدا کے تابع رکھنا ہے

غور کیجیے عزیزانِ من! بکرا یا اس قسم کا طاقتور جانور اونٹ جیسا جانور گرایا ہوا ہے' گھٹنوں کے نیچے دبایا ہوا ہے' ہاتھ میں چھری لی ہوئی ہے تو یہ کتنا بڑا غلبہ ہے جو اس کو اس وقت حاصل ہے اسکے اوپر' بڑی قوت ہے' اس کی بڑا غلبہ ہے۔ عین اس مقام کے اوپر اس کا اعتراف کہ نہیں بھائی! میں ہی نہیں بڑا' اللہ اکبر بڑا وہ ہے۔ اپنی اس تکبر میں کہ اس کے اوپر واقعی Dominate کر رہا ہے' دوسرے کی جان لے رہا ہے' اس کو حق اس کا دیا گیا ہے' اس کو اقتدار حاصل یہ پورے کا پورا کہ اس کی جان لے رہا ہے۔ دل میں کچھ تھوڑا سا تکبر آ سکتا ہے کہ میں بڑا ہوں اس کائنات میں اور اس وقت تو اس سے بڑا کوئی اور ہوتا ہی نہیں ہے جب یہ اس وقت چھرا لے کے اس کے سر پہ کھڑا ہوتا ہے اونٹ کے اوپر۔ عین اس وقت اندر جو Ego اس کے بیدار ہونے والا تھا اس کو سمجھایا کہ نہ کہیں نہ دل میں سمجھ لینا کہ کائنات میں سب سے بڑی تقدیر جو تیرے ہاتھ میں ہے' تجھے حاصل ہو گئی ہے۔ عین اس وقت اعلان کر کہ میں نہیں' وہ بڑا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ حلال وطیب جانور کو کھانے کے لیے ایک شرط یہاں بھی عائد کر دی کہ یہ کر اس لیے کہہ رہا ہوں کہ خدا کی صفتِ رحمت کی نمود

ہو جائے۔ مجھے غلبہ اور اقتدار اس پہ حاصل ہے' میں آخری غلبہ اور اقتدار والا نہیں' غلبہ اور اقتدار اسی کا ہے' یہ اس کا دیا ہوا اقتدار مجھ کو ہے جس کو میں Exercise کر رہا ہوں' اکبر وہ ہے۔

مومن کی ہر آن نئی شان

دیکھا یہ صیغہ کیوں استعمال کیا اس نے ایسا' Superlative Degree میں وہی ہے اکبر۔ مجھے بھی کبریائی حاصل ہے اور قرآن نے کہ مومن کو کبریائی حاصل ہونی چاہیے۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ اس کی کبریائی بالحق ہوتی ہے' غیر مومن کی غیر حق ہوتی ہے۔ جسے کبریائی حاصل نہیں وہ مومن کیسے ہوسکتا ہے۔ **انتم الاعلون** وہ تو Superlative Degree اس کے لیے استعمال کرتا ہے۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے

غیرتِ او بر نہ تابد ہمسرے

کسی کا آگے بڑھ جانا تو ایک طرف رہا یہ تو اپنا ہمسر بھی برداشت نہیں کرسکتا کیونکہ یہ اعلون ہونا ہے اس نے۔ اللہ اکبر۔ کہا **فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ** (6:118) حلال وطیب جانور کو بھی اب کھانے کے متعلق کہا کہ نہیں! اس وقت خدا کا نام لے کر۔ اور اتنی بڑی شرط ہے **اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ** (6:118)

خدائے رحیم کی طرف سے انسان کے جسم اور اس کی ذات کی نشو ونما کے انتظامات

اب یہ دیکھئے کہ قرآن کے سامنے جسے آپ پرورش کہتے ہیں' انسان کے جسم کی پرورش بھی ہے' اس کی ذات کی پرورش بھی ہے۔ جسم کی پرورش کے لیے پہلے تو یہ ہے کہ کچھ جانوروں کو حرام قرار دیدیا' وہ تو الگ ہوگئے۔ جنہیں حلال قرار دیا ہے اس سے جسم کی پرورش مقصود ہے' یہ گوشت کھانے سے جسم کی پرورش ہوتی ہے۔ خدا کا منکر بھی وہ کھائے گا تو اسی طرح سے پرورش ہوگی جس طرح سے کہ ایک مومن کی ہوتی ہے۔ طبعی طور پر Physically دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ تو جسم کی پرورش تک تو دونوں برابر ہوئے۔ یہاں ایک اور اگلا نقطہ درمیان میں لے آئے۔ انسان کی ذات کی پرورش یہ ہے کہ خدا کا نام اس کے اوپر لیا جائے گا۔ یہ یاددہانی اس چیز کی کہ مقصد اس سے انسان کے جسم کی پرورش ہی نہیں اس کی ذات کی پرورش بھی ہے۔ اور اتنی سی چیز کہ یہ عقیدہ کہ میں دنیا میں جو کچھ کرتا ہوں تیری صفتِ رحمت کی نمود کے لیے کرتا ہوں حتیٰ کہ قرآن بھی اگر پڑھتا ہوں تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اس لیے کہ قرآن کے متعلق تو خود اس نے یہ کہا تھا یہ کیوں نازل کیا ہے؟ **اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ** (55:1-2)۔

خدا تعالیٰ کی صفت رحمانیت عظیم خصوصیات کی حامل ہے

دیکھا آپ نے رحمٰن کی صفت کتنی بڑی ہے۔ یعنی اتنی بڑی صفات خدا کی آپ نے دیکھا کہ اس میں سے یہ ایک صفت کیوں اس نے چنی ہے' بڑی گہری چیز ہے یہ۔ یہ اس لیے ہے کہ اس کی صفتِ رحمانیت کی نمود ہو جائے اس لیے قرآن دیا۔ اور اسی لیے ہمارے لیے یہ ہے کہ میں قرآن بھی پڑھتا ہوں تو اس لیے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ کھانے والی چیز کو میں کھاتا ہوں تاکہ تیری صفتِ رحمت کا نزول ہو۔ اسے کھانے کے قابل بنا رہا ہوں ذبح کر کے تاکہ تیری صفتِ رحمت کی نمود ہو۔ یعنی یہ چیزیں میرے لیے مقصود بالذات نہیں ہیں یہ ذرائع ہیں تیری صفتِ رحمت کی نمود کے۔ اور یہ سب کچھ کھانے کے بعد اگر یہ ذریعہ نہیں بنتا اس کی رحمت کی صفت کی نمود کا تو جو کچھ کھا رہا ہے یہ حرام کھا رہا ہے دعویٰ کچھ اور اس نے کیا تھا۔ دیکھتے ہیں قدم قدم پہ وہ کیا تعلیم دیتا ہے آپ کو۔ وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ (6:119) کہا یہ ٹھیک ہے حلال وطیب چیزیں جو ہیں ان پہ اللہ کا نام لے لیا جائے حلال ہو پھر وہ طیب بھی ہو ساتھ اس کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ان لوگوں کے اس اعتراض کی طرف نہ جایئے۔ میں نہیں یہ کھانا چاہتا' ناگوار گذری کوئی چیز کوئی زبردستی نہیں۔ لیکن جن کے رتبے ہیں سوا ان پہ سوا مشکل ہے۔ بات فوراً یہ آ گئی کہ ایک نبی نے ایسا کیا تھا تو امت نے یہ سمجھ لیا کہ یہ چیز تو حرام ہے' اس لیے انہوں نے نہیں کھائی۔ انہوں نے یہ چیز اپنے طور پہ کچھ کہی تو کہا کہ يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ (66:1) جس چیز کو خدا نے حلال قرار دیا ہے اسے حرام اپنے اوپر کیوں قرار دے' بالکل نہ ایسا کرنا۔ تیرے کرنے میں اور عام لوگوں کے کرنے میں فرق بڑا پڑ جائے۔ باقی لوگوں کا جی چاہے' کھائیں نہ کھائیں' تم نے یہ جو چھوڑا ہے' بعد میں آنے والے سمجھیں گے کہ یہ حرام ہے' نبی نے جو نہیں کھایا تھا۔ اور وہ اس لیے کہ حضرتِ یعقوبؑ کے بعد تو ایک بتانے والا آ گیا' یہ جس نے کہہ دیا۔ کہا کہ ہم نے بتا دیا یہ چیزیں حرام ہیں۔ حرام کے ساتھ ہی یہ بھی کہ انسانی زندگی بہرحال بڑی قیمتی ہے۔

خورد و نوش کے سلسلہ میں حلال وحرام چیزوں کی وضاحت کے باوجود ہمارے ہاں کی فہرستوں کی نوعیت کا انجام

آپ کو معلوم ہے جہاں جہاں قرآن نے حرام چیزوں کا ذکر کیا ہے وہیں یہ کہہ دیا ہے کہ اگر اضطراری حالت پیدا ہو جائے کہ جان پہ بن آئے اور دوسری کوئی چیز کھانے کے لیے مل نہیں رہی تو پھر اجازت ہے تمہیں اس حد تک جس حد تک تمہاری زندگی بچ سکتی ہے کہ تم اسے کھا سکتے ہو۔ ساتھ ہی وہاں کہا ہے کہ یونہی مزا لینے کے لیے نہیں' زندگی بچانے کے لیے ضرورت پڑے' تو تم وہ کھا سکتے ہو۔ یہ چیزیں

پہلے آ چکی ہیں جسے اضطراری حالت کہتے ہیں۔ بات دور نکل جاتی ہے ورنہ میں نے کئی دفعہ یہ بتایا ہے کہ قرآن نے جب یہ کہا ہے کہ عام حالات میں جن چیزوں سے روکا گیا ہے کہ تم نہیں کھا سکتے' اضطراری حالت کے اندر وہ کھا سکتے ہو۔ تو اگر ایک بھوکا ہے باوجود کوشش بسیار کے کام مزدور کو نہیں ملا پاس پیسے نہیں ہیں بھوک سے نڈھال ہو رہا ہے تو وہ اضطراری حالت میں آ جاتا ہے۔ تو اس سے اگر کہا جائے کہ ہاں بھئی! ٹھیک ہے قرآن نے خنزیر کو حرام قرار دیا ہے تم ایسی حالت میں خنزیر کا گوشت کھا سکتے ہو" یعنی بکرے دا تے او چھ روپے لے کے کھائیں سکدا تے اونوں کیا جاندا اے پئی اٹھارہ روپے سیر والا کھا سکنا ایں"۔ اس لیے کہ یہاں جان جاتی ہے کہنے سے کہ عام حالات میں جو تمہیں کہا تھا کہ نہیں! دوسرے کی چیز تم کھا سکتے اضطراری حالت میں تم پر جائز ہو گیا ہے کہ لے لو جا کے۔ کہا اضطراری حالت میں۔ یہاں بڑی عجیب چیز ہے وَ اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (6:119) کہا اس کے بعد تم دیکھو گے مذہبی پیشوائیت آئے گی جناب' فہرستیں بنالیں گے حرام اور حلال کی' اتنی اتنی لمبی چیزیں بغیر علم۔ العلم صرف وحی کا علم ہے عزیزانِ من! اس کے بغیر ہی فہرستیں بنائی ہوئیں تمہارے لیے یہ حرام ہے یہ حلال ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ (6:119) کہا ہم نے تو لکیر کھینچ دی تھی کہ بس یہاں تک یہ ہے حرام کی چیزیں۔ لیکن تم دیکھو گے کہ پھر یہ اس لکیر کو پھاند کے "پوچھو نہ کتھوں تیکر ترے جان گے کوڈی کوڈی کردے ہوئے"۔ مُعْتَدِيْنَ (6:119) ان حدود سے تجاوز کرنے والے' فہرستیں مرتب کرنے والے۔ اتنی سی چیز جو ہم نے تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ (6:115) کہا تھا کہ بھئی یہ چیزیں جو ہیں بس یہی۔ نہ! چلتے جا رہے ہیں' بڑھتے چلے جا رہے ہیں فہرستیں مرتب ہو رہی ہیں۔ کہا ہم جانتے ہیں' ان کی بات نہ ماننا۔ لیکن میں نے جیسا عرض کیا تھا کہ یہ تو ایسی چیز ہے' بچپن سے ہی ذہنوں کے اندر جب کسی چیز کے متعلق ڈال دیا جائے کہ یہ چیز حرام ہے تو اس سے تو پھر طبیعت ابا کرنے لگ جاتی ہے کہ وہ شراب کا پیالہ رکھا ہوا ہے یعنی اس کے ممنوع ہونے میں تو شبہ ہی نہیں ہے یہ نصِ صریح ممنوع ہے۔ بہت خوش ہو کے اسے پینے والا' اگر کہیں چوہیا پھدکتی ہوئی اس پیالے کے اندر آ جائے تو شراب انڈھیل دیتا ہے۔ یعنی دیکھا یہ اثر جو ہے Psychological کتنا گہرا ہوتا ہے کسی شے کے متعلق بچپن سے یہ کہتے چلے جانا۔ جینی کا بچہ گوشت سامنے آ جائے تو کیا کرتا ہے "مسلمان دا بچہ جنے مزے نال اے ہڈی چوسدا ہیگا اے دودھ نئیں پیندا اس مزے نال" یہ کیا چیز ہے؟ بچپن کی تربیت ہے اور اس کا نکالنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے یہ چیز' بغیرِ علم یہ تم کو گمراہی کے راستے پہ ڈال دیں گے حدود سے تجاوز کرنے والے۔ اور ابھی تو عزیزانِ من! بہرحال وہ وقت نہیں آیا' بتا رہے ہیں کہ کم از کم ابھی چند سال' تیس سال کے بعد ہی ابھی یو این او میں سے نکلی ہے وہ ان کی Population کی رپورٹ وہ کہہ رہے ہیں کہ 2000ء کی عیسوی میں دنیا کی آبادی آج سے غالباً ڈیڑھ گنا سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ اور اتنی آبادی جب بڑھے گی اور اس وقت پھر یہ چیزیں کھانے کی' جس قوم نے اتنی چیزیں اپنے اوپر حرام قرار دی ہوئی ہونگی اس وقت دیکھئے کہ ان کو کتنی مشکل پیش آئے گی۔ جس نے یہ محض دو

تین چیزیں حرام قرار دی تھیں۔ ایسے ہی نہیں اس نے یہ کر دیا تھا وہ قیامت تک انسانوں کی ضرورت سے واقف ہے۔ مردار تو بہرحال ایک چیز ہے زندہ میں شمار ہی اس کا نہیں ہے۔ زندہ میں تو یہی لحمِ خنزیر ہی ہے۔ لیکن فہرستوں کے ذریعے سے یہ جو چیزیں منع کی ہوئی ہیں' اس وقت اس قوم کے اوپر کتنی دشواری پیش آئے گی۔ ان کو جانا پڑے گا سمندر کی طرف' وہاں ابھی سامانِ زیست تھوڑی تعداد میں ہے۔ انہوں نے وہاں بھی مہریں لگائی ہوئی ہیں ''آ مچھی حرام آ مچھی حلال'' اور پھر اس کے اندر کی بیشمار چیزوں کے متعلق۔ بہرحال قرآن نے یہ کہا ہے یہی چیز کہ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُعۡتَدِیۡنَ (6:119)۔ اور اسکے بعد عزیزانِ من! ایک آیۂ جلیلہ آتی ہے جو کبھی کبھی میں کہا کرتا ہوں کہ بعض آیتیں ایسی آجاتی ہیں کہ انسان وجد میں آجاتا ہے اور وہاں واقعی سرِ تسلیم خم ہوجاتا ہے کہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ مذہب کی دنیا' یہودیت کی دنیا' ان کے ہاں قانون کی اطاعت اتنی جزئیاتی طور پہ تھی کہ ایک بکرا ذبح کرنے کے لیے وہ جو کہتے ہیں نو من تیل ہو تو رادھا ناچتی ہے' یہ ان کی شریعت میں یہ کیفیت تھی۔ اور اتنا پھر اس کو Meticulously کیا جاتا ہے۔ اتنی لمبی چھری ہو' اتنے فاصلے پہ کھڑا ہو' اس طرح سے لٹایا جائے' اس طرح سے کھڑا ہوا جائے' اس وقت یہ پڑھا جائے اُس وقت یہ دہرایا جائے۔ اور زندگی کے سارے شعبوں کے متعلق اس طرح سے ان تمام چیزوں کا وہ اتباع کر رہے تھے کہ زندگی خود معمہ بن رہی تھی۔ لیکن وہ اتنا کچھ اس کے متعلق کرتے تھے اس کے باوجود کیفیت یہ کہ ضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّةُ وَ الۡمَسۡکَنَةُ ٭ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (2:61) ذلت و مسکنت کی مار اس قوم کے اوپر تھی ذلیل و خوار دنیا میں پھر رہے تھے۔ یعنی شریعت کے ان احکام کی اس طرح سے جزئیاتی طور پر (Meticulously) اطاعت کرنے والی قوم' کیفیت ان کی یہ کہ دنیا میں ذلیل و خوار پھر رہی ہے۔ ذہن میں رکھئے گا اس چیز کو۔ اسی کا ردِعمل تھا عیسائیت۔ اس نے آ کے کہا کہ یہ سب کچھ غلط کر رہے ہو تم' یہ ساری ظواہر پرستی ہے یہ جتنی چیزیں مرئی ہیں' محسوس ہیں نظر آنے والے ارکان ہیں' ان کا تم اتباع کر رہے ہو۔

حضرت عیسیٰ کی طرف سے ہیکل کی سیڑھیوں پر دیئے جانے والے خطاب کی نوعیت

حضرتِ عیسیٰ کے وعظ جس شکل میں بھی انجیل میں ہیں وہ دیکھئے کہ وہ ہیکل کی سیڑھیوں پہ کھڑے ہو کے کیا کرتے تھے۔ کم بختو! تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم وہ سفیدی کی ہوئی قبریں ہو بظاہر تمہارے ہاں کی قانونِ شریعت کے اتباع کی یہ کیفیت ہے۔ لیکن اس کے اندر اس کا مقصد اس کی روح جو ہے اس کو اس قدر تم نے ترک کیا ہوا ہے' اس سے اس قدر غافل ہوئے ہوئے ہو۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ اتنی قانون کی اطاعت کے باوجود' کوئی خوشگوار نتیجہ تمہارے حصے میں نہیں آ رہا۔ اس کا ردِعمل عیسائیت آئی انہوں نے اٹھا کے سارے قوانین کو ہی دریا برد کر دیا۔ انجیل میں کوئی قانون ہی نہیں ہے' سوائے ایک قانون کے کہ شادی جو ہے' نکاح جو ہے' یہ صرف زنا کی بناء پہ طلاق ہو سکتی ہے Otherwise اس کے علاوہ کوئی طریقہ الگ ہونے کا نہیں۔ صرف ایک قانون ہے اور اسے بھی ایسا ناقابلِ عمل قرار دیدیا

عیسائی دنیا نے۔یعنی ان کے ہاں قانون ہے ہی نہیں' یہاں زور دیا گیا روحانیت کے اوپر: ترکِ دنیا' ترکِ آلائش' خانقاہیت کی زندگی' رہبانیت کی زندگی' شادی بھی نہیں کرانی' بال بچے کا تو ذکر ہی نہیں' Monastery میں جا کے رہنا خانقاہوں میں رہنا' جنگلوں میں جا کے رہنا ترکِ دنیا۔یہی چیز دنیا کے ہر مذہب میں تھی۔ہندوؤں نے اپنے ہاں یہ چار الگ الگ زندگی کے شعبے بانٹ لیے: برہم چاری کا شعبہ علم حاصل کرنے کا' پھر اس کے بعد آشرم کا شعبہ بال بچوں کی زندگی کا اور اس کے بعد سنیاس کا شعبہ یہاں سے آہستہ آہستہ الگ ہونا اور آخری بن باس کا شعبہ جنگلوں میں ہی چلے جانا' تیاگ دینا اس چیز کو۔دنیا کے تمام مذاہب میں یہ کیفیت تھی قانون کی اس طرح سے وہ اطاعت کرتے تھے کہ وہ جو ظاہری الفاظ ان کے ہیں حرفاً حرفاً ان کا اتباع' مقصد سے بالکل صرفِ نظر۔یا یہ کہ کوئی قانون ہی نہیں ہے کہا کہ زور ہی انسان اپنی روحانیت کے اوپر دے۔باطنیت جسے کہا جاتا ہے یا اس کے اوپر آئے۔اس میں مقصد غائب' سب کچھ کرنے کے باوجود نتیجہ کچھ نہیں۔کوئی چیز آپ Mechanically کرتے چلے جائیے' اس کا کوئی نتیجہ ہی نہیں نکل سکتا۔اس کے ردِعمل میں قانون ہی کوئی نہیں' زندگی چل ہی نہیں سکتی اگر اس میں قانون نہ ہو تو' قانون تو نہایت ضروری ہے۔ضروری کیا ہوئی؟ قانون کی اطاعت مقصد پہ نگاہ رکھتے ہوئے کیوں پر نگاہ رکھتے ہوئے' کیوں ایسا کہا گیا ہے۔'کیوں' کی پرکھ کس طرح سے ہوتی ہے؟ نتیجے سے' ایسا کرو گے' اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ Pragmatic Test اسے کہتے ہیں ایسا کرو گے تو ایسا نتیجہ نکلے گا۔ویسا کرنے کے بعد کھڑے ہو کے دیکھ لو کہ ویسا نتیجہ نکل رہا ہے یا نہیں۔نہیں نکل رہا تو سمجھ لو کہ کہیں غلطی ہو رہی ہے۔نتیجہ نکل رہا ہے تو اطاعت صحیح ہو رہی ہے۔لیکن کوئی بھی نتیجہ آپ نے نکالنا ہو یہ محسوس Process یہ طریقہ تو آپ کو اختیار کرنا ہوگا۔دوائی پینے سے آپ کو شفا ہوگی۔دوائی ایک محسوس چیز ہے' اس کا نتیجہ آپ کے سامنے آئے گا کہ بیماری دور ہو جائے' یہ اس کا مقصد ہے۔اور اگر کیفیت یہ ہو کہ دوائی پئے جائیے اور بخار اترے نہیں' دوائی پئے جائیے' کیوں صاحب؟ کہ جی ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا۔ارے یہ تو بخار اتارنے کے لیے ذریعہ تھی۔اور اگر دوسری طرف یہ ہو کہ دوائی وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے ''بخار اترنا ہوگا تے آپے اتر جائے گا''۔دو نظریے زندگی کے یاد رکھئے یا تو یکسر Mechanically ایک چیز کو کرتے چلے جانا بغیر یہ پرکھے ہوئے کہ نتیجہ نکلتا ہے یا نہیں اور یا سرے سے اس سارے طریق کو ہی نذرِ آتش کر دینا کہ اس کی ضرورت ہی نہیں ہے ہونا ہوگا تو ''آپے ای ہو جائے گا''۔دنیا اسی افراط وتفریط کے گہوارے میں چلی آ رہی تھی عزیزانِ من!۔آپ نے دیکھا کہ یہاں بھی کہا جا رہا تھا یہ حرام ہے' یہ حلال ہے' حلال کو اس طرح سے ذبح کرو۔یہ ساری چیز Mechanically آ رہی ہے۔اس میں ایک لفظ یہ پھر بتا دیا گیا نہیں بھئی! اس عین وقت کے اوپر خدا کو درمیان میں بیچ میں لے آیا کرو۔اس Mechanical Action کے اندر آپ نے دیکھا ایک اور چیز داخل کر دی۔سنئے قرآن کیا کہتا ہے اور تڑپ اٹھئے۔یاد رکھئے کہ دنیا انہی افراط وتفریط کے گہوارے میں جھولا جھول رہی ہے یا Purely Mechanical ظواہر پرستی تھی یا یکسر اسکو چھوڑ کے

جسے باطن پرستی آپ کہتے ہیں، روحانیت تھی۔ وہ کہتا ہے کہ وَ ذَرُوۡا ظَاهِرَ الۡاِثۡمِ وَ بَاطِنَهٗ (6:120) خدا کے سوا کوئی یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ جو چیزیں Mechanically ظاہر میں جس انداز سے کچھ ہو رہا ہے، اس کے مطابق کیا جائے، اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ لیکن یہ بھی نہ کہو کہ یہ بھی کوئی ضروری چیز نہیں ہے، اصل شے جو ہے وہ باطن کی چیز ہے۔ یہ بھی نہ کرو کہ Mechanically کرو اور وہ مقصد کو بھول جاؤ تم، یہ بھی نہ کرو کہ مقصد سامنے رکھو اور وہ چیز جس ذریعے سے آتی ہے اس ذریعے کو چھوڑ دو تم، بڑا ضروری ہے کہ موٹر میں پٹرول ڈال کے چلو۔ لیکن یہ نہ کرو کہ "پٹرول پا کے اوہنوں گراج اچ بند کر رکھو تے آپ راولپنڈی پہنچ جاں گے"۔ موٹر بھی ہے پٹرول بھی ہے دو ہی چیزیں تو چاہئیں آپ کو "آ انی گل ہی ہے ناپئی اونوں چلاونا نئیں ہیگا تاں کی ہویا" یہ اس موٹر کے سفر کی باطنیت ہے۔ اور اگر یہ ساری ظاہر کی چیزیں چھوڑ دیجیے اور کہیے کہ پہنچ جاؤں گا یہ باطنیت ہے، یہ بھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی وہ بھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے۔ اب آئیے ہم تمدنی زندگی پہ۔ زندگی قوانین کے سہارے چلے گی تمدنی زندگی میں قوانین نہایت ضروری ہیں۔

انسان کی تمدنی زندگی کا تمام تر دارومدار قانون کے احترام میں ہی مضمر ہے

قوانین تو محسوس ہونگے Keep to the left بائیں طرف چلو۔ یہ ایک چیز ہے ٹھیک ہے بائیں طرف چلو بڑا ضروری ہے، کیوں بائیں طرف چلو؟ اگر تو یہ ہو کہ اس سے حادثے سے بچ جائے انسان تو پھر تو یہ ہے کہ اگر سامنے والا غلطی کر کے ادھر سے چلا آ رہا ہے تو آپ اس لیے نہیں بائیں چلے جائیں گے کہ بائیں طرف چلو جو قانون ہوا "تے ٹھاہ وجے"۔ نہ ہی یہ صورت ہو گی کہ بچنا ہے تو بچ جائیں گے "تقدیر اچ جے لکھیا ہویا ہیگا ایس طراں مرنا تے بچا کون سکدا ہیگا اے۔ میں تے ایدھروں ای چلاں گا جناب"۔ دونوں چیزیں غلط ہیں۔ تمدنی زندگی کے اندر قوانین کی اطاعت نہایت ضروری ہے یہ ہے ظاہر۔ لیکن یہ اس لیے ضروری کہ اس سے ایک مقصد حاصل ہونا ہے یہ دیکھو کہ وہ مقصد حاصل ہو رہا ہے یا نہیں۔ تو قوانین کی اطاعت جس سے وہ مقصد یا نتائج حاصل ہو جائیں جن کے لیے وہ قانون بنایا گیا تھا، یہ جو دین ہے۔

شریعت اور طریقت دو مختلف اصطلاحیں ہیں اور ان کی ساری بنیاد دین کی بجائے مذہب پر ہے نیز قرآن حکیم اور تلوار کا باہمی تعلق

مذہب پرست کی ظواہر پرستی ساری اس میں آتی ہے اس کو بھی نہیں چھوڑا جا سکتا۔ باطنیت جسے آپ کہتے ہیں لفظ ہی قرآن نے ظاہر اور باطن کا استعمال کیا ہے یہ دو Technical اصطلاحیں تھیں۔ وہ اہلِ شریعت کی یہ اہلِ طریقت کی۔ اہلِ شریعت کا سارا زور ظواہر پہ ہوتا ہے۔ میں ابھی آتا ہوں یہاں بات پھر کھول کے کرونگا۔ قرآن نے یہ بات کہی اور عظیم چیز ہے کہ یاد رکھو مقصد پہ نگاہ رکھو۔

لیکن ظواہر کی اہمیت کو نظر انداز نہ کرو۔ وہ مقصد ان ظواہر کے ذریعے سے آنا ہے تمہارے پاس۔ دین نے یہ دیا' دین کا تمکن مقصود تھا۔ صدرِ اول کے جماعتِ مؤمنین حجروں میں نہیں بیٹھ گئے' شمشیر بدست باہر نکلے لیکن شمشیر مقصود بالذات نہیں تھی۔ دونوں کے امتزاج اور دونوں کی جامعیت کو کس حسین انداز میں اقبالؒ نے بیان کیا ہے۔ قرآن شمشیر کا مقصد متعین کرتا ہے' شمشیر قرآن کو ایک عملی قانون کے ذریعے سے نافذ کرتی ہے۔ اور وہ کہتا ہے کہ

ایں دو قوت حافظِ یک دیگرند

عزیزانِ من! تصور نہیں کیا جاسکتا کہ اس سے کوئی اور جامع طریقہ بھی ہوسکتا تھا بیان کرنے کا۔ مبداءِ فیض نے کتنی کرم گستری اس پہ کی تھی اور وہ قرآن کی بصیرت کا نتیجہ تھا۔ ایں دو قوت' قانون بھی قوت رکھتا ہے' قرآن کے معنی قوانین خداوندی ہیں۔

ایں دو قوت حافظِ یک دیگرند

شمشیر بھی قوت رکھتی ہے۔ چنگیز کے ہاتھ میں بھی تھی وہ' ہلاکو کے ہاتھ میں بھی' ہٹلر کے پاس بھی تھی' مستبد لوگوں کے ہاتھ میں بھی ہوتی ہے' مشرقی پاکستان کے باغیوں کے ہاتھ میں تھی۔ وہی شمشیر یہ تباہیاں کیوں لاتی ہے؟ وہ دوسری قوت جو اس کی محافظ تھی وہ ساتھ نہیں ہے۔ اور قانون خالی جو ہے بغیر اس کے

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اپنے قوانین پہ نگاہ ڈالئے تو سہی کونسا زندگی کا شعبہ ہے جس کے لیے قانون موجود نہیں ہے اور کونسا شعبہ ہے جس میں قانون کی حکمرانی ہے۔ عزیزانِ من! چودہ سو برس پیشتر وہ کہہ رہا ہے وَ ذَرُوۡا ظَاهِرَ الۡاِثۡمِ وَ بَاطِنَه (6:120) اثم کے ظواہر سے بھی بچو اس کے باطن سے بھی بچو۔ Mechanically اطاعت کچھ نتیجہ نہیں پیدا کرسکتی۔ لیکن اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ ظواہر کو چھوڑ دو تم۔ نہایت ضروری ہے۔ اسلام نے یہ کرکے دکھایا' صدرِ اول کے مسلمانوں نے یہ کرکے دکھایا۔ یاد ہے آپ کو حضرتِ عمرؓ کے زمانے کے سپاہی کا قول۔ عیسائی راہب نے پوچھا تھا کہ ہر کلمہ ہر نظریہ جو زندگی کی ایک حقیقت ہوتی ہے' تمہارے اس کلمے کی حقیقت کیا ہے۔ وہ حقیقت وہ ہے جس سے حق ہونا پہچانا جائے کہ واقعی یہ حق ہے۔ کیا ہے تمہارے کلمے کی حقیقت؟ کہا یہ چالیس ہزار شہر اور قلعے جو ہم نے فتح کیے ہیں اگر یہ حقیقت ہمارے کلمے کی نہیں تو اور کیا ہے۔ **اعلون** ہونا مومن کا اسی طریقے سے ہوسکتا تھا' تسبیح کے ذریعے تو نہیں ہوسکتا۔ لیکن محض چالیس ہزار شہر اور قلعے یہ تو پھر آپ کے دورِ ملوکیت میں چالیس لاکھ ہوگئے تھے ہر نیا قلعہ نئی تباہی کا پیش خیمہ بنتا چلا گیا' کیا ہوا؟ قرآن جو محافظ تھا شمشیر کا وہ ساتھ نہ رہا۔ ان کے ہاتھوں میں شمشیر رہ گئی' ان کے ہاتھوں میں قرآن کا نیام رہ گیا۔ قرآن کے الفاظ کو جس طرح اس قوم نے دہرایا ہے' دنیا کی کوئی قوم ایسے نہیں کرے گی۔ یہ ظواہر ہے اس کا' باطن فراموش ہوگیا۔ اس کا کچھ مقصد تھا۔ دوسرے

والوں نے کہا کہ ہم نے اس کا باطن لے لیا

ما ز قرآن مغز را برداشتیم

ہمارے ہاں دیندار طبقے کی زبوں حالی

اِنہوں نے اس کے ظواہر کو ختم کر دیا۔ دونوں ہی دین سے الگ ہو گئے۔ اور اس کے بعد آ جایئے آپ کے دیندار طبقے کی طرف جن کو بڑا ہی اس پہ ناز ہے کہ ہم دین پہ ہیں۔ یہ نمازیں آپ کی یہ روزے آپ کے یہ حج اور زکوٰۃ آپ کی' مسجد میں کس چیز پہ سر پھٹول ہوتی ہے؟ ہاتھ یہاں کیوں نہیں باندھا' جس کو اس نے دیکھا' یوں نیچے ہاتھ باندھے نماز پڑھتے ہوئے مسجد سے دھکیلتے ہوئے ہم نے دیکھا ہے۔ نماز کے متعلق مسئلے ان سے پوچھ لیجیے۔ پہلے تو وضو کے پوچھئے صاحب اگر ذرا سی کہنی کا اتنا حصہ بھی خشک رہ گیا مردود ہے' وضو نہیں ہوا۔ چلا ہوا ہے یہ قصہ کہ یہ مسح یہاں تک ہونا ہے یا یہاں تک ہونا۔ نماز شروع ہوئی اور اس کے بعد شروع ہو جایئے اس کے اتنے فرائض اتنی سنتیں اتنے نفل اور اس کے بعد پاؤں کے درمیان اتنا فاصلہ' سجدے میں یوں ہاتھ رکھے جائیں گے' اللہ اکبر کرتے ہوئے یہاں تک ہاتھ آئیں گے۔ ذرا نیچے اوپر ہوئے نہیں' اور دہائی ملی نہیں وہاں قیامت ایک برپا ہو جاتی ہے۔ یہ سارا کچھ جس کا ٹھیک ہے الحمدللہ نماز ہو گئی ''اوئے تیری نماز نئیں ہوئی ہیگی'' کیا ہوا صاحب؟ وہ دونوں پاؤں کے درمیان فاصلہ کم رہ گیا تھا۔ اس کی تو نہیں ہوئی وہ جس کی ہوئی ہے ''اوہنوں کی ہو گیا اے۔ اوکھڑا ہو کے پوچھے نا پئی میری جو نئیں ہوئی تے او کی گھاٹا ہو گیا یعنی کوئی پیسے ملنے سی ایتھوں مینوں تے نئیں ملے تے اوہنوں تے مل گئے''۔ اس اعتبار سے تو دونوں ہی ایک ہیں۔

ہمارے ہاں کے خطبے اور تقریر میں فرق

اب اس سے پوچھا جاتا ہے کیا ہوا؟ کہتا ہے اس کو ثواب ہوا۔ ''اوکیندا اے پنجابی اچ دس کی ہویا' کہن لگا نئیں ایہدی پنجابی نئیں ہوندی ہیگی' پنجابی اوہدی ہوندی اے جیہڑی گل سمجھ اچ آ جاوے''۔ خطبے اور تقریر میں آپ کو پتہ ہے کیا فرق ہوتا ہے؟ خطبہ وہ ہوتا ہے کہ جو سمجھ نہ آئے اور ثواب ہوا اور تقریر وہ ہوتی ہے جو سمجھ میں آ جائے' ثواب نہ ہو۔ کہتا ہے ہوئی نہیں نماز تیری' کیا نہیں ہوا اس میں؟ پاؤں کا فاصلہ کم ہو گیا۔ جن کی نماز ہو گئی ہے۔ ان کا کیا ہو گیا ہے؟ وہ بھی اسی طرح سے ذلیل وخوار پھر رہے ہیں ان کی طرح جن کی نمازیں نہیں ہوئیں۔ نہیں ہوئیں تو ایک طرف' جو نہیں پڑھ رہے' انہی کی طرح وہ بھی ذلیل وخوار پھر رہے ہیں۔ ساری امت آپ کے ہاں اس وقت دنیا میں ذلیل وخوار ہو رہی ہے' وہ بھی جن کی نمازیں ہو رہی ہیں' روزے ہو رہے ہیں' حج ہو رہا ہے' زکوٰۃ ہو رہی ہے۔ پھر وہ بھی شامل ہیں جنہوں نے کہا کہ یہ سارے ظواہر پرست ہیں' اس سے کچھ نہیں بنتا' روحانیت کی طرف آ جایئے۔ ذلت کی جوتیاں انہیں

بھی پڑ رہی ہیں جس طرح ان دوسروں کو پڑ رہی ہیں۔ اس لیے کہ دین دینے والے نے کہا تھا کہ وَ ذَرُوۡا ظَاهِرَ الۡاِثۡمِ وَ بَاطِنَهٗ (6:120) یہ ہے دین۔

قرآن حکیم کے مطابق نیکی کی تعریف دین کا ماحصل اور اس کا عملی مظاہرہ

نہ آپ قانون کے اور تمدنی زندگی کے ظواہر کو چھوڑ سکتے ہیں نہ اس کے نتیجے کو نظر انداز کر سکتے ہیں' یہ ہے دین۔ ان کے متعلق کیا کہا اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ (107:1) تم نے ان کو بھی دیکھا دین کی تکذیب کرتے ہیں۔ انکار نہیں کر رہے اقرار کے باوجود اس کو جھوٹا ثابت کر رہے ہیں۔ دین نے تو یہ کچھ کر کے دکھا دینا تھا کہ رزق ضرورت کے مطابق ہر ایک کے دروازے کے آگے سے بہتا ہوا جائے۔ اسے تو روکتے ہیں اور نماز میں پابندی شدت کی کرتے ہیں۔ یہ دین کی تکذیب کر رہے ہیں۔ کیونکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نماز کا تو نتیجہ یہ نکلنا چاہیے تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھ لیتے کہ ان کی نماز ہی نہیں ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ہے ہی غلط نماز و ماز والی بات ہی غلط ہے۔ یہ جو ہے کہ اس مقصد کو سامنے رکھئے ورنہ آپ نے غور فرمایا ہے لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ (2:177) نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کر لیتے ہو یا مغرب کی طرف کر لیتے ہو۔ دیکھا وہ ظواہر جو ہیں یہی نہیں ہے۔ وَ لٰـکِنَّ الۡبِرَّ (2:177) اور آگے یہ بتایا ہے کہ وہ ان چیزوں کے اوپر صدقِ دل سے ایمان رکھے۔ وَ اٰتَی الۡمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنَ وَ ابۡنَ السَّبِیۡلِ (2:177) اور مال کی محبت کے باوجود انہیں ان لوگوں کے لیے کھلا رکھے۔ وہی نیکی نہیں ہے لیکن یہ نہیں کہ وہ چیز اہم نہیں ہے۔ دوسری جگہ یہ چیز کہی ہے کہ جہاں کہیں بھی تم ہو اپنا رخ اس کعبے کی طرف رکھو یہ بھی ضروری ہے امت میں محسوس وحدت پیدا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے۔ لیکن یہ نہیں کہ وہ مقصود بالذات ہے اتنا کر لیا تو دین کا مقصد پورا ہو گیا۔ کہتا ہے لَیۡسَ الۡبِرَّ (2:177) کیا بات ہے اس قرآن کی۔ اور یہ وجہ ہے کہ قرآن نے ٹھیک ہے تمدنی زندگی تو جو ظاہر کی قانون شکنی ہے اسی پہ گرفت کرتا ہے نا۔ لیکن خدا جو محاسب ہے وہ یہ کہتا ہے کہ یَعۡلَمُ خَآئِنَةَ الۡاَعۡیُنِ وَمَا تُخۡفِی الصُّدُوۡرُ (40:19) وہ نگاہوں کی خیانت کو اور دل کے بھیدوں کو بھی جانتا ہے۔ اس لیے وَ ذَرُوۡا ظَاهِرَ الۡاِثۡمِ وَ بَاطِنَهٗ (6:120)۔

ظواہر اور باطن کی عملی تفسیر اور علامہ اقبال کی نگاہ بصیرت

یاد رکھو! ظواہر نہایت ضروری ہے تمدنی زندگی کے لیے قوانین کی اطاعت نہایت ضروری ہے اس کو نہ چھوڑ دینا۔ لیکن Mechanical اطاعت کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا۔ دیکھنا یہ کہ اس کا وہ نتیجہ مرتب ہو رہا ہے' یہ اس کا باطن ہے۔ اقبالؒ نے بھی جو ایک جگہ کہا ہے بڑی عمدہ چیز کہی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ زمین پہ ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی قرآن کا مسلمہ ہے' اس میں شبہ ہی نہیں۔ لیکن آپ کی

موجودہ شریعت تو پوچھو ہی نہیں پھر وہ تو کہتے ہیں' اسکے اوپر حد بندی نہیں ہوسکتی۔ قرآن سے اس کے متعلق جب دلیل لائی گئی کہ الارض للہ زمین تو خدا کی ملکیت ہے۔ تو کہا جی یہ ارض وسماء میں جو خدا کی ملکوت ہے یہ اس کا ذکر ہے یہ نہیں کہ یہ جو زمین پڑی ہوئی ہے' اس پہ کسی قسم کی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ اس میں یہ کہا کہ

باطنِ الارض للہ ظاہر است

ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

یہ ٹھیک ہے باطنی طور پہ تو کائنات کی ہر شے تم کہہ سکتے ہو خدا کی ملکیت ہے اس نے کہا ہے' اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عقیدے کے طور پہ تو آپ یہ ذہن میں رکھیں کہ خدا کی ملکیت ہے جی اور اس کے بعد ہر شخص لکیریں کھینچ کھینچ کے اسے اپنی ملکیت میں لے۔ یہ ظواہر ہے اس کا۔ یہ جو آپ لکھا ہوا دیکھتے ہیں مکانوں کے اوپر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ درحقیقت تو مالک خدا ہی ہے' یہ گھر یہ زمین وغیرہ جو ہے یہ چند روزہ میرے پاس امانت ہے۔

اب یہ اس امانت کو دوسروں کے ہاتھوں بیچتا بھی ہے' بیع بھی کرتا ہے' رہن بھی رکھتا ہے' وراثت میں بیٹوں کو بھی دیتا ہے' پیداوار بھی کھا رہا ہے۔ تو جس کی امانت ہے اس کو یہ ساری عمر کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے اور اس پہ لکھا ہوا ضرور ہے کہ یہ تو اس کی میرے پاس امانت ہے' ہے تو اصل میں مالک وہی' خدا ہی کا ہے جی سب کچھ جو دیا ہوا ہے' مال بھی جان بھی۔ حتیٰ کہ قرآن کی یہ آیت کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ (9:111) مومن وہ ہے جو بیچ دیتا ہے اس چیز کو خدا کو۔ تو ٹھیک ہے جی بیچنے کے بعد رکھتا ہے اپنے ہی پاس ''نہ اوس خریدار نے آونا نہ اوہدے ہتھ اچ پھڑانی''۔ اسے کہا کہ وہ اس کا مالک ہے تو اس نے کہا ''جدوں او سامنے آئے گا قیامت نوں' دیدیاں گے اوہنوں''۔ اس نے بکری چرا کے کھالی تھی' دوسرے کی' اس نے کہا او یہاں تو تو مکر گیا ہے کہ کوئی گواہ نہیں' شاہد نہیں' قیامت کے دن کیا کرے گا وہاں اگر یہ بات ہوگئی تو۔ اس نے کہا میں وہاں بھی مکر جاؤں گا' اس نے کہا وہاں وہ بکری موجود ہوگی جو یہ کہے گی کہ اس نے مجھے چرا کے کھایا تھا' کہنے لگا موجود ہوگی ''میں کنوں پھڑ کے اوہنوں کہاں گا' لے لا پئی اپنی بکری''۔

ظاہر اور باطن کا قرآنی مفہوم اور اس کی اہمیت

وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ (6:120) عزیزانِ من! کیا لفظ ہیں آیہ جلیلہ کے' پوچھو نہیں کیا کچھ اس کے اندر نہیں آ گیا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ (6:120) اور یاد رکھو! یہ اثم یہاں الاثم آیا ہے وہاں ظاہر اور باطن دونوں چیزیں آئیں کہ جن باتوں سے' یاد رکھئے' اضمحلال پیدا ہوتا ہے قوموں کے اندر۔ ظواہر کو بھی اس کے Unimportant نہ سمجھو بڑی Importance ہوتی ہے' زندگی میں ظواہر کی۔ ''پردہ جناب دل دا پردہ اے'' میاں ظاہر کا بھی پردہ ہے۔ نماز کے ظواہر بھی ہیں'

اس کا ایک مقصد بھی ہے' اسے بھی سامنے رکھو۔ قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ ہم نے کتاب اور حکمت نازل کی ہے دونوں چیزیں ہیں۔ کتاب ظاہری قانون کو کہتے ہیں حکمت اس کی غایت کو کہتے ہیں۔ یہ دو چیزیں ہونگی تو پھر زندگی دین کے مطابق چلے گی۔ کہا کہ یہ چیز نہ کرو گے تو یاد رکھو! دور کی بات نہیں ہے بہت جلدی اس کے نتائج تمہارے سامنے آئیں گے۔ اور جب ہم نے اس چیز کے امتزاج کو چھوڑا' ظواہر پرستی آپ کی امت میں کم نہیں رہی۔ یہ اس دور میں ہے کہ بہت سے لوگوں نے نمازیں چھوڑ دیں' روزے چھوڑ دیے ورنہ اس سے پیشتر ہمارے ہاں کا نوے نانوے فیصد امت کا جو طبقہ تھا وہ نمازی پرہیز گار ہوتا تھا۔ لیکن کچھ نہ بنا۔ جنہوں نے ظواہر کو چھوڑا باطن والے جو آ گئے پوچھو نہیں یعنی ان کو تو پھر بھی کچھ دنیا تو حاصل ہوگئی۔ اُن کے حصے میں وہ بھی نہ رہا۔ قرآن نے کہا تھا کہ یَکْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا کَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ (6:120) زیادہ وقت نہیں لگے گا' سَیُجْزَوْنَ (6:120) بہت جلدی نتیجہ سامنے آ جائے گا اس کا۔ ظواہر کو چھوڑو گے اور تب بھی اور ظواہر کے نتائج کو اور مقاصد کی طرف سے آنکھیں بند کر لو گے تو بھی' اس کا نتیجہ ظاہر ہو کے سامنے آ جائے گا۔ اور امت یہ بھگت رہی ہے عزیزانِ من! ۔ سورۃ الانعام کی 120 آیت تک ہم آ گئے آئندہ 121 آیت سے ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

اٹھارواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 121 تا 127)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج دسمبر 1971ء کی 26 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی آیت 122 سے ہوتا ہے (6:122)۔

ہر وہ حلال چیز جو خدا تعالیٰ کی بجائے کسی شخصیت کے ساتھ منسوب ہو وہ حرام ہو جاتی ہے

ہمارا آخری درس 28 نومبر کو ہوا تھا اور اس کے بعد جنگ کے پیدا کردہ حالات کی وجہ سے درس کا سلسلہ ملتوی ہو گیا۔ للہ الحمد کہ ہم اس قابل ہیں کہ آج اسے پھر شروع کریں۔

تجدیدِ یاداشت کے لیے عرض کردوں کہ موضوعِ کلام حلال اور حرام کے متعلق چلا آ رہا تھا۔ کھانے پینے کی چیزوں میں قرآنِ کریم

نے پہلے تو یہ بتا دیا کہ یہ چار چیزیں حرام ہیں: لحمِ خنزیر' مردار' بہتا ہوا لہو اور ہر وہ شے جسے خدا کے علاوہ کسی اور کے نام کے ساتھ منسوب کردیا جائے۔ اب یہ جو حلال ہوئی چیزیں ان حلال میں سے ایک چیز تو پہلے ہی کہہ دی کہ جسے خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کردیا جائے۔ مثلاً بکرا حلال ہے لیکن اگر اسے منسوب کردیا آپ نے کسی پیر کی طرف کسی مزار کی طرف' کسی کی نیاز دیدی خدا کے علاوہ' حرام ہوگیا۔ اب سوال پیدا ہوگیا گوشت کھانے کے متعلق اور Main Diet جسے آپ کہتے ہیں یہ گوشت ہی ہوتا ہے اس میں پھر ایک تخصیص کردی تھی کہ تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ (6:119) اسے کھاؤ جس پر خدا کا نام لیا گیا ہو۔

کسی شخصیت کے نام پر منسوب حرام چیز کے وہ نفسیاتی اثرات جو ذاتِ انسانی پر بڑا گہرا اثر چھوڑتے ہیں

یہ حلال و حرام کی تمیز آج ہمارے دور میں تو یہ تمیز ہی اٹھ گئی ہوئی ہے اس لیے اس کا احساس بھی رفتہ رفتہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور پھر یہ سوال بھی عام ہوتے چلے جاتے ہیں کہ اس کی توجیح کچھ بیان کیجیے کہ یہ کیوں حرام ہے اور یہ کیوں ممنوع ہے۔ اس کا ایک تو بڑا گہرا نفسیاتی اثر ہے۔ کھانے پینے کا معاملہ ایسا ہے کہ دن میں بار بار یہ چیز سامنے آتی ہے اور جب بھی کوئی چیز آپ کے سامنے آئے اور آپ کے دل سے یہ خیال ابھرے کہ یہ ان شرائط کے مطابق ہے یا نہیں کہ جو خدا نے مقرر کی ہیں تو آپ نے دیکھا کہ آپ کے ذہن میں بار بار یہ چیز ابھری کہ مجھے زندگی ان شرائط و حدود و قیود کے مطابق بسر کرنی ہے جو خدا نے مقرر کی ہیں۔ بات تو کھانے پینے کی تھی لیکن ہر لقمے سے پہلے آپ کے ذہن میں یہ خیال ابھر آیا کہ میں نے زندگی نہ تو بلا شرائط و حدود بسر کرنی ہے اور نہ ہی کسی غیر اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود کے مطابق بسر کرنی ہے' نہ اپنی خواہشات کے مطابق بسر کرنی ہے۔ بہت جی چاہتا ہے میرا ایک چیز کھانے کو جس کے متعلق خدا نے یہ کہہ دیا ہے کہ نہیں! یہ حرام ہے اب میں اس پہ ہاتھ نہیں ڈال سکتا' میں اسے چکھ بھی نہیں سکتا۔ تو ایک تو اس کی تجدید ہوتی جاتی ہے ہر آن ہر لقمے کے ساتھ کہ زندگی مجھے ایک حدود کے اندر بسر کرنی ہے۔ وہ نہ میری مقرر کردہ ہیں' نہ کسی اور انسان کی مقرر کردہ ہیں' غیر متبدل ہیں' خدا کی مقرر کردہ ہیں۔ تو اب ظاہر ہے کہ تجدیدِ یادداشت تو اس لقمے کے اوپر ہوئی لیکن یہ حدود و قیود اور یہ شرائط جو ہیں یہ تو زندگی کے ہر گوشے میں اس نے مقرر کی ہوئی ہیں۔ تو اس یاددہانی سے بشرطیکہ واقعی یہ دل کے اندر سے اٹھے Mechanical نہ ہوگئی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ دن میں ہر سانس کے ساتھ یہ خیال ابھرتا آئے گا کہ مجھے زندگی کچھ حدود کے اندر رہتے ہوئے بسر کرنی ہے' بیباک اور سرکش سیلاب کی طرح بسر نہیں کرنی۔ ساحلوں کے اندر گھرے ہوئے دریا اور نہروں کی طرح مجھے بسر کرنی ہے۔ ہر آن ہر چیز کے کھانے پینے کے وقت یہ خیال ابھرتا ہے یہ نفسیاتی اثر ہے۔ ایک تمدنی اثر بھی اس کا ہے کہ حلال و حرام کی تمیز سے ہر فرد اپنے آپ کو ایک گروہ کے ساتھ Belonging کی Sense جسے کہتے ہیں کہ میں اس گروہ سے متعلق ہوں میں اس جماعت سے متعلق ہوں' میں اس امت سے متعلق ہوں وہ خیال بھی دل کے اندر پیدا ہوتا ہے' ایک تمدنی رشتہ ہوتا ہے اس چیز سے۔ دو انسان چلے جا رہے ہوں سفر کر رہے ہوں بظاہر

لباس میں گفتگو میں کوئی فرق نظر نہ آتا ہو' کھانے کے وقت میز پہ اگر کوئی چیز آ گئی ہے آپ کے سامنے کہ جو آپ کے ہاں حرام ہے' اس کے ہاں حلال ہے فوراً تمیز ہو جائے گی کہ آپ اس کے گروہ کو Belong نہیں کرتے آپ کسی دوسری جماعت کے فرد ہیں۔ یہ جو احساس بار بار آتا ہے کھانے پینے میں' یہ چیزیں ہیں اس کے اندر پنہاں۔ لیکن یہ تو قرآن ہے اس نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ وہ خنزیر نہیں ہے مرغا ہے اور اس کے بعد آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اس کو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہے تو اب یہ جتنی ظاہرہ شرائط ہیں انہیں تو آپ نے پورا کرلیا اور اگر وہ مرغی رشوت کے پیسوں کی لی ہوئی ہے تو ؟؟۔ یہ شرائط جو تھیں یہ تو پوری کرلیں مُلا کے فتوے کے مطابق یہ بالکل حلال وطیب ہے شیرِ مادر کی طرح کیونکہ شرائط پوری ہوگئی ہیں اس میں۔ یہ جو اگلی بات تھی جو میں نے کہا کہ یہ قرآن ہے جونہی اس نے پہلے یہ حکم دیا کہ یہ شرائط پوری کرو اس کے بعد کہا وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ (6:120) اس کے ظواہر سے بھی بچو' اتنا ہی نہیں ہے' اس کے باطن سے بھی بچو۔ حرام ظاہر سے بھی بچو کہ خنزیر نہ ہو حلال جانور ہو ذبح کیا ہوا ہو خدا کے نام پہ ذبح کیا ہوا ظاہر ہے' اس کے بعد یہ ہے کہ جو چیز تمہارے سامنے حلال کی کمائی کی ہونی چاہیے۔ اب آپ نے دیکھا کہ جب دین مذہب میں بدل جاتا ہے تو ساری چیز Mechanical ہو کے رہ جاتی ہے۔ اس طبقے کو تو چھوڑ دیجیے جس نے سرے سے اب ان امتیازات کو مٹانا چھوڑ دیا۔ اس نے کہا یہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں' مہذب دنیا کے اندر یہ چیزیں اب نہیں چلتیں۔ مہذب سے مراد ہوتا ہے یورپ اور امریکہ۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ سور کے گوشت میں کیا حرج ہے بالکل صاف ستھرا ہوتا ہے Healty ہوتا۔ وہ سارے دلائل جو وہاں دیے جاتے ہیں۔ وہ تو احساس وہاں چھوڑ دیجیے جن کے دل میں یہ بھی باقی نہ رہا۔ اس طبقے کو لیجیے جو بڑا متشدد ہے اس معاملے کے اندر کہ ہاں اسے پاک کرنے کے لیے تین مرتبہ پانی بہاؤ تین مرتبہ اس پہ کلمہ پڑھو۔ یہ حرام ہے وہ حرام ہی نہیں وہ اس میں اور زیادہ آگے چلتے ہیں حرام ہے' یہ مکروہ ہے مکروہ تحریمی ہے۔ یا اللہ۔ یعنی مسائل کے اعتبار سے تو ہم یہاں تک جا رہے ہیں۔

ظواہر پر اہل شریعت اور اہل طریقت کا طرزِ زندگی

اس کا قطعاً خیال نہیں ہے کہ یہ مرغی جس پہ اس طرح سے شرائط کو پورا کر کے چھری چلائی گئی ہے' جائز کمائی کی ہے یا حرام کمائی کی ہے اس سے واسطہ نہیں ہے۔ ظواہرِ شریعت میں دیکھئے تو اس قدر متدین متورع متشرع شکل وصورت لباس وخراش ووضع قطع تمام چیزیں اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا ایک ایک قدم اٹھانا' یہاں دایاں قدم اٹھاؤ تو یہ کرو بایاں اٹھاؤ تو یہ کرو' بیٹھو تو اس طرح بیٹھو' اٹھو تو ایسا۔ جیسے ایک ایک سانس شریعت کی حدود میں گذر رہا ہے اور اس کے بعد جب دیکھئے مسجد کی امامت کے اندر کوٹھیاں بن رہی ہیں' کاریں مل رہی ہیں ٹیلی فون لگ رہے ہیں' کہ اس میں کونسی چیز حرام کی ہے۔ یہ ظواہرِ شریعت تھا جو Mechanical ہو کے رہ گیا کہ ان خطوط اور حدود کو دیکھ لیجیے کہ پورا ہوتا ہے۔ وَ بَاطِنَهٗ (6:120) اور اُدھر آپ کے ہاں اربابِ طریقت آئے انہوں نے کہا کہ اصل میں تو تعلق باللہ باطن

سے ہے' یہ ظواہر کی چیزیں جتنی بھی ہیں یہ دنیا داروں کی ہیں۔

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید

کوئی بات نہیں ہے نماز کے مصلے کو شراب کے خوں میں ڈبو دے اگر پیرِ مغاں کہتا ہے

سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزل ہا

باطن کا حرام ظواہر کے حلال سے' حلال نہیں ہو جاتا

اس نے تو راستہ طے کیا ہوا ہے تم نہیں جانتے' یہ جانتا ہے اسے صاحب۔ چلیئے! انہوں نے سرے سے سارا ظواہر ہی اس مٹکے میں جا کے ڈبو دیا۔ یہ عام بھنگڑ خانے کے جو آپ کے ہاں کے یہ ملنگ ہیں ان کی باتیں نہیں ہیں۔ بڑے بڑے آپ کے ہاں کے روحانیت کے مقامات طے کیے ہوئے بلند مرتبہ بزرگ جن کو آپ گنتے ہیں' ان کے متعلق آپ دیکھئے' ظواہر کی کوئی پیروی نہیں ہے۔ اور پھر وہ ظواہر کے خلاف اتنا کچھ ہے' سارا تصوف آپ کا اس کے خلاف ہے لٹھ لے کے پھر رہے ہیں۔ عقل کے بھی خلاف اور شریعت کے بھی خلاف۔ دیکھئے کہ چار لفظوں میں کیا کہہ گیا ہے قرآن وَ ذَرُوۡا ظَاهِرَ الۡاِثۡمِ وَ بَاطِنَهٗ (6:120) یہ ظواہر پرست جتنے تھے جنہوں نے اس کو بالکل Mechanical بنا لیا تھا' اس سے تو کہا کہ اس کے باطن کے اوپر بھی نگاہ رکھو۔ حرام کی کمائی سے خریدی ہوئی شے محض تکبیر پڑھنے سے حلال نہیں ہو جاتی' وہ باطن میں حرام ہے۔ باطن کا حرام ظواہر کے حلال سے حلال نہیں ہو جاتا۔ اور یہ جو آپ کے ہاں اہلِ باطن ہیں' ان سے کہا کہ یہ غلط چیز ہے اس کا تعلق باطن ہی سے ہے اس لیے کہ یہ دین تھا۔ دین نے تو 'از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد' اس نے تو دین کی چابی سے دنیا کے دروازے کھولنے ہیں۔ اس لیے یہ ظواہر بھی نہایت ضروری ہیں۔ ظواہر سے تو آپ کی امت کی تشکیل ہوتی ہے تمدنی زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہ تمیز یہ حدود یہ شرائط یہ ساری چیزیں' ظواہر سے بنتی ہیں اور ظواہر سے ہی ایک امت کی تشکیل ہوتی ہے۔ جیسے میں نے عرض کیا ہے' یہ نہایت ضروری ہیں۔ لیکن ظواہر اگر محض Mechanical بن کے رہ جائے گا تو بے معنی ہو جائے گا' وہ ایک نیام ہوگا بغیر شمشیر کے' ایک جسد ہوگا بغیر روح کے۔ اس لیے اس نے دونوں چیزوں کے متعلق کہہ دیا کہ ظاہر سے بھی بچو ان کے' ان کے باطن سے بھی بچو۔ اب پہلے بات یہ کہی تھی کہ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اسے کھاؤ۔

ذبح کرنے سے پہلے اللہ کا نام نہ لینے کی صورت میں قوانین خداوندی کی جامعیت

سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ جی! ایک جانور کو ذبح کر دیا ہے اس پہ کسی کا نام ہی نہیں لیا گیا۔ قرآن کی جامعیت ملاحظہ فرمایئے وہاں اتنا کہا اور اس کے بعد وَ لَا تَاۡكُلُوۡا مِمَّا لَمۡ يُذۡكَرِ اسۡمُ اللّٰهِ عَلَيۡهِ (6:121) جس پہ اللہ کا نام نہیں لیا گیا اسے نہیں کھانا' حرام رہ جائے گا وہ۔ یعنی یہاں ایک چیز Negative ہی نہیں ہے منفیانہ پہلو ہی نہیں ہے کہ خدا کا نام نہ لیا گیا ہو تو اسے نہ کھاؤ۔ خدا کا نام نہیں لیا گیا

جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کسی کا نام بھی نہیں لیا گیا۔ بت پرستوں کے ذبیحے تو تھے کہ غیر اللہ کا نام لیتے تھے۔ یورپ کے ذبیحوں پہ تو کسی کا نام ہی نہیں لیا جاتا۔ تو اب اگر اتنی سی بات ہی ہوتی کہ جس پہ خدا کا نام لیا ہوا ہے وہ کھاؤ جس پہ کسی کا بھی نام نہیں لیا گیا' درمیان میں یہ بات رہ جاتی۔ قانون کی جامعیت یہ ہے جو قرآنِ کریم دیتا ہے عزیزانِ من! کہ جس پہ خدا کا نام نہیں لیا گیا اسے مت کھاؤ وہ حرام رہ جاتا ہے۔ تو Positive چیز یہ ہوگئی' اور Negative یہ کہ جس پہ خدا کے علاوہ کسی اور کا نام لیا گیا ہے اسے مت کھاؤ حرام ہے اور جیسا میں نے عرض کیا ہے نام لینے سے مراد یہاں صرف ذبح کرنا نہیں ہے بلکہ کوئی شے جسے خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے' حرامِ قطعی ہو جاتی ہے قرآن کی نصِ صریح کی رو سے۔ ذبح کرنے میں اگر غیرِ خدا کا نام ہے حرام ہوگئی۔ سوال یہ ہے کہ نام ہی کسی کا نہیں لیا گیا اس آیت کے ماتحت وہ بھی حرام ہوگئی کہ نہیں کھا سکتے آپ۔ تو گویا حرامِ قطعی جو ہے اس کے بعد باقی چیزیں جو حلال ہیں حلال میں اس پہ خدا کا نام لیا جائے ذبح کے وقت تو صرف وہ حلال ہوتی ہے آپ کے ہاں۔

ہمارے ہاں حرام چیز کو حلال کرنے کا خود ساختہ طریق

پھر میں عرض کر دوں ظَاهِرَ الْاِثْمِ (6:120) کہ محسوس اور مرئی شکل ہے یہ حلت و حرمت کی' اس کی احتیاط نہایت ضروری ہے اس کی پابندی نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہی مقصود بالذات نہیں اس کے بعد یہ بھی ہے کہ جس شے کو تم اس شرائط کے ماتحت ذبح کرتے ہو خدا کا نام لے کے' وہ ناجائز کمائی کی تو نہیں ہے۔ اگر وہ حرام کمائی کی ہے تو لاکھ بار تکبیریں پڑھنے سے بھی وہ حلال نہیں ہو جاتی۔ ہم نے ظَاهِرَ الْاِثْمِ (6:120) کی پابندی ابھی تک غنیمت ہے اس قوم کے اندر ہے کہ اس سے یہ گروہ بندی تو قائم رہتی ہے۔ لیکن یہ باطن الاثم جو ہے اس کی اب کسی کو پرواہ نہیں رہی۔ اور قرآن نے تو یہ واضح کر دیا ہے کہ صرف ظَاهِرَ الْاِثْمِ (6:120) کی پابندی سے باطن حلال نہیں ہو جاتا۔ یہ ہماری غلط نگہی تھی جس نے حرام کو مختلف شکلوں میں اس طرح سے پھیلا دیا کہ وہ حرام محسوس ہی نہ ہوا۔ جس طرح جی چاہے کمائی کیجیے اس میں سے اگر آپ نے چالیسواں حصہ دیدیا زکوٰۃ کا تو باقی مال آپ کا بالکل حلال وطیب ہو جاتا ہے یہ فتویٰ دیدیتے ہیں۔ ارے! یہ پوری کی پوری حرام کی کمائی اور اس میں سے یہ تو ٹھیک ہے کہ حکومت کا انکم ٹیکس دیدیجیے تو اس کے بعد تو آپ کو گرفت نہیں ہوتی' تو اسی ٹائپ کا ایک تھوڑا سا انکم ٹیکس آپ اللہ کا دیدیجیے تو باقی کمائی ساری حلال ہوگئی آپ کی!!۔ یہ چیزیں تھیں کہ جس نے ظَاهِرَ الْاِثْمِ (6:120) کے اوپر تو ہم کو رکھا باطن الاثم وہ نگاہوں سے اوجھل ہوا۔ حرام تو حرام رہتا ہے۔

ہر لمحہ ہر آن قوانین خداوندی کی یاد انسانی ذات پر ایک گہرا اثر مرتب کرتی ہے

عزیزانِ من! جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ ظواہر کی کتنی پابندیاں ان کے اوپر آپ کیوں نہ کرلیں جب تک باطن کی پابندی بھی

نہیں آپ کرتے وہ حرام' حلال نہیں ہو جاتا۔اس لیے بھی یہ تاکید کی کہ یہ نہیں ہے کہ جس پہ کسی کا بھی نام نہ لیا گیا ہو وہ جائز ہو جاتی ہے خدا کا نام لیا۔اور خدا کا نام لینا اور ہر چیز جو سامنے آتی ہے اس کے متعلق ہر لقمے اور ہر کھانے کے وقت یہ احساس کہ یہ ان شرائط کو پورا کر رہا ہے یا نہیں جو خدا نے مقرر کی ہیں۔یہ یادداشت جو ہر آن ہوتی ہے Psychologically اس کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے بشرطیکہ یہ کچھ Mechanically نہ کیا جائے۔ Mechanically کرنے سے تو کسی چیز کا بھی اثر انسان کے اعمال پہ نہیں ہوتا' ارادے کا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ Mechanically جسے کہتے ہیں Instinctly وہ حیوان کرتے ہیں' اس میں ارادہ نہیں ہوتا Mechanically ہوتا ہے وہ۔لیکن انسان اگر اس احساس کے ماتحت جو کچھ کھا رہا ہے اس کے متعلق پہلے تحقیق کر لے کہ یہ ظَاهِرَ الْإِثْمِ (6:120) اور باطن کی جو شرط قرآن نے عائد کی ہے' اس کے مطابق حلال ہے یا نہیں۔آپ دیکھئے کہ آپ کا معاشرہ چند دنوں میں کیا سے کیا نہیں بن جاتا۔تو حرام اور حلال کے متعلق یہ جو اتنی تاکید قرآن نے کی ہے بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ یہ یونہی چھوٹی سی بات تھی' کہہ دینا تھا کہ یہ حلال ہے یہ حرام ہے۔لیکن اس کا اثر انسان کی سیرت پر کتنا پڑتا ہے اس کے معاشرے اور اس کے تمدنی زندگی پہ کتنا گہرا اثر پڑتا ہے۔ ہر کھانے کا لقمہ آپ کے سامنے آیا ہے اس میں شرط ہے یہ دیکھنے کی کہ جتنی ظواہر کی شرائط ہیں وہ بھی اس میں پوری کی ہیں یا نہیں اور باطن میں جس کو اس نے حلال اور جائز قرار دیا ہے وہ بھی اس میں پوری ہوئیں ہیں یا نہیں۔یہ دونوں شرائط پوری ہونگی تو وہ لقمہ آپ کے لیے حلال ہوگا ورنہ حرام ہے یاد رکھئے! قرآن کی رو سے۔اب یہ الگ بات ہے کہ آپ حرام کو حرام کہہ کے کہیے' میں نہیں اس کو کرتا' تو ٹھیک ہے نکل جایئے اس گروہ سے' اس پابندی سے' ان حدود سے۔

منافقت کی پہچان خدا کو مانتے ہوئے' اسے نہ ماننا

اب یہ منافقت ہو جائے گی کہ آپ یہ چاہتے بھی نہیں ہیں مالِ حرام چھوڑنا اور نام بھی آپ کا مسلمان رکھاتے ہیں۔یہی تو وہ مقام تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (2:8) تمہیں وہ لوگ ملیں گے جو کہیں گے کہ الحمد للہ مسلمان ہوں اللہ پہ ایمان ہے آخرت پہ ایمان ہے وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) اس کے باوجود مؤمن نہیں ہونگے۔یہ کون ہیں جو زبان سے کہتے ہیں' کبھی انکار نہیں کرتے۔انکار کرنے کے لیے جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔اس گروہ سے نکلنا پڑتا ہے نکو بننا ہوتا ہے۔ اس گروہ میں آپ کی جماعت کے اندر Athiest موجود ہیں خدا کو نہ ماننے والے موجود ہیں۔رسول ﷺ کو نہ ماننے والے' وحی کے نہ ماننے والے۔لیکن مردم شماری کے رجسٹر میں اپنا نام مسلمان لکھائیں گے۔يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (2:9) دھوکہ دیتے خدا کو جماعتِ مؤمنین کو۔کہا کس کو دھوکہ دیتے ہیں؟ یعنی کہ انہیں دھوکہ نہیں دے سکتے وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ (2:9) اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں۔سارا معاشرہ ساری قوم جو آج مسلم کہلاتی ہے (معاف رکھئے گا مجھے) اپنے آپ کو بھی شامل کرتا ہوں وہ اسی گروہ کے

اندر شامل ہے جو اپنے آپ کو دھوکہ دے رہی ہے۔اور جو اپنے آپ کو دھوکہ دے گا اس کا نتیجہ تو پھر باہر آ کے رہے گا۔وہ سرسوں کے بیج کو بارود سمجھ کے اپنے پاس رکھے ہوئے ہے۔جس وقت بھی وہ بندوق میں پڑے گا اس وقت پتہ چل جائے گا۔اپنے آپ کو دھوکے میں رکھے ہوئے ہیں۔جرأت ہوتی تو یہ کہہ دیتے کہ ہم مسلمان نہیں ہیں۔منافق میں جرأت نہیں ہوتی۔اور جرأت والا تو ایک ڈاکو بھی' اس منافقت سے کہ جو اپنے آپ کو یہ کچھ کہتا ہے' وہ بہتر ہوتا ہے وہ دندنا کے للکار کر تو آتا ہے' کہہ کے آتا ہے کہ ڈاکہ ڈالنے کے لیے آ رہا ہے' جان لینے کے لیے آ رہا ہے۔

لیکن یہ جو دھوکہ دیتے ہیں وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ مَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ (2:9) ۔دوسری جگہ قرآنِ کریم نے سورۃ حجرات میں یہ چیز کہی ہے کہ یہ بدوی قبائل کے لوگ جو آ کے کہتے ہیں کہ اٰمَنَّا (2:8) ان سے کہو کہ یہ نہ کہیں کہ اٰمَنَّا (2:8) ' ان سے کہو کہ یہ مملکت بن گئی' شان وشوکت مسلمانوں کو کچھ حاصل ہو گئی' اس کی بناء پہ یہ اس گروہ میں داخل ہو گئے ہیں ان سے کہو اَسۡلَمۡنَا (49:14) کہیں کہ ہم نے اپنے آپ کو صرف سرنڈر کیا ہے ابھی اس درجے میں اپنے آپ کو نہ پہنچائیں ہنوز یہ Probationer ہیں Under-training ہیں۔وَلَمَّا يَدۡخُلِ الۡاِيۡمَانُ فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ (49:14) اس لیے کہ ایمان ابھی ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔یہ شاعری نہیں قرآن کر رہا کہ ان سے کہو ابھی نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔یہ دھوکہ ہو جائے گا اگر اسی سٹیج کے اوپر انہوں نے اپنے آپ کو سمجھ لیا کہ ہم مومن ہو گئے تو جب یہ سمجھ لیا تو پھر تو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔کہا کہ نہیں! ان سے کہو ابھی نہ کہیں۔یہ جو انڈر ٹریننگ ہوتا ہے کیڈٹ کالج میں دو سال کے لیے وہ لیفٹننٹ اور کیپٹن نہیں اپنے آپ کو کہہ سکتا۔یہ کہہ سکنے کا دھوکہ بہت بڑا ہے اور اس کہہ سکنے کے دھوکے نے ہی ہم کو مار دیا۔ہم نے اپنے آپ کو مومن قرار دیدیا اور قرآن نے جتنے وعدے مؤمنین سے کیے ہوئے تھے' سمجھ لیا کہ ہم ان کے مورد اور مستحق ہو گئے۔

حلال اور حرام میں فرق ڈاکٹر نہیں بتاتا خدا کا قانون بتاتا ہے

عزیزانِ من! آج ابھی ہمت نہیں ادھر آنے کی۔وَ اِنَّ الشَّيٰطِيۡنَ لَيُوۡحُوۡنَ اِلٰٓى اَوۡلِيٰٓـئِهِمۡ لِيُجَادِلُوۡكُمۡ وَ اِنۡ اَطَعۡتُمُوۡهُمۡ اِنَّكُمۡ لَمُشۡرِكُوۡنَ (6:121) کہا کہ یہ باتیں بڑی چھوٹی چھوٹی سی نظر آتی ہیں یہ حلت وحرمت کی حرام اور حلال کی جو کہی گئی ہیں۔یہ سرغنے سازشیوں کے وسوسے ڈالیں گے تمہارے دلوں میں آ کے' بحث کریں گے کہ اس میں کونسی بات ہے حلال کیا' حرام کیا ہے' آپ گوشت کسی ڈاکٹر سے کہہ دیجیے' تجزیہ کر لیجیے لیبارٹری میں جا کے رکھ دیجیے بالکل صحیح انسانی جسم کے لیے' اس کی صحت کے لیے کوئی خرابی کی بات نہیں ہے۔اس کے اندر فرق کیا پڑتا ہے کہ اس کے اوپر اللہ کہے کے یوں کیجیے اور اللہ کہے کے نہ کیجیے۔کہا' یہ باتیں کریں گے آپ سے۔ اگر تم نے ان کی یہ بات مان لی۔تو کیا ہوگا؟ اِنَّكُمۡ لَمُشۡرِكُوۡنَ (6:121) تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔

انسانی زندگی کا رشتہ جسم اور ایمان دونوں سے مرتب ہوتا ہے جب کہ مقصود بالذات ایمان ہی ہے

پھر عرض کردوں کہ وہ بات صرف ظَاهِرَ الْاِثْمِ (6:120) کی نہیں تھی وَ بَاطِنَهُ کی بھی تھی۔ دلائل دیے جاتے ہیں' فرق بتاتے ہیں حلال کی کمائی میں حرام کی کمائی میں' حلال کی کمائی کا روپیہ یا ہو حرام کی کمائی کا روپیہ' باہر سے جا کے آپ گوشت یا گھی خرید لائیے۔ وہ اگر خالص ہے' کہیے کہ اس گھی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ حرام کی کمائی سے جو آپ لے آئے یا چرا کے لے آئے کہیں سے ایک ٹین گھی کا اور ایک ٹین اس سے خرید کے لائے' وہ کہتا ہے کہ گھی کے Contents میں تو کوئی فرق نہیں ہوتا آپ کے جسم کے اوپر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ٹھیک ہے یہاں تک۔ یہ تو فلسفہ وہ ہے کہ انسان نام ہی جسم کا ہے اس کو تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اگر اگلا ایمان ہو کہ صرف جسم کا نام نہیں ایک اور شے بھی ہے انسان کی جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے' اس کے اوپر جا کے جو اثر پڑتا ہے' یہ وہاں پہنچتا ہے۔ جسم کی پرورش بھی نہایت ضروری قرار دیتا ہے کہ سفر کرنے کے لیے گھوڑے کی ضرورت ہوتی ہے اور اسے تنومند ہونا چاہیے۔ لیکن وہ مقصود بالذات تو نہیں ہوتا کہ اس کو اصطبل میں باندھ رکھئے آپ۔ قرآن مقصود بالذات انسان کی ذات کو قرار دیتا ہے Human Personality جس نے مرنے کے بعد بھی زندہ رہنا ہے اور ایک ایک عمل ایک ایک ارادے کی جوابدہی جس کے اوپر ہوتی ہے۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ تم سے ان معاملوں میں جھگڑیں گے وسوسے ڈالیں کہ فرق کیا پڑتا ہے ان چیزوں سے۔ ان کی بات نہ مان لینا اگر تم نے ان کی اطاعت کی اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ (6:121) تم مشرک ہو جاؤ گے۔

جسم اور ذات کی باہمی حرمت کی بنا پر قرآن حکیم ان ہر دو کی موت و حیات کو دو مختلف پیمانوں میں تقسیم کرتا ہے

یاد رکھو۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے حلال اور حرام کی۔ پھر عرض کردوں چھوٹی بات ہے اگر اس کو ظَاهِرَ الْاِثْمِ (6:120) پہ رکھا جائے Mechanically رکھا جائے' کچھ نہیں اس کا فرق پڑتا۔ اس کے باطن کے اوپر جب جائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ ایک ایک لقمے ایک ایک سانس کے اوپر فرق پڑتا چلا جائے گا۔ اور اس کے بعد اب یہ چیز تو صرف یہاں تک اس حلت و حرمت کی تھی اب آیا قرآن' اگلی ہی آیت کے اندر دونوں میں فرق کر کے کیسا بتا دیتا ہے۔ کہتا ہے ایک شخص وہ ہے یا ایک جماعت وہ ہے اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ (6:122)

کہا سوچو تو سہی کہ یہ دو کبھی برابر ہو سکتے ہیں' کونسے دو؟ ایک وہ کہ جو مردہ تھا ایک جماعت' ایک قوم' ایک فرد' مردہ تھا فَاَحْيَيْنٰهُ (6:122) پھر ہم نے اس کو زندگی عطا کی۔ مردہ قوم کو زندگی عطا ہوئی۔ یہ تو اس کی ذات تک ہوا جی۔ مردہ طبعی مردہ نہیں ہے یہ'

طبعی زندگی طبعی موت اور ایک حیاتِ باشرف اور ایک حیاتِ بےشرف' الگ الگ رکھتا ہے: قرآن تو موت اور حیات کے دو پیمانے الگ الگ رکھتا ہے۔ جس کو کہتے ہیں وہ نہیں ہے۔ Physical Dead ان کو۔ وہ زندہ انسان کہتا ہی ان کو ہے کہ جن کے اندر زندگی اور حرارت کی نمود ہوتی ہے۔ یہ سانس لینے والے جو اپنے لاشوں کو اپنے کندھوں پہ اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں' وہ انہیں زندہ قرار نہیں دیتا۔ وہ تو سب سے بڑا زندہ انہیں کہتا ہے جنہیں دنیا کا' طبعی قوانین کا ہر ٹیسٹ مردہ قرار دیدیتا ہے۔ جس وقت وہ انہیں کہتا ہے کہ ان کو مردہ کہو بھی نہیں' یہی تو زندہ ہیں۔ تم جو ہر پیمانے پہ سمجھتے ہو ہم زندہ ہیں' مردہ تم ہو اور جن کو قبر بھی قبول نہیں کرے گی' جن کو جہنم بھی قبول نہیں کرے گا۔ کیا وہ جو مردہ تھا اور اسے ہم نے زندگی عطا کر دی' کتنی بڑی نعمت ہے۔

مذہب میں ہر شخص کا ایک انفرادی فریضہ ہوتا ہے جبکہ دین میں ہر کام اجتماعی طور پر شمع قرآنی کی روشنی میں سرانجام پاتا ہے

طبعی زندگی تو ہر بچے کو عطا ہوتی ہے۔ سنئے قرآن کیا کہتا ہے۔ یہ انفرادی چیز ہے۔ دنیا کا ہر مذہب انفرادی ہے۔ ایک فرد مذہب کی تعلیم حاصل کرتا ہے' مذہب کے جتنے احکام ہیں' ان کی بھی پابندی کرتا ہے۔ مذہب کہتا ہے کہ ٹھیک ہے تجھے نجات مل جائے گی' تو مذہب پرست ہو گیا ہے۔ اتنا ہی فریضہ ہے تمہارا۔ دین میں فریضہ انفرادی نہیں رہتا۔ مردہ تھا زندگی عطا کی مقصد پورا نہیں ابھی ہوا فریضہ پورا نہیں ابھی ہوا۔ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا (6:122) پھر اسے ہم نے ایک روشنی دی۔ مذہب کی روشنی گھر کے اندر دیا ہوتا ہے جس سے اسی فرد کا گھر روشن ہوتا ہے' اس سے زیادہ اس کو واسطہ نہیں ہوتا۔ یہاں تک بھی یہ بات ہوئی کہ ہاں! وہی انفرادی چیز ہے کہ مردہ تھا زندگی دی' ایک روشنی بھی دیدی۔ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ (6:122) اس لیے دی وہ روشنی کہ اس کو لے کے انسانوں کے راستوں کو تم روشن کرو جا کے۔ یہ دین ہے عزیزانِ من!۔ جو زندگی پا کر' اس روشنی کو لے کے حجرے میں بیٹھ گیا' مسجد میں بیٹھ گیا' گھر کے کمرے کے اندر بیٹھ گیا' دین کا مقصد نہیں پورا ہوا۔ یہاں تو اجتماعی زندگی ہے انسانیت کا فریضہ ایک عائد ہوتا ہے۔ جسے وہ موت سے زندگی دیتا ہے' زندگی کے بعد ایک شمعِ ہدایت اس کے ہاتھ میں دیتا ہے' اس پہ فریضہ عائد ہوتا ہے يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ (6:122) اس کو لے کے اب چلو تم انسانوں کے راستوں کو روشن کرو۔ اور جن کے اپنے ہی راستے تاریک تر ہوں' وہ دوسروں کے راستے کیا روشن کرے گا۔ دیکھا آپ نے کہ مذہب' دین کہاں آ کے بنتا ہے۔ مذہب یہ کہتا ہے کہ ''توں اپنی نبیڑ تینوں ہور نال کی''۔ نہیں! يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ (6:122)۔ کہتا ہے ایک طرف تو یہ جماعت ہو جن کے یہ فرائض ہوں' دوسری طرف كَمَنْ مَّثَلُهٗ (6:122) روشنی والا اور روشنی لے کے چلنے والا

علامہ اقبال کا قرآن فہمی کے سلسلہ میں علامہ پرویزؒ کی ایک تاریخی مشورہ

اگر ایک فقرہ میں کا معاف کر دیں' آپ کو معلوم ہے کہ 'میں' کبھی نہیں لایا کرتا لیکن وہ ہے مثال ایسی کہ یہ روشنی لے کے چلنے والی کہ چونکہ اس نے میری زندگی کا راستہ بدل دیا تھا' اس لیے میں اسے Quote کیا کرتا ہوں بات سمجھانے کے لیے۔ یہ قرآنِ کریم کے یوں سمجھنے اور سمجھانے کا طریقہ جو میں نے اختیار کیا' علامہ اقبالؒ نے یہ مجھے Suggest کیا تھا۔ اور اس کے بعد بتایا یہ تھا کہ اسے لو اور اس انداز کے اوپر قرآن کی تعلیم کو پھر آگے عام کرو۔ یہ جو تصریفِ آیات سے تبویب سے' قرآن کریم کو Subject wise سمجھانے کا طریقہ ہے۔ میں اس زمانے میں بچہ تھا ابھی' چھوٹی سی عمر تھی علم بھی وہی مسجد کا علم تھا ہنوز' طبیعت میں تصوف کی وجہ سے ایک پیدا کردہ انکساری بھی تھی۔ تو میں نے انہیں یہ لکھ دیا کہ آپ نے یہ کیا فرما دیا۔ میری بساط کیا' میرا علم کیا میری وسعت کیا' اور یہ اتنا بڑا فریضہ کہ خالص قرآن کی تعلیم کو ان کے الفاظ میں محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات کے مطابق اس کو سمجھوں اور اس کے بعد پھر اس تعلیم کو عام کروں۔ یہ اتنا بڑا فریضہ میں اسے کس طرح سے ادا کروں۔ تو اسی خط کے کنارے پہ انہوں نے لکھ کے دیدیا تھا' انہوں نے لکھا تھا کہ تمہاری دِقت یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک چھوٹا سا دیا ہے۔ یہ کڑوے تیل سے جو جلنے والا دیا ہوتا تھا' اگلی نسل ہماری تو شاید سمجھ ہی نہ سکے کہ وہ ''دیوا وی ہوندا ہیگا''۔ تو اس زمانے میں تو وہی ہوتے تھے کہ تمہارے پاس ایک دیا ہے' شبِ تیرا و تار ہے' ایک وسیع عریض صحرا لق و دک جس میں روشنی کا نشان نہیں' تم اس دیے کی طرف دیکھتے ہو کہ اتنا چھوٹی سی لَو والا دیا' پھر تم ان تاریکیوں کو دیکھتے ہو کہ اتنی دور و دراز کی تاریکیاں کس طرح سے یہ روشنی یہاں تک پھیل جائے گی۔ تو انہوں نے لکھا کہ یہ خدشہ اس وقت تک ہے جب تک تم اس دیے کو لے کے کھڑے ہو' اس دیے کو ہاتھ میں لے کے چلتے چلے جاؤ' سارے راستے روشن ہوتے چلے جائیں گے۔ وہ عجیب ٹیچر تھا صاحب' وہ شخص' عجیب معلم تھا یوں نگاہوں کا رخ بدل دیتا تھا۔ چلتے جاؤ اس دیے کو لے کے' مت گھبراؤ کہ اس کی روشنی تین قدم تک جاتی ہے یہ تین قدم تو اس وقت تک ہیں جب تک تم لے کے کھڑے ہو اس کو۔ اس وقت میرے ذہن میں نہیں تھا کہ یہ شخص بات کہاں سے کہتا ہے۔ جب یہ چیز آئی میرے سامنے نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ (6:122) قرآن سے لیا تھا اس نے کہ دیے چھوٹے چھوٹے کیوں نہ ہوں' چلتے جاؤ انسانیت کی راہوں میں۔ سارے راستے روشن ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ فریضہ تھا اس قوم کا' مردہ تھی' زندگی عطا ہوئی' زندہ ہوا تو ایک روشنی ہاتھ میں ملی' روشنی ملی تو اپنے ہی صحن کو روشن کرنے کے لیے نہیں ملی اس کو لے کے چلتے جاؤ' چلنا تھا تا کہ انسانیت کی راہیں روشن ہو جائیں۔

کوئی فرد یا قوم جب خود ہی تاریکیوں سے نہ نکلنا چاہے تو چمگادڑ کی طرح پھر اندھی ہو جاتی ہے

کہا ایک طرف یہ قوم ہو اور دوسری طرف کَمَنْ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ (6:122) دوسری طرف جو تاریکیوں میں ہو۔ اچھا! ہوسکتا ہے بائی چانس اتفاق سے نامساعدات حالات سے تاریکی کے اندر کوئی فرد کوئی قوم گھر سکتی ہے۔ کہتا ہے تاریکیوں میں ہو لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (6:122) اس سے نکلنا بھی نہ چاہے۔ پھر کیا ہو جاتا ہے؟ پھر وہ چمگادڑ ہو جاتا ہے، روشنی سے اس کو بیر ہو جاتا ہے۔ آفتاب کا وہ دشمن ہوتا ہے۔ وہ دعائیں مانگتا ہے کہ یا اللہ سحر ہو نہ سورج چڑھے اس لیے کہ اس کی آنکھوں کو روشنی بری لگتی ہے۔ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (6:122) اتنا ہی نہیں کہا کہ فِى الظُّلُمٰتِ (6:122) میں ہو، ظلمات میں تو ہوسکتا ہے، تاریکیوں میں ہو اور اس سے نکلنا ہی نہ چاہے۔ عربی جاننے والے حضرات یہاں کہیں گے Verb نہیں آیا بِخَارِجٍ (6:122) آیا ہے، فاعل کا صیغہ ہے۔ اس میں بڑا فرق ہوا کرتا ہے، وہ نکلنے والا بننا ہی نہ چاہے۔ کیا بات ہے!!۔ کوئی اندھیرے میں بھی کبھی خوش رہتا ہے۔ کہا اس کے بعد کیفیت یہ ہو جایا کرتی ہے، چمگادڑ کی ابھی میں نے مثال دی ہے، وہ اندھیرے میں خوش رہتا ہے روشنی دشمن ہوتی ہے اس کی۔

جب کسی قوم کے لیے تاریکی نعمت قرار پا جائے تو پھر اس کا کیا علاج

كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (6:122) یوں ان لوگوں کو جو صداقت کا انکار کرتے ہیں ان کے اعمال مزین ہو کے ان کو نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ ان کو تاریکی سب سے بہتر نعمت بن کے نظر آنے لگ جاتی ہے۔ کہا کہ یہ دو گروہ کبھی بھی برابر ہوسکتے ہیں؟۔ جن کو سارے معاشرے میں پھیلا ہوا حرام، حلال بن کے نظر آنے لگ جائے جو ان تاریکیوں سے نکلنا ہی نہ چاہے۔ کہیں سے آواز اگر اس کی اٹھ آتی ہے تو وہ چاہے کہ گلا گھونٹ دے اس آواز دینے والے کا۔ یہ ہے سب سے بڑی تباہ کن بات کسی قوم کے لیے جیسے اس کی برائی اس کو بھلائی بن کر دکھائی دے۔ اچھا تھا وہ مرحلۂ عمر، میرے سامنے ہے

یہ بھی کیا مرحلۂ عمر ہے جس میں یا رب
ہر بری بات بری بات نظر آتی ہے

کسی قوم کی سب سے بڑی خوش بختی یہ ہے کہ اسے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے شروع میں ہی قندیل آسمانی کی راہنمائی میسر آ جائے

بڑی خوش بختی ہے اس قوم کی عزیزانِ من! جس کو پہلے بری بات، بری بات نظر آنے لگ جائے۔ نظر کیسے آتی ہے؟ اندھیرے میں تو کچھ نہیں نظر آتا۔ اندھیرا ایک ایسی چیز ہے جس میں کوئی رنگ، رنگ رہتا ہی نہیں ہے۔ کبھی غور کیا آپ نے! سات رنگ ہوتے

ہیں۔مختلف رنگ ہوتے ہیں۔تاریکی میں کوئی رنگ رنگ ہی نہیں رہتا۔اتنا گہرا رنگ اس کا اپنا ہوتا ہے سارے رنگ مٹ جاتے ہیں۔یہ جو نظر آنا ہے وہ روشنی میں آتا ہے۔تو پہلے اس کو وہ قندیل ملنی چاہیے' پھر نظر آنے کے لیے زندگی کی بھی تو ضرورت ہے۔مردے کے سرہانے دیا جلاتے ہو تو وہ تو یہ قبروں کے دیے ہوتے ہیں۔باہر جو زندہ ہے' اس کو تو نظر آتا ہے۔وہ جو نیچے مردہ ہوتا ہے ''او ہنوں لکھ نئیں نظر اوندا''۔مردہ ہو زندگی ملے' زندگی ملے دیا ملے' دیا ملے تاکہ ہر بری اور بھلی بات میں تمیز ہو سکے۔تمیز اپنی ذات تک محدود نہ رکھے یَّمۡشِیۡ بِہٖ فِی النَّاسِ (6:122) پھر اس کو لے کے چلے انسانیت کے اندر۔کہا کہ یہ دونوں کبھی برابر ہو سکتے ہیں؟ نہیں ہو سکتے۔یہ تاریکیوں کے اندر خوش رہنے والے اور جن کو اپنا ہر عمل' ہر حرکت مزین نظر آتی ہے۔

قوموں کی تباہی ہمیشہ سرغنوں کے ہاتھوں ہوتی ہے جو ہر چھوٹی بڑی سازشوں میں ملوث ہوتے ہیں اور پھر ان سے نکلنا نہیں چاہتے

وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنَا فِیۡ کُلِّ قَرۡیَۃٍ اَکٰبِرَ مُجۡرِمِیۡھَا لِیَمۡکُرُوۡا فِیۡھَا (6:123) یوں ہوتی ہیں قومیں تباہ کہ ان کے ہاں کے ایک تو عام مجرم ہوتے ہیں' ایک اکابر مجرمین ہوتے ہیں' مجرموں کے سرغنے بڑے بڑے مجرم۔کہتا ہے قومیں تباہ ہوتی ہیں کہ یہ بڑے بڑے مجرم جو جرم کرتے ہیں سازشوں کے ذریعے سے جرم کرتے ہیں لِیَمۡکُرُوۡا فِیۡھَا (6:123)۔للکار کے جرم کرنے والا جو آتا ہے اس سے آپ بچ سکتے ہیں۔کیا کہوں کہ کیا آیتیں آتی ہیں۔لاکھ کہتا ہوں کہ میں نہیں آنا چاہتا' وہ آیتیں تو مجھے مار مار کے لے آتی ہیں۔اَکٰبِرَ مُجۡرِمِیۡھَا (6:123) اور یہ اکابر کرتے کیا ہیں لِیَمۡکُرُوۡا فِیۡھَا (6:123) مجرم تو اکابر ہیں پستیٔ حوصلہ کی یہ کیفیت ہے کہ جو جرم کرتے ہیں' للکار کے نہیں کرتے ہیں' سازش کے ذریعے سے کرتے ہیں اور پھر اپنے اعمال مزین بن کے ان کو دکھائی دیتے ہیں لَیۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡھَا (6:122) نکلنا نہیں چاہتے اس سے۔وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنَا فِیۡ کُلِّ قَرۡیَۃٍ اَکٰبِرَ مُجۡرِمِیۡھَا لِیَمۡکُرُوۡا فِیۡھَا (6:123)۔

اس قسم کی سازشیں کرنے والوں کا نتیجہ عقل وشعور سے محرومی ہوتا ہے

اور سنئے عزیزانِ من! چیخیں نکل جاتی ہیں۔وَ مَا یَمۡکُرُوۡنَ اِلَّا بِاَنۡفُسِھِمۡ (6:123) اپنے خلاف سازش کرتے ہیں۔وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ (6:123) سمجھتے نہیں ہیں۔وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ (6:123) پہلی چیز ہی یہ ہے' عقل وشعور کے دیے تو گل ہو جاتے ہیں' ظلمات تو اسی وقت ہی آتی ہیں یہ چراغ گل ہو جاتے ہیں۔جس طرح طبعی شراب سے انسان کے طبعی حواس کند ہوتے ہیں۔یہ جو سازشوں کی اس قسم کی اَکٰبِرَ مُجۡرِمِیۡھَا (6:123) کی شراب ہوتی ہے وہ فکر وشعور کی اندرونی صلاحیتیں بھی ختم کر دیتی ہے۔اس کے

بعد فرد نہیں پوچھتا' قوم پوچھتی ہے' دنیا پوچھتی ہے کہ بالآخر اسے اس سے حاصل کیا تھا۔ کوئی اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ اُس کو پوچھئے وہ بھی جواب نہیں دے سکتا کہ مجھے اس سے ملا کیا ہے جو میں نے کیا ہے۔ کوئی جواب نہیں دے سکتا' آپ نے سمجھا ہے جواب کیوں نہیں دے سکتا؟ جواب اس چیز کا دیا جاسکتا ہے جو عقل وشعور کی رو سے کی جاتی ہے۔ وَ مَا یَشْعُرُوْنَ ۔ وَ مَا یَمْکُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ (6:123) اپنے آپ سے سازشیں کرتے ہیں۔ اور سازش کی کیفیت یہ کہ ان سے بھی پوچھو کہ یہ کیوں کیا تھا تو اس کا جواب نہیں ہوتا اس لیے کہ وَ مَا یَشْعُرُوْنَ ۔ (6:123)۔ شرابی سے پوچھئے اس کا نشہ اترنے کے بعد ''توں جو ایہو جیاں گلاں کرداسیں پیا او کیوں کرداسیں پیا' یا سر جھکا لوے گا فیر یا پتھر مارلے گا' کیوں دا جواب نئیں دے سکدا'' ۔

شرابی کا نشہ اترنے کی حالت میں اس کے ہاتھوں ہونے والے نقصان کا قصہ

مشہور ہے کہ رنجیت سنگھ ہاتھی پہ چڑھا آ رہا تھا'' ماناجٹ اگوں اونداسی پیا شراب پیتی ہوئی کہن لگا او کانیا' اے کٹا ویچنا ای''۔ سپاہی آئے لے گئے پکڑ کے رات بھر حوالات میں رکھا صبح تک ہوش ٹھکانے آ گئے اُس نے کہا بلالاؤ۔ آیا سامنے'' کہن لگا پئی توں بیوپاری ہیگا سیں تے کل ساہنوں پچھداسیں پیا پئی او کٹا ویچنا ہیگا ای' او ویچنا ہیگا اے دس خریدنا ای' کہن لگا جی او بیوپاری تے کل ای لدگئے۔ اولد گئے بیوپاری جیہڑا کٹا خریدن واسطے آئے ہیگے سن۔ آج تے ماناجٹ ای تہاڈے سامنے' فیر او ماناجٹ ای رہ جاندا ہیگا''۔ وَ مَا یَمْکُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ (6:123)۔ کہا کہ اگر اکابر مجرمین ہوں تو ان کی یہ سازشیں اور مکر زیادہ سے زیادہ ان کی ذات کو نقصان پہنچائیں گی' اکابر مجرمین کی جو پہلی سازشیں ہوتی ہیں' وہ تو قوموں کو لے ڈوبتی ہیں۔ مکر تو اپنی ذات ہی کے خلاف کرتے ہیں ان کے نقصانات لیکن کہاں تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ وہ نقصان ہیں جس کے متعلق قرآن کریم نے سورۃ ابراہیم میں یہ کہا ہوا ہے کہ تم نے اس کو بھی دیکھا ہے جس نے ہماری نعمتوں کا کفران کیا اور اس کے بعد وہ قوم کو اس منڈی میں لے گیا کہ جس میں اس جنس کا سد کا کوئی خریدار نہیں ہے۔

لفظ یحل کا لغوی اور قرآنی مفہوم اور ذہنی طور پر خناس کی کیفیت

اس نے ہماری نعمتوں کا کفران کیا وَ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (14:28) اس نے ہماری نعمتوں کا کفران کیا اور قوم کو اس منڈی میں لے گیا جہاں اس جنس کا سد کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ جہنم میں لے گیا وَ بِئْسَ الْقَرَارُ (14:29) کتنی بری ذلیل جگہ ہے وہ رہنے کی۔ قوم کو اس منڈی میں جا اتارا اس نے۔ یحل کا لفظ ہے جہاں یہ سوداگر' یہ قافلے والے جو لاتے ہیں سامان' جہاں رسیاں کھول دیتے ہیں' اونٹوں کی' بٹھا دیتے ہیں جنس کو اتار دیتے ہیں منڈی میں۔ اس منڈی میں قوم کو لے گیا جہاں اس جنس کا سد کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ لِیَمْکُرُوْا فِیْهَا ط وَ مَا یَمْکُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَ مَا یَشْعُرُوْنَ (6:123)۔ کہا ان کے تکبر کا پھر یہ عالم ہو جاتا ہے۔ بڑھنا

چاہیے۔ یہ رونا آج کا نہیں یہ رونا تو اب عمر بھر کا ہوگا' یہ رونا تو آئندہ آنے والی نسلوں تک کا ہوگا اور میرا رونا نہیں' رونا یہ ہے سارے گلستاں کا۔ کہاان کے تکبر کا یہ عالم ہوتا ہے کہ یہ عام چیزوں کے تو مالک بن بیٹھتے ہیں اس مقامِ بلند کے اوپر۔ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہوتا۔ حتٰی کہ ان کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ **وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ** (6:124)

ان کو اگر خدا کا پیغام بھی آ کے کوئی رسول دیتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں! تم کہتے ہو تمہاری طرف خدا کی وحی آتی ہے' یہ نہیں ہم مانتے' خدا ہماری طرف براہِ راست حکم بھیجے تو پھر مانیں گے۔ اللہ اکبر۔ خناس سماتا ہے ذہنوں میں تو یہ مقام آتا ہے۔ اس نے کچھ کہنا ہے اگر ہم سے تو براہِ راست وحی بھیجے ہمارے اوپر۔ اپنے سے باہر رسول کی بات بھی نہیں ماننے کے لیے تیار ہوتے۔ اپنے آپ کو خود فریبی میں' اسی صلاحیتوں کا مالک سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ **اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ** (6:124) ٹھیک ہے یہ طبعی چیزیں تو تم چھین جھپٹ کے لے سکتے ہو' ان کے مالک تو بن سکتے ہو۔ کم از کم ایک چیز تو ایسی رہنے دو ہمارے لیے خدا کہتا ہے' کہ جسے ہم ہی دیں کوئی اور نہ دے سکے اور وہ رسالت ہے' اسے تو ہم تک رہنے دو۔ تم کہتے ہو کہ رسول بھی ہم ہی ہونے کے مستحق ہیں۔ اسے چاہیے کہ جبریل کو ہمارے پاس بھیجے۔ کیا انداز ہے بات کہنے کا صدقے ہونے کو جی چاہتا ہے اس مصنف کے اوپر۔ **اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ** (6:124) ٹھیک ہے طبعی زندگی کی چیزیں تو ایک ڈاکو بھی لے جاسکتا ہے' ہلاکو بھی سلطنت لے جاسکتا ہے' یہ سب چیزیں لے جاسکتا ہے۔ لیکن کم بختو! کم از کم ایک چیز تو ہمارے پاس رہنے دو اور وہ رکھی ہوئی ہے ہم نے اپنے پاس' وہ کسی کو کسب و ہنر سے نہیں مل سکتی اسے تم نہیں چھین سکتے۔ اور یہی مقام ہے۔ جہاں پھر بچنے کی کوئی امید نظر آتی ہے کہ رسالت ان کے ہاتھ میں نہیں۔

خدا کا پیغام آج بھی ان کے ہاتھوں سے بچا ہوا ہمارے سامنے ہے۔ ہمارا سب کچھ لے گئے' اللہ کا احسان ہے کہ اس کی رسالت کو ہم سے نہیں لے کر جاسکے' وہ آج بھی موجود ہے۔

بے بسی کے عالم میں 10 لاکھ مربع میل تک حکومت کا قیام رسالت کا ہی صدقہ تھا

ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ قوم پھر اس کی رسالت پہ ایمان لے آئے کسی طرح سے۔ عزیزانِ من! اسے کوئی نہیں چھین کے لے جاسکتا کسی کو یہ حاصل نہیں ہوسکتی۔ اُس کی ہے' اس نے اس کو محفوظ رکھا ہوا ہے۔ سب کچھ تمہارا چھن جائے' پھر رسالت کی طرف آجاؤ پھر سب کچھ مل جائے گا۔ اس رسالت نے ایک دفعہ آپ کو یہ کچھ دیا تھا۔ چپہ بھر زمین نہیں تھی آپ لوگوں کے پاس' اس قوم کے پاس جس میں رسول آیا تھا۔ زمین اپنے پاس ہونا تو ایک طرف رہا اپنے گھر بار سے نکالے گئے تھے' دوسروں کے ہاں جا کے پناہ لی تھی۔ اس سے زیادہ بیچارگی بے بسی بے کسی کا تو عالم کسی قوم پہ نہیں آسکتا کہ گھر بار بھی نہ رہے ان کا۔ مہاجر صرف گھر بار ہی کو ترک کرنے والا نہیں ہوتا یہ تو

وہ ہوتا ہے جو سب چیز ترک کر چھوڑتا ہے۔اس کیفیت میں یہ قوم گئی تھی ان کے پاس کیا تھا' کچھ نہیں تھا طبعی زندگی کا' کچھ نہیں تھا ان چیزوں کا جو طبعی طور پہ حاصل ہوتی ہے۔ان کے پاس صرف رسالت تھی۔اس رسالت کو انہوں نے سنبھال لیا تھا۔اور پھر کوئی دور کی بات نہیں تھی افسانہ نہیں ہے' محض عقیدت مندی نہیں ہے' تاریخ کا اٹل نوشتہ ہمارے سامنے ہے۔اسی رسول کی زندگی میں کم از کم دس لاکھ مربع میل کی مالک یہ قوم ہوگئی تھی جن کا ایک گھر بھی اپنا نہیں تھا۔

نبی اکرم ﷺ کی وفات کے فوری بعد حضرت ابوبکرؓ کی زبانی ملتِ اسلامیہ کے لیے قرآن کا اعلان عظیم

یہ رقبے کا چھوٹا ہو جانا کچھ بات نہیں ہے۔رسالت تھی ان کے پاس۔اور پھر رسالت کے معنی شخصیت نہیں تھی۔یہاں بھی ہمیں اس نے یہ بتا دیا جب اس میں سے رسول گیا ہے حضور ﷺ کی وفات کے اوپر جو کہرام مچا ہے' تاریخ ہمیں بتاتی ہے۔تو اس وقت جو سب سے قریب تر تھا رسول ﷺ کے' وہ اٹھا تھا اور اس نے منبر پہ کھڑے ہو کے کہا تھا وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (3:144) محمد ﷺ اس سے زیادہ کچھ نہیں تھے کہ ایک رسول ﷺ تھے رسالت کو لانے والے تھے پیغام تمہیں Deliver کر دی پیغام رسان چل گیا۔کس چیز کی کمی واقع ہوئی ہے۔اس سے پہلے بھی رسول آئے' پیغام دے کے چلے جاتے تھے قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (3:144) تو کل کو اگر یہ خدا کہہ رہا ہے یہ خدا ہی تو کہہ رہا تھا تو ہم نے برداشت کر لیا کوئی اور کہتا اس رسول کے متعلق تو ہم شاید برداشت نہ کر سکتے۔خدا نے بڑی عظیم بات کہہ دی ہے شخصیتوں کے دور ختم ہو گئے' شخصیتیں آنی جانی ہوتی ہیں۔کیا کل کو اگر یہ مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو تم کہو گے کہ بس معاملہ اس کی ذات تک تھا' وہ گیا ہمارا معاملہ چلا گیا' پھر پلٹ جاؤ گے اپنی روش پر۔اس صاحبِ غار اور صاحبِ قبر نے منبر پہ کھڑے ہو کے یہ کہا یہ آیت پڑھی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اور اس کے بعد کہا کہ سن لو کہ جو محمد ﷺ کی عبودیت اختیار کیے ہوئے تھے وہ روئے آج کہ اس کا معبود مر گیا ہے اور جو خدا کی عبودیت اختیار کیے ہوئے تھا اس کو کوئی وجہ رونے کی نہیں ہے کہ وہ حی لا یموت ہے۔

نبوت کے ختم ہونے پر رسالت تو ختم نہیں ہوتی

اس کی رسالت ہمارے پاس موجود ہے۔رسول کے چلے جانے سے' رسالت گم نہیں ہو جاتی اور قرآن نے یہ کہا ہے کہ رسالت ہماری ہے ہم بھیجتے ہیں اس کو۔اس رسالت کو قیامت تک کے لیے اس نے محفوظ رکھ دیا تھا کہ جب طبعی زندگی میں سے کوئی چیز بھی تمہارے پاس نہ رہے' تو مکے یا مہاجر بن کے گھروں سے بھی نکالے جاؤ تو رسالت کو نہ ضائع کرو۔اس کو اگر تم نے محفوظ رکھ لیا تو سب کچھ ملے گا' وہ کچھ ملے گا جس کا تصور بھی نہیں تم کر سکتے تھے اس سے پہلے۔یہ اس لیے ہمارے ساتھ ہوا کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا

بِاللّٰہِ وَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ(2:8)یا یہ کہنا چھوڑ دیتے تو منافقت سے نکل کے کفر میں چلے جاتے۔کفر بھی کفرِ خالص بھی اپنے نتائج رکھتا ہے خواہ وہ عارضی ہی کیوں نہ ہو۔شعلۂ مستعجل ہی کیوں نہ ہو'وہ رکھتا ہے اپنے نتائج' قرآن بتاتا ہے۔اور ایمانِ خالص تو پوچھیے ہی نہیں کیا نتائج رکھتا ہے۔یہ دونوں نتائج رکھتے ہیں۔لیکن **اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ** (4:145)منافق تو جہنم کے پست ترین درجے میں ہوتا ہے۔منافق ہوتا ہے **وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ**(2:8) یہ نہیں اگر رسالت پہ تم نے چلنا تھا تو ایمانداری سے کام لیتے۔کہتے کہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے کم از کم دنیا کی سیکولر حکومتوں میں سے تمہاری حکومتیں ہو جاتیں ایمان نہیں تھا تو کفر تو ہوتا۔لیکن در کفر ہم پختہ نہ ای' زنار را رسوا مکن۔یہاں تو نہ جرأت وہ ہوئی کہ کفر کا اعلان کرے نہ اخلاص یہ ہوا کہ ایمان کے اوپر رہیں۔**وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ**(2:8). **وَ مَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ** (2:9). **اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ** (6:124) کہا اگر تم نے اس رسالت کو محفوظ رکھ لیا اپنے پاس **سَیُصِیْبُ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰہِ وَ عَذَابٌ شَدِیْدٌ بِمَا کَانُوْا یَمْکُرُوْنَ** (6:124)اگر تم نے رسالت کی پاسداری کی۔دیکھیے الفاظ قرآن کے یہاں کہا تھا **اَکٰبِرَ مُجْرِمِیْھَا**(6:123) کہا کہ تم دیکھ لو گے آنکھوں کے سامنے تمہارے آجائے گا کہ یہی اکابر مجرمین **صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰہِ**(6:124) کس طرح سے بن جاتے ہیں۔اکابر جو ہیں **صَغَارٌ** (6:124) ہو جائیں گے' کوئی بڑے سے بڑا تمہیں نظر آتا ہے چھوٹے سے چھوٹا ہو جائے گا۔بالکل اس کے مقابل میں لفظ لایا ہے قرآن **صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰہِ**(6:124) ۔اور پھر یہ نہیں کہ ذہنی طور پہ بات چھوڑ دی کہ ہاں ٹھیک ہے اس قسم کی پستیاں۔**عَذَابٌ شَدِیْدٌ**(6:124) بڑی شدت کا عذاب اور سزا ہوگی۔**سَیُصِیْبُ الَّذِیْنَ**(6:124) یہ بس دیکھ لیجیے یہ کیا ہے' دیر نہیں لگے گی اس میں' خود دیکھ لو گے اپنی آنکھوں سے کہ کس طرح یہ اکابر سے **صَغَارٌ** بنتے ہیں کیسا عذابِ شدید ملتا ہے۔کیوں ملتا ہے؟ کہا تھا کہ وہ **یَمْکُرُوْنَ** (6:124)سازشیں کرتے تھے۔یہ کیوں ملے گا؟ **بِمَا کَانُوْا یَمْکُرُوْنَ** (6:124) وہی سازشیں ان کی الٹ کے ان کے اوپر جا پڑیں۔دیکھا آپ نے کہاں رسالت قرآن لایا ہے کیا علاج بتایا ہے۔ہمارا اس نے۔کہتے ہو جب تک زبان سے تو پھر تو رسالت کو اپنانا پڑے گا اور اگر کہتے ہو زبان سے **وَ مَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ**(2:8) پھر تو اس کے لیے بڑا شدید عذاب ہوگا۔رسالت پہ ایمان لے آؤ دیکھ لو گے تم اپنی آنکھوں سے کہ اکابر کس طرح سے **صَغَارٌ** بنتے ہیں' عذابِ شدید ملتا ہے۔**بِمَا کَانُوْا یَمْکُرُوْنَ**(6:124)۔لیکن پہلی چیز اس کے لیے بہت بڑی شرط لگائی ہے۔

وسعت نظر اور کشادہ قلبی شعبہ رسالت کی پاسداری کا بنیادی ستون ہے

پہلے ایک شے ہوتی ہے تنگ نگہی' ظرف کا چھوٹا ہونا۔یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں جتنی بھی طبعی زندگی کی انہیں ہی منتہا اور مقصود سمجھ لینا

کشادنہ پیدا ہونے دینا اپنے اندر۔ دوسری چیز یہ ہوتی ہے کہ نگاہوں میں کشاد' قلب میں وسعت یہ چیزیں حاصل ہوں۔ کہا کہ یہ جو چیز ہم نے کہی ہے رسالت کی پاسداری' جسے ہم اسلام کہتے ہیں اس کے لیے تو بنیادی شرط یہ ہے کہ **فَمَنۡ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ يَّهۡدِيَهٗ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ** (6:125) جس کے متعلق یہ ہو کہ کشادگی راہیں اس کے سامنے آ جائیں' کامیابیوں کے راستے اس کے سامنے کھل جائیں۔ آپ نے کبھی اس پہ غور کیا قرآن نے ہمیشہ ہدایت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جسے آپ مایوسی کہتے ہیں اور انتہائے مایوسی کیا ہوتی ہے؟ کسی چیز کا ہاتھ سے جاتے رہنا' اس سے غم ہوتا ہے آپ کو' Loss ہوتا ہے' نقصان ہوتا ہے' مایوسی نہیں ہوتی۔ مایوسی اس وقت ہوتی ہے جب آگے راستہ کوئی نظر نہ آئے' اسے مایوسی کہتے ہیں۔ اگر کہیں سے بھی کوئی راستہ نظر آ جائے تو نقصان تو اٹھاتا چلا جاتا ہے' مایوس نہیں انسان ہوتا۔ قرآن ہر ایسے مقام کے اوپر ہدایت کہتا ہے' ہدایت کے معنی ہوتے ہیں کشادہ راستہ سامنے آ جانا نکھر کے۔ اس نے کہا ہے اس سے نقصان تمہیں ہوا ہے راستے بند نہیں ہوئے' رونے کی کونسی بات ہے۔ یہاں بھی وہی چیز ہے کہ اس قدر ناکامیوں کے باوجود جس مقام پہ تم آ پہنچے' اس کے بعد راستہ کھلا ہوا تمہارے پاس ہونا چاہیے۔ راستہ موجود ہوتا ہے اس کے لیے ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ذرا اپنی نگاہ میں وسعت پیدا کر لو یہ تنگ نظریاں چھوڑ دو۔

تنگ نظری کے برعکس وسعتِ قلب ایک ایسا کھلا میدان ہے جس میں پوری انسانیت سما سکتی ہے

انفرادی مفاد پرستیاں سب سے بڑی تنگ نظری یہ ہے' سب کچھ سمٹ کے میرے پاس آ جائے اس سے زیادہ تنگ نظری بھی کچھ اور ہو سکتی ہے۔ جسے الاسلام کہتے ہیں عزیزانِ من! بنیادی شرط اس کے لیے کشاد ہے نگاہ کی' وسعت ہے قلب کی سینے کی۔ یہ کتنی بڑی وسعت ہے اتنی بڑی کہ ساری انسانیت اس کے اندر سما جائے۔ بہبودِ خویش کو تو ہر حیوان بھی اپنے سامنے رکھتا ہے یہ تو By instinct آتی ہے' حیوانی جبلت ہے تحفظِ خویش' اپنا تحفظ حیوانی جبلت ہے۔ تحفظِ غیر کے لیے وسعتِ قلب کی ضرورت ہے یہ انسانیت کا شرف ہے' اسے ہی الاسلام کہتے ہیں۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ تحفظِ خویش تو حیوانوں کی جبلت ہے اور وہ حیوان بھی ملتے ہیں جو تحفظِ خویش بھی نہیں چاہتے تباہ کر دیتے ہیں' اپنے آپ کو بھی۔ قرآن نے کہا تھا ان کے متعلق **اُولٰٓـئِكَ كَالۡاَنۡعَامِ** (7:179) یہ حیوان ہیں فوراً کہا **بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ** (7:179) یہ ان سے بھی گئے گذرے ہیں۔ دنیا میں کوئی پرندہ اپنا گھونسلہ اپنے ہاتھوں سے نہیں اجاڑتا۔ کوئی حیوان اپنے مسکن کو خود تباہ نہیں کرتا۔ گدھا بھی اپنے بچوں کو ہلاک نہیں کرتا۔ Preservation of self کو حیوانی Instinct کہا گیا تھا۔ کبھی کبھی باتیں چمک کے آ جاتی ہیں سامنے جب قرآن نے کہا کہ حیوانوں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ حیوان کم از کم تحفظِ خویش تو وہ کرتا ہے۔ جو تحفظِ خویش بھی نہیں کرتا **بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ** (7:179) ان سے توقع کرنا کہ یہ وہ وسعتِ قلب ہو گی جو قرآن کہتا ہے **يَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ** (6:125)۔

قرآنِ حکیم کا فرعون کے متعلق ارشاد کہ وہ بڑا ہی تنگ نظر واقع ہوا تھا

حضرتِ موسیٰؑ جب گئے تھے اتنی بڑی مہم کے اوپر تو جانے سے پہلے جو درخواست کی تھی وہ یہی کہی تھی' پوچھا گیا تھا کہ فرعون یہ کچھ کیوں کرتا ہے' کہا گیا کہ بہت تنگ نظر واقع ہوا ہے' انہوںؑ نے کہا تھا کہ یا اللہ! پھر مجھے کشادگیٔ ظرف عطا کردے' میں کامیاب ہو جاؤنگا اس کے اوپر۔ اپنا تحفظ یا اپنا مفاد یہ تو حیوانی درجہ ہے' تنگ نظری ہے۔ کشادہ پیدا کیجیے انسانیت کا مفاد سامنے رکھئے اور پھر اس کے بعد دیکھئے کہ کوئی تنگ نظر آپ کو ناکام نہیں بنا سکے گا۔ کہا کہ جس کے لیے یہ چاہتے ہیں' اس کے سامنے راستے کھل جاتے ہیں۔ وَمَنۡ یُّرِدۡ اَنۡ یُّضِلَّهٗ یَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَیِّقًا حَرَجًا (6:125) اور اس کے مقابلے میں غلط راستے کے اوپر چلنے والے۔ یہ جو ترجمے لفظی آپ اس میں دیکھیں گے کہ جن کے متعلق ہم یہ چاہتے ہیں جن کے متعلق ہم یہ کرتے ہیں ان کے سامنے راستے کھول دیتے ہیں۔ تو ان ترجموں سے بڑی غلط چیز ذہن کے اندر آتی ہے۔ تو اب مجھے ہر آیت کے اوپر یہ تشریح کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ''کتاب التقدیر'' میں میں نے سب کچھ لکھ دیا ہے کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ ابھی ایک اور بات عرض کرونگا۔

غلط راستے پر چلنے والے کی نفسیاتی کیفیت

غلط راستے کے اوپر چلنے والے کی کیفیت سنئے کیا ہوتی ہے حالت: تنگ نظر' گھٹا ہوا تنگ سینہ' ہموار زمین پہ چلتا ہے' محسوس ایسا ہوتا ہے جیسے پہاڑ کی گھاٹی چڑھ رہا ہے۔ سانس پھولی ہوئی دم اکھڑا ہوا' کیفیت اس کی یہ ہو جاتی ہے۔ تنگ نظری اور سینے کی تنگی کی کیفیت یہ ہے کہ سانس جیسی چیز جس کا احساس بھی انسان کو کبھی نہیں ہوتا' آپ سمجھ سوچ کے نہیں لیتے' یہ خود ہی آتا چلا جاتا ہے۔ لیکن گھاٹی پہ چڑھنے والے کے متعلق دیکھئے کہ وہ سانس کیسے لیتا ہے یا مرض سے جس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے جسے ہم دمہ کہتے ہیں' اسے دیکھئے وہ سانس کیسے لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے' یہ گھٹن پیدا ہو جاتی ہے نگاہوں کے اندر' اپنی ہی ذات کے مفاد تک نگاہ رہتی ہے اس سے ذرا بھی آگے نہیں جاتی۔ یہ سمجھئے کہ سینے میں اس کی سانس بھی اس کو کشادہ سے نہیں آتی۔ ایک ایک سانس کے اوپر یوں نظر آتا ہے کہ اب موت آئی اب موت آئی۔ دوسری جگہ وہ کہتا ہے کہ چاروں طرف سے موت آتی نظر آتی ہے یَاۡتِیۡهِ الۡمَوۡتُ مِنۡ کُلِّ مَکَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَیِّتٍ (14:17) لیکن کم بخت مرتے بھی تو نہیں ہیں۔

اپنے پست جذبات کے تحت وحی کی صاف اور شفاف تعلیم کو رجس کر دینا یا گدلا دینا

یہ ہے وہ تنگ نظری۔ کَذٰلِکَ یَجۡعَلُ اللّٰهُ الرِّجۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ (6:125) جو ان صداقتوں پہ ایمان نہیں رکھتا اور زبان سے کہتا رہتا ہے کہ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ (2:8) کہتا ہے اس طرح سے اس کے اوپر رِجۡس ڈال دیتے ہیں۔ لفظ یہی

ہے ترجمہ آپ دیکھیں گے تو ناپاکی ترجمہ اس کا آ جائے گا۔ بات نہیں سمجھ میں آتی کہ کیا چیز ہے۔ رجس : ایک تو صاف مقطر پانی ہوتا ہے' ایسا پانی ہوتا ہے جس میں آپ کھڑے ہوں تو نیچے تک سوئی بھی نظر آ جاتی ہے کوئی گری ہوئی اور اس مقطر پانی میں جب اسی پانی کے نیچے جو گدلا پن ہوتا ہے جو کیچڑ ہوتا ہے ''او ہنوں اگر کچول دیوا یہدے وچ'' اس کے بعد اسی مقطر پانی کی جو کیفیت ہو جاتی ہے اسے رجس کہتے ہیں عربی میں۔ وہ کہتا ہے ہوتا یہ ہے کہ پانی تو مقطر ان کے پاس تھا عقل وشعور اور فکر اور ساری چیزیں تھیں۔ ان کے پست جذبات نے '' کچولا کچول دتا اے تے ہن صاف چیز اں وی ایہناں نوں نظر نئیں اوندیاں''۔ کیا کہہ جاتا ہے!!۔ جبھی تو میں نے کہا کہ منطق کے ذریعے سے جواب نہیں ملتا کہ یہ کیوں کیا صاحب' کیوں کا جواب تو آبِ مقطر میں سے ملتا ہے۔ یہ جو رجس ہے اس کے معنی یہ ہیں میں خود نہیں کہتا قرآن نے دوسرے مقام پہ کہا ہے وَ يَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ (10:100) ہم رجس ڈال دیتے ہیں ان لوگوں کے اوپر لَا يَعْقِلُوْنَ (10:100) جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔ کوئی بات صاف نظر نہیں پھر ان کو آتی ''عقلاں ماریاں جاندیاں نیں' متاں ماریاں جاندیاں نیں''۔ یعنی یونہی ذرا کنارے پہ کھڑا ہوا بھی آدمی یہ کہتا ہے اوئے اسے کچھ بھی نظر نہیں آتا ایک Lay Man بھی پھر اس کے بعد پکارتا ہے او یہ تو ہم بھی سمجھ رہے تھے یہ کچھ غلط ہوتا ہے اور انہیں یہ کچھ بھی نہیں سمجھ میں آیا۔

ساری قوم کے مقابلے میں اس ''کچولا کچولنے'' والے کی حالت

ساری قوم پکارنے لگ جاتی ہے اوا تنا کچھ بھی کیوں سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آیا کہ اپنے ذاتی تنگ نظری جذبات نے ''کچولا کچول دتا ہو یا ہیگا سی''۔ کہا یہ تھا ان کے اوپر ہو گیا ہوا' ورنہ راستے تو گم نہیں ہو گئے تھے وَ هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا (6:126) ''اوا اے تے آ سامنے پیا ہو یا ہیگا سی''۔

ذکر کا قرآنی مفہوم' اس کی اہمیت اور اس کی عملی وضاحت

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (6:126) کس طرح نکھار نکھار کے ہم باتیں سمجھاتے جاتے ہیں' لاتے جاتے ہیں۔ لیکن یہ تو اس قوم کے لیے ہے جو ان چیزوں کو اپنے سامنے رکھے ورنہ کتنی ہی تفصیل سے بیان کی ہوئی چیز' کتنی ہی نکھری ہوئی ابھری ہوئی چیز کیوں نہ ہو جو اسے اپنے سامنے ہی نہیں رکھتا اس کو اس سے فائدہ کیا ہوگا۔ اور پھر يَذَّكَّرُوْنَ (6:126) ہے یہاں یہ جانتے ہیں عربی والے' ہر وقت نگاہ کے سامنے رکھے ہوئے' کہ اس مقام کے اوپر مجھے کدھر جانا ہے۔ ہوائی جہاز والے سے پوچھا کرو کہ اس کو یہ ذکر کتنا زیادہ شدت سے کرنا پڑتا ہے۔ وہ تو ایک سیکنڈ میں تین تین میل کی رفتار سے چلتا ہے اور اس کو جو رخ اپنے بدلنے ہوتے ہیں' مقام کا تعین کرنا ہوتا ہے' کس طرف جانا ہوتا ہے ہر وقت چارٹ اس کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے ایک سیکنڈ کے لیے بھی نگاہ سے اوجھل ہو تو میلوں کدھر کا کدھر نکل جاتا ہے۔ یہ ہے یذکرون جسے کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں پھر اس ذکر کا جو ترجمہ ہوا اور پھر اس کا جو عمل ہوتا ہے ''الا اللہ

والا گنگاں والا ذکر دے' ایہہ معنی ہوگئے'' ۔فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ (6:126) کھلی ہوئی آیتیں ہیں رازِ سر بستہ نہیں ہے باطنی علم نہیں ہے فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ کھلی ہوئی باتیں ہیں حقیقتیں ہیں۔واقعی اگر'' کچولا نہ ہووے تے ایہدے نالوں سیدھیاں کھلیاں ہویاں گلاں ہی کوئی نئیں او ہیگیاں۔

ہر قسم کی تباہی سے بچنے کے لیے ذکر کے مفہوم کو سامنے رکھنا ہوگا

عزیزانِ من!''۔لیکن یہ تو ان کے لیے فائدہ مند ہوسکتی ہیں جو اس چارٹ کو سامنے رکھ کے Piloting کرے اس جہاز کو' ورنہ ذرا او جھل یہ ہوا گیا پھر۔اور پھر جتنی تیزی سے چلو گے اتنی تیزی سے تباہی ہوگی۔یہ جو ہر وقت اس چارٹ کو سامنے رکھ کے ان راستوں پہ چلتے ہیں اس دیے کو آگے رکھتے ہوئے لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ (6:127) سلامتی ہے ان کے لیے' یہ تباہیوں سے بچ سکتے ہیں۔ وَ هُوَ وَلِیُّهُمْ (6:127) اس مقام پہ جاکے تم تو اپنے آپ کو کہتے تھے کہ ہم ولی اللہ ہوتے ہیں' وہ کہتا ہے وہ تمہارا ولی ہو جاتا ہے۔ سوچئے تو سہی' سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کا ہے کا' کوتوال اگر کسی کا سیاں ہو جائے تو وہ کہتا ہے کہ اب ڈر ہی کوئی نہیں' اوجس کا سیاں خدا ہو جائے خود عزیزانِ من! فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (6:48) ۔لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ هُوَ وَلِیُّهُمْ (6:127) موج ہوگئی خدا یار بن گیا بڑی موج ہوگئی۔

خدا کو اپنا ولی بنانے کا معیار اور ہمارے ٹی وی پروگراموں کی نوعیت

لیکن آیت کو ابھی نہ ختم کیجیے دو لفظ اور باقی ہیں ابھی' اسے تو ہم سننا نہیں چاہتے۔کہتا ہے بن کیسے گیا تمہارا یار؟ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (6:127) تمہارے اعمال کے صدقے میں' یوں بنتا ہے۔''سوکھا وی کناں تے ڈاہڈا اوی کناں'' بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (6:127) یہاں تو عمل کی بات ہے کام کرنے کی بات ہے پھر وہ یار بن جاتا ہے۔بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (6:127) اور جونہی یہ عمل آپ کا جو تھا وہ آیا تسبیح اور مصلے پہ وہ آیا Mechanical نمازوں پہ پھر یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ مَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ (2:9) ۔ولی بن جاتا ہے وہ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (6:127)۔میں نے کہا تھا کہ ان مایوسیوں کے عالم میں ایک بات اور بھی میں آپ سے کہونگا رات ہی میں نے وہ ٹی وی پہ سنی اور میرے ذہن میں تھا کہ اب بہکایا قوم کو پھر انہوں نے۔سوال یہ پیدا ہو رہا تھا آج کل تو یہ عام اب ہو رہا ہے کہ اب کیا کیا جائے اب کیا ہو جی۔ایک بہت بڑے فلاسفر تھے جنہوں نے قوم کو بتانا تھا اب کیا کیا جائے۔وہ فرماتے تھے اب قوم کو یہ سبق دیا جا رہا ہے' گھر گھر پہنچایا جا رہا ہے' کونوں کے اندر رکھا ہوا ٹیلی ویژن بتا رہا ہے' بچے بھی سن رہے تھے۔اب کیا کیا جائے ہر ایک کے سینے میں ہے اب کیا کیا جائے؟ وہ کہہ رہے تھے کہ فطرت کو جب منظور ہوتا ہے کسی قوم کو بچانا تو وہ پھر اپنی طرف سے ایک انسان اس میں پیدا کر دیتی ہے۔تو کسی اس نے کہا کہ جی! اگر وہ انسان نہیں پیدا ہوتا تو پھر سمجھ لیا کہ فطرت کو بچانا ہی

مقصود نہیں ہے تو بات ختم ہوگئی۔ یعنی قوم کے لیے تو کچھ کرنے کی بات ہے نہیں۔ یوں چلا آپ کے ہاں سے پہلے سے یہ فریب کا جھکڑ 'مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔ اسی کا انتظار ان کورہا اس قوم کو' غیب سے آئے' ایک اندریں گردسوارے باشد' غبار اٹھتا ہے کیا پتہ اسی کے اندر وہ شاہسوار چھپا ہو۔ غبار آتا ہے' غبار بیٹھ جاتا ہے' نکل جاتا ہے پھر یہ دوسرے غبار کے انتظار میں بیٹھ جاتے ہیں 'مردے از غیب بروں آید و کارِ بکند'۔ یہ بتایا جارہا ہے کہ وہ تو پھر فطرت ایک پیدا کر دیتی ہے۔

فطرت نے جس کو پیدا کرنا تھا وہ پیدا کر دیا اور اپنی راہنمائی کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا

عزیزانِ من! فطرت کا پروسیس کبھی تھا ایسا' پیدا کیا کرتی تھی۔ انہوں نے سمجھا ہی نہیں ہے کہ فطرت نے اعلان کر دیا اس چیز کا خاتم النبین ﷺ کہہ کے' اب ہماری طرف سے کوئی آ کے کام نہیں تمہارا کیا کرے گا۔ اب تم نے خود پیدا کرنی ہیں۔ شخصیتوں کا دور چلا گیا۔ رسالت باقی رہے گی اب ہماری طرف سے مردے از غیب نہیں آئے گا تمہارے پاس کچھ کرنے کے لیے۔ اب تو **وَ هُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (6:127) یہ نہیں کہا کہ کوئی ایک آئے گا وہ آ کے یہ کر دے گا وہ تو یہ ہے کہ تم کچھ کرو گے تو یہ کچھ ہو سکے گا ورنہ نہیں ہو سکے گا۔ راستہ بتا دیا' دستورالعمل دیدیا' حقائق کو واضح طور پہ دکھا دیا' غلط اور صحیح میں تمیز کر کے دکھا دی' دیا دیدیا روشنی کا چراغ دیدیا۔ سب کچھ دیدیا اور اس کے بعد کہا کہ بھائی صاحب! اب تو تمہارے کرنے پہ ہے۔ کوئی غیب سے آ کے تمہاری جگہ کچھ نہیں کرے گا۔ حتیٰ کہ **وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ** (3:144)۔ عزیزانِ من! ختمِ نبوت ﷺ پہ ایمان رکھنے والی قوم کو دنیا میں سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیے تھا۔ جس کا بھروسہ کسی شخصیت کے اوپر نہیں ہو سکتا۔ جو اس آسمان کے نیچے بڑی سے بڑی شخصیت بھی ہو سکتی تھی' جسے کہا گیا کہ 'بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر' اس نے اس ﷺ کے متعلق بھی یہ کہہ دیا کہ اس کے جانے سے کچھ نہیں بگڑے گا یاد رکھو۔ اب اس انتظار میں نہ بیٹھے رہو کہ کوئی آئے گا اور تمہارے کام کرے گا۔ ساری قومیں تباہ ہوگئیں جو اس انتظار میں رہی تھیں' دنیا کی ہر نکبت و زبوں حالی میں ڈوبی ہوئی قوم کا یہ عقیدہ ہے کہ آخر میں ایک آئے گا اور پھر ہمارا عروج ہوگا اور ہماری سلطنت ہوگی۔

اب کسی آنے والے کا تصور مذہب کا پیدا کردہ ہے' دین کا نہیں دین تو ہر لحاظ سے مکمل ہو چکا ہے

ہر مذہب کے اندر آنے والے کا تصور ہے ہندو دھرم میں کلنکی اوتار آئے گا' بدھوں کے اندر آخری مسیحا بدھ آئے گا' جینیوں کے اندر آخری جینی ایک آئے گا' یہودیوں کے اندر ایک آنے والا مسیحا ہوگا۔ مسیح آیا تو عیسائیوں نے کہا وہ آخری زمانے میں حضرتِ عیسیٰؑ آئیں گے' زرتشت کے اندر میترا آنے والا ہے۔ یہ اس زمانے کا تصور ہوتا ہے جب قوم کسی زوال میں گھر جاتی ہے اور اپنے بازوؤں میں قوت اس کے نہیں رہتی پھر وہ سہارا دے لیتی ہے اپنے آپ کو' فریب دے لیتی ہے اپنے آپ کو کہ آئے گا۔ اور پھر وہ سارے جتنے ہیں جیسا میں نے پہلے بھی کبھی بتایا تھا کہ وہ کہتے ہیں کہ قیامت سے پہلے وہ آئے گا آنے والا اور ان میں سے ہر ایک یہ کہتا ہے کہ پھر

ہمارے مذہب کا فروغ ہوگا ہماری قوم کو فروغ ہوگا۔ کسی نے مجھ سے پوچھا یہ قیامت سے پہلے کہتے ہیں' میں نے کہا سوچو تو سہی کہ ہندو' بدھ' جینی' یہودی' عیسائی' مسلمان ان سب کا وہ آنے والا آئے گا وہ ہر ایک چاہے گا کہ اس کا مذہب اور اس کی قوم جو ہے ان کو فروغ حاصل ہو' تے ایہد وں وڈی قیامت ہور کی ہونی ہیگی جے اوتے آپے ای آجانی ہوئی یعنی اوہ ڈانگاں سوٹا ہون گے آپس اچ اور فیر اے وڈے تو وڈے نال آئے ہون گے تے قیامت تے آ گئی آپے ای''۔ یہ برادرانِ من! یہ ہے فریب جو دیا جاتا ہے اس وقت قوم کو۔

ختم نبوت کے بعد کسی آنے والے کا تصور خود فریبی کے سوا کچھ اور نہیں

اس فریب سے نکالنے کے لیے ختمِ نبوت ﷺ کا عظیم اعلان ہوا تھا۔ جس قوم سے کہا گیا ہو کہ محمد ﷺ کے جانے سے بھی تمہارا کچھ نہیں بگڑ سکتا وہ کسی اور کا انتظار کر کے بیٹھ جائے گی؟؟۔ عزیزانِ من! وَ ھٰذَا صِرَاطُ رَبِّکَ مُسۡتَقِیۡمًا (6:126) رسالت تمہارے ہاں محفوظ ہے' یہی ہے تمہارے رب کا سیدھا راستہ۔ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّذَّکَّرُوۡنَ (6:126) اس قوم کے لیے جو اس چارٹ کو سامنے رکھے گی Piloting کے راستے بڑے صاف ہیں اس کے سامنے۔ لَھُمۡ دَارُ السَّلٰمِ عِنۡدَ رَبِّھِمۡ (6:127) ان کے لیے سلامتیوں کے گھر ہیں۔ سلامتی Negative چیز نہیں ہوتی' ترجمہ اس کا یہ امن اور سلامتی جو ہم کہتے ہیں یہ نہیں ہے' سالمیت ہے اس کے معنی۔ یہی بار بار کہتے تھے۔ پاکستان کی سالمیت' یہی لفظ تو ہے وہ۔ بہر حال مرغِ مسلم تو آپ نے سنا ہی ہوگا ''اوہدے اچوں جے اک ٹانگ کوئی لے لوے تے واپس کر دیندے اونا'' کہ یہ پورا نہیں ہے۔ وہ جب پورا آتا ہے۔ اسی کو الاسلام کہتے ہیں۔ پوری کی پوری بھرپور زندگی جب ملتی ہے۔ لَھُمۡ دَارُ السَّلٰمِ عِنۡدَ رَبِّھِمۡ وَ ھُوَ وَلِیُّھُمۡ (6:127) پھر وہ دار السلام ہوتا ہے' وہ یار ہو جاتا ہے' پھر ان کا مددگار ہو جاتا ہے۔ کیسے ہو جاتا ہے؟ غیب سے کوئی مرد آ کے کام نہیں یہ کر دیتا۔ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (6:127)۔ وَ ھٰذَا صِرَاطُ رَبِّکَ مُسۡتَقِیۡمًا (6:126) وہ ہے آپ کے ہاں دیا' چراغِ راہ اور تمہارا کام عمل ہے۔ عمل بھی نہ کہا کریں ''عمل توں وی کئی ہور معنی ہوندے ہیگے'' ایک تو یہ شریعت کا عمل ہوا وہ تو آپ کے سامنے ہے ''ایک عملی وی ہوندے ہیگے نیں نا' عمل کردا اے جی اے' بھنگ پیندا اے پوست پیندا ہیگا اے' ڈوڈے پیندا ہیگا اے' اینوں عمل کیندے نیں نا'' یہ عملِ باطن ہے۔ لیکن وہ عملِ ظاہر ہے یا یہ عملِ باطن ہو نتیجہ دونوں کا ہی خود فریبی ہوتا ہے۔ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (6:127) یَعۡمَلُوۡنَ وہ کہ جس کے لیے سَیُصِیۡبُ الَّذِیۡنَ اَجۡرَمُوۡا صَغَارٌ (6:124) کہ یہ جو اکابر بنے پھرتے ہیں فوراً نظر آ جائے تمہیں کہ یہ صَغَارٌ (6:124) ہو گئے ہیں تمہارے سامنے' یہ ہے وہ عمل عزیزانِ من! یہ ہوگا ٹیسٹ اس عمل کا۔ سورۃ الانعام کی آیت 127 تک ہم آ گئے' 128 سے آگے شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

انیسواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 128 تا 135)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قوموں میں پیدا ہونے والے انقلابات کے سلسلہ میں مکافاتِ عمل کا ذکر

عزیزانِ من! آج جنوری 1972ء کی 2 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی آیت 128 سے ہو رہا ہے (6:128)۔

حقیقی انقلاب میں بڑے بڑوں کے چہرے بے نقاب ہو جائیں گے

سابقہ درس میں نقطۂ ماسکہ یہ تھا کہ وَ کَذٰلِکَ جَعَلْنَا فِیْ کُلِّ قَرْیَۃٍ اَکٰبِرَ مُجْرِمِیْھَا لِیَمْکُرُوْا فِیْھَا (6:123) کہ قوموں میں یہ بڑے بڑے لیڈر جو درحقیقت بہت بڑے مجرم ہوتے ہیں وہ سازشیں شروع کرتے ہیں۔ وَ مَا یَمْکُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِھِمْ وَ مَا یَشْعُرُوْنَ (6:123) یہ سازشیں کسی اور کے خلاف نہیں ہوتیں، کرتے تو ہیں وہ یہ سمجھ کے کہ یہ دوسروں کے خلاف ہیں لیکن درحقیقت

وہ سازشیں خود ان کی اپنی ذات کے خلاف ہوتی ہیں وہ اس بات کو سمجھتے نہیں ہیں۔ اور اسی سلسلے میں بات آگے آئی تھی کہ پھر ایک انقلابی حادثہ آنے والا ہے جس میں یہ جتنے بڑے بڑے اکابر ہیں صَغَارٌ عِنۡدَ اللّٰهِ (6:124) یہ ذلیل وخوار ہونگے۔ اور اسی سلسلے میں اب بات آگے چلتی ہے کہ یہ جب انقلاب آئے گا تو اس میں صورت کیا پیدا ہوگی۔ آیت شروع ہوتی ہے۔

وَ یَوۡمَ یَحۡشُرُهُمۡ جَمِیۡعًا ۚ یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ قَدِ اسۡتَكۡثَرۡتُمۡ مِّنَ الۡاِنۡسِ (6:128) عام ترجمے کے اعتبار سے تو یہاں بڑی الجھن پیدا ہوتی ہے کہ جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے اور ان سے کہیں گے کہ اے جن اور انس کے گروہ یعنی انہیں جمع کریں گے اور کہیں گے گروہِ جن سے کہ تم نے گروہِ انس سے کافی فائدہ اٹھایا' ان میں سے بہت سوں کو اپنے ساتھ ملایا۔ وَ قَالَ اَوۡلِیٰٓؤُهُمۡ مِّنَ الۡاِنۡسِ ۚ رَبَّنَا اسۡتَمۡتَعَ بَعۡضُنَا بِبَعۡضٍ (6:128) اور گروہِ انس یہ کہیں گے کہ ہم نے ایک دوسرے سے بہت سا فائدہ اٹھایا در حقیقت' میں ابھی عرض کرونگا کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ وَّ بَلَغۡنَاۤ اَجَلَنَا الَّذِیۡۤ اَجَّلۡتَ لَنَا (6:128) لیکن بالآخر وہ معیاد ختم ہوگئی ہماری سازشوں کی جو کچھ ہم کیا کرتے تھے وہ دور ختم ہوگیا اور ہمارے اعمال کے نتائج کے سامنے آنے کا وقت آ پہنچا۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ قَالَ النَّارُ مَثۡوٰىكُمۡ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیۡمٌ عَلِیۡمٌ (6:128) ان سے کہا جائے گا کہ تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم میں اب تم داخل ہو جاؤ۔ یہی تمہارے اعمال کا اجر ہے' یہ بدلہ ہے' یہی نتیجہ ہے۔ میں نے یہ عرض کیا ہے کہ یہاں جن اور انس دو لفظ آئے ہیں اور یہ اسی مقام پہ نہیں قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں جن اور انس اکٹھے آئیں گے۔ ہمارے ذہنوں میں جنوں کے متعلق ایک عجیب سا تصور ہے وہ جو جن چمٹ جایا کرتے ہیں پھر وہ جنوں کو نکالنے کے لیے آیا کرتے ہیں اور آستانے اس کے لیے مشہور ہیں۔ یہ عام افسانے ہمارے ہاں مشہور ہیں۔ یہ جن کے متعلق تو تفصیلی گفتگو بعد میں کی جائے گی ضمناً یا اشارتاً یہاں یہ عرض کردوں کہ اس کائنات کی ایسی مخفی قوتیں جو یوں آنکھ سے نظر نہیں آتیں Invisible سی اور اب تو وہ جتنی مخفی قوتیں اس سے پہلے تھیں' آہستہ آہستہ وہ ساری محسوسات کے دائرے میں آتی چلی جاتی ہیں۔ لفظِ جن کے ہی معنی ہیں جو نگاہوں سے پوشیدہ ہو۔ تو کائنات کی ایسی قوتیں جو عام انسانوں کی Naked Eye سے پوشیدہ ہوتی ہیں انہیں جن کہا گیا ہے۔ لیکن یہ جن کے ایک معنی ہیں۔

دیہاتی اور شہری آبادی کے لیے جن وانس کے نام پر قرآن حکیم کی دو مختلف اصطلاحات کی وضاحت

جہاں جن اور انس آتا ہے قرآنِ کریم میں' عربوں کے ہاں یہ دو چیزیں جو تھیں وہ دو آبادیوں کے متعلق بولی جاتی تھیں۔ آج تو ہمارے ہاں چونکہ Communication (مواصلات) اتنی عام ہوگئی ہے کہ عام دیہاتی زندگی اور شہری زندگی میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہا۔ لیکن کچھ عرصہ پہلے خود ہمارے بچپن کے زمانے میں بھی جب ابھی اختلاط شہریوں اور دیہاتیوں کا اتنا عام نہیں ہوا تھا تو ان دونوں کی تہذیبیں بالکل مختلف ہوتی تھیں ایک دوسرے سے۔ گاؤں والا کبھی شہر میں آجاتا تھا تو بالکل اجنبی نظر آتا تھا اور اگر شہر والا کبھی

گاؤں میں چلا جاتا تھا جسے گاؤں والے اب تک مجھے یاد ہے ''تنبی پان والا کیندے سن یعنی او تھے تنبی پان والا جیہڑا اسی پنڈ وچ اجنبی ہونداسی'' یہ شلوار پہننے والا' گاؤں والوں میں کوئی بھی شلوار نہیں پہنتا تھا' تہہ باندھتے تھے۔ان کے خیالات ان کی فکر ان کی تہذیب ان کا تمدن رہن سہن بودوباش ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے تھے۔اور یہ تو پھر شہروں کی اور دیہات کی آبادی کا ذکر ہے خانہ بدوشوں کی اور شہر والوں کی ان دو آبادیوں کے اندر جو فرق ہوتا تھا تہذیب وتمدن کا' وہ تو اب بھی کچھ نظر آتا ہے۔اگرچہ وہ خانہ بدوش بھی اب شہروں کے بہت قریب آ کے بسنے لگ گئے ہیں۔لیکن اسے ذرا دور پھیلا دیجیے اور چودہ سو سال پہلے عرب کی زندگی پہ نگاہ ڈالیے اور عرب میں تو اب بھی قریب قریب وہی زندگی ہے۔ بہت تھوڑے سے شہر ہیں وہاں آبادیاں اور باقی ساری آبادی ان کی صحرانوردوں کی خانہ بدوشوں کی بدوؤں کی ہے۔ وہ شہروں میں اسی طرح سے آتے تھے جیسے یہ آپ کے خانہ بدوش وہ ''گکھوں گھوڑے والیاں'' وہ کبھی چھاج اور چھالنی بنا کے کبھی بچوں کے کھلونے بنا کے' کبھی کوئی چھوٹی چھوٹی گھریلو مصنوعات کی چیزیں بنا کے شہروں میں آیا کرتی تھیں بیچنے کے لیے یا یہ مداری اور قلندر اور اس قسم کے۔دن میں وہ یہاں رہتے تھے شام کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا' کہاں چلے جاتے ہیں یہ سب لوگ۔اور عربوں کی صحرائی زندگی تو اس سے بھی بڑی مختلف تھی وہ اکثر وبیشتر صحرا میں رہتے تھے' جنگلوں میں رہتے تھے' بیابانوں میں رہتے تھے' خانہ بدوشی کی ان کی زندگی تھی۔اور وہ ایک مستقل طرزِ بودوباش کے حامل تھے وہ یعنی ان صحرانشینوں کی ایک خاص زندگی تھی اور شہر کی آبادیوں کی ایک خاص زندگی تھی۔اسے آج مہذب زندگی کہہ لیجیے ان کو کچھ وحشیوں کی سی زندگی کہہ لیجیے۔لیکن بڑی متمیز تھی ایک دوسرے کے ساتھ۔اور Rural اور Urban Areas تو ہمارے ہاں ابھی تک یہ دو اصطلاحیں موجود ہیں۔ان کی صورت یہ تھی کہ یہ صحرا نشین کبھی کبھی شہروں میں آ جاتے تھے وہی چھوٹی موٹی چیزیں ضروریات کی وہاں سے لے کے نخلستان کی کچھ کھجوریں لیں وہاں سے شہد لیا تھوڑا سا کبھی اپنے انداز کا دودھ کا نکالا ہوا مکھن وہ لے آئے۔شہروں سے اپنی ضروریات کی چیزیں وہاں لے گئے۔

الیکشن کے زمانے میں لیڈروں کا دیہاتی آبادی کے ساتھ رابطے کا مقصد

اس سے پہلے گاؤں کی اور شہروں کی ہماری زندگی بھی ایسی ہوا کرتی تھی۔لیکن جب کبھی اس قسم کی سازشوں کا موقع آتا تھا تو یوں سمجھئے جیسے الیکشن کے زمانے میں لیڈر تو شہروں میں ہوتے ہیں اور ووٹرز گاؤں میں ہوتے ہیں۔اور آپ کو معلوم ہے کہ پھر ووٹنگ کے زمانے میں یہ شہروں کے لیڈر گاؤں والوں کی جا کے کتنی منتیں کرتے ہیں کتنی خوشامدیں کرتے ہیں۔ بتاتے یہی ہیں کہ ہم تو تم میں سے ہی حقیقت میں ہیں' یونہی کاروباری سلسلے میں شہر میں جا کے بس گئے ہیں۔اور اس کے 85% ووٹس کی بناء پہ یہاں یہ لیڈر بنتے ہیں پھر اقتدار حاصل کر لیتے ہیں' جب الیکشن ختم ہو جاتا ہے تو آنکھ بھی نہیں ملاتے ایک دوسرے سے۔اور ان میں سے بھی جی باہر کے دیہات کے علاقے والے ہیں وہ بھی اب جانتے ہیں' یہ بھی جب ووٹس مانگنے جاتے ہیں تو وہ سودے کرتے ہیں ان سے۔لیکن دونوں کے باہمی

روابط کسی قسم کے بھی کیوں نہ ہوں اس کے بعد جو ہیئت اقتدار بنتی ہے اس کے بعد جو آپ کے ہاں اکابرِ مجرمین جنہیں قرآن نے کہا ہے وہ بنتے ہیں' اگر چہ شہروں کی آبادی ان کا تمدن ان کی تہذیب ان کی دولت ان کے کام آتی ہے گاؤں کی آبادیاں دیہات کی آبادیاں صحرا نشینوں کی آبادیوں کے (آج کی اصطلاح میں میں نے کہا ہے) ووٹس بھی تو ان کے اقتدار کا ستون ہوتے ہیں۔ یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ یہ اکابرِ مجرمین یہ کچھ کیا کرتے تھے تو یہ اکابرِ مجرمین ہوتے تھے' یہ بھی شہری آبادیوں کے بڑے بڑے لیڈر لیکن ان کی قوت کا راز انہی صحرا نشینوں میں ہوتا تھا انہی بدوی قبائل میں ہوتا تھا۔ یہ عربی بدوی قبائل جس کے حلیف بن جاتے تھے جس کے ساتھ معاہدہ دوست داری کر لیتے تھے' اس کی بڑی قوت ہو جاتی تھی۔ وہاں جتنی لڑائیاں ہوتی تھیں ان میں لڑائیوں کے سرغنے تو یہ شہری آبادیوں والے ہوتے تھے لیکن ان کی جمعیت ان کی فوج ان کی سپاہ' وہ سارے یہ صحرا نشین بدوی قبائل ہوا کرتے تھے جو مالِ غنیمت کے لالچ میں ان کے ساتھ آ جاتے تھے۔ یہ ان کی Strength کا راز تھا اور یہ ان کی زندگی تھی۔ اب یہ دونوں مل کے ایک قوت یا ایک گروہ بنتے تھے اور ان کا نام قرآن نے کہا ہے یہ اکابرِ مجرمین جو بستیوں میں رہنے والے تھے وہ ان بدوی قبائل صحرا نشینوں کی تائید سے ان کی تقویت سے' یہ سارے جرائم کیا کرتے تھے۔ اور کہا یہ کہ اب تو انقلابی دور آ رہا ہے جس میں یہ سارے کے سارے باندھ کے اکٹھے کر کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے اور ان سے پوچھا جائے گا کہ تم یہ کچھ کیا کرتے تھے اور وہاں وہ یہ اقرار کریں گے۔ وہ صحرا نشین اور یہ شہروں کی آبادیوں والے یہ ہیں جن کے لیے عربوں کے ہاں جن اور انس کی اصطلاح مستعمل تھی۔ جن کہتے تھے ان آبادیوں کو جو نگاہوں سے اوجھل رہتی تھیں صحراؤں میں' وادیوں میں' باہر میدانوں میں۔ اور انس وہ موانست والے آپس میں مل جل کر رہنے والے جو شہری آبادیاں کہلاتی ہیں۔ یہ اصطلاح ہے یاد رکھئے! قرآنِ کریم میں جہاں جن اور انس آئے گا وہاں مراد ان کی ہوگی صحرا نشین بدوی اور شہروں کے رہنے والے آپس میں مل جل کر رہنے والی شہری آبادی۔ یہ اربن ایریا اور وہ رورل ایریا والے۔ یہ ہے جن اور انس سے مراد یاد رکھئے! جہاں اکٹھے یہ دو لفظ آئیں گے ان سے یہی مراد ہوگی۔ پھر ان سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے آپس کے روابط کیا تھے؟ وہ کہیں گے باہر کی آبادیوں والے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے ان شہر والوں سے خاصا فائدہ اٹھایا تھا۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے آج سمجھنے کے لیے تو وہ ووٹنگ کا زمانہ لے آیئے' اس میں ہر ایک اپنا اپنا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور یہ انس جو ہیں شہری آبادیوں کے سرغنے یہ کہیں گے کہ ٹھیک ہے' ہم نے ایک دوسرے کو برتا ایک دوسرے کو استعمال کیا۔ عجیب لفظ ہے یہ کہ ہم نے ایک دوسرے کو استعمال کیا تھا اور اس کی بناء پہ ہم یہ سب کچھ کیا کرتے تھے۔ تو ان سے کہا جائے گا کہ تم سب کے سب اسی طرح سے مجرمین کا گروہ ہو' جرائم پیشہ ہو ان جرائم میں تم سب اکٹھے تھے اس لیے تم سب کا ایک ہی حشر ہوگا۔ ووٹ دینے والوں کا بھی اور جنہیں ووٹ دیے گئے تھے ان کا بھی ان سب کا ایک ہی حشر ہوگا۔ اور وہ حشر ہے تباہی اور بربادی۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں دنیا اور آخرت کی ہر دو جہنمیوں کا ذکر کیا ہے

یاد رکھئے! عذابِ جہنم قیامت میں تو جو آنے والا ہے برحق ہے اس پر ہمارا ایمان ہے لیکن اس دنیا میں بھی قوموں کے اوپر جو قیامتِ صغریٰ گذرتی ہے ان تباہیوں کو بھی قرآن جہنم کا عذاب کہتا ہے جس عذاب میں ہم مبتلا ہیں۔ان سے یہ کہا جائے گا۔اور اس کے بعد کہا کہ وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًاۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (6:129) یہ یہاں نولی ہے مادے کے اعتبار سے دو معنی ہو سکتے ہیں اس کے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ جو سباق چلا آ رہا ہے‘ اس اعتبار سے تو یہ معنی ہونگے کہ اس طرح سے مفاد پرستوں کے گروہوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا جاتا ہے وہ خواہ دیہات کی آبادی ہو‘ صحرا نشینوں کی آبادی ہو اور خواہ یہ شہر والوں کی آبادی ہو۔جب بھی ان کے مفاد میں اشتراک ہوتا ہے تو پھر ان میں ایک اختلاط پیدا ہوتا ہے‘ مل جاتے ہیں۔یوں تو آبادیاں مختلف ہوتی ہیں‘ الگ الگ رہتے ہیں‘ کوئی بھی ان میں قدرِ مشترک نہیں ہوتی لیکن جرائم پیشگی کے لیے ان کے مفاد میں اشتراک جب ہوتا ہے تو اس طرح سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتے ہیں۔وہ جو کچھ کرتے ہیں‘ ان کا جو وہ کسب ہوتا ہے‘ جو کچھ وہ کمائیاں کرتے ہیں‘ ان کی بناء پر ایک دوسرے کے ساتھ وہ مل جاتے ہیں ایک دوسرے کے دوست ہو جاتے ہیں۔اور اگر اس کے دوسرے معنی لیے جائیں تو وہ ایک وسیع اصول کی حیثیت سے نظر آتا ہے‘ دنیا میں ایک جماعت ایک گروہ ایک قوم ظلم وستم اور غصب ونہب پہ اتر آتا ہے۔اس کا صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ کوئی ایسی جماعت تیار ہو‘ جو ظالم کو سزا دینے کے لیے اٹھے‘ ان کے ظلم ختم کرنے کے لیے طاقت فراہم کرے اور اس طرح سے ان کے مظالم سے انسانیت کو نجات دلا کے عدل اور انصاف کا ایک معاشرہ قائم کرے‘ ایک شکل تو اس کی یہ ہے۔

آج کی دنیا میں تو ہر کسی کو انصاف کی تلاش ہے جب کہ ایک ظالم دوسرے ظالم کو قتل کرنے میں مصرف دکھائی دیتا ہے

لیکن دوسری شکل یہ بھی ہے کہ ایک قسم کے لٹیروں کے گروہ کے اوپر اسی قسم کا دوسرا لٹیروں کا گروہ آ کے چڑھ جائے اور وہ ان کو دبا لے اور دبانے کے بعد خود اس قسم کی لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو جائے۔گویا یہ بھی انداز ہے اور آج ہمارے دور میں تو انداز ہی یہ ہے۔ظلم کی جگہ انصاف قائم کرنے والا گروہ تو آج دنیا میں کہیں نظر ہی نہیں آتا۔آج کی ساری سیاست یہ بین الاقوامی کیا‘ اور ملی کیا‘ ایسی ہی نظر آتی ہے کہ ہر ایک کو ہے تلاش۔اور اس کے لیے قرآن کہتا ہے کہ ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک گروہ جو ظلم وستم پہ اترتا ہے اس کے اوپر ایک اسی قسم کا دوسرا ظالمین کا گروہ جو اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہے‘ وہ اس پہ غالب آ جاتا ہے اور اس طرح سے اسے اس کے ہاتھوں سے سزا مل جاتی ہے۔اور پھر اس کے لیے اس قسم کا کوئی دوسرا گروہ آ جاتا ہے اُسے اس کے ہاتھوں سے سزا ملتی ہے۔سزائیں تو ان کو ملتی

رہتی ہیں ایک دوسرے کے ہاتھوں سے ملتی ہیں گروہ دونوں مجرمین کے ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایک مفہوم ہے اور یہ چیز تو جیسا میں نے عرض کیا ہے نظر آ رہی ہے دنیا کی سیاست میں کہ آج کل تو ظالمین کو اگر کسی قسم کی سزا ملتی ہے تو وہ اسی قسم کے گروہِ ظالمین یا مجرمین ہوتا ہے جو زیادہ قوت فراہم کرلیتا ہے اس کے ہاتھوں سے پہلے گروہ کو سزا مل جاتی ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد یہ جب وہی کچھ کرنے لگ جاتا ہے تو پھر کوئی اسی قسم کا اور گروہ ان کے اوپر چڑھ دوڑتا ہے۔ تو بہر حال دونوں معنی کے اعتبار سے یہ آیت جو ہے ہمارے سامنے ہے۔

قرآنِ حکیم کا انداز یہ ہے کہ وہ انسان کو ظلم کے انجام سے پہلے آگاہ کر دیتا ہے

کہا یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ یَقُصُّوۡنَ عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِیۡ وَ یُنۡذِرُوۡنَکُمۡ لِقَآءَ یَوۡمِکُمۡ هٰذَا (6:130)

تم سے اس وقت کہا جائے گا اے گروہِ جن وانس! کیا تمہارے پاس ہمارے پیغامبر نہیں آئے تھے کیا انہوں نے تمہیں نہیں بتایا تھا اس ظلم وستم اس سلب ونہب اور غصب واستحصال کا نتیجہ اور انجام کیا ہوا کرتا ہے۔ کیا تمہیں اس سے مطلع نہیں کر دیا گیا تھا تمہیں باخبر نہیں کر دیا گیا تھا؟ تم جانتے نہیں تھے کہ ظلم کا انجام تباہی ہوا کرتا ہے؟ یہ معلوم نہیں تھا تمہیں؟۔ یہ ابھی آگے آیت آتی ہے اصولی طور پر اور یہ بڑی اہم آیت ہے کہ انہیں پہلے باخبر کیا جاتا ہے' ان کو بتایا جاتا ہے کہ یہ جو تمہاری روش ہے' اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ کہا کہ کیا تم میں سے ہی تمہارے پاس پیغامبر یہ پیغام لے کر نہیں آئے تھے کہ یہ روش جو تم نے اختیار کر رکھی ہے اس کا نتیجہ کس قدر تباہی اور بربادی ہے۔ کیا وہ تمہیں اس بات سے آگاہ نہیں کرتے تھے کہ تمہارے اس انداز کے اعمال کے نتائج کس طرح سے تمہارے سامنے آ کر رہیں گے۔

ظہورِ نتائج کے وقت انسان کی حالت

قَالُوۡا شَهِدۡنَا عَلٰۤی اَنۡفُسِنَا (6:130) اس وقت یہ مجال ہی نہیں ہوگی کہ کوئی انکار کر دے۔ جب اس طرح سے کوئی Red Handed پکڑا جائے' تو اس کے بعد وہ انکار کیا کر سکتا ہے۔ اور قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے جب ان اعمال کے نتائج سامنے آتے ہیں تو پھر تو مجالِ انکار ہوتی نہیں ہے۔ قرآن نے ان مقام پہ کہا ہے کہ وہ خود اپنی ذات کے خلاف شہادت دیں گے۔ وہ جو تمثیلی انداز میں قرآن بتاتا ہے کہ ہاتھ اور پاؤں ان کے خلاف شہادت دیں گے' ان کی جلد ان کے خلاف شہادت دے گی۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس وقت (دوسرے مقام پہ ہے قرآن میں) یہ جو آج معذرت سے اور جھوٹی بہانہ سازی سے اور اس قسم کی چیزوں سے اپنے جرائم چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اس وقت اس کا موقعہ نہیں ہوگا اس کی گنجائش نہیں ہوگی کوئی اس چیز کو چھپا نہیں سکے گا (30:57)۔ وہ تو کہتا

ہے کہ جو مَا فِی الصُّدُوْرِ (100:10) ہوتا ہے وہ بھی اس وقت سامنے آ کے رہے گا۔ قانونِ مکافات کی رو سے تو پھر کوئی چیز چھپتی نہیں ہے۔ اور یہ چیزیں تو آج چھوٹے سے پیمانے پہ بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ بڑے بڑے اکابرِ مجرمین اپنے دورِ اقتدار میں کچھ وہ کرتے ہیں اس پہ پردے پڑے رہتے ہیں۔ جونہی وہ کرسی سے نیچے اترتے ہیں تو آپ دیکھئے وہ پردے پھر کس طرح سے اٹھنے شروع ہو جاتے ہیں اور ایک ایک چیز ان کی منصّہ شہود پہ آ جاتی ہے دنیا کے سامنے آ جاتی ہے پبلک کے سامنے آ جاتی ہے۔

ہر آنے والے دور میں مکافاتِ عمل کے اثرات بڑی تیزی کے ساتھ وارد ہوں گے

یہ تو ابھی چھوٹے سے پیمانے پہ ہے ابھی اس دور میں ہے جہاں ایک ظلم وستم کے دور کے بعد حق وانصاف یا اقدارِ انسانیت کا دور نہیں آتا۔ اگر وہ دور کہیں آ جائے تو پھر تو پوچھو نہیں کہ کیا کیا رازہائے سربستہ لوگوں کے سامنے منکشف ہو کر نہیں آ جاتے اور جسے قرآن نے پھر اخروی زندگی کہا ہے تو اس میں تو سوال ہی نہیں کسی چیز کے چھپے رہنے کا پوشیدہ رہنے کا۔ وہاں تو دل میں گذرنے والے خیالات بھی ایک اعمال کے نتائج کی شکل میں سامنے آ جائیں گے۔ ایک ایک شے کا قرآن کے الفاظ میں وزن ہوگا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شے کا نتیجہ انسان کے سامنے آ جائے گا۔ تو کہا کہ وہ اس وقت خود اپنی ذات کے خلاف گواہی دیں گے۔ تو بات یہ ہوئی کہ جب انہیں بتا بھی دیا گیا تھا کہ اس کا انجام یہ ہونے والا ہے پھر یہ بھی نہیں کہ وہ اس سے ناواقف تھے۔ جب وہ اپنے خلاف شہادت دیں گے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں احساس تھا کہ یہ چیز یوں ہے۔ اور کون نہیں جانتا آج کہ ظلم ایک برائی ہے برائی برائی ہوتی ہے۔ کیوں پھر یہ لوگ اس میں مبتلا ہوتے ہیں؟ کہا کہ وَ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا (6:130)

قرآنِ حکیم نے مفادِ عاجلہ کی اصطلاح حیات الدنیا کے معنی میں استعمال کرتے ہوئے اقدارِ خداوندی کی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے

یہ جو پیش پا افتادہ مفاد ہوتے ہیں مفادِ عاجلہ قریب ہی پڑے ہوئے فائدے یہ دھوکہ دیدیتے ہیں انسان کو یہ فریب دیدیتے ہیں۔ جانتا ہے وہ سب کچھ ان کے فریب میں آ جاتا ہے۔ یہ قرآنِ کریم کی اصطلاحیں ہیں یہ مفادِ عاجلہ جسے ہم نے کہا ہے جسے وہ حیات الدنیا کہتا ہے۔ اصل میں تو اس دنیا کی زندگی کے اندر یہ جتنا ساز وسامان ہے وہ انسان ہی کے تمتع کے لیے ہے۔ انسان کو کہا گیا ہے کہ ان کو مسخر کرو ان سے فائدہ اٹھاؤ۔ تو یہ چیزیں جو قرآن میں کہیں کہیں آتی ہیں کہ یہ حیاتِ دنیا ان کو تباہ کر دیتی ہے اور یہ اس کے فریب میں آ جاتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قرآن ان چیزوں سے نفرت دلاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دو چیزوں کا تقابل جب ہو ایک چیز یہ ہے کہ انسان مستقل اقدارِ انسانیت جسے قوانینِ خداوندی کہتے ہیں اس کو سامنے رکھے اور دوسری چیز یہ ہے کہ ان سے اعراض برتے اور جو

مفاد جلدی سے حاصل ہو جانے والا ہے' اسی کو اپنی نگاہ کے سامنے رکھے۔ مثلاً یہ چیز کہ انسان کو روپے کی ضرورت ہے' سامانِ زیست کی ضرورت ہے' قرآن اس سے نفرت نہیں دلاتا وہ کہتا ہے کہ ایک طرف یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ کوئی شخص آتا ہے رشوت میں کسی شخص کو دس ہزار روپے آفر کرتا ہے اور اس سے ایک غلط کام کرانا چاہتا ہے۔ اب یہاں آ کے Tie پڑ گئی ایک انسانیت کی قدر میں یا قرآن کے قانون میں اور دوسری طرف اسے وہ کہتا ہے مفادِ عاجلہ یونہی جلدی سے ہاتھ آ جانے والا فائدہ۔ ہزار روپیہ وہ کما سکتا ہے اس کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے اس کے لیے وقت درکار ہے۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے کہ وہ فوراً ہاتھ میں آ جاتا ہے یہ ہے جسے وہ کہتا ہے مفادِ عاجلہ فوراً ہاتھ میں آ جانے والا۔ کہتا ہے جب ایسے مواقع آتے ہیں تو یہ بڑا ٹیسٹ ہوتا ہے انسان کا کہ وہ اس قسم کے مفادِ عاجلہ کو ترجیح دیتا ہے یا وہ جو اصول اور قدرِ انسانیت ہے' اس کو ترجیح دیتا ہے۔ اگر وہ مفادِ عاجلہ کو قربان کر دیتا ہے اس قدر کے اوپر تو یہ زندگی انسانیت کی یعنی مومن کی زندگی ہے۔ اور اگر وہ اس اصول سے اعراض برتتا ہے اور مفادِ عاجلہ کو ترجیح دیتا ہے' تو یہ کفر کی زندگی ہے' فسق و فجور کی زندگی ہے' یہ تباہیوں کی زندگی ہے۔ یہ ہیں معنی اس چیز کے کہ ان کو دنیاوی زندگی کی متاع یا اس قسم کی چیزیں فریب دے جاتی ہیں۔ یہ جس قدر Overnight Millionaier بننے والے لوگ ہوتے ہیں وہ اس فریب میں آ جاتے ہیں مفادِ عاجلہ حاصل کرنے کے لیے۔ تو کہا کہ ان لوگوں کو اس کا علم تو تھا کہ ان چیزوں کا نتیجہ ایسا ہوتا ہے تو پھر کیوں ایسا انہوں نے کیا؟ جواب دیا کہ یہ مفادِ عاجلہ جو قریب ہی پڑے ہوئے مفاد تھے ان کے فریب میں آ گئے اور انہوں نے یہ کچھ کیا۔ ورنہ آج جبکہ وہ کیفیت نہیں رہی تو یہ خود اپنے کیے پر نادم ہیں اپنے خلاف آپ شہادت دے رہے ہیں کہ واقعی یہ بڑی زیادتی تھی جو ہم لوگوں نے کی۔ وَ شَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ (6:130) یہ اس وقت ان اصولوں سے' ان اقدار سے سرکشی برتتے تھے۔ آج خود اپنے خلاف یہ شہادت دے رہے ہیں۔ ان کے جرائم ایسے نہیں ہیں جن کی تحقیقات کے لیے کسی کمیشن بٹھانے کی ضرورت پڑے۔ ان کی تو اپنی پوری زندگی سر سے پاؤں تک ایک شہادت ہے ان کے خلاف کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ خود اپنے خلاف شہادت دے رہے ہیں۔

زندگی کے حسن کو قائم رکھنے کے لیے اگر قانون بنانا ضروری ہے تو اس سے آگاہ کرنا بھی ضروری ہے

یہ ہے وہ اصول جو قرآن بتاتا ہے۔ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ (6:131)

ہم کبھی ایسا نہیں کرتے کہ کسی بستی کسی قوم کو اس کا علم نہ ہو کہ غلط چیز کیا ہے اور صحیح چیز کیا ہے اور ہم انہیں تباہ کر دیں۔ بڑی عجیب اصول کی چیز ہے۔ قانون سے آگاہ کرنا یہ نہایت ضروری چیز ہے حکومتوں کے لیۓ یہ پہلے بتانا کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے۔ اگر قانون یہ بنتا ہے کہ Keep to the left بائیں ہاتھ کی طرف چلو' دائیں کی طرف نہ چلو' قانون بنانا ہی کافی نہیں ہے اس قانون سے آگاہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اور جب اس سے آگاہ کر دیا جائے تو اس کے بعد پھر یہ جرم ہوگا اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اگر قانون

سے آ گاہ ہی نہ کیا جائے تو اس کی خلاف ورزی جرم نہیں ہو سکتی۔ اور پھر قانون بھی بنایا جائے تو اس کو Retrospective Effect نہیں دینا چاہیے یعنی پہلے جو کچھ ہو گذرا ہے اس قانون کا اطلاق اس پہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ چیز آج نہیں قرآنِ کریم نے چودہ سو سال پہلے یہ اصول مقرر کیے تھے۔ جب بھی اس نے کوئی حکم دیا ہے تو اس کے بعد یہ کہا ہے اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (4: 22) جو پہلے ہو گیا وہ ہو گیا اس پہ نہیں یہ Apply کرے گا قانون۔ بڑی بنیادی چیز ہے قانون کی۔ اور اسی طرح سے اس نے یہ کہا کہ کبھی ایسا نہیں ہم کرتے کہ کسی گروہ کو کسی جماعت کو کسی قوم کو بتایا نہ جائے کہ غلط کیا ہے اور اس کو پکڑ لیا جائے اس غلطی کی بناء پر۔ اور یہ جو سلسلہ ہے انبیائے کرامؑ کا قرآنِ کریم نے جو سلسلۂ رشد و ہدایت شروع کیا اس کے بھی معنی یہ تھے کہ پہلے آ کے ان کو بتا دیا جائے کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے اور پھر اس کے بعد اگر وہ غلط روش کو نہیں چھوڑتے تو پھر ان کی گرفت ہو۔

UNO کے چارٹر میں دیے گئے حقوقِ انسانیت کا 75% حصہ تقریباً قرآن حکیم کے اصولوں کا ترجمان ہے

آج کی دنیا میں تو صورت یہ ہے کہ جتنی آپ کے ہاں غلط اور صحیح چیزیں ہیں' اب کہیں بھی ایسا نہیں کہ کسی قوم کو ان کا علم نہ ہو۔ خود قرآنِ کریم کی جتنی اقدار ہیں جتنے اصول ہیں قریب قریب بیشتر ان کا حصہ وہ Universal Ethics کی حیثیت اختیار کر چکا ہے' عالمگیر ضابطۂ اخلاق بن چکا ہے۔ آپ UNO کے چارٹر کو اٹھا کے دیکھئے ان میں جو حقوقِ انسانیت دیے ہوئے ہیں ان میں کم و بیش 75% ایسے ہیں جو خود قرآن میں موجود ہیں۔ کچھ غلط ہیں ان میں اور قرآن میں جو ان کا اضافہ یا ان کی جگہ ہیں وہ ان سے کہیں آگے جاتے ہیں۔ لیکن کم از کم اتنے تو ایسے ہیں کہ جنہیں تمام اقوامِ عالم نے اپنے ہاں متفقہ منشور کی رو سے تسلیم کیا ہوا ہے۔ کونسی قوم ہے آج دنیا میں جو یہ نہیں جانتی کہ کمزور اور ضعیف قوموں کے اوپر قوت سے غلبہ حاصل کرنا ظلم ہے' یہ استحصال ہے۔ کونسی قوم آج یہ نہیں جانتی کہ مکاری اور فریب جھوٹ چوری ڈاکہ زنی انفرادی ہو یا قومی حیثیت سے ہو' یہ جرم ہے۔ کونسی قوم ہے جن کے تعزیرات کا جو مجموعہ ہوتا ہے کوڈ ہوتا ہے قانون کی کتاب ہوتی ہے' ان میں ان چیزوں کو جرم نہیں قرار دیا گیا۔

ختم نبوت کا اعلان دراصل انسانیت کی بلوغت کا اعلان تھا

آج سلسلۂ رسل و رسائل کی اس قدر فراوانی سے کیفیت یہ ہے کہ ساری دنیا ایک برادری سی بن گئی ہوئی ہے۔ یہاں کوئی چیز اب ایسی ہے نہیں جس کے متعلق کوئی قوم یہ کہے کہ ہمیں اس کا علم نہیں تھا کہ یہ جرم ہے یہ ظلم ہے' یہ ناانصافی ہے' یہ خلافِ انسانیت ہے کوئی قوم بھی اب نہیں کہہ سکتی۔ اور یہ وجہ تھی کہ جو نبی اکرم ﷺ کی ذات پر سلسلۂ نبوت کو ختم کر دیا گیا۔ پہلے یہ سلسلۂ رسل و رسائل اقوام میں اس طرح عام نہیں تھا۔ عام کیا تھا ہی نہیں اس زمانے میں۔ ساری بستیاں ساری قومیں مقامی ہوتی تھیں مقامی طور پر ان کے اندر ایک پیغامبر

آ تا تھا اس کے پیغام کا دائرہ بھی اسی قوم تک اسی بستی تک اسی علاقے تک محدود ہوا کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ سلسلہ بڑھنا شروع ہوا وہ جیسا کہ میں لکھا کرتا ہوں کہ انسانیت پھر بلوغت کی سن میں جا پہنچی۔ اب اس کے بعد دور ایسا شروع ہونا تھا جس میں علمی ترقیوں سے آہستہ آہستہ یہ جتنے بُعد اور فاصلے تھے درمیانی' یہ کم ہونے تھے پھر ختم ہو جانے تھے۔ پوری انسانیت کو ایک برادری بننا تھا۔ اسی لیے ایک ایسا نبی پھر مبعوث کیا گیا کہ جسے کہا کہ تو پوری نوعِ انسانی کے لیے نبی ﷺ ہے پوری انسانیت کی طرف پیغامبر ہے اور اس کے پیغام کو محفوظ کر دیا۔ اور اس کے بعد آپ نے یہ دیکھا کہ آہستہ آہستہ وہ پیغام ساری دنیا کے اندر کس طرح سے پھیل گیا۔ اس لیے دنیا کو اب ضرورت ہی نہیں ہے کسی نبی کی' کسی مامور من اللہ کسی آسمان سے آنے والے کی۔ وہ جو کچھ Ethical Code تھا جو اقدارِ انسانیت تھے' وہ تو اس قدر عام عالمگیر ہو گئے ہیں' گھر گھر میں رکھا ہوا ہے' جو منکر اور کافر ہیں ان کے گھروں میں بھی قرآن موجود ہے ان کی زبانوں میں قرآن موجود ہے۔ اسی لیے اس کے بعد اب کسی آنے والے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تصور ہی غلط ہے' ختمِ نبوت ﷺ کے منافی ہے نام آپ کچھ بھی رکھ لیں اس کا۔ اب صرف یہ ضابطۂ اقدارِ انسانیت ہے جسے قرآنِ کریم آپ کہتے ہیں اور وہ عام ہو چکا ہے عالمِ انسانیت میں۔ اس امت کا فریضہ یہ تھا اس کے بعد کہ اس کو یہ عام کرتے چلے جاتے۔ نبوت تو ختم ہوئی۔ رسول تو آنے بند ہو گئے۔ جسے رسالت کہتے ہیں پیغام کا پہنچانا دوسری جگہ یہ' اس امت کا فریضہ تھا۔ بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن نے جو کہا ہے کہ کوئی بستی کوئی قوم ہلاک نہیں ہوتی تاوقتیکہ اس کو پہلے بتا نہ دیا جائے کہ جرم کیا ہے جن کے وہ مرتکب ہو رہے ہیں۔ تو آج اس دور میں تو کوئی قوم دنیا کی کہہ نہیں سکتی کہ ہمیں علم نہیں تھا کہ جرم کیا ہے اور ظلم کسے کہتے ہیں صاحب۔ اب تو ہر ایک کے علم میں آ چکی ہیں یہ باتیں' ہم سے زیادہ بہتر طور پہ وہ قومیں جانتی ہیں ان چیزوں کو۔ ذٰلِکَ اَنۡ لَّمۡ یَکُنۡ رَّبُّکَ مُہۡلِکَ الۡقُرٰی بِظُلۡمٍ وَّ اَہۡلُہَا غٰفِلُوۡنَ (6:131) ہم یہ نہیں کرتے۔ اور اسی بناء پر ادھر تو یہ ہے کہ یہ جو جرائم ہیں ان کی سزائیں اس طرح سے اسی قانون کے مطابق ملتی ہیں۔ اسی قانون کے مطابق جو اچھی باتیں کی جاتی ہیں قرآن کہتا ہے وَ لِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوۡا (6:132)

درجات کا تعین حسب اور نسب کی بجائے اعمال کی بنیاد پر ہوگا نہ کہ اقرباء نوازی پر

اب جو مدارج بھی قائم ہوتے ہیں درجات بھی قائم ہونگے یا ہونے چاہئیں' وہ اعمال کے بدلے میں ہونے چاہئیں۔ حسب اور نسب کے وہ تمام امتیازات جو اس سے پیشتر عہدِ جاہلیت میں تھے' ختم ہو گئے۔ پہلے یہ تھا کہ کسی کا کام یا جوہر یا میرٹ وہ معیار نہیں بنا کرتے تھے بلکہ دیکھا یہ جاتا تھا کہ کس کا بیٹا ہے۔ اور اب بھی تباہ ہونے والی قوموں میں یہی معیار ہے کہ کس کا بیٹا ہے اور یہی تو ہیں جو تباہی کا موجب بنتے ہیں۔ اقرباء نوازی جسے اب آپ کہتے ہیں Favouritism۔ یہ ساری چیزیں وہ ہیں جو اس معیار کے خلاف ہیں۔ قرآن نے معیار دیا ہے چودہ سو سال پہلے وَ لِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوۡا (6:132) یاد رکھو مدارج متعین ہونگے ہر ایک کے

جوہرِ ذاتی اوراس کی سیرت اور کردار کے مطابق نہ کہ اس کی نسبتوں کے مطابق جواضافی ہوتی ہیں کس خاندان سے ہے یہ' کس قوم سے ہے۔

ذاتوں اور گوتوں کا پہلواب ایک نیارنگ اختیار کررہا ہے

اوراب تو وہ پرانی ذاتیں گوتیں جوتھیں ان کی جگہ ایک نئی قسم کی ذاتوں گوتوں نے لے لی ہے۔یہ بڑی بڑی Families دولت کی بناء پہ جوبنتی ہیں یاایک برادری جواعلیٰ درجے کی ملازمتوں کی بناء پہ قائم ہوتی ہے CSP ایک الگ برادری ہوتی ہے PCS ایک الگ برادری ہوتی ہے۔پھر یہ جو بڑے بڑے متمول خاندان ہیں' ان کی برادری الگ ہوتی ہے۔دائرے مختلف ہوگئے ہیں' اصول وہی رہے ہیں۔لیکن انسانیت کے متعلق اصول یہی تھا کہ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (6:132) ہرایک کا درجہ سوسائٹی کے اندر' اس کے جوہرِ ذاتی اورسیرت وکردار کی بناء پر متعین ہونا چاہیے نہ کہ اضافی نسبتوں کی روسے' کہا یہ ہے ہمارا اصول۔وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ (6:132) بہرحال وہ کہتا ہے کہ تم اپنے ہاں کوئی بھی معیار مقرر کرلو' جو جی چاہے مقرر کرلو' تمہیں آزادی حاصل ہے۔لیکن خدا تو یہ جانتا ہے کہ کون کیا کرتا ہے اس کے ہاں یہ جو مدارج متعین ہوتے ہیں' وہ اعمال اور جوہرِ ذاتی کی بناء پر ہی ہوتے ہیں۔ جتنا جی چاہے تم بڑا بن جاؤ' مکافاتِ عمل کی روسے تو پھر وہ اکابر' اسا وراِیک دن بنتے ہیں۔خدا تو جانتا ہے تم کیا کرتے ہو تم دنیا کو فریب دے سکتے ہو۔اس کو تو فریب نہیں دے سکتے۔

دوسروں کا فیصلہ کرنے والے کے لیے چند ایک بنیادی خصوصیات کا ہونا لازم ہے

اس کے بعد وہ عظیم آیت اور اصول آرہا ہے کہ جو آج واقعی ہمارے لیے خون کے آنسو رلا دینے والا ہے۔اصول یہ ہے کہ تم میں سے جس کا جی چاہے بڑا بن جائے' افراد میں ایسا کوئی کرے' اقوام میں ایسا کوئی کرے۔ظلم اور زیادتی غصب اور نہب اور سلب کی بناء پر جتنی جی چاہے دولت قوت اقتدار اکٹھا کرلے۔کوئی قوم اس بناء پر جتنا جی چاہے اپنے آپ کو سمجھ لے کہ میں بلندیوں پہ پہنچ گئی ہوں۔کہا کہ خدا کے قانونِ مکافات کی روسے بھی ایک معیار ہے ان چیزوں کا۔وہ معیار کیا ہے؟ وَ رَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ (6:133) عجیب الفاظ آئے ہیں۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ خدا کسی کا محتاج نہیں ہے۔عدل اور انصاف کے لیے قانون کے مطابق فیصلے کرنے کے لیے۔ایسے فیصلے کہ جس میں کسی کی رورعایت ملحوظ نہ ہو۔اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ فیصلے کرنے والا ایسی پوزیشن میں ہو کہ کسی کا محتاج اور لاگو نہ ہو۔جونہی وہ کسی کا محتاج ہوا' وہ پھر بے لاگ فیصلہ نہیں کرسکتا۔کہا کہ ہمارے ہاں کے فیصلے قانون کے مطابق ہوتے ہیں اور وہ اس لیے ہوتے ہیں کہ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ (6:133) ہم محتاج نہیں ہیں کسی کے' نہ کسی پارٹی کے' نہ کسی دولت مند کے' نہ کسی صنعتکار کے' نہ کسی بہت بڑی مل والے

کے، نہ کسی حکومت والے کے، نہ کسی قوم کے، ہم محتاج ہی نہیں ہیں کسی کے۔ اس لیے ہمارے ہاں سے جو فیصلہ نافذ ہوگا وہ بلا رو رعایت کے ہوگا، خالص قانون پہ مبنی ہوگا۔ اگلا لفظ ہے ذُو الرَّحْمَةِ (6:133)

خدا تعالیٰ کی طرف سے ظالم کی کھیتی کٹ جانے پر الحمد اللہ کے الفاظ کا استعمال اور خدا تعالیٰ کے عدل و انصاف کے خدوخال

ہمارے جو فیصلے ہونگے ان کی بنیاد یہ ہوگی کہ ہمارے سامنے پوری نوعِ انسانی کی پرورش، نوعِ انسانی کا مفادِ کلی ہوگا۔ ہم ذُو الرَّحْمَةِ ہیں یہ نہیں کہ کسی پر ظلم کرنے کے لیے ہم اپنی قوت کا استعمال کرلیں۔ ہم تو بڑی قوتوں کے مالک ہیں۔ لیکن ہماری قوت کا استعمال ہمیشہ نوعِ انسانی کے لیے رحمت بن کر آتا ہے۔ وہ رحمت کیا ہے؟ دوسرے مقام پہ قرآنِ کریم نے ظالم اور مستبد قوموں کی تباہی کے بعد کہا فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (6: 45) کہ خدا نے ظالم قوم کی جڑ کاٹ دی۔ اور اس کے بعد ہے وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (6: 45) آپ غور کیجیے کونسا مقام آیا ہے یہ الحمد اللہ کا، ظالم کی جڑ کٹ جانا، مظلوموں کے لے باعثِ رحمت ہے۔ اور یہ جو الفاظ آئے ہیں ایسے ہیں کہ ظالم کی جڑ کٹنے کے بعد جیسے مظلوم دنیا بلا ساختہ پکار اٹھے کہ الحمد للہ۔ اقبالؒ نے جو سمٹا کے اس کو چار لفظوں میں کہا ہے کہ

مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگی

ظالم کی موت دنیا کے لیے زندگی کا موجب بنتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے ظالم کی موت پر یا اس کی تباہی پر مظلوموں سے پوچھئے کہ ان کے لیے یہ کیا مقامِ الحمد ہوتا ہے۔ اور یہ الحمدیت یہاں کیوں آئی ہے کہ وہ رب العالمین ہے وہ کسی ایک خاص گروہ کا پروردگار نہیں ہے، وہ پوری عالمِ انسانیت کا پروردگار ہے۔ اور اس کی ربوبیت اور پروردگاری کا تقاضا یہ تھا کہ یہ جو اس کے راستے میں ظالم اور غاصب بن کر کھڑے ہوگئے تھے، ان کو ہٹا دیا جائے۔ ان کو راستے سے ہٹا دیا جائے تو یہ جتنی نوعِ انسانی ہے، اس کی پرورش ہو جاتی ہے۔ وہ پانی جو ہر ایک کے کھیتوں میں جانا تھا، راستے میں گاؤں کا بڑا نمبردار چوہدری اس میں بند لگالے اور اپنے ہی کھیت کی طرف لے جائے تو وہ بیچارے غریب ضعیف ناتواں زمیندار کلیجہ مسوس کے رہ جاتے ہیں، کچھ کر نہیں سکتے۔ اور اگر کوئی اس قسم کا حاکم آ جائے کہ وہ آ کے ان کے بند کو توڑ کے پانی ان کے کھیتوں تک پہنچا دے تو ان کی زبان سے بے ساختہ الحمد للہ نکلے گا۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ ہم غنی ہیں جو فیصلہ کرتے ہیں تو اس میں کوئی رو رعایت نہیں اور جو فیصلہ کرتے ہیں تو یہ نہیں کہ ایک ظلم کی جگہ اس سے بڑا ظلم ہم عائد کرتے ہیں۔ ظالم کی جڑ اس لیے کاٹتے ہیں کہ اس میں مظلوم انسانیت کی پرورش

اور پروردگاریت کا راز پنہاں ہوتا ہے۔ہم ذُو الرَّحۡمَةِ واقع ہوئے ہیں۔اب یہ غور فرمائیے کہ یہ اس کا غنی ہونا اور ذُو الرَّحۡمَةِ ہونا اس کا تقاضا کیا ہے اور وہ عملی دنیا میں آتا کس طرح سے ہے؟ کہتا ہے وہ یوں آتا ہے وہ پکارتا ہے ظالم اور غاصب قوم کو' ان گروہوں کو جو انسانیت کا خون نچوڑ کے پی جانے والے ہیں وہ کہتا ہے کہ اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡهِبۡکُمۡ وَ یَسۡتَخۡلِفۡ مِنۡۢ بَعۡدِکُمۡ مَّا یَشَآءُ کَمَاۤ اَنۡشَاَکُمۡ مِّنۡ ذُرِّیَّةِ قَوۡمٍ اٰخَرِیۡنَ (6:133)

ایک قوم کی جگہ کسی دوسری قوم کو لانے کی وجہ جواز

وہ کہتا ہے سمجھ لو اس بات کو' گوشِ ہوش سے سن لو کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔یہ نہیں کہ تم میں سے کسی ایک فرد کو ختم کر دیں' کسی ایک پارٹی کو ختم کر دیں۔سن رکھو کہ ہم میں یہ قوت' ہمارے قانونِ مکافات میں یہ قوت ہے کہ پوری کی پوری قوم کو تباہ کر کے اس کی جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئیں۔اسے قانونِ استبدال و استخلافِ قومی کہا جاتا ہے ایک قوم کی جگہ دوسری قوم لے جائے۔ایک مملکت ایک قوم کے ہاتھوں سے نکل جائے اور دوسری قوم کے ہاتھ میں چلی جائے۔کہا کہ اس ظلم کے پیمانے کو اتنا نہ چھلکنے دو۔یاد رکھو! کوئی چہیتی قوم نہیں ہمارے نزدیک اور ہم کسی کے لاگو بھی نہیں کہ دیتے ہیں کسی سے کہ لحاظ کر جائیں اس کا۔اور پھر دوسری چیز یہ ہے کہ ہمارے سامنے تو انسانیت کا مفادِ کلی ہے' کسی گروہ کا نہیں ہے۔ہمارا قانون یہ ہے اس لیے سن لو گوشِ ہوش سے کہ ہم کیا کرتے ہیں' ہمارا قانون کیا کرتا ہے۔کیا یہ کرتا ہے کہ ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کو لے آیا کرتا ہے۔قرآن کیا کہہ گیا ہے۔اور کہا کہ یہ ہماری دھمکی خالی خولی دھمکی نہیں ہے کہ تم کہہ دو کہ یونہی ایک ڈانٹ پلا دی ہے۔اِنَّ مَا تُوۡعَدُوۡنَ لَاٰتٍ (6:134) یاد رکھو! جو کچھ ہم کہتے ہیں آ کے رہے گا تمہارے سامنے۔ وَّمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ (6:134) تم ہمیں بے بس نہیں کر سکتے۔تم کتنی بڑی قوتوں کے مالک کیوں نہ ہو' یاد رکھو یہی نہیں ہے کہ ہم تم میں سے کچھ افراد کو ہٹا دیں گے اس کی جگہ دوسرے افراد لے آئیں گے' بالکل نہیں۔پوری کی پوری قوم کو وہاں سے بدل دیں گے اور ان کی جگہ ایک دوسری قوم لے لے گی۔یہ بھی تو ہو سکتا ہے جیسے پہلے کہا تھا کہ ایک ظالم قوم کی جگہ دوسری ظالم قوم ہی کیوں نہ آ جائے' ایسا بھی ہے۔لیکن دوسری جگہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ ایسی بھی صورت ہے کہ بہتر قوم آئے اس سے۔

آخر کار تباہ حال قوم کا ذکر افسانوی رنگ اختیار کر جاتا ہے اور سپین میں مسلمانوں کی حکومت کا انجام تو ہمارے سامنے ہے

لیکن یاد رکھو! ظلم و نہب کرنے والی قوم کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم ایک قوم کی جگہ دوسری قوم لے آیا کرتے ہیں۔تاریخِ انسانیت پہ نگاہ ڈالئے عزیزانِ من! کتنی بڑی بڑی قومیں تھیں جو قوت کے نشے میں بدمست تھیں۔اور اس کے بعد ان کی جگہ جو دوسری قوم آئی تو پہلی

قوم کی' قرآن کے الفاظ میں' پھر احادیث باقی رہ گئیں کہانیاں صرف باقی رہ گئیں اس قوم کا کہیں وجود باقی نہیں رہا۔(19 :34) سپین میں ہم نے سینکڑوں سالوں تک ایسی بادشاہت کی کہ ان کے آج نقوش جو باقی وہاں رہ گئے ہیں' انہیں دیکھنے کے لیے دنیا کے Tourist جاتے ہیں۔نادر قسم کی چیزیں ہیں۔لیکن اس پورے سپین سے مسلمانوں کا صفایا ہوگیا۔قرآنِ کریم کے دوایک مقام ایسے ہیں اس سے بات واضح ہوگی۔عجیب انداز میں قرآن نے محاکاتی Graphically نقشہ کھینچا ہے۔بڑی توجہ سے سننے کی چیز ہے کہ قومیں کس طرح تباہ ہوتی ہیں۔ وَ کَمۡ قَصَمۡنَا مِنۡ قَرۡیَةٍ کَانَتۡ ظَالِمَةً (21:11)

کتنی ہی ایسی قومیں ایسی بستیاں تھیں کہ وہ ظلم وستم پہ اتر آئی تھیں اور ہمارے قانونِ مکافات نے ان کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ظَالِمَةً : آپ قرآنِ کریم میں دیکھئے قوموں کی تباہی کا سب سے بنیادی جرم قرآن ظلم کو قرار دیتا ہے۔ظلم کے معنی کسی سے لوٹنا کھسوٹنا ہی نہیں ہے یہ بھی تو ظلم ہے۔بے انصافی یہی نہیں ہے کہ عدالتوں میں آپ کے ساتھ انصاف نہ ہو۔جیسا کہ آپ کو معلوم ہے عربی زبان میں یہ ظلم کا لفظ بڑا ہی جامع المعانی ہے۔بنیادی معنی اس کے ایسے اصولی ہیں کہ ان کو سامنے رکھا جائے تو ظلم کی ہر شق واضح طور پہ سامنے آ جاتی ہے۔ظلم کے معنی ہوتے ہیں جس شے کو جس مقام پہ ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو۔مجرم کو جیل خانے میں ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو' وہ مسندِ اقتدار پہ ہو اور جس شریف آدمی کو معزز ہونا ہو' وہ ذلیل ہو۔آپ دیکھئے گا کیسی جامع تعریف ہے ان کے ہاں' عجیب قوم تھی یہ۔ظلم کے معنی ہیں جس شے کو جہاں ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو۔اور تباہی قوم اس وقت ہوتی ہے جب جس کو جہاں ہونا ہو' وہ وہاں نہ ہو۔کہا جب قوموں میں ظلم اس انتہا تک پہنچ جاتا ہے تو کتنی بستیاں ایسی تھیں کہ جن کو ہم نے تباہ کر دیا۔وَّ اَنۡشَاۡنَا بَعۡدَهَا قَوۡمًا اٰخَرِیۡنَ (21:11) اور ان کے بعد ایک دوسری قوم نے ان کی جگہ لے لی دوسری قوم ان کی جگہ آ گئی۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک سریع الحساب اور مہلت کے وقفے کا باہمی تعلق

سنئے انداز کیا ہے۔فَلَمَّاۤ اَحَسُّوۡا بَاۡسَنَاۤ اِذَا هُمۡ مِّنۡهَا یَرۡکُضُوۡنَ (21:12) عجیب لفظ ہے یہ اَحَسُّوۡا بَاۡسَنَاۤ (21:12)۔ خدا کے متعلق کہا ہے کہ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ (14:51) ہے بڑی جلدی حساب لیتے ہیں ہم۔اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک ظالم فرد ہو قوم ہو گروہ ہو پارٹی ہو ظلم کیے چلی جاتی ہے' پنپتی چلی جاتی ہے تو سطح بیں نگاہیں یہ کہتی ہیں کہ کہاں ہے وہ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ (14:51)' ان کی تو پکڑ ہی نہیں ہوتی۔قرآن نے عجیب اصول بتایا ہے وہ کہتا ہے کہ ہر عمل کا نتیجہ ہمارے قانون کے مطابق اسی وقت مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔لیکن یہ شروع میں اس دور میں سے گذرتا ہے جو محسوس شکل میں تمہارے سامنے نہیں آتا وہ مرتب تو ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن ابھی وہ اس فارم میں نہیں تمہارے سامنے آتا' محسوس شکل میں نہیں آتا' غیر محسوس شکل میں ہوتا ہے۔دانہ جب زمین میں آپ ڈال دیتے ہیں تو آپ کو کچھ معلوم نہیں اس وقت ہوتا کہ اس میں واقعی کچھ تغیر آ رہا ہے اس میں کوئی ایسی تبدیلی آ رہی ہے جس میں اس

دانے نے تنومند درخت بن جانا ہے وہ آپ کی نگاہوں کے سامنے نہیں ہوتا۔ لیکن اس میں تو اسی آن شروع ہو جاتی ہے وہ تبدیلی جب آپ اس دانے کو زمین میں ڈالتے ہیں، پانی دیدیتے ہیں اس میں حرارت پہنچتی ہے، تبدیلی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ محسوس شکل میں ہمارے سامنے اس دن آتا ہے جب کونپل پھوٹتی ہے۔ وہ جو ڈاکٹر کے پاس جاکے آپ کہا کرتے ہیں کہ رات اچھا بھلا سویا بالکل نو برنو، کوئی تکلیف نہیں کچھ نہیں اور صبح کو دیکھا ہے تو درد گردہ کے مارے ایک سانس نہیں لیا جاتا، تڑپ رہا ہے مریض، بری حالت ہو رہی ہے۔ اور ڈاکٹر جب ایکسرے سے دیکھتا ہے تو اتنا بڑا پتھر ہوتا ہے گردے میں۔ وہ کہتا ہے دو سال پہلے سے یہ شروع ہو گیا تھا بننا۔ اس دو سال میں اسے محسوس نہیں ہوا، یہ غیر محسوس شکل کے اندر وہ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ (14:51) جو تھا اس کو مرتب کر رہا تھا اسے اس دن پتہ چلا جب یہ محسوس شکل میں سامنے آیا۔

کوئی قوم ہو یا کوئی فرد اس کے ہر عمل کا نتیجہ غیر محسوس طور پر اس وقت مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے

اسی طرح سے افراد کے جرائم اور پھر قوموں کے جرائم کی تو یہ کیفیت ہے، بڑا لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ لیکن ان کے جرائم کے تباہ کن نتائج مرتب ہونا تو شروع ہو جاتے ہیں اسی دن سے جب ارتکاب جرائم کا ہوتا ہے۔ محسوس شکل میں اس قوم کے سامنے نہیں آتے۔ اور یہی چیز ہے جس کی وجہ سے وہ دھوکے میں رہتی ہے کہ ہمیں کون پکڑنے والا ہے۔ کہا کہ یہ بستیاں ہلاک ہوئیں، یہ قوم ہلاک ہوئی (سنئے عزیزانِ من! قرآن کے الفاظ) تو جو کچھ وہ کر رہے تھے ظلم اور زیادتیاں ان کے نتائج تو مرتب ہو رہے تھے لیکن وہ تھے غیر محسوس شکل میں۔ فَلَمَّآ اَحَسُّوۡا بَاۡسَنَآ (21:12) جب وہ نتائج محسوس شکل میں ان کے سامنے آئے اِذَا هُمۡ مِّنۡهَا يَرۡكُضُوۡنَ (21:12) تو وہ بھاگنے لگے پھر ان سے۔ دیکھا آپ نے کیا محاکاتی نقشہ ہے۔ ابھی آگے چلئے۔ جب وہ محسوس شکل میں سامنے ان کے آئے تو وہ پھر بھاگنے لگے اس تباہی سے۔

ظہورِ نتائج اور مہلت کا وقفہ ختم ہو چکنے کے بعد کیا پوچھا جائے گا اور کیا کچھ کہا جائے گا

کسی نے کہا کہ چھوڑ جاؤں ملک ہی، پاکستان چھوڑ جاؤں، پتہ نہیں کہ پاسپورٹ ضبط کر لیا، کسی نے کہا کہ کسی اور شکل سے بچ کے بھاگ جاؤں۔ مِّنۡهَا يَرۡكُضُوۡنَ (21:12) اس تباہی سے بھاگنے لگے۔ قرآن کے اعجاز پہ سر دھنئے انداز کیا ہے۔ وہ بھاگنے لگے تو پیچھے سے ہمارے قانونِ مکافات نے آواز دی لَا تَرۡكُضُوۡا (21:13) کہ تم کہیں نہیں بھاگ سکتے اب، مت بھاگو فضول ہے یہ تمہاری Attempt جو ہے۔ لَا تَرۡكُضُوۡا نہیں بھاگ سکتے، مت بھاگو۔ یعنی جیسے کسی کو کہا جائے کہ ''کیوں اے فضول حرکتاں کرنا پیا ایں فائدہ کی اے ایہدا، تو کتھے نٹھ سکنا ہیگاں ہن؟''۔ لَا تَرۡكُضُوۡا (21:13) مت بھاگو کچھ فائدہ نہیں ہے۔ یعنی یہ اس انداز میں نہیں کہا کہ بھاگنے کا فائدہ نہیں ہے، کہا یہ ہے کہ مت بھاگو کچھ فائدہ نہیں اس کا۔ کیا کرو؟ وَارۡجِعُوۡۤا اِلٰى مَاۤ اُتۡرِفۡتُمۡ فِيۡهِ (21:13) آؤ

واپس وہیں۔ کہاں واپس آؤ؟ وہاں واپس آؤ' ان عیش سامانوں کے سرہانے کھڑے ہو جاؤ جنہیں تم نے غریبوں کے خون کی رنگینیوں سے جمع کیا تھا۔ اِرْجِعُوْٓا (21:13) لوٹو۔ کہاں واپس لایا ہے ان کو!! اس مال ودولت کے ڈھیر کے اوپر آؤ۔ وَ مَسٰكِنِكُمْ (21:13) ان محلات کی طرف آؤ' بڑے بڑے ماربل کے محلات تھے عقیق وجواہر اور زمرد لگا یا ہوا تھا ان کے اندر۔ چلو واپس۔ مَآ اُتْرِفْتُمْ (21:13) وہ عیش سامانیوں کے ڈھیر جو تم نے جمع کر رکھے تھے' یہ محلات جن کی رنگینیاں اس انداز کی تمہارے سامنے تھیں' چلو واپس۔ کاہے کے لیے چلو؟ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ (21:13) تا کہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کہاں سے لی تھی دولت۔ حذرائے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔ نہیں بھاگ سکتے چلو واپس چلو' چلو اپنی رنگین سامانیوں کی طرف' چلو اپنے ایوان اور ان محلات کی طرف لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ (21:13) تم کہتے تھے کہ ہمیں کون پوچھنے والا ہے' تا کہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کہاں سے جمع کیا تھا' کہاں سے یہ لیا تھا۔ کہتا ہے جب اس حالت میں وہ پہنچ جاتے ہیں کہ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (21:14) تو وہاں پھر تھر تھر کانپتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہاں ہم نے بڑا ظلم کیا تھا ہم نے بڑی زیادتی کی تھی۔

جب تباہی محسوس شکل میں سامنے آجائے تو اس وقت ندامت کچھ کام نہیں آتی

یہ وقت آ گیا ہے کہ جب وہ ندامت کا معافی کا زمانہ گذر چکا ہے۔ تباہی محسوس شکل میں سامنے آتی ہے تو پھر توبہ کے دروازے بند ہو چکتے ہیں۔ کہا کہ وہ قوم وہ گروہ وہ یہ کہتے چلے گئے فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ (21:15) وہ کہتے چلے گئے کہ ہاں ہم نے ظلم کیا۔ لیکن یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ ان کو اب باز آفرینی کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ وہ کہتے چلے جائیں حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (21:15) تا آنکہ وہ قوم ایسے ہو گئی جیسے کٹا ہوا کھیت ہو جیسے بجھا ہوا شعلہ ہو۔ اللہ اکبر۔ کس انداز میں یہ بات کہتا ہے!! کھیت جو کوئی چر گیا ہو' شعلہ جو بجھ چکا ہو۔ خاکستر بن کے رہ جاتی ہیں وہ قومیں' ان کی کھیتیاں کوئی چر جاتا ہے۔ ان کے شعلے خاکستر ہو جاتے ہیں۔ دیکھا آپ نے عزیزانِ من! خدا کے مکافاتِ عمل کی رو سے پھر تباہیاں کیسے آتی ہیں۔

مکافاتِ عمل کے نتیجہ میں تباہی اور بربادی کی شکل وصورت

عزیزانِ من! بہت ڈر لگتا ہے۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (85:12) ہماری گرفت بڑی محکم ہوا کرتی ہے۔ پھر پڑھ دوں فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (21:15) وہ یہ پکارتے رہے کہ ہاں ہم نے ظلم کیا۔ لیکن وقت گذر چکا تھا وہ پکارتے رہے اور پھر ہمارے قانون نے اس قوم کو یوں بنا دیا جیسے چرا ہوا کھیت ہو' جیسے بجھا ہوا شعلہ ہو کہ زندگی کی حرارت کی کوئی رمق اور چنگاری بھی اس میں پھر باقی نہیں رہا کرتی۔ ایک قوم کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔

1972ء کے کنونشن میں علامہ پرویز کے خطاب کے عنوان کا ذکر یعنی ''پاکستان کے متعلق خدائی فیصلہ''

یوں تو قرآنِ کریم نے بڑی تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ ایک قوم کب تباہ ہوتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم کب لے لیتی ہے۔ لیکن دو تین تو ایسی نمایاں چیزیں ہیں جن کو وہ ابھار کر سامنے لایا ہے کہ ایک قوم میں جب یہ خوبیاں نہیں رہتیں تو وہ تباہ ہو جاتی ہے اور اس کے بعد دوسری قوم آتی ہے۔ دو تین مقامات میں پیش کرتا ہوں۔ افسوس ہے کہ وہ کنونشن نہ ہوئی' اس کے بعد ہوگی' ورنہ آپ نے پروگرام میں دیکھا ہوگا میرا ایک خطاب کا عنوان تھا ''پاکستان کے متعلق خدائی فیصلہ''۔ میں نے اس خطاب میں یہی کیا تھا کہ قرآن نے جو اصول بتایا ہے کہ ایک قوم تباہ کب ہوتی ہے اور کیوں ہوتی ہے اور کس طرح ہوتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم کیسے لے لیتی ہے پورے کے پورے خطاب میں جو خاصا طویل اور مفصل ہے میں نے یہی کیا تھا کہ قرآن کے یہ مقامات گنائے تھے۔ بڑی تفصیل سے قرآن نے بتایا ہے قرآن میں قوموں کے عروج و زوال کے قوانین بڑی تفصیل سے آئے ہیں کہ اس کا تو موضوع ہی بنیادی یہ ہے۔ بہر حال دو ایک مقامات میں آپ کے سامنے لاتا ہوں۔ کہتا ہے پہلی بات سن لیجیے کہ قوم کب تباہ ہوتی ہے۔ زندگی کی بنیاد جد و جہد پہ ہے۔ جہدِ مسلسل عملِ پیہم ہر وقت رواں دواں سرگرمِ عمل رہنا اور اسی جد و جہد میں ایک مقام وہ آ جاتا ہے' جب دشمن کے مقابلے میں سر بکف میدانِ جنگ میں آنا پڑتا ہے جسے قتال کہا جاتا ہے۔ یاد رکھئے! یہ جہاد کی آخری اور بلند ترین شکل ہے۔

جہادِ اصغر اور جہادِ اکبر کے سلسلہ میں ایک وضعی روایت اور اس کی حقیقت

یاد رکھئے! یہ بھی ایک فریب دیا گیا تھا اس قوم کو جب ایک وضعی روایت بنا کے کہہ دیا گیا کہ یہ جہاد یہ جہادِ اصغر ہے جس میں جانیں دینے کے لیے خدا کے یہ غازی میدانِ جنگ میں پہنچ جائیں کہ یہ تو جہادِ اصغر ہے۔ اور یہ جو گھروں میں بیٹھ کے ہم وعظ و نصیحت کرتے ہیں' قلم دوات لے کے بیٹھ جاتے ہیں' یہ جہادِ اکبر ہے۔ بہت بڑا فریب اور سازش تھی جو اس قوم کے ساتھ کی گئی۔ سازش ہی یہ تھی کہ اس قوم کو جہاد سے بیگانہ بنا دیا جائے۔ قرآن نے کہا کہ **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ** (9:38)

کہا تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تمہیں بلایا جاتا ہے کہ آؤ اس میدانِ جنگ کی طرف آؤ دشمن کے مقابلے کی طرف اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم زمین کے ساتھ چمٹ کے رہ جاتے ہو' بوجھل بن جاتے ہو' پاؤں نہیں تمہارے اٹھتے۔ اس پاؤں نہ اٹھنے کی شکلیں یہ بھی تو ہیں کہ قوم تیار نہ ہو۔

جہاد کے سلسلہ میں ہونے والی ایک سازش کا ذکر

یہ بھی تو شکل ہے کہ قوم کے مجاہد تو میدانِ جنگ میں پہنچے ہوئے ہوں اور ان کے پاؤں میں حکم کی بیڑیاں ڈال دی جائیں کہ تم نے چپک کے رہ جانا ہے آگے نہیں بڑھنا' یہ بھی تو جرم ہے۔ تم سے کہا گیا کہ چلو آگے بڑھو خدا کی راہ میں' تمہارے پاؤں بوجھل ہو کے رہ گئے تم آگے نہیں بڑھے۔ ذمہ دار کوئی بھی ہو واقعہ تو یہ ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب یہ وقت آیا تھا تو تمہارے پاؤں بوجھ ہو گئے۔ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ (9:38) ہمارے وہ سپاہی جیالے تو ذمہ دار نہیں تھے جو بھی ذمہ دار تھا قرآن نے کہا تھا اسکی وجہ یہ ہوئی کہ مستقبل کے مقابلے میں مفادِ عاجلہ' تم نے اس کو ترجیح دیدی (وہی بات جو میں نے ابھی عرض کی تھی) اس لیے رک گئے۔ اگر قوم کے اندر سے قتال کا جذبہ مفقود ہو جاتا ہے جہاد کی آخری شکل گم کر دی جاتی ہے اس کی نگاہوں سے تو یاد رکھئے دین کے خلاف بہت بڑی سازش ہوتی ہے۔ اور وہ قوم قرآن کہتا ہے تباہ ہو جاتی ہے جس قوم کے اندر سے یہ جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (9:38) یاد رکھو! یہ مفادِ عاجلہ جو ہیں بظاہر بہت بڑے نظر آتے ہیں لیکن مستقبل کے مقابلے میں ان کی حیثیت کچھ نہیں ہوا کرتی۔ جب قوم اس مقام پہ پہنچ جاتی ہے تو سنئے اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (9:39) اگر تم اس طرح سے ذوقِ شہادت میں میدانِ جنگ کی طرف لپک کے نہیں جاؤ گے تو بڑی سخت تباہی' الم انگیز تباہی۔ افوہ! الم انگیز کہا ہے یہاں' تمہارے اوپر درد انگیز تباہی آ جائے۔ سنئے وہ تباہی کیا ہو گی؟ وَّ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (9:39) تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے لے گی آ کے۔ پہلی چیز جو ایک قوم کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ یہ سازشیں تو بہت دیر سے شروع ہوئی تھیں کہ اس قوم کو اس جہاد سے بیگانہ بنا کے رکھ دیا جائے جس میں رازِ زندگی ہے قرآن نے جو بتایا تھا۔ اس کی وقعت اور قیمت ہی گھٹا دی جائے' اسے جہادِ اصغر قرار دیدیا جائے۔ اور پھر اس کے بعد آہستہ آہستہ وہ Plannings اور Schemings وہ ساری چیزیں اس کے اندر آتی ہیں جو اس مقام کے اوپر کسی قوم کو پہنچائے۔ سنئے قرآن کا فیصلہ کہ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَ لَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا (9:39) اور تم اس سے خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ اس کا قانونِ مکافاتِ عمل اس طرح سے عمل کرتا ہے وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (9:39) وہ بات اصل یہ ہے کہ ہم نے تو ہر شے کے لیے پیمانے اور قانون مقرر کر دیے ہیں اور وہ اپنا کام کرتے جاتے ہیں۔ تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی اگر تم نے ایسا کیا تو۔ پوری کی پوری مملکت کا ایک آدھا حصہ اس کا' تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی' استبدالِ قومی۔ خدا کے قانونِ تعزیرات کی رو سے عذابِ الیم سب سے بڑا عذاب عظیم' قوم کی جگہ دوسری قوم آ جائے۔ پھر تو باز آفرینی کی جگہ ہی کوئی نہیں۔ کوئی چھوٹی چیز ہے یہ؟۔ ایک تو یہ وجہ بتائی قرآن نے۔

معاشرے میں دولت کا کسی ایک جگہ رک جانا انسانی جسم کے اندر خون کی گردش کا رک جانا ہے' جس کا نتیجہ فالج ہوتا ہے

دولت یہ لفظ عربوں کے ہاں دول سے ہے جس کے معنی ہی گردش کے ہیں۔ انسانی جسم کے اندر خون جو کچھ کرتا ہے' معاشرے کے اندر دولت وہ کچھ کرتی ہے یہ وجۂ حیات ہوتی ہے خون کی گردش۔ اور اگر خون کی گردش رک جائے' موت ہے۔ پوری گردش کا رک جانا تو ایک طرف رہا کہیں ایک خش خش سے بھی کم ہوتا ہے وہ ایک ذرہ جسے "Clot" کہتے ہیں وہ ایک ذرا سا ذرہ جو ہے وہ کسی جگہ رک جائے کسی نالی میں اس سے فالج ہو جاتا ہے۔ اور اگر پورے کا پورا قوم کا سرمایہ کہیں جمع ہو کے رک جائے' منجمد ہو جائے تو کیا اس قوم کی زندگی باقی رہ سکتی ہے؟۔ پہلی چیز تھی وہ جذبۂ جہاد جو قتال پہ ہوتا ہے' اس کا ذہنوں سے نکل جانا یا قوم کا اس سے جی چرانا۔ دوسری چیز نظامِ سرمایہ داری کا قوم کے اندر آ جانا' دولت کا منجمد ہو کے رہ جانا۔ اور اگر وہ گردش کرے بھی تو قرآن نے کہا ہے کہ یہ گردش گردش نہیں ہے کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ (59:7) کہ گردش تو کرے لیکن اوپر ہی ایک طبقہ ہو تھوڑا سا جس کے اندر گردش کرے' نیچے آئے ہی نہیں۔

دولت کے سلسلہ میں قرآن حکیم نے انفاق کا لفظ استعمال کیا ہے' جس کے معنی کھلا رکھنے کے ہیں

یہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے کی باتیں ہیں۔ اس نے اس کے لیے لفظ انفاق استعمال کیا ہے جس کا ترجمہ ہم نے خرچ کرنا کر دیا اصل حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ تباہ کر دیا ان ترجموں نے آ کے۔ نَفَقٌ کہتے ہیں وہ میانی کہ جس کے دونوں سرے کھلے ہوں۔ روپیہ جمع کرنے والے کی میانی کا ایک سرا تو کھلا ہوتا ہے جس میں وہ ڈالتا ہے' اگلا سرا بند ہوتا ہے جس میں سے نکلتا ہے۔ یہ میانیاں ہوتی ہیں یہ تمام سرمایہ داروں کی' سرمایہ داری کا نظام ہی وہ میانی ہے کہ جس میں ایک ہی سرا کھلا ہوتا ہے اگلا سرا بند ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ میانی تو ہونی چاہیے' آنا چاہیے روپیہ لیکن نَـفَـقٌ کی صورت ہونی چاہیے' دونوں سرے کھلے رہنے چاہئیں ادھر سے ڈالتے جاؤ اُدھر سے نکلتا چلا جائے۔ کہتا ہے قوم اس صورت میں بچ سکتی ہے۔

بخل کا لفظ انفاق کے مقابلے میں آیا ہے کنجوسی کے لیے نہیں

سنئے قرآن کی آیت۔ هٰۤاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ تُدۡعَوۡنَ لِتُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ (47:38)

یہ ڈوبنے والی تباہ ہونے والی قوم کے افراد سے کہا جاتا ہے کہ تم وہ ہو گئے کہ تمہیں پکار پکار کے کہا جاتا ہے کہ بابا! اس دولت کو کھلے رکھو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے} ان کی بہبود کے لیے۔ جہاں فی سبیل اللہ آتا ہے' اس کے معنی یاد رکھئے پوری عالمگیر انسانیت کی بہبود مقصد ہوتا ہے اس سے۔ تم سے پکار پکار کے کہا جاتا ہے کہ بابا! کیوں اپنی تباہی کو بلا بلا کے گھر اپنا دکھاتے ہو۔ یہ عام انسانیت کی فلاح

اور بہبود کے لیے اس سرمایے کو اس دولت کو نَـفَـقْ کی طرح رکھو اس میانی کی طرح رکھو جس میں سے نکلتا جائے۔ یہ کہیں رکنے کے لیے نہیں دیا گیا۔ یہ دولت نہیں رہتی پھر اس صورت میں۔ تم وہ ہو گئے ہو کہ تمہیں یہ دعوت دی جاتی ہے تو کیا کیفیت ہوتی ہے؟ فَـمِـنۡـكُمۡ مَّنۡ يَّبۡخَلُ (47:38) تو تم میں سے وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ نہیں یہ تو ہم نے اپنے علم و ہنر کی بناء پہ اپنی کاریگری سے کمایا ہے۔ ہم تو اسے اپنی ذات کے لیے رکھیں گے، کسی دوسرے کا اس پہ حق نہیں ہے۔ بخل کے معنی کنجوسی نہیں ہوتا، بخل انفاق کے مقابلے میں ہے روک کے رکھ لینا روپے دولت کو سرمایے کو۔ سنئے کیا کہتا ہے۔ یہ روک کے جو رکھنے والا ہے یہ سمجھتا ہے کہ میں نے دوسروں کو اس سے محروم کر دیا۔

قرآنی آیات کی رو سے بخل برتنے والی قوم کا انجام

قرآن کے الفاظ سنئے عزیزانِ من! اور سر دھنئے اعجاز پہ۔ کہتا ہے وَمَنۡ يَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا يَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِهٖ (47:38) کہا کہ یہ روک کے رکھنے والے بزعمِ خویش سمجھتے یہ ہیں کہ ہم نے دوسروں کو اس سے محروم کر دیا، درحقیقت یہ اپنے آپ کو بھی اس سے محروم کر رہے ہیں۔ آج بھی یہ صورت ہے کہ خود اپنے پہ بھی خرچ نہیں کر رہے۔ وہ جَـمَـعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (104:2) پھر وہ ننانوے کے پھیر میں پڑ جاتا ہے جمع کرتا ہے پھر گننا شروع کر دیتا ہے، آج یہ کیفیت ہے۔ اور اس کے بعد یہ اس جمع شدہ کا انجام کیا ہونے والا ہے سنئے۔ کہا ہے ہم جو یہ کہہ رہے ہیں فی سبیل اللہ دیدو، بھکاری نہیں ہیں کہ تم سے اپنے لیے کچھ مانگ رہے ہیں وَالـلّٰـــهُ الۡـغَـنِـىُّ وَاَنۡـتُـمُ الۡـفُقَرَآءُ (47:38) ہمیں کسی کی احتیاج نہیں، محتاج تو تم ہو۔ اور اگر تم نے یہ کیفیت کر لی وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا (47:38) ہم نے وارننگ دیدی ہے تمہیں اگر تم نے اس پہ بھی اعراض برتا اس سے، نہ چھوڑی یہ روش تو پھر کیا ہوگا؟ سنئے يَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًـا غَيۡرَكُمۡ (47:38) تمہاری جگہ پھر کوئی اور قوم لے لے گی۔ قوم کے بدلنے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ سارے کے سارے تہ تیغ ہی کر دیے جائیں۔ اگرچہ اس کا اولیں مرحلہ وہ بھی ہوتا ہے جس طرح سے آج خبریں آ رہی ہیں. ان مظلوموں پہ ان بے گناہوں پہ، کیا بیت رہی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ قوم تو زندہ رہے ہیں لیکن وہ محکومی اور محتاجی کی ذلت آمیز زندگی بسر کرے۔ تمہاری جگہ پھر ایک اور قوم لے لے گی ثُـمَّ لَا يَكُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَـكُمۡ (47:38) وہ تمہاری طرح کی نہیں ہوگی۔ یہاں یہ چیز بتائی ہے کہ پھر وہ تمہاری طرح کی نہیں ہوگی. اس قوم میں تم سے زیادہ خوبیاں ہونگی۔ اور کچھ نہیں، قوت ہی زیادہ ہوگی وہی ایک پروسیس جو بتایا تھا کہ ظالم ہی ظالم کو آن کے مغلوب کر لیتا ہے۔

پوری نوع انسانی کی بربادی کی بنیادی وجہ کیپٹل ازم ہے جس نے انسانوں کو کئی قسم کی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا کر رکھا ہے

بہر حال استبدالِ قومی جو میں نے کہا ہے کہ یہ جو قوموں کا بدلنا ہے وہ یہ ہے کہ اگر یہ انفاق کی صورت نہ رہے، نظام ہو جائے تمہارا وہ کیپٹل ازم کا جس میں دولت چند ہاتھوں کے اندر جمع ہو کے رہ جائے، انفاق کی صورت اس میں نہ ہو تو کہا کہ پھر وہ قوم باقی نہیں رہا

کرتی۔اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ یہ دوسری چیز قوم کے استبدال کی قرآن نے بتائی۔ایک آگے اور چیز ہے قوم سے مذاق کرتے رہتے تھے۔اپنی تباہیوں پہ غور کرنے کے لیے ذرا پیچھے دیکھئے عزیزانِ من! ہر آنے والے نے ایسی ایسی Statements دیں ایسے ایسے وعدے کیے کہ نظر آتا تھا کہ بس آ گئے اب نجات دہندہ' پوچھئے نہیں اس قوم میں ہُن برسنے لگ جائے گا۔ یہ کیا جائے اور وہ کیا جائے گا اور ہم اپنے وعدے کے اوپر قائم ہیں اور ہم یہ کردیں گے اور یہاں یہ نظام رائج ہو جائے گا اور اس طرح سے ہُن برسے گا۔ یہ سارا کچھ یہ کرتے رہے اور خود اپنی وہی رنگ رلیاں منانا شروع کیا۔بیانات پہ بیانات دیے چلے جا رہے ہیں Statements پہ Statements آ رہی ہیں۔ وعدوں پہ وعدے ہو رہے ہیں۔شاید کہیں مسودے بھی تیار ہو رہے ہیں۔اب بن رہا ہے چلا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ بیانات بازی کا ساتھ کے ساتھ اور خود اپنی ان رنگینیوں کے اندر مست ہیں۔

مشرقی اور مغربی رقبوں کی تقسیم میں ڈھاکہ کا انجام

غور فرمایا آپ نے۔کہا یہ جو ہیں رقبوں کی تحدیدیں اور تقسیمیں East کی اور West کی مغربی خطے کی اور مشرقی خطے کی۔ میں نے پچھلی دفعہ بھی کہا تھا کہ میں بڑے ضبط سے کام لیتا ہوں لیکن

دل کا خوں آنکھ میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج
نالہ روکا تھا کہ یہ پردہ درِ راز نہ ہو

یہاں دل کا خوں آنکھ میں کھنچ آتا ہے وہاں میں بے بس ہو جاتا ہوں۔لفظ وہ آ گئے قرآن کے فَلَآ اُقۡسِمُ بِرَبِّ الۡمَشٰرِقِ وَالۡمَغٰرِبِ (70:40) یہ مشرقیں اور یہ مغربیں شہادت دے رہی ہیں اس بات کے اوپر۔ یہ مشرق اور مغرب} کہاں قرآن نے ہماری دکھتی ہوئی رگ یہاں پکڑ لی۔ یہ شہادت دیتی ہیں اس بات کے اوپر کہ اِنَّا لَقٰدِرُوۡنَ (70:40) ہم اس کے اوپر قادر ہیں مقدرت رکھتے ہیں' کس بات کے اوپر؟ عَلٰۤی اَنۡ نُّبَدِّلَ خَیۡرًا مِّنۡہُمۡ (70:41)۔قرآن نے کہا یہ تھا کہ خدائے مشارق ومغارب اس کی شہادت دیتا ہے اس کا قانونِ مکافاتِ عمل کہ ہم اس پر قادر ہیں کہ تماری جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئیں جو تم سے بہتر ہو۔اور یاد رکھو ان سے کہہ دو کہ یہ ہمیں پیچھے چھوڑ کے آگے نہیں بھاگ سکتے ہم راستے میں کھڑے ہیں' گذریں ہمارے پاس سے ہم ان کا گلا پکڑ لیں گے۔ فَذَرۡہُمۡ یَخُوۡضُوۡا وَیَلۡعَبُوۡا (70:42) ان کو کچھ وقت کے لیے چھوڑ دو یہ اپنی انہی بیان بازیوں کے اندر مصروف رہیں' اپنی انہی تماش بینیوں کے اندر مشغول رہیں۔تھوڑے سے وقت کے لیے ان کو چھوڑ دو۔کوئی بات نہیں ہے آ رہا ہے وہ قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے تباہی کا وقت۔حَتّٰی یُلٰقُوۡا یَوۡمَہُمُ الَّذِیۡ یُوۡعَدُوۡنَ (70:42) تاآنکہ وہ دن ان کے سامنے آ کے کھڑا ہو جائے کہ جس کے متعلق ان کو وارننگ دی جا رہی ہے کہ یاد رکھو یہ انجام ہوا کرتا ہے ان چیزوں کا۔اب بھی باز آ جاؤ تو تم بچ جاؤ گے ورنہ یاد رکھو وہ دن آنے والا ہے۔

یہ ہیں قرآنِ کریم کی رو سے قوموں کی جگہ ایک دوسری قوم کے آجانے کے اصول' کچھ قوانین جو اس نے بتائے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ تفصیلاً تو بہت مقام ہیں جہاں اس نے کہا ہے لیکن نمایاں طور پہ یہ مقام اس نے بتایا ہے کہ جس قوم کے اندر سے اس میدانِ جنگ میں جانے والے قتال کا جذبہ اور اس جہاد کا جذبہ کم ہو جائے باقی نہ رہے وہ قوم ختم ہو جاتی ہے۔ جس قوم کے اندر نظامِ سرمایہ داری آ جائے کہ دولت سمٹ کے کم جگہوں کے اندر جمع ہو کے رک کے رہ جائے' وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ اور جس قوم کے اکابرین کی کیفیت یہ ہو کہ وہ محض الفاظ کے اوپر بیانات کے اوپر Statements کے اوپر' ٹرخاتے رہیں قوم کو اور خود رنگ رلیاں مناتے رہیں' قرآن کہتا ہے کہ وہ بھی قوم نہیں بچا کرتی' تباہ ہو کے رہ جایا کرتی ہے اس پہ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل شاہد ہے۔

ان ناگفتہ بہ حالات کے باوجود قرآن حکیم کی روشنی میں علامہ اقبال کا پیغام

جہاں تک قرآنِ کریم کا تعلق ہے یا خدا کے نظام کا تعلق ہے اس سے ایک ضرور ہم لوگوں کو جو دور تک نہیں دیکھتے' کچھ تھوڑی سی مایوسی چھا جاتی ہے کہ یہ خطۂ زمین جسے ہم نے قرآن کے نظام کو متشکل کرنے کے لیے حاصل کیا تھا وہ اس قسم کی تباہیوں میں آ گیا تو پھر اس کا انجام کیا ہوگا۔ قرآن کے اس نظام کا' دین کے اس تمکن کا' جو اس کی آماجگاہ بننے کے لیے اس خطے کو حاصل ہم نے کیا تھا' وہ اگر تباہیوں کے نرغے میں آ گیا تو پھر اس کا انجام کیا ہوگا۔ اس کے متعلق اپنے الفاظ میں نہیں اقبالؒ کے الفاظ میں میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ بڑی جامع حیثیت سے یہ چیز کہہ جاتے ہیں۔ جاوید نامے میں انہوں نے قرآن کی عظمت بیان کرنے کے بعد یہ کہا۔ پھر افسوس ہے کہ وہ شعر فارسی کے ہی ہیں مجھے ان ترجموں میں پھول خوشبو کے تجسس میں پتی کو مسلنا پڑے گا۔

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است

ٹھیک ہے کہ آج ہماری محفل نہ اس میں شراب رہی نہ اس میں ساقی رہا۔ بے مے اور بے ساقی محفل یہ ہوگئی۔ لیکن یہ تو امیدوں کا شہزادہ ہے قرآن پہ نگاہ ہے۔ کہتا ہے مایوسی کی کوئی بات نہیں' قرآن والوں کے لیے مایوسی کی کوئی بات نہیں کیونکہ

ساز قرآں را نوا ہا باقی است

قرآن کے ساز کے اندر تو بڑی بڑی ابھی نوا باقی ہے۔

زخمۂ ما بے اثر افتد اگر
آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور

اگر ہمارا مضراب ٹوٹ گیا ہے کہ جس سے اس تار کے اندر پوشیدہ نغموں نے باہر آنا تھا تو کوئی بات نہیں' آسمان کے پاس ہزاروں زخمہ اور باقی ہیں ہماری جگہ کوئی زخمہ اور آ جائے گا۔

ذکرِ حق از امتاں آمد غنی

از زمان و از مکاں آمد غنی

یہ خدا کی بات قیامت تک رہنے والے کے لیے ہے۔ یہ کسی خاص قوم تک محدود نہیں ہے۔ یہ کسی خاص زمان تک کسی خاص Locality تک محدود رہنے والی بات نہیں ہے۔ یہ تو عالمگیر بات ہے' ابدی طور پر رہنے والی چیز ہے۔

ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جدا است

احتیاجِ روم و شام او را کجا است

خدا کا ذکر ابدیت رکھتا ہے اس ذکر کے کرنے والے وہ بدل سکتے ہیں اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے کہ روم میں ہو یا شام میں ہو ہند میں ہو یا عرب میں ہو۔ آج کسی ایک خطۂ زمین میں نہیں ہے' دوسرے خطۂ زمین کے اندر یہی چیز اسی طرح سے ابھرے گی۔

حق اگر از پیشِ ما بردارش

پیشِ قومے دیگرے بگذاردش

اگر ہمارے سیاہ نامۂ اعمال کی وجہ سے ہم سے یہ چیز چھن گئی ہے یہ بربط ہم سے چھین لیا گیا ہے تو کوئی بات نہیں! یہ کسی اور قوم کے ہاتھ میں دیدیا جائے گا۔

از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن

ہر زماں جانم بلرزد در بدن

کہتا ہے یہ مسلمان جس کے ہاتھ میں آج یہ ہے یہ بربط ہے' میں دیکھتا ہوں کہ یہ تو تقلید کے اندر ڈوبی ہوئی ہے' اس میں تو یقینِ محکم باقی نہیں رہا اس قوم کو دیکھ کر مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ بڑا ہمدرد قلب اس نے پایا تھا امت کے لیے۔ اور شعر ہے

ترسم از روزے کہ محرومش کنند

میں ڈرتا ہوں اس دن سے کہ جس دن اس قوم کو اس سے محروم کر دیا جائے گا اور

آتشے خود بردلِ دیگر زنند

اور وہ ہمارا محبوب اپنے عشق کی آگ ہم سے چھین کے کسی اور جگہ رکھ دے گا' مجھے اس چیز سے ڈر آتا ہے۔ اس سے نہیں ہے کہ قرآن کا نغمہ خاموش ہو جائے گا یہ ہمارا اور تمہارا اور روم و شام کا محتاج نہیں ہے۔ یہاں سے اٹھے گا اور قوم کوئی لے لے گی۔ ہم سے بہتر قوم ہوگی وہ جو اس کو لے لے گی۔

نبی اکرم ﷺ کی زبانی قرآن حکیم کا اعلان

یہ انقلاب لانے کے لیے کتنا بڑا اعلان ہے۔ جو قرآنِ کریم نے نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے کہا کہ **قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ** (6:135) ان سے للکار کے کہہ دو کہ اے قوم! زبانی باتیں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں نے تمہیں سمجھا دیا ہے کہ تمہاری روش غلط ہے اور یہ روش صحیح ہے۔ اب اس کے پرکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ تم اپنے پروگرام کے اوپر عمل کرتے جاؤ مجھے میرے پروگرام پر عمل کرنے دو۔ Pragmatic Test۔ ٹھیک ہے چلو تم اپنی روش پر لیکن اجازت دو کہ میں اپنی روش کے اوپر چلوں۔ میں نہ تم میں مداخلت کرتا ہوں' اب نہ تم مجھ میں مداخلت کرو۔ **فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ** (6:135) عنقریب بہت جلد یہ بات سامنے آجائے گی **مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ** (6:135) کہ انجامِ کار کامیابی کس کو ہوتی ہے جلدی بات سامنے آجائے گی۔ اور آگے اصول بتایا عزیزانِ من! کہ میں کیوں اس دعوے سے کہتا ہوں کہ تم تباہ ہو جاؤ گے' برباد ہو جاؤ گے اور میں غالب رہونگا اور میں کامیاب رہونگا کیوں کہتا ہوں؟ **اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ** (6:135) اس کا اصول غیر متبدل یہ ہے کہ ظالم کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی۔ اس نے یہ کہا ہے کہ ظالم کامیاب نہیں ہو سکتا' یہ اصول ہے۔ جس کی بناء پہ مجھے یقین اتنا ہے اس کے اوپر کہ ٹھیک ہے آج میں کمزور و ناتواں سہی' مجھے ذرا اپنے پروگرام پہ عمل کرنے دو اور تم جو جی میں آئے کرتے چلے جاؤ اور پھر چند دنوں کے بعد دیکھ لو کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ اور اس حتم و یقین سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے ایمان ہے اس پر کہ ظالم کی کھیتی پنپا نہیں کرتی۔ تم نہیں پنپ سکتے۔ میں عدل و انصاف لے کے اٹھا ہوں میں کامیاب و کامران رہونگا۔ آج پھر سے امید کی کرن اس طرح سے پیدا ہو سکتی ہے کہ کوئی کہنے والا یہ کہنے کے لیے اٹھے کہ ظلم اور استحصال کی حامل قومو! تم اپنے طور پہ جو کرنا چاہتی ہو کرو لیکن خود یہ خدا کا انصاف اور اس کے قوانین اور اقدار کو لے کے اٹھے اور کہے کہ مجھے اپنی جگہ تھوڑی سی مہلت دیدو کام کرنے کی اور پھر اس کے بعد تم دیکھو کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ پھر خدا کا یہ قانون کس طرح محسوس شکل میں سامنے آتا ہے کہ **اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ** (6:135) ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی۔ یہ وہی کہہ سکتا ہے جو ظلم کو مٹانے کے لیے اٹھے اور پھر یہ کر کے دکھائے۔ نبی اکرم ﷺ سے بھی یہ کہا گیا' یہ نہیں ہے کہ وہ بیٹھا ہوا دعائیں مانگتا رہے' وہ نعرے بلند کرتا رہے یہ چیز نہیں ہے' نہ ہی یہ چیز ہے کہ کوئی مردِ از غیب بیروں آید و کارے بکند۔ وہ کہیں سے آئے گا وہ آ کے کام کرے گا۔ **اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ** (6:135) تم اپنی جگہ کام کرو اپنے پروگرام کے مطابق' میں اپنی جگہ کام کرتا ہوں۔ اور یہ دعویٰ وہی کر سکے گا جو ظلم کو مٹانے کے لیے عدل کا ترازو ہاتھ میں لے کے اٹھے اور پھر کام کرے اس کے مطابق اور پھر وہ دیکھے کہ خدا کے وعدے کس طرح سچے نہیں ہو سکتے۔ ہم سورۃ الانعام کی آیت 135 تک آ گئے عزیزانِ من! 136 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

بیسواں باب: **سورة الانعام** (آیات 136 تا 150)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1972ء کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی آیت 136 سے ہوتا ہے (6:136)۔

انسانی زندگی کی کامیابی اور آزادی کا نشان یہ ہے کہ اسے کوئی خوف ہو نہ حزن

قرآنِ کریم نے اس طرزِ زندگی کا ماحصل اور نتیجہ جو قوانینِ خداوندی کے مطابق بسر کی جائے جسے وہ مومن کی زندگی کہہ کر پکارتا ہے اس کا ماحصل' اس کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (6:48) ان لوگوں کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ حزن ہوگا۔ غور فرمایئے کہ اس نہجِ زندگی کا نتیجہ کیا بتایا گیا ہے نہ خوف اور نہ حزن۔ خوف انگریزی میں اس کا ترجمہ Fear کیا جاتا ہے اور حزن کے لیے Grief کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ عام طور پہ خوف کسی سامنے دیکھے ہوئے محسوس خطرے سے پیدا ہوتا ہے جیسے دشمن نے حملہ کر دیا اور اس سے کوئی خوف پیدا ہوا۔ اور حزن دل کی اس کیفیت کا نام ہے کہ جس میں بظاہر کوئی سامنے محسوس خطرہ تو نہ ہو لیکن دل ڈوبا جا رہا ہو غیر محسوس طور پر' معلوم نہ ہو کہ اس کی وجہ کیا ہے کیوں ایسا ہے لیکن انتہائی افسردگی اور دل گرفتگی کا عالم ہو۔ تازہ مثال میں تو یوں سمجھئے کہ جس زمانے میں جنگ ہو رہی تھی اس زمانے میں بعض محاذ کہ جہاں ہم کمزور تھے خطرہ لاحق تھا' خوف تھا۔ اور آج جبکہ جنگ کا خطرہ ٹل گیا ہے ساری قوم ایک غیر محسوس حزن میں گرفتار ہے' ایک افسردگی چھائی ہوئی ہے پژمردگی چھائی ہوئی ہے۔ یہ حزن ہے۔ تو کہا یہ گیا کہ اس نہجِ زندگی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ تو محسوس خطرات سے کوئی ڈر ہوگا اور نہ اس قسم کی دل گرفتگی اور پژمردگی کا عالم ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ انسان کی کوئی اور آرزو ہو نہیں سکتی کہ اسے نہ خوف ہو اور نہ حزن ہو' انتہائی کامیاب اسے کہا جائے گا۔ وہ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی اگر یہ چیز میسر آ جائے افراد کو اور کسی قوم کو تو یہ انتہائی' جیسا میں نے عرض کیا' کامیاب اور بامراد زندگی کہلائے گی۔

ابتدائی دور میں انسان کی عملی سطح اور کائناتی حوادثات کا ذہن پر اثر اور اس کا نتیجہ

ابتدائی دور میں جب انسان اس نظامِ فطرت کے رموز سے واقف نہیں تھا تو اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ یہ فطرت کے حادثات کیسے نمودار ہوتے ہیں۔ سیلاب کیوں آتے ہیں' زلزلے کیوں پیدا ہوتے ہیں' کوہِ آتش فشاں کیوں پھٹتا ہے حتیٰ کہ وبائی امراض کیوں آ جاتی ہیں۔ اسے یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا۔ چیچک کیوں نکلتی ہے۔ تپ دق کا معلوم نہیں تھا کہ بخار کیوں آ جاتا ہے۔ اس کیوں کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اور حزن اس وقت پیدا ہوتا ہے کہ جب کبھی کیوں کا جواب نہ مل سکے' یہ نہ معلوم ہو سکے کہ یہ جو ہو رہا ہے' اسکی وجہ کیا ہے۔ اسی سے مایوسی چھاتی ہے۔ مایوسی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کیوں کا جواب نہ مل سکے کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ تو اس زمانے میں انسان کا علم ابھی محدود کیا بالکل نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے وہ ان حوادث کے کیوں کا جواب نہیں پاتا تھا۔ تو اسکے بعد اس کے سوا چارہ کیا تھا کہ

وہ اپنے ذہن سے ہی کچھ تراش لیتا' چوں نہ بینند حقیقت رہے افسانہ زنند' حقیقت اس کے سامنے نہیں تھی اس لیے اس نے اس کیوں کا جواب یونہی اپنے ذہن سے تراشا۔ اس نے سمجھا کہ کوئی مخفی قوتیں ہیں' دیوی دیوتا ان کے نام رکھے' جن بھوت' یہ ان کی تعبیریں کیں' کبھی اس نے کہا کہ یہ مرنے والوں کی روحیں ہیں جو ہمیں آ کے ستاتی ہیں۔ اب ان انجانی غیر محسوس غیر مرئی Invisible قوتوں کو خوش کرنے کے لیے اس نے ان کے سامنے سجدے کیے ڈنڈوت کیے' ان کی پرستش شروع کی' ان کو راضی کرنے کا طریقہ سوچا کہ کسی طرح یہ ناراض نہ ہو جائیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے ناراض ہونے سے ان کے غصے سے یہ سارا عتاب آتا ہے' یہ غضب نازل ہوتا ہے جو زلزلوں کی' کوہِ آتش فشاں کی' سیلابوں کی تلاطم انگیزیوں کی' وبائی امراض کی شکل میں مسلط ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسے روکنے کے لیے ان کے پاس ایک ہی طریقہ تھا کہ انہیں کسی طرح سے خوش کیا جائے۔ ہزاروں قسم کے یہ حوادث اور امراض آتے تھے اس لیے ان کو ہزاروں قسم کے دیوی دیوتا تراشنے پڑے۔ اب آپ سوچئے کہ ایک انسان ہو اور ہزاروں قسم کے اس طرح سے دل میں حزن پیدا کرنے والے۔ یہ دیوی دیوتا غیر مرئی قوتیں ہوں تو اس کی کیفیت کیا ہوگی بیچارے کی۔ صبح سے شام تک ایک ایک سے ڈرتا رہے گا سہا ہوا رہے گا وہ ناراض نہ ہو جائیں' انہیں غصہ نہ آ جائے کہیں' ان کے حق میں مجھ سے کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔ تو وہ ڈرتا سہا ہوا پھرتا تھا۔ قرآن نے جو نہجِ زندگی سکھائی اس میں کیا بات بتائی۔

کائنات کے ذریعے انسان کے لیے راہنمائی اور خوف وحزن کا علاج

وحی نے پہلی چیز تو یہ بتائی کہ کائنات میں جتنے حوادث اور واقعات ہوتے ہیں یہ قوانینِ فطرت کی رو سے ہوتے ہیں۔ اور آدمی کے اندر اس کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ وہ ان قوانینِ فطرت کو معلوم کر سکے۔ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا (2:31) بڑی عظیم چیز ہے وہی جو شروع میں ہی آپ قصہ آدم' جو ہمارے ہاں بدقسمتی سے چیستاں بن کے رہ گیا ہے ایک افسانہ بن کے رہ گیا ہے' بڑی عظیم حقیقتیں اس کے اندر مضمر ہیں جو تمثیلی انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ کلها تمام اشیائے کائنات کے قوانین کے علم حاصل کرنے کی صلاحیت انسان کے اندر رکھ دی گئی' اس کو ودیعت کر دی گئی۔ اور اسے کہا گیا کہ جو بھی یہاں حادثہ رونما ہو اس کے متعلق علم حاصل کیا جا سکتا ہے یہ کہ اس کے Cause & Effect کا جو علم ہے وہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کیوں ایسا ہوا۔ اور جب کیوں کا علم ہو جائے تو حزن تو وہیں ختم ہو جاتا ہے اور جب اس سبب کا تدارک کر لیا جائے' ازالہ کر لیا جائے' اس کی مدافعت کر لی جائے تو خوف ختم ہو جاتا ہے۔ تو کائنات کی طرف سے وہ دیوی دیوتا اور غیر مرئی قوتیں جو ذہنِ انسانی نے اپنی جہالت کی بناء پہ تراشی تھیں' جب کائنات کے متعلق قوانینِ فطرت کا علم ہو جائے ان کے اسباب کا پتہ چل جائے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے تو حزن تو اسی وقت دور ہو گیا کیونکہ یہ معلوم ہو گیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ملیریا کیوں ہوتا ہے۔ ایک خاص قسم کے مچھر کاٹتے ہیں' ان کے جراثیم سے ملیریا ہو جاتا ہے۔ حزن تو ہو گیا ختم۔ اب اس

کے بعد اس کا خوف تو اس کا تدارک یہ ہے ان مچھروں سے اپنے آپ کو بچا لیجیے۔ اور اگر کہیں وہ کاٹ گئے ہیں تو اس کے بعد اس کا جو علاج ہے، کونین کا علاج یا اس قسم کی ادویات موجود ہیں، ان سے علاج کر لیجیے۔ خوف اور حزن دور ہو جاتا ہے جب آپ کو اسباب وعلل کا پتہ چل جائے۔ اب یہ تو رہا باہر کی دنیا کے متعلق، خود انسانوں کے باہمی معاملات میں بھی تو یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

خارجی کائنات کے علاوہ انسان کی معاشرتی زندگی کے متعلق راہنمائی

اس کے لیے اس نے ایسے قوانین دیدیے وحی کے ذریعے سے کہ اگر ان کے مطابق انسانی معاشرہ متشکل ہو جائے تو اس کی بنیادی خصوصیت ہوگی کہ اس معاشرے میں کسی فرد کو کسی قسم کا نہ خوف ہوگا نہ حزن ہوگا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس معاشرے میں ہر چیز قانون کے مطابق ہوگی۔ وہی بنیادی نقطہ جو وہاں کارگہ کائنات میں کارفرما تھا وہی انسانی زندگی کے اندر نافذ ہوگا کہ ہر چیز قانون کے مطابق ہوگی، قاعدے کے مطابق ہوگی، کوئی دھاندلی نہیں ہو سکے گی۔ قانون کو کوئی توڑ نہیں سکے گا، کوئی خرید نہیں سکے گا، کوئی سفارش سے اس کو الجھا نہیں سکے گا۔ غیر قانونی بات کوئی نہیں ہوگی۔ قانون کا ہر ایک کو علم ہوگا اور یہ بتایا جائے گا کہ اس کی قانون شکنی کا نتیجہ کیا ہوگا۔ قانون کی پیروی سے تمہیں کس قدر امن مل جائے گا۔ تو جب معاشرے کے اندر بھی قانون ہوں اور باہر کی خارجی کائنات میں دور دورہ ہو اور قوانین کا علم ہو اور کوئی چیز قانون کے خلاف ہو نہ سکتی ہو اس کے بعد آپ سوچیے کہ پھر خوف اور حزن رہتا کہاں ہے۔ یہ جو مومن کی زندگی کہی گئی وہ یہ ہے۔ ایک زندگی تو وہ تھی ابتدائی انسان کی کہ اس کو فطرت کے قوانین کا ابھی علم نہیں تھا اس لیے قدم قدم پر ڈرتا سہتا تھا۔

اہل یورپ کی زندگی کی کیفیت۔ یہاں سے مریخ کو کنٹرول کرنے والا اپنے ہمسائے کو کنٹرول نہیں کرسکتا

پھر قوانینِ فطرت کا تو علم ہو گیا جیسے یورپ کی قومیں ان کو اب دیکھئے کہ جہاں تک فطرت کی قوتوں کا تعلق ہے انہیں کسی قسم کا خوف نہیں ہوتا۔ لیکن کیونکہ انسانی زندگی کے متعلق ان کے ہاں قوانین ایسے نہیں ہیں جیسے فطرت کے اٹل اور غیر متبدل قوانین ہیں۔ اس لیے انسانوں کی زندگی میں ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ عہدِ جاہلیت کا وحشی انسان اتنا سہا ہوا ڈرا ہوا نہیں تھا، جتنا آج کا انسان ہے۔ متمدن انسان، مہذب انسان، اتنا بڑا سائنس کے قوانین کو جاننے والا کہ یہاں بیٹھا ہوا مریخ تک کو تو کنٹرول کر رہا ہے پڑوسی کو کنٹرول نہیں کرسکتا۔ فرد کے ہاتھوں فرد سہا ہوا۔ قوم کے ہاتھوں قوم سہی ہوئی۔ اس وقت سارا عالمِ انسانیت سہا ہوا ہے۔ ہر ایک کو اس کا ڈر ہے کہ ایک بم اگر چل گیا تو یہ پورے کا پورا کرۂ ارض بکھری ہوئی اون کی طرح اڑ جائے گا۔ سہمی ہوئی ہیں قومیں ایک دوسرے سے، ڈرے ہوئے ہیں افراد ایک دوسرے سے۔ یعنی وہی انسان کہ جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا لیکن زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا۔ یہاں پہنچنے کے بعد وہ تاریکیاں، جو رات کو بچے کو اندھیرا ڈراتا ہے، ہر انسان کو ہر قوم کو اس وقت وہ ڈرا رہا ہے۔ حزن کی کیفیت

پیدا ہوگئی ہوئی ہے۔

انسان کی تیسری کیٹیگری یعنی قران کا نظریہ رکھنے والی قوم اور خدا کے تصور کی ضرورت

تیسری قوم وہ ہے جس نے فطرت کی قوتوں کو بھی مسخر کیا اور انسانی معاشرے کو بھی اسی قسم کے غیر متبدل قوانین کے تابع رکھا۔تو اس معاشرے میں کیفیت یہ ہوگی کہ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ(6:48)۔یہ تو تھا جو قرآن نے نظریۂ زندگی دیا۔اب اس نظریے میں آپ دیکھئے بنیادی نقطہ یا بنیاد کیا ہے۔بنیاد ہے قانون کی۔اور جب قانون کہیں گے تو قانون دینے والا بھی آپ کے سامنے آئے گا' قانون کو چلانے والا بھی آئے گا یعنی ایک اتنی بڑی قوت کہ جو قانون ساز بھی ہو اور قانون کو نافذ کر سکتی ہو' اسے خدا کہتے ہیں۔ ایمان اس نے یہ بتایا کہ ایک ہی قوت ہے جو قانون بنا رہی ہے' قانون دے رہی ہے' قانون چلا رہی ہے۔اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔اسے توحید کہتے ہیں۔

بتیس کروڑ دیوی دیوتاؤں کا تصور رکھنے والی قوم کی حالت اور قرآن کے نزدیک شرک کی تعریف

ابتدائی دور کا انسان' میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے' ہر حادثے اور ہر مصیبت کے لیے اس بیچارے کو ایک نیا خدا تراشنا پڑتا تھا۔ بتیس کروڑ دیوی دیوتا آپ کے پڑوس میں ہندوستان کے لوگ پوجنے والے' یہ افسانہ نہیں ان کے ہاں کی مذہبی کتابوں میں یہ ہے۔اور یہی وجہ تھی کہ کوئی تکلیف ہوئی اس کے لیے ایک دیوی دیوتا ان کو تراشنا پڑا کیونکہ ایک دیوتا تو ایسا نہیں تھا کہ جو دوسرا کام بھی کر سکتا۔لیکن جب آپ ایک خدا پہ ایمان لائیں کہ وہی قانون دینے والا' وہی قانون کو چلانے والا تو اس ایک ایمان سے یہ جتنی توہماتی قوتیں تھیں آپ کے ذہن میں جن سے قدم قدم پہ آپ ڈرتے تھے' وہ ختم ہوگئیں۔قرآن یہ کہنے کے لیے آیا تھا۔یہ جو ہے کہ یورپ کا جس نے یہ مانا ہی نہیں ہے کہ کوئی ایسی قوت اور ہستی بھی ہے جو انسانی دنیا کے لیے بھی قوانین دیدے' اسے تو آپ کفر کہیے۔لیکن ایک ایسی صورت بھی ہے کہ خدا کو بھی مانتے چلے جائیں اور اس قسم کی قوتوں کو بھی ساتھ مانتے چلے جائیں' اسے شرک کہا جاتا ہے۔

خارجی کائنات میں خوف وحزن کی ساری بنیاد' اس شرک پر ہے جس کو Cause& Effect کے تحت سمجھا جا سکتا ہے

قرآن نے یہ کہا ہے کہ بدترین قسم کا خوف اور حزن شرک سے پیدا ہوتا ہے۔

ہر کہ رمزِ مصطفیٰ ﷺ فہمیدہ است
خوف را در شرک مضمر دیدہ است

جس نے قرآن کی تعلیم کو سمجھ لیا ہے وہ یہ جانتا ہے کہ خوف درحقیقت شرک کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے۔قرآنِ کریم نے شرک کو کس طرح سے مٹایا یہ تو آپ اس کے پہلے ورق سے آخر تک چلے جایئے' آپ کو نظر آئے گا کہ ہر جگہ' وہ شرک کی جڑ کاٹتا چلا جاتا ہے۔اب آپ کی سمجھ میں یہ بات آ گئی ہوگی کہ شرک یہ نہیں ہے کہ مندر میں جا کے آپ نے بت کے سامنے سجدہ کر لیا تو یہ شرک ہوگیا' مسجد میں آپ نے نماز پڑھ لی تو یہ توحید ہوگئی۔ یہ تو مظاہر ہیں ان دونوں چیزوں کے۔توحید یہ ہے کہ آپ اسے تسلیم کریں کہ باہر کی کائنات میں بھی ایک ہستی قانون ساز ہے جس کے قوانین کارفرما ہیں اور انسانی دنیا کے اندر بھی اسی ایک کے قوانین کارفرما ہیں۔اور دوسری چیز یہ مانیں کہ باہر کی دنیا ہو یا انسانوں کی زندگی' ہر چیز قانون کے تابع ہے' قانون کے ماتحت یہاں نتائج پیدا ہوتے ہیں' قانون کی خلاف ورزی سے نقصان ہوتے ہیں' تباہیاں آتی ہیں۔ایک خدا کے قوانین اور جو کچھ واقع ہوتا ہے' ان قوانین کے تابع۔خوف اور حزن تو ختم ہوگیا۔جو کچھ بھی ہو اس کے ماتحت دیکھنے کی بات یہ ہوگئی کہ کونسا قانون تھا' جس کے مطابق یہ ہوا اور کونسا قانون تھا جس کی خلاف ورزی سے ہم پر یہ تکلیف یا مصیبت آئی۔باہر کی دنیا کے متعلق تو اب کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں رہی کہ سائنس کے علوم نے اس چیز کو اس طرح عام کر دیا ہے کہ جو واقعہ بھی یہاں ہوتا ہے جو Effect بھی ہوتا ہے' اسکے پیچھے Cause ہوتا ہے اور Cause کو وہ معلوم کر رہے ہیں' کیے جا رہے ہیں۔

انسان کے سامنے اس کی زندگی عام طور پر نظروں سے اوجھل ہی رہتی ہے

جہاں تک انسانی زندگی کا تعلق ہے یہاں یہ چیز نگاہوں سے عام طور پر اوجھل رہ جاتی ہے' رہ سکتی تھی کہ معلوم نہیں کہ یہ کیوں ہوا' کیونکہ اس کے اسباب یہ جتنے Physical Laws ہیں ان کی طرح محسوس اور بدیہی طور پر سامنے نہیں آتے' چھپے ہوئے آتے ہیں۔ آج ہی ہمارے ساتھ جو ہوا' وہ کالک ملی گئی ہمارے مونہوں کے اوپر کہ جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔دو ہی قومیں تھیں جن کو ہم چودہ سو سال سے ذلیل ترین قومیں شمار کیا کرتے تھے۔یہودیوں کی قوم اور یہ ہندی بنیے کی قوم' پہلے ہمارے ساتھ یہ ہوا کہ یہودیوں کی ذلیل ترین قوم اور اس قوم میں بھی' عورت تھی حاکم' اس کے ہاتھوں پورے عالمِ عرب کو اتنے جوتے لگے کہ آج تک ان کی صدا آ رہی ہے۔اور اسکے بعد یہ دوسری ذلیل ترین قوم جو تھی وہاں بھی عورت ایک بیٹھی ہوئی ہے اور اس کے ہاتھوں سے ہمارے منہ پہ اتنی کالک ملی گئی ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ تسنیم و سلسبیل کا پانی بھی اسے نہیں دھو سکے گا۔

ہر انسان اپنے منہ پر کالک خود ہی ملتا ہے جس کی بنیادی وجہ حقائق سے انکاری اور توہم پرستی ہے

آج سمجھ میں بات نہیں آ رہی کہ یہ کیوں ہوا۔اس کہنے والے نے کہا تھا کہ یوں اس طرح سے مایوس نہ ہو حزن میں گرفتار نہ ہو۔

سنئے اس نے کیا کہا تھا وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ (42:30)

کوئی مصیبت تم پہ نہیں آتی بجز اس کے کہ وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔تو حزن کی کیفیت ختم ہوگئی 'یہ کیوں ہوا' سوال ہی نہیں ہے اپنے سے باہر کہیں جانے کا۔کتنا عظیم اصول دیا ہے نہ کوئی دیوی دیوتا نہ کوئی جن بھوت نہ کوئی خارجی قوت نہ کوئی غیر مرئی قسم کے احساسات' کچھ نہیں نہ کوئی باہر کا دشمن' کچھ نہیں' تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ (42:30)۔عظیم اصول ہے۔اب جس قرآن نے یہ تعلیم دی ہو کہ باہر کی کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے' وہ بھی Cause & Effect کے ماتحت ہوتا ہے وہاں جو کچھ ہو یہ دیکھو کہ اس کے لیے کیا Cause تھا' علومِ سائنس کی رو سے دیکھو۔ تمہارے اپنے معاشرے کے اندر کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کے لیے بھی یہ کچھ نہ کرو کہ اسے کسی غیر مرئی قوت کی طرف منسوب کر دو یہ ڈھونڈنا شروع کر دو کہ پتہ نہیں! ایسا کیوں ہوا ہے۔وہ کہتا ہے کہ 'کیوں' کیا ہوا ہے!! جو کچھ تم پہ مصیبت آتی ہے تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔اپنے ہاتھوں کو دیکھو کہ یہ مصیبت کیسے لائے ہیں۔اب ظاہر ہے کہ اس قسم کی تعلیم جس قوم کو مل جائے ان کے لیے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کیفیت جو عہدِ جاہلیت میں انسان کی تھی۔عہدِ جاہلیت میں کیوں کہوں' اس جاہلیت کا عہد تو انسان کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔جہالت کا جو نتیجہ تھا کہ کوئی غیر مرئی قوتیں ہیں جن کی وجہ سے یہ ہوتا ہے اور پھر ان کی تعظیم شروع ہوگئی ان کی' پرستش شروع ہوگئی' ان کو خوش کرنا شروع کیا' ان کو نظر نیاز دینی شروع کر دیے' ان کے پاس قربانیوں کے لیے چلے گئے' ان سے دعائیں کرانی شروع کر دیں۔یہ سارا قصہ ختم ہوگیا۔کچھ حاصل کرنا ہے' قانون کے مطابق زندگی بسر کرو' نتیجہ مل جائے گا۔نقصان ہوا ہے تو یہ دیکھو کہ یہ ہمارا ہی اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا ہے اس کی تحقیق کرنے بیٹھ جاؤ' بات ختم ہوگئی۔کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے کسی غیر مرئی قوت کی طرف جانے کی ضرورت نہیں ہے۔یہ جو چیز تھی کہ کسی غیر مرئی قوت کی طرف جائے اس کا پہلا جذبہ' جیسا میں نے عرض کیا' تعظیم کا ہوتا ہے' احترام کا ہوتا ہے کہ کہیں یہ ناخوش نہ ہو جائے۔ان لوگوں کی کیفیت یہ تھی دست پروردگانِ رسالت ﷺ کی اس طرح سے توحید ان کے سامنے واضح ہو کر آئی تھی کہ انہوں نے کہیں' یہ محسوس اگر ہوتا تھا کہ شاید کسی وقت اس راستے سے کہیں وہ شرک کی کیفیت نہ پیدا ہو جائے' اس کی جڑ کاٹ دیتے تھے وہ لوگ۔سب سے زیادہ قابلِ احترام ہستی نبی اکرم ﷺ سے بڑھ کر کون ہو سکتی تھی۔آج بھی ہمارا ایمان ہے' قیامت تک یہ ایمان رہے گا کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔کیفیت کیا تھی ان لوگوں کی؟

بیعت رضوان کے سلسلہ میں درخت کو مقدس سمجھے جانے کے خطرے کے پیشِ نظر درخت کو کاٹ دینے کا حکم

حضرتِ عمرؓ نے یہ دیکھا کہ حج کی تقریب پہ جو لوگ آتے ہیں راستے میں ایک مقام پہ ایک درخت ہے لوگ جا کے اس کے نیچے دو نفل پڑھتے ہیں۔ نماز ہی پڑھتے تھے وہ کوئی بت پرستی نہیں وہاں کرتے تھے وہ درخت کے سامنے ڈنڈوت نہیں بجالا رہے تھے وہاں جا کے دو نفل پڑھتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ تعلیمِ نبوی ﷺ نے اور قرآن کے حقائق نے کیا نگاہیں پیدا کر دی تھیں ان کی۔ آپؓ کھڑے ہوئے اور لوگوں سے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ وہ درخت ہے جس کے نیچے رسول اللہ ﷺ نے بیعت لی تھی لوگ اسے متبرک سمجھتے ہیں اور اس کے نیچے جا کے نماز پڑھنے کو ثواب کا موجب سمجھتے ہیں۔ اُنہوںؓ نے کہا کہ ٹھیک ہے لگی پڑنے طرح اس شرک کی کہ ان یادگاروں کا قائم رکھنا کتنا ضروری سمجھا جاتا ہے اور کتنا یہ عظیم واقعہ تھا بیعتِ رضوان کا کہ اس کو یاد کے طور پہ ہی رکھا جاتا۔ لیکن جو یادگار شرک پر منتج ہوتی ہے آپ سوچئے کہ یہ کتنی بڑی جذباتی چیز تھی۔ لیکن انہوںؓ نے دیکھ لیا کہ یہ چیز ایک دن آگے چل کر ایک آستاں بن جائے گا لوگوں کو شرک کی طرف لے جانے کا۔ آپ حیران ہونگے کہ حضرتِ عمرؓ نے اس درخت کو جڑ سے کٹوا دیا اب اس کا پتہ بھی نہیں ہے کہ وہ درخت کہاں ہوتا تھا۔ یہ تھی تعلیم جو اس قرآن نے دی تھی۔ اور اس کے بعد پھر ورق الٹ دیے چودہ سو سال چودہ سو سال تو میں اس لیے کہتا ہوں کہ ہم اپنے دور میں آجائیں ورنہ یہ تو اس کے بہت پہلے شروع ہو گئی تھی بات۔ آج دیکھئے اس ابتدائی دور کا انسان اتنے اتنے آستانوں میں جا کے ماتھے نہیں رگڑتا تھا جتنے آستانوں پہ آج اس قرآن کی حامل قوم جا کے سجدے کرتی ہے۔

ہمارے ہاں آج کے دور میں بڑے بڑے مہذب تعلیم یافتہ حضرات کی حالتِ زار

پہلے ہم سمجھا کرتے تھے کہ یہ صاحب بیچارے گاؤں والے جاہل لوگ ہیں ان کی زندگی اس قسم کی ہے۔ گاؤں میں تو جا کے آپ دیکھئے کوئی کیکر کا درخت نہیں جس پہ سندور نہیں لگایا ہوا ہوگا اس کی شاخوں کے ساتھ انہوں نے دھجیاں نہیں باندھی ہوئی ہونگی کوئی اونچا سا ٹیلہ نہیں ہوگا جس کے اوپر ایک جھنڈی نہیں کھڑی ہوگی اور اس پہ دیا نہیں جلایا جائے گا اور مزاروں کا تو آپ پوچھئے ہی نہیں پھر کہ کیا کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن یہ ان جاہل گنواروں کی بات نہیں ہے آپ کے مہذب ترین شہروں کے اندر بڑا بڑا تعلیم یافتہ طبقہ جسے آپ کہتے ہیں یوں تو ہر روز ورنہ جمعرات کی شام کو آپ دیکھ لیجیے شہر میں کونسا اونچا ٹیلہ ہے کہ جہاں جا کے سجدے نہیں کیے جاتے کونسی چونے گچ کی عمارت ہے کہ جہاں جا کے مرادیں نہیں مانگی جاتیں وہاں دھجیاں نہیں باندھی جاتیں وہاں سہرے نہیں لٹکائے جاتے وہاں نیازیں نہیں دی جاتیں۔ اکثر لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ اس سے پہلے پاکستان بننے سے پہلے یا ابتدائی دنوں میں اتنا زیادہ رجحان لوگوں کا نہیں تھا وہی

جاہل لوگ جاتے تھے عام طور پر عورتیں۔ لیکن اب تو پوچھو نہیں' تانتا لگا ہوا ہے اور یہ سارے وہ موٹروں والے اور وہ بڑے بڑے پڑھے لکھے بڑے بڑے امراء۔ اور اتنا زیادہ کثرت میں یہ کیوں ہو گیا؟ بات بڑی واضح ہے۔ جتنی جتنی معاشرے میں لاقانونیت پھیلتی جائے گی۔ قانون کے مطابق کسی کا کام نہیں ہوگا' وہ اس لاقانونیت کی طرف بھی آتا چلا جائے گا کہ اس طریقے سے تو میرا حق مجھے نہیں ملتا یا جو کچھ میں لینا چاہتا ہوں حق یا ناحق' نہیں ملتا۔ چلئے ان بزرگوں سے دعائیں کرائیں ان سے جا کے مرادیں مانگیں۔

قوم کو حضرت صاحب کے اس غلط تصور نے ان گنت نفسیاتی بیماریوں میں الجھا رکھا ہے

وہی عہدِ اول کا انسان جو تھا غیر مرئی قوتوں کی طرف جاتا تھا۔ احترام پیدا ہوا' احترام کے بعد پھر ڈر پیدا ہوا۔

ڈر کی کیفیت یہ ہے آپ وہاں جا کے دیکھئے اس سجدہ کرنے کے بعد اس طرف پشت کر کے نہیں مڑتے' پچھلے پاؤں لوٹتے ہیں۔ حضرت صاحب کے متعلق اپنے کمرے میں تنہائی میں بیٹھے ہوئے دل کی گہرائیوں میں بھی اگر کوئی خیال ایسا گذر گیا ہے کہ ان کی یہ حرکت اچھی نہیں تھی' کپکپا اٹھتے ہیں' ڈرتے ہیں' سہمتے ہیں' روتے ہیں' چیختے ہیں۔ وہاں جا کے کہتے ہیں یا حضرت معاف کر دیجیے مجھے بخش دیجیے' میں مارا گیا' میں تباہ ہو گیا۔ حضور کے متعلق دل میں گستاخی کا خیال اتر گیا۔ جس قوم کی یہ حالت ہو کہ وہ اینٹوں اور سیمنٹ کے ڈھیر سے ڈر رہی ہو جس کی کیفیت یہ ہو کہ قدم شریف کا ایک میلہ لگتا ہے' دھرم شالہ سے چلتا ہے' ڈھول بجا رہے ہیں جھنڈے ساتھ ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں۔ راستے میں وہ مقام کرتا ہوا چلا جاتا ہے' کہاں مقام کرتا ہے؟ قدم شریف پہ۔ یہ قدم شریف کیا چیز ہے؟ ڈیرہ غازی خان میں سخی سرور کا مزار ہے وہ بزرگ مشہور ہے کہ وہ وہاں اس پہاڑ سے چلے تھے' راستے میں جہاں جہاں انہوں نے قیام کیا' وہ قدم شریف ہو گیا۔ اب وہ جو سنگ چلتا ہے ڈیرہ غازی خان کے سخی سرور کے مزار پہ پہنچتا ہے۔ راستے میں لوگ ساتھ جمع ہوتے جاتے ہیں۔ جہاں جہاں انہوں نے قیام کیا وہیں وہیں وہ قیام کرتے ہیں' وہاں وہ سجدے کرتے ہیں۔ دلی کی شاہی جامعہ مسجد کے ساتھ حجرے کے اندر ایک پتھر رکھا ہوا تھا اور کونسا مقام ہے جہاں پتھر نہیں ہے' کیا ہے جی؟ قدم شریف ہے۔ پتھر کے اوپر ایک قدم کا نشان یہ منسوب تھا نبی اکرم ﷺ کی طرف کہ حضور ﷺ کا یہ قدم ہے۔ خانۂ خدا میں مسجد کے اندر ہر جمعرات کو وہ وہاں سے نکالا جاتا تھا اور وہاں پھر سجدہ کعبے کی طرف رخ کر کے' خدا کے لیے نہیں کیا جاتا تھا اس قدم شریف کو کیا جاتا تھا۔ یہ ایسا نہ کہیے کہ وہ لوگ کرتے ہیں ہم نہیں کرتے' پوچھو نہیں ہم کیا کچھ کرتے ہیں۔ کیفیت ساری قوم کی یہ ہو گئی کہ

راہ مدہ اقبال را در کعبہ اے شیخ حرم
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

بلکہ اس سے بھی آگے کہ

آج ہم قدم قدم پر مختلف قسم کے خوف وحزن کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر

میری تو کیفیت یہ ہے کہ میری فکر کے بت کدے میں ہر آن ایک نیا بت تراشا جاتا ہے

رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

ایک زنجیر سے میں رہا ہوتا ہوں ایک اور زنجیر کے اندر جا کے پھنس جاتا ہوں۔

ساری قوم اس شرک کے اندر مبتلا ہے۔ اور جب اس کی کیفیت یہ ہوگئی ہے تو اس کے بعد آپ سوچئے کہ یہ خوف اور حزن کے اندر مبتلا کیوں نہیں ہوگی۔ آج جو آپ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ آپ کیوں پٹ گئے کیوں یہ ذلت آپ کے نصیب ہوگئی وہ اس لیے ہوا کہ آپ نے ان حوادث کے متعلق دور سے سوچنا بند کر دیا تھا کہ یہ ساری چیزیں قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتی ہیں۔ جہاں اس قانون کا دامن ہاتھ سے چھوٹا تباہیاں آجائیں گی۔ کیفیت آپ کی یہ ہوگئی ہے کہ محسوس طور پہ سامنے نظر آتا ہے۔

1965ء کی جنگ کے مجاہدین کی قربانیوں نے ہمیں ہندوؤں کی غلامی سے بچایا تھا

1965ء کی جنگ میں تو آپ نے دیکھ لیا تھا کہ ہمارے ان مجاہدوں نے کس طرح سے ان آنے والوں کے چھکے چھڑائے تھے کس طرح یہاں راوی کے اوپر لڑائیاں ہوتی تھیں ٹکراؤ ہوتے تھے ان طیاروں کے اور کس طرح گولہ باری سے ان ایک ایک کو گراتے تھے۔ مجاہدوں نے سرحدوں کے اوپر کس طرح ان کو شکست فاش دی تھی۔ سامنے نظر آرہا تھا کہ خدا کے بتائے ہوئے قانون اور قاعدے کے مطابق یہ ہو رہا ہے۔ اس نے قانون یہ بتایا تھا کہ امن چاہتے ہو تو اپنی سرحدوں کو اتنا مضبوط رکھو کہ دشمن کے دل میں تمہارا رعب طاری رہے یہ قرآن نے کہا تھا۔ یہ کچھ 1965ء کی جنگ میں ہمارے مجاہدوں نے کر کے دکھایا۔ لیکن ہمیں تو اطمینان ہوتا ہی نہیں تھا۔ افسانے شروع ہو گئے کہ سفید گھوڑیوں والے سبز عماموں والے اتر رہے تھے ان کی وجہ سے یہ ہوا۔ یعنی پھر آپ قاعدے قانون سے نکل کے چلے گئے وہیں پرستشوں کے اوپر۔ وہاں سے حضرت صاحب چلے تھے اور وہاں سے پیر صاحب نے یہ کہا تھا۔ بلکہ یہاں تک افسانہ مشہور تھا کہ خود نبی اکرم ﷺ تشریف لے آئے تھے۔ چلیے ان افسانوں کے اوپر۔ اور جب یہ افسانے اور تو ہم پرستیاں تھیں اسی کی وجہ سے اس جنگ کے اندر نہ کوئی سبز عمامے والا آپ کے پاس آیا' نہ کوئی سفید گھوڑی والا آپ کے پاس آیا' کہاں گئے۔

یورپ کے مقابلے میں ہمارے مصائب کی بنیادی وجہ جہالت پر مبنی شرک ہے

آج بھی ہم سے یہ نہیں کہا جاتا کہ بیٹھو اور سوچو۔ خدا نے یہ کہا تھا کہ **مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ** (42:30) جو مصیبت بھی آتی ہے، بیٹھ کے سوچو کہ ہماری اپنی لائی ہوئی، سوچو کیسے ہم یہ مصیبت لائے ہیں۔ اب بھی نہیں یہ کہا جارہا اب بھی نگاہوں کے رخ اسی طرف دوڑائے چلے جارہے ہیں۔ تو سیدھی سی بات ہے کہ جو قوم اتنے بڑے شرک کے اندر مبتلا ہو۔ میں نے عرض کیا ہے کہ کفر ہوتا تو یہ بات نہ ہوتی یورپ کے سائنسدانوں کے ہاں کفر ہے۔ ہمارے ہاں شرک کی صورت یہ ہے کہ ہر شخص خدا کو مانتا ہے اور ہر شخص یہ کرتا ہے کوئی کسی مقام پہ کوئی کسی مقام پہ، کسی کا معبود کوئی ہے کسی کا کوئی اور ہے۔ عہدِ جاہلیت کے انسان نے ابتداء کی اس چیز کی، اس کے بعد کچھ کاروباری لوگ پیدا ہوئے انہوں نے کہا کہ بہت عمدہ سودا ہے یہ، ان کی جہالت کو Exploite کرو۔ یہ تھے آپ کے ہاں کے مذہبی پیشواء یہ تھے آپ کے ہاں پیرانِ طریقت، یہ تھے ان قبروں کے مجاور۔ Exploite کرو، کس طرح سے Exploite کرو؟ وہ یہ نہیں کہتے کہ جو کچھ لاؤ ہمارے لئے لاؤ، نہ! حضرت صاحب کی نیاز، اللہ کی نیاز۔ آپ نے غور فرمایا پھر کہ اس کو Perpetuate کرنے کے لیے، اس کو دوام بخشنے کے لیے، اس جہالت اور شرک کو یہ Exploite کرنے والے آ گئے ان کی وجہ سے یہ دوام ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں آج بھی جن کو بڑے بڑے آستانے کہا جاتا ہے کہ وہاں مرکز ہیں مرادیں پورے ہونے کے، بڑے بڑے کتبے اور قبریں ان کی مٹا دیجیے زمین کے برابر کر دیجیے اور جو مجاور بیٹھے ہوئے ہیں ان کو نکال دیجیے کسی کو یاد ہی نہیں ہوگا کہ یہاں سے بھی مرادیں ملا کرتی تھیں۔ وہ کہیں گے کہ یہاں بھی ٹٹو باندھا کرتے تھے، اب بھی گھوڑے باندھو۔ یہ ہیں جو اوپر بیٹھے ہیں ان کا یہ پروفیشن ہو جاتا ہے پھر، اس پروفیشن کی خاطر پھر ان کے ہاں یہ ہوتا ہے خدا کے لیے دو، حضرت صاحب کے لیے دو۔ اور یہ دونوں جاتے کہاں ہیں؟ دونوں ان کے ہاں جاتے ہیں۔ کہیے ان سے تو کہتے ہیں ہم تو پوسٹ آفس ہیں آپ سے لیتے ہیں، وہاں بھیجتے ہیں۔ ان سے کہا کہ ٹھیک ہے پوسٹ آفس والا تو دس روپے کا منی آرڈر دیجیے دو آنی اس میں سے لیتا ہے اور آپ تو دس کے دس لے جاتے ہیں۔

خدا کے نام پر، حضرت صاحب کے نام پر کیے جانے والے کاروبار کی نوعیت

یہ تقسیم کر رکھی ہوتی ہے خدا کے نام کی حضرت صاحب کے نام کی۔ **وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا** (6:136)

کہتا ہے ان کی کیفیت یہ ہے کہ مجاور بن کے بیٹھے ہیں۔ کہتے ہیں اچھا لائے ہیں بھئی، ٹھیک ہے بھئی! یہ اللہ کا حصہ یہ حضرت صاحب کا حصہ۔ یعنی ان کا اپنا کچھ نہیں ہے۔ **فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ** (6:136) کہتے ہیں سیدھی بات ہے جو کچھ

تو یہ حضرت صاحب کا نکال لیتے ہیں وہ تو اللہ کی طرف جاتا نہیں ہے کیونکہ وہ تو پہلے ہی کہہ دیا کہ حضرت صاحب کا ہے۔ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ (6:136) اور جو اللہ کا کہتے ہیں وہ بھی ان کو مل جاتا ہے اس لیے کہ وہ اللہ کے پاس کہاں پہنچتا ہے۔ کہتا ہے سوچتے ہو یہ کرتے کیا ہیں 420۔ پہلی چیز تو یہ کہ ہمارے لیے کچھ نہیں ہم نے کیا کرنا ہے آپ لائے ہو' ہم تو بھیجنے والے ہیں یہ حضرت صاحب کا ہے' یہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ دیکھئے اللہ میاں کہتا کس انداز سے ہے!! کہتا ہے سنتے ہو یہ کرتے کیا ہیں یہ۔ جو ان کے حضرت صاحب کا ہے وہ بھی اپنا اور جو اللہ کے لیے نکالا ہوا ہے' وہ بھی اپنا۔ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (6:136) کس انداز سے چار سو بیس یہ کرتے ہیں۔ روز ہوتا ہے یہ۔ یہ جو دو ٹکڑے ہیں کبھی آپ نے غور کیا ہوگا یہاں تو خیر کم آتے ہیں ایسے فقیر' شہروں میں اب بھی پھرتے ہیں' نذر اللہ نیاز حسین۔ دیکھتے ہیں یہ دو کیوں رکھے ہوتے ہیں الگ؟ وہ یہ دو حصے الگ الگ کرنے کے لیے کہ کہیں لانے والے کے ذہن میں یہ نہ ہو جائے کہ ''سارے دا سارا ای لے گیا اے'' پہلے ہی الگ کر کے رکھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے یہ دیکھئے اس طرح سے الگ کر کے یہ تو ان کا ہو گیا اور یہ جو ہے یہ بھی ان کا ہو گیا پھر۔ کہتا ہے جب یہ چیزیں پروفیشن بن جاتی ہیں تو پھر جو پروفیشن ہوتا ہے یہ Secrets ہوتے ہیں Trade کے۔ یہ کچھ کرتے ہیں۔

قرآنی تعلیم کے برعکس مختلف اعتقادات کی پختگی کا نتیجہ بچوں کو ذبح کرنے تک جا پہنچتا ہے

وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ (6:137)

کہتا ہے یہاں تک ان کو پختہ کر دیتے ہیں اپنے ان اعتقادات میں کہ اولاد جیسی عزیز شے بھی آ کے ان آستانوں پہ وہ ذبح کر دیتے ہیں۔ انتہا ہے یہ۔ اب تو یہ واقعات کم ہو گئے لیکن پھر بھی آپ نے سنے ہونگے کبھی کبھی آیا کرتے ہیں وہ فلاں کو خواب میں اس نے بشارت دیکھی اور حکم دیکھا اور صبح اٹھ کے اپنے بچے کو ذبح کر دیا۔ یہ آیا کرتے ہیں واقعات' اب بھی آتے ہیں یہ واقعات۔ اور یہ تو ذبح وہ ہے جو چھری سے ذبح کرتے ہیں' جو اس کی پوری زندگی کو ذبح کرتے ہیں۔ یہ تو آپ نے دیکھے ہونگے یہاں تو خیر پتہ نہیں ہوتے ہوں۔ یہ جو فلاں پیر کے بالکے بناتے ہیں پہلا بچہ جو ذرا Deform سا پیدا ہو جاتا ہے' شاہ دولا کا چوہا بناتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ اس کا علاج کیا جائے اس کو چوہا بنا دیتے ہیں۔ وہاں یو پی میں میر مدھو کے بالکے بنایا کرتے تھے۔ یعنی ایک بچے کو وقف کر دیتے تھے اس مزار کے اوپر چڑھاوا چڑھانے کے لیے۔ وہ چھری سے ذبح تو ایک منٹ میں ہو جاتا تھا یہ ساری عمر کا ذبح کرنا ان کے ہاں ہوتا تھا بچوں کو۔ وہ بچے پھر بھیک مانگتے تھے ان سب کے لیے۔ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ (6:137) کہا یہ عجیب بات ہے یہ سارا کچھ کرتے ہیں دین کا نقاب اوڑھا کر مذہب کے رنگ میں۔ یہ کیفیت یہ لوگ پیدا کر دیتے ہیں۔ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ (6:137) ٹھیک ہے ہمارا تو قانونِ مشیت یہ ہے کہ ہم زبردستی تو کبھی روکتے نہیں' ان کو اختیار و ارادہ دیا ہے۔ اس لیے ٹھیک

ہے یہ افتراء پردازیاں ہیں جو خدا کے خلاف یہ نکالتے ہیں کہ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

کوئی شخص اپنے پیر کی سواری پر سواری بھی نہیں کر سکتا اور کوئی عورت نیاز کی چیز نہیں کھا سکتی

اور آگے چلو وَ قَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّ حَرْثٌ حِجْرٌ لَّا یَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَ اَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَ اَنْعَامٌ لَّا یَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا افْتِرَآءً عَلَیْهِ ؕ سَیَجْزِیْهِمْ بِمَا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ (6:138)

اور پھر اس کے بعد یہ جانور ہے اس کے اوپر فلاں سوار نہیں ہوگا۔ یہ چیزیں بھی ہمارے ہاں ہوتی تھیں۔ گاؤں میں' کوئی گھوڑی جس پہ کبھی پیر جی نے سواری کر لی ہو وہ چلے گئے ہوں تو اس کے بعد تو انتہائی گستاخی تھی کہ کوئی اور اس گھوڑی پہ سوار ہو جائے۔ اب وہ کوتل ہے چھوڑا ہوا ہے اسے' اس سے کوئی کام نہیں لیا جاتا وہ حضرت صاحب کا گھوڑا ہو جاتا ہے کہ اس پہ کوئی سواری نہیں کر سکتا۔ کہتا ہے یہ کیفیت ان لوگوں کی ہوتی ہے۔ کہا اس قسم کی تو ہم پرستیاں پھر آگے نکل آتی ہیں ان کے ہاں۔ وَ قَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَ مُحَرَّمٌ عَلٰۤی اَزْوَاجِنَا ۚ وَ اِنْ یَّكُنْ مَّیْتَةً فَهُمْ فِیْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَیَجْزِیْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ (6:139) اور آگے بڑھتے تھے کہ یہ جو نیاز دی جا رہی ہے نا بھئی! یہ صرف مرد کھا سکیں گے' عورتیں نہیں کھا سکیں گی۔ اب آپ احباب کے لیے شاید یہ باتیں کچھ تعجب انگیز سی ہوں۔ یہاں اب یہ چیزیں یوں نہیں ہوتیں' ہمارے ہاں ہوتی تھیں۔ اور ہمارے ہاں میں خاص طور پہ ہم لوگ تو بالکل نئے نئے مسلمان ہوئے تھے شاید دو پشتیں ہی ہوئی ہونگی۔ میری اپنی ایک نانی ہندنی تھی آخر تک۔ دو ہی پشتیں ہوئی ہونگی اور اب یہاں کہنا پڑا اور وہ بھی یہ ہندوؤں میں بھی' یہ راجپوتوں کی ذاتیں ہوتی ہیں۔ یہ بڑے ان معاملوں کے اندر گاڑھے اکھڑ ہوتے تھے۔ تو مسلمان ہو گئے ہوئے تھے۔ دو پشتیں ہو چکی ہوئی تھیں۔ پیدا ہونے سے لے کے مرنے تک ساری رسومات اس گاؤں میں جس طرح سے کہ وہ کرتے تھے۔ جو مسلمان نہیں ہوئے تھے' اسی طرح سے ہمارے گھروں میں ہوتی تھیں۔ یہی چیز جو ہے یہ نیاز مرد کھا سکتے ہیں عورتیں نہیں کھا سکتیں' بچے جو ہیں بالکے بنے ہوئے ہیں ان کے اوپر جا کے' یہ کچھ کیا جا رہا ہے اور اب بھی ہمارے وہاں یہی کچھ ہوتا چلا جاتا ہے۔ عورتیں نہیں کھا سکتیں۔

خود فریبیوں کی بنا پر توہم پرستی اپنے اندر کئی پہلوؤں کو جنم دیتی ہے

وہ آپ کو تو معلوم ہی ہے عورتوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے' ہندوؤں کے ہاں جا کے دیکھئے کیا کیا چیزیں ہیں' عورتیں جو نہیں کھا سکتیں۔ قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ (6:140) کہتا ہے کہ سوچئے تو سہی خدا نے جن چیزوں کو اس طرح سے حلال قرار دیا تھا' اسے اس طرح سے حرام قرار

دیا جاتا ہے۔ اولاد تک کو قتل کر دیا جاتا ہے اس سے زیادہ خودفریبی اور کیا ہوگی۔ سَفَهًا کا لفظ آیا ہے خودفریبی جسے کہتے ہیں۔ کس قدر خود فریبی ہے جس کے ماتحت انسان یہ کچھ کرتا ہے۔ کوئی دوسرا کسی کے بیٹے کو تھپڑ مارے، وہ اس کا سر پھوڑ دیتے ہیں۔ عدالت تک میں چلے جاتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو ذبح کر دیتے ہیں اور بڑا ثواب کا کام سمجھتے ہیں، کتنی بڑی خودفریبیاں ہیں۔

خدا تعالیٰ کا نظام ربوبیت تو پوری نوع انسانی کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے

کہا اللہ کی طرف اسے منسوب کرتے ہیں۔ جس اللہ کی کیفیت یہ ہے وَهُوَ الَّذِیٓ اَنۡشَاَ جَنّٰتٍ مَّعۡرُوۡشٰتٍ وَّ غَیۡرَ مَعۡرُوۡشٰتٍ وَّ النَّخۡلَ وَ الزَّرۡعَ مُخۡتَلِفًا اُكُلُهٗ وَ الزَّیۡتُوۡنَ وَ الرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ غَیۡرَ مُتَشَابِهٍ (6:141) کہ صفحۂ ارض کے اوپر دیکھو تو سہی یہاں سے وہاں تک لہلہاتی ہوئی کھیتیاں، یہ ثمر بار درخت، یہ انگور یہ کھجوریں، انواع واقسام کے یہ میوے، سارے کے سارے پھیلا دیے اور اس نے کسی درخت پہ یہ نہیں لکھا کہ اس میں سے مرد کھائیں گے، عورت نہیں کھائے گی یہ مخصوص ہے کسی خاص پیر جی کے لیے۔ بکھیر دیا سب کے لیے پورے انسانوں کے لیے یہ سب کچھ اگا دیا اور کہا كُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ (6:141) کھاؤ جب اس پہ پھل آ جائے تو۔ کسی کو شجرِ ممنوعہ نہیں قرار دیا ہم نے، کہیں کوئی پابندی نہیں لگائی۔ بس ایک ہی پابندی تھی اور تھوڑی سی، سنئے عزیزانِ من! کھاؤ پیؤ وَ اٰتُوۡا حَقَّهٗ یَوۡمَ حَصَادِهٖ (6:141) بس اتنی سی بات کہ جب فصل کو کاٹو، اس کا حق دیدیا کرو۔

ہم نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے جو حقیقت پر مبنی نہیں

بڑی عجیب چیز یہاں آئی ہے حَقَّهٗ۔ یہ ہمارے ہاں روزمرہ کی گفتگو میں آپ دیکھیں حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ یعنی ایسے یہ چیزیں ہم مان لیتے ہیں، جیسے مسلمات ہوتے ہیں۔ حقوق کی دو کیٹگریز ہم نے کر رکھی ہیں۔ یہ حقوق اللہ ہیں یہ حقوق العباد ہیں۔ حقوق اللہ نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ یہ حقوق اللہ ہیں۔ حقوق العباد: لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرو، خیرات دو، یہ سب کچھ۔ ان سے پوچھو کہ حقوق اللہ کا کہیں لفظ بھی آیا ہے کسی جگہ۔ یہ اللہ کا حق یعنی نماز پڑھ لی ہم نے ایک اللہ کا حق تھا، ادا کر دیا۔ یہ حقوق اللہ کا لفظ نہیں آیا، یہ تقسیم ہی کہیں نہیں ہے۔ دین آیا اس لیے ہے کہ حقوق العباد سکھائے۔ اللہ تمہارے حقوق کا محتاج ہے؟ حقوق سارے انسانوں کے ایک دوسروں کے اوپر ہیں۔ دین آیا ہی یہ سکھانے کے لیے ہے کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کے اوپر جو حق بنتا ہے اسے کس طرح سے ادا کیا جائے۔ اور جن چیزوں کو ہم اس طرح سے عبادات کہتے ہیں، وہ بھی درحقیقت ان حقوق العباد کے لیے ہی تعلیم وتربیت سکھانے والی چیز ہے۔ سارا دین انسانوں کو آپس میں رہنا سہنا سکھاتا ہے۔ جیسا کہ میں اکثر کہا کرتا ہوں اگر ایک شخص کہیں باہر جنگل میں، غار میں جا کے رہے اسے نہ دین کی ضرورت ہے، نہ دین کے احکام کی ضرورت ہے، نہ اقدار کی ضرورت ہے، سوال ہی نہیں۔ یہ تو سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب

ایک انسان کا دوسرے انسان سے معاملہ پڑے۔ وہاں یہ سارے قاعدے قانون اقدار اصول' یہ ساری پابندیاں اس وقت سامنے آتی ہیں جب ایک انسان کا دوسرے انسان سے معاملہ پڑے۔ اللہ تو **غنی عن العلمین** ہے مستغنی ہے ان چیزوں سے۔

خدا تعالیٰ کو انسانوں سے اپنا حق مانگنے کی ضرورت نہیں یہ تو سب کچھ ان انسانوں کے لیے ہے جن کو اس کی ضرورت ہوتی ہے

سارے قرآن میں ایک جگہ یہ چیز آتی ہے جسے **حَقَّهٗ** (6:141) کہا ہے پیچھے سے بات چلی آتی تھی کہ یہ لوگ نکالتے ہیں' یہ خدا کو دیدو اور یہ سب کچھ اس کو دیدو۔ یہ کیا ہے؟ یہ اس کا حق کہاں جائے گا؟ اس نے کہا کہ یہ حق جو اس کا ہے یہ (دوسرے مقام پہ اس نے یہ کہا ہے) کہ یہ جتنی چیزیں ہم نے دی ہیں جس کو حق کہا جاتا ہے یہ جتنے بھوکے ہیں ان تک پہنچا دو ہمارا حق ادا ہو جائے گا۔ آپ دیکھتے ہیں اس Term میں گفتگو چونکہ ہو رہی تھی کہ یہ کہتے ہیں یہ خدا کا حصہ ہے یہ **شرکآء** کا حصہ ہے وہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے فصل کاٹتے ہو تمہارا حق ہے یہ' اس میں سے تم کہتے ہو کہ کچھ خدا کا بھی حق ہے۔ تو خدا کا حق یہ ہے کہ یہ جو محتاج ہیں یہ مسکین ہیں' یہ بھوکے ہیں یعنی جو اپنی محنت سے اپنے لیے رزق حاصل نہیں کر سکتے' انہیں دیدیجیے۔ (56:73) کتنا دیدیجیے اب یہ آیا سارا سوال۔ ''اسی تے اوہدے اچوں اک چنگ کڈنے ہیگے آں ناک مٹھی'' فقیر کو دینے کے لیے۔ اس نے کہا یہ نہیں۔ **یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ** (2:219) پوچھتے یہ ہیں کہ کتنا دیدیں ضروریات کے لیے' کہا **قُلِ الْعَفْوَ** (2:219) جتنا تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے سب کا سب۔ رکھنا کا ہے کے لیے ہے تم نے۔ ہم نے اس کو **للانام** (55: 10) پیدا کیا ہے سارے رزق کو تمام نوعِ انسانی کی ضرورت کے لیے **سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ** (41: 10) ضرورت پوری کرنے کے لیے ہے اپنی ضرورت پوری کرو اس سے زائد اسے دو جس کی ضرورت رکی ہوئی ہے (2: 177) بات صاف ہوگئی۔ کہا یہ ہے **حقه** جسے تم اگر حق ہی کہنا چاہتے ہو تو یہ ہے حق۔ یہاں کن الفاظ میں کہا **وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ وَ لَا تُسْرِفُوْا ط اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ** (6:141) ضرورت سے زائد نہ لو اس میں سے' یہ اسراف ہے۔

لفظ اسراف کا لغوی قرآنی مفہوم جو بڑا معنی خیز اور بصیرت افروز ہے

عجیب لفظ ہے عربوں کے ہاں یہ اسراف جسے ہم کہتے ہیں۔ ہم تو کہتے ہیں نا فضول خرچی۔ اور فضول خرچی کی تو کوئی حد نہیں جو کچھ بھی کوئی خرچ کرتا ہے آپ کے نزدیک وہ فضول خرچی ہوئی وہ اس کے Justification دے گا۔ یہ فضول خرچی کیا ہوتی ہے؟ کنویں سے پانی دیا جاتا ہے کھیتوں کو' اس کے بنائی جاتی ہیں نالیاں ''آ ڈاں جنوں کہندے نیں'' اسے ایسا بنایا جاتا ہے کہ وہ پانی اس میں سے بہتا ہو کھیت تک پہنچ جائے اور کھیت میں بھی کھیت کی ضرورت کے مطابق پانی دیا جاتا ہے۔ اگر پانی کم آ جائے تو پھر بھی کھیتی نہیں

ہوتی اور اگر پانی اس سے زیادہ دیا جائے تو جب بھی مر جاتی ہے کھیتی۔ اس کی ضرورت متعین ہے قانونِ فطرت کی رو سے۔ اب کھیت میں اس سے زیادہ تو دیا نہیں جاتا' جو دے گا کسان نقصان اٹھائے گا۔ ضرورت سے زیادہ اپنے کھیت میں پانی جمع کرنے والا' کھیتی گل جائے گی۔ راستے میں یہ جو نالیاں جارہی ہیں اگر یہ اس قسم کی ہوں کہ یہاں سے بھی پانی بہہ رہا ہے' یہاں سے بھی نکل رہا ہو' وہاں سے بھی نکل رہا ہو تو یوں جو پانی نکل جاتا ہے کہ نہ اس کھیت تک پہنچ رہا ہے نہ کسی دوسرے کے کام آ رہا ہے' اسے اسراف کہتے ہیں عربی زبان میں۔

قدرت کی طرف سے پیدا کردہ نعمائے خداوندی کا مقصد انسانوں کی ضروریات پورا کرنا تھا نہ کہ سامان تعیش فراہم کرنا

یہ ٹھیک ہے فصل ہے ڈھیر لگ گیا اناج کا' خود کھاؤ پیؤ اپنی ضرورت سے جو زائد ہے ضرورت مندوں کو دیدو۔ اور یہ چیز نہ کرو کہ کھیت میں اتنا جمع کرلو کہ جل جائے یہ کیفیت شروع کردو تم کہ کسی کی ضرورت پہ بھی کام نہ آئے۔ سامانِ تعیش جسے کہا جاتا ہے۔ پھر وہی آگے بات آ گئی وَ مِنَ الۡاَنۡعَامِ حَمُوۡلَۃً وَّ فَرۡشًا ؕ کُلُوۡا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ وَ لَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّیۡطٰنِ ؕ اِنَّہٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ (6:142)

کہتا ہے اسی طرح سے ہم نے مویشی بنائے ہیں کوئی بار برداری کا کام دیتا ہے' کوئی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں والا ہے یہ بکریاں وغیرہ ہیں۔ کہا یہ سب چیزیں تمہارے اپنے فائدے کے لیے ہیں۔ رزق کا سامان ہے' کھاؤ پیؤ اللہ کا دیا ہوا رزق ہے۔ شیاطین کی پیروی نہ کرو خواہ یہ پیشہ ور مجاور ہوں یا تمہارے اپنے اندر کے مفاد پرست جذبات ہوں جو سب کچھ سمیٹ لینے کا سبق دیتے ہو۔ اِنَّہٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ (6:142) یاد رکھو یہ سب کھلے ہوئے دشمن ہیں تمہارے۔ تباہی آ جائے گی اس سے اگر تم نے یہ روش اختیار کی۔ کیفیت یہ ہے ثَمٰنِیَۃَ اَزۡوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاۡنِ اثۡنَیۡنِ وَ مِنَ الۡمَعۡزِ اثۡنَیۡنِ ؕ قُلۡ ءٰٓالذَّکَرَیۡنِ حَرَّمَ اَمِ الۡاُنۡثَیَیۡنِ اَمَّا اشۡتَمَلَتۡ عَلَیۡہِ اَرۡحَامُ الۡاُنۡثَیَیۡنِ ؕ نَبِّـُٔوۡنِیۡ بِعِلۡمٍ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۙ وَ مِنَ الۡاِبِلِ اثۡنَیۡنِ وَ مِنَ الۡبَقَرِ اثۡنَیۡنِ ؕ قُلۡ ءٰٓالذَّکَرَیۡنِ حَرَّمَ اَمِ الۡاُنۡثَیَیۡنِ اَمَّا اشۡتَمَلَتۡ عَلَیۡہِ اَرۡحَامُ الۡاُنۡثَیَیۡنِ ؕ اَمۡ کُنۡتُمۡ شُہَدَآءَ اِذۡ وَصّٰکُمُ اللّٰہُ بِہٰذَا ۚ فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا لِّیُضِلَّ النَّاسَ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ۙ (6:143-44)

دورِ جہالت کی وہ چند ایک رسومات جن کا ذکر قرآن حکیم نے اپنے ہاں کیا ہے

ان کی یہ رسومات اس زمانے میں جو رائج تھیں ان کا ذکر کیا ہے کہ وہ یہ کچھ کیا کرتے تھے۔ کہتا ہے کہ ان کے ہاں چار قسم کے یہ مویشی ہوتے تھے بھیڑ' بکریاں یہ گائے بیل اور اونٹ ان کے نر اور مادہ۔ کبھی یہ چیز کہ ان کے ہاں ایسے بچے پیدا ہوں جو نر اور مادہ یہ

مشتمل ہیں وہ نہیں کھائے جائیں گے۔ اکیلا نر آئے گا' اس کو یہ کیا جائے گا مادہ اگر پیدا ہوگی تو یہ کیفیت ہوگی اتنے بچے دیدے گا جانور تو اس کو بت کے آستان پہ چڑھا دیا جائے گا۔ اس نے کہا یہ سب چیزیں اسی جذبۂ حزن کی اور خوف کی پیدا کردہ ہیں جو عہدِ جاہلیت میں تمہارے ذہنوں میں راسخ ہوا تھا' ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ سب تمہارے فائدے کے لیے ہم نے پیدا کیے ہوئے ہیں اس قسم کی توہم پرستیاں مت کرو۔ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (6:144)

قرآن حکیم کی طرف سے خودساختہ قوانین کی تردید

وہ کہتا ہے کہ بتاؤ یہ کہتے ہیں سارے کے سارے یہ سب کچھ خدا کے نام پہ ہے' اللہ کے احکام کے مطابق ہے۔ کہتا ہے ان سے پوچھو تو سہی کہ جو خدا نے احکام دیے ہیں' ان میں تو ہے نہیں۔ اس نے خلوت میں کوئی ایسے احکام دیے تھے تو جناب وہاں موجود تھے' سن رہے تھے کہ اس نے اس قسم کے احکام دیے ہیں۔ کیا سند ہے تمہارے پاس اس کی۔ کیوں اتنی تمہاری جرأتیں بیباک ہوگئی ہیں کہ خود اپنے ہاتھوں سے یہ چیزیں وضع کرتے ہو ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (2:79) اور کہتے یہ ہو کہ یہ خدا کی شریعت ہے۔ آپ دیکھتے ہیں جو کچھ بھی ان مرکزوں میں' ان مزاروں میں' ان خانقاہوں میں' ان تکیوں میں' زاویوں میں ہوتا ہے' اسے عینِ مذہب قرار دیا جاتا ہے بلکہ اسے تو مغزِ مذہب قرار دیا جاتا ہے۔ کہتا ہے یہ ظلم ہے خدا کی طرف ان چیزوں کو منسوب کرنا' اسے اس کی شریعت کی بتانا' اسے اس کی طریقت بتانا۔ کہنا کہ یہ خدا کی طرف جانے والا راستہ ہے۔ کہا کہ یہ اَلْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (6:144) کا راستہ ہے' خدا کا راستہ نہیں ہے۔ یاد رکھو کیوں لوگوں کو گمراہ کرتے ہو خدا کا نام درمیان میں لے کر۔

قرآن حکیم کا اعلان یہ ہے کہ بجز چار چیزوں کے کوئی شے بھی حرام نہیں ہے

یہ حرام ہے وہ حلال ہے فہرستیں شروع کر دیں۔ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِىْ مَآ اُوْحِىَ اِلَىَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ (6:145)) کس قدر چیلنج کے الفاظ ہیں۔ اے رسول! ان سے کہدو کہ مجھ پر جو خدا کی طرف سے وحی ہو رہی ہے اس وحی میں تو میں بجز ان چار چیزوں کے کوئی شے حرام نہیں پاتا۔ کتنا حتمی طور پہ کہا جا رہا ہے۔ حرام وہ ہے جسے خدا کی وحی نے حرام قرار دیا ہے۔ کہا کہ جو وحی مجھ پہ نازل ہوئی ہے اس میں صرف یہ چار چیزیں حرام ہیں اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا (6:145) کہتا ہے بس یہ ہیں: مردار' بہتا ہولہو اور لحمِ خنزیر اور وہ جو اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ (6:145) اور ہر وہ شے جو خدا کے سوا کسی کی طرف منسوب کر دی جائے۔ کہا یہ ہیں حرام' یہ ہیں رجس' فسق یہی ہیں حرام چیزیں۔ ان میں بھی فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ

فَاِنَّ رَبَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (6:145) اگر اضطراری حالت پیدا ہو جائے' کہیں کچھ کھانے کو نہیں مل رہا' جان پہ بن گئی ہے تو صرف اتنی حد تک یہ جو چیز حرام قرار دی گئی ہے' اس میں سے تم کچھ کھا سکتے ہو۔ یہ نہیں کہ دندناتے ہوئے یہ کہتے ہوئے کہ مجھے کیا پرواہ ہے قوانینِ خداوندی کی' یا لذت کے لیے کھانا شروع کر دو۔ بس یہ ہیں حرام۔

اربابِ رشد و ہدایت کی طرف سے حرام و حلال کی لسٹوں کا ذکر

ابھی تو بات ہو رہی تھی مزاروں اور خانقاہوں کی اب آ جایئے اربابِ رشد و ہدایت کی طرف جو فتوے دیتے ہیں۔ اتنی اتنی لمبی لسٹیں ہیں ان کے ہاں حرام و حلال کی' ایک ایک چیز پہ بحث ہوتی چلی جا رہی ہے۔ طوطا حرام ہے یا حلال ہے۔ فتویٰ یہ آیا تھا کہ طوطے آٹھ قسم کے ہوتے ہیں ''لے دسواے چڑی مار دے پتر' ایناں نوں پتہ ہے آٹھ قسم دے طوطے ہوندے نیں'' ان میں سے سات قسمیں حلال ہیں ایک قسم حرام ہے۔ کہا جی وہ کونسی ہے ''او کہن لگے دیکھیا تے اسی وی نئیں ہیگا''۔ وہ جواب حرام ہے ایک تو کہا کہ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ ''اٹھے قسماں ہی حرام قرار دیدیو''۔ فہرستیں عزیزانِ من! بنی ہوئی ہیں۔ خدا یہ کہہ رہا ہے رسول اللہ ﷺ سے کہ اعلان کر دو کہ جو خدا نے وحی میری طرف بھیجی ہے میں تو اس میں ان چار چیزوں کے علاوہ کسی چیز کو حرام نہیں پاتا۔ (معاذ اللہ معاذ اللہ) یہ اس کے بعد یہ کہتے ہیں کہ اب یہ ہمارا قصور ہے کہ آپ ﷺ اس میں اور چیزوں کو حرام نہیں پاتے۔ ''آ و یکھنا کنیاں چیزاں حرام نیں''۔ بات تو وہ ہے یونہی مذاق کی سی' ہے بڑے پتے کی۔

حرام و حلال کے متعلق کچھ علما کی بحث پر مہاراجہ کرشن پرشاد کا ان سے استفسار؟

مہاراجہ سر کرشن پرشاد تھے حیدر آباد دکن کے وزیر۔ حیدر آباد دکن میں عام طور پہ علماء کا' فقراء کا' اربابِ طریقت کا' دانشوروں کا جھمگٹا ہمیشہ رہتا تھا ان کے وظیفے مقرر ہوتے تھے۔ تو ایک دن علماء کا مجمع تھا' ساتھ کے کمرے میں وہ بیٹھے ہوئے تھے یہ دوسرے کمرے میں تھا خود۔ وہاں بحثیں چلی ہوئی تھیں حرام و حلال کی۔ یہ حرام ہے اس کی نص یہ ہے۔ فلاں امام نے اس کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ فلاں کتاب میں اس کو بھی حرام قرار دیا ہوا ہے وہ دو تین گھنٹے سے اسی بحث میں لگے ہوئے ہیں۔ سن رہا ہے مہاراجہ کرشن پرشاد' تنگ آ گیا دروازہ کھولا اور اس کے بعد اس نے کہا کہ میں یہ سن رہا ہوں او حرامیو' آپ کے ہاں کچھ حلال بھی ہے یا نہیں۔ یہ حرامیو' کا لفظ اس حرام سے بڑا دلچسپ تھا۔ جب ان سے بات سنو کہ یہ حرام ہے وہ حرام ہے۔ لسٹیں بنی ہوئی ہیں۔ کونسی چیز ہمارے ہاں خاص طور پہ یہ پنجے دار جانور وہ سارے حرام ہیں ناخن جن کے پنجے میں ہوتے ہیں حرام ہیں آپ کے ہاں یہ صاحبِ شریعت آپ کو بتاتے ہیں۔ وَعَلَی الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ (6:146) کہا یہودیوں پہ ہم نے یہ پنجے دار جانور حرام کیے تھے۔ اور اس کے علاوہ وَمِنَ

الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (6:146) کہتا ہے ان کے ساتھ یہ چربی بھی ان کے اوپر حرام تھی سوائے اس کے جو جانور کی پیٹھ پہ لگی ہو یا ہڈیوں کے ساتھ چپکی ہوئی ہو'وہ بھی حرام تھی اور یہ ناخن والے پنجے دار پرندے یہ ان کے اوپر حرام تھے' یہودیوں کے اوپر۔ کیوں حرام تھے؟ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ (6:146) انہوں نے جو سرکشی برتی تھی خدا کے قوانین کی ہم نے سزا دی تھی ان کو۔ ان کو تو سزا ملی تھی کہ انہوں نے اس طرح سے سرکشی برتی قوانینِ خداوندی کی' ان پہ یہ جانور حرام ہوئے پنجے دار۔ یہ امتِ محمد ﷺ کے اوپر سب پہ یہ حرام ہو گئے۔ اور خدا خود کہتا ہے کہ ان پہ تو حرام تھے اس لیے کہ سزا دی تھی ان کو۔ اور ٹھیک ہے عزیزانِ من! ہمیں بھی تو سزا ملی ہوئی ہے کہ ہم نے انہیں خدا بنا لیا ہے اس سے بڑا اور ظلم کیا خدا کی عدالت میں ہو گا۔ ٹھیک سزا مل رہی ہے' ہمیں جو کچھ مل رہی ہے۔ کچھ انہوں نے حرام کیا کچھ ان کے بعد ہماری کرتوتوں نے ہم پہ حرام کر دیا۔

حرام چیزوں کے بارے میں ایک سوچنے والی بات

بات تو سوچنے کی ہے کہ جو رزق ہم دوسروں کے ہاں سے بھیک مانگ کر' گداگری کے ٹکڑوں کی طرح حاصل کریں وہ رزقِ حلال ہو سکتا ہے؟

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اب تو ہمیں اپنی ہستی کے لیے بھی محتاج ہونا پڑ رہا ہے ہماری زندگی حرام کی زندگی ہو گئی ہے' حلال کہاں سے تلاش کریں۔ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ (6:146) انہوں نے جو بغاوت برتی ہمارے قوانین کی تو ہم نے یہ سزا دی ان کے اوپر حلال وطیب چیزیں بھی حرام قرار دیدیں۔ افوہ۔ یہ سزا ملتی ہے اس کے قوانین سے سرکشی برتنے پہ' حلال اور طیب چیزیں بھی حرام ہو جاتی ہیں۔ حرام ہو گیا آج ہم پہ' مشرقی پاکستان کے سارے پھل' وہاں کی چائے' وہاں کا پٹ سن وہاں کی سب چیزیں حرام ہو گئی ہوئی ہیں۔ وہ ان کی بغاوت کی وجہ سے تھا۔ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (6:146) کہا یہ جھوٹ بولتے ہیں ہم سچی بات کہتے ہیں۔ یہ سزا ملی تھی۔ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَ لَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (6:147) اور اگر یہ تمہیں جھٹلائیں ان معاملات کے اندر کہ نہیں ہم جو کہتے ہیں ٹھیک ہے آپ لوگ سب غلط کہتے ہیں۔ جب بھی ان میں سے کسی کے پاس جایئے وہ فتوے آپ کو حرام حلال کی لسٹ دیں گے کہیں گے کہ نہیں' آپ بکتے ہیں۔ آپ کہیے کہ یہ قرآن کہتا ہے قرآن کی آیتیں یہ پیش کر رہا ہے کہتا ہے' بکتے ہیں سب جھوٹ ہے' ہم ٹھیک کہتے ہیں' ہم سچ کہتے ہیں۔ کہا کہ یہی بات یہ کہیں گے تمہیں جھٹلائیں گے۔ اگر وہ جھٹلائیں تو ان سے کہو کہ دیکھو بھائی کسی شے کو نوعِ

انسانی کے لیے ابدی طور پر حرام قرار دیدینا یعنی انہیں محروم قرار دیدینا اس سے کہ تم اس کو نہیں چھو سکتے۔ کہا یہ تو بہت بڑی پابندی ہے بہت بڑی چیز ہے جس سے تم محروم کر رہے ہو انسانیت کو' دیکھو کتنا بڑا جرم ہے۔ خدا تو یہ نہیں کرے گا کہ یہ اتنی چیزیں حرام حرام حرام حرام کرتا چلا جائے' وہ تو ذو رحمت ہے۔ کیا بات کہاں کہی ہے ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ (6:147) رحمت ہے۔ رحمت ہوتی ہے نہایت لطیف طریقے سے سامانِ نشو و نما بہم پہنچانا۔ یوں پہنچا رہا ہے اور وسعت ہے اس کی رحمت میں۔

جاگیرداری سطح کے تحت کرہ ارض پر انسانوں کی کھینچی ہوئی لکیروں نے حلال کو حرام قرار دے رکھا ہے

ارے وہ تو اتنا وسیع ہے اپنی رحمت میں تم اتنا محدود کیے چلے جا رہے ہو۔ لیکن (آگے ہے یہ ٹکڑا) جو قوم اس کی رحمت کے سرچشموں کے اوپر لکیریں کھینچ کھینچ کے خواہ وہ شریعت کے فتوؤں کی رو سے حرام ہوں یا آپ کے غلط معاشی نظام کی رو سے ان کو حرام قرار دیا جائے۔ کیا یہ ہزاروں ایکڑ زمینیں جو ایک ایک شخص سنبھال کے بیٹھا ہوا ہے ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ (6:147) وہ مزارعوں کے اوپر حرام قرار دیدی گئی ہیں یا نہیں۔ خدا کی وسعت جو ہے۔ رحمت کو محدود کر دیا گیا ہے یا نہیں۔ کہا کہ جو قوم یہ کرتی ہے الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (6:147) ہے۔ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ (6:147) اور جو قوم پھر اس قسم کے جرائم پہ اترتی ہے اس کی صورت میں ہم اپنی سزا کو کم نہیں کیا کرتے۔ کیا باتیں کہہ رہے ہیں۔ اور رزق تو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے یہ چیزیں جو ہم کرتے ہیں یہ ساری اس کے حکم سے ہیں' اس کے حکم کے بغیر ایک پتا نہیں ہل سکتا۔ بندہ بشر تو مجبور ہے یہ خود کیا کر سکتا ہے۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ (6:148) کہا یہ کہیں گے کہ ہم تو مجبور ہیں اگر اللہ چاہتا تو ہم یہ کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے سب کچھ اس کے حکم سے ہوتا ہے' اس کی منظوری سے ہوتا ہے' انسان کیا کر سکتا ہے۔ صبح سے شام تک ہم یہی کہتے ہیں کہ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے' انسان تو مجبور ہے' پہلے سے لکھا ہوا ہوتا ہے' اس کو کوئی بدل ہی نہیں سکتا۔ اسے کہتے ہیں راضی برضا رہنا' جو اللہ کی رضا ہے اس کے اوپر ہم راضی ہیں' اس کے خلاف ہم کر ہی نہیں سکتے۔ تو جب اس کے خلاف کوئی انسان کر نہیں سکتا تو دو ہی شکلیں ہیں کہ یا تو اس پہ کڑھتا رہے' کہتا ہے یہ تو بڑی بری بات ہے' پھر کیا ہو؟ راضی برضا رہے کہ ٹھیک ہے شکر ہے تیرا ''جس حال اچ تو رکھے''۔ کہا جب ان سے یہ کہو گے تو یہ جواب دیں گے۔ سوچئے کہ ہم کس مقام پہ کھڑے ہیں۔ یہ ہم جواب دیتے ہیں اور اس جواب کو ہم سمجھتے ہیں کہ جتنا زیادہ کوئی راضی برضا رہتا ہے' اسے مقرب بارگاہِ خداوندی کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اس مقام تک جا پہنچتا ہے وہ حسرت کے الفاظ میں' وہ شعر کئی دفعہ میں نے دہرایا کہ

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

یعنی دعا نہ کریں کہ مرضئ یار کے خلاف نہ ہو۔

جو چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یہ ہمارے ہاں مسلمے چلے آ رہے ہیں ہزار برس سے۔ کہا یہ کہیں گے تمہیں جب تم ان سے کہو گے تو۔ کَذٰلِکَ کَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ (6:148) کہا اسی طرح سے یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں ایسا ہی جھوٹ اس سے پہلے بھی لوگوں نے بولا تھا وہ بھی یہی کہا کرتے تھے وہ خود کرتے تھے کہتے تھے کَذٰلِکَ کَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ (6:148) یہ قسمت کا لکھا ہوا' کہتے چلے جاتے تھے۔ آ گے سنئے کب تک کہتے چلے گئے حَتّٰی ذَاقُوۡا بَاۡسَنَا (6:148) تا نکہ ہمارا عذاب پھر ان کے اوپر مسلط ہو جایا کرتا ہے۔ یہ کہنا کہ سب کچھ قسمت سے ہی ہوتا ہے' تقدیر ہی ایسی تھی' اس قوم کی قسمت میں ہی ذلت لکھی ہوئی تھی۔ کہا ان کی بات نہیں' پہلے بھی اس قسم کی قومیں یہی کچھ کیا کرتی تھیں اور وہ کہتی رہتی تھیں تا نکہ پھر آ کر ان کے اپنے اعمال کی سزا ان پہ مسلط ہو جاتی تھی۔ تو یہ کیفیت ان قوموں کی ہوتی تھی۔ قُلۡ ہَلۡ عِنۡدَکُمۡ مِّنۡ عِلۡمٍ فَتُخۡرِجُوۡہُ لَنَا (6:148) یہ تقدیر کے فلسفے بنانے والوں کو اور قسمت کے راز سمجھانے والوں سے پوچھئے کہ کیا اس کی تائید میں علم بھی ہے تمہارے پاس' ہے سند خداوندی؟ اگر ہے تو لاؤ۔

مذہب کے گرویدہ ذہن کے پاس ظن وقیاس تو ہوتا ہے لیکن دلیل و براہین نہیں ہوتا

کتنی بڑی چیز ہے۔ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ (6:148) علم ان کے پاس نہیں ہوتا محض ظن اور قیاس ہے جس کا اتباع کرتے ہیں۔ وَ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا تَخۡرُصُوۡنَ (6:148) یہ ساری جتنی بھی چیزیں ہیں کہتا ہے' بکواس کرتے ہیں' جھوٹی بحثیں کرتے ہو' یونہی اٹکلیں دوڑاتے ہو۔ نہ خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی یہ کہے گی اور نہ ہی Cause & Effect کا اگر علم تمہیں آ جائے تو تم یہ بات کہو گے کہ انسان مجبور واقع ہوا ہے' جو کچھ ہوتا ہے وہاں سے ہوتا ہے' ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ کہا تمہارے پاس اس کا علم نہیں ہو سکتا۔ قُلۡ فَلِلّٰہِ الۡحُجَّۃُ الۡبَالِغَۃُ فَلَوۡ شَآءَ لَہَدٰکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ (6:149) ان سے کہو کہ سندِ آخر جو ہے کسی معاملے کے اندر وہ صرف خدا کی ہے یاد رکھو۔ لاؤ خدا کی طرف سے سند حرام وحلال کی فہرستوں کے متعلق سندیں لاؤ نذر و نیاز کے متعلق سندیں لاؤ' یہ ان گوشوں کے اوپر' یہ قبروں پہ اور مزاروں پہ اور ان خانقاہوں پہ اور زاویوں پہ جا کے مرادیں مانگنے کی سندیں لاؤ۔ پھر اس کے بعد یہ عقیدہ جو جبر و تقدیر و قسمت کا عقیدہ ہے اس کے لیے خدا کے ہاں سے سند لاؤ۔ سند صرف خدا کی قابلِ قبول ہے دین کے معاملے میں کوئی اور سند نہیں۔ ٹھیک ہے۔ اگر تم یہ کہتے ہو کہ جو کچھ ہم شرک کرتے ہیں' یہ جرم کرتے ہیں' یہ ظلم کرتے ہیں' جو تباہیاں ہیں خدا کی طرف سے ساری آئی ہوئی ہیں۔ تو خدا کو تم نے بس یہ کوئی ظالم اور قصاب اور ہلاکو اور چنگیز فرض کر لیا ہے کہ جو مصیبت جو تکلیف آئے وہ اس کی طرف سے آتی ہے۔ ہوتا یہ ہے' ہم

جیتے جاگتے چلتے پھرتے ہیں کبھی بھی نہیں یہ ہم کہتے کہ اللہ نے زندگی دی ہوئی ہے۔ مرجاتا ہے تو اسکے بعد کہتے ہیں جی ''اللہ نوں منظور ہی اے سی''۔ بیمار شفایاب ہوجاتا ہے تو وہ جی وہ ہم نے بڑا اچھا علاج کرایا' وہ فلاں ڈاکٹر بڑا اچھا تھا اس معاملے کے اندر۔ مرجائے تو تقدیر ہوتا ہے۔ مقدمہ جیت کے آجاتے ہیں آپ تو بینڈ باجے کے ساتھ چلے آ رہے ہوتے ہیں۔ ہار کے نکلتے ہیں تو قسمت میں یہ لکھا تھا' اللہ کو منظور ہی یہی تھا۔ لڑکا فیل ہوتا ہے تو اللہ کی مرضی سے' پاس ہوتا ہے اپنی محنت سے۔ جہاں کہیں بھی آپ کی ناکامی ہوتی ہے مصیبت آتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ وہ کہا کہ اوکم بختو! اگر یہ جبر کا ہی معاملہ کرنا ہوتا ہم نے' تمہارے اختیار میں کچھ نہ ہوتا ہم نے کچھ کرنا ہوتا' تو خدا کو کم از کم ایسا تو کہو فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ (6:149) تو ہم مجبوراً تمہیں سیدھے راستے پہ ہی کیوں نہ چلاتے۔ کیا بات یہاں کہی ہے کہ خدا بھی کسی تصور کا قائم کیا تو ایسا تو قائم کرو کہ وہ سب کو نیک راستے کے اوپر چلانے والا خدا ہوتا' جبر سے کراتا تو کم از کم ایسا تو خدا گھڑو اپنے ذہن میں کہ مجبوراً انسانوں کو ہدایت پہ چلائے۔ خدا بھی تم نے بنایا تو ایسا کہ وہ مصیبت کو اپنی طرف سے نازل کرتا ہے۔ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ (6:149) جبر کرنا ہوتا تو ہم یوں جبر کرتے۔ قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ (6:150) ان سے کہا یہ ہے کہ لاؤ کوئی شہادت لاؤ اس باب میں جو کچھ تم اپنے یہ عقائد رکھتے ہو۔ تم کوئی شہادت نہیں لا سکتے۔ اور اگر یہ اپنے ہی آپ کو شہادت میں پیش کریں تو کہو کہ وحی کی رو سے اس شہادت کی تائید نہیں ہوسکتی۔ یہ سارے ان کی مفاد پرستیوں کے جذبے ہیں جن کی رو سے یہ اس قسم کے عقائد گھڑتے رہتے ہیں۔ ہمارے قوانین کو جھٹلاتے ہیں اور تو ہم پرستیوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اور یہ کون ہیں؟ یہ قانونِ مکافاتِ عمل پہ ایمان نہیں رکھتے۔ اور یہ وجہ ہے کہ جو اس قسم کی ان دیکھی قوتوں کو خدا کا یہ شریک اور اس کے برابر کا ٹھہرا دیتے ہیں' یہ بات بالکل غلط ہے۔ عزیزانِ من! سورۃ الانعام کی آیت 150 تک ہم آ گئے 151 سے آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀.....❀.....❀

اکیسواں باب: سورة الانعام (آیت 151)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1972ء کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی آیت 151 سے شروع ہوتا ہے (6:151)۔

مذہبی پیشوائیت کی خودساختہ شریعت کے خدوخال

سابقہ آیات میں سلسلۂ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ اس مذہبی پیشوائیت کی کیفیت یہ ہے کہ یہ خود ہی اپنے جی سے کچھ باتیں گھڑتے ہیں اور پھر انہیں شریعتِ خداوندی کا نام دے کر رائج' نافذ یا عام کرتے ہیں۔ حرام اور حلال کی فہرستیں بنائے چلے جاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد کچھ فرائض ہیں' واجبات ہیں' مستحبات ہیں۔ پھر دوسری طرف حرام ہے وہ تحریمِ' مکروہی ہے وہ تنزیہی ہے۔ معلوم نہیں کیا کیا کچھ بیٹھے کرتے رہتے ہیں اور ظلم یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ یہ احکامِ خداوندی ہیں' اس نے ان چیزوں کو واجب قرار دیا ہے' اس نے ان چیزوں کو فرض قرار دیا ہے۔ کہا یہ سب کچھ یہ اپنے جی سے گھڑتے ہیں اور یہ سارا اس لیے کرتے ہیں لِيَشْتَرُوا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (2: 79) کہ اس سے چار پیسے مل جائیں ان کو۔ جب بھی دین پروفیشن بن جاتا ہے' وہ مذہب بن جاتا ہے۔ اور پھر مذہب میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ پروفیشن اختیار کرنے والے' اس خداوندی فریضے کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور اس طرح سے اپنی وضع کردہ شریعت کو خدا کی شریعت قرار دے کے نافذ کرتے ہیں' واجب ہیں اور فرض ہیں۔

قرآن حکیم کی وہ دو جامع الاحکام آیات جن میں انسان کے مقام کو بڑی وضاحت سے متعین کیا گیا ہے

کہا کہ آ ؤ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ تم پر کیا کچھ واجب ہے کیا فرائض ہیں کیا احکامِ خداوندی ہیں وہ کیا کہتا ہے کہ کیا کرو اور کیا نہ کرو کہا

ہم بتاتے ہیں تمہیں۔اور یہاں سے بات شروع ہوتی ہے۔قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمۡ عَلَیۡکُمۡ (6:151) ہم بتاتے ہیں کہ خدا نے تم پر کیا واجب قرار دیا ہے۔

عزیزانِ من ! اس کے بعد یہ دو آیتیں ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ دین کی ساری تعلیم' احکام و واجبات کی شکل میں مرتکز ہو کر Concentrated طریق کے اوپر ان دو آیتوں میں اس طرح سے آ گئی ہے کہ ان کو جامع الاحکام کہا جا سکتا ہے۔ زندگی کے سارے ہی دوائر پر محیط ہے اور اس میں وہ تمام چیزیں آ گئی ہیں کہ جن کی پابندیوں سے دین کا منشاء پورا ہو جاتا ہے۔ دین کا منشاء کیا ہے؟ پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہ فرد کی اپنی ذات کے اندر ایک تبدیلی پیدا کرتا ہے۔اور تبدیلی یہ ہے کہ وہ انسان کو اس کے مقام سے آشنا کرا دیتا ہے۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ جسے شعورِ خویش کہتے ہیں Self Consciousness کہتے ہیں' جسے خود آگاہی کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان کو اس کے اپنے مقام سے آشنا کرا دیا جائے۔اور وہ مقام کیا ہے انسان کا؟ مقام یہ ہے کہ مخلوق میں کوئی شے انسان سے اونچی نہیں ہے اور انسان سب آپس میں برابر ہیں۔اس لیے ایک انسان کسی دوسری شے یا کسی دوسرے انسان کے سامنے نہیں جھکے گا۔ان میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ جھکنا بھی اس میں آ جاتا ہے اور جھکنے کے معنی کیا ہیں؟ کسی کی حاکمیت تسلیم کر لینا' کسی کی اطاعت کرنا۔اپنے آپ کو اس سے نیچے سمجھنا' ذلیل سمجھنا پست سمجھنا محکوم سمجھنا غلام سمجھنا مطیع سمجھنا' یہ باعثِ ذلتِ انسانیت ہے۔کائنات میں صرف ایک خدا کی ذات ایسی ہے جو انسان سے اونچی ہے اور اس کی اطاعت بھی اس کے قوانین کی رو سے کی جاتی ہے۔اس لیے مقامِ انسانیت یہ ہے کہ وہ صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے اور اس کے بعد ساری دنیا کی بندگی اور اطاعت سے آزاد ہو جائے۔ آزادی تو اتنی بڑی ہے کہ کسی کا مطیع نہیں۔لیکن یہ آزادی مادر پدر آزادی نہیں کہ سرکشی اور بیباکی ہو کہ کوئی پابندی اس پر عائد ہو ہی نہیں۔ پابندی صرف ایک اور وہ قوانینِ خداوندی کی پابندی۔ یہ ہے مقامِ انسانیت۔قرآن انسان کو اس مقام سے آگاہ کرتا ہے اور ایسا پروگرام دیتا ہے کہ جس میں وہ اس اپنے مقام کو پالے۔فرد کے اندر اس قسم کا تغیر پیدا کرنے کے بعد' آگے تمدنی زندگی آتی ہے۔اس میں مل جل کر رہنا ہوتا ہے' اس میں ایک فرد کا دوسرے افراد کے ساتھ معاملہ پڑتا ہے۔اور یہاں سے ابدی ہدایات یا احکام شروع ہوتے ہیں کہ باہمی معاملات انسان کے کس طرح سے سنوریں گے۔

تمدنی زندگی کی اہمیت' اور اس کے اختیار کردہ نظام ہائے زندگی کے عملی نتائج

تمدنی زندگی میں قرآن گھر کو Home کو ایک ابتدائی یونٹ قرار دیتا ہے' ایک وحدت قرار دیتا ہے۔اور یہ تقسیمِ عمل اس لیے ہے کہ نسلِ انسانی میں اضافہ تو ہوتا چلا جاتا ہے' بقاء ہی اسی سے ہے کہ یہ تسلسل قائم رہے۔پچھلی نسل اپنی مدتِ عمر ختم کر کے' ختم ہوتی چلی جاتی رہے اور آئندہ نسل ایک جوئے رواں کی طرح آتی رہے۔اب یہ آئندہ نسل جس کا اضافہ موجودہ نسل کر رہی ہے' کس قسم کی ہونی

چاہیے۔جس قسم کی بچپن سے اسے بنا دیا جائے گا' اسی قسم کی وہ نسل بن کر آگے آئے گی۔آئندہ نسل کو صحیح انسانی مقام عطا کرنے کے لیے' جس تربیت کی ضرورت ہے' اس کے لیے وہ گھر کو ایک یونٹ قرار دیتا ہے۔اب سمجھ لیا آپ نے تقسیمِ کار کیا ہوگئی۔بات تو تھی پوری انسانیت کو ایک خاص قالب میں ڈھالنے کی۔لیکن اس کے لیے کیا یہ کہ چھوٹے چھوٹے یونٹ بنا دیے جس میں ایسا کرنا ممکن ہو جائے۔ ایک گھر اس کے اندر بچوں کی تربیت کی ذمہ داری ان پر ڈال دی گئی۔پرورش کی' تعلیم کی تربیت کی' یعنی انہیں انسان بنانے کی ذمہ داری ایک چھوٹے سے گھر پہ ڈال دی۔اور یہ وحدتیں ایسی ہیں کہ اگر ہر وحدت ہر یونٹ اپنے اپنے اس فریضے کا احساس کرے اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جائے تو آپ سوچئے کہ پھر آنے والی نسل خود بخود کیا نہیں بن کے آگے چلے گی۔انسانوں کے معاملات بڑے ہی آسان اور سہل ہو جائیں اگر یہ ابتدائی یونٹ جو گھر کا ہے وہ اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جائے۔لیکن اگر یہ اوپر والی نسل ہی حیوانی زندگی بسر کر رہی ہو تو سیدھی بات ہے کہ آنے والی نسل از خود ہی حیوان بلکہ حیوان تر ہوگی وہ تو پھر اس کے بعد۔تو پہلا یونٹ گھر کی زندگی کا' قرآن اس کے متعلق ہدایت دیتا ہے۔پھر آگے بڑھتا ہے تو وہ گھر کی دیواروں کو اُدھر اور اِدھر سے نیچے گرا دیتا ہے تو یہ معاشرہ بن جاتا ہے۔معاشرہ یہی ہے نا رات کو آپ سمٹ کے ایک گھر کی چار دیواری میں آجاتے ہیں' صبح اس سے نکلتے ہیں تو سارے اکٹھے ہوتے ہیں' وہ معاشرہ بن جاتا ہے۔اور یہی معاشرہ ہے کہ جس کو اور وسیع تر کرتے چلے جایئے' اسے قوم کہتے ہیں۔قوم سے آگے بڑھ جایئے تو یہ عالمگیر انسانیت بن جاتی ہے۔تو گھر کی چار دیواریوں کے بعد پھر آگے جا کے وہ معاشرتی زندگی میں یہ سکھاتا ہے کہ افرادِ معاشرہ کا باہمی تعلق کیا ہونا چاہیے۔اور پھر عالمگیر انسانیت میں باہمی ربط و نظم اور ضبط اور باہمی تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے۔یہی ہے نا جو کچھ چاہیے آپ کو تعلیم و تربیت میں' یہی ہے نا حسنِ معاملہ کہ جس کی رو سے آپ ایک گھر ایک معاشرہ ایک خاندان ایک قوم اور انسانیت وہ اس طریقے سے زندگی بسر کرے جو انسانیت کا تقاضا ہے۔یہی ہے نا مقصود سارا تعلیم و تربیت سے۔یہی ہے دین کا مقصود و مطلوب و منتہا یہی ہے قرآن کی رشد و ہدایت کا نصب العین اور یہی ہے جو میں نے ابھی عرض کیا ہے سمٹی ہوئی شکل میں ان دو آیتوں کے اندر آپ کے سامنے آتا ہے۔دیکھئے کس انداز سے آتا ہے۔

دینِ خدا کے برعکس مذہب کی دنیا میں انسان ہمیشہ سوچ کے مختلف جالوں میں پھنسا رہتا ہے

جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ بات یہ کہی کہ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ (6:151)

آؤ۔یعنی ایسے آواز دی ہے کہ جیسے انہوں نے الگ الگ انسانوں کو پھنسا رکھا ہو کوئی یہاں لے کے بیٹھا ہے' کوئی وہاں لے کے بیٹھا ہے اور سارے اپنے اپنے فریب کے پھندوں میں اس کو پھنسا رہے ہیں۔اور یہ یہاں سے ان کو آواز دیتا ہے کہ ارے کہاں پھنس رہے ہو کہاں جا رہے ہو' آؤ تَعَالَوْا (6:151) ادھر آؤ ادھر آؤ' ہم بتاتے ہیں تمہیں۔کیا انداز ہوتا ہے قرآن کا!! ہم بتاتے ہیں تمہیں

کہ تمہارے فرائض کیا ہیں' تمہارے واجبات کیا ہیں' خدا کے احکام کیا ہیں ہم بتاتے ہیں۔ پہلی چیز وہی جو میں نے عرض کیا تھا کہ فرد کو اس کے مقامِ انسانیت سے آگاہ کرنا۔ اور وہ یہ چیز کہ اطاعت اور تسلیم صرف خدا کے قوانین کی ہے اس کے ساتھ کسی اور کی نہیں ہے۔ خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت اور محکومیت کو توحید کہا جاتا ہے اور اس کے ساتھ کسی اور کو ملا لیا جائے تو وہ شرک ہو جاتا ہے۔

کہا کہ پہلی چیز یہ ہے اَلَّا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا (6:151) پہلی چیز یہ ہے جو اس نے کہی ہے۔ سوچئے عزیزانِ من! یہ مقام اگر حاصل ہو جائے کہ قوانینِ خداوندی کے سوا کسی کے سامنے انسان کی گردن نہ جھکے تو وہ جو اس نے کہا تھا کہ اس کا ماحصل یہ ہوتا ہے کہ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (6:48) ان پہ نہ خوف رہتا ہے کسی کا' نہ حزن ہوتا ہے کسی قسم کا۔ یہ کیفیت عملاً آ جاتی ہے یا نہیں۔ شرک یہ ہے دین میں اس کا نام تھا۔

دینِ خداوندی کے میں شرک کی نوعیت

مذہب میں صرف بتوں کے سامنے جھکنے کا نام شرک ہوا' انہیں معلوم ہے کہ یہ کچھ تو کوئی نہیں کرے گا۔ اور وہ بت بھی جو اس طرح سے کسی انسان کی دیوتا کی شکل کے اندر ہو۔ وہ خانقاہوں کے اندر جو بچھی ہوئی قبروں کی شکل میں ہو وہ بھی ان کے نزدیک شرک نہیں ہے۔ لیکن یہ تو پھر بھی مذہب کا شرک ہے کہ صرف بتوں کے سامنے نہ جھکئے۔ دین کا شرک یہ ہے کہ خدا کے قوانین کے علاوہ کسی اور کی اطاعت قبول کر لینا' یہ شرک ہے۔ کہا پہلی چیز یہ ہے اَلَّا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا (6:151) کسی شے کو اس کے ساتھ شریک نہ کرو۔

تمدنی لحاظ سے انسانی زندگی میں حیوانی عوامل کے علاوہ باہمی جبلت کے تقاضوں میں فرق

اب آگے چلیں جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ اب تمدنی زندگی شروع ہوئی اور اس کا پہلا یونٹ تقسیمِ کار کے اعتبار سے گھر کی چار دیواری ہے۔ اب گھر میں دو شکلیں ہونگی' یہ درمیان میں فرد ہے اوپر کی طرف جاؤ گے تو والدین آئیں گے اور نیچے کی طرف آیئے تو اولاد آئے گی۔ حیوانی زندگی میں آپ دیکھتے ہیں کہ والدین کا کوئی رشتہ اس کے ساتھ باقی نہیں رہتا' جسے آپ اولاد کہتے ہیں وہ پہچانتا بھی نہیں ہے۔ گائے بکری بھیڑ کے بچے آپ کے سامنے ہیں وہ جب تک خود اپنے رزق کا سامان مہیا کرنے کے قابل نہیں ہو جاتے' چرنے چگنے کے قابل نہیں ہو جاتے' ان کی پرورش کا سامان ان کی ماں کے تھنوں میں ہوتا ہے۔ پرندوں کی صورت میں وہ دانہ دنکا چگ کے لاتے ہیں' ان کی پرورش کرتے ہیں۔ وہ ماں باپ ان بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ جب یہ بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کو یہ پتہ بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے ماں باپ کون تھے کوئی تعلق ان کا باہمی نہیں رہتا۔ یہ Home کی زندگی نہیں ہوتی ان کی۔ جسے کہتے ہیں بڑے فخر سے اسلام دینِ فطرت ہے۔ کوئی آج تک نہیں بتاتا وہ بات تو کر و کھل کے ہے کیا یہ فطرت ہے صاحب۔ او فطرت تو ہمیں باہر نظر آتی ہے کہ ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ شیر بکری کو نگل لیتا ہے۔ اس یونٹ کے اندر بھی وہ ماں باپ تو بچے کی پرورش کو فطرت کی جبلت کی مجبوری

کی بناء پہ کرتے ہیں' یہ بچے پہچانتے بھی نہیں ہیں کہ ماں باپ کونسا ہے۔ یہ ہے دینِ فطرت؟؟۔ اور چونکہ یہ چیز حیوانی جبلت کے اندر ہے نہیں کہ وہ ماں باپ کو پہچانیں' اس لیے قرآن کو ضرورت پڑی کہ وہ یہ چیز کہے وَّ بِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا (6:151)

والدین کی اطاعت کا تصور ایک غیر قرآنی تصور ہے

اس یونٹ میں یادرکھو والدین کے ساتھ احسان کرو۔ جیسا کہ اس سے پیشتر متعدد بار یہ چیز سامنے آ گئی کہ یہ جو ہمارے ہاں والدین کی اطاعت فرض ہے' قطعاً غیر قرآنی ہے یہ چیز۔ اطاعت فرض نہیں ہے۔ وَّ بِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا (6:151) احسان کے معنی ہوتا ہے کسی میں جو کمی واقع ہو جائے اسے پورا کر کے اس کے توازن کو اور حسن کو برقرار رکھا جائے۔ جتنی کمی اس میں آ گئی ہے' اسے پورا کر دیجیے۔ یہ ٹھیک ہے وہ خود جوانی کے عالم میں تنومند و توانا تھے' کماتے تھے اپنی پرورش بھی کرتے تھے' تمہاری پرورش بھی کرتے تھے۔ اب اگر بڑھاپے کی وجہ سے ان کے قواء مضمحل ہو گئے ہیں' کمزور ہو گئے ہیں' وہ اس قابل نہیں رہے کہ خود محنت کر کے کچھ کما کے لائیں تو ان میں یہ کمی آ گئی ہے یا اور بیماری کی وجہ سے کمی آ جاتی ہے۔

آرام وسکون کی زندگی کے لیے خیال وتصورات کی یک رنگی بنیادی شرط ہے

ایک لفظ قرآن نے کہا ہے کہ جہاں جہاں سے ان کا توازن بگڑ رہا ہے بس اتنی سی کمی ان کی پوری کر دو تا کہ وہ توازن برقرار رہے ان کا۔ اور جب اس کا توازن برقرار رہے گا تو تم دیکھو گے تمہارا گھر بھی حسین بن جائے گا۔ وہ گھروں کے اندر فساد اس وقت برپا ہوتا ہے جب یہ توازن بگڑ جاتا ہے ''جدوں منجی اچ کانوں پے جاندی اے'' پھر نہیں سویا جا سکتا اس پہ۔ یہ جو آپ آرام سے رات بھر سو جاتے ہیں چارپائی پہ' ہوتا کیا ہے؟ اس کا حسن برقرار ہوتا ہے' اس کا توازن برقرار ہوتا ہے۔ ذرا ایسی چارپائی لے لیجیے جس میں تین پائے اونچے ہوں اور ایک ذرا نیچا ہو' اس میں کمی آ جائے اس کے اندر۔ یہ ہوتا ہے جسے احسان کہتے ہیں ''اوہدیاں کانوں کڈ دیو تسی چارے پاوے اکو جئے کر دیو''۔ گھر کے اندر پہلے یہ ہونا چاہیے توازن برقرار رہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ وَّ بِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا (6:151) کیا چیز کہہ دی ہے۔ اور زور اس لیے دیا ہے کہ یہ حیوانی جبلت نہیں ہے۔ بچے کی پرورش میں جہاں تک وہ ماں اسے دودھ پلاتی ہے' وہ جبلت کا تقاضا ہے۔ لیکن ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا ان کے توازن کو برقرار رکھنا' حیوانی جبلت نہیں ہے یہ فطرت کا تقاضا نہیں تھا۔ اس لیے یہ چیز کہی کہ آؤ ہم بتاتے ہیں تم پہ فریضہ یہ ہے کہ وَّ بِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا (6:151 ٹھیک ہو گیا جی۔ اب اوپر سے تو یہ تعلیم دی دی نیچے اولاد آئی۔

مفلسی کی وجہ سے بچوں کو قتل نہ کرنے کا حقیقی مفہوم کسی کو حقیر وذلیل نہ کرنا ہے

اولاد کے متعلق جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ اتنا سا حصہ جتنا ماں اس کو دودھ دے سکتی ہے' یہ تو ایک جبلی تقاضا تھا۔ آگے اولاد کی تعلیم

وتربیت کا سوال آتا ہے۔الفاظ یہ آتے ہیں کہ وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ (6:151) عام ترجمہ یہ ہے کہ اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل مت کرو۔قتل کا ترجمہ قتل کر دیا جاتا ہے اور پھر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم تو نہیں قتل کرتے۔اور کبھی کبھی ایسے واقعات آجاتے ہیں کہ جس میں بچوں کو وہ ذبح کر دیتے ہیں۔لیکن بعض اوقات جذباتی غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں کہ خدا خوش ہو جاتا ہے یا دیوتے خوش ہو جاتے ہیں' بچے کو ذبح کر دینے سے' یہ کبھی واقعہ ہوتا ہے۔لیکن مفلسی کی بناء پر بچوں کو قتل نہ کرو۔خود عربوں کے ہاں بھی قرآنِ کریم نے بتایا ہے اور تاریخ بھی بتاتی ہے کہ ان میں بھی عام بات نہیں تھی بعض ایک آدھ قبیلہ ایسا تھا جو اپنی لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا کرتے تھے اور وہ مفلسی کے ڈر سے نہیں کرتے تھے۔قرآن نے بتایا ہے کہ ان کو ایک غلط قسم کا تصور تھا غیرت کا کہ ''اسیں کسے دے سوہرے کہلائیے''۔آپ نے دیکھا ہے وہ پرانی جاہلیت کا تصور کس طرح چلا آتا ہے۔سالا ہمارے ہاں اب بھی گالی ہے۔یہ وہی چیز ہے۔لڑکی تو بہر حال بیاہی جائے گی' کوئی داماد بنے گا پھر اس کے بعد اس گھر والوں سے یہ تعلق پیدا ہوگا۔تو یہ جوان کی غیرت تھی' حمیت تھی ایک False Prestige کا گمان تھا' وہ ان کے ہاں نسبی افتخار انتہا تک پہنچا ہوا تھا۔وہ چاہتے ہی نہیں تھے کہ لڑکی ہماری کسی کے ہاں جائے اور کوئی ہمارا داماد بن کر آئے یا سمدھی بن کر آئے۔قرآن نے کہا ہے کہ یہ تھا وہ جذبہ جس کے ماتحت ایک آدھ قبیلہ یہ کیا کرتا تھا۔لیکن یہ چیز کہ مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کر دیا جائے یہ تو عام بات نہیں ہوتی تھی۔اور یہ اس لیے کہ ہم نے بس وہ قتل کا لفظ آیا اور اس کے معنی بھی ذبح کر دینے' قتل کر دینے کے لیے حالانکہ عربی زبان میں یہ لفظ بڑا وسیع المعنی ہے۔

اس کے معنی کسی کو حقیر و ذلیل کر دینا بھی ہوتا ہے اس کے معنی ہوتے ہیں کہ کسی کو ایسا Ineffective کر دیا جائے کہ اس کا وجود اور عدمِ وجود برابر ہو جائے۔وہ بیچارہ جیسے ہے ہی نہیں ہے۔اور پھر اس کے معنی ہوتے ہیں کہ کسی شے کی توانائی کو قوت کو Dilute کر دیا جائے' کمزور کر دیا جائے۔وہ قتل الشراب کہا کرتا تھے جب شراب میں پانی ملا دیتے تھے اور اس کو Dilute کر دیتے تھے کمزور کر دیتے تھے۔اس کی کیف آوری کو اس کی تندی کو کمزور کر دیتے تھے' اسے بھی کہا کرتے تھے۔تو قتل کا لفظ ان کے ہاں ان تمام معنی میں استعمال ہوتا تھا۔

اولاد کو تعلیم وتربیت سے محروم رکھنا سب سے بڑا قتل ہے' ظلم ہے

یہاں بھی وہی چیز ہے جو قرآن نے کہی ہے کہ مفلسی کی وجہ سے ایسی صورت نہ پیدا کرو کہ تمہاری اولاد کی تعلیم و تربیت رہ جائے Ineffective بیچارے ہو جائیں۔ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی انسانی صلاحیتیں وہ ساری مضمحل ہو جائیں' کمزور رہ جائیں Dilute ہو جائیں وہ صہبائے انسانیت نہ رہیں بلکہ وہ بالکل پانی کی کیفیت اختیار کر جائیں۔کتنا جامع لفظ قرآن نے کہا ہے۔اور یہ چیز مفلسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔آج آپ کے معاشرے میں کتنے غریبوں کے گھرانے ہیں جو اولاد کو اس لیے نہیں پڑھا سکتے کہ ان کی فیس نہیں دے سکتے'

ان کی کتابوں کا خرچ برداشت نہیں کرسکتے۔ رہ جاتی ہیں اس اولاد کی صلاحیتیں کمزور ہوکر Dilute ہوکر مضمحل ہوکر۔ یہ ہے اولاد کا قتل جوافلاس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کہا کہ ایسا نہ کرو۔ یہ صورت نہ پیدا ہونی چاہیے۔ کونسا ورنہ باپ ہے جو یہ چاہتا ہے کہ میری اولاد ہنرمند نہ ہو باعزت نہ ہو سرفراز نہ ہو خوشحال نہ ہو۔ کوئی باپ بھی یہ نہیں چاہتا۔ لیکن غربت اور افلاس کی مجبوریاں یہ ہیں ان بیچاروں کو یہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔

اجتمائی طور پر معاشرے کی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کرنے کا عملی طریق، صرف قرآن کے معاشی نظام میں مضمر ہے

اس کے معنی یہ تھے کہ ایسی صورت نہ تمہارے معاشرے کے اندر پیدا ہو کہ افرادِ معاشرہ اپنی اولاد کو بے بہرہ رکھیں، تعلیم کا انتظام نہ کرسکیں، تربیت کا انتظام نہ کرسکیں محض اس لیے کہ وہ Afford نہیں کرسکتے، مفلسی ہے غریبی ہے۔ ایسی بات نہ ہو۔ تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اب اگر ایک شخص ہے ہی غریب، مفلس ہے اس کے پاس پیسہ ہی نہیں ہے اولاد کو تعلیم و تربیت اس طرح سے دینے کا کہ ان کی صلاحیتیں نشو ونما پا جائیں، برومند ہو جائیں تو وہ کیا کرے پھر۔ آگے ہے۔ آج یہ چیز بڑی عام ہو رہی ہے کہ صحیح معاشی نظام کیا ہونا چاہیے Economic System کیا ہو۔ معیشت کا مسئلہ ہمارے دور کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اسے تو کہتے ہی Age of Economics ہیں، ہمارے اس دور کو دورِ اقتصادیات۔ کہیں سوشلزم آ رہی ہے، کہیں کمیونزم آ رہی ہے، کہیں اسلامک سوشلزم آ رہی ہے یہ تمام چیزیں آ رہی ہیں کہ اس وقت یہ تقاضے بڑے ابھر کے سامنے آ گئے ہیں۔ بات قرآن نے یہاں سے شروع کی کہ افلاس کی وجہ سے ایسی صورت نہ ہو کہ آنے والی نسلیں ان چیزوں سے محروم رہ جائیں۔ تمہاری اولاد ان چیزوں سے محروم رہ جائے۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا جائے۔ اگر یہ چیز افراد پہ رکھی جائے انفرادی ذمہ داری اگر اسے رکھا جائے تو اس کا تو یہ نتیجہ ہوگا۔ کہا یہ انفرادی ذمہ داری نہیں ہے۔

ہمارے ہاں قرآن حکیم کے غلط تراجم نے حقائق کو الجھا رکھا ہے

سوال یہ نہیں ہے کہ ایک فرد کے ہاں بچے پیدا ہو گئے اور اسکے اوپر اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ کرے۔ اس نے کہا کہ یہ اجتماعی ذمہ داری ہے یہ پورے نظام کی ذمہ داری ہے۔ اگلے الفاظ سنئے۔ پہلے اس پہ غور ہو کہ ایسا نہ کیجیے کہ افلاس کے ڈر سے تمہاری اولاد کی تعلیم و تربیت اور پرورش ایسی نہ ہو سکے کہ ان کی صلاحیتیں دبی کی دبی رہ جائیں، یہ نہ کرو۔ کیا انتظام کرو؟ نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَ اِيَّاهُمۡ (6:151) پھر وہی ترجمہ جو ہمارے ہاں ہے کہ ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی رزق دیتے ہیں۔ اس ترجمے اور مفہوم کو سامنے رکھئے

عزیزانِ من! اور پھر ذرا حق کو اپنے سامنے لے کے آیئے Realities کو لے کے آیئے' یہ سوال تو عقیدت مندی کا ہے نہیں۔ اعتراض پڑتا ہے کہ تمہارے خدا نے یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم رزق دیں گے تمہیں بھی تمہاری اولاد کو بھی۔ اور یہ جو آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ایک قحط میں دس دس لاکھ انسان بھوک سے مرجاتے ہیں۔ خود بھی مرجاتے ہیں ان کی اولاد بھی تڑپ تڑپ کر مرجاتی ہے۔ پھر یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ آج آدھی دنیا ایسی ہے جن کو دو وقت کے لیے پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا۔ پھر یہ جو دیکھتے ہیں کہ کم از کم ستر اسی فیصد گھرانے ایسے ہیں کہ جن کے اندر اتنا نہیں ہوتا کہ ان کی اولاد کو پورا رزق مل سکے' سامانِ زیست مل سکے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے تمہارے ساتھ یہ وعدہ کیا ہوا ہے کہ ہم ذمہ دار ہیں تمہارے رزق کے' تمہاری اولاد کے رزق کے۔ اور عملاً ہم دیکھ یہ رہے ہیں کہ یہ انسانیت بھوک کے مارے اتنی مرجاتی ہے۔ عالمگیر بھوک ہو رہی ہے خود انسانوں کو نہیں ملتا' ان کے بچوں کو نہیں ملتا۔ تو یہ پھر خدا کا وعدہ کیا ہے یہ اعتراض پڑتا ہے۔

رزق کے سلسلہ میں خدا نے اپنا وعدہ پورا کرنے کا جو طریق بیان کیا ہے' یہ اس سے پورا ہوگا

کہاں ہے خدا کا وعدہ کہ ہم رزق دیتے ہیں تمہیں بھی تمہاری اولاد کو بھی۔ اور رزق بھی اتنا فراواں ملنا چاہیے کہ کوئی بچہ محروم نہ رہ جائے اس چیز سے کہ اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما نہ ہو سکے۔ اتنا رزق ملنا چاہیے اور ہر فرد کو ملنا چاہیے' ہر بچے کو ملنا چاہیے۔ اعتراض ہوتا ہے اس پہ کہ اتنا بڑا دعویٰ اور وعدہ کیا ہے خدا نے اور عملاً یہ شکل ہے۔ اور آپ جھٹلا نہیں سکتے اس چیز کو۔ کہاں ہے خدا کا یہ وعدہ' بہت بڑا اعتراض ہے۔ کہ جی! رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے اور اس کی تقسیم ایسی ہے کہ جسے چاہے اتنا فراواں دے اور جسے چاہے اتنا نپا تلا دے۔ یہی تقسیم سہی تمہارے خدا کی' نپا تلا ہی سہی' دے تو سہی۔ یہ جو لاکھوں کروڑوں بھوک سے مرجاتے ہیں وہ نپا تلا بھی تو نہیں مل رہا۔

ملوکیت کے پیدا کردہ تصورِ خدا نے نظامِ ربوبیت کی اصل کو نظروں سے اوجھل کر ڈالا ہے

عزیزانِ من! اسے سوچئے گا بعد میں بھی سوچئے گا' یہ ہے قوی اعتراض' ہے یا نہیں۔ کیا جواب ہے اس کا آپ کے پاس۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہمارا ایمان ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔ ہمارا ایمان ہے' یہ خدا کا وعدہ ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ خدا کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی تو قرآن میں لکھا ہوا ہے لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (13:31) ہم اپنی وعدہ خلافی کبھی نہیں کرتے۔ اور صورت یہ ہے کہ وعدہ اتنا بڑا' اس کی خلاف ورزی یوں ہو رہی ہے یہ روز ہم دیکھ رہے ہیں۔ یہ کوئی مسئلہ نظری نہیں Theoretical نہیں ایک Practical محسوس چیز ہے۔ روز بھوک سے مرتے ہیں۔ غور طلب چیز ہے۔ یہ جو تصور تھے کہ یہ خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور وہی تقسیم کرتا ہے' یہ تصور آپ کے اس دور میں پیدا ہوا جب ملوکیت Fudalism عام ہو گئی ہوئی تھی۔ جاگیرداری اور ملوکیت یہ مسلمانوں کا شعار ہو گیا

تھا۔عباسیوں کے دور میں یہ خیال پیدا ہوا تھا۔وہ دور ہے جہاں ابتداء ہوتی ہے قرآن سے جو آپ کی گاڑی دوسری پٹڑی پہ پڑی ہے۔ عباسیوں کے دور میں پڑی ہے یاد رکھئے۔یہ نظامِ جاگیرداری اور جسے آپ سرمایہ داری یا کیپٹل ازم کہتے ہیں' اس زمانے میں ابھی فیوڈل ازم ہوتی تھی۔ملوکیت اور فیوڈل ازم یہ عام ہوئیں اور اس کی وجہ سے رزق کے سرچشمے صاحبِ اقتدار اور قوت والے لوگوں نے اپنے ہاتھ میں لیے۔اور اس کے بعد پھر یہ غریبی عام ہوئی' ناہمواریاں پیدا ہوئیں رزق کی تقسیم میں۔

خدا کے راستے کی طرف جانے والوں کے لیے روک بن کر کھڑے ہو جانے والوں کا کردار اور ان کی نشان دہی

اب اگر یہ بات سامنے آجاتی کہ یہ اس غلط نظام کا نتیجہ ہے جو ان لوگوں کو پیٹ بھر کے بھی نہیں ملتا اور دوسروں کے کتوں کو وہ کچھ مل رہا ہے۔نئی نئی بات تھی لوگوں کی نگاہ اس کے اوپر اٹھتی وہ اس نظام کو بدلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔لوگ تھے بڑے ابھی دیندار مذہب پرست۔مذہبی پیشوائیت آگے آئی اور اس نے یہ عقیدہ پیدا کیا کہ نہ بابا! یہ کون ہوتے ہیں رزق کو تقسیم کرنے والے یا لینے والے' رزق کی تقسیم تو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے وہ رازق ہے۔توبہ توبہ توبہ! کبھی دماغ میں بھی یہ خیال نہ لانا کہ اس نے ان کو اتنا دیا ہمیں کیوں اتنا سا دیا یہ تو شکایت ہے یہ شکوہ ہے خدا کی شکایت ارے بابا!!۔ڈراتے چلے گئے دھمکاتے چلے گئے ان کو۔راضی برضا جتنا وہ دیتا ہے ٹھیک ہے۔ارے پھر کوئی تسکین کی شکل' بھوکے مر رہے ہیں۔وہاں جا کے دیکھئے گا آسمان کی بادشاہت تمہارے ہی ہاتھ میں ہوگی۔ ان کا کیا ہے چار دن کی بات ہے یہ تو لاشِ مردار ہے' یہ کتے ہیں کھانے دو۔تم بھوک سے مر جاؤ جتنی جلدی مرو گے اتنی جلدی جنت میں جا پہنچو گے۔یہ تقسیمِ خداوندی بڑی عجیب تقسیم ہے۔

دو بھائیوں کے مابین مکان کی تقسیم اور رزق کے حصول کا معاملہ

از صحنِ خانہ تا بہ لبِ بام ازانِ من

دو بھائی تھے۔باپ کے ترکے کی تقسیم کا سوال پیدا ہو گیا تھا جائیداد کا تو بڑے بھائی نے کہا کہ بات بڑی آسان ہے تقسیم کر لیتے ہیں۔میرے پاس تو اور بھی بہت کچھ ہے مجھے زیادہ نہیں چاہیے میں تھوڑا سا لوں گا اور تمہیں بہت زیادہ ضرورت ہے تمہارے بچے وچے زیادہ ہیں تمہاری ضروریات زیادہ ہے۔اس لیے تقسیم یوں کی جاتی ہے کہ

از صحنِ خانہ تا بہ لبِ بام ازانِ من

کہ یہ جو گھر ہے ایک ہی تو ہے صحن سے لے کر چھت تک یہ دس بارہ فٹ کی ساری بلندی یہ اتنا سا تو میں لے لیتا ہوں اور

از بامِ خانہ تابہ ثریا ازانِ تو

چھت سے لے کے آسمان تک تیری ملکیت۔لو بابا! خوش ہونا اب تو۔انہوں نے کہا کہ یہ رزق یہاں کے یہ لاش' یہ کتے ہیں چلنے دو۔آسمانوں کی بادشاہت جنتیں اور پھر گنائیں وہاں کی نعمتیں اور سارا کچھ گنا دیا یہ سب تمہارے حصے میں ہے ابدی طور پر۔بس مرنے کی دیر ہے اور مرنے کا سامان انہوں نے کر دیا ہوا ہے تمہارے لیے۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے

پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

نگاہ نہ ان کی اٹھنے پائے کہ یہ ہیں جنہوں نے رزق کے سرچشموں کے اوپر قبضہ کیا ہوا ہے۔یہ سانپ بن کے بیٹھے ہوئے ہیں دولت پہ۔نگاہ نہ اٹھنے پائے پختہ تر کرتے چلے جاؤ اس کے اندر۔اب اس کا نتیجہ ہے کہ نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَ اِيَّاهُمۡ (6:151) اس کی تفسیریں لکھی گئیں۔پہلی تفسیر آپ کی اسی دور میں لکھی گئی تھی۔اور یہ عربی تصور بھی نہیں تھا۔

عربوں کی مہمان نوازی کی نوعیت اور ایرانی ملوکیت کے اثرات قرآنی لٹریچر پر

عربوں کی کیفیت ہی یہ تھی وہ تو اتنے مہمان نواز تھے مہمان آتا تھا گھر میں' اور مہمان کوئی رشتے دار نہیں ہے' کوئی ملنے جلنے والا نہیں۔وہ تو جنگلوں میں رہتے تھے صحراؤں میں رہتے تھے جو راستہ گذرتا ہوا آ گیا' وہ مہمان آ جاتا تھا ان کی کیفیت یہ تھی کہ آپ کھجوروں کی گٹھلیاں کھاتے تھے' کھجوریں مہمان کو کھلاتے تھے۔ان میں بڑی وسعت تھی۔یہ تو ایرانی ملوکیت تھی جو آئی آپ کے ہاں عباسیوں کے دور میں' اس نے آ کے یہ سارا نظام فیوڈل ازم کا پیدا کیا اور سارا دین آپ کا پھر ان کے قالب میں ڈھل گیا۔آج جو آپ کے ہاں اسلام مروج ہے اسے نہ قرآنی اسلام سے کوئی تعلق ہے' نہ عربی تصور سے کوئی تعلق ہے۔خالص ایرانیت کی ملوکیت کا اسلام ہے آپ کے ہاں چلا آ رہا۔نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَ اِيَّاهُمۡ (6:151) ٹھیک ہے صاحب! خدا رزق دیتا ہے تمہیں بھی ان کو بھی۔تو پھر بھوکے کیوں مرتے ہیں؟ بھئی وہ اب جو دیتا ہے وہ تو قادرِ مطلق ہے' وہ جتنا چاہے دیتا ہے۔بھئی نہیں دیتا!! وہ کہتا ہے بس جس کی موت آ جاتی ہے پھر اس کو نہیں دیتا۔سنئے عزیزانِ من! قرآن نے یہ دعویٰ کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ کہا تھا کہ اس کے یہ معنی نہ سمجھ لینا کہ ہم رزق کی تقسیم کرتے ہیں اور ہم دیتے ہیں ایک ایک کو۔یہ بات نہیں ہے۔اس نے کہا یہ جو چیز ہے یہ جو تصور ہے یہ کفر کا تصور ہے۔

ہزار سال سے قرآنِ حکیم کی واضح روشن اور آسان تعلیم سے لاتعلقی کی کیفیت

عزیزانِ من! حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے تو یہ بات کسی مسلک کی خاطر پیدا کی تھی تفسیروں کے اندر۔او اس ہزار سال کے اندر

کسی نے قرآن کو کھول کے دیکھا ہی نہیں۔ وہ اس لیے کہ قرآن کی طرف آنا تو انہوں نے کفر قرار دیدیا۔ کیسے سمجھا جائے دین کو؟ جو کچھ اسلاف سمجھتے چلے آ رہے ہیں بس اس کے مطابق سمجھا جائے گا ان سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں ہٹا جائے گا۔ بھئی! قرآن کی طرف آؤ۔ ارے وہ قرآن تم سے زیادہ جانتے تھے۔ یعنی اب یہ ہمارے لیے نہیں رہا۔ جتنا یہ جاننا چاہیے تھا انہوں نے جان لیا اس کو تو کر دو ٹھپ۔ بخشواؤ مردے اس سے' زندوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ زندہ کیا کریں؟ یہ جو چلا آ رہا ہے اسلاف کے ہاں اسی کے اوپر چلتے چلے جاؤ۔ اگلی بھیڑ جدھر جاتی ہے جائے پچھلی بھیڑ بھی' اندھوں کی قطار' جدھر اگلا اندھا بابا دیجا پچھلا بھی اندھا بابا دیجا۔ یہ نہیں ہے تمہارے ہمارے لیے۔ کسی نے نہیں اس کو کھول کے دیکھا۔

قرآن حکیم کے معاشی نظام کی وضاحت نیز مومن اور کافر میں فرق

ہمارا یہ تصور کہ رزق خدا کے ہاں سے براہِ راست ملتا ہے' جتنا کسی کو ملتا ہے اس پہ اسے راضی برضا رہنا چاہیے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ صورت نہیں ہے۔ رزق کے سرچشمے اور ذرائع تو ہم نے اس طرح سے پیدا کر دیے اور عام کر دیے۔ اب اس کی تقسیم تمہارے نظام کے ہاتھوں سے ہوتی ہے' وہ اسے تقسیم کرتا ہے۔ اور نظام یہ ہے کہ اس کو کہیں روک کے نہ رکھا جائے اس کو کھلا رکھا جائے سوآء للسآئلین تا کہ ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری ہوتی رہے۔ یہ ہوگا نظام صحیح۔ غلط نظام والے جو ہیں جب ان سے یہ کہا جائے گا کہ بھئی! اسے کھلا رکھو۔ سنئے کیا کہتا ہے قرآن کہ وہ کیا دلیل دیں گے۔ اے عزیزانِ من! ایک دفعہ پھر ذہن میں لے آیئے کہ آپ کے ہاں اب شریعت اور دین یہ بتایا جاتا ہے کہ رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے وہ جسے جتنا چاہے دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کے لیے نظام جو تم بناتے ہو وہ ذمہ دار ہوتا ہے۔ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ (36:47) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو رزق تمہارے لیے خدا نے دیا تھا۔ یہ ہو گیا جی خدا رازق یہاں تک۔ سامانِ رزق پیدا کرنا اور دیدینا انسانوں کو یہ ہے خدا کی رزاقیت۔ خدا کی رزاقیت یہ ہے کہ اس نے سامانِ رزق سامانِ زیست یہ اپنی طرف سے بلامزدومعاوضہ تمام انسانوں کے لیے دیا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ(36:47)۔ یہ نہیں ہے کہ اتنا اتنا حصہ ہر ایک کو آ کے بانٹ دیا۔ جو اس نے اس طرح مائدہٴ ارض پر بچھا دیا تمہارے لیے' اس میں اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اَنۡفِقُوۡا(36:47) ان سے جب کہا جاتا ہے کہ بھئی! اس پہ بندمت لگاؤ اسے روک کر نہ بیٹھ جاؤ اسے کھلا رکھو ہر ایک کی ضرورت کے لیے۔ یہ ہوا جی نظام۔ کہا جب ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ نظام قائم کرو تا کہ ہر ایک کو ملے قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا (36:47) یہ جو ایسا کہنے والے ہیں کہ ایسا نظام قائم کرو یہ تو ہیں جن کو جماعتِ مؤمنین کہا گیا ہے۔ قرآن نے کہا ہے وہ جو ایمان لاتے ہیں وہ یہ بات کہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں یہ جو اس نظام کے الٹ دوسرا نظام قائم کرتے ہیں ان کو کافر کہا ہے۔ کہا اس کے جواب میں یہ کافر یہ بات کہتے ہیں اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطۡعَمَهٗۤ (36:47) کیا کہتے ہو!! کہ جنہیں خدا نے غریب رکھا ہوا ہے ارے ہم ان کو روٹی

دیں ان کو رزق دیں، ارے کیا کہہ رہے ہو!!۔ خدا ان کو غریب رکھنا چاہتا ہے تم ہمیں کہتے ہو کہ جاؤ جا کے ان کو روٹی دو' نہ بابا! خدا کے ساتھ بغاوت ہو جائے گی۔

قرآنِ حکیم کے پیش کردہ حقائق پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے

یہاں بھی سوچئے' پھر یہ بھی سوچئے' ہر وقت سوچئے کہ یہ جو ہمارے ہاں اب خالص دین کا تصور کہہ کے پیش کیا جاتا ہے کہ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی' جسے جتنا چاہے دے۔ اور جسے اس نے غریب رکھا ہے اس کی مرضی یہ ہے کہ اسے غریب رکھا جائے وہ چاہتا یہ ہے کہ وہ غریب رہے۔ تو تم اگر اس کو کسی طرح امیر بنانے کی کوشش کرو جو بھوک سے مر رہا ہے' خدا اپنی تقسیم کی رو سے چاہتا یہ ہے کہ وہ بھوکا رہے' تم اگر جا کے اس کے رزق کا انتظام کرو تو یہ تو خدا کے اختیارات کے اندر دخل در معقولات ہے' دخل اندازی ہے تم کیا کر رہے ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس رزق کو باندھ کے نہ رکھو' عام کرو تا کہ ہر ایک کی ضرورت پوری ہو تو یہ کفر کرنے والے کافر یہ بات کہتے ہیں کہ واہ! جنہیں خدا نے نپا تلا دیا ہے جنہیں خدا نے محروم رکھا ہے' مفلس رکھا ہے تم کہتے ہو کہ ہم ان کو جا کے یہ دیں' نہ بابا توبہ توبہ!!۔ کہا ان سے کہو اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ (36:47) کہا اس سے بڑی کھلی ہوئی گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے کہ غلط نظام کی بناء پہ پیدا کردہ ناہمواریوں کو خدا کی طرف منسوب کرو اور جب کہا جائے' اس کو دور کرو تو کہو کہ نہیں یہ تو نظامِ خداوندی میں دخل اندازی ہوگی۔ کہتا ہے کفر ہے یہ' ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ (36:47) ہے یہ۔ غور فرمایا آپ نے عزیزانِ من! قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ وَیَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ھٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (36:48) پھر یہ پوچھتے ہیں کہ اچھا بات یہی ہے بات تو بڑی عجیب ہے تو یہ وعدے کب پورے ہونگے۔ کہا ابھی ہو جائیں گے۔ یہ وعدے کب پورے ہونگے' کیا وعدے؟ نَحۡنُ نَرۡزُقُکُمۡ وَ اِیَّاھُمۡ (6:151) بھوکا مفلس پوچھتا ہے کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ قیامت میں جا کے پورا ہوگا' یہ کہتے ہیں کہ ابھی تمہیں معلوم ہو جائے گا پورا ہوا چاہتا ہے ابھی وہ نظام قائم ہو جائے گا۔

نظام سرمایہ داری کے ایجنٹ قرآنی حقائق کو سامنے آنے ہی نہیں دیتے

یہ چیزیں جو خدا نے اپنے ذمہ لی ہیں یہ اس نظام کی وساطت سے پوری ہوتی ہیں جو اس کے قوانین کے مطابق متشکل ہوتا ہے۔ یہ بظاہر ایک انوکھا سا سوال نظر آئے گا آپ لوگوں کو۔ وہ اس لیے کہ کبھی یہ چیزیں ان گوشوں سے کہ جو مذہب کے علمبردار بنے پھرتے ہیں' کبھی آتی ہی نہیں سامنے۔ آج بھی وہ نظامِ سرمایہ داری ہی کے علمبردار ہیں اور انہی کے مؤید ہیں' ان کے ایجنٹ ہیں' ان کی روٹی ان کے سر پہ ہوتی ہے۔ جس محلے میں بیچارے غریب جن کے پاس خود نہیں ہے وہ ان کو کیا دیں گے۔ ان سے تو یہ نچوڑتے ہیں کہ جو کچھ باقی رہتا ہے کبھی ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا دودھ پلانے کے قصے میں ہو' شادی ہوئی تو نکاح پڑھانے کے قصے میں' مر گیا تو اس کے بعد چالیس دن

تک روٹی۔لیکن یہ جو اس طرح سے فراوانی سے ملتا ہے وہ تو ان کے ہاں سے ملتا ہے کہ جو اس طرح سے ڈاکے ڈال ڈال کے لیے چلے جاتے ہیں خود۔اسی لیے ہامان اور فرعون دونوں اکٹھے رہتے ہیں' قارون ہامان اور فرعون تینوں اکٹھے ہوتے ہیں یاد رکھئے۔

قرآنی نظام کے پہلے سربراہ نبی اکرم ﷺ خود تھے جن کے ہاتھ پہ صحابہ کرامؓ نے بیعت کی تھی۔

سوال یہ ہے کہ اسکی یہ ذمہ داریاں اس نظام کی رو سے پوری ہوتی ہیں جو خدا کے احکام کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔' خدا نے خود بتایا ہے یہ۔نبی اکرم ﷺ نے یہ نظام قائم کیا حضور ﷺ اس نظام کے سربراہ تھے سب سے پہلے سربراہ۔خدا نے یہ چیز کہی تھی کہ اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَ اَمۡوَالَھُمۡ (9:111) یہاں یہ تھا کہ سودا کیا تم نے' تم نے بیچا ہے خدا کہتا ہے ہم نے خریدا ہے۔ کیسے یہ بیع ہوئی؟ ایسے ذہنی نہیں اس بیع کے متعلق قرآن نے بتایا فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِہٖ (9:111) یہ لفظ ہیں۔ بیعت کیسے ہوئی یہ؟۔میں نے بیعت کہا اور آپ کے سامنے حضرت جی آ گئے بیعت کر آیا جی میں حضرت صاحب کی۔یہ ہے جو اس نے کہا تھا بیعت ہے خدا کے ساتھ یہ معاملہ ہو رہا ہے بیچ دینا' کیسے یہ ہوا تھا؟ حدیبیہ کے مقام پہ وہ وقت آیا جب ضرورت پڑی کہ اپنی جانیں بیچ دی جائیں' ذہنی طور پہ نہیں۔وہاں یہ پھر بیعت ہوئی۔کون تھا وہاں؟ خدا تو نہیں تھا نبی اکرم ﷺ تھے۔انہوں نے آ کے یہ بیچا' رسول اللہ ﷺ نے اسے خریدا۔اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ (48:10) اے رسول جو تیرے ہاتھوں یہ بیچ رہے ہیں تیرے پاس نہیں بیچ رہے۔اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ (48:10) یہ خدا کے پاس بیچ رہے ہیں۔

رسول کے ہاتھ پہ بیعت کرنا خدا تعالیٰ کے قوانین کو عملاً تسلیم کرنا ہوتا ہے

غور فرمایا آپ نے اس نے اپنا ایک نمائندہ بھیجا ہے' اس کے پاس اتھارٹی تھی اس نے کہا تھا کہ ہمارے Behalf پہ یہ خرید و فروخت کرے گا۔آج بھی یہ بیشمار کاروبار ہوتے ہیں اصل مالک فرموں والے خود نہیں آتے ان کے نمائندے آتے ہیں۔انہوں نے یہ لکھ کے دیا ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ جو تم معاملہ کرو گے ہم اس کے ذمہ دار ہیں' وہ معاملہ ہمارے ساتھ ہوگا۔یوں یہ معاملہ عملاً طے پاتا ہے۔ورنہ اگر درمیان میں نہ آئے وہ نمائندہ ان کا تو' آپ اس فرم کے ساتھ معاملہ یہاں بیٹھے کر ہی نہیں سکتے۔کہا کہ یہ جو تمہارے ہاتھ خرید و فروخت کا معاملہ کر رہے ہیں اے رسول یہ تیرے ساتھ نہیں کر رہے اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ (48:10) یوں خدا کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے عزیزانِ من!۔اور آگے بات کی کہ معاملہ کرنے میں ان کی یہ رسم تھی آج بھی رسم ہوتی ہے وہ ہاتھ پہ ہاتھ یوں رکھتے ہیں بڑی پرانی رسم ہے معاہدے کو پختہ کرنے کے لیے۔اب بھی یہ جو حضرت صاحب بیعت لیتے ہیں وہ بھی ہاتھ یوں رکھتے ہیں۔یہ ان کے ہاں رسم تھی اپنے معاملے کو پختہ کرنے کے لیے خرید و فروخت کے معاملے کو۔کہا یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡھِمۡ (48:10) ان کے ہاتھ کے اوپر یہ جو تیرا

ہاتھ ہے یہ تیرا ہاتھ نہیں خدا کا ہاتھ ہے۔اس لیے کہ اس کے Behalf پہ یہ سب کچھ کر رہے ہیں یہ معاملہ اس کے ساتھ نہیں ہو رہا یہ اس کا نمائندہ ہے۔

خدا کے ساتھ کیے گئے معاہدہ نظامِ حیات کو توڑنے کا نتیجہ جہنم ہے

وہ جو بیع وشریٰ کا معاملہ تھا آپ نے دیکھا کہ کس طرح عملاً وجود میں آ گیا۔اب یہ بات نہیں کہ یہ امانت اس کی ہے درحقیقت' ملکیت اس کی ہے ہمارے پاس چندروزہ ہے وہ مالک نہیں ہوتا پھر یوں بیچنا پڑتا ہے۔فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ (48:10) کہا اس معاملے کو جو اس کے بعد توڑے گا اس سودے کو اس کا نقصان اسی کو ہوگا۔اور اس کے بعد ہے وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ (48:10) اور وہ جو اس معاہدے کو پورا کرے گا جو اس نے خدا کے ساتھ کیا ہے۔اب دیکھئے یہ معاہدہ خدا کے ساتھ ہو گیا۔یہ تھا وہ نظام اس کی عملی شکل' بیع وشریٰ' کی خرید وفروخت کی۔اب یہ جو اس کے ہاتھوں سب کچھ یہ لے لیتا ہے' خرید لیتا ہے یہ اس کا نمائندہ اس نظام کا۔اس نے کہا تھا کہ اس کے بدلے میں ہم اسے جنت دیدیتے ہیں۔وہاں کی جنت تو ٹھیک ہے وہاں جا کے ملے گی' یہاں کی جنت کیا ہے؟ یہاں کی جنت کے متعلق اس نے کہہ دیا تھا آدم سے کہ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (2:35) یہ ہے بنیادی خصوصیت جنت کی پہلے تو قرآن نے بتائی ہے عزیزانِ من! پہلے ہی پارہ میں قصۂ آدم میں۔پہلی چیز تو یہ ہے قرآن نے اس کے اندر آدم وزوجہ کہا ہے مرد اور عورت دونوں۔

انسانی نظام میں عورت کی گھریلو زندگی کی ذمہ داری لیکن مالی طور پر مرد کی محتاجی اور محکومی! نتیجہ زندگی بھر کا خوف وحزن

انسانی نظام نے کیا یہ' ابتدائی زندگی کے اندر تو تقسیمِ کار ایسی نہیں تھی عورتیں بھی باہر کے کام اسی طرح کرتی تھیں جیسے مرد کرتے ہیں بعد میں آہستہ آہستہ انہوں نے گھر کے اندر کے کام کاج عورتوں کے سپرد کیے' باہر کے کام کاج مردوں نے اپنے ذمے لیے۔یہ ہو گئی کچھ وقت کے لیے محتاج' معذور' وہ کما کے لایا۔ابتداً تو یہ صورت تھی کہ کوئی بات نہیں ہے مل کے کھایا۔آہستہ آہستہ عورت کی اس معذوری کو جو کچھ وقت کے لیے کما نہیں سکتی تھی' کچھ وقت نہیں بلکہ بڑا زیادہ وقت اس کا صرف ہو جاتا ہے۔حمل کا زمانہ' وضع حمل کا زمانہ' اولاد کی پرورش کا زمانہ بڑا لمبا وقت ہوتا ہے' معذور ہوتی ہے۔مرد نے اس کی اس معذوری سے فائدہ اٹھایا کہا یہ کہ رزق کا مالک وہ کمانے والا مرد ہے''اوراے ایہہ ادتا کھاندی اے''۔یہ بڑی چیز ہے!۔اب یہ اس کی محتاج قرار پا گئی۔نکاح نامے میں یہ لکھا ہوتا ہے نان ونفقہ اس کے ذمے۔یہ ہوئی عمر بھر کے لیے محتاج۔اور جونہی کوئی کسی کا روٹی کا محتاج ہوا پھر تو محکوم ہوا۔یہ جو کچھ ان بیچاریوں کے ساتھ ہو رہا ہے ان کی

اس معذوری کی بناء پہ ان کو محتاج بنایا گیا محتاجی کو Exploite کیا جاتا ہے۔ اس حد تک معذور کہ یہ بیچاریاں کانپ اٹھتی ہیں، سہمے رہتی ہیں ساری عمر کہ یہاں سے نکال دیا تو کیا بنے گا، کہاں جاؤں گی، ایک وقت کی روٹی نہیں۔ یہ ہے جو مرد نے نظام دیا۔ قرآن نے جنت کی زندگی وہ نظام جو جنت کے مثیل، یہاں بننا ہے اس کے متعلق کیا گیا۔

قرآن حکیم میں بیان کردہ قصہ آدم کے تمثیلی بیان میں مرد وزن کے لیے برابر کے حقوق کا ذکر

عزیزانِ من! قصۂ آدم کے تمثیلی انداز بڑے عجیب ہیں، بڑے گہرے گہرے معنی ہیں اس کے اندر۔ اس نے پہلے یہ کہا وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ (2:35) یہ جو جنت، جس کو آگے ہم بتائیں گے کیا اس میں ہوتا ہے، یہ مرد کی تنہا نہیں ہے ''تیرے پیؤ دی نئیں ہیگی'' مرد عورت دونوں کی ہے۔ اس کے بعد صیغۂ تثنیہ کے كُلَا مِنْهَا (2:35) دونوں کھاؤ اس میں۔ یہ نہیں ہے کہ یہ تیری جنت ہے تو بھی کھا ''ایس وچاری نوں وی دیدیا کروچوں، تیرے نال جواوہنے لادتی اے، ہن کتھے جائے اوو بے چاری''۔ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ (2:35) عجیب ہے یہ تمثیل۔ دونوں کو برابر کا حقدار بنایا ہوا ہے، وَ كُلَا (2:35) دونوں کے لیے ہے۔ کھانے کے لیے ہے رزق، جمع کرنے کے لیے نہیں ہے۔ دیکھا لفظ کیا کہہ دیا قرآن نے وَ كُلَا (2:35) کھانے کے لیے ہے، جمع نہیں کیا جائے گا۔ بھئی کتنا آدھی روٹی؟ رَغَدًا (2:35) پیٹ بھر کے۔ پیٹ بھر کے کھانے کے لیے، اسکے بعد جمع کرنے کے لیے نہیں۔ کہاں سے! اب تو یہی ہے کہ یہ میرا گھر ہے، ساتھ والا جو ہے، اس کے ہاں فاقہ آرہا ہے، اس کو یہاں سے نہیں مل سکتا۔ باہر بھی نکل جاؤ تو جیب میں پیسے اگر ہیں پھر وہ نان بائی کی دوکان سے یا ہوٹل سے مل سکتا ہے۔ حَيْثُ شِئْتُمَا (2:35) جہاں بھوک لگے وہیں سے۔

جنتی زندگی کی بنیادی خصوصیات

یہ ہے جنت عزیزانِ من! مرد اور عورت دونوں کا برابر کا حصہ، کھانے کے لیے، جمع کرنے کے لیے نہیں۔ کھانا آدھے پیٹ کا نہیں رَغَدًا (2:35) ملے گا پورا پیٹ بھر کے ملے گا۔ یہی نہیں ملے گا کہ خاص مقام ہے وہاں آجاؤ تو مل جائے، باقی جگہ گھومتے رہو بھوکے سارا دن نہیں۔ قرآن نے یہ کہا تھا وہ جو میں نے ابھی بیع کہا نا آپ کو۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111) یہ بیچ دو اور ہم اس کے معاوضے میں اس کی قیمت میں تمہیں اَلْجَنَّةَ دیدیں گے۔ یہاں کی الجنت تو یہ ہوگی کہ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (2:35) مرد اور عورت کھاؤ سیر ہو کر کھاؤ جہاں تم ہوگے، وہاں تمہیں ملے گا۔ کیا بات ہے الجنت کی۔ یہ ہے نظام اور یہ ہیں اس نظام کے قائم کرنے والے جو کہتے ہیں کہ تم نے یہ کچھ بیچا، ہم اپنی فرم کی طرف سے جس کے ہم Representative ہیں، ہم اس خدا کی طرف سے کہ جس کے Behalf پہ ہم نے یہ سودا تمہارے ساتھ کیا ہے۔

انسانوں کے لیے خدا کی ذمہ داری قرآنی اصولوں کی اطاعت سے مشروط ہے

ہم تمہیں ہمیشہ کے لیے وعدہ دلاتے ہیں کہ نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَ اِيَّاهُمۡ (6:151) تمہارے رزق کی بھی ذمہ داری لے لی ہم نے' تمہاری اولاد کے رزق کی بھی ذمہ داری لے لی۔ سمجھ میں آئی بات یہ وعدہ۔ جب تک وہ یہ وعدہ پورا کرتا رہا سودا برقرار' جس دن اس وعدے میں کچھ کمی آ گئی سودا ختم۔ پھر اطاعت نہیں اس کی کی جا سکتی' یہ نظام ہی قائم نہیں ہو سکتا۔ اس نظام کی بنیادی شرط یہ ضمانت ہے نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَ اِيَّاهُمۡ (6:151) بنیادی ضمانت۔ دیکھنا ہو پرکھنا ہو کہ اسلامی مملکت اسلامی نظام قائم ہو گیا یا نہیں۔ باقی چیزیں بھی آ گے آئیں گی' ابھی آ رہی ہیں اسی آیت میں آئیں گی ساری۔ لیکن بنیادی شرط تو اس کے اندر یہ ہے کہ اگر وہ نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَ اِيَّاهُمۡ (6:151) کے اس عہد کو پورا کر رہی ہیں تو تمہاری جان اور مال جو تم نے بیچا تھا' وہ اس کی مالک ہو سکتی ہے' تمہاری اطاعت وہ لے سکتی ہے۔ اور اگر وہ اپنے اس وعدے کو پورا نہیں کر رہی تو اسکی اطاعت تمہارے اوپر نہیں۔ تم اس کی اطاعت کر نہیں رہے تھے' تم تو اطاعت کر رہے تھے اس خدا کی جس کے ساتھ یہ سودا ہوا تھا اس کے Behalf پہ یہ سودا ہوا تھا۔ اور اگر درمیان میں Representative کسی فرم کا وہ بے ایمان ہو جائے تو وہ اس کا نمائندہ ہی نہیں رہتا۔ وہ کہہ دیتی ہے کہ یہ ہمارا نمائندہ نہیں ہے' اشتہار دیدیتی ہے یہ جتنے اب خدا کا نام لینے والے اور اس کے نام کے اوپر آپ کو Exploite کرنے والے ہیں یہ اس فرم کے نمائندے ہیں جن کے عاق نامے اس نے اعلان کر دیے ہوئے ہیں کہ ہمارے Representative نہیں ہیں۔

حضورﷺ کے فرمان کے مطابق خدا کے ساتھ کیے گئے معاہدہ سے انحراف کا نتیجہ

ہمارے Representative کی پہلی نشانی یہ ہے کہ اس وعدے کو وہ پورا کرے گا۔ اور اس سے وہ نبی اکرمﷺ کی حدیثِ جلیلہ نکھر کر سامنے آ جاتی ہے چمکتے ہوئے موتی کی طرح حضورﷺ نے فرمایا کہ جس بستی میں ایک شخص نے بھی رات ایسے بسر کی کہ وہ بھوکا تھا اور اس کو صبح ہو گئی' اُس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔ سیدھی بات ہے۔ اس نے کہا کہ وہ جو معاہدہ کیا ہوا تھا کالعدم ہے' یہ نظام اب ہمارا نمائندہ نہیں رہا' ایک فرد رات کو بھوکا سو گیا۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن نے جو کہا تھا لَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ مِّنۡ اِمۡلَاقٍ (6:151) غریبی اور مفلسی کی وجہ سے اولاد کو اس طرح کی نشوونما صحیح صلاحیتوں کی برومندی سے ان چیزوں سے محروم رکھنا بالکل نہیں۔ سوال ہوا کہ کیسے ہو گا؟ کہا ایسے کہ ہم ہیں رزق کے ذمہ دار تمہارے بھی تمہاری اولاد کے بھی۔ کیسے پوری ہو گی یہ چیز؟ اس نظام کی رو سے جو ہمارے Behalf پہ تم سے یہ چیزیں خرید کے ان چیزوں کا وعدہ تمہیں دے گا' وہ پورا کرے گا۔

تمدنی زندگی کی ابتدا گھر کے چھوٹے سے یونٹ سے کی جاتی ہے

پہلی چیز اس نے کہی تھی اَلَّا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـًٔا (6:151) فرد کو اس کے مقامِ انسانیت سے آگاہ کیا کہ دنیا میں کسی کے سامنے جھکنا نہیں۔ تمدنی زندگی کی ابتداء ہوم کے یونٹ سے کی' گھر کی وحدت سے اور اس میں یہ کہا والدین کہ جن میں عمر کی زیادتی کی وجہ سے بعض چیزوں میں کمی آ گئی ہے' ان کی اس کمی کو پورا کرتے جاؤ تا کہ گھر کا توازن نہ بگڑنے پائے۔ وَّ بِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا (6:151) اولاد کے متعلق ان کے لیے جس قدر بھی طبعی نشوونما اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے جس قدر سامان کی ضرورت ہے انتظام کی ضرورت ہے وہ کرتے جاؤ۔ یہ افراد کا ذمہ نہیں ہے' ہمارے نظام کا ذمہ ہے کہ یہ ساری چیزیں وہ پوری کرتا چلا جائے۔ نظام قائم رہے گا کب تک؟ جب تک یہ اوپر والے جنہوں نے اس کی ذمہ داری لی ہے' ان کی سیرت اور کردار پاکیزہ رہے گی۔

انسانی زندگی کو پرائیویٹ کریکٹر اور پبلک کریکٹر کی دو اصطلاح میں تقسیم کرنا یورپ کی تقلید ہے

ذرا پہلے ذہن میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ یہ جو ارکانِ مملکت ذمہ دار افراد' ان کا جو پرائیویٹ کریکٹر ہے۔ یہ یورپ کم بخت نے ہمیں یہ چیزیں سکھا دیں کہ ایک پرائیویٹ کریکٹر ہوتا ہے' ایک پبلک کریکٹر ہوتا ہے۔ فرق ان میں اتنا بڑا ہوتا ہے کہ وہ مکیاولی جو تھا اٹلی کا مدبر اس نے یہ کہا تھا کہ جو چیزیں ہم نے مملکت کے لیے کی ہیں اور اس کی وجہ سے ہمارے مجسمے کھڑے کیے جا رہے ہیں' وہ اگر ہم اپنی ذات کے لیے کرتے تو یہی قوم ہمیں شیطان قرار دیتی۔ بالکل صحیح ہے۔ ہر قسم کا جھوٹ فریب مکاری عیاری صیادی سفا کی قصابی' یہ سارا کچھ جو کچھ کیا اندرا گاندھی نے یہ سب کچھ کرنے کے بعد اس کی قوم نے اُسے سب سے بڑے سرکاری اعتراز سے نوازا۔ یہ اندرا صاحبہ اپنے گھر کے ملازم کے چار پیسے کسی فریب سے اگر روک لیتی تو وہ دعویٰ دائر کر دیتا مجرم قرار پا جاتی۔ لیکن اپنی قوم یا ملک کے لیے دوسری قوم کے ساتھ یہ سارا کچھ جو کیا اس رتنا کا اعزاز اس کو دیا گیا ہے۔ یہ کیا ہے؟ پرائیویٹ کریکٹر' پبلک کریکٹر اس میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ قرآن نے یہ بات کہی تھی کہ بالکل غلط کہتے ہو' انسانی زندگی دو حصوں میں تقسیم کی ہی نہیں جاسکتی پرائیویٹ اور پبلک کا امتیاز بالکل غلط ہے۔

گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

ظاہر اور باطن کی یک رنگی میں کامیابی کی صورت گہری ہے

وہ گوہر تو اس وقت گوہر ہوتا ہے جب باہر سے بھی گوہر ہو اندر سے بھی گوہر ہو' بلکہ یہ کہ جو اندر سے گوہر ہو تو جب باہر سے گوہر نظر آتا ہے۔ اس لیے ان افراد کے پرائیویٹ کریکٹر قوموں کے مستقبل کو متعین کرتے ہیں۔ لہٰذا کہا کہ یہ بہت بڑا نظام ہے جو ہم کہتے ہیں قائم کیا جائے۔ پورے افرادِ مملکت اور ان کی اولاد کی ذمہ داری اور ان سب کے مال و جان اپنی تحویل میں لیے ہوئے۔ اللہ اکبر! اتنا بڑا

صاحبِ قوت ہے آپ سوچو تو سہی یہ نظام، تمام افراد کے جان و مال کا مالک بنایا ہوا۔ ذمہ داری بھی تو اتنی بڑی تھی۔ کہتا ہے کہ اگر ان کے پرائیویٹ کریکٹر اس قسم کے آ جائیں پھر یہ نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لیے وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ (6:151) مَا ظَهَرَ (6:151) پبلک، مَا بَطَنَ (6:151) پرائیویٹ۔ کہا دیکھنا یہ نظام اس صورت میں قائم رہے گا فحاشی کے قریب نہ جانا کہیں۔ سوچئے تو سہی بات کہاں کی ہو رہی تھی اس کی بنیاد کیا قرار دے رہا ہے قرآن۔ ورنہ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ یہ بالکل Purely Private چیز ہے۔ یہ عیاشی اور فحاشی کے جتنے بھی شعبے ہیں ٹھیک ہے، پبلک کو اس سے کیا تعلق، کہا بالکل نہیں۔

قوموں کے تمدن پر جنسیاتی اختلاط کے متعلق یورپ کے ایک نامور محقق ڈاکٹر انون کی تحقیق

وہ جو میں آپ سے کہا کرتا ہوں کہ اب تو یورپ کے خود جتنے یہ محققین ہیں وہ بھی اس نتیجے کے اوپر پہنچے ہیں۔ وہ جو 'انون' کی کتاب کا میں حوالہ دیا کرتا ہوں Sex & Culture۔ عمر بھر کی تحقیق کے بعد اس نے ساری مہذب قوموں اور غیر مہذب قبیلوں کے اندر جا کے اس نتیجے پہ پہنچا کہ جو قوم جنسی اختلاط کے معاملے میں بے راہ روی اختیار کر لیتی ہے، اس پہ پابندیاں عائد نہیں کرتی، وہ کتنی ہی شان و شوکت کی مالک کیوں نہ ہو، زیادہ سے زیادہ تین پشتوں تک وہ زندہ رہ سکتی ہے، اس کے بعد قطعاً زندہ نہیں رہ سکتی۔ یعنی سارے انتظامات اس کے مملکت کے، سلطنت کے، فوجیں دولت اقتصادی نظام، وہ کہتا ہے سب ٹھیک ہوں بے شک، صرف جنسی اختلاط کے اندر اگر ان کے یہ کیفیت نہیں رہی تو وہ کہتا ہے تاریخ اس کی شاہد ہے، میں بتا سکتا ہوں کہ سو سال سے زیادہ وہ قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ قرآن نے کہا بہت بڑا نظام ہے جو تم نے قائم کرنا ہے جو ہم یہ کہہ رہے ہیں۔ اور اس کے لیے پہلی چیز وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ (6:151) فحاشی کے قریب نہ جانا۔

مکافات عمل کا قانون ہر ظاہر اور باطن کے لیے بڑا باریک بین واقعہ ہوا ہے

سوچئے پہلی بات کیا کہی ہے اس نے۔ ظاہر و باطن کو آپ Private & Public بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور پھر قرآن تو اس میں اور آگے جاتا ہے کہتا ہے کہ ظَوَاهِر میں تو یہ ہے جو محسوس شکل میں Actually یہ چیزیں جو ہیں وہ کہتا ہے کہ ہم تمہارے دل میں گذرنے والے خیالات اور نگاہ کی خیانتوں سے واقف ہیں۔ نگاہ کی خیانت بڑی چیز ہے خائنة الاعین نگاہ کی خیانت، اس کے نزدیک یہ بھی فحش میں داخل ہو جاتی ہے۔ دل کے خیالات اور نگاہ کی خیانتوں سے بات چلتی ہے۔ یہ تو اس کے محسوس مظہر ہوتے ہیں سامنے آتے ہیں، یہاں سے بات چلتی ہے۔ وہ چور کو نہیں، چور کی ماں کو پکڑتا ہے۔ یہ ہے مَا ظَهَرَ مَا بَطَنَ (6:151) Public & Private بھی محسوس اور غیر مرئی غیر محسوس تک بھی لَا تَقْرَبُوْا (6:151) اس کے قریب نہ جانا، Actual جو ہے وہ تو بہت آگے کی بات ہے، اس کے قریب بھی نہ جانا۔ اتنا بڑا نظام یاد رکھو اگر اتنی کمزور بنیادیں ہوئی ان کی، ان کا پرائیویٹ کریکٹر ایسا ہوا تو وہ اتنا بڑا

بوجھ یہ بنیادیں نہیں سہار سکیں گی' نہیں قائم رہ سکے گا۔ اور یہ نظام ٹوٹا ہی اس وقت ہے جب ہمارے ہاں بھی یہ چیزیں عام ہونی شروع ہوئی ہیں۔

عباسیوں کے دور میں شہنشاہ ہارون رشید کے ہاں تین ہزار لونڈیوں کا ذکر

یہ عباسیوں کے دور کے بظاہر جن کا نام لینے سے نظر آتا ہے کہ یہ تو بہت اچھے شہنشاہ تھے ہارون رشید جیسے۔ تین ہزار لونڈیاں تو ہارون رشید کے محل میں تھیں۔ کوئی حد ہے صاحب یہ۔ وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ (6:151) یہ چیز پرائیویٹ کریکٹر کی ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک انسانی زندگی کی قیمت

اس کے بعد اگلی چیز آئی جان کی حفاظت' کہا یہ بڑی قیمتی چیز ہے انسانی زندگی انسانی جان۔ ہر ایک کو اس کی ضمانت دی جائے کہ یہ محفوظ رہے گی پوری سکیورٹی اس کی دی جائے۔ قرآنِ کریم نے سورۃ مائدہ میں کہا ہے مِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ کَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ (5:32) جس نے کسی ایک جان کو بھی بجز اس کے کہ قانون کی رو سے وہ جرمِ قتل کی پاداش میں اس کو آپ موت کی سزا دیں یا ملک میں فساد برپا کرنے کے جرم میں سزا دیں' یہ تو ہے جو بالحق ہوگی۔ اس کے علاوہ اگر ناحق کسی ایک فرد کی جان بھی کسی نے لے لی فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا (5:32) یوں سمجھو جیسے اس نے پوری انسانیت کو ذبح کر دیا۔ وَ مَنْ اَحْیَاهَا فَکَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا (5:32) جس نے کسی ایک کو بھی زندگی بخش دی یوں سمجھو کہ پوری نوعِ انسانی کو زندہ کر دیا اس نے۔

قرآنی معاشرے کی بنیادی خصوصیات

اتنی بڑی قیمت ہے ایک فرد کی زندگی کی۔ اس لیے فحشاء کے اندر تو عفت اور عصمت کی سکیورٹی اور ضمانت مل گئی۔ اس میں جان کی حفاظت مل گئی۔ پہلی آیت میں رزق کی ضمانت مل گئی۔ یہی ضمانتیں چاہتے ہیں صحیح معاشرے کے اندر آپ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (6:48) میں رزق کی ضمانت' حفاظتِ عصمت' جان کی سکیورٹی۔ وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ (6:151) حرم کے معنی یہ ہیں کہ جسے خدا نے واجب التحریم قرار دیا ہے' احترام کے قابل ہے۔ وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (17:70) ہر فردِ انسانیت' وہ مستحقِ تکریم ہے اس کی عزت کی جائے گی' احترام کے قابل ہے۔ اور اصل تہذیب احترامِ آدمی۔ تہذیب کی بنیاد یہ ہے انسان کا احترام صرف اس کے انسان ہونے کی حیثیت سے۔ مدارج کا تعین قرآن کی رو سے لِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (6:132) ٹھیک ہے

اعمال اور جوہرِ ذاتی کی بناء مدارج کا تعین۔ لیکن تکریم انسان کی ہر فرد کی انسان ہونے کی جہت سے تکریم۔ اگلی ضمانت آ گئی کتنی بڑی چیز ہے کہ ہر فرد کی عزت ہو کوئی کسی شخص کو ذلیل نہ قرار دے۔

انسانی معاشرے کی تباہی و بربادی کے لیے سب سے زیادہ خطرناک چیز احترامِ آدمیت کا مفقود ہونا ہے

احترامِ آدمیت اٹھ گیا ہے آپ کے ہاں سے۔ تھوک کے بھاؤ حقارت آج بک رہی ہے۔ **وَ لَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالۡحَقِّ** (6:151) یہ دونوں معنی ہو سکتے ہیں کہ قاعدے اور قانون کے علاوہ اگر کسی کی بھی کوئی جان لیتا ہے تو قرآن نے اس کو حرام قرار دیا ہے یا یہ کہ قرآن نے جب انسانی زندگی کو واجب التحریم' واجب الاحترام قرار دیا ہے تو تم کسی جان کو نہیں ایسے لے سکتے۔ **اِلَّا بِـالۡـحَقِّ** (6:151) الحق کہا ہے اس کے لیے' قانون اور قانون بھی وہ جو خدا کا قانون ہو گا وہ الحق ہو گا یاد رکھو۔ ہم نے کہا تھا کہ آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ خدا کن چیزوں کو واجب قرار دیتا ہے' فرض قرار دیتا ہے۔ ان کی شریعتوں کے پیچھے نہ جاؤ' یہ ہیں جو چیزیں ہم نے تمہارے لیے فرض قرار دیں۔

خدا کا ہر قانون انسانیت کی نشو و نما کے لیے حکمت پر مبنی ہوتا ہے

ذٰلِکُمۡ وَصّٰکُمۡ بِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ (6:151) ہم نے اس کا حکم دیا ہے ایک ڈکٹیٹر کا حکم نہیں ہے کہ جب اس سے پوچھا جائے کہ کیوں یہ حکم دیا ہے۔ یا تو وہ کھلے لفظوں میں یہ کہے کہ ہماری مرضی ہے دیا ہم نے' اور یا ذرا لپٹا ہوا ہو تو وہ یہ کہے کہ ہاں یہ پبلک انٹرسٹ میں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اتنا بڑا بظاہر جسے تم ڈکٹیٹر کہتے ہو' خدا قادرِ مطلق وہ حکم دیتا ہے اور حکم دینے کے بعد کہتا ہے **لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ**(6:151) تا کہ تم عقل و فکر سے غور کر وان چیزوں کے اوپر کہ کیوں حکم دیے گئے ہیں۔ خدا اپنے ہر حکم کے ساتھ **لَـعَـلَّـکُـمۡ**(6:151) بتاتا ہے برادرانِ عزیز!۔ ہم نے تم سے یہ کہا **کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ**(2:183) تا کہ یہ ہو۔ جب بھی کسی حکم کے ساتھ 'تا کہ' بتایا جائے گا تو وہ ڈکٹیٹر شپ نہیں رہے گی۔ **لَـعَـلَّـکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ** (6:151) تا کہ تم غور و فکر کر وان چیزوں پہ کہ یہ کیوں حکم دیے گئے تھے۔ واقعی دینے چاہئیں تھے یہ احکام۔ لہٰذا دو آیتوں میں قرآنِ کریم نے یہ جتنے بنیادی اصول اور قواعد اور قوانین اور احکام ہو سکتے تھے انسانیت کے لیے' ان دو آیتوں کے اندر Concentrated Form میں قرآن نے دیدیے ہیں۔ ایک آیت ہمارے سامنے آ گئی (6:152) اور ایک آیت ابھی باقی ہے۔ وقت ہو گیا ہے اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

بائیسواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 152 تا 153)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1972ء کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی آیت 152 سے ہو رہا ہے (6:152)۔

مذکورہ سورت الانعام کی آیات نمبر 152 اور 153 کی اہمیت کے پیشِ نظر چند ایک اہم نکات کا ذکر

جیسا کہ میں نے سابقہ درس میں عرض کیا تھا سورۃ الانعام کی ان دو آیات 151 اور 152 ان میں قرآنِ کریم کے اصولی احکام کو اس طرح مرتکز کر کے Concentrated طریقے سے چند فقروں کے اندر یکجا کر دیا گیا ہے کہ اگر ان کے مطابق کوئی معاشرہ متشکل ہو جائے تو آپ دیکھیں کہ ابنِ آدم کو وہ فردوسِ گم گشتہ جس کی تلاش میں یہ صدیوں سے مارا مارا پھر رہا ہے پھر سے کس طرح نہیں مل جاتا۔ تین چار چیزیں تو پہلے آ گئی تھیں تجدیدِ یادداشت کے لیے انہیں دہرا دوں۔ پہلی چیز اس نے کہا تھا کہ اَلَّا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـئًا (6:151) اور میں نے عرض کیا تھا کہ خدا کے ساتھ شرک کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے مقام سے آشنا ہو جاتا ہے مقصد اس کا یہ ہوتا ہے کہ کسی طاقت و قوت کے سامنے جھکا نہ جائے کسی اور کی اطاعت نہ کی جائے' کسی کو اپنے سے برتر نہ سمجھا جائے سوائے خدا کے۔ اور اس کے بعد پھر اس کا نتیجہ جو ہوتا ہے کہ انسان کا قلب خوف اور حزن سے پاک ہو جاتا ہے۔ یہ اتنی بڑی حریت اور آزادی اور سرفرازی ہے جس کی مثال کہیں سے نہیں مل سکتی۔ یہ پہلی چیز انسان کی اپنی ذات کے متعلق کہی۔ پھر تمدنی زندگی شروع ہوئی تو یہ کہا کہ گھر ایک یونٹ ہے اس میں ماں باپ یا اور دیگر اقرباء عمر کی زیادتی کی وجہ سے جن میں کچھ کمی آ گئی ہو' ان کی اس کمی کو پورا کر کے ان کا توازن برقرار کر دیا جائے جسے وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا (6:151) کہا ہے۔ ان کا توازن صحیح ہو جائے گا تو گھر کا توازن درست ہو جائے گا اور ایک گھر کا توازن

درست ہوگا تو معاشرے کا توازن درست ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد کہا کہ یہ تو والدین کے متعلق تھا جو بڑھاپے تک پہنچ گئے۔ دوسری طرف بچوں کے متعلق یہ کہا کہ ان کی تعلیم وتربیت کو Neglect مت کروان کی انسانی صلاحیتوں کو ذبح مت کرو مفلسی کے ڈر سے۔ تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر کوئی واقعی مفلس ہے تو وہ کرے کیا۔ تو اس نے اپنا نظام بتا دیا کہ یہ نظام قائم ہونے والا ہے۔ قرآن کی رو سے کہ ہر فرد اور اس کی اولاد کے رزق کی ذمہ داری اس نظام کے سر ہوگی۔ اس لیے سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کسی فرد کی اولاد اس لیے محروم رہ جائے تعلیم وتربیت سے کہ اس کے پاس خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اور اس کے بعد یہ کہا کہ پھر معاشرے میں فواحش سے مجتنب رہو خواہ وہ ظاہر کے ہوں یا باطن کے۔ اور میں نے عرض کیا تھا کہ اس میں محسوس فواحش بھی آتے ہیں اور انسان کے دل میں گذرنے والے خیالات بھی آتے ہیں۔ اور دوسری طرف پرائیویٹ لائف بھی آتی ہے اور پبلک لائف بھی آتی ہے۔ اور پھر یہ کہا تھا کہ کسی جان کو ناحق تلف مت کرو۔ اور اس کو قرآن نے اتنی اہمیت دی ہے خاص طور پہ انسانی جان کو کہ اگر ایک شخص کی زندگی کو بھی ناحق تلف کر دیا جائے تو یوں سمجھو کہ اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔ یہ 151 میں تھا۔ اسی سلسلے میں آگے بات آتی ہے اور اب وہ معاشی نظام کی طرف آتا ہے۔ انفرادی طور پہ تو اس نے کہا کہ وَ لَا تَقۡرَبُوۡا مَالَ الۡیَتِیۡمِ اِلَّا بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ حَتّٰی یَبۡلُغَ اَشُدَّہٗ (6:152)

یتیم جن کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں اگر تم انہیں اپنی حفاظت میں لو' حفاظت میں لے کے ان کی پرورش تعلیم وتربیت تو بہر حال اپنے بچوں جیسی کرنی ہوگی۔ لیکن ان کا جو مال ہے اسے تم چھو نہیں سکتے بجز اس کے کہ وہ احسن طریقے پہ ہو۔ اور اس کے لیے قرآن نے دیگر مقامات میں بتا دیا ہے کہ وہ احسن طریقہ کیا ہے۔ حتٰی کہ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ تمہیں اس نگہداشت کے لیے اگر تمہارا اپنا انتظام ہے معاش کا اور اس سے کچھ اس پر اثر نہیں پڑتا تو پھر تو اس میں سے کچھ بھی لینا جائز نہیں ہے۔ اور اگر کچھ ایسا ہے کہ اس پہ تم وقت صرف کرتے ہو اور اس سے تمہاری اپنی معاش پر اثر پڑتا ہے تو صرف اتنا اس میں سے تم لے سکتے ہو۔ اسمیں بھی اگر نہ لو تو زیادہ اچھا ہے (4:6)۔

دین خداوندی کے بالمقابل نظام سرمایہ داری کا طریق کار

اب آگے آیا معاشرے کا پورا نظام معاشی جسے آپ کہتے ہیں۔ اس کے لیے قرآنِ کریم نے ایسی جامعیت سے ایک اصول دیا ہے کہ آج کے دور میں بھی عام سطح پہ اگر اسے سمجھا جائے تو نہایت صحیح بات سامنے آتی ہے۔ اور اگر بلند ترین اقتصادی سطح یا اکنامکس جسے آپ کہتے ہیں اس پہ دیکھا جائے تو وہاں بھی ایسے اصول اس نے دیے ہیں کہ اس کے مطابق وہ تمام تباہیاں اور خرابیاں جو تجارت کے نقاب میں ڈاکو پن کی پیدا ہو رہی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج کی تجارت تو ڈاکہ ہے' نام اس کا تجارت رکھا جاتا ہے۔ لیکن ایک جیب کترنے والا ایک ڈاکہ ڈالنے والا ایک رہزن بھی اتنا کچھ نہیں لے جاتا دوسرے سے جتنا تجارت کے رنگ میں افراد لے جاتے ہیں اور اقوام لے جاتی ہیں۔ افراد تو یہ عام کاروباری ہیں' اس سے ذرا اونچے اٹھئے تو کامرس میں بڑی بڑی Firms ہیں۔ آگے چلئے تو انڈسٹریل کنسرن

آتی ہیں، صنعتی ادارے آتے ہیں اور اس سے آگے چلئے تو ایک قوم دوسری قوم کو تجارت کے راستے سے جس طرح لوٹتی ہے، نچوڑ کے رکھ دیتی ہے دوسری قوم کو۔ اسی لیے آپ نے دیکھا کہ قومیں مثلاً برطانیہ نے بطیّب خاطر ہندوستان تک کی سلطنت کو مملکت کو چھوڑ دیا لیکن جہاں ان کی تجارت کے اوپر کہیں حرف آ کے پڑتا ہے کہیں زد آ کے پڑتی ہے اس کے تحفظ کے لیے وہ جنگ تک چھیڑ دیتے ہیں۔ اس دور میں قزاقی اور رہزنی کا ایک (مہذب) طریقہ یہ تجارت ہے۔

ماپ تول کے سلسلہ میں انصاف کا ایک لفظ اپنے اندر پورا اقتصادی نظام لیے ہوئے ہے

قرآنِ کریم نے اس کے لیے اس دور میں یہ اصول دیے اصول تو چار لفظوں میں ہیں وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ (6:152) عام ترجمہ تو اس کا یہ ہے کہ ماپ اور تول کے پیمانوں کو انصاف کے مطابق رکھو۔ لیکن بات بڑی جامع ہے۔ ماپ اور تول کے معنی یہی نہیں کہ ایک تو ترازو سے تول کے چیزیں دی جاتی ہیں اور ایک مثلاً یہ دودھ وغیرہ ماپ کے دیا جاتا ہے۔ اور اگر سمٹا کے اس کو لیا جائے تو پھر تو یہی چیز ہے کہ ترازو سے تول کے دینے والی چیزیں یا ماپ کے دینے والی چیزیں ان کو عدل کے مطابق صحیح صحیح رکھو۔ لیکن اسی کو اگر آپ پھیلائیں تو آپ دیکھیں گے کہ پوری اقتصادیات پوری کامرس، تجارت یہ سب ان دو لفظوں کے اندر آ جاتا ہے۔ اور اس کی تشریح قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پہ کی ہے۔ مثلاً سورۃ تطفیف میں اس نے بتایا یہ ہے کہ جسے آج کے دور میں یہ نظامِ سرمایہ داری کہا جاتا ہے اس کا نتیجہ ہمیشہ تباہی ہوتا ہے۔

نظام سرمایہ داری کے خدوخال اور اس کے ذرائع

کہنا یہ چاہتا ہے قرآن۔ نظامِ سرمایہ داری ویسے تو ذہن میں ہمارے آتا ہے کہ یہ جو بڑی بڑی دولت اکٹھی ہو جاتی ہے، سرمایہ ہے یہاں سے سرمایہ داری کہتے ہیں۔ اس کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ محنت کرنے والے کو اس کی محنت کا پورا معاوضہ نہیں دیا جاتا۔ یہی وہ چیز ہے جس سے سرمایہ دار کا سرمایہ بنتا ہے۔ ورنہ اگر محنت کرنے والے اس کے پاس نہ ہوں اور وہ سرمایے کو بند کر کے رکھ دے تو سرمایہ بچّے تو نہیں دیتا۔ مرغی کے انڈوں سے تو پھر بھی اکیس دن کے بعد بچے نکل آتے ہیں روپیہ تو اگر رکھا رہے، دس ہزار برس تک بھی، تو اس میں ایک روپے کا بھی اضافہ نہیں ہوتا۔ یہ سرمایہ کہاں سے بنتا ہے؟ وہ بنتا یہ ہے کہ محنت کرنے والے جو ہیں ان کو پہلے محتاج کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی احتیاج کی بناء پہ اس کے پاس آتے ہیں اور اس کے پروگرام کو وہ کامیاب کرتے ہیں اپنی محنت کی بناء پہ۔ اگر ایسی صورت ہو کہ جتنی کسی نے محنت کی ہے جو کچھ بھی اس سے پیدا ہوا ہے، وہ اس کو دیدیا جائے تو اس شخص کو کچھ نہیں ملتا پھر بھی۔ اس کا راز یہ ہے کہ دوسرے کی محنت سے جو کچھ پیدا ہوا اسے اتنا نہ دیا جائے۔

نظام سرمایہ داری انسانی صلاحیتوں کو خرید کر ان کی آزادی کو سلب کر دیتا ہے

اس سے اگلی چیز محنت ہے اور محنت جب ہم کہتے ہیں تو اسکے معنی لیبر کے ہوتے ہیں' مزدوری کے ہوتے ہیں Physical Labour جسے آپ کہتے ہیں وہی ذہن میں آتا ہے جب آپ مزدور یا محنت کش کہتے ہیں تو۔لیکن اس نظام میں وہ بھی تو ہیں جن کی عقل و دانش علم و ہنر انسانی صلاحیتوں کو بھی خریدا جاتا ہے۔انجینئر' وہ کچھ فزیکل لیبر نہیں کرتا لیکن اس کا جو ذہنی ہنر اور صلاحیتیں ہیں سرمایہ دار انہیں بھی خرید لیتا ہے۔تو دونوں چیزیں خریدی جاتی ہیں اشیاء خریدی جاتی ہیں' محنت خریدی جاتی ہیں' انسانی صلاحیتیں خریدی جاتی ہیں۔خریدی جاتی کے معنی یہ ہیں کہ ان کو بہت کم دیا جاتا ہے اور اس سے زائد جو کچھ وصول ہوتا ہے وہ شخص لے جاتا ہے جو کہتا ہے کہ میں نے اس پہ کیپٹل انویسٹ کیا ہے' سرمایہ لگایا ہے۔اس طرح سے وہ سرمایہ جو رکھے رہنے سے دس ہزار برس میں بھی ایک پائی اس میں اضافہ نہیں ہوتی' اس طرح سے جب اس سرمایے کی بناء پہ ان کی محنت اور صلاحیتوں کو خریدا جاتا ہے تو وہ سرمایہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔اسے کہتے ہیں سرمایہ داری کا نظام جس کو مٹانے کے لیے قرآن آیا تھا۔ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ (83:1) کہا ہے کہ یہ نظام بالآخر تباہ ہو کے رہتا ہے۔

لفظ مطفف کا لغوی مفہوم

کیا نظام؟ نظامِ تطفیف اسے کہیے۔مطفف قرآن نے لفظ کہا ہے۔یہ مادہ جو ہے وہ ط ف ف کا۔اب تو آپ جانتے ہیں مادہ کیا ہوتا ہے جہاں سے یہ عربی کے الفاظ بنتے ہیں اور جن کے انتخاب سے قرآن مرتب ہوا۔یہ میں نے عرض کیا تھا کہ عربوں کے ہاں زندگی تو بڑی سادہ تھی لیکن ان کی زبان میں بڑی گہرائی اور بڑی وسعت تھی۔ط ف ف کے ایک معنی تو ہوتے ہیں اونٹنی کو اس طرح سے اس کے پاؤں کو باندھ دینا کہ وہ پوری رفتار سے نہ چل سکے' بلکہ اس کا جو پروگرام اس کی جو سکیم ہے' صرف اس کے مطابق اسے چلنے دیا جائے۔آپ دیکھتے ہیں کہ اس پابندی سے کتنی گہرائی میں بات چلی جاتی ہے۔یہ جتنے بھی ہنرمند دانش مند' صلاحیتوں والے ہیں' کتنے بھی محنت کرنے والے ہیں' ان کو آزاد نہیں چھوڑا جاتا ان کو Capitalist اپنے نظام کے اندر باندھ دیتا ہے۔وہ ان سے اسی انداز کا کام لیتا ہے جس کا وہ خود چاہتا ہے۔انہیں آزادی حاصل نہیں ہوتی۔کسی بھی بکی ہوئی شے کو آزادی حاصل نہیں ہوتی۔تو بات یہ تھی بنیادی کہ وہ اسے باندھ دیتے تھے کہ آزاد نہ ہونے پائے۔اب یہاں سے آپ دیکھئے کہ عربوں نے ایک لفظ اس سے قائم کیا تھا قرآن نے استعمال کیا ہے اور آگے چل کے بات آئے گی کہ استعمال کہاں کیا ہے۔پھر اس کے معنی یہ ان کے ہاں ہوتے تھے ایسی اونٹنی جو نا تمام بچہ جن دے' بچہ اس کے پیٹ میں بھی رہے اتنا عرصہ' یہ ساری کچھ اس کی پرورش بھی ہو محنت بھی ہو لیکن نا تمام بچہ وہ جنے۔یہ محنت کش کی محنت کا معاوضہ جو نا تمام شکل میں اس کو دیا جائے یہ ہے جسے **تطفیف** کہا جاتا ہے۔

قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے عربی زبان کی اہمیت اوراس کی وسعت کو سمجھنا پڑے گا

میں نے عرض کیا ہے عزیزانِ من! قرآن سمجھنا ہو تو عربی زبان کے اس انداز سے سمجھئے۔ اور پھر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کیوں یہی ایک زبان تھی جو اس کی حامل ہوسکتی تھی۔ اب اسے تصور میں لائیے کہ آزادی نہ دی جائے اپنی منشاء کے مطابق ان کو مقید رکھا جائے' باندھ کے بھی نہ رکھا جائے' چلتا پھرتا تو وہ رہے لیکن اس کی منشاء کے مطابق۔ اوراس کا ساری محنت کا ماحصل پختہ اور مکمل شکل میں نہ ملے نا تمام شکل میں اس کو ملے اسے تطفیف کہتے تھے اور ایسا کرنے والے کو المطففین کہا جاتا تھا۔ اور قرآن نے کہا یہ ہے کہ وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ (83:1) اس قسم کا نظام قائم کرنے والوں کا انجام تباہی ہے۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ اس نظام میں تو دن بدن دولت زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے' بڑی خوشحالی ہوتی ہے' بڑی فارغ البالی ہوتی ہے بڑی Prosperity ہوتی ہے۔ پھر نیشنل انکم اس کو کہا جاتا ہے' فریب در فریب دیے چلے جاتے ہیں۔

نظامِ سرمایہ داری کی بدعملی کی خصوصیات اوراس کا نتیجہ

نظام سرمایہ داری میں سرمایہ چند افراد چند خاندانوں کی دولت کو جمع کر کے قوم کی آبادی کے اوپر پھیلا دیا جاتا ہے اور پھر کہا جاتا ہے کہ یہاں پر کیپٹا انکم اتنی آتی ہے' یہ سب فریب ہیں۔ وہ نا تمام بچہ ہوتا ہے جوان کو ملتا ہے یہ بندھے ہوئے ہوتے ہیں اس میں۔ وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ (83:1) وہ کہتا ہے کہ یہ یہ نہ سمجھو کہ Prosperity حاصل ہو رہی ہے تباہی ہے' اس کا انجام۔ اب دیکھئے خود ہی اس نے بتایا کہ مُطَفِّفِيۡنَ ہوتے کون ہیں۔ الَّذِيۡنَ اِذَا اكۡتَالُوۡا عَلَى النَّاسِ يَسۡتَوۡفُوۡنَ ۔ وَاِذَا كَالُوۡهُمۡ اَوْ وَّزَنُوۡهُمۡ يُخۡسِرُوۡنَ (83:2-3) یہاں دیکھئے اِذَا اكۡتَالُوۡا عَلَى النَّاسِ (83:2) اشیاء نہیں کہا یہاں انسان کہا ہے کہ جب کوئی انسان ان کے سامنے آتا ہے تو پھر اس کو وہ ماپتے ہیں۔ ماپنے کے بعد جتنی ان کو ضرورت ہوتی ہے يَسۡتَوۡفُوۡنَ (83:2) وہ تو پورے کا پورا لے لیتے ہیں۔ وَاِذَا كَالُوۡهُمۡ اَوْ وَّزَنُوۡهُمۡ يُخۡسِرُوۡنَ (83:3) اور جب اس کے بدل میں اسے کچھ دیتے ہیں تو ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ یہ خَسِرَ کا لفظ جو ہے ویسے تو اس کے معنی ہوتا ہے نقصان پہنچانا لیکن تولنے میں جب کوئی ڈنڈی ماری جاتی ہے یہ اس کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔

نظامِ تطفیف کے چند ایک پہلو

اندازہ لگائیے کہ الناس قرآن نے یہاں کہا ہے حالانکہ یہ ساری کامرس تجارت بیع یہ قزاقی' یہ ساری اشیاء میں ہوتی ہے' Commodities میں ہوتی ہے۔ لیکن Commodity تو بجائے خویش کچھ شے نہیں ہوتی وہ تو انسانوں کی پیدا کردہ چیز ہوتی ہے۔ قرآن نے اشیاء نہیں کہا ہے الناس کہا ہے یہاں ہوتا یہ ہے تطفیف کے نظام میں کہ وہ انسانوں کو لیتے ہیں جب انہیں ماپتے ہیں

انہیں تولتے ہیں تو جو کچھ انہیں چاہیے وہ تو پورا پورا اس سے وصول کر لیتے ہیں۔ اور جب انہیں دیتے ہیں جو کچھ انسان وہ ہوتا ہے وہ اس کے برابر انہیں دیتے' وہاں ضرور کمی کر جاتے ہیں' ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ کہا کہ یہ ہے عملِ تطفیف۔ اب دیکھئے کہ قرآن نے اس میں اصول ایک دیا ہے نہ کوئی خاص شے دی ہے' نہ اشیاء کہا ہے۔ انسانوں کے ساتھ معاملہ دوسرے انسانوں کا پڑ رہا ہے ایک طرف **مطفف** ہے دوسری طرف وہ ہے جو اپنی صلاحیتوں کو اپنی محنت کو اس کے پاس بیچنے کے لیے آیا ہے۔ وہ اس کو اسی طرح سے ماپتا تولتا ہے جس طرح سے کوئی شے اس کے پاس Commodity آئی ہے جس کو یہ کہہ رہا ہے۔ یہ لیتا پورے کا پورا ہے اور جب دیتا ہے تو اس میں ڈنڈی مار جاتا ہے' اس میں پورا نہیں دیتا۔

ہمارے ہاں قرآن حکیم کی تفاسیر نظام سرمایہ داری کے دور کی لکھی ہوئی ہیں

یہ ہے وہ نظامِ تطفیف جس کا نتیجہ تباہی ہے۔ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ . لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ(83:4-5)۔ اسی ایک آیت کو اگر آج واضح کر دیا جائے اپنے ملک میں تو دوسری اقوام کے اندر نظر آ جاتا ہے کہ قرآن کیا بات کہہ گیا تھا چودہ سو سال پیشتر۔ کہا کہ یہ لوگ جو اس نظام کو قائم کرتے ہیں۔ یہ مبعوثون یا بعث وغیرہ کے لفظ جو قرآن میں آئے ہیں میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کے یہ تراجم ہمارے جو مبنی ہیں ان تفاسیر پہ جو ہمارے نظامِ سرمایہ داری کے زمانے میں لکھی گئی تھیں' یہ صحیح مفہوم نہیں دیتیں۔ پہلی چیز تو اس میں یہ ہے کہ یہ اس دنیا کے متعلق بات ہی نہیں کرتے یہ ساری بات آنے والی دنیا کے متعلق کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ قرآن تو اس دنیا میں رہنا سکھانے کے لیے آیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہاں کے رہنے کا اثر ایک جوئے رواں کی طرح مسلسل چلتا ہے اس زندگی میں بھی' آنے والی زندگی میں بھی۔ لیکن بات تو یہاں سے شروع کرنی چاہیے' قدم زمین پہ ٹکانے چاہئیں۔ یہ بعث کے معنی ہوتا ہے راستے میں جو رکاوٹیں آتی ہیں ان کو ہٹا کے کسی کو آزادی دیدینا۔ کسی کے راستے میں جو رکاوٹ آئے اسے ہٹا دینے کے معنی میں آتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ زندگی کے راستے میں موت ایک رکاوٹ جو آتی ہے اس کو ہٹا دیا جائے تو زندگی آگے بڑھ جاتی ہے' اس معنی میں بھی یہ آئے گا اگلی زندگی کے لیے۔ لیکن اس دنیا میں جو قدم قدم کے اوپر رکاوٹیں آتی ہیں ان کے لیے بھی تو یہ لفظ آئے گا۔

قرآن حکیم انسانیت کے راستوں کی تمام رکاوٹوں کو ختم کرتے ہوئے انقلاب کی نوید دیتا ہے

آپ کو معلوم ہے یہ بعث پارٹی وہی لفظ ہے مصر میں Freedom Movement کے لیے یہ لفظ وہاں آیا۔

کہا ہے کہ جو اس طرح سے تطفیف کے ذریعے سے' نظامِ سرمایہ داری کے ذریعے سے Prosperity اس قدر ترقی حاصل کرتے ہیں' بزعمِ خویش کیا وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں راستے سے ہٹایا ہی نہیں جائے گا۔ یہ انسانیت کے کارواں کے راستے میں روک بن کے

کھڑیں رہیں گے ہمیشہ کے لیے‘ یہ ہٹائے ہی نہیں جائیں گے راستے سے؟ ۔کیا یہ اس زعمِ باطل میں بیٹھے ہیں کہ ہماری جڑیں بڑی زمین میں گڑی ہوئی ہیں‘ پہاڑوں کی طرح ہم اٹل کھڑے ہیں۔کوئی نہیں جوہمیں اپنے مقام سے ہٹا سکے۔کیا یہ اس زعمِ باطل میں ہیں کہ ہمیں کوئی راستے سے ہٹا ہی نہیں سکے گا‘ غلط ہے۔یہ راستے سے ہٹائیں جائیں گے لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ (83:5) ایک عظیم انقلاب آئے گا جس میں یہ راستے سے ہٹائے جائیں گے۔کب وہ انقلاب آئے گا‘ کیسے وہ انقلاب آئے گا ایک سطر میں بات کہہ دی ایک فقرے میں بات کہدی۔یہ عظیم انقلاب آئے گا يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (83:6) جس دن یہ پوری نوعِ انسانی خدا کی ربوبیت کوعام کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی۔یہ اس دن راستے سے ہٹائے جائیں گے یہ سنگِ گراں جوانسانیت کے کارواں کا راستہ روکے کھڑے ہیں آگے بڑھنے نہیں دیتے پہاڑوں کی طرح اٹل سمجھتے ہیں۔اب اس استعارے سے آپ دیکھئے قرآن نے جہاں کہا ہے کہ اس دور میں یہ پہاڑ روئی کے گالے کی طرح اڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔اپنے مقام سے یوں چلتے ہوئے دکھائی دیں گے تمہیں۔یہ ہیں ساری چیزیں جوقرآن کہتا جا رہا ہے۔یہ ہٹائے جائیں گے راستے سے لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ (83:5) بہت بڑے انقلاب کے دن‘ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (83:6) پوری انسانیت جس دن Mass movement کی حیثیت سے خدا کی ربوبیت کی عالمینی کوعام کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی۔یہ راستے سے ہٹا دیے جائیں گے۔اس طرح سے وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ (83:1) ہمارے سامنے آ جائے گی اس نظام کی تباہی۔اب یہ جودو لفظ یہاں کہے تھے وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ (6:152) آپ دیکھئے اس کی تشریح کس طرح سے ہوتی ہے۔اور میں نے عرض کیا ہے برادرانِ عزیز! قرآن سمجھنے کا طریقہ یہ ہے۔ایک تو محاورۂ عرب‘ یہ دیکھئے کہ وہ الفاظ اس عربی مبین میں کن معنی میں استعمال ہوتے تھے اس دور میں۔اور دوسرے تصریفِ آیات‘ یہ دیکھئے کہ قرآن کے دیگر مقامات میں اس خاص موضوع کے متعلق کیا کہا گیا ہے۔دو چیزیں سامنے لے آیئے کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں رہتی قرآن نکھر کے سامنے آ جاتا ہے۔۔

قرآن حکیم نے انسان کی تمدنی زندگی کا ابتدائی نقشہ قصہ آدم کے تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے

اس نظامِ سرمایہ داری کے خلاف اس ربوبیتِ عالمینی کی یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔جب سے انسان کی تمدنی زندگی شروع ہوئی اور اس نے جو پہلا نظام تھا وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (2:35) کہ نظام وہ ہو کہ جہاں کسی کو بھوک لگے وہاں اسکے کھانے کے لیے ہو اور وہ صرف پیٹ بھر کے اپنا کھائے اس سے زیادہ جمع نہ کرے۔یہ تھی ابتدائی جنت کی زندگی جسے آدم کے تمثیلی بیان میں بیان کیا گیا تھا۔اس کے بعد جب وہ اس سے نیچے گرا اس مقام سے یہ تو وہاں پھر بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (2:36) مفاد آپس میں ٹکرائے ایک دوسرے کے‘ لکیریں کھینچی گئی میری اور تیری کی صورت ہوئی۔اب وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (2:35) کی کیفیت نہ رہی اپنی لکیر کے

اندر کچھ مل سکتا ہے تو کھا سکتا ہے اس لکیر سے باہر کہیں نہیں کھا سکتا۔ اور پھر جن کے پاس وہی لکیریں نہیں کہ وہ صرف پیٹ بھر کے کھائے گا اپنا پیٹ تو اس کا ایک چپاتی سے بھر جاتا ہے مگر وہ گودام کے گودام اپنے بھر کے رکھے گا مفاد پرستی کے لیے۔ یہ نقشہ ہوا **بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ** (2:36) اور اس کے بعد جب اس پہ افسردگی چھائی کہ اب یہ اس کا نتیجہ تو وہ **یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَ یَسۡفِکُ الدِّمَآءَ** (2:30) ہے خوں ریزیاں ہیں، فساد ہے۔ کہا نہیں! کوئی بات نہیں ہے۔ **فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ هُدًی فَمَنۡ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ** (2:38) اس کا علاج خدا کی طرف سے ہدایات جو آئیں گی اس کے مطابق نظام معاشرے کا اگر قائم کرلو گے تو پھر کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ تو یہ وہاں سے بات چلی ہے۔

تمدنی زندگی میں انسان کی مفاد پرستیوں کے علاج کا ذکر

جب سے انسان نے تمدنی زندگی شروع کی۔ اس گروہ کی مفاد پرستیوں نے یہ نظام قائم کیا کہ ہر محنت کرنے والے کی محنت کو سلب کیا اور خدا کی طرف سے ہدایت آتی رہی جس کا وعدہ پہلی آیت میں کیا گیا تھا۔ یہ ہے نظامِ رشد و ہدایت جسے کہتے ہیں، حضراتِ انبیائے کرامؑ کی طرف سے آتا رہا۔ یہی کہتے رہے۔ تفصیل میں جانے سے تو بات بڑی ہوگی۔ ہر نبی کے متعلق یہ چیز قرآن نے دی ہے کہ اس نے آ کے کیا کہا تھا۔ حضرت شعیبؑ کے متعلق قرآن نے بڑی وضاحت سے کہا ہے۔ یہی چیز یہاں جو الفاظ آئے ہیں **وَ اِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاهُمۡ شُعَیۡبًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ** (11:84)

ہر رسول کی تعلیم کی ابتداء اس سے ہوتی تھی کہ خدا کے سوا اقتدار کسی کا نہیں ہے، بنیادی چیز ہے یہ۔ اب آگے وہ تعلیم پیش کرتے ہیں۔ **وَ لَا تَنۡقُصُوا الۡمِکۡیَالَ وَ الۡمِیۡزَانَ اِنِّیۡۤ اَرٰىکُمۡ بِخَیۡرٍ وَّ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ مُّحِیۡطٍ** (11:84) اُس نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے اس وقت میں دیکھ رہا ہوں **اَرٰىکُمۡ بِخَیۡرٍ** (11:84) بڑی مال و دولت ہے بڑی فارغ البالی بظاہر تمہیں نظر آ رہی ہے لیکن تمہارا نظام بڑا غلط ہے۔ میں تمہیں کہتا ہوں **لَا تَنۡقُصُوا الۡمِکۡیَالَ وَ الۡمِیۡزَانَ** (11:84) ماپ تول کے اپنے پیمانوں میں کمی نہ کرو۔ وہی میں نے عرض کیا ہے کہ ایک فرد جو دوکان پہ بیٹھا ہے وہاں سے لے کے پورا اقتصادی نظام اکنامک سسٹم اس اصول پہ قائم ہوگا۔ ماپ اور تول کے پیمانوں کو کم نہ کرو، اشیاء کے ماپ تول میں بھی، انسانوں کی محنت کے ماپ تول میں بھی کیونکہ الناس آیا تھا وہاں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت بڑے مال و دولت کی فراوانیاں ہیں ہُن برس رہا ہے، ایک ایک کے پاس کروڑوں روپے ہیں۔ **اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ مُّحِیۡطٍ** (11:84) دیکھ تو رہا ہوں تمہارے پاس لیکن ڈرتا ہوں اس سے کہ بہت بڑی تباہی آنے والی ہے۔ کیا بات ہے **اَرٰىکُمۡ** اور **اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ** ۔ بہت بڑی تباہی آنے والی ہے۔ کرو کیا؟ ۔ وہ تو منفی کی بات تھی کہ یہ نہ کرو۔ کرو کیا؟ **وَ یٰقَوۡمِ اَوۡفُوا الۡمِکۡیَالَ وَ الۡمِیۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ** (11:85) ماپ اور تول کو حق کے مطابق پورا رکھو۔ **وَ لَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَهُمۡ** (11:85)

یہ **بخس** جو ہے کسی شے کو یوں کم دینا بھی ہے اور کسی شے کے متعلق یہ بھی ہے کہ وہ اسی صورت' اسی اصلی شکل میں نہ دی جائے اس میں Adulteration کردی جائے۔ یہ بھی نہ کرو۔ وَ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ (11:85) دیکھئے کہاں فساد کا لفظ قرآن لایا ہے۔ اور فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ ہم تو فساد یہی سمجھتے ہیں ''جنوں اوڈا نگ سوٹا کیندے ہیگے نیں''۔ فساد بڑا جامع لفظ ہے ان کے ہاں' یہ تو صلح کے مقابلے میں ہے اس کے معنی ناہمواریاں پیدا کرنا ہوتا ہے۔ کہا کہ ناہمواریاں نہ پھیلاتے پھرو تم' یہ ایک سیدھا سا اصول ہے۔ بَقِیَّتُ اللّٰهِ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ (11:86) یہ ٹھیک ہے ایسا کرنے سے بظاہر تمہیں نظر آئے گا کہ! وہ جو تم تھی' وہ سمٹ کے تھوڑی سی رہ گئی۔

نظامِ عدل کے خوشگوار نتائج کا ذکر

کہا نظامِ عدل کے مطابق وہ جو تھوڑی سی رہ جائے گی اس کے نتائج بڑے ہی خوشگوار رہیں گے۔ کیا بات ہے صاحب!!۔ ڈر یہ ہے کہ تھوڑی سی رہ جائے گی۔ اس نے کہا یہ جو بہت زیادہ ہے' یہ تو سیلاب ہے بستیوں کی بستیوں کو بہا کے لے جائے گا۔ وہ تھوڑی سی جو رہ جائے گی' وہ تو جوئے نغمہ بار ہوگی' سمٹا ہوا پانی ہوگا' زندگی ہی زندگی اس میں ملے گی' کھیتیاں تروتازہ ہوجائیں گی' زندگی کی بہاریں ناچتی پھریں گی۔ بظاہر وہ سیلاب کے مقابلے میں بڑی چھوٹی ''آ ڈ جنوں کیندے ہیگے نیں پنجابی اچ'' اس کی حیثیت اس کے مقابلے میں بڑی چھوٹی سی ہوتی ہے۔ تو کہا یہ جو چھوٹی سی رہ جائے گی' یہ جو باقی رہ جائے گا' ڈرو نہیں تھوڑی رہ جائے گی۔ اس تھوڑی کے اندر زندگی مضمر ہوگی' اس بہتات کے اندر تباہی آئے گی۔ وَ مَاۤ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِحَفِیۡظٍ (11:86) یاد رکھو وہ جو تباہی آنے والی ہے اگر تم نے اپنی اس روش کو نہ بدلا' اس سے بچا نہیں سکونگا۔ اور میرا کام تو تمہیں تبلیغ کرنا ہے' بات کو پہنچا دینا ہے' کوئی داروغہ تو مقرر نہیں کیا گیا کہ مار مار کے سیدھا کروں۔

قرآنی حقائق کو بیان کرنے کا انتہائی بلاغت سے بھرپور اعانت کا انداز

اس سے آگے ایک بات آتی ہے جس انداز سے قرآن بات کرتا ہے۔ اور یہ بلاغت کا انتہائی اعجاز ہوتا ہے۔ یہ جو انداز ہوتا ہے ادب سے دلچسپی رکھنے والے' شاعری سے دلچسپی رکھنے والے احباب اس کو Appreciate کریں گے۔ قرآن کا ایک انداز ہے اور انداز ہوتا ہے میں نے کہا انتہائی بلاغت میں' اسے ایمائیت کہتے ہیں Suggestiveness۔ یعنی ساری کہانی یوں کھول کے نہ بیان کردینا اس انداز سے اسے بیان کیا جائے کہ درمیان میں Gap آئے اور اس Gap کو چھوڑ دیا پڑھنے والے کے اپنے Imagination پہ۔ وہ اس سے اس Gap کو پر کرے اور ساری بات سمجھ میں آجائے۔ بڑا ہی لطیف پیرایہ ہوتا ہے' لطیف اور

مشکل ہوتا ہے سہل ممتنع اس کو کہتے ہیں۔ مشکل اس لیے ہوتا ہے کہ اگر وہ Gap اس قسم کا ہے کہ میرا Imagination کسی اور نتیجے پہ پہنچا تا ہے دوسرے کا اور پہ پہنچا تا ہے تو یہ نقص ہوتا ہے اس کا۔ یا اس قدر مشکل ہو اس پہ محنت کرنی پڑے کہ وہ اسی میں گم ہو کے رہ جائے جیسے وہ بہت بڑا کوئی حساب کا سوال نکال رہا ہے' پھر یوں بات نہیں رہتی۔ وہ سہل ممتنع اس لیے کہ وہ کہنا تو بڑا ہی مشکل اور سمجھنا بڑا ہی آسان ہو اس کا اور ہو درمیان میں ایک Gap۔ یہ انداز بڑا لطیف ہوتا ہے۔ اور یہ جو بڑے ہی بلندی پہ پہنچے ہوئے شاعر یا ادیب ہیں ان کے اسلوب میں' ان کی انشاء میں یہ بات ہوتی ہے۔ بات دوسری طرف چلی جائے گی ورنہ میں آپ کو کئی شعروں سے بتاتا۔ مثلاً ایک ہی شعر سے بات سمجھ میں آ جائے گی۔ غالب اس معاملے میں بہت اونچا ہے کہتا ہے کہ

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم

میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

یعنی کھول کے کچھ نہیں اس نے کہا۔ اگر کھول کے کچھ یہاں کہہ دیتا تو پھول کی پتیاں بکھیر دیتا۔ اس حسین انداز سے ساری بات کر گیا ہے کہ ہوا کیا ہے۔ ''او توں کتھے جا کے مر گیا ایں او ستیاناس تیرا' تینوں بھیجیا سی سویر دی چٹھی دے کے''۔ یعنی اب یہ ساری کہانی بیان کر رہا ہوں' مسل رہا ہوں ان پتیوں کو۔ اب پھر سنئے Imagination پہ چھوڑیے 'تجھ سے تو کچھ کلام نہیں' ''میں تینوں کی کہناں بھائی'' تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم' ''کوئی گالی نئیں دتی اوہنوں'' کہتا ہے میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے۔ اسے کہتے ہیں ایمائیت۔

ایمائیت کے انداز میں حضرت شعیبؑ کا قوم سے خطاب

عزیزانِ من! ایمائیت Suggestiveness بڑی خوبصورت اور پیاری چیز ہوتی ہے۔ قرآن سمجھنا ہو تو اس انداز کو بھی سامنے رکھئے گا۔ مسلسل کہانی نہیں کہتا کہانی میں اس طرح سے Gap چھوڑتا ہے اس میں Suggestiveness ہوتی ہے بڑی بلیغ انداز کی۔ مثلاً یہ آیت جو میں آپ کے سامنے لا رہا ہوں۔ بات یہاں کہی ہے کہ حضرتِ شعیبؑ نے ان سے یہ کہا کہ یاد رکھو یہ انداز تمہارا بڑا غلط ہے' یہ نہیں ہونا چاہیے۔ کہا قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (11:87)

شعیبؑ! یہ تیری نماز کس قسم کی ہے جو ہمیں ایک طرف یہ بھی کہتی ہے کہ جن کو ہمارے آباؤ اجداد نے صاحبِ اقتدار بنایا تھا انہیں چھوڑ دیں۔ اور اگلی بات! یہ تمہاری نماز کس قسم کی ہے جو ہمیں کہتی ہے کہ ہم اپنے مال میں بھی اپنی مرضی کے مطابق کچھ صرف نہیں کر سکتے۔ یہ کس قسم کی نماز ہے۔ اب دیکھئے وہ Gap جو ہے آپ کے ہاں' کہانی پوری ہو جاتی ہے۔ نظر آتا ہے کہ انہوں نے جو اپنی

تبلیغ کے لیے دعوت کی آواز اٹھائی اُنہوں نے سمجھا کہ یہ ایک مذہبی قسم کا اللہ والا بندہ آ گیا ہے کہتا ہے کہ دیکھو بھئی! تم دخل نہ دو جو میں کرتا ہوں مجھے صرف نماز کی اجازت تو دیدو نا اس میں تو کچھ نہیں۔ تو اُنہوں نے کہا کہ اس میں تو کوئی چیز ہے ہی نہیں یہ تو کوئی چیز مضر نہیں ہے اس میں نقصان ہی نہیں ہوتا۔ کسی نے اپنی بھگتی کر لی' بندگی کر لی ڈنڈوت کر لیا' پرستش کر لی' پوجا کر لی اپنے اپنے طور پہ' ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ تو انہوں نے کہہ دیا کہ ہاں ٹھیک ہے ہم اجازت دیتے ہیں تمہیں صلوٰۃ کی۔ آپ کو معلوم ہے۔

صلوٰۃ کے عمل کو اگر صرف نماز کی شکل میں ادا کر دیا جائے تو اس پر کسی کافر کو بھی اعتراض نہیں ہوتا

عزیزانِ من! مذہب کے اندر صلوٰۃ' جب نماز ہو جاتی ہے' کوئی معترض نہیں ہوتا۔ انگریز کی غلامی کے زمانے میں بھی نماز کی اجازت تھی۔ آج ہندو بھی وہاں نماز کی اجازت دے رہا ہے۔ جو یہ نہیں دیکھ سکا کہ پاکستان کی مملکت ایسی وسیع رہے اس کے تو ٹکڑے کر دیئے' اپنے ہاں کے مسلمانوں کے نماز میں تعرض قطعاً نہیں کر رہا کیونکہ وہ مذہب کی نماز ہے۔ یہی انہوں نے سمجھا ہو گا اس لیے کہ وہ قوم تو دین کو ابھی جانتی نہیں تھی' مذہب کی بات تھی۔ انہوںؑ نے صلوٰۃ کی بات کہی ہو گی انہوں نے کہا کہ کوئی حرج نہیں۔ ٹھیک ہے ہم اپنے ہاں بتوں کی گھنٹی وٹی بجا لیتے ہیں' یہ اپنے کہیں خانقاہ میں مصلے پہ نکڑ میں بیٹھ کے یوں کر لیا کرے گا' کر لیا کرے' ہمارا کیا بگڑتا ہے۔

قرآنی صلوٰۃ کا تعلق تو قرآن حکیم کے اقتصادی نظام سے بھی ہے

آپ نے دیکھا یہ ساری کہانی۔ انہوں نے کہا کہ شعیبؑ! ہم نے تو سمجھا تھا کہ تو نماز پڑھنے کے لیے ہم سے کچھ اجازت مانگ رہا ہے یہ تمہاری نماز کس قسم کی ہے کہ وہ ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنا مال اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکیں عجیب قسم کی صلوٰۃ ہے۔ آپ نے دیکھا عزیزانِ من! دین کی صلوٰۃ اور مذہب کی نماز میں فرق کتنا ہے۔ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں حضرتِ شعیبؑ ان سے کہ اپنی اقتصادیات کو اس نظام میں رکھو' یہ معاشی نظام غلط ہے یہ صلوٰۃ ہے انؑ کی۔ کہا انہوں نے صرف یہی ہے کہ ہم تو یہ سمجھے تھے اور تمہاری صلوٰۃ عجیب قسم کی ہے۔ صلوٰۃ اس نظام کو کہتے ہیں جس میں ہر فرد قانونِ خداوندی کے پیچھے چلتا جائے۔ اسی کی ایک Miniature Form چھوٹے پیمانے کے اوپر ایک شکل ہے جو اجتماعِ صلوٰۃ کہلاتا ہے۔ کہ قرآن نے کہا ہے کہ صلوٰۃ کے اجتماعات کا انتظام رکھو وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (42:38) کیونکہ تمہارے معاملے باہمی مشاورت سے طے ہونے ہیں۔ اب دیکھا صلوٰۃ کا اجتماع کیا ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ شعیبؑ! یہ تمہاری صلوٰۃ عجیب قسم کی ہے کہ اب تم لگے ہو یہ بھی کہنے کہ کاروبار یوں کرو ماپ تول یوں رکھو' نظامِ معیشت یوں قائم کرو' تجارت اس طرح سے ہو سکتی ہے' ایسے نہیں ہو سکتی۔ اور یہ سارا کچھ نظر آتا ہے کہ انہوں نے یہ صلوٰۃ کے نام پہ یہ سب کچھ کہا ہے۔ اسی لیے انہوں نے صلوٰۃ کے متعلق کہا ہے کہ یہ عجیب قسم کی صلوٰۃ ہے۔ باقی رہا یہ کہ محنت کشوں کی محنت تم لے جاتے ہو۔ کیا

طنز ہے!! اِنَّکَ لَاَنۡتَ الۡحَلِیۡمُ الرَّشِیۡدُ (11:87) ہاں! سارے جہاں کا درد تمہارے ہی جگر میں ہے بہت بڑے آ گئے غریبوں اور محنت کشوں کے ہمدرد کہیں کے۔ جاؤ جاؤ اپنا کام کرو۔ اِنَّکَ لَاَنۡتَ (11:87) دیکھئے! حالانکہ یہ اِنَّکَ (11:87) ہی کافی تھا ''توں ای رہ گیاں ایں'' صرف ایک تم رہ گئے ایسے بڑے درد خواہ بڑے غمگسار بڑے رقیق القلب، رشید اور بڑے سمجھدار بڑے عقل والے۔ ایک طرف تو یہ کیفیت کہ درد اور غم اتنا دوسری طرف یہ کہ یہ سارے نظامِ معیشت بڑی Technical چیز ہے ہم جانتے ہیں او تم رشادت اس کی بھی تمہارے ہی حصے میں آ گئی۔ جاؤ تمہیں کیا پتہ ہے کہ یہ کیا چیزیں ہوتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہاں! مجھے اتنا پتہ ہے کہ محنت کش کو اس کی محنت پوری نہ دی جائے تو نتیجہ تباہی ہوتا ہے یہ میں سمجھتا ہوں یہ تم نہیں سمجھتے۔ وَ اَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَ الۡمِیۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ (6:152) یہ پابندیاں عائد ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ اُدھر یہ کہا گیا تھا کہ سب سے بڑی آزادی تمہیں دی جائے گی۔ یہ پابندیاں عائد ہو رہی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ تو آزادی دینے کا مدعی تھا پابندیاں عائد کیے چلا جا رہا ہے۔ لَا نُکَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا (6:152) اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ہم کسی جان کو کسی ذات کو اس سے زیادہ مکلّف نہیں ٹھہراتے جتنی کہ اس کی وسعت ہوتی ہے اس کی وسعت سے زیادہ نہیں۔ اس کے متعلق تو میں کبھی بعد میں عرض کرونگا کہ وسعت کوئی محدود شے نہیں ہے مقید شے نہیں ہے کہ اتنی ہی ہوتی ہے اس سے زیادہ نہیں ہوتی۔ قرآن کی تو تعلیم ہے کہ وسعت کو زیادہ سے زیادہ انسان کرتا چلا جائے اختیارات اپنے بڑھاتا چلا جائے۔ ٹھیک ہے اس اعتبار سے آپ کہیے کہ اپنے اختیارات کو اپنی وسعتوں کو اپنی صلاحیتوں کو بڑھاتے چلے جایئے اس کے مطابق تمہارے اوپر فرائض یا ذمہ داریاں عائد ہونگی یہ بھی ہے۔

عملی زندگی میں خدا کی طرف سے عائد کردہ پابندی زندگی کو روبہ عمل کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے

لیکن یہاں جو بات کہی اور دیگر کئی مقامات پہ بھی کہی ہے اس کے معنی اور ہیں۔ لَا نُکَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا (6:152) تمہیں اس کے متعلق کچھ گراں تو گذرتا ہوگا کہ ہر بات کے اوپر پابندی۔ یہ پابندیاں ہم ایسے نہیں عائد کرتے جیسے ایک تھانیدار، کوئی داروغہ پابندیاں عائد کر رہا ہوتا ہے۔ ہم یہ پابندیاں عائد کرتے ہیں کہ ان پابندیوں سے تمہاری ذات کے اختیارات میں وسعتیں پیدا ہوتی چلی جائیں۔ یہ ایک عجیب فارمولا قرآن نے بتایا ہے اور آج کی سائیکولوجی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ یہ آپ نے نہریں تو دیکھی ہیں یہ چلتی ہیں یہ کم از کم کوئی پانچ سات سو میل سے شروع ہوتا ہے دریا یا نہر جس میں سے نکلتی ہے اور اتنا لمبا فاصلہ وہ طے کرتی ہوئی چلی آتی ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ اس کی روانی کس چیز سے قائم رہتی ہے۔ یہ تھوڑے تھوڑے سے فاصلے کے بعد آپ نے دیکھا اس کے راستے میں ایک فال یا ٹھوکر آتی ہے وہاں پتھر گاڑ دیے جاتے ہیں وہ آ کے ان پتھروں سے ٹکراتی ہے اس کی روانی میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ جو اس قسم کی بظاہر پابندیاں ہوتی ہیں وہ انسانی ذات کی جوئے رواں پہ ایک ٹھوکر کا کام دیتی ہیں جن سے ٹکرا کر اس کی رفتار اور تیز

ہو جاتی ہے۔ یہ ساحل ہوتے ہیں جن کے اندر پانی رہتا ہوا ایک نہر کی شکل اختیار کرتا ہے جس سے فائدے ہی فائدے ہوتے ہیں۔ یہ ساحل ٹوٹ جاتے ہیں تو وہ پانی سیلاب بن جاتا ہے جو تباہی ہی تباہی لاتا ہے۔ یہ جسے ہائیڈروالیکٹرک آپ کہتے ہیں وہی پانی پوری نہر کی شکل میں بہتا ہوا چلا جائے' اس میں یہ قوت ہوتی نہیں ہے۔ اس کو سمٹا کے جب ایک پائپ کے اندر سے گذارا جاتا ہے اور اوپر سے نیچے کو بہایا جاتا ہے تو اتنی بڑی قوت اس کے اندر ہوتی ہے۔ بہت بڑی ٹربائین ہوتی ہے جس کو وہ اس طرح چلاتا چلا جاتا ہے۔ یہ جو ان چیزوں کو کسی ساحلوں کے اندر پابند کرنا ہوتا ہے قرآنِ کریم کی یہ پابندیاں' بظاہر جو آپ کو نظر آتی ہیں کہ یہ تو ہماری آزادی کے راستے میں پابندیاں ہیں' پابندیاں نہیں' تمہاری صلاحیتوں کو Concentrate کر کے کسی نقطے کے اوپر مرکوز کرتا ہے تمہاری ذات میں اس سے اور زیادہ وسعتیں پیدا ہوتی ہیں۔

می شود از جبر پیدا اختیار

یہ آج یہ سائیکاٹرسٹ وغیرہ یا Psycho Analysis والے جو یہ علاج کرتے ہیں اب ان طریقوں کے اوپر' جن کو آپ کہتے ہیں ایک خاص پابندی لگانے کے بعد پھر اس کو چھوڑ دینا' پھر پابندی لگانا پھر اس کو چھوڑ دینا۔ اس طرح سے اس میں ایک خاص توانائی ابھرتی ہے۔

قانون کی پابندی انسانی صلاحیتوں کو توانائی عطا کرنے کا ذریعہ ہے

لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (6:152) درمیان میں کہا کہ یہ نہ کہو کہ اتنی پابندیاں لگا دیں اور ہمیں تو جکڑ کے رکھ دیا' جکڑ کے نہیں رکھ دیا۔ قانون کا انتظام یا پابندی معاشرے کی صلاحیتوں کو بڑا ہی نکھارتا ہے' بڑی وسعتیں دیتا ہے۔ قانون کے تابع جب معاشرے کی صلاحیتوں توانائیوں کو رکھا جائے' اس سے صحیح نتائج' خوشگوار نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ہیں وہ پابندیاں جن کا نتیجہ وسعت ہوتی ہے' لا قانونیت نہیں' اُس سے تو Defuse ہو جاتی ہے ساری صلاحیت' کوئی نتیجہ نہیں ہوتا سوائے تباہی کے۔ قانون کے اندر گھری ہوئی صلاحیتیں جب کام کریں گی آپ دیکھیں گے ان کا نتیجہ کیا اچھا ہوگا۔ یہ ڈسپلن کہلاتا ہے۔ فوج کی قوت اس کی کامیابی کا راز اس ڈسپلن کے اندر ہوتا ہے۔ آپ سوچئے کہ اگر فوج کو اوپر سے لے کے نیچے تک ہر درجے میں مثلاً آگے سب سے جو سپاہی ہے اس کو ہی اگر اس کی آزادی دی جائے کہ وہ جو جی میں آئے کرے۔ ذرا نقشہ سامنے لائیے اس فوج کا کہ جس کے ہر سپاہی کو یہ آزادی ہو کہ وہ جو جی میں آئے کرے۔ میں کہتا ہوں خرابی کی نیت سے نہ بھی کرے' بڑے حسنِ نیت سے اپنی طرف سے یہ سمجھ کے کرے کہ ہاں یہی بہتر ہے۔ لیکن ذرا سوچئے اس فوج کی کیفیت کیا ہوگی جس کے ہر سپاہی کو یہ اجازت ہو کہ یہ نہیں کہ جو اوپر انسٹرکشن یا حکم ملا ہے' اس کے مطابق کرے بلکہ وہ جو بہتر سمجھتا ہے کرے۔ یہ جو پابندی عائد ہوتی ہے اِلَّا وُسْعَهَا (6:152) اس سے انسانی ذات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

زندگی کے حسن کو برقرار رکھنے کے لیے ہر آن عدل کو ملحوظ رکھنے کی تاکید

درمیان میں یہ کہہ کے پھر آگے بڑھ گیا آگے پھر پابندی۔ وَ اِذَا قُلۡتُمۡ فَاعۡدِلُوۡا وَ لَوۡ کَانَ ذَا قُرۡبٰی (6:152) جب بھی کوئی بات کرو' کہو یا کرو' عدل کو ملحوظ رکھو' عدل کے مطابق کرو خواہ وہ کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہو۔ عام طور پہ تو عدل کرتے ہی رہتے ہیں فرق وہاں پڑتا ہے جہاں کوئی قریب' قریب کے معنی یہاں رشتے داری کی قربت نہیں ہے۔ کسی انداز سے بھی جو قریب ہو جائے وہاں عدل کا دامن چھوٹتا ہے آ کے۔ خواہ وہ رشوت کے ذریعے قریب ہو جائے خواہ وہ سفارش کے ذریعے قریب ہو جائے خواہ وہ دوستی کے ذریعے قریب ہو جائے خواہ وہ رشتہ داری کے ذریعے سے قریب ہو جائے عدل چھوڑتا ہے انسان۔ اس وقت جب ہر ایک اتنے ہی اتنے Distance کے اوپر رہے Equal Distance جسے کہتے ہیں اس وقت انسان خود بخود عدل کرتا ہے۔

عدل ایک ایسا درمیانی نقطہ ہے جو زندگی کے سرکل کا حسن بگڑنے نہیں دیتا جب کہ امت مسلمہ کا یہی فریضہ تھا

یہ جو قرآن نے کہا تھا کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ (2:143) جسے عام طور پہ کہا گیا کہ تمہیں ہم نے ایک درمیانے درجے کی امت بنا دیا ہے تا کہ تم نوعِ انسانی کے اعمال کی نگرانی کرتے رہو۔ تو وَّسَطًا (2:413) کے یہ معنی ہیں درمیانے درجے کے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جس طرح سے مرکز یا سنٹر دائرے کے محیط سے کسی نقطے سے دیکھئے وہ Equal Distance پر ہوتا ہے' یکساں فاصلہ اس میں ہوتا ہے۔ کبھی نہیں ہوتا کہ کسی سے وہ قریب ہو کسی سے وہ بعید ہو۔ کہا کہ تمہارا مقام اس دنیا کی قوموں میں یہ ہے کہ ہر فرد اور ہر قوم تمہارے نزدیک Equal Distance کے اوپر ہو۔ اب کوئی قریب نہیں کوئی بعید نہیں' اس لیے عدل تو اس کا لازمی نتیجہ ہو جائے گا۔ یہی چیز قرآن نے یہاں کہی ہے کہ یاد رکھو! عدل کا دامن اس وقت ہاتھ سے چھوٹتا ہے جب یہ نقطہ کسی سے قریب ہو جاتا ہے کسی سے بعید ہوتا ہے۔ اور آپ کو پتہ ہے پھر اس دائرے یا سرکل کا حلیہ کیا بگڑتا ہے۔ ذرا سوچو تو سہی کہ جو محیط ہے اس میں کوئی حصہ سنٹر سے قریب ہو جائے کوئی بعید ہو جائے پھر یہ دائرہ رہے گا۔ کیا بنے گا یہ؟ زندگی کا دائرہ پاکستان کا معاشرہ بن جائے گا۔ کہاں کہاں لفظ لے آتا ہے قرآن۔

نظامِ عدل کے بنیادی تقاضے اور مسئلہ شہادت کی اہمیت اور اس کے خدوخال

عدل کے متعلق قرآن نے یہاں تو صرف یہی کہا ہے کہ ذَا قُرۡبٰی (6:512) دوسرے مقام پہ اس کی تفصیل دی ہے دیکھئے کہ عدل کا تقاضا کیا ہے۔ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ (4:135) ایمان کا دعویٰ کرنے والو! عدل کے

اوپر قائم رہو۔عدل کی بنیاد ہوتی ہے شہادت پہ۔اور اسی لیے قانون دان جانتے ہیں کہ Evidence قانونِ شہادت جو ہے مشکل تریں قانون ہے' وسیع ترین قانون ہے کہ مقدمے کا سارا مدار اس کے اوپر ہوتا ہے۔کہا کہ عدل کے قیام کے لیے شہادت کی ضرورت ہوگی۔شاہد گواہ یا مدعی کی طرف سے آتا ہے یا مدعا علیہ کی طرف سے یا استغاثے کی طرف سے ہوتا ہے یا صفائی کی طرف سے۔وہ ان میں سے کسی کی طرف سے ہوتا ہے۔کہا نہ! یہ بات نہیں ہے شُهَدَآءَ لِلّٰهِ (4:135) تم اللہ کی طرف سے گواہ بن کے جاؤ۔پہلے ہی بات کاٹ کے رکھ دی۔اب دیکھئے کہ وہاں جا کے جو تم شہادت دو۔کس معیار پہ قرآن پہنچاتا ہے اس جماعت کو جسے وہ یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (4:135) سے خطاب کرتا ہے۔

کہتا ہے' شہادت دو وہاں جا کے۔وَ لَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ (4:135) خواہ وہ شہادت تمہاری اپنی ذات کے خلاف کیوں نہ جائے۔اللہ اکبر۔یہ ہے عدل یہ ہے شہادت اپنے خلاف شہادت دو۔اَوِ الْوَالِدَيْنِ (4:135) تمہارے ماں باپ کے خلاف کیوں نہ جائے وَ الْاَقْرَبِيْنَ (4:135) تمہارے رشتہ داروں کے خلاف کیوں نہ جائے۔اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا (4:135) پارٹیوں میں سے کوئی دولت مند ہو کوئی غریب ہو فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا (4:135) یہ بات نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی ایک اپنی دولت کی وجہ سے تمہارے قریب ہو جائے گا' ذہنی طور پہ وہ تم سے بعید ہو جائے گا۔اللہ کے لیے تم تو گئے ہو گواہ بن کے اور اللہ کے نزدیک یاد رکھو یہ جو ہیں یہ سب برابر ہیں گواہی کے لیے' کوئی کسی قسم کا Consideration اس میں نہیں آنا چاہیے۔فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا (4:135) پھر تمہارے ذاتی جذبات کہیں اس چیز کے اوپر غالب نہ آجائیں کہ تم عدل سے کام نہ لو۔یہ ذاتی جذبات بڑی بری چیز ہوتی ہے یہی تو انسان میں لغزش پیدا کرتے ہیں یہ نہ کہیں پیدا ہو جائے۔وَ اِنْ تَلْوٗٓا (4:135) یہ بھی نہ ہو کہ وہاں جا کے شہادت تو دو لیکن کچھ ایسی Diplomatic Language استعمال کرو کہ یہ بھی معنی نکل آئیں اور وہ بھی معنی نکل آئیں۔خدا نہ کرے کہ کسی کا واسطہ پڑے ورنہ کہیں جا کے یہ جو پروفیشنل گواہ ہوتے ہیں' کبھی عدالت میں ان کی گواہی سنئے کہ وہ بڑے چالاک ہنرمند پولیس والے اور یہ وکیل حضرات کے بھی کان کاٹ جاتے ہیں وہ اس قسم کے گواہ ہوتے ہیں۔اس قسم کی بات ہوتی ہے وہاں۔کہا یہ بھی غلط ہے' نہ! زبان کو لپیٹ کے بات نہ کرنا۔قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (33:70) ایک جیسے دیوار سیدھی کھڑی ہوتی ہے اس قسم کی بات' ذومعنی بات نہیں مبہم بات نہیں۔اَوْ تُعْرِضُوْا (4:135) اور یہ بھی نہ کرو کہ بڑی مشکل میں آپھنسے ہم' اُدھر یہ ہے اِدھر یہ ہے سچ بولتے ہیں یہ ہوتا ہے' جھوٹ بولتے ہیں یوں ہوتا ہے' سمن کی تعمیل ہی نہ ہونے دو کہا یہ بھی بات نہ ہو اعراض برت لو تم۔یہ ہیں عدل کے تقاضے قرآن کی رو سے شہادت کے یہ تقاضے ہیں۔کہ کسی خطۂ زمین میں اگر اس قسم کا کوئی گروہ ہو جائے وہاں کوئی جرم کسی طرح سے اس کا ارتکاب ہو بھی سکتا ہے؟ اور کوئی جرم بلا عدل کے رہ بھی سکتا ہے؟۔وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (6:152) عدل کرو ہمیشہ۔عدل کی ایک

شرط قرآن نے ایسی عائد کی ہے کہ دنیا کے کسی کوڑ میں بھی آپ کو نہیں ملے گی۔ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا (5:8) کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پہ آمادہ نہ کردے کہ اس کے ساتھ عدل نہ کرو۔ ورنہ Every thing is fare in love and war. دشمنی اور جنگ کے لیے تو ہر چیز فیئر قرار دی جاتی ہے ۔لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا(5:8) کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پہ آمادہ نہ کرسکے کہ عدل نہ کرو۔فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی (6:153)اور اگلی بات آئی وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا (6:152)

خدا کے ساتھ معاہدہ کرنے اور مسلمان کہلانے کی بنیادی شرط کی وضاحت

سب سے بڑی چیز خدا کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا اسے پورا کرو۔ خدا کے ساتھ معاہدہ کے متعلق میں پچھلی دفعہ بھی عرض کر چکا ہوں اور یہ تو بار بار سامنے آئے گا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ مسلمان ہونا جسے اب کہتے ہیں میں پھر دہرادوں کہ ہم لوگ پیدائشی مسلمان ہیں اور ہمارے لیے تو مسلمان ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ''اسی تے ہوئے ہوئے ای ہونے آں''۔ کبھی ساری زندگی میں کسی کو یہ خیال آیا ہے کہ یہ کچھ ہونا پڑتا ہے' نہ۔ لیکن جو ہوتے بھی ہیں۔ ہمارے غیر مسلم جو مسلمان ہوتا ہے اس سے بھی وہ چار کلمے آپ پڑھا لیتے ہیں نا اس کے بعد مبارک ہو جی دعا کرو جی اللہ عاقبت بخیر کرے۔''ایہدی دنیا دا بیڑہ غرق دے کر لیتا اے اسی' سیدھی جی گل اے جیہڑا چنگا بھلا کھاندا پیندا تے ساہڑے اچ آ رلے' چمگدڑاں دے گھر پروناں گیا سی اوہناں کہیا اک ڈالی نال میں لٹکیاں دوئی نال تو لٹک جا۔ اوہدے لئی فیر دعا منگدے ہیگے نیں پئے''۔ لیکن جب مسلمان ہونا پڑتا تھا تو اس کے لیے ایک معاہدہ کرنا پڑتا تھا Contract تھا اور پھر اس Contract کو دہرادوں میں۔اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111) یہ جا کے کہتا ہے کہ اپنی جان اپنا مال یہ بیچنے کے لیے آیا ہے۔ وہ کہتے ہیں بہت اچھی بات ہے' ہم خریدتے ہیں۔ قیمت کیا دو گے کہا الْجَنَّةَ (9:111) دیں گے' جنت دیں گے۔ میں پھر یہ عرض کردوں کہ ہمارے ہاں اگر اس کے یہ معنی بھی لیے جاتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے جان اور مال اللہ کے پاس تم نے بیچا ہے' وہ بیچ دؤوہ رہے گا تمہارے ہی پاس۔ کہا ملے گا کیا' اس نے کہا جس طرح سے تم نے کچھ دیا اسی قسم کا تمہیں یہاں ملے گا۔ تم نے بھی تو ذہنی طور پہ کچھ دیا نا ''سچ مچ تے نئیں نا دتا' اوتھوں وی تینوں ثواب مل جائے گا اوہنے وی لکھ نئیں دینا تینوں۔ تے ایہو جیاں نال ایہو جئے ای سودے ہونے چاہیدے نیں''۔

عرب کے ایک سردار کے استفسار پر قرآنی نظام کی سرفرازیوں کے ثبوت کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ایک عملی شہادت

جب یہ معاہدہ حقیقت میں ہوا کرتا تھا تو اب بھی تاریخ ہماری شاہد ہے عجیب روایت ہے وہ۔ بہت بڑا سردار تھا عرب کا وہ حضور ﷺ

کے پاس آیا انہوں نے کہا آپ ﷺ ایک دعوت دیتے ہیں اسلام کی اگر میں دعوت قبول کرلونگا تو اس کے بعد کیا ہوگا۔ پہلی چیز یہی تھی کہ ٹھیک ہے آخرت کی زندگی سنور جائے گی وہاں یہ کچھ ملے گا۔ اس نے کہا یہ چیزیں تو سرِ دست بہرحال ماننے کی ہیں' عقیدت کی ہیں' ذہنی چیزیں ہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ کرنے کے بعد اس وقت تو یہ حالت ہے میرے خاندان کی میرے قبیلے کی ہماری' مگر تمہاری دعوت قبول کرنے کے بعد اس میں کیا ہوگا یہ بتاؤ۔ دیکھا یہ کیسے مسلمان ہوتے تھے ''بڑے کھرے ہوندے سن سودے''۔ تو یہ عزیزانِ من! وہ ہے بنیادی چیز۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے بعد عرب اور عجم کے اوپر تمہیں تمکن حاصل ہوگا اور ایسا تمکن کہ جس میں کوئی خوف و حزن نہیں ہوگا اور تمہارے علاقے کو بھی کوئی خوف وحزن نہیں ہوگا۔ کیا کہتے ہو۔ اس نے کہا بسم اللہ۔ یوں مسلمان ہوتے ہیں۔ وہ الْجَنَّةَ یہاں سے شروع ہوجاتی ہے۔ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111)۔ اس لیے کہ جو وہ بیچ رہا تھا جنس جو دے رہا تھا وہ بھی ذہنی نہیں تھی۔ وہ تھی يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ (9:111) ذہنی طور پہ نہیں دے کے گھر میں آجاتا تھا پھر اس کے بعد جب بھی آواز بلند ہوتی تھی' سر ہتھیلی پہ لے کے آجاتا تھا' میدانِ جنگ کے اندر آجاتا تھا۔ اور یہاں کیفیت اس کی یہ ہوتی تھی کہ یا تو فاتح منصور واپس آتا تھا یا وہاں جان دیدیتا تھا۔ یہ تھا معاہدہ مسلمان ہونے کا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

تو یہ چیز تھی یہ وہ معاہدہ تھا یہ وہ کنٹریکٹ تھا جو اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ اور آپ نے دیکھا کہ اس بنیادی کنٹریکٹ کے بعد جس عمل کا ذکر کیا ہے قرآن نے گویا وہ انتہائی چیز ہے جو یہاں کہی ہے۔ یہ زندگی ساری کے اندر کی یہ چیزیں یہ کچھ نہیں یہاں کہیں۔ وہ تو ہوتی رہیں گی کر بھی سکتا ہے۔ سب سے مشکل ترین مرحلہ یہ تھا جان دینے کا جو مرحلہ ہے۔

قرآنی تصور کے برعکس ہمارے ہاں جہادِ صغیر اور جہادِ کبیر کے متعلق پایا جانے والا تصور

یہ ہے عزیزانِ من! جہادِ کبیر' یہ ہے سب سے بڑا عمل جس کا قرآن نے یہاں فوراً ذکر کیا ہے۔ راستے کی چیزوں کا ذکر نہیں کیا وہ بہت چھوٹی چھوٹی رہ جاتی ہیں۔ یہ تو بہت بڑی سازش تھی مسلمانوں کے خلاف جو ہوئی کہ اس سے یہ جو قتال فی سبیل اللہ تھا اس جہاد کے متعلق کہہ دیا کہ یہ جہادِ صغیر ہے بہت چھوٹا سا جہاد ہے۔ جہادِ کبیر کیا ہے!؟ مباحثے کرنا مناظرے کرنا قلمیں دواتیں لے کے کتابیں لکھنا' یہ جہادِ کبیر ہے۔ اسی کا قرآن ذکر کر رہا ہے اس معاہدے کے بعد يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ (9:111) پھر مردِ مجاہد کی کیفیت ہی یہ ہے میدانِ جنگ میں وہ جاتا ہے اور وہاں پھر جیسے یہ یا تو ان کو قتل کر دیتا ہے' مار دیتا ہے۔ فاتح ومنصور ہوجاتا ہے یا اپنی جان دیدیتا ہے۔ وہ کبھی ہتھیار رکھ کے نہیں میدانِ جنگ سے واپس آتا۔ دو ہی چیزیں قرآن نے کہی ہیں!۔ بات دور چلی

جائے گی۔کہا یہ کوئی نئی بات نہیں جو ہم کہہ رہے ہیں کہ اس طرح سے مسلمان ہوا جاتا ہے۔**وَعۡدًا عَلَيۡهِ حَقًّا فِي التَّوۡرٰةِ وَ الۡاِنۡجِيۡلِ وَ الۡقُرۡاٰنِ** (9:111) یہ وعدہ ہے خدا کا' خدا کے اوپر ایسا کرنا واجب ہے **الۡجَنَّةَ**(9:111) دینا یہاں۔

خدا تعالیٰ کی ذات اپنے وعدہ سے کبھی انحراف نہیں کرتی

آپ دیکھتے ہیں کہ خدا قادرِ مطلق ہے اس جیسا آزاد کہاں ہوسکتا ہے وہ جو جی میں آئے کرنے والا' اپنے اوپر پابندیاں عائد کر رہا ہے۔جب کہا ہے کہ واجب ہے خدا کے اوپر ایسا کرنا' انسان پہ جو چیزیں واجب ہیں اس کو تو اختیار ہے کہ جی چاہے وہ کرے' جی چاہے نہ کرے خمیازہ بھگتے۔خدا نے جو اپنے ذمے واجب قرار دی ہے بات اس کے خلاف تو وہ کر ہی نہیں سکتا۔**وَعۡدًا عَلَيۡهِ حَقًّا** (9:111) بڑی سچی چیز واجب ہے اس کے اوپر۔اور یہ چیز جو اس نے کی ہے' نئی بات نہیں ہے' تورات میں بھی یہی کہا گیا تھا' انجیل میں بھی یہی کہا گیا تھا' قرآن میں بھی یہی کہا گیا ہے۔اور اس کے بعد کہا کہ یہ اب معاہدہ کیا ہے تم نے' یقین مانئے **وَ مَنۡ اَوۡفٰى بِعَهۡدِهٖ مِنَ اللّٰهِ** (9:111) اللہ سے بڑھ کے وعدے کا پورا کرنے والا کون ہے۔تم نے جس پارٹی سے معاملہ کیا ہے' بڑی قابلِ اعتماد پارٹی ہے یاد رکھو! کبھی دھوکہ نہیں دے گی' کبھی پھر نہیں جائے گی یقین رکھو۔یہی ہے وہ ایمان مومن کا جس کی بناء پہ وہ اس طرح سے سربکف میدان میں آجاتا ہے۔**فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَيۡعِكُمُ الَّذِىۡ بَايَعۡتُمۡ بِهٖ** (9:111) اوجشن مناؤ اس سودے کے اوپر جو تم نے کرلیا ہے''لُٹ کے لے گئے ہو اللہ نوں وی تسی تے''۔

خدا کے ساتھ کیا گیا سودا ہمیشہ فوز عظیم کے نتائج کا حامل ہوتا ہے

کیا بات یہاں کہی ہے۔یعنی انداز یہ ہے جیسا کسی کو کہتے ہیں''اوتوں ٹھیک کیناں اے اوئے اپنیاں پیسیاں اچ لے آندا او واہ اوئے واہ لُٹ لیاندا ای بھائی''۔**فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَيۡعِكُمُ الَّذِىۡ بَايَعۡتُمۡ بِهٖ‌ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ** (9:111)۔فوز: نجات نہیں' نجات تو کسی مصیبت سے چھوٹنے کا نام ہوتا ہے' Achievement بہت بڑی **الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ**(9:111)۔اب یہ کہ یہ سودا کتنا بڑا فوزِ عظیم کہا ہے۔ہم کیا جانیں اس کو۔ایک مصرع ہے جامی کا' جب زلیخا نے یوسفؑ کو وہاں سے خریدا ہے جامی نے اپنے یوسف زلیخا میں لکھا ہے۔گھر آئی تو انہوں نے کہا کہ کیا سودا کیا' اس نے کہا سودا کیا؟

درہم چند دادم جاں خریدم

''تھوڑے جئے پیسے دتے'' جان خرید کے لے آئی ہوں۔

؟؟؟ واللہ عجب' چہ ارزاں خریدم

''اواللہ دی سوں بڑا ہی سستا سودا ماریا اے میں''۔

عزیزانِ من! یہ اس سے پوچھیے۔ یہ شے کیا ہے جان' ایک زلزلہ آتا ہے لاکھ انسان مرجاتے ہیں راستہ چلتے ہوئے پاؤں پھسلتا ہے' جان چلی جاتی ہے۔ اب تو روز اچھا بھلا شام کو دیکھتے ہیں کہ حرکتِ قلب بند ہوئی' جان چلی گئی۔ یہ ایسی چیز جس کی ایک پائی قیمت نہیں جس کی انجام کار اندازہ لگایئے آپ۔ اسی لیے اس نے کہا تھا کہ

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جان دے کے بھی حق ادا نہیں ہوتا تو اتنا بڑا سستا سودا اس قسم کی چیز یہ دی جائے اور اس کے بدلے میں اَلْجَنَّۃَ مل جائے کسی کو کہا بشارت ہو او مبارکیں ہوں تمہیں اس سودے پہ جو تم نے مار لیا ہے۔ وہ سودا مارنا ایک لفظ ہوتا ہے۔ خدا کے ساتھ یہ سودا کیا ہے تم نے۔ وَذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (9:111) بڑی Achievement ہے'' بھئی آج تے بلے بلے کیا بات ہے سودا کِتا ای نا اکوای سودے اچ مار کے لے گیا''۔ یہ ہے عزیزانِ من! وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا (6:152) خدا سے جو تم نے کنٹریکٹ کیا تھا معاہدہ کیا تھا اس معاہدے کو پورا کرو۔ دونوں آیتوں میں آپ نے دیکھ لیا کہ کیا کیا ہدایات و احکام و اصول دیے گئے ہیں۔ سوچیے تو سہی ان کے مطابق اگر کوئی معاشرہ متشکل ہو جائے تو اَلْجَنَّۃَ (9:111) یہیں ملنی شروع ہو جائے گی یا نہیں انسان کو؟۔ اس سے بڑی اور اَلْجَنَّۃَ (9:111) ہو گی کیا سوچیے تو سہی جو چیزیں کہی گئی ہیں یہ اگر ہو جائے۔ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (6:152) ان چیزوں کا تمہیں حکم دیا گیا ہے ان چیزوں کے متعلق تمہیں نصیحت کی گئی ہے تاکہ تم غور و فکر کر کے ان کو Accept کرو اور پھر ہر وقت اپنے سامنے رکھو ان کو تَذَكَّرُوْنَ (6:152) ذکر یہ ہے۔ قوانین و احکامِ خداوندی کو ہر وقت اپنے سامنے رکھنا نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دینا اس چیز کو اپنے سامنے رکھو۔

صراطِ مستقیم کامیابیوں کا وہ راستہ جو سیدھا بھی ہے ہموار بھی متوازن بھی اور آگے سے ابھرا ہوا بھی

یہ سب کچھ کہنے کے بعد غور کیجیے کیا کہا ہے۔ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا (6:153) یہ ہے میرا صراطِ مستقیم یہ ہے میرا سیدھا راستہ۔ ہر روز چوالیس دفعہ تم دعائیں مانگتے ہو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5) مانگ کے چلے جاتے ہو آگے۔ زیادہ سے زیادہ جو زور دیا جاتا ہے اسکے اوپر کہ اس طرح سے نہیں صراطِ مستقیم الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ٹھیک ہو گیا چل بھئی۔ یعنی راستہ خواہ وہ شہر کی بجائے ماڈل ٹاؤن کی طرف لے جانے والا ہو سڑک تو میٹلڈ ہے نا بھئی۔ تجوید' قراءت یہ چیزیں جو ہیں۔ کہا صراطِ مستقیم کی دعا مانگتے تھے کہ وہ دکھاؤ۔ یہ سارا کچھ گنانے کے بعد کہا وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا (6:153) اور یہاں تو صِرَاطِيْ کہا ہے خدا نے' خود خدا کا

صراطِ مستقیم اللہ کا راستہ سیدھا۔ فَاتَّبِعُوْهُ (6:153) بس اس پہ چلتے جاؤ۔ بات یہاں پوری ہوگئی تھی لیکن اس کی نگاہوں میں ہم بھی تھے اتنا ہی نہیں کہہ کے خاموش ہوگیا۔ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ (6:153) یاد رکھو! اور راستوں کا اتباع نہ کرنا اس ایک راستے کے اوپر چلنا اور سبل جو ہیں ان کا اتباع نہ کرنا ان کے اوپر نہ چلنا۔ دونوں چیزیں ہیں یہاں نفی بھی ہے اثبات بھی ہے۔ لا الہ ہے پہلے جتنے بھی سبل متفرقہ ہیں ان تمام سے منہ موڑو گے تو صراطِ مستقیم کے اوپر آؤ گے۔ صراط شاہرا ہوتی ہے ہائی وے ہوتی ہے سبل وہ پگڈنڈیاں ہوتی ہیں وہ اس صورت میں سبلِ لاحقہ کہلاتی ہے جب پگڈنڈی صراطِ مستقیم میں آ کے مل جائے۔ کہتا ہے متفرق سبل جو ہیں جو مختلف سمتوں میں لے جانی والی سبل ہیں ان کا اتباع نہ کرنا۔ اگر تم ان کے اوپر چل پڑے فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (6:153) تو پھر وہ تمہیں اس کے سبیل سے اس کے راستے سے منتشر کر دے گی تفریق ڈال دے گی اس کے اندر۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے پوری انسانیت کے لیے تو ایک ہی راستہ صراطِ مستقیم تجویز کیا گیا ہے

سوچئے عزیزانِ من! اس نے ایک ہی راستہ صراطِ مستقیم کہا تھا۔ غور کیجیے تو سہی یہ اس کو ماننے والے اس کے اسلام کے اتباع کرنے کے مدعی مسلمانوں کی جماعت یہ ایک راستے کے اوپر چل رہے ہیں۔ کیا یہ صراطِ مستقیم کے اوپر چل رہے ہیں یا سبلِ متفرقہ ہیں جن کے اوپر چل رہے ہیں۔ تو کیفیت یہ ہوگئی کہ نام لینے کے لیے بھی ایک چیز نہیں ہمارے ہاں رہ گئی۔ جیسا میں کئی دفعہ کرتا ہوں پوچھئے کسی سے جی! ''کون ہوندے او جی' مسلمان جی الحمدللہ' اونہیں میں پوچھیا ہیگا پئی مسلمان تے مینوں پتہ ہیگا اے مسلمان تسی ہوندے ہیگے او' یعنی شیعہ ہیں یا سنی ہوتے ہیں؟ الحمدللہ جی! میں سنی ہوتا ہوں' نہیں! سنی نہیں میں پوچھتا یہ ہوں کہ اہل حدیث ہیں آپ یا اہل فقہ ہوتے ہیں؟ کہنے لگے میں اہل فقہ ہوں' اہلِ فقہ میں آپ حنبلی شافعی ہیں مالکی ہیں یا حنفی ہوتے ہیں؟ جی! میں حنفی ہوں' اچھا حنفی ہیں آپ دیو بندی ہیں یا بریلوی ہیں؟۔ ''اوستیاناس تیرا کتے کھلووی' او کہن لگا اینے اچ ای تنگ پے گیا ایں'' ابھی تو میں نے شریعت کی بات بتائی ہے ابھی طریقت کی طرف تو میں آیا ہی نہیں ہوں' اُدھر بھی آیئے نا آپ' کس سلسلہ کے اندر بیعت ہیں الحمدللہ جی سلسلۂ چشتیہ کے اندر' چشتیہ نظامیہ کے اندر ہیں یا صابریہ کے اندر ہیں؟ انہوں نے کہا نظامیہ کے اندر ہوں' اچھا نظامیہ کے اندر ہیں تو آپ تونسوی ہوتے ہیں یا دہلوی ہوتے ہیں۔ کہیں نہیں عزیزانِ من! ٹھکانہ۔ اس لیے کہ جب بھی آپ صراطِ مستقیم چھوڑیں گے پھر سبلِ متفرقہ آئیں گی اور ان کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔ صحیح جواب ہمیشہ ایک ہوتا ہے' غلط جواب کی تعداد ہی کوئی نہیں دنیا میں ہوتی' غلط جواب لاتعداد ہوتے ہیں۔ جونہی آپ نے صحیح جواب چھوڑا پھر ہر بچے کا جواب مختلف ہوگا ایک دوسرے سے ملے گا نہیں۔ یہ سبلِ متفرقہ ہیں۔ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِيْمًا (6:153)۔ اور پھر آپ نے دیکھ لیا کہ یہ صراطِ مستقیم کی دعا مانگنے والوں کے لیے Abstract یا مبہم بات نہیں رہنے دی کہ صراطِ مستقیم ہے کیا۔ یہ ساری تفصیل دی ہے ان دو آیتوں کے اندر۔

حضرت عمر فاروقؓ کی طرف سے تقویٰ کا متعین کردہ مفہوم

یہ ہے صراطِ مستقیم یہ ہے میرا راستہ سیدھا۔**فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ** (6:153) یہ ہے وہ چیزیں جن کا تمہیں حکم دیا جاتا ہے اور یہ اس لیے دیا جاتا ہے کہ تم زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ' اسے تقویٰ کہتے ہیں۔اس راستے کے اندر قدم قدم کے اوپر خاردار جھاڑیاں آئیں گی۔ یہ تقویٰ کا مفہوم فاروقِ اعظمؓ کا سمجھایا ہوا ہے' خوب تھے یہ سمجھانے کے لیے۔ پوچھا تھا کسی نے حضرتِ عمرؓ سے کہ تقویٰ کیا ہوتا ہے۔ کہنےؓ لگے تم صحراؤں میں ہمیشہ جنگلوں میں چلتے تھے۔ کہنےؓ لگے ایسے وادیوں سے گذرے ہونگے جہاں چھوٹی چھوٹی خاردار جھاڑیاں ہوتی ہیں راستے میں' کہنے لگے جی ہاں۔اور پھر عربوں کا تو لباس یہ ہوتا ہے۔ کہنےؓ ہیں اس میں سے گذرتے ہو کیسے گذرا کرتے ہو؟ کہنے لگے جی وہ یہ ہے کہ ادھر سے گذرتے ہیں اِدھر سے دامن کو سمیٹ لیتا ہوں اُدھر سے چادر سمیٹتے ہیں یوں گذرتے ہیں بچ کے'یوں گذرتے ہیں بچ کے تاکہ وہ کانٹا الجھ نہ جائے۔ کہنےؓ لگے اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔اسی لیے صراطِ مستقیم میں سے یہ چیزیں بتا دیں کہ راستے میں خاردار جھاڑیاں بھی آئیں گی' رکاوٹیں بھی ہونگی' خطرناک گھاٹیاں بھی آئیں گی اس لیے یہ سنگِ میل لگا دیے ہیں وہاں نشاناتِ راہ کہ تمہارے دامن ان کانٹوں میں کہیں الجھ کر نہ رہ جائیں۔**لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ**(6:153)۔سورۃ الانعام کی آیت 154 تک ہم پہنچ گئے آیت 155 سے آگے ہم بات کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

تیئسواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 154 تا 159)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1972ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی آیت 154 سے ہو رہا ہے (6:154)۔

وحی کے ذریعے زندگی کے غیر متبدل اصول روزِ اول سے ہی متعین ہیں

میں نے عرض کیا تھا کہ سابقہ دو تین آیات میں قرآنِ کریم نے اپنے اصولی احکام کو ارتکازاً (Concentrative) طریقے کے اوپر دو آیات میں جامع طور پر بیان کر دیا ہے۔ اور اس کے بعد کہا تھا کہ **اَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ** (6:153) کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ اسی کا اتباع کرو اسی کے اوپر چلو۔ دوسرے راستوں کا اتباع مت کرو ان کے اوپر مت چلو ورنہ وہ تمہیں اس کے راستے سے منتشر کر دے گا یاد رکھو۔ صرف یہ ایک راستہ ہے صرف قرآنِ کریم' اس کا اتباع کرو اس کے علاوہ کسی اور راستے کا بھی اتباع کرو گے تو وہ تمہیں اس راستے سے بھٹکا دے گا۔ اور یہ چیزیں تم سے کہی جاتی ہیں تا کہ تم **لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ** (6:153)۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ کوئی نئی بات نہیں جو تم سے کہی جا رہی ہے۔ دین پہلی مرتبہ نہیں آیا۔ دین تو جس دن پہلا

رسول آیا تھا وہ اپنے ساتھ دین کے اصول لایا تھا۔ اور وہی دین کے اصول ہر زمانے میں خدا کی طرف سے دہرائے جاتے رہے۔ ان کی تفاصیل میں فرق ہوتا تھا زمانے کے تقاضوں کے اعتبار سے۔ لیکن جہاں تک دین کے اصولوں کا تعلق ہے وہ شروع سے آخر تک ایک ہی رہے تھے۔ اور اصول تو قوانین ہوتے ہیں اور قوانین تو بدلتے نہیں ہیں' اٹل ہوتے ہیں' غیر متبدل ہوتے ہیں۔ ان میں تو کبھی کسی قسم کی تبدیلی آتی نہیں ہے۔ وہ اسی لیے کہا کہ پہلی مرتبہ یہ بات نہیں کہی گئی **ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ** (6:154) اس سے پہلے موسیٰ کو بھی ہم نے کتاب دی تھی۔

لفظ تفصیل کا حقیقی مفہوم کسی چیز کے مختلف اجزا ہوتے ہیں جن سے وہ چیز مرتب ہوتی ہے

اب اس کتاب کی یہاں خصوصیات بتائی گئی ہیں پہلے میں لونگا **تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ** (6:154)۔ ہمارے ہاں تفصیل کا ترجمہ Details کیا جاتا ہے یہ اس لفظ کا صحیح ترجمہ نہیں ہے ہر شے کی Details اس کے اندر نہیں ہیں۔ **تَفْصِيْلًا** (6:154) تو ہوتا ہے فصل سے' نکھار کر الگ الگ Distinctly بیان کرنا۔ اور اگر ہر شے کے معنی لیے جائیں وہ چیزیں جو دین کے اجزاء ہیں جن سے دین مرتب ہوتا ہے تو وہ ساری چیزیں اس کے اندر ہیں ٹھیک ہیں۔ لیکن اگر تفصیل کے اردو معنی لے کے آدمی اس پہ چلے کہ ہر حکم کی تفصیل اس کے اندر ہے تو پھر تو ایک ایسا مغالطہ شروع ہوتا ہے۔ وہ جو اہلِ قرآن حضرات کو مغالطہ لگا وہ اٹھے تو تھے قرآن کی طرف لوگوں کو بلانے کے لیے' ایک بنیادی غلطی ہوئی اور اس کی وجہ سے وہ اور زیادہ دور لے گئے لوگوں کو قرآن سے۔ انہوں نے قرآن سے ان احکام کی تفاصیل بھی مرتب کرنی شروع کر دیں مثلاً یہ کہ قرآن کیسے پڑھا جائے گا؟ اب قرآن میں تفصیل نہیں ہے ان چیزوں کی۔ تو انہوں نے یہ جو کہا کہ قرآن تمام احکام پہ جامع ہے اور اس میں تفاصیل بھی دی ہوئی ہیں ان تمام چیزوں کی۔ اب وہ زکوۃ کو لے کے بیٹھے اور انہوں نے کہا کہ نکالیے تفصیل تو وہ لگے نکالنے۔ اب قرآن میں تو تفصیل ہے نہیں ان معنوں کے اندر ان چیزوں کی۔

قرآن حکیم میں ان تفصیلات کو ڈھونڈا جا رہا ہے جو اس میں نہیں ہیں

اب جو چیز ہے نہیں قرآن میں جب اس کو قرآن سے ڈھونڈنے لگے تو ظاہر ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ وہ بیچارے اتنا بھی نہیں اس سے مرتب کر پائے کہ نماز کے اوقات کتنے ہیں۔ کچھ ان میں سے وہ ہیں جو تین وقتوں کی نمازیں کہتے ہیں انہیں میں وہ لوگ ہیں جو ایک ہی وقت کی نماز کہہ رہے ہیں۔ اور یہ سب اس بنیادی غلطی کی وجہ سے ہوا کہ انہوں نے یہ سمجھا کہ ان چیزوں کی تفصیل (Details) بھی قرآن کے اندر ہیں۔ یہ بنیادی غلطی تھی ان کی۔ قرآن کا تو انداز اور ہے وہ اصول دیتا ہے۔ صرف چند ایک قوانین ایسے ہیں اور وہ ہیں عائلی زندگی سے متعلق زیادہ تر' خاندانی زندگی سے متعلق ان کی تو اس نے تفاصیل بھی دی ہے۔ ہمارے معنوں میں تفصیل جسے آپ کہتے

ہیں، میں انہیں جزئیات کہا کرتا ہوں۔ اس سے معنی زیادہ واضح ہو جاتے ہیں تفصیل سے الگ ہٹ کر۔لیکن قرآن نے باقی دین کے امور کے متعلق صرف اصول دیے ہیں۔ اور یہ بڑی بنیادی چیز ہے دین کی کہ جس دین کو اب قیامت تک کے لیے تمام انسانوں کے لیئے ضابطۂ زندگی بننا تھا' اس کے لیے صحیح طریقہ ہی یہ تھا کہ اصول دیے جاتے جو غیر متبدل تھے' ہر زمانے میں اسی طرح سے اٹل طور پر وہ رہنے تھے۔

قرآن حکیم نے زندگی کے بنیادی اصول دیئے ہیں جزئیات کا تعین نہیں کیا' یہ نظام کا فریضہ تھا

قرآن کے نظام کو قائم کرنے والی امت جو تھی یہ اس کے ذمے قرار دیا جاتا کہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کی جزئیات وہ خود مرتب کریں۔ اصول اپنی جگہ پہ اٹل رہیں اور یہ جزئیات زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتی رہیں' یہ تھا حقیقت میں دین۔ اور کون مرتب کرے یہ جزئیات؟ یہ افراد کا کام نہیں ہے یہ اسلامی نظام جسے آپ کہتے ہیں' یہ نظام کا کام ہے۔ یہ دین ہے ہی نظام کی چیز' ایک اجتماعی چیز ہے ایک مملکت کی شے ہے۔ اور یہ چیز تو ہماری نگاہوں سے ایک عرصہ بالکل اوجھل رہی۔ یا تو صدرِ اول میں یہ تصور ہمارے سامنے رہا اور اسکے بعد جب یہ نگاہوں سے اوجھل ہوا ہے تو اس ہزار سال کے اندر آواز ہی اس کے متعلق نہیں اٹھی۔ یہ تو اس دور میں آواز بلند ہوئی' پاکستان میں یہ آواز بلند ہوئی دین کو ایک نظام کی حیثیت دینے سے۔ اور اس اعتبار سے یہ خطۂ زمین یا یہاں کے دین کا اصول دینے والے لوگ' یہ بڑی ہی بابرکت چیز تھی کہ جو یہاں نصیب ہوئی ہزار برس کے بعد۔ اس دور میں ناموں کے اعتبار سے بڑے بڑے ہمارے ہاں آتے رہے لیکن دین کو ایک نظام کی حیثیت سے کسی نے پیش نہیں کیا سب مذہب کی حیثیت سے اسے پیش کرتے رہے۔ یعنی یہی وہ بنیادی غلطی تھی' غلط فہمی تھی جو ہم سے کہا گیا کہ غیر مسلموں کی حکومت کے اندر بھی اسلام کی زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔ مذہب کی زندگی تو بسر کی جاسکتی ہے' دین تو نام ہی اسلامی مملکت کا ہے' غیروں کی محکومیت کے اندر دین کی زندگی کس طرح بسر کی جاسکتی ہے۔ یہ چیزیں ان کی نگاہوں سے اوجھل تھیں اس لیے کہ انہوں نے کبھی کھڑے ہو کے سوچا ہی نہیں تھا کہ دین کہتے کس کو ہیں۔ ایک چیز چلی آرہی تھی تقلیداً' اسی پہ چلتے رہے۔

اہل قرآن کی بنیادی غلطی اور اس کا حل

یہی وہ غلطی تھی جو ان اہلِ قرآن کو لگی انہوں نے بھی اسکو ایک مذہب سمجھا۔ قرآن سے اسکی جزئیات نکالنی شروع کیں۔ جزئیات اس کے اندر تھی نہیں' اب چلے پھر۔ انہی کے اندر سے ہی اتنے فرقے خود پیدا ہو گئے۔ ابھی بات آتی ہے فرقوں کی۔ دین نظام ہے اس کے اصول اٹل ہیں۔ جماعتِ مؤمنین کا ایک اجتماعی نظام ہے یہ اس نظام کا کام ہے کہ وہ دین کے اصولوں کی جزئیات اپنے اپنے دور کے تقاضے کے مطابق مرتب کرے۔ اس لیے میں بات یہ کہہ رہا تھا کہ جب یہ کہا جائے کہ تَفۡصِیۡلًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ (6:154) تو اسکے معنی یہ

نہیں ہیں کہ جزئیات بھی ان تمام چیزوں کی اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے قرآن کے اندر دیدی تھیں' ایسا نہیں ہے۔ یہی چیز تورات کے متعلق یہاں آئی ہے ہر شے کو نکھار کر الگ الگ کر کے بیان کر دیا گیا تھا۔ فصل اس کے درمیان رکھی تھی تاکہ التباس کسی قسم کا نہ ہو' اختلاط نہ ہو' ابہام نہ ہو۔ هُدًى وَّ رَحْمَةً (6:155) وہ راہنمائی تھی اور اس کا مقصد تھا رَحْمَةً (6:154) انسانی صلاحیتوں کی نشوونما' یہ اس کا مقصد تھا۔ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ (6:154) اب میں نے وہ ٹکڑا لیا بڑی عجیب چیز ہے یہ۔ وہ خدا کی نعمتوں کو پورا کرنے والی تھی' لیکن کن کے لیے؟ عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ (6:154) صرف ان لوگوں کے لیے جو حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کریں۔ اب یہ شرط ہوگئی کہ ہدایت بھی ہے رحمت بھی ہے تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (6:154) بھی ہے لیکن صرف ان کے لیے کہ جو اس کے دیے ہوئے اصولوں کے مطابق نہایت متوازن زندگی بسر کریں۔ اَحْسَنَ : ایک متوازن زندگی ہے A Balanced Personality ہے جو اس سے حاصل ہوتی ہے۔ لَعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ (6:154) اور اس سب کا مقصد یہ تھا کہ انہیں اس چیز پہ یقین ہو جائے کہ واقعی ہر عمل اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔

خدا سے ملاقات کا مفہوم خدا کے قوانین کو عملی شکل دے کر ان کے نتائج کو سامنے لانا ہے

یہ جو ہے لقآء رب اللہ کی ملاقات جسے عام ترجمہ کیا جاتا ہے' تاکہ وہ اللہ کی ملاقات پر ایمان لے آئیں' اللہ کے آمنے سامنے ہونے پر' ایمان لے آئیں۔ اور اس کے لیے ہمیں بتا دیا گیا اب یہاں تو اللہ سامنے آتا نہیں کسی کی ملاقات ہوتی نہیں ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ اس دنیا کی بات نہیں ہے' یہ مرنے کے بعد کی بات ہے' وہاں خدا کا لقاء ہوگا' وہاں خدا سامنے آئے گا' وہاں ملاقات ہوگی۔ اب وہ یہ کہتا ہے کہ یہ سب کچھ ہم نے اس لیے دیا تھا تاکہ انہیں خدا کے آمنے سامنے جانے سے خدا کی ملاقات پر ایمان حاصل ہو جائے۔ اب پوچھیے کہ اس سے ایمان کس طرح سے حاصل ہو جائے گا۔ دین کے اصول دیے اس لیے جاتے ہیں قانون کی حیثیت سے کہ اگر ان کے مطابق عمل کرو گے' یہ نتائج مرتب کریں گے۔ اگر ان کی خلاف ورزی کرو گے تو اسکے یہ نتائج تمہارے سامنے آئیں گے اسی دنیا کے اندر۔ تو اسی طرح سے ایمان آ سکتا ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ اگر تم نے یہ کیا تو اس کا نتیجہ یہ مرتب ہوگا۔ اُنہوں نے وہ کیا اُس کا نتیجہ مرتب ہوا' ایمان ہو گیا حاصل۔ اُنہوں نے خلاف ورزی کی اُس نے کہہ رکھا تھا کہ خلاف ورزی کرو گے تو یہ تباہی آ جائے گی خلاف ورزی کی' وہ تباہی آ گئی' ایمان ہو گیا حاصل۔ لَعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ (6:154) یہ اس لیے دیے گئے تھے قوانین اور اصول تاکہ جب انکے اوپر عمل کیا جائے اور اس کے مطابق نتیجے مرتب ہوتے جائیں تو ان کو ایک ایک چیز پہ ایمان آتا جائے کہ واقعی خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل برحق ہے۔ یہ تھا لقاء رب۔ اور پھر یہ تو اربابِ شریعت بیچارے انہوں نے تو اس کو قیامت پہ اٹھا کے چھٹکارا کیا۔

اہل شریعت کی اور اہل طریقت کی خدا سے لِقا کی نوعیت

ان اربابِ طریقت کی ہر رات ملاقات ہوتی ہے رب سے ان کی ملاقاتوں کا کہنا کیا ہے۔ چوں نہ بینند حقیقت رہِ افسانہ زنند۔ شریعت والوں کی ملاقات قیامت تک کسی دوسرے کو معلوم ہی نہیں' اِن کی ملاقات بھی خلوتوں کے اندر ہوتی ہے راتوں کو وہ بھی کسی دوسرے کو معلوم نہیں ہے۔ جب پوچھئے تو یہ کہ ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی' یہ تو بھائی صاحب خود جا کے ملاقات کرو گے تو بات سمجھ میں آئے گی' بتانے کی بات تو ہے نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ دی اس لیے تھی یہ کتاب تا کہ ان کو لقاءِ رب پر ایمان آ جائے۔ یہ تو اس زمانے میں دی۔ وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (6:155) اور اس کے بعد یہ کتاب تمہیں دی ہم نے اس کو نازل کیا مبٰـرک۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس سے پہلے بھی یہ لفظ آیا تھا اور میں نے اس کی تفصیل بتائی تھی' تجدیدِ یاداشت کے لیے سہی پھر دہرادوں اس کو۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآنِ کریم کے متعلق کوئی اور خصوصیت نہ بتائی جاتی اور ایک لفظ یہی کہا جاتا تو دین سمجھ میں آ سکتا تھا۔

عربی زبان کے مادوں کا مفہوم سمجھے بغیر قرآن حکیم سمجھ نہیں آ سکتا

پھر اسے دہرادوں کہ قرآن سمجھنے کے لیے عربی زبان کے یہ جو مادے ہیں جہاں سے یہ الفاظ بنتے ہیں ان کے معنی اور مفہوم سمجھنا نہایت ضروری ہے اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ بڑی بنیادی چیز ہے جسے محاورۂ عرب کہتے ہیں وہ سامنے آ جائے تو پھر پتہ چلتا ہے کہ قرآن نے یہ لفظ کیوں استعمال کیا۔ ابھی میں نے عرض کیا ہے' دین نام ہے اٹل غیر متبدل اصول جو اپنی جگہ پہ قائم ہوں ثابت ہوں' محکم ہوں' ہلیں نہیں وہاں سے۔ اب ایک شے جو اپنے مقام پہ اس طرح سے مستحکم اور ثابت ہے وہ تو پتھر بھی ہوسکتا ہے پتھر تو بڑا اپنے مقام پر جما ہوا ہوتا ہے ہلتا ہی نہیں تو اس میں تو کامل جمود ہوا۔ یہ نہیں۔ برکت کی دوسری خصوصیت یہ ہے دین کی کہ اصول اپنی جگہ پہ مستحکم ہیں لیکن زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ان کے اندر جو تبدیلیاں ہوتی ہیں تو اس میں نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے' وہ بڑھتے چلے جاتے ہیں' پھولتے پھلتے چلے جاتے ہیں۔ ایسی شے جو اپنے مقام پر محکم اور ثابت ہو لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے اندر سے نشوونما بھی ہوتی چلی جائے جیسے درخت کہ وہ اپنے مقام پر ثابت بھی ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ دیکھتے ہیں کہ ہر دور میں ہر موسم میں ہر زمانے میں اس میں ایک نشوونما کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کہ جو شے اپنے مقام پہ جمی ہوئی ثابت ہو اور اس کے ساتھ اس کی نشوونما بھی ہوتی چلی جائے اسے عربی زبان میں برکت کہتے ہیں ۔

عربی زبان کی خصوصیت

میں تو عرض کر رہا ہوں کہ ایک ایک لفظ قرآنِ کریم کا لیا جائے اور بات سمجھ لی جائے۔ وہ کیوں بار بار کہتا ہے کہ ہم نے عربی مبین

میں اس کو نازل کیا' لسانِ عربی میں نازل کیا(26:195)؟ پتہ تھا کہ عربی زبان تو ہے وہ اس کی اہمیت بتاتا تھا کہ اس زبان کی اہمیت کتنی ہے۔اور حقیقت یہی ہے کہ قرآن کریم کے ان حقائق کے لیۓ ان حقائق کی ذرا خصوصیت تو دیکھئے قیامت تک تمام نوعِ انسانی کے لیے ضابطۂ حیات بننے کی خصوصیت' کوئی چھوٹی خصوصیت نہیں ہے۔ان خصائص کی حامل کتاب کے لیے صرف عربی زبان تھی جو اس کی متحمل ہوسکتی تھی کسی دوسری زبان میں اتنی وسعت اور گنجائش تھی نہیں کہ وہ قرآن کے حقائق کو اس طرح سے اپنے دامن کے اندر سمیٹ لے۔ اب دیکھئے ایک لفظ اس نے کہا ہے مُبٰرَکٌ (6:155)۔کیونکہ نبوت ختم ہوگئی اس کے بعد تو وحی آنے والی بات نہیں تھی۔اسے قیامت تک کے لیے رہنا تھا اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (6:34) تبدیلی اس میں ہونہیں سکتی تھی۔تو اس شے کو اپنے مقام پہ مستحکم ثابت اور برخودخزیدہ رہنا چاہیے۔میں نے عرض کیا ہے کہ پھر اس کی شکل تو پتھر کی سی ہوسکتی ہے تو وہ تو زمانے کا ساتھ دے ہی نہیں سکتی۔ایسی شے کہ اپنے مقام کے اوپر جمی ہوئی بھی رہے اور اسمیں نشوونما کی صلاحیت بھی موجود ہو۔اسی لیے قرآن نے دین کو شَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ(14:24) کی مثال دی ہے۔

لفظ طیب اور خبیث میں فرق

شجر بھی طیب اور خبیث دو قسم کے ہیں۔کیا بات ہے عربی زبان کی !!۔طیب ہوتا ہے جو پھل پھول لائے' خبیث ہوتا ہے جو پھل پھول نہ لائے۔نشوونما دونوں کی ہوتی ہے اپنے اپنے انداز میں۔اُس میں کانٹے ہی اگتے ہیں' اس میں پھول آتے ہیں یہ طیب ہے وہ خبیث ہے۔كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ (14:24) کیا ہے اس کی تفصیل اَصْلُهَا ثَابِتٌ (14:24) دیکھئے مبارک کی تفصیل آرہی ہے۔ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ(14:24) جڑیں پاتال کے اندر گڑی ہوئیں' شاخیں آسمان کی فضاؤں میں جھولا جھول رہی ہیں اور طیب ہے پھل دیتا ہے اور قرآن نے کہا تھا دائم ہمیشہ پھل دیتا ہے۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں محتاج
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

اُكُلُهَا دَآئِمٌ (13:35) قرآن نے کہا ہے۔سارا سال پھل دینے والا' ہمیشہ پھل دینے والا' جما ہوا اپنے مقام پہ شاخیں لہلہا رہی ہیں شجر ہے طیب۔طیب بھی ایسا ہے کہ جو ہمیشہ پھل دینے والا شجر ہے۔یہ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ (6:155) اس کتاب کو ہم نے نازل کیا اصول دائم اور محکم' شاخوں میں نشوونما کی اتنی صلاحیت کہ وہ پھیلتی چلی جائیں' بڑھتی چلی جائیں۔اور فِي السَّمَآءِ(14:24) کہا ہے وہ بلندیاں جن کی حد کوئی نہیں ہوتی۔اگر افق کی طرف کہتا تو حد آجاتی کہیں۔سما تو غیر محدود ہوتی ہے اور پھر اس نے بلندی کہا ہے۔ یہی نہیں ہے کہ وہ سیدھا لے جانے والا ہے' صراطِ مستقیم وہ واقعی سیدھا جاتا ہے لیکن آپ کو پتہ ہے اس نے مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ(70:3)

کہا ہے سیدھا اور بلندیوں کی طرف لے جانے والا راستہ۔

علامہ پرویزؒ کی عمر بھر کی جگرسوزی کا ماحصل ''لغات القرآن'' کی اہمیت

قرآن کے الفاظ ہیں عزیزانِ من! وہ اگر اس میں اتنی سی میں والی بات معاف کر دیجیے تو ہوسکتا ہے ذہن میں کہ صاحب! کون اتنی محنت کر کے یہ کچھ کیے جائے۔ بہر حال میں نے اپنی بصیرت کے مطابق اس پہ محنت آپ احباب کے لیے کر دی ہوئی ہے۔ میرے ''لغات القرآن'' میں جو قرآن کے مفردات کے معنی دیے ہوئے ہیں وہ اسی اصول کے ماتحت دیے ہوئے ہیں کہ مادے کے اعتبار سے ان کے جو معنی عرب اس زمانے میں، جب نزولِ قرآن کے زمانے میں، جو معنی لیتے تھے وہ معنی ہیں اس کے اندر آپ دیکھیں گے تو یہ ساری چیزیں کھل جائیں گی۔ مُبٰرَکٌ فَاتَّبِعُوْهُ (6:155) اس کا اتباع کرو۔ یہ ہے عزیزانِ من! دین کا نقطہ۔

فرقوں کی موجودگی میں ایک اُمت کا تصور تو کیا ہی نہیں جا سکتا

آگے آیت آتی ہے تفرقے کی۔ وہاں یہ تفصیل سامنے آئے گی کہ جس قوم جس امت کے اندر فرقے موجود ہوں، وہاں اسلام نہیں ہوتا، کسی فرقے میں نہیں ہوتا۔ حقیقت تو آتی ہے لیکن آنکھیں بند کر دینے سے تو حقیقت ٹل نہیں جاتی، اپنے مقام پہ رہتی ہے۔ فَاتَّبِعُوْهُ (6:155) سیدھی سی بات ہے کہ اس نے ابھی یہ کہا تھا کہ اسکے علاوہ اتباع کرو گے کسی اور کا بھی تو اس کے راستے سے بہکا کے سبل بن جائیں گے، مختلف پگڈنڈیاں تو وہ ہو جائیں گی، صراطِ مستقیم نہیں رہے گی۔ سبل تو پگڈنڈیاں ہوتی ہیں وہ نہیں رہیں گی۔ صرف اس کا اتباع ہے جس سے اس میں سے شاخیں الگ الگ تفرقے کی شاخیں، انتشار کی شاخیں، اختلاف کی شاخیں، نہیں پھوٹیں گی۔ یہ ایک طریقہ تھا فَاتَّبِعُوْهُ کا یاد رکھئے صرف قرآن کا اتباع۔ لیکن ایک نظام کی حیثیت سے اس کا اتباع، اپنے اپنے طور پر اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے نہیں۔ اگلی آیت میں بات آئے گی۔ وَ اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (6:155) اور بات وہی جو میں نے عرض کی تھی پچھلی دفعہ تقویٰ: راستے کی خاردار جھاڑیوں سے دامن بچاتے ہوئے اور پھر سیدھے نکل جانا، یہ تقویٰ ہوتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (6:155) پھر وہی ترجمہ ہمارے ہاں، کہا کہ تم پر رحم کیا جائے، وہی God is mercy , Christianity کا، رحم کیا جائے۔ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (6:155)۔

رحمِ مادر میں بچے کی نشوونما نظامِ ربوبیت کا مکمل تصور ہے

رحمت کے معنی ہیں سامانِ نشوونما اس انداز سے دینا جیسے رحمِ مادر میں بچے کو ملتا ہے۔ چیز ہی ساری نشوونما کی ہے۔ رزق ہی سامانِ زیست ہوتا ہے اس کے لیے ایک محسوس انداز ضروری ہے۔ رحمت وہ انداز ہوتا ہے جو اس رحم سے ہے۔ آپ دیکھتے ہیں وہاں کیسے نشوونما

ہورہی ہوتی ہے۔ یہ جتنے باہر کے اسباب ووسائل کے طریقے ہیں وہ سارے وہاں مفقود ہوتے ہیں۔ وہ تو تین تین تہوں کے اندر لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ سانس بھی آتا ہے خون کی گردش بھی ہوتی ہے نشوونما بھی ہورہی ہوتی ہے۔ اس میں ایک لچک کا پہلو ضروری ہوتا ہے وہ اس کا خول اس طرح سے پتھر کی طرح سخت نہیں ہوتا ورنہ وہ بچہ تو وہاں شکنجے کے اندر گھٹ کے مرجائے۔ اتنی لچک اور لوچ کہ اس کے اندر وہ پہلو بھی بدلتا ہے سارے قواء کام کررہے ہیں' دل دھڑکتا ہے' سانس لیتا ہے' نشوونما پاتا ہے اور بظاہر محسوسات میں سے کوئی چیز ہمارے سامنے نہیں ہوتی اس انداز سے جو نشوونما ملتی ہے' اسے رحمت کہا جاتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (6:155) تاکہ تمہاری صلاحیتوں کے برومند ہونے کے سامان تمہیں مل جائیں۔ اب مُبٰرَكٌ کے معنی سمجھ میں آ گئے ایسا درختِ طیب کہ ہمیشہ پھل دے اور اس سے تمہاری انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوجائے۔

خدا کی طرف سے راہنمائی کا بنیادی اصول

یہ تھا اس سے مقصد۔ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ. اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ (6:156-57) کہا اس لیے یہ کتاب دی (یہ عرب مخاطب ہیں اس دور کے) کہ تم یہ نہ کہو کہ صاحب! یہودیوں کو بھی کتاب ملی تھی اور عیسائیوں کو بھی کتاب ملی تھی اور ہمیں تو کتاب ملی نہیں تھی۔ ٹھیک ہے یہ تمہارا اعتراض بجا ہوتا۔ اس لیے یہ دی اور اس اتمام حجت کے لیے بھی کہ تم کہتے کہ ہم اس وقت تو ٹھیک ہے غلط راستے پہ چلتے ہیں اگر ہمیں بھی صحیح راہنمائی مل جاتی' صحیح ضابطۂ حیات مل جاتا' تو تم دیکھتے کہ ہم ان سے بھی زیادہ ہدایت یافتہ ہوجاتے۔ تم یہ کہہ سکتے تھے۔ ہم نے اتمامِ حجت کیا اس ضرورت کے لیے کہ تم یہ نہ کہو کہ ہمیں کتاب نہیں ملی' اس لیے ہم غلط راستے پہ ہیں' اس لیے یہ کتاب دیدی گئی۔ اور مقامات بھی ہیں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ خدا قوموں کو تباہ نہیں کرتا تاوقتیکہ پہلے ان کو یہ وارننگ نہ دیدی جائے کہ صحیح راستہ کونسا ہے اور غلط راستہ کونسا ہے (17:15)۔ تو گویا اس نے جو کہا تھا کہ ہماری طرف سے تمہارے پاس پیغامات/ہدایات یہ آتی رہیں گی جو ان کا اتباع کرے گا ان پہ کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا (2:38)۔ تو یہ جو ذمہ داری لی تھی اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رہنمائی دینے کی اسے وہ اس طرح سے پوری کرتا چلا گیا۔ اسی لیے ہر قوم کی طرف رسول ہر بستی کے اندر نبی یہ سلسلۂ رشد وہدایت جاری رہا (16:36)۔ اسی لیے کہا تمہیں یہ قرآن دیا۔

آج انسانیت کی راہنمائی کے لیے قرآن حکیم کو عالمگیریت کا مقام حاصل ہے

اس کے بعد نبوت ختم ہوئی اب تو کتاب کوئی اور آنی نہیں ہے۔ لیکن آپ دیکھئے کہ کس زمانے میں آ کے یہ ختمِ نبوت ﷺ ہوتی ہے۔ یہ اس دور میں ہوتی ہے آج جب سامانِ نشر واشاعت اتنے عام ہیں کہ اب دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جو یہ کہہ سکے کہ ہم تک قرآن کی

آواز پہنچی نہیں تھی۔ یعنی یہ عالمگیر کتاب بن گئی' یہ دوروہ آ گیا تھا کہ جس میں اب یہ پیغام عالمگیر بن سکتا تھا۔ یہ وجہ تھی کہ پیغام کو مکمل کیا َ تَمَّتُ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا (6:115) مکمل کیا لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ(6:115) اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہوگی Correction Slips اس میں اب نہیں لگیں گی۔ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (15:9) ہم اس کے محافظ ہیں حفاظت بھی اس کی ہم کریں گے۔ مکمل غیر متبدل محفوظ کتاب۔ اوراس کے بعد وسائلِ نشر واشاعت اتنے عام کہ اب یہ آواز گھر گھر تک پہنچ سکتی ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں اس کے ترجمے اوراب تو گوشے گوشے اور کونے کونے تک پیغام پہنچ سکتا ہے دوروہ آ گیا ہے۔

اس لیے اس دور میں یہ جو کہا گیا کہ یہ کتاب تمہیں دی تا کہ تم یہ نہ کہو کہ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ صحیح اور غلط راستہ کونسا ہے۔ اتمامِ حجت ہوگئی۔ ورنہ یہ چیز غلط ہے کہ کسی قانون کا اعلان نہ کیا جائے' بتایا نہ جائے کہ قانون کیا ہے اوراس قانون کی خلاف ورزی پہ سزا دیدی جائے یہ تو بڑا ظلم ہے۔

قرآن حکیم کی موجودگی کے باوجود ہماری یہ حالت زار کیوں؟

اب سوال یہ ہے ان کے متعلق تو کہا کہ اس لیے کتاب دی تا کہ تم یہ کہہ نہ سکو۔ مسلمانوں کے پاس کونسی حجت باقی ہے یہ کچھ کہنے کے لیے۔ چھوڑ دیجئے باقی دنیا کو کہ ان تک قرآن پہنچایا نہیں پہنچا' اِن کے تو ہر گھر کے اندر کتاب موجود ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ آج تو خیر موجود تو آج بھی ہے لیکن اس سے ذرا پیچھے ہٹ کے تو ہر صبح ہر گھر سے جہاں چکی پیسنے کی آواز آتی تھی' وہاں قرآن گنگنانے کی بھی آواز آتی تھی۔ اب بھی جتنی اس قرآن کی تلاوت ہوتی ہے (ان الفاظ میں جن میں تلاوت آج مروج ہے ورنہ تلاوت کے تو معنی کسی چیز کے پیروی کرنا ہیں کسی چیز کے پیچھے چلنا ہیں) تو جتنی تلاوت یا قرأت قرآن کی آج ہوتی ہے کسی اور کتاب کی دنیا میں ایسے نہیں ہوتی۔ اور مسلمانوں کے ہاں تو ہر وقت یہ موجود ہے۔ تو یہ تو یہ قوم کہہ نہیں سکتی کہ ہمیں معلوم نہیں تھا اس لیے ہم تباہ ہوئے۔ کیا یہ جو تباہی آپ پہ آئی ہے' اس کے متعلق آپ کو معلوم نہیں تھا۔ یہ تو الگ بات ہے ہم اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے لیے یونہی یہ ٹھیک ہے کہ جو اوپر کی دو چار شخصیتیں ہوتی ہیں' ان کے جرائم بھی اتنے بڑے' کبیر ہوتے ہیں۔ لیکن ہم نے جو ان کو تختۂ مشق بنالیا ہے آپ دیکھئے اس کے اندر ایک نفسیاتی کیفیت ہے۔ یہ ہماری اپنی ذاتی بدمعاشی ہے کہ ہم انہیں ذمہ دار کہہ کے' اپنے آپ سے بری الذمہ ہو جائیں کہ یہ دیکھئے اس نے شراب پی تھی اس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوگیا' میں نے نہیں کچھ کیا تھا۔ ساری قوم نے یہ کچھ کیا تھا ایک ایک فرد اس کا ذمہ دار ہے۔

غلط معاشرے میں تباہی کی بنیادی وجہ اجتماعی اور انفرادی طور پر رنگ' نسل' اور زبان کی بنیاد پر وطن کی تقسیم ہے

یہ جو ہمارے ہاں کے اندر نفس کی' معاف رکھئے' جسے بدمعاشی کہتے ہیں' وہ ہوتی یہ ہے کہ یہ ہمیشہ ذمہ داری کے لیے کسی اور کو اپنے

سامنے ٹارگٹ بنالیتا ہے۔اُدھر توجہ مرتکز کی' قوم بری الذمہ ہوگئی۔یہ جی او پر ہائی کمان والے تھے' انہوں نے سب کیا۔ٹھیک ہے ان کی بہت بڑی غلطی تھی ان کا بہت بڑا جرم ہے' بری الذمہ تو ہم میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہے ہر ایک نے Contribute کیا اس کے اندر۔وہ Contribution کیا تھی؟ باقی دنیا تو کمیشن بٹھاتی پھرے گی جن کے سامنے قرآن ہے ان کو تو ضرورت ہی نہیں ہے۔ قرآن نے ایک ایک چیز واضح کر دی تھی کہ یہ یہ چیزیں جس قوم کے اندر پیدا ہو جائیں گی' اس کا تباہ ہونا یقینی ہے۔روز پڑھتے تھے' روز وہی کچھ کرتے تھے۔اس نے جو کہا تھا کہ رنگ اور نسل اور زبان اور وطن کی بنیادوں پہ اگر تم نے ملت کو تقسیم کر دیا' تو تباہی آ جائے گی یہ ہے قرآن میں۔روز پڑھتے تھے اسے حصولِ ثواب کے لیے دہراتے تھے اسے اور ملت کے ٹکڑے انہیں چیزوں کے اوپر کر رکھے ہیں۔تو اب اس نے جو کہہ دیا تھا کہ وہی اگر کرو گے تو تباہ ہو جاؤ گے' تم برباد ہو جاؤ گے قرآن نے کہا تھا عَذَابَ الْهُوْنِ ذلت آمیز تباہی ہوگی' یاد رکھو اگر ایسا کیا۔

ہم نے 1965ء کی جنگ سے بھی کوئی سبق حاصل نہ کیا

کیا حجت باقی ہے اس قوم کے پاس۔وہ کہتا ہے اس لیے ہم نے یہ قرآن دیا تھا تاکہ تم بعد میں یہ کہہ نہ سکو کہ ہمیں معلوم نہیں تھا۔ سب کچھ معلوم تھا۔اور یہ جو آج ان کی عیاشیوں اور فحاشیوں کے قصے گنانے والے لوگ ہیں' حیرت ہوتی ہے خود یہ لکھتے ہیں اپنے ہاں کہ 1965ء میں بھی ہم دیکھتے تھے کہ یہ ہوتا تھا۔کیوں جی! 1965ء سے 1971ء تک پھر زبان پہ تمہاری مہریں کیوں لگی ہوئی تھیں' آج یاد آیا۔اس وقت اگر اس چیز کو تم نے جو دیکھی تھی' اوپر لاتے' ہو سکتا تھا کہ اس کی بھی اصلاح ہوتی' اس کی نہ ہوتی تو قوم تو اپنی بچت کی کوئی صورت پیدا کر لیتی۔یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ یہ اس لیے دیا گیا تاکہ تم بعد میں کہہ نہ سکو کہ ہمیں معلوم نہیں تھا۔اب نہیں کہہ سکتے' کوئی نہیں کہہ سکتا۔کہا یہ چیز تھی۔فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ (6:157) اس مقصد کے لیے تمہارے پاس بَيِّنَةٌ۔ بین اپنے ہاں بھی ہم یہ لفظ استعمال کرتے ہیں جس کے معنی بالکل واضح ہوتا ہے۔قرآن اپنے آپ کو بین کہتا ہے' مبینات کہتا ہے آیات کو' مبین کہتا ہے اس کو یہ سارا کچھ کہتا ہے۔

قرآن حکیم کے متعلق ہماری کوتاہ نظری کی کیفیت

ہمارا ایمان ہے کہ نہیں قرآن تو بڑا مجمل ہے بڑا مبہم ہے' نہیں جی یوں نہیں سمجھ میں آ سکتا' بڑا الجھاؤ ہے اس کے اندر' بڑا التباس ہے اس کے اندر۔یعنی وہ اپنے متعلق یہ کچھ کہتا چلا آ رہا ہے اور آپ اس کے متعلق یہ کچھ کہتے چلے آ رہے ہیں۔کیسے یہ دور ہوگا۔اپنے اپنے اڈے الگ الگ قائم کیے ہوئے ہیں۔ایک ہی قرآن ہے رکھا ہوا اس کے اندر' آپ دیکھئے ہر فرقہ اپنے اپنے عقیدے اور مسلک کے مطابق کھینچا تانی شروع ہوئی ہوئی ہے۔اس کے اندر قرآن رہتا ہی نہیں ہے پھر ''اوس لسی اچ ایناں پانی پوندے نیں' پئی پانی ای رہ

جاندا اے لسی مک ای جاندی اے اوہدے اچ''۔ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ (6:157) یہ تو دیا ہم نے۔

حقائق سے کھلے بندوں انکار کے مقابلے میں تکذیب......نا قابل معافی جرم ہے

آگے آئے ہم فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ صَدَفَ عَنْهَا (6:157) کہوان سے زیادہ ظالم کون ہوگا۔ یہاں ہے كَذَّبَ بِاٰيٰتِنَا تکذیب آیات۔ ایک تو ہے کفر اختیار کرنا یعنی کہ ہم قرآن کو مانتے ہی نہیں کہ خدا کی کتاب ہے۔ ٹھیک ہے زبردستی تو ہم کرتے ہی نہیں ہے یہ ایک مسلک ہے کھلے طور پہ یہ کہو کہ نہیں ہم اس پہ نہیں چلتے۔ ہم سیکولر انداز سے، جس طرح ہماری مصلحت کا تقاضا ہوگا، ہماری عقل و دانش کا تقاضا ہوگا، ہم کریں گے۔ یہ تکذیب نہیں یہ کفر ہے انکار ہے۔ تکذیب یہ ہے کہ آپ اس کو مانتے تو رہیں زبان سے، عملاً اس کو جھٹلاتے رہیں یعنی وہ کہے کہ اگر تم نے ملت کی تقسیم ان چیزوں پہ کر لی، تو تباہ ہو جاؤ گے اور ہم اسی طرح سے اس کی تفریق و تقسیم کرتے چلے جائیں۔ تو ہم نے کیا کیا؟ ہم نے کہا کہ نہیں نہیں! یہ ایسے ہی کہہ رہا ہے، اسے تکذیب کہتے ہیں کہ نہیں اونہیں ایسے ہی یہ کہتا ہے۔ یعنی اگر وہ کہہ رہا ہے کہ اس پڑیا کو مت پھانکو یہ زہر ہے اس سے ہلاک ہو جاؤ گے یہ چیز کہنا کہ نہیں اوئے اس سے کچھ نہیں ہوگا یہ ہے تکذیب۔ قرآن کو دہراتے ہیں، پڑھتے ہیں، تلاوت ہوتی ہے۔ جو کچھ یہ کہتا ہے اس کے بعد عملاً یہ کہتے ہیں کہ نہیں اونہیں! ایسا نہیں ہوگا۔ تکذیبِ آیات ہے۔ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (107:1) ہے نا کتنی بڑی چیز ہے۔

تکذیب دین کرنے والوں کی نشاندہی اور کچھ نمازیوں کی عملی زندگی کا ذکر

تم نے اس کو بھی دیکھا جو دین کی تکذیب کرتا ہے۔ کون ہے یہ دین کی تکذیب کرنے والا؟ عملاً جھٹلاتا ہے۔ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ . وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ یہ (3-2:107) جب پوچھو کون ہے؟ الحمدللہ مسلمان، يَدُعُّ الْيَتِيْمَ (107:2) معاشرے میں تمہارہ جانے والوں کو دھکے دیتے ہیں ان کے بچے بھوکے مرتے ہیں کوئی اٹھ کے یہ نہیں کہتا کہ پہلے ان کو کھلاؤ اور پھر اپنے بچوں کو کھلاؤ۔ تکذیبِ دین کرتے ہیں۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ. الَّذِيْنَ (5-4 :107) دیکھئے میں نے جو کہا تھا تکذیب کے معنی یہ نہیں انکار کرتا ہے یہ نمازی ہیں نماز پڑھتے ہیں فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ (107:4) تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (107:5) نماز پڑھتے ہیں نماز کے مقصد سے غافل ہیں۔ میں نے بتایا تھا یہ سَاهُوْنَ (107:5)۔ یہ دُھنیا آتا ہے نا وہ روئی دھنتا ہے، وہ دھنک بھی اس کے پاس ہوتی ہے اس میں ایک تانت ہوتی ہے ایک کمان ہوتی ہے وہ اس میں چڑھائی جاتی ہے تو پھر پوچھو نہیں کیسے وہ بڑے بڑے پہاڑوں کو روئی کے گالوں کی طرح دھنک کے رکھ دیتا ہے۔ اور اگر وہ کمان بھی موجود ہو اور وہ تانت بھی موجود ہو اور وہ الگ الگ رکھی ہوئی ہو تو پھر وہ کچھ بھی کرتی ہے؟ یہ دونوں موجود ہوتی ہیں۔ سَاهُوْنَ (107:5) کہتے ہیں اس کمان کو جس کی تانت

الگ کردی ہوئی ہو۔نماز وہ پڑھتے ہیں' کیا کرتے ہیں؟ اَلَّذِیۡنَ ھُمۡ یُرَآءُوۡنَ (107:6) بس جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ کر کے چلے آتے ہیں۔ کانوں کی لو تک ہاتھ اٹھے' اور یہاں تک نہ اٹھے دہائی مچ جاتی ہے''اوئے ایس طراں تے حنفی کردے ہوندے ہیگے نیں'' یہاں ہاتھ باندھا''نئیں نماز ہوئی جناب' ایتھے بنھ ہوگئی جی''۔''اوجدوں نئیں ہوئی تے کی ہویا تے اے ہوگئی تے ہن کی ہویا''۔ پاؤں کے درمیان اتنا فاصلہ''تیری نئیں ہوئی ہیگی' کی ہویا جی؟ فاصلہ تھوڑا جیا گھٹ گیا سی' ٹھیک ہوگیا' ہاں جی ہوگئی۔ھُمۡ یُرَآءُوۡنَ(107:6) نماز تو یوں کر آتے ہیں وَیَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (107:7) اور وہ رزق کہ جسے بہتے ہوئے چشمے کے پانی کی طرح ہر گھر کے سامنے سے چلا جانا چاہیے کہ جس کا جی چاہے جتنا چاہے لے لے' اُس میں بند لگاتے ہیں۔اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ(107:1)۔

پاکستان کی تشکیل کے فوری بعد ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارموں پر قبلے کا رخ متعین کرنے کے نشانات کا عمل

دیکھا تکذیب کرنے والے۔کَذَّبَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ صَدَفَ عَنۡھَا (6:157) تکذیب کرتے ہیں یوں ہو جاتے ہیں ذرا سا بس یوں رخ بدل لیتے ہیں۔نماز میں منہ طرف قبلہ شریف کے' دہراتے ہیں' اہتمام اتنا ہوتا ہے کہ پہلی جب یہ سلطنتِ خداداد متشکل ہوئی ہے پہلا کام انہوں نے کیا کہ ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارموں کے اوپر قبلہ کی طرف رخ کرنے والے Arrows لگا دیے۔ الحمدللہ رخ متعین ہوگیا۔اس قوم کے ہر فرد کا قبلہ اپنا اپنا' نماز میں قبلے کا رخ متعین ہوگیا۔صَدَفَ عَنۡھَا (6:157) قبلے کا رخ تو متعین کرتے ہیں جو منتہا اور نصب العین قرآن نے بتایا تھا' دین نے بتایا تھا' اس سے رخ موڑ لیتے ہیں۔ سنئے اب جو وہ کہہ رہے تھے کہ ٹھیک ہے قیامت میں جا کے جہنم ہوگی سَنَجۡزِی الَّذِیۡنَ یَصۡدِفُوۡنَ عَنۡ اٰیٰتِنَا سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ بِمَا کَانُوۡا یَصۡدِفُوۡنَ (6:157) یہ جو اس منتہا سے اس نصب العین سے اپنا رخ یوں موڑ لیتے ہیں' سَنَجۡزِی الَّذِیۡنَ (6:157) عربی جاننے والے جانتے ہیں یہ سَ کیا ہے' دیر نہیں لگے گی تم دیکھو گے ابھی اس کا بدلہ تمہارے سامنے آ جائے گا۔صاحب! کیا آئے گا؟ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ (6:157) تباہی بدترین قسم کی تباہی۔کیوں؟ بِمَا کَانُوۡا یَصۡدِفُوۡنَ (6:157) رخ جو دوسری طرف موڑ لیا تھا۔یہ ہوگا۔

وراثتِ کتاب کا عذابِ خداوندی سے بچاؤ کا طریق

قرآن نہ ملا ہوتا تو کم از کم اتنا تو کہہ سکتے کہ ہمیں پتہ نہیں تھا''اسی تے ہون اے کہن جوگے وی نئیں رہے'' بلکہ ہمیں تو اس نے یہ کہا ہے کہ ہم نے ان لوگوں کو وراثتِ کتاب کے لیے منتخب کیا تھا۔یہ ٹھیک ہے کتاب کے وارث ہونے کا دعویٰ تو ہے ان کا۔اور پھر یہ چیز جو ہوئی عذاب کی آیتیں منبروں پہ سے دہرائی جاتی تھیں عذاب آئے گا۔ذہنوں کے اندر کہتے ہیں کیا نقشہ تھا ان کے؟ ھَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ

اِلَّآ اَنۡ تَاۡتِیَهُمُ الۡمَلٰٓئِکَةُ اَوۡ یَاۡتِیَ رَبُّکَ اَوۡ یَاۡتِیَ بَعۡضُ اٰیٰتِ رَبِّکَ(6:158) تو گویا ان کے ذہن میں یہ تھا کہ عذاب یوں ہوتا ہے کہ فرشتے آتے ہیں ''گرزاوہناں دے ہتھ اچ ہوندے ہیگے نیں' مار مار کے سور بنا دیندے ہیگے نیں'' بس اس طرح سے آئیں گے فرشتے آئیں گے یوں ماریں گے۔ اور پھر یہ ہمارے لیے تو گویا یہ چھوٹے چھوٹے سپاہی بھی کچھ کافی نہیں ہونگے خود ہی آئے گا وہ تھانیدار' اللہ میاں آئے گا صاحب! ہنٹر ہاتھ میں لیے ہوئے ہوگا' بس یوں تھا نقشہ عذاب کا ان کے سامنے آتا تھا۔ ہائے! اس کا انتظار کر رہے ہو۔ کہتے ہیں اس آنے والے عذاب کی کچھ محسوس نشانیاں سامنے آنی چاہئیں۔ دیکھ نہیں رہے پھر۔ ان سے کہو یَوۡمَ یَاۡتِیۡ بَعۡضُ اٰیٰتِ رَبِّکَ لَا یَنۡفَعُ نَفۡسًا اِیۡمَانُهَا(6:158) جس دن پھر محسوس طور پہ سامنے آ جایا کرتا ہے وہ عذاب' اس وقت پھر ایمان لانا یہ کہنا کہ ہاں صاحب! اب سمجھ گئے' کسی کام نہیں آیا کرتا۔

ظہورِ نتائج کے وقت جب مہلت کا وقفہ ہی ختم ہو جائے تو پھر تلافی نہیں ہو سکتی

یہاں ایک بڑی عجیب چیز ہے۔ لَا یَنۡفَعُ نَفۡسًا اِیۡمَانُهَا لَمۡ تَکُنۡ اٰمَنَتۡ مِنۡ قَبۡلُ (6:158) جس نے اس سے پہلے کہ جب ابھی یہ چیز محسوس طور پر' پک کے سامنے نہیں آئی تھی اس سے پہلے جو اس چیز کی حقیقت کو اس نے نہیں مان لیا تھا یہ اس سے پہلے ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ایک کام اور اس کے محسوس طور پر نتیجے کے سامنے آنے کے درمیان ایک مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ ہے تو سریع الحساب' وہ نتیجہ تو اسی وقت مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے جب بیج ڈالتے ہیں زمین کے اندر تو اس کے اندر تبدیلی تو اسی آن شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ محسوس طور پر آپ کے سامنے اس کی کونپل دیر میں جا کر آتی ہے۔ یہ جو وقت ہے درمیان کا یہ وہ مہلت کا وقفہ ہوتا ہے جس میں آپ بچ سکتے ہیں۔ اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لیں تو ابھی مہلت کا وقفہ ہوتا ہے' ابھی وقت ہوتا ہے اس پہلی غلطی کی تلافی کے لیے دوسرے قسم کے کام کرنے کا۔ یاد رکھئے یہ توبہ جو کہتے ہیں وہ یہ نہیں ہے کہ یا اللہ میری توبہ کہنے سے توبہ ہو جاتی ہے۔ اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰهَ رَبِّیۡ مِنۡ کُلِّ ذَنۡبٍ وَّاَتُوۡبُ اِلَیۡهِ بس یہ صبح اٹھ کے سو دفعہ پڑھا اور سارے معاف ہو گئے۔ قرآن کہتا ہے کہ یاد رکھو! اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ (11:14) جو غلطیاں ہو جاتی ہیں ان کی تلافی اس لیے ہوتی ہے کہ اس سے بہتر قسم کے اچھے کام کرو۔ تو مہلت کے وقفے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ قبل اس کے کہ تباہی کا آخری لمحہ آ جائے' اتنا وقت ہونا چاہیے تمہارے پاس کہ تم اپنے ان غلط کاموں کے تخریبی نتائج کی تلافی کے لیے' اچھے کام زیادہ کر سکو۔ اسے تاب واصلح کہتے ہیں۔ اور اگر یہ وقت ہی نہیں ہے تو پھر تو سوال ہی نہیں' پھر توبہ کے کیا معنی۔ لَمۡ تَکُنۡ اٰمَنَتۡ مِنۡ قَبۡلُ (6:158) یہاں تک تو بات یونہی صاف ہی ہے کہ ٹھیک ہے پہلے اس کے متعلق سوچنا چاہیے تھا۔

کسی شخص کا زبانی کلامی ایمان کچھ کام نہیں دے گا

اب اگلی بات ہمیں تو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ ہر مسلمان' بحمد اللہ مسلمان ہے ایمان ہے اللہ پہ ایمان ہے رسول پہ ایمان ہے سب

چیزوں کے اوپر ایمان ہے۔ ایمان تو یہ ہے یہ جو زبانی ایمان ہے۔ کہا ایک تو ان کو نہیں ایمان فائدہ دے گا کہ جب سامنے کوئی چیز آ جائے تو اس وقت کہیں کہ ہم ایمان لائیں۔ ایک اور کیٹگری بھی ہے اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا (6:158) یا جنہوں نے ایمان' ایمان کہنے کے بعد کوئی نیک عمل نہیں کیا تھا اس کا ایمان بھی گیا۔ ایمان معنی ہی کچھ نہیں رکھتا کسی چیز کو صحیح ماننے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے مطابق کام کیا جائے تا کہ وہ نتیجہ نکلے۔ ایک زمیندار مانتا ہے کہ آج کل گنے کی فصل بونے میں بڑا فائدہ ہے۔ ایک ایک ایکڑ سے تین تین ہزار چار چار ہزار نکل آتا ہے۔ یہ ہے موسم اس میں اس قسم کا بیج ڈالتے ہیں' یوں زمین تیار کرتے ہیں' یوں کھاد ڈالتے ہیں' یوں ان کو پانی دیتے ہیں' یوں گوڈی کرتے ہیں' وہ سب جانتا ہے۔ وہ کہتا کہ واقعی اس سے اتنا کماد پیدا ہو جاتا ہے۔ بوائی کا وقت آتا ہے ''تے بیٹھا حقہ پیندا رہندا اے'' نہ زمین سنوارتا ہے نہ بیج ڈالتا ہے نہ کھاد ڈالتا ہے' جاتا ہی نہیں فصل کے اوپر۔ ہر جگہ بیٹھ کے کہتا رہتا ہے کہ بڑی کمائی ہے کماد کی فصل میں صاحب آج کل اور خوب ہوتا ہے گنا اور ہماری زمین میں تو اتنا اتنا موٹا ہوتا ہے' کہتا چلا جاتا ہے۔ کہیے کیا مل جائے گا اس کو اس کے بعد۔ یہ جو بحث آپ کے ہاں چلی ہے اور بحثیں تو پوچھو نہیں کتنی چلی ہوئی ہیں کہ خالی ایمان سے بھی نجات ہو سکتی ہے یا نہیں ہو سکتی۔ بحث بڑی لمبی چوڑی۔ بہت بڑا آپ کے ہاں ایک فرقہ ہے کہ بس اتنا ایمان نجات کے لیے کافی ہے۔ تو دوسرے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ یوں نہیں ہے۔ یعنی بحثیں اس پہ چلی ہوئی ہیں۔

عمل کیے بغیر کسی اچھے فارمولے کو دہرائے چلے جانا صحت کے اصولوں کے منافی ہے

قرآنِ کریم کی آیت موجود ہے اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا (6:158) جس نے اپنے ایمان کے ساتھ کوئی کسبِ خیر نہیں کیا ہے یہ ایمان اس کا کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ سارے صحت کے اصول آپ کو از بر ہوں لیٹے رہیں چار پائی کے اوپر آپ' ٹھیک ہے پہلوان بن جاؤ گے؟۔ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا (6:158) اور ایمان اور عمل کا یہ ساتھ دیکھئے کتنا عجیب وغریب ہے۔ محض کسی اچھے فارمولے کا دہرائے چلے جانا اس کے متعلق کہتے چلے جانا کہ بہت اعلیٰ درجے کا ہے' ہمارے ہاں ہو یہ رہا ہے قرآنِ کریم کے متعلق آپ کہیں وعظ سنئے یا لیکچر بھی سنئے

نہ دہر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری

لیکچروں میں بھی آپ دیکھئے تو قرآنِ کریم کی عظمت کے اوپر گھنٹوں لیکچر ہونگے اتنی اتنی بڑی تصنیفیں آپ کے ہاں موجود ہیں۔ لیکن اس کے بعد زندگی جتنی بھی ہے وہ ساری اس کے خلاف جاتی ہے۔ کچھ فائدہ نہیں۔ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا (6:158)۔

قیامت سے پہلے قبر میں قیامت کے ماجرے کی نوعیت

ٹھیک ہے پھر آ گیا وہی مولوی صاحب کہ کرو یہ کچھ قیامت میں دیکھنا۔ قیامت میں نہیں بس نظروں سے اوجھل ہوا مردہ اور بس شروع ہوگیا۔ یعنی سامنے جب تک ہے نار کھا ہوا بھی مردہ اس وقت بھی نہ کوئی گرزوں والا آتا ہے نہ اس کی چیخیں نکلتی ہیں کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اس وقت تو پتہ چل جاتا ہے کہ مولوی صاحب! کہاں ہے آپ کہتے تھے کہ وہ مارا کرتے ہیں، چیخیں نکلتی ہیں۔ کہنے لگے ذرا ٹھہر جا۔ جونہی اس کو مٹی کے نیچے دبایا اور انہوں نے کہا کہ ہوگئی شروع۔ کوئی آواز نہیں آتی' نہیں! اس کی آواز تمہارے کانوں میں نہیں آتی، تمہاری جوتیوں کی آواز اس کے کانوں میں پہنچ رہی ہے۔ یہ ہے جو کچھ کہا جا رہا ہے۔ یعنی ان چیزوں کا تعلق آپ کی اس زندگی سے نہیں ہے۔ وہ کیا کہتا ہے قُلِ (6:158) اے رسول ان سے کہد و انۡتَظِرُوۡۤا اِنَّا مُنۡتَظِرُوۡنَ (6:158) کوئی بات نہیں! تم کہتے ہو کہ نہیں سنکھیا کھانے سے کچھ نہیں ہوتا، میں کہتا ہوں کہ اس سے ہلاکت ہوجاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں اس کا ثبوت' وہ کہتا ہے کہ یہ پھانکو اور چند منٹ کے لیے تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کرتا ہوں، بات صاف ہوجائے گی۔ اگر یہ نتائج یہاں نہیں نکلتے تو یہ انتظار کس قسم کا ہے، دیکھ لوگے سامنے۔

زندگی کی چلتی گاڑی میں جمود کا نام جحیم ہے

یہ جو کچھ بھی ہوا ہے ہمارے ساتھ ہورہا ہے' ہوا کیا ہورہا ہے برسوں سے، صدیوں سے ہورہا ہے یہ سب عذاب ہیں یہ عذابِ جحیم ہے۔ اس نے اسی لیے جہنم کے لفظ کے علاوہ اپنا عربی کا لفظ جو تھا، جہنم تو وہ ہے کہ وہ بھٹی جس میں انسان جلتے ہوں اور جحیم اس نے کہا ہے کہ جہاں کوئی چلتا ہوا رک کے کھڑا ہوجائے، وہ جحیم ہے۔ حرکت کا نام ہے انسان' جہاں حرکت رک گئی جہاں کوئی قوم کھڑی ہوگئی بس جس مقام پہ وہ کھڑی ہوگئی جحیم ہے۔ جحیم کے تو معنی ہی ہیں رک جانا۔ صدیوں سے جس عذاب کے اندر ہم مبتلا ہیں یہی نہیں کہ ہمیں یہ نہیں کہا گیا کہ یہ عذاب ہے، اللہ کی رحمت ہے خدا کے مقرب بندوں کی نشانیاں ہی اتنی ہوتی ہیں۔

امام مہدی کے آنے کے انتظار کے تصور کی کہانی اور ایک مولوی صاحب کا فرمان

وعظ کہا جاتا ہے کہ وہ آنے والے امام مہدی' لوگ پوچھتے ہیں کہ اب بھی کیوں نہیں آئے۔ تو ایک وعظ میں نے خود سنا ہے بہت بڑی مسجد کا' انہوں نے کہا کہ اس کے لیے شرط یہ تھی کہ جب مسلمان انتہائی ذلت کے اندر، زوال کے اندر، پستی کے اندر گر جائیں گے، اس مقام پہ امام صاحب تشریف لائیں گے۔ اگر ابھی نہیں آئے تو یہ سمجھئے کہ ابھی تمہاری انتہائے ذلت میں کچھ فرق ہے۔ ''چھیتی کروائے تہاڈے ہتھ اچ ہے''۔ قُلِ انۡتَظِرُوۡۤا اِنَّا مُنۡتَظِرُوۡنَ (6:158) عربی جاننے والے اس کو جانیں گے کہ یہاں اِنَّا (6:158) کیا آیا

ہے 'ہم' بھی انتظار کرتے ہیں۔ جو صداقت کے اوپر حق کے اوپر عدل کے اوپر ہو' جھنوں یقین تے مان ہونداا ے ایس گل دا'' کہ جو میں کہتا ہوں ویسے ہو کے رہے گا کس انداز سے کہا ہے قُلِ انۡتَظِرُوۡۤا تم انتظار کرو اِنَّا مُنۡتَظِرُوۡنَ (6:158) ہم بھی انتظار کرتے ہیں ابھی معلوم ہو جائے گا کہ کس کا نتیجہ کیا سامنے آتا ہے۔ دین انسان کو دنیا میں رہنا سکھانے کے لیے آیا تھا۔ اچھا جی پھر!! یہ تو چیز ہو گئی کہ یہ صراطِ مستقیم ہے اس کے اوپر چلو گے تو سیدھے اس منزل تک پہنچ جاؤ گے۔ اگر یہ ملت ملتِ واحدہ نہ رہی تو۔

دین خداوندی کا عطا کردہ نظام حیات انسان کو زندگی گزارنے کے آداب سے آگہی بخشتا ہے

وہ آ گئی آیت عزیزانِ من! یہ تو کلیجے پہ ہاتھ رکھ کے سننے والی آیتیں آ گئیں' ہمت ہے تو سنئے۔ بہر حال یہ تو نہ سنیں گے تو پھر کونسی معافی مل جائے گی ہمیں۔ یہ تو ہے نہیں کہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرو گے تو بلی چلی جائے گی' یہ تو اپنا نتیجہ مرتب کرتی چلی جائیں گی۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا (6:159) اللہ اکبر۔ ملت' ملتِ واحدہ۔ میں یہیں یہ کہہ دوں کہ آپ یہ جہاں جی چاہے وعظیں سنتے چلے جائیے' جس مولوی صاحب سے جی چاہے' پوچھ لیجیے۔ کبھی آپ کو وہ فرقہ بندی کے خلاف کچھ نہیں بتائے گا قرآن کی آیتیں بھی نہیں بتائے گا۔ جب یہ آیتیں آئیں گی یہ عجیب تکنیک ہے ان کی اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ (6:159) یہ نہیں کہ جنہوں نے فرقے پیدا کر لیے یہ ترجمہ ہی نہیں کرے گا' 'جنہوں نے تفرقہ پیدا کر لیا' یہ کہہ کے آگے بڑھ جائے گا۔ آپ نے دیکھا کہ اس میں وہ بات نہیں کھٹکتی۔ لیکن یہ تو قرآن ہے یہ تو کوئی راستہ بھی چور کے لیے چھوڑتا نہیں ہے۔ تفرقہ کہہ رہے ہو فرقہ بندی نہیں کہہ رہے' فرقہ کہنے سے تو وہ خود فرقے میں ہوتا ہے۔ اس نے اتنا ہی نہیں فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا (6:159) اور خود ایک گروہ بن گئے۔ آ گئی بات۔ تفرقے کے معنی خود بتا دیے اس نے گروہ بندی' فرقہ سازی۔ دین میں ملت میں فرقے کا پیدا ہو جانا۔ دین کی بنیاد کے خلاف ہے۔

امت واحدہ کے بنیادی خدوخال اور ہماری سوچ

ایک آئین ایک Constitution ایک دستور ایک ضابطہ' قانون ایک نصب العین ایک منزل' اس کی طرف چلنے والا ایک کارواں ایک قافلہ' ملت' ملتِ واحدہ۔ اس کے اندر فرقے پیدا کر لینا یہ کیا ہے؟ کئی دفعہ آیتیں آئی ہیں۔ پھر بات آ گئی ہے اور یہ تو ہزار دفعہ کہنے کی بات ہے۔ فرقہ پیدا ہو جانا قرآن اسے کیا قرار دیتا ہے؟ وہ اسے شرک قرار دیتا ہے۔ جو قوم فرقوں میں بٹ گئی ہو اسے وہ قوم مشرکین کی کہتا ہے۔ ٹھیک ہے میں نے کہا تھا جھنجلاہٹ تو بڑی آتی ہے لیکن اس کا کیا علاج۔ مُنِیۡبِیۡنَ اِلَیۡہِ وَ اتَّقُوۡہُ وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ لَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ (30:31) یاد رکھنا تم کہیں مشرکوں میں سے نہ ہو جانا۔ مولوی صاحب مطمئن ہیں کہ ہم بت تو نہیں پوجتے ہم تو نہیں مشرکین میں سے۔ بتاتا ہے یعنی مِنَ الَّذِیۡنَ (30:32) ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ (30:32) جنہوں نے

دین میں فرقے پیدا کرلیے۔ وَ کَانُوۡا شِیَعًا (30:32) خود بھی ایک گروہ بن کے بیٹھ گئے۔ پھر اگلا لفظ چھوڑتا نہیں ہے۔ کُلُّ حِزۡبٍ ۭبِمَا لَدَیۡہِمۡ فَرِحُوۡنَ (30:32) پھر ہوتا یہ ہے کہ ہر فرقہ، ہر گروہ خوش ہوتا ہے کہ میں حق پہ ہوں یہ باقی بہتر جہنمی ہیں سارے۔

قرآن حکیم کے فرمان کے برعکس 72 فرقوں کے متعلق ایک خودساختہ حدیث کا ذکر

اس خوش فہمی میں نہ رہیے کہ کوئی ایک فرقہ کہہ سکتا ہے کہ میں دین کے اوپر حق کے اوپر ہوں۔ فرقے امت میں پیدا ہوتے ہیں قرآن کہتا ہے کُلُّ حِزۡبٍ ۭ بِمَا لَدَیۡہِمۡ فَرِحُوۡنَ (30:32) پھر تو ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے، مگن ہو رہتا ہے، اس میں خوش ہو رہتا ہے کہ میں حق کے اوپر ہوں۔ امت میں فرقہ پیدا ہوجانا جو ہے پھر وہ پوری امت بمعہ اس فرقے کے دین کے راستے سے ہٹ گئی ہوتی ہے۔ اب ہر فرقے سے جس سے پوچھ لیجیے وہ کہتا ہے کہ میرا کیا قصور ہے میں تو صحیح اسلام کے اوپر ہوں یہ باقی ہیں جو فرقے بن گئے ہیں۔ وہ تو کہتا ہے کُلُّ حِزۡبٍ ۭ بِمَا لَدَیۡہِمۡ فَرِحُوۡنَ (30:32)۔ اب اس کے لیے تھوڑی سی ان کو خوش فہمی میں رکھنے کے لیے ان لوگوں نے ایک حدیث وضع کردی۔ اس حدیث نے اس طرح سے یہ گرہیں پختہ کیں۔ حدیث ہے کہ میری امت میں تہتر فرقے ہونگے بہتر تو ان میں جہنم میں ہونگے اور ایک فرقہ ان میں سے جنت میں ہوگا۔ اور تہتر کے تہتر اپنے اپنے ہاں یہ سمجھ رہے ہیں کہ ''اسی آں او اک جیہڑا جنت اچ جان والا ہے''۔ یعنی ہر فرقہ کو یہ اطمینان مل گیا ضمانت مل گئی جب بھی Exception آپ نے اس میں کردی تو ہر ایک کو اس میں ضمانت مل گئی کہ ہم ٹھیک ہیں وہ جو کہا ہے حضور ﷺ نے، وہ ہم ہیں۔ اب ساری بحثیں آپ کے ہاں لڑائیاں جھگڑے جتنے ہیں وہ یہ ہو رہے ہیں کہ وہ جی ہم ہیں، یہ باقی نہیں ہیں اور ہر ایک اپنے آپ کو یہ سمجھ رہا ہے۔ اور قرآن کہتا ہے کُلُّ حِزۡبٍ ۭ بِمَا لَدَیۡہِمۡ فَرِحُوۡنَ (30:32)۔ یہ تو ہو گیا شرک۔ قرآن کہتا ہے مُشۡرِکُوۡنَ۔

رسول کی نسبت سے امت کا وجود قائم ہوتا ہے

یہ جو آیت ہمارے سامنے تھی اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا (6:159) رسول اللہ ﷺ سے کہا جارہا ہے۔ اس سے تو پھر کہدوں سورۃ روم کی یہ جو آیت تھی (30:31) اس سے تو خدا سے تعلق ختم ہوا مشرک ہوگئے، باقی رہ گئے رسول اللہ ﷺ۔ رسول ﷺ سے ایک تعلق ہے جس سے امت بنتی ہے یاد رکھئے امت رسول کی نسبت سے بنتی ہے۔ خدا پر ایمان لانے سے ایک امت نہیں بنتی، دین نہیں بنتا، رسول پہ ایمان لانے سے اس کی نسبت سے ایک امت بنتی ہے۔ یہ تو امتِ واحدہ تھی۔

رسول کی ذات کا کسی فرقے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا

اس آیت کو غور سے سنئے۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا (6:159) جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کیے خود بھی ایک

ان میں سے گروہ بن گئے' اے رسول! لَّسۡتَ مِنۡهُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ (6:159) تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ خدا سے واسطہ نہ رہا تو شرک' مشرک ہو گئے' رسول سے واسطہ نہ رہا۔ سوچئے عزیزانِ من! ہم کہاں کھڑے ہیں۔ امت میں فرقہ پیدا ہو جانا پھر ان میں سے کسی کا بھی تعلق نہ خدا کی توحید سے رہتا ہے' نہ رسول سے رہتا ہے۔ اب ہر ایک ان میں سے کہتا ہے کہ جی نہیں! ہم تو فرقے والے نہیں ہیں ہمارا فرقہ نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے آپ کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھتا ہے' ہم فرقے میں نہیں ہیں۔ آپ کو پتہ ہے فرقہ کیا ہے یہ فرقہ بنتا کس طرح سے ہے۔ دین میں سند جو ہے وہ خدا کی کتاب ہے۔ کسی معاملے میں آپ کو اختلاف ہو باہمی' دلائل آپ دیے جا رہے ہیں۔ ایک نے قرآن کی آیت جب پیش کر دی تو وہ سند ہو گئی اب اگر دونوں قرآن کو ماننے والے ہیں' تو بحث ختم ہو گئی۔ جو اس نے کہہ دیا وہ حجت ہو گئی' وہ سند ہو گئی خدا کی کتاب۔

قرآن حکیم کے الفاظ میں انسانوں کو صرف کلامِ الٰہی کا اتباع کرنے کا حکم ہے

مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) جو اسے حکم نہیں مانتا ہے وہ کافر ہے۔ یہ ہو گیا دین۔ جبھی اس نے کہا تھا فَاتَّبِعُوۡهُ اسی کا اتباع کرو۔ جہاں اس نے کہا تھا کہ اس کا اتباع کرو وہاں کہا تھا وَ لَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِیَآءَ (7:3) یہ ایک بڑی عجیب چیز ہے۔ اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ (7:3) اتباع کرو اس کا جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے وَ لَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِیَآءَ (7:3) یہ ہے چیز۔ اولیاء' جن کے تم بہت قریب ہوتے ہو جن کو اپنا سرپرست سمجھتے ہو' جنہیں اپنے سے بڑا سمجھتے ہو' ان کا اتباع نہ کرو۔ تو یہ نظر آ گیا کہ اتباع اگر ما انزل اللہ کا ہو' قرآن کا ہو' تو پھر تو فرقہ بنتا نہیں ہے۔ فرقہ اس وقت بنتا ہے جب آپ کے نزدیک سند اور حجت کسی انسان کا قول ہو جائے۔

مختلف فرقوں کے نزدیک کسی قول کو حجت قرار دینے کی نوعیت

کوئی فرقہ آپ لے لیجیے ان سے کوئی بات کیجیے آخر میں جا کے کسی نہ کسی انسان کا قول آ جائے گا جس پہ وہ حجت اس کو قرار دیں گے۔ اس میں سب سے بڑے اہل حدیث حضرات کہا کرتے ہیں کہ نہیں ہم تو کسی انسان کا قول نہیں مانتے ہم تو رسول اللہ ﷺ کی حدیث کو مانتے ہیں۔ اگر رسول اللہ ﷺ اپنی کوئی حدیث یا حدیثوں کا مجموعہ امت کو مصدقہ طور پر دے جاتے جیسے قرآن دے گئے تھے تو وہ تو حدیثِ رسول ﷺ ہوتی' حضور ﷺ نے تو دیا ہی کوئی نہیں ایسا۔ اب جسے یہ حدیثِ رسول ﷺ کہتے ہیں وہ ہے کیا؟ سب سے زیادہ معتبر ترین کتاب بخاری شریف ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے اڑھائی سو سال بعد ایک شخص نے انفرادی طور پر اپنے طور پر (بخارا سے وہ اٹھا) بڑی محنت کی اس نے اس میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن یہ محنت کیا تھی؟ اپنے طور پر حضور ﷺ کے زمانے کی باتیں جو ڈھائی سو سال

کے بعد لوگوں میں مشہور تھیں، وہ اس نے ایک جگہ اکٹھی کیں۔ اکٹھی کر کے وہ خود لکھتے ہیں کہ چھ لاکھ کے قریب اتنی باتیں مجھے لوگوں کی زبانی سنائی دیں، کہا کہ پانچ لاکھ چورانوے ہزار تو میں نے کہا کہ نہیں یہ تو غلط ہیں۔ گویا اتنی اس زمانے میں یہ عام ہوگئی تھیں کہ چھ لاکھ میں سے پانچ لاکھ چورانوے ہزار تو ان کے نزدیک ہی ایسی تھیں جو اعتبار کے قابل نہیں تھیں وہ تو چھوڑ دیں۔ چھ ہزار انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے ہاں یہ رکھ لیں۔ تو کیا چیز ہوا یہ مجموعہ۔ جو باتیں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کی جاتی تھیں حضور ﷺ کی وفات کے دوسو اڑھائی سوسال بعد، ایک شخص نے اپنی بصیرت کے مطابق ان میں سے ان باتوں کو صحیح سمجھا۔ ارے! تو مجھ پہ کیا یہ لازم آ گیا کہ میں ان کی بصیرت پر ایمان لے آؤں۔ ایک شخص کی بصیرت ہے اس کے پاس خدا کی تو کوئی سند نہیں ہے اس کے پاس رسول ﷺ کی کوئی سند نہیں ہے اس کی بصیرت ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اب مطالبہ کیا ہے؟ مطالبہ یہ ہے کہ کوئی شخص جو بخاری اور مسلم (دوسرا مجموعہٴ حدیث ان کے بعد جو ہے مسلم کا ہے) کی کسی ایک حدیث سے بھی انکار کرتا ہے وہ کافر ہے۔ اہلِ حدیث حضرات کا یہ ہے عقیدہ۔ اب کفر اسلام کا معیار ہوگیا امام بخاری اور امام مسلم کی جو بصیرتِ انتخابی ہے اس پر قیامت تک کے لیے ایمان لاؤ تو آپ مسلمان اگر اس میں شبہ کرو تو آپ کافر۔ وہ تو ایک حدیث پہ کہا۔

اہل فقہ کے نزدیک حجت کا معیار

آگے آئے ہمارے ہاں فقہ والے۔ فقہ والوں کے ہاں حنفی فقہ والے سب سے زیادہ تعداد میں رہے ہمیشہ۔ حنفی فقہ والے حدیث سے انکار نہیں کر رہے لیکن بخاری کی قریباً دوسو حدیثیں ہیں احکام کی، جن کا یہ انکار کرتے ہیں۔ اس لیے اہل حدیث تو رہے الگ، ان کے نزدیک سند امام بخاری اور مسلم ہیں۔ یہ فقہ والوں کے لیے سند ان کے ہاں کا فقہ کا امام۔ انہوں نے جو آپ کے ہاں شریعت میں مسئلہ دیدیا، جو قانون دیدیا، جو حکم دیدیا جو قول دیدیا، وہ قول سند اور حجت ہے۔ یعنی کسی معاملے میں بحث ہوتی ہو ان کے ہاں اس امام کا قول اور پھر وہ بھی ان کے ہاں کی ان جو کتابوں کے اندر ہیں وہ بھی امام ابوحنیفہؒ کی نہیں ہیں۔ حنفی تو یہ کہتے ہیں امام ابوحنیفہؒ کی کوئی کتاب ہی فقہ میں نہیں ہے یہ ساری کتابیں اوروں کی ہیں۔ لیکن کسی نہ کسی شخص کے اوپر جا کے بات ٹک گئی، اُس کا قول ہے۔

کیا کوئی حدیث قرآن حکیم کی آیت کو منسوخ بھی کرسکتی ہے؟

حدیث والوں نے یہ بات کہی کہ قرآن تو ساتھ ہے بشرطیکہ یہ قرآن اس حدیث کی اگر تائید کرتا ہے تو پھر تو وہ قرآن مان لو اتنا حصہ۔ اور اگر کہیں ٹکراؤ ہو جاتا ہے حدیث میں اور قرآن کی آیت میں تو حدیث، قرآن کی آیت کو منسوخ کر دیتی ہے۔ اور حدیث ہے کسی ایک شخص یا دو تین اشخاص جو ہیں امام بخاری اور مسلم، ان کی انتخاب کی بصیرت ہی آپ کہیں گے اور کیا ہے۔ فقہ والے آئے، انہوں نے

یہ بات کہہ دی کہ ہمارے امام کا کوئی قول اگر اس کی تائید قرآن اور حدیث کرتی ہے تو ان کو تو لیا جائے گا اور اگر یہ دونوں میں ٹکراؤ پیدا ہوگا تو قول واجب الاتباع ہمارے امام کا ہے۔ یا تو ان کی تعبیر ایسی کرو قرآن حدیث کی جو اس کے مطابق ہو جائے اور اگر نہیں ہو سکتی تو پھر اسے منسوخ سمجھا جائے' اتباع اس کا ہوگا۔ وَ لَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ (7:3) قرآن نے کہا تھا کہ ان اشخاص کی پیروی نہ کرنے لگ جانا۔ کہیں آپ دیکھئے گا فرقے کے متعلق ایک شخص ہوگا جس کا قول حجت ہوگی۔ آپ اس شخص کے اوپر تنقید نہیں کر سکتے اس کے قول کو رد نہیں کر سکتے' اس کے خلاف نہیں کچھ کہہ سکتے' شخصیت ہی اتنی بڑی ہوگی۔ یعنی کسی چیز میں قرآن کا مثلاً سمجھنا کسی سے' استاد سے سمجھنا اس کی یہ سمجھنے سمجھانے کی بات اور ہے لیکن اگر یہ چیز کہی جائے کہ یہ بات جو میرا استاد کہتا ہے وہ سند ہے' بس یہاں شرک ہے' یہاں سے فرقہ بنتا ہے۔ افہام وتفہیم درس وتدریس یہ تو جاری ہے' کوئی بات ہی نہیں ہے۔

قرآنی حقائق کو تسلیم کرنے کے سلسلہ میں عقل وشعور کا معیار

آپ درس سنتے ہیں قرآن میں سمجھاتا ہوں آپ کو پورا حق حاصل ہے مجھ سے اتفاق کریں' مجھ سے اختلاف کریں' مجھ پہ تنقید کریں' کہہ دیں ہم نہیں مانتے' غلط کہتے ہو۔ لیکن اگر کسی شخص نے باہر یہ کہہ دیا کہ پرویز صاحب یہ کہتے ہیں' اُس نے کہا کہ نہیں اس معاملے کے اندر قرآن کی آیت تو یہ ہے اور اُس نے کہا کہ نہیں میں تو جو کچھ پرویز صاحب کہتے ہیں' میں تو وہ مانتا ہوں صحیح' بس یہ فرقہ ہے یہ شرک ہے۔ اب پرویز صاحب نے (معاذ اللہ) خدا کا درجہ لے لیا۔ سارے اس ہزار سال میں آپ کے ہاں ان اشخاص نے یہ درجہ لیا ہوا ہے اسے کہتے ہیں فرقہ۔ یوں تو کوئی بھی نہیں اقرار کرتا ان میں سے کہ ہمارا فرقہ ہے۔ اب اس دور کے اندر اب جو اللہ کا شکر ہے کہ اس دور میں قرآن کی آواز بہت اٹھی ہے' عام ہوئی ہے' یہ آیتیں عام ہوئی ہیں۔ اب ان سے پوچھو کہ کیا کہتے ہیں' کہتے ہیں کہ نہیں یہ ایک مکتبِ فکر ہے۔ یعنی جو فکر ہے کسی انسان کی وہ تو حجت نہیں ہو سکتی' دلیل نہیں ہو سکتی سند نہیں ہو سکتی' اس شخص نے ایسا سوچا ہے تو آپ تو سند مانتے ہیں اسے۔ بتایئے تو سہی اگر فکر کی حیثیت ہی یہ ہے کیا آپ اس کو ماننے کو تیار ہیں کہ آج ایک بات ایسی کہی جائے جو بقول آپ کے' امام ابوحنیفہؒ یا فقہ حنفی کے خلاف جائے اور آپ اسے صحیح مان لیں۔ فکری بات تو یہ ہے کہ آپ بھی' سوچیں ہم بھی سوچتے ہیں' سوچ کے بعد کسی نتیجے پہ پہنچیں گے۔ وہاں تو سوچ حرام ہے۔ جہاں آپ نے کسی انسان کو شخصیت کو آپ نے سند مان لیا' سوچ ختم ہو گئی آپ کی۔

قومی یا ملکی سطح پر ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ایک اجتماعی نظام کا ہونا لازم ہے

قرآن سوچ ہی تو دینے کے لیے آیا تھا کہ یہ اصول ہیں خود سوچو اس کے اوپر۔ باقی رہا ملت کا عمل اس میں اختلاف پیدا ہوتا ہے وہاں آ کے تفرقہ پیدا ہوتا ہے' وہاں فرقہ بنتا ہے جہاں آپ کا عمل شروع ہوتا ہے۔ اس کے لیے نظامِ مملکت' یہ تھی چیز' پوری امت کا ایک

نظام آپ کے لیے۔فکری حریت آپ کی رہے گی قرآن کے حقائق کو میں نے یوں سمجھا ہے' اس نے یہ سمجھا ہے اپنے طور کے اوپر۔لیکن جہاں عمل کی صورت آئے گی قوم کے لیے وہ ایک راستہ ہوگا' ساری قوم کو ایک طریقے کے اوپر چلنا ہوگا' طریقہ وہ ہوگا جو اسلامی نظام تجویز کرے گا اس کے لیے۔یوں فرقے ختم ہوتے ہیں۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (30:32)۔اور اگر یہ مملکت ہی کسی خاص حزب کی کسی خاص فرقے کی ہوئی تو سب سے بڑی مشرک خود ہے وہ مملکت۔یہ دور اب آ رہا ہے اس میں شکر ہے اللہ کا قرآن کی آواز اونچی ہوئی ہے۔کہا جا رہا تھا کہ کتاب وسنت کے مطابق قوانین بنے گا جب کہ چوبیس برس سے (میری اس میں کو معاف کر دیجیے گا) میں کہہ رہا تھا کہ کتاب وسنت کے مطابق کوئی ضابطہ ایسا نہیں بن سکتا جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔اور مملکت کا ضابطہ تو ایسا ہونا چاہیے جو سب کے اوپر Equally Apply کرے' ہر ایک کے اوپر منطبق ہو وہ۔اور ایسا نہیں بن سکتا۔

ایک ہزار علماء کی طرف سے پرویزؒ کے خلاف کفر کا فتویٰ اور آخر کار کتاب وسنت کے متعلق ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا تحریری اقرار

آپ کو معلوم ہے چوبیس برس شور مچاتے چلے گئے منکرِ حدیث' منکرِ شانِ رسالت اور یہ اور وہ۔بہت اچھا جی کرتے چلے جایئے۔اور آپ کو معلوم ہے کہ اب آ کے بالآخر جو سب سے زیادہ مجھے کافر کہنے والے' شور مچانے والے تھے' انہوں نے لکھ کے دیدیا ہے کہ کوئی ضابطۂ حیات کتاب وسنت کے مطابق ایسا نہیں بن سکتا جو سب فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تحریر موجود ہے 'نہیں بن سکتا'۔چلو جی! کہیں کوئی اقرار ہوا 'نہیں بن سکتا'۔اور اب جو نئی مملکت بنی اس کو جو انہوں نے اپنی بھیجی ہیں قرار دادیں Constitution (آئین) بنانے کی اس کے اندر پہلی قرار داد یہ ہے کہ مملکت میں کتاب وسنت کے مطابق ضابطۂ قانون بنایا جائے جو نہیں بن سکتا۔آپ دیکھتے ہیں کتنے بڑے فتنے کا بیج بویا جاتا ہے۔چوبیس سال تک اعتراض کہ یہ سارے بے ایمان ہیں جی یہ بناتے نہیں' دیکھئے صاحب! شریعت کا قانون نہیں بناتے' قانون نافذ نہیں کرتے بڑے بے ایمان ہیں۔

حقیقت کا اقرار کرنے کے باوجود متواتر انکاری کی رٹ

لوگ بھی بیچارے ہیں ان کی سمجھ میں بات نہیں آتی۔شرط وہ عائد کرتے ہیں جس کے مطابق' اب پرویز صاحب نہیں کہہ رہے' وہ خود یہ لکھ کے دے رہے ہیں کہ نہیں بن سکتا۔لکھا ہوا موجود ہے 'نہیں بن سکتا'۔اور ان سے پھر مطالبہ ہو رہا ہے کہ اس کے مطابق بناؤ۔اب پھر شور مچنا شروع ہو جائے گا کہ دیکھو جی نہیں بناتے۔انہوں نے کہا کہ تمہارے اپنے اندر اختلافات ہیں ان اختلافات کو رفع کرو تو پھر ہم کچھ بنائیں بھی۔اِنہوں نے کہا کہ واہ! اختلاف ہے' دیکھئے ہم اختلاف مٹاتے ہیں۔

1951ء میں 33 علمائے دین کی طرف سے 22 نکات کا پہلا نکتہ کہ قانون کو کتاب وسنت کے مطابق بنایا جائے

1951ء میں 33 علمائے کرام اکٹھے ہوئے تھے مختلف فرقوں کے۔ متفقہ انہوں نے فیصلہ ان کے حکومت کا پیش کردیا' بائیس نکات وہ کہتے ہیں کہ جی اس پہ ہم سب اکٹھے ہیں اس کے مطابق بنا دیجیے جی۔ آپ کو پتہ ہے کہ ان میں سب سے پہلا نکتہ جو ہے بائیس نکات میں سے کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ مملکت کا قانون کتاب وسنت کے مطابق بنایا جائے گا۔ اکٹھے ہوگئے اس پہ۔ اب جو ان سے کہتے ہیں وہ کہتے ہیں جی دیکھئے ہم نے متفق علیہ مطالبہ دیدیا کہ اس کے مطابق بنایا جائے' جس کے متعلق خود کہہ دیا کہ نہیں بن سکتا۔ جب ان سے کہا گیا کہ یہ نہیں بن سکتا تو کہا کہ کوئی بات نہیں یہ نہیں بن سکتا تو ملک میں حنفی قانون رائج کردیا جائے' کتاب وسنت کے مطابق ہوگا۔ اہلِ حدیث سارے اکٹھے ہوگئے انہوں نے کہا کہ تم بنا کے دیکھو''کھل نہ لہا چھڈ یے'' وہ کہنے لگے جی ہم اس کو مانتے ہی نہیں اسلامی۔ یہ بحث تھی سنیوں کی آپس میں۔

فقہ حنفی کے نفاذ کی تجویز اور شیعہ حضرات کی طرف سے مکمل انکار

شیعہ حضرات نے کہا''تہاڈی فقہ تہاڈیاں حدیثاں تہاڈے نال'' ہم ان میں سے کسی کو بھی نہیں مانتے۔ یہ ہے فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ (6:159)۔ یہ عملی چیزیں ہیں پریکٹکل چیزیں ہیں' یہ کوئی مذاق کرنے کی بات نہیں ہے۔ آپ جو کہہ رہے ہیں کہ چوبیس سال ہوگئے بنے ہوئے اسلامی مملکت کو' ایک قدم آگے نہیں اٹھایا جا رہا' قانون ہی نہیں بنایا جا رہا بتایئے تو سہی۔ یہ واقعات ہیں۔ فرقوں کی موجودگی میں جو مطالبہ ان کا ہے وہ یہ کہ شخصی جہاں تک قوانین Personal Laws ہیں وہ تو ہر فرقے کے اپنے اپنے۔ یوں فرقوں کی گرہیں تو مضبوط ہوگئیں نا Personal Laws تک۔ Public Laws تو سارے اکٹھے ہونے چاہئیں یعنی وہ تو مملکت کا ایک قانون ہوتا ہے۔ آپ سمجھ لیں Public Laws پھر اب کیا ہوگا۔ وہ مملکت کا ایک ہوتا ہے۔ مطالبہ یہ تھا کتاب وسنت کے مطابق بناؤ' اقرار کرلیا کہ نہیں بن سکتا اس کے مطابق۔ پھر کیا کیا جائے؟ وہ کہتے ہیں فقہ حنفی لے آیئے۔ حنفی فقہ لائے ہیں تو وہ سارے ان کے پیچھے کھڑے ہیں کہ ہم تو اس کے خلاف بغاوت کردیں گے' تم لاؤ تو سہی اس طرح سے۔

ہمارے ان ناگفتہ حالات کو سدھارنے کا کوئی طریق بھی ہے؟

کیا کوئی طریقہ بھی ہے اس کے لیے؟ طریقہ وہی ہوگا اگر کسی مملکت نے فی الواقعہ اپنے آپ کو اسلامی بنانا ہو اور یہ کرنا ہو کہ مسلمانوں کے اندر اسلام کے مطابق ایک نظام اور ضابطہ رائج ہوجائے اس کی شکل یہی ہوگی کہ وہ خود کسی فرقے سے متعلق نہ ہو قرآن کو

بنیاد قرار دے کے اس زمانے کی ضرورتوں کے مطابق' خود قوانین وضع کرے جو اس کی چار دیواری کے اندر رہیں' اس سے نہ ٹکرائیں۔ اور ان کا اطلاق ساری قوم کے اوپر یکساں طور کے اوپر کریں۔ یہ ہے طریقہ جس میں ہمت ہو یہ کرے اگر ایسی چیز نہیں ہے تو سب دھوکہ ہے' سب منافقت ہے۔ یعنی جو بن نہیں سکتا خود کہتے ہیں' اس کا مطالبہ کرتے ہیں کہ یوں بناؤ۔ آپ دیکھ لیجیے گا فرقہ جب موجود رہے فَرَّقُوْا دِیْنَہُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْہُمْ فِیْ شَیْءٍ (6:159) مشرکین قرآن نے قرار دیا ان کو' کہہ دیا رسول سے کہ تمہارے ساتھ واسطہ نہیں' نہ کتاب سے واسطہ نہ سنت سے تعلق۔ اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا وہ بھی سن لیں۔ وَ لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا (3:105) دیکھنا مسلمانو! تم کہیں ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے فرقے پیدا کر لیے۔

باہمی اختلاف تو تب پیدا ہوتا جب کسی بات میں الجھاؤ ہو

میں نے کہا ہے جہاں بھی قرآن نے یہ کہا ہے تفرقوا' ہمیں چھوڑا نہیں ہے ایسے کہ جو جی میں آئے معنی اس کے پہنا دو' فوراً ساتھ دوسرا لفظ لے آتا ہے۔ وَ اخْتَلَفُوْا (3:105) یعنی اختلاف نہ پیدا کر لینا۔ مِنْ م بَعْدِ مَا جَآءَ ھُمُ الْبَیِّنٰتُ (3:105) اس قدر کھلی ہوئی تعلیم آ جانے کے بعد اختلاف نہ پیدا کر لینا' تفرقہ نہ پیدا کرنا' فرقے نہ بنا لینا۔ ایسا کیا تو کیا ہوگا؟ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (3:105) ایسا کرلو بڑی ہی سخت قسم کی تباہی آئے گی تمہارے اوپر۔ اس تباہی کی تفاصیل قرآن نے شرح وبسط سے اپنے ہاں بیان کی ہیں۔ لیکن اس وقت تو میرے سامنے ایک لفظ آیا ہے اسی کو لاؤں عذابِ عظیم۔ اسْوَدَّتْ وُجُوْھُھُمْ (3:106) چہروں پہ کالک مل جائے گی' روسیاہ ہو جاؤ گے دنیا میں۔ عذابِ عظیم اسْوَدَّتْ وُجُوْھُھُمْ (3:106) روسیاہی ملے گی۔ ان سے کہا جائے گا فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْھُھُمْ (3:106) جن کے چہروں پہ سیاہی مل جائے گی جنہیں روسیاہی نصیب ہوگی۔ کہا کیسے آ گئی؟ اَکَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ (3:106) وہ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے تھے کم بختو! اور کاہے کے لیے آتی۔ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ (3:106) چکھو مزا اس عذاب کا۔ بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ (3:106) جس پہ ایمان کا دعویٰ کرتے تھے اور عملاً کفر اختیار کیا ہوا تھا کم بختو تم نے۔ روسیاہی ہوگی۔ لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ (6:159) اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اِنَّمَآ اَمْرُھُمْ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ یُنَبِّئُھُمْ بِمَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ (6:159) ان کے معاملے تک ان کا فیصلہ آخری جو ہے خدا کے قانون کے مطابق ہوگا وہ پھر واضح کر کے بتا دے گا کہ تم کرتے کیا تھے' تمہارے کرتوت کیا تھے۔ کہا یہ ہے کیفیت عزیزانِ من!۔ اب اس کے بعد بھی پوچھنے کی ضرورت باقی رہ گئی' کسی کمیشن بٹھانے کی ضرورت رہ گئی کہ ہمارے ساتھ یہ کیوں ہوا۔

منافقت کرنے والوں کا عمل اور پھر اس کا نتیجہ

اس سے انکار کرو ٹھیک ہے کہو کہ ہم نہیں مانتے اس قسم کی راہنمائی کے اصولوں کو' سیکولر طور کے اوپر جس طرح سے ہماری مصلحت کا تقاضا ہوگا جس طرح سے ہماری عقل وبینش چاہے گی' ہم اس کے مطابق یہ کچھ کریں گے۔ چلئے بر سبیل تنزل سہی' وحی کی روشنی میں تو بات ہی کچھ اور ہوتی' لیکن بہرحال قرآن کہتا ہے کہ ایمان تو پوچھو نہیں کیا نتائج رکھتا ہے' کفر بھی اپنے نتیجے رکھتا ہے اگر اس میں منافقت نہ ملی ہوئی ہو تو۔ شعلۂ مستعجل ہی سہی کچھ وقت کے لیے سہی' نتیجے رکھتا ہے وہ۔ لیکن یہ جو آپ کے ہاں کی روش ہے کہ زبان سے آپ ان چیزوں کو مانتے چلے جا رہے ہیں عملاً اس کے خلاف کرتے چلے جا رہے ہیں' اسے منافقت کہتے ہیں۔ اور یہ تو جہنم کے پست ترین درجے میں قرآن کہتا ہے یہ ہوتے ہیں۔ یہ ہے جس مقام پہ ہم ہیں۔ کوئی چیز جو یہاں اٹھی مملکت کے تقاضے کے مطابق امت کی مصلحت کے مطابق کوئی بات کی بجائے اس کے اوپر عقل وفکر کی رو سے غور کرتے آواز اٹھ گئی جناب! شریعت کی رو سے ناجائز ہے یہ۔ بھئی اگر کہتے کہ قرآن کی رو سے ایسا ہے تو صحیح ہے تو متعین بات تھی۔ شریعت کی رو سے ناجائز ہے' او بھئی کہاں ہے وہ شریعت؟ ہر ایک کی شریعت اپنی اپنی۔

فیملی پلاننگ کے سلسلہ میں شریعت کے نام پر مبہم اور متضاد کیفیت کا اظہار

انہوں نے کہا فیملی پلاننگ چاہیے ملک کی پاپولیشن بڑھ رہی ہے۔ اُس مسئلے پہ گفتگو نہیں میں کر رہا' شریعت بتا رہا ہوں۔ اس قدر قیامت یہاں برپا کی گئی کہ یہ خلافِ شریعت ہے خلافِ شریعت ہے۔ دو ہفتے ہوئے ہیں یہاں ساری دنیا کے مسلمان ممالک کی ایک کانفرنس ہوئی ہے اس میں سارے علمائے کرام اکٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے یہ قرارداد پاس کی ہے کہ فیملی پلاننگ بالکل شریعت کے مطابق ہے۔ متعین تو خدا کی کتاب ہے۔ یہاں یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ میں سے خدا کی کتاب کا وہ حوالہ دے اور اس کو جائز قرار دے' دوسرا ناجائز قرار دے۔ شریعت کی تو Definition ہی کوئی نہیں ہے ہر ایک کی اپنی اپنی شریعت ہے۔ کوئی فرقہ ایسا نہیں جسے دوسرے فرقے نے کافر قرار نہ دیدیا ہو' کوئی نہیں ہے اس وقت۔

امت واحدہ کے تصور کی خاطر غیر مبہم اور واضح تر انداز میں قرآن حکیم کو بنیاد بنانا ہوگا

اب پوچھئے تو سہی کہ شریعتِ حقہ یا اسلامی شریعت ہے کہاں ان کے ہاں۔ بہرحال کسی مملکت نے بھی یہ چاہنا ہے کہ وہ اسلام کے مطابق ایک امتِ واحدہ قائم کر کے اسلامی نظام قائم کرے۔ اگر اس میں یہ جرأت ہے' ایمان ہے اس کا تو اس کا ایک ہی طریقہ ہوگا خود کسی فرقے سے وہ منسوب نہ ہو' قرآنِ کریم کو وہ بنیاد قرار دے اپنے قوانین کی۔ اپنے زمانے کے تقاضوں اور مصلحتوں کے مطابق بیٹھ کے باہمی مشاورت سے اس کے اصولوں کی روشنی میں' اس کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے یہاں وہ جو قوانین وضع کرے' اسے آپ

اسلامی شریعت کہیں گے۔ یہ بدلتی رہے گی حالات کے تابع' یہ اصول محکم رہیں گے قرآنِ کریم کے' یہ ہے مبارک کتاب جسے کہا ہے۔ یہ تو ایک طریقہ ہے۔ یہ نہ کریں گے' نہ کریں' زمانہ خود آ رہا ہے اس کی طرف' وہ اس کی چیزوں کو ایک ایک کر کے لے رہا ہے۔ یہ لیتے ہوئے انسانی تجربے کی بناء کے اوپر آگے بڑھتا جائے گا یہ کارواں' ایک ایک لیتا ہوا کسی ایک دن وہاں جا پہنچے گا کہ جہاں ان چیزوں کو وہ لے گا۔ یہی طریقہ ہے جس میں یہ فرقوں سے اونچا ہو جائے گا۔ اور کوئی طریقہ عزیزانِ من! نہیں ہے۔ وہ ساری چیزیں آپ کو صحیح راستے سے بھٹکانے کی ہیں کہ کوئی آنے والا آئے گا اور وہ آ کے یہ کر کے دے جائے گا۔ پھر وہ شخصیت پرستی ہے۔

قرآن حکیم اور ختم نبوت کے بعد کسی آنے والے کا تصور ختم نبوت کی مہر کو توڑنے کے مترادف ہے

قرآن کی خاتمیت کے بعد کوئی آنے والا نہیں آئے گا۔ قرآن ہوگا اور ملت وہ ہوگی جو قرآن کو اپنا مرکز بنائے گی اس کے تابع خود بیٹھ کے باہمی مشاورت سے' وہ یہ چیزیں طے کریں گے۔ اب کوئی آنے والا نہیں آئے گا۔ آنے والا تو پھر ایک نیا فرقہ بنا کے چلا جاتا ہے' جسے قرآن نے شرک قرار دیا ہے۔ یہ ہے طریقہ جو قرآن نے ہمیں بتایا ہے۔ سورۃ الانعام کی آیت 160 تک ہم آ گئے 161 سے آئندہ ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

چوبیسواں باب: **سورۃ الانعام** (آیات 160 تا آخر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مامور من اللہ کی حقیقت نیز فرقہ واریت کے وجود کی بنیادی وجہ اور اس کا علاج

عزیزانِ من! آج فروری 1972ء کی 6 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانعام کی آیت 161 سے ہو رہا ہے (6:161)۔

فرقے کی بنیاد ہمیشہ شخصیت پرستی پر استوار ہوتی ہے

آپ کو یاد ہوگا میں نے عرض کیا تھا کہ سورۃ الانعام کی ان آخری آیات میں قرآنِ کریم نے اپنی بنیادی تعلیم کو چند ایک مختصر سی آیات میں سمٹا کر رکھ دیا ہے اور بڑا ارتکاز ہے ان آیات کے اندر۔ آخری درس میں جو آیت سامنے آئی تھی اس میں کہا یہ گیا تھا کہ اے رسول! جو لوگ دین میں فرقہ پیدا کرلیں ان کے ساتھ تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ دوسرے مقام پہ قرآنِ کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا تھا۔ اور میں نے انہی آیات کی تشریح کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا کہ امت میں اگر فرقوں کا وجود ہے اس میں اسلام نہیں آسکتا اسلام صرف امتِ واحدہ کے اندر رہ سکتا ہے۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہفتہ بھر میں مختلف احباب نے اس میں بڑی دلچسپی لی اور مختلف قسم کے استفسارات وہ کرتے رہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آگے بڑھنے سے پیشتر تھوڑے سے وقت میں ان باتوں کو دہرا دوں جو مزید پوچھی گئیں۔ اس لیے بھی کہ جیسا میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں شاید درس کا یہ سلسلہ پھر شروع نہ ہو سکے تو یہ آیات تو پھر

سامنے نہیں آئیں گی۔اور ویسے بھی میرا یہ درس ان ٹیپس کے ذریعے سے محفوظ رہ رہا ہے معلوم نہیں کہ ان کے بعد کب تک یہ محفوظ رہے گا اور آنے والے بھی ان سے استفادہ کر سکیں گے۔اس لیے بھی میں چاہتا ہوں کہ جو بات کہنے کی ہے جس مقام پہ وہ آ جائے اسے شرح وبسط سے بیان کر دیا جائے۔فرقے کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ فرقے کی بنیاد شخصیت پرستی پر ہوتی ہے اسے یاد رکھیے۔دین میں سند اور حجت خدا کی کتاب ہے کسی شخص کا قول نہیں۔اسے قرآنِ کریم نے خدا کی کتاب کا حجت اور سند ہونا اور بشریت خواہ وہ رسول کی بشریت کیوں نہ ہو قرآن نے اسے نکھار کر بیان کر دیا۔وہ آیت جو بار بار سامنے آیا کرتی ہے اور آنی چاہیے سورۃ آل عمران کی 79 (3:79) اس میں یہی حقیقت ہے جس میں خدا کی کتاب اور بشریت کو الگ الگ کیا گیا ہے تا کہ شخصیت پرستی نہ آنے پائے۔مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْکِتٰبَ وَ الْحُکْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ وَ بِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (3:79)

کسی بشر کے لیے یہ جائز نہیں خواہ اسے خدا کتاب اور حکومت اور نبوت ہی کیوں نہ دے کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے بندے بن جاؤ۔یہ جائز نہیں اس کے اوپر کہ وہ اپنی بات کسی سے منوائے' من دون الله خدا کی منوائے گا۔اور آگے یہ کہہ دیا کہ وہ کہے گا اگر یہ سچا ہے حق پر ہے تو تم اس کتاب کے ذریعے سے جس کی تعلیم و تدریس تمہارے ہاں جاری ہے' تم اللہ والے بن جاؤ۔مَا کَانَ لِبَشَرٍ (3:79) کسی بھی انسان کے لیے یہ جائز نہیں ہے۔

قرآن حکیم نے نبی اکرم ﷺ کی دو حیثیتوں کو الگ الگ بیان کیا ہے حضرت زید کا واقعہ قابل غور ہے

اب یہ جو بَشَرٍ کہا ہے تو سب سے پہلے خود نبی اکرم ﷺ نے ان اپنی دو حیثیتوں کو الگ کر کے دکھا دیا۔قرآن نے جو کہا بار بار کہ ان سے کہہ دو کہ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ (18:110) آپ دیکھئے دونوں حیثیتیں الگ الگ ہو گئیں۔بشر ہوں تمہارے جیسا' ایک ہی امتیازی خصوصیت ہے کہ وحی ہوتی ہے مجھ پر۔وہ وحی جب میں تمہیں دیدیتا ہوں اور وہ کتاب اللہ میں محفوظ ہو جاتی ہے تو اس کے بعد میری حیثیت بھی بشر کی رہ جاتی ہے۔اب جو باتیں میں وحی کی تم سے کہوں گا یعنی جو وحی تمہیں میں دوں گا وہ تو ایسی چیز ہے جس کی اطاعت کی جائے' جو سند اور حجت مانی جائے۔لیکن جو باتیں میں بشر کی حیثیت سے تم سے کروں گا ان کی حیثیت یہ نہیں ہے۔اب دیکھئے خود رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہی شخصیت پرستی کو کس طرح سے کاٹ کے رکھ دیا۔یاد رکھئے! قرآن کی تعلیم کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ وہ انسان کو صحیح آزادی عطا کرنے کے لیے آیا ہے۔حضور ﷺ کی شخصی حیثیت' بشری حیثیت اور رسالت کہ جو خدا کی طرف سے وحی آتی تھی اس کو الگ کر کے رکھ دیا۔اور پھر اس کی مثال بھی قرآن نے اپنے اندر خود دی کہ باہر تاریخ کی طرف ہمیں نہ جانا پڑے اس کی مثالیں لینے کے لیے۔سورۃ احزاب میں حضرتِ زید کا واقعہ قرآن نے خود اپنے دامن میں محفوظ رکھ لیا اور وہ اسی لیے رکھ لیا کہ دو حیثیتیں رسول اللہ ﷺ کی

نکھر کر سامنے آجائیں۔

آپ ﷺ ان سے کہتے ہیں اَمۡسِکۡ عَلَیۡکَ زَوۡجَکَ (33:37) اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ سیدھی سی بات ہے کہ یہ چیز رسول کی ہے تو اس کی اطاعت اور اطاعت بھی ایک ایسا جلیل القدر صحابیؓ حضور ﷺ کے صحابہؓ میں سے' انہیں حضور ﷺ حکم دے رہے ہیں اَمۡسِکۡ عَلَیۡکَ زَوۡجَکَ (33:37)۔ تو مجال ہو سکتی ہے کسی صحابہؓ کی کہ وہ انکار کرے' معصیت کرے' خلاف کرے' اس کو نہ مانے سرکشی برتے نافرماں برداری کرے' تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ آیت کی ابتدا ہوتی ہے اس سے کہ یہ وہ شخص ہے جس پہ خدا نے بھی انعامات کیے اس کے رسول ﷺ نے بھی انعام کیے یعنی اتنی بڑی شخصیت ہے وہ۔ اس سے کہا جاتا ہے حکم کے طور پر اَمۡسِکۡ عَلَیۡکَ زَوۡجَکَ (33:37) بیوی کو طلاق نہ دو۔ اور پھر آگے بھی ہمیں تاریخ میں نہیں جانا پڑتا قرآن میں ہی کہہ دیا کہ اس کے باوجود انہوںؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی۔ اور اس کے بعد نہ صرف یہ کہ انہیں معصیتِ رسول ﷺ کے جرم میں ماخوذ نہیں کیا گیا' وہی تعلقات رسول ﷺ کے ساتھ ان کے باقی رہے۔ اسی قسم کے وہ صحابیؓ رہے' اسی قسم کے انعام یافتہ رہے' خدا کی نعمتیں ان کے اوپر اسی طرح سے ہوتی رہیں۔ تو گویا یہ کوئی جرم نہیں ہوا۔ حالانکہ معصیتِ رسول ﷺ ایسی چیز ہے جس کے بعد کوئی انسان مسلمان ہی نہیں رہ سکتا۔ فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ (4:65) قرآن کی آیت موجود ہے کہ تیرا رب اس کی شہادت دیتا ہے کہ کبھی یہ شخص ایمان والے نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ اپنے ہر معاملے کے اندر تمہیں حکم نہ تسلیم کریں اور تمہارے فیصلے کے بعد اپنے دل میں بھی کوئی گرانی نہ محسوس کریں۔ ایک طرف یہ کیفیت ہے دوسری طرف یہ کہ وہ حکم دیتے ہیں اُسے کہ اَمۡسِکۡ عَلَیۡکَ زَوۡجَکَ (33:37) اور وہ اس حکم کے علی الرغم' اسے نہیں مانتے اور بیوی کو طلاق دیدیتے ہیں اور اس کے بعد کچھ بھی ان سے مواخذہ نہیں ہو رہا۔

نبی اکرم ﷺ نے کسی انسان کی شخصی آزادی کو سلب نہیں کیا

یہ کیا چیز تھی؟ بڑی عظیم حقیقت ہے۔ اور قرآن ان واقعات کو یونہی شاعری کی حیثیت سے تو بیان نہیں کر جاتا۔ وہی چیز جو سورۃ آل عمران میں کہی کہ کسی بشر کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے اپنے حکم منواتا پھرے۔ مشورے دے گا وہ' نصیحتیں کرے گا کسی کی شخصی آزادی کو سلب نہیں کرے گا وہ۔ لیکن جہاں وحی کی بات آئے گی وہاں خود رسول ﷺ بھی اسے اسی طرح سے مانے گا' ہر وہ شخص جو وحی پہ ایمان رکھتا ہے اس پر بھی اس کا ماننا فرض ہو جائے گا۔ یہ دو حیثیتیں نمایاں طور پہ بتا دیں۔ بشری حیثیت رسول اللہ ﷺ کی بھی قرآن نے یہ بتادی کہ اس کی اطاعت نہیں ہے اطاعت صرف خدا کے احکام کی ہے اس کی وحی کی ہے یعنی سند اور حجت یہ ہے۔

قیامت تک سند اور حجت صرف خدا کی کتاب ہوگی اور کسی دوسرے کا سمجھا ہوا قرآن کسی کے لیے حجت نہیں ہو سکے گا

جب نبوت کو ختم کر دیا' کتاب کو مکمل کر دیا تو اب نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد وحی کا سلسلہ تو ہو گیا ختم۔ کیا بشر کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ سند اور حجت قرار پائے اس کا قول۔ تو اب اس کے بعد قیامت تک کے لیے دین میں سند اور حجت اور واجب الاطاعت صرف خدا کی کتاب رہ گئی۔ یہ ہے عزیزانِ من! بنیاد۔ جب سند اور حجت خدا کی کتاب ہوگی شخصیت پرستی اس میں آئے گی نہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ دوسرے لوگ بھی اصل میں قرآن ہی کی تعلیم دیتے ہیں قرآن ہی کو سمجھاتے ہیں اپنی بات تو نہیں منواتے۔ ٹھیک ہے تعلیم و تدریسِ قرآن ضروری ہے وہ سمجھائیں لیکن یہ مجھ پہ کیا فریضہ ہے کہ جو کچھ وہ سمجھے ہوئے ہیں' مجھ پر بھی وہی فریضہ عائد ہو جائے کہ ویسا ہی میں سمجھوں۔ اور اگر اسے نہ سمجھوں تو کہا جائے کہ یہ خدا کی وحی کا انکار ہے' معصیت ہے۔ میں آپ کو قرآن سمجھا رہا ہوں' یہاں درس دے رہا ہوں' تعلیم ہو رہی ہے۔ ٹھیک ہے صرف سمجھا رہا ہوں آپ کا یہ اپنا کام ہے کہ اس پہ غور کریں' فکر کریں' سوچیں۔ صحیح بات نظر آئے اس کو مان لیں نہ صحیح بات نظر آئے کہیں کہ نہیں ہم اس سے متفق نہیں ہیں' ہم اس کو یوں سمجھتے ہیں۔ ٹھیک ہے آپ کو آزادی حاصل ہے۔ اب یہ رہا کہ امت کی وحدت کیسے قائم رہے گی؟ قرآن تو سمجھنے اور فکر کرنے کی اجازت ہے ہر ایک کو' یہ آزادی تو سلب نہیں کی جا سکتی کوئی شخص سند اور حجت نہیں ہو سکتا۔

امت میں وحدت پیدا کرنے کے لیے نظام مملکت کا ہونا صرف ضروری ہی نہیں بلکہ لازم ہے

امت میں وحدت کیسے قائم رہے گی؟ اس کے لیے نظام ہے امت کا' ایک نظام مملکت کا۔ وہ جو نظام ہے امت کا سربراہِ مملکت مشاورت سے قرآنِ کریم کے ان احکام کو جس انداز سے وہ رائج کرنا چاہتا ہے' وہ اس کے متعلق جو فیصلہ کریں گے' وہ نافذ کریں گے۔ اس فیصلے کی اطاعت یعنی قرآن کی اطاعت اس نظامِ مملکت کی وساطت سے ہر مسلمان کے اوپر اس کا ماننا مملکت کے قانون کی حیثیت سے ماننا' فرض ہو جائے گا۔ جو اس کے خلاف کرے گا' جرم ہوگا اور جو اس کے خلاف بغاوت کرے گا' وہ جسے ارتداد کہا جاتا ہے وہ باغی قرار پائے گا مملکت کا۔ اس میں فرقے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ ایک مملکت ایک نظام ایک ضابطۂ قانون جسے قرآن کہتے ہیں اس کو عملاً منوانے کے لیے یہ نظام اپنے ہاں طے کرے گا اس کی شکل کیا ہوگی۔ اسے خود رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا۔

نبی اکرم ﷺ کی یہ سنت سب سے بڑی سنت ہے کہ زندگی کے معاملات قرآن حکیم کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے کئے جائیں

اس لیے کہ حضور ﷺ کو خدا کا حکم دیا گیا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (3:159) ان معاملات میں ان کے ساتھ مشورہ کرو۔ ظاہر ہے کہ رسول کی حیثیت جو ایک رسول کی تھی جس میں وحی ملتی تھی وحی میں تو مشورے کا سوال ہی نہیں ہے۔ وحی میں رسول کے اپنے ذاتی خیالات کا سوال نہیں چہ جائیکہ دوسرے لوگوں کے مشورے سے کوئی بات کرے گا۔ لیکن مشورے کا حکم دیا گیا' یہ کیا بات تھی؟ قرآن کے احکام کو نافذ کیسے کرنا چاہیے' ان کی تعمیل کس طرح سے کرائی جائے؟ خدا کے احکام کی تعمیل باہمی مشورے سے طے کرو۔ اور جب یہ چیز طے ہو جائے تو پھر قانون کی حیثیت سے' اس بات کو نافذ کردو۔ اب یہ جو حکم نافذ ہوا ہے اس کی اطاعت اگر نہیں کی جائے گی تو یہ معصیت کہلائے گی' یہ جرم کہلائے گی۔ وحدت قائم رہے گی امت کی' اس میں شخصیت پرستی نہیں آتی۔ تو نظام کے ارباب نظم ونسق' وہ بدلتے رہیں گے' دوسرے آتے رہیں گے۔ قرآن اپنے مقام پہ رہے گا یاد رکھئے۔ جب تک یہ پوزیشن رہے گی' امت میں کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوگا نہ ہوا تھا جب تک یہ پوزیشن رہی تھی۔ شخصیت پرستی کا سوال ہی نہیں تھا اس وقت۔ قرآن نے اس واقعہ کو اپنے دفتین میں محفوظ رکھ لیا کہ رسول کہہ رہے ہیں کہ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ (33:37) اور اس کے باوجود وہ اسکو نہیں مانتے' طلاق دیدیتے ہیں بیوی کو اور اس پہ کوئی مواخذہ نہیں ہوتا۔

قرآن حکیم کے خلاف کہی ہوئی بات پر اعتراض کرنے کا حق

اب یہ جو آگے نظام آپ کا بنتا ہے اس نظام میں بھی یہ کیفیت ہے کہ جب مشورے کی بات ہوئی تو ہر ایک کو اس کا حق حاصل ہے کہ بات کو پوچھے' تنقید کرے' کوئی بات اگر نظر آتی ہے کہ وہ قرآن کے خلاف ہے۔ کسی کے بھی یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ یہ قرآن کے مطابق نہیں' اُسے حق حاصل ہے کہ اس پہ تنقید کرے' سوال کرے' اعتراض کرے' اٹھ کے پوچھے۔ چنانچہ خلفائے راشدینؓ کے زمانے کی تاریخ میں یہ واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ کسی بڑے آدمی کا اعتراض کرنا تو ایک طرف رہا یعنی حضرتِ عمرؓ جیسی شخصیت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ لوگوں نے بڑے بڑے مہر باندھنے شروع کردیے ہیں' یہ نہیں ہونا چاہیے اس کی حد بندی ہونی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی چیز قباحت کی نہیں ہے کیا جاسکتا ہے حکم جو نہیں قرآن نے دیا۔ یہ کہا ہے کہ یہ ہونا چاہیے کتنا ہونا چاہیے زمانے کے تقاضے کے مطابق مرکزِ ملت اسلامیہ اسکی حد بندی کرسکتا ہے۔ یہ ایک عجیب مسئلہ ہے کہ جسے اباحت کہتے ہیں یعنی جو چیزیں جائز قرار دی گئی ہیں کہ کی جاسکتی ہیں ان کو کچھ شرائط سے مشروط کردینا حدود کے اندر ان کو رکھ لینا' اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن آپ دیکھئے کہ تاریخ میں یہ ہے کہ ایک

بڑھیا اٹھ کے یہ کہتی ہے کہ عمرؓ! جب خدا نے ہم سے یہ کہا ہے کہ خواہ تم سونے کا ڈھیر بھی کیوں نہ مہر میں دیدو واپس نہیں لے سکتے تو اس پہ تو حد بندی نہیں ہے تو یہ حد بندی آپؓ نہیں کر سکتے قرآن کے خلاف جائے گی۔ میں نے عرض کیا کہ یہ یوں کی جا سکتی ہے۔لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حضرتِ عمرؓ نے محض یہ تعلم دینے کے لیے کہ واقعی اگر قرآن کے متعلق کسی کے ذہن میں یہ بات آئے کہ اس کے خلاف ایک حکم جاتا ہے تو اس کو حق حاصل ہے کہ اس کے اوپر تنقید کرے۔انہوںؓ نے تسلیم کر لی یہ بات۔سند اور حجت قرآن ہے کوئی شخص نہیں۔ یہ تھا وہ نظام جس کے تابع امت میں فرقہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

امام ابوحنیفہؒ کا ایک سنہری قول کہ دین قرآن حکیم اور عقل انسانی کا نام ہے

یہ وہ دور تھا جس میں امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق دین قرآن اور عقلِ انسانی کا نام تھا۔ بڑی صحیح بات تھی۔نظامِ مملکت اور اس کے فیصلے قرآن کی سند، فکرِ انسانی، عقلِ انسانی حالات کے تقاضے اسکے مطابق۔شخصیت پھر اس میں نہیں آتی۔ نبی اکرمﷺ کی بھی شخصیت رسالت کی شخصیت وحی کے تابع قرآن کے اندر آ گئی۔ بشریت کی جو حیثیت تھی وہ آنے والوں کے لیے سند اور حجت نہیں تھی۔ یہ اس دور کے اندر نظام تھا۔ یہ عقیدہ جو تھا کہ رسول اللہﷺ کی یہ دو حیثیتیں تھیں، قرآن نے جسے نہایت عمدگی سے واضح کیا اور جس کی موجودگی میں شخصیت پرستی کا تصور بھی نہیں آیا۔

نبی اکرمﷺ کا ہر قول وحی ہے، امام شافعی کا فرمان نیز یہ کہ وحی کی دو قسمیں ہیں

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس کے خلاف جو چیز ہوئی وہ امام شافعیؒ نے سب سے پہلے یہ عقیدہ وضع کیا کہ نہیں! رسول کا ہر قول وحی ہے۔وہ دو حیثیتیں جو قرآن نے متمیز کر کے بتائی تھیں، انہوں نے کہا کہ نہیں! یہ دو حیثیتیں نہیں ہیں۔اب جو انہوں نے کہا کہ رسولﷺ کا ہر قول وحی ہے۔ بھئی! قرآن میں تو نہیں ہے۔کہا وحی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ وحی ہے جو قرآن کے اندر آ گئی ہے اور ایک دوسری وحی ہے جو قرآن کے باہر ہے۔یہ پہلا دن تھا جب اس شخصیت پرستی کا بیج بویا گیا جسے قرآن نے اس طرح سے ختم کیا تھا کہ خود حضورﷺ کی دو حیثیتیں جو تھیں ان کو الگ الگ کر کے دکھا دیا تھا۔اب جب یہ عقیدہ آیا تو اس کے بعد رسول اللہﷺ کا جب کہا گیا کہ ہر قول وحی ہے تو اب اقوالِ رسول اللہﷺ کی ضرورت پڑی کہ جنہیں نہ رسول اللہﷺ نے کہیں مرتب کر کے دیا تھا امت کو نہ صحابۂ کبارؓ نے ان کو مرتب کیا تھا۔اسی سے نظر آتا ہے کہ وہ اس چیز کو دین میں ابدی حجت اور سند اور دلیل تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ورنہ رسول اللہﷺ کا فریضہ تھا کہ جیسے قرآن انہوں نے اتنی حفاظت سے امت کو دیا ہے اگر یہ دوسرا حصہ بھی وحی تھا اور قیامت تک کے لیے حجت بننا تھا دین میں، یہ رسالت کا فریضہ تھا کہ اس کو محفوظ کر کے امت کو دے کے جاتے۔انہوں نے تو اس لیے نہیں دیا تھا کہ یہ دین میں حجت تھی نہیں، بشریت

کی حیثیت تھی۔

اقوال رسول جمع کرنے کا عمل اوران کی نوعیت

جب اسے دین میں حجت قرار دیا گیا تو اب اس چیز کی جسے کہتے ہیں ضرورت پڑی کہ وہ اقوالِ رسول اللہ ﷺ ارشاداتِ رسول اللہ ﷺ کو کہیں جمع کیجیے۔ اور وہ تو کہیں مدون حیثیت میں تھے نہیں۔ آپ دیکھئے کس طرح سے فرقوں کی ابتداء ہوتی ہے۔ اب ان اقوال کو پہلے تلاش کرنا شروع کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد کوئی Written Material نہیں ہے پہلے کوئی تحریری مواد نہیں ہے۔ اب وہ اقوال جمع کرنے شروع کیے جن کی حیثیت یہ بتائی گئی کہ وہ وحی ہیں۔ سوچئے حیثیت کیا ہے ان کی۔ یعنی تاریخ نہیں ہے تاریخ کی حیثیت ہوتی تو کوئی بات نہیں ہے، تاریخیں مرتب ہوتی رہتی ہیں، جمع کرتے رہیے بہت اچھا تھا، تاریخی حیثیت ان کی ہوتی۔ حیثیت ہے دین کی جسے رسول اللہ ﷺ نے خود نہیں دیا صحابۂ کبارؓ نے جمع کر کے نہیں دیا دوسو سال تک جمع نہیں کیا۔ اب وہ جمع ہونی شروع ہوئیں۔ اب یہاں سے اختلاف شروع ہوا۔ پہلا اختلاف سب سے بڑے جامع جو تھے حدیث کے امام بخاری وہ کہتے ہیں کہ مجھے چھ لاکھ حدیثیں ملیں ان میں سے میں نے چھ ہزار کو صرف رکھا ہے باقی مسترد کر دیں۔ کیا حق حاصل تھا آپ کو۔ اپنی بصیرت سے انہوں نے یہ کیا، اپنی فراست سے کیا اور وہ ایک شخص کی فراست ہے۔ ایک شخص کی فراست 594000 کو اس طرح مسترد کر دیتی ہے اور جو وہ چھ ہزار کو اپنے ہاں رکھتی ہے اس کے متعلق یہ عقیدہ دیدیا جاتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک حدیث کا انکار بھی کفر ہے۔

امام بخاری کے بعد امام مسلم کا جمع شدہ مجموعہ اوران صحاح ستہ کے علاوہ شیعہ حضرات کی الگ جلدیں

اب ایک ان کا مجموعہ ہوا پھر ایک دوسرا مجموعہ مسلم کا ہوا پھر تیسرا ہوا پھر چوتھا ہوا پانچواں ہوا چھٹا ہوا۔ چھ تو سنیوں نے اپنے ہاں مانے چار اسی قسم کے شیعہ حضرات نے اپنے ہاں مانے۔ اور چھ تو یہ صحاح ستہ ہیں اس کے علاوہ اور ہیں کئی، کئی کتابیں ہیں مختلف۔ اب یہ سوچئے کہ عقیدہ ہو یہ کہ ان میں سے ہر قول دین میں حجت ہے وحیِ خداوندی ہے ان کی پوزیشن یہ ہو کہ ایک سے دوسرا مجموعہ نہیں ملتا ایک ہی مجموعے میں اختلافی حدیثیں موجود ہیں۔ اختلاف تو ہو گیا شروع، بیج بو یا گیا فرقے کا۔ اب انہیں میں سے جنہوں نے یہ چھ میں سے بھی پہلی دو کو صحیحین کو مانا وہ ایک الگ فرقہ۔ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک آپ نے دیکھا کہ قرآن اور عقلِ انسانی اور اس کا فیصلہ امت کے مرکز کے ذریعے، مملکت کے ذریعے۔ بالکل صحیح دین کا یہ تقاضا ہے۔ اب یہاں سے یہ تصور ختم ہوا۔ لیکن جب یہ تصور عام کیا گیا کہ سند اور حجت جو ہے خدا کی کتاب کے ساتھ مثلہ معہ اس کی مثل اسکے ساتھ یہ مجموعے۔ اب ان میں سے کسی نے کسی کو مانا کسی نے کسی دوسرے کو مانا۔

امام ابوحنیفہؒ کا ایک سنہری قول اور ایک اہم واقعہ

جنہیں ہم اب حنفی کہتے ہیں امام ابوحنیفہؒ نے تو کوئی اپنا فقہ کا مجموعہ بھی نہیں دیا۔ اور وہ اس لیے نہیں دیا کہ انہوں نے خود کہا کہ یہ ایک انسان کے خیالات ہیں آج کے حالات کے تابع' میں یہ فیصلہ دیتا ہوں کل حالات بدل جاتے ہیں' میری اپنی رائے بدل جاتی ہے۔ تو میری رائے کو کیا حق حاصل ہے کہ قیامت تک کے لیے تم سند بنالو۔ ان کا ایک عمدہ شاگرد کئی برس تک پاس رہا اس کے بعد اس نے کہا کہ میں نے بہت کچھ حاصل کرلیا ہے۔ جانے لگا تو سلام کرنے کے لیے آیا تو آپؒ نے دیکھا کہ اس کے پاس ایک گٹھری تھی تو آپؒ نے کہا یہ کیا ہے' اس نے کہا کہ آپؒ نے جتنے فیصلے دیے ہیں میں ان کو جمع کرتا رہا اور لکھتا رہا اور میں یہ لے چلا ہوں۔ انہوںؒ نے کہا کا ہے کے لیے لے چلے ہو' کہنے لگا جہاں میں جاؤنگا تو جو معاملات آئیں گے ان کے مطابق میں فیصلہ کرونگا۔ کہنےؒ لگے او تم ان کے مطابق فیصلہ کروگے اور میں کل ہی ان کے خلاف فیصلہ کوئی اور دیدونگا۔ یہ ایک انسان کی رائے ہے حالات کے تابع وہ تھی حالات کے تابع وہ بدل سکتی ہے اور تو اس کو سند اور حجت بنا کے پشتارے کو لیے جارہا ہے۔ پکڑ کے ضائع کر دیا۔ کئی معاملات ایسے ہیں تاریخ کے اندر جس میں انہوںؒ نے ایک فیصلہ دیا اور دوسرے نے کہا کہ یہ تو فلاں حدیث کے خلاف جاتا ہے۔ عجیب شخصیت تھی ان کی تفقہ کے اعتبار سے۔ انہوںؒ نے کہا کہ دین تو قرآن کی سند کے ساتھ باہمی مشورے کا نام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان معاملوں میں مشورہ کیا آپ ﷺ کے گرد جو حضرات موجود تھے انہوںؓ نے یہ مشورہ دیا اس کے ماتحت یہ فیصلہ ہوا اور میں سمجھتا ہوں اگر میں موجود ہوتا اور میں یہ رائے دیتا تو رسول اللہ ﷺ اس کو ضرور قبول کر لیتے۔ اب میرا جو نقص ہے کہ میں اس زمانے میں نہیں ہوا اور بعد میں پیدا ہوا ہوں اب میرا تو یہ جرم نہیں ہے۔ میں جو رائے دے رہا ہوں اس کو پرکھ کے دیکھئے کیسی ہے اس کے مطابق چلئے صاحب۔ بڑی صحیح بات ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی حکومت کی طرف سے ذمہ داری کا تعین اور فرقوں کو ختم کرنے کا طریق

آپ ذاتی طور پہ ان چیزوں کو نہیں نافذ کرتے تھے یہ چیزیں حکومت کی طرف سے قاضی القضاۃ تھے جس کو چیف جسٹس کہتے ہیں نافذ ان کے ذریعے سے ہوتے تھے۔ احتیاط کی صورت یہ تھی کہ ان کی بیٹی نے ایک دن یہ پوچھا کہ ابا جان میں روزے سے ہوں دانت میں پتہ نہیں خلال کرنے لگ گئی تھی خون نکل آیا ہے روزہ رہا ہے یا روزہ ٹوٹ گیا ہے۔ انہوںؒ نے کہا کہ بیٹی! یہ بات جو ہے جماعت سے پوچھو۔ انہوں نے کہا جی! وہ تو آپؒ کے پاس آ کے پوچھا کرتے تھے۔ وہ وہاں کے قاضی تھے معاملے کے۔ تو کہا کہ جی! وہ تو آپؒ سے پوچھا کرتے ہیں۔ وہؒ کہنے لگے ٹھیک ہے مشورہ مجھ سے لیا کرتے ہیں فتویٰ وہ حکومت کا مقرر کردہ قاضی دے سکتا ہے ابوحنیفہؒ نہیں دے سکتا۔ یہ تھا طریقہ فرقے مٹانے کا۔ وہ الگ بات ہے کہ اسے ضرورت ہو تو مجھ سے ہی کیوں نہ آ کے پوچھ لے۔ لیکن جب بات فتویٰ دینے کی آئے گی تو وہ حکومت کا نمائندہ دے گا ابوحنیفہؒ نہیں دے گا۔ یہ تھا وہ نظام۔

امام ابوحنیفہؒ کے بعد شخصیتوں کے زمانہ کا ذکر کفر کے فتویٰ' بغداد کی تباہی کا قصہ اور پھر اجتہاد کا خاتمہ

اس کے بعد جب یہ سلسلہ شروع ہوا اب یہ شخصیتیں آ گئیں: امام بخاری کی شخصیت' امام مسلم کی شخصیت۔ یعنی یہ شخصیتیں اور ان کے مجموعے آئے۔ اس کے بعد یہی امام ابوحنیفہؒ والے یہ آگے بڑھے تو ان کے مقابلے میں ان کے اپنے امام ان کے قول سند اور حجت۔ فقہ حنفی میں کوئی بات ان سے پوچھئے کوئی نہ کوئی جو فقہ کا امام ہے اس کا فتویٰ یہ آپ کو دیدیں گے کہ انہوں نے اس میں یہ فرمایا۔ کچھ عرصے تک تو ان کے ہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا رہا کہ مزید ان کے ہاں فقہ کے امام آتے رہے اور انہوں نے مزید اجتہاد کر کے مزید اور قسم کے فیصلے دیئے' فتوے دیئے' یہ چیز ہوتی رہی۔ اور اس کے بعد ایسا دور آیا بغداد کی تباہی کے بعد کہ اجتہاد کا دروازہ ہی بند ہو گیا' انہوں نے کہا کہ اب اس کے بعد کوئی شخص بھی نہیں سوچ سکتا۔ ان کے ہاں کے جو فیصلے تھے وہ سند اور حجت ہو گئے قیامت تک کے لیے ہر معاملے میں فیصلے کے لیے۔ مزید سوچا ہی نہیں جا سکتا۔

قرآنی آیات کو منسوخ قرار دیا جانے لگا

وہی شخصیت پرستی۔ ان پہ مہریں اس طرح سے لگائی گئیں کہ حدیث کے متعلق تو یہ چیز آ گئی کہ جس کسی نے صحیحین کی کسی ایک حدیث کا انکار کیا وہ کافر ہو گیا۔ پوچھا گیا کہ اگر کوئی حدیث اور قرآن کی آیت جو ہے وہ ٹکرائے آپس میں اس سے متضاد ہو' خلاف جائے اس کے تو پھر کیا کیا جائے۔ کہا کہ قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھا جائے۔ یہ جسے قیامت تک کے لیے محفوظ کیا گیا تھا پڑھتے رہو اسے' وہ منسوخ سمجھی جائے۔ آئمہ فقہ کے متعلق کہا گیا کہ ان کے کئی فیصلے ایسے نظر آتے ہیں جو حدیث کے قرآن کے خلاف جاتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ کوشش یہ کرو کہ قرآن یا حدیث کی تاویل ایسی ہو جائے کہ وہ ان فیصلوں کے مطابق ہو جائے۔ یعنی اسے لاؤ ان کے مطابق کرنے کے لیئے معیار یہ ہیں۔ کہا جی اگر تاویل ممکن نہ ہو؟ تو کہا انہیں منسوخ سمجھو اور عمل اس قول پہ کرو۔

مختلف فقہ کے مختلف آئمہ ترمذی' مالکی' شافعی' حنبلی' اور حنفی وغیرہ

آپ دیکھ رہے ہیں فرقے کی کس طرح سے مہر لگتی ہے کیسے فرقہ بنتا ہے۔ یہ سند آخر ہو گئے یہ اقوال۔ اور ان میں چونکہ یہ مختلف آئمہ تھے حدیث کے' آئمہ مختلف فقہ کے' کسی نے کسی کو مانا کسی نے کسی کو مانا اور یہ فرقہ۔ حدیث میں حنفیوں کے ہاں ترمذی کو قابلِ سند مانا جاتا ہے۔ اہل حدیث کے ہاں صحیحین کو مانا جاتا ہے۔ فقہ حنفی والے بخاری اور مسلم کی کم از کم دوسو احادیث احکام کی ہیں جن کے خلاف چلتے ہیں' نہیں مانتے وہ ترمذی کو مان رہے ہیں۔ فقہ کے اندر یہ مختلف ستون' کوئی مالکی ہیں کوئی شافعی ہیں کوئی حنبلی ہیں کوئی حنفی ہیں۔ اور یہ تو موٹے موٹے ہیں ان کے نیچے اور فروع جو چلتی ہیں۔ کیسے چلتی ہیں؟ کسی نہ کسی انسان کا قول سند' اس کے خلاف لب کشائی

نہیں کی جاسکتی۔ یہاں تک بھی تھا کہ بہرحال ان فرقوں سے متعلق کوئی نہ ہوتو ان کے متعلق کسی حد تک بات تو کرسکتا تھا کہ اس نے یہ غلطی کی ہے اس میں یہ کچھ کیا ہے۔ اگرچہ جب تک اقتدار تھا مذہبی پیشوائیت کا' اتنی سی بات بھی زبان پہ نہیں لائی جاسکتی تھی۔ یعنی ان حضرات کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ میری دانست میں یہ بات جو انہوں نے کہی ہے' وہ قرآن کے مطابق نہیں اس کے خلاف جاتی ہے' نہیں کہی جاسکتی تھی پھانسی کا تختہ تھا۔ لیکن بہرحال اگر کہی بھی گئی تو اتنی سی چیز تھی کہ یہ انسان ہی تھے ان کی اپنی فکر تھی۔

مامور من اللہ کا تصور ختم نبوت کی مہر کو توڑنے کے مترادف ہے

فرقہ پرستی میں اس سے آگے ایک اور قدم اٹھتا ہے جو اس سے بھی آگے جاتا ہے۔ اور وہ پہلا تصور یہ تھا کہ نبوت کا تو خاتمہ ہوگیا ٹھیک ہے۔ لیکن خدا کی طرف سے مامور ضرور آکے رہے گا۔ صرف لفظی فرق ہے۔ یہ نبوت کیا تھی؟ خدا سے ایک علم پا کے بات انسانوں کو کہی جاتی تھی۔ یہ تصور مامور من اللہ کا یہ بعینہٖ یہی تصور ہے کہ وہ اپنی فکر سے اپنی عقل سے کوئی بات نہیں کہتا خدا سے بات ہے اس کی جو وہ آگے پہنچاتا ہے۔ تو اب جتنے پہلے اشخاص تھے یہ ان سے اونچا چلا گیا۔ اشخاص میں تو پھر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے فلاں امام کو ہم نہیں مانتے۔ انہوں نے اپنی فکر سے ایک بات کہی' اجتہاد سے کہی' ہم اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ مامور من اللہ کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ یہ اس کی بات نہیں ہے' یہ خدا کی بات ہے۔ آپ کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ یعنی یہ شدید ترین قسم کی شخصیت پرستی ہے۔

شیعہ حضرات کے سلسلہ امامت اور مامور من اللہ کے تصور کے متعلق علامہ پرویزؒ کی طرف سے ضروری وضاحت اور معلومات

آپ کو معلوم ہے کہ میرا تعلق تو کسی فرقے سے ہے نہیں' جو فرقہ کو شرک قرار دے رہا ہے قرآن کی رو سے اپنا تعلق کیسے کرے گا۔ میں نہ ہی ان معنوں میں کسی کے اوپر تنقید کیا کرتا ہوں۔ لیکن جب قرآن سامنے ہے بات تاریخ کی ہے تو یہ باتیں کہنی پڑتی ہیں کہ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے بعد امامت کا تصور وہ آیا شیعہ حضرات کے نزدیک۔ بعینہٖ جو کیفیت نبی کی تھی خدا کی طرف سے مامور' اسی طرح سے انہوں نے کہا کہ امام خدا کی طرف سے مامور ہوتا ہے اس کا ہر قول خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے جو آئمہ ہیں ان آئمہ کے جو ارشادات ہیں انہیں وہ اسی طرح سے خدا کی طرف سے دی ہوئی وحی مانتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ہاں یہ جو مجموعہ ہے احادیث کا جنہیں ہم کہتے ہیں وہ انہیں آئمہ کی رو سے ملی ہوئی ہیں۔ تو اس میں تو سوال ہی نہیں۔ یعنی جو بھی اس عقیدے کو مان لے اب اس سے وہ ایک حرف اِدھر اُدھر نہیں ہوسکتا جیسے قرآن کو ماننے والا قرآن کے کسی ایک لفظ کے متعلق بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس میں شبہ ہے یا میں کوئی دوسری رائے رکھتا ہوں اس کے خلاف۔ اسی طرح سے وہ بھی نہیں کہہ سکتے انہیں وہ ماننا پڑتا ہے۔ امامت آرہی تھی حضرت

علیؓ کی اولاد میں۔ گیارہویں امام کے بعد آگے سلسلہ ختم ہوا بارہویں امام کے ساتھ' آگے وہ سلسلہ اولاد کا نہیں چلا۔ تو انہوں نے یہ کہا کہ وہ امام وفات نہیں پا گئے بلکہ وہ چھپ گئے ہیں امامِ غائب ہیں۔ وہ موجود ہیں قیامت تک کے لیے وہ زندہ ہیں۔ قیامت کے قریب پھر ان کا ظہور ہوگا۔ بہرحال یہ ان کا عقیدہ ہے اور انہوں نے کہا کہ وہ چیز جو آ رہی ہے امامت کی وہ ہے موجود قیامت تک کے لیے۔ لہٰذا ان کے ہاں بھی اپنے طور پہ دین کو سمجھنے کی یا کسی اسلامی مملکت کے ذریعے دین کو نافذ کرنے کا یہ تصور نہیں آ سکتا تھا۔ وہاں تو یہ ختم ہوئی امامت اس طرح سے۔ لیکن مامور من اللہ کا عقیدہ جو تھا یہ باقی رہا۔

صوفیوں کی طرف سے کشف اور الہام کا تصور اور بیعت کے عمل کا نتیجہ

صوفیوں نے اپنے ہاں اس عقیدے کو رکھا کہ ان کو خدا کی طرف سے کشف اور الہام ہوتے ہیں۔ الفاظ مختلف ہیں بات وہی ہے لیکن یہ غنیمت ہے کہ انہوں نے اپنے طور پہ کہا کہ شریعت سے الگ طریقت ہے ہمارے ہاں۔ شریعت کو نہیں چھوا اس لیے ان کے فیصلے شریعت کے احکام نہیں بنے۔ وہ جو انہیں مانتا ہے ان کی بیعت کرتا ہے مرید ہوتا ہے' سلسلے میں جاتا ہے' اس کے نزدیک ان کا قول سند اور حجت ہو جاتا ہے کہ

بے سجادہ رنگین کن گروت پیرِ مغاں گوید

ان کا مسلک یہ ہے کہ اگر پیر یہ کہہ دے کہ اس مصلے کو شراب کے مٹکے میں ڈبو دے تو ڈبو دے' اس لیے کہ

سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزل ہا

طریقت کے علاوہ شریعت میں بھی مامور من اللہ کا تصور اور شخصیت پرستی کی نوعیت

وہ ان راستوں پہ گیا ہوا ہے اسے پتہ ہے راستہ کونسا ہے' تو نہیں جانتا' آنکھیں بند کر کے اس کی بات مان لے۔ لیکن یہ شریعت کی طرف نہیں آئے۔ شریعت کی طرف مامور من اللہ بھی آنے شروع ہوئے مجدد کا عقیدہ آ گیا' سو برس کے بعد مامور من اللہ۔ یہ مصلحین آئیں' آتے رہیں' مفکرین آئیں معلمین آئیں مدرسین آئیں درس دیں تعلیم دیں اصلاح کریں۔ لیکن یہ چیز کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں ہماری فکر کا نتیجہ نہیں خدا کی طرف سے یہ چیز آئی ہوئی ہے۔ وہیں آ گئے جہاں آپ نبوت میں تھے۔ شخصیت پرستی شدید ترین شکل میں یہاں ہوتی ہے۔ اب جو بھی ان کو مانے گا ظاہر ہے کہ ان کے کسی قول سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ اور جب کسی انسان کے قول کو آپ سند مان لیتے ہیں اس سے اختلاف نہیں کر سکتے اس سے الگ سوچ نہیں سکتے' اس پہ کسی قسم کی تنقید نہیں کر سکتے۔ یہ ہے شخصیت پرستی۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے کسی قسم کی غلطی کی ہے ان سے کوئی سہو ہوا ہے ان کے متعلق یہ چیز بھی نہیں۔

مامور من اللہ کے متعلق یہ بھی ہے کہ وہ کوئی غلطی نہیں کر سکتے

آپ کہہ سکتے جب آپ یہ عقیدہ مان لیں۔ معاف رکھئے جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ مجھے نہ کسی عقیدے پہ تنقید کرنی ہے نہ کسی فرقے کی تنقیص کرنا ہے مجھے تو یہ کوائف یہ حالات یہ Realities ہیں جو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ان کے متعلق وہ یہ بھی نہیں تسلیم کرسکتے کہ ان سے کوئی غلطی ہوسکتی تھی۔ مجھے یہ مثال دینی پڑے گی ابھی کہ یہ عقیدہ مامور من اللہ کا کس طرح سے یہ چیز لے آتا ہے کہ وہ غلطی بھی نہیں کرسکتے تھے۔کوئی دو برس اُدھر کا ذکر ہے۔ایک روایت ہے ایک حدیث ہے پہلے تو وہ حدیث ہی سنئے کہ کس قسم کی ہے۔

خدا تعالیٰ کی صفت رحیمی کو مبذول کرانے کے لیے گناہ کا عمل کرنا ضروری ہے' مسلم

وہ حدیث ہے مسلم کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دیکھنا مسلمانو! تم کبھی ایسا نہ ہوجانا کہ تم سے گناہ ہی نہ ہوں۔اگر ایسی صورت ہوگئی کہ تم سے گناہ نہ ہوں تو خدا تمہیں مٹا دے گا اور تمہاری جگہ ایک قوم دوسری لے کے آئے گا جو گناہ کرے گی تا کہ اس کی غفور ورحیمی عام ہوتی رہے۔ یہ ایک روایت ہے خود اس روایت کو پہلے آپ دیکھئے کہ یہ ہے کیا۔ یہ اخبار ''پیغام صلح'' میں یہ روایت چھپی اور اس میں لکھا یہ تھا کہ مرزا صاحب نے یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اس کے نیچے یہ حدیث لکھی ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ایسا۔تو اس کے اوپر ''طلوعِ اسلام'' میں یہ لکھا گیا کہ یہ قرآن کی آیت نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا یہ ایک حدیث ہے یوں کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا۔ یہ قرآن کی آیت نہیں ہے بات بڑی صاف تھی کہ ٹھیک ہے مرزا صاحب سے یہ سہو ہوگیا یہ آیت نہیں یہ حدیث ہے بات ختم ہوجاتی۔اس پرچے کے اندر قریب کوئی پانچ چھ اتنے اتنے لمبے مضمون لکھے گئے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ نہیں انہوں نے غلطی نہیں کی ہے یہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو لکھا ہے' اس کے یہ معنی ہیں اسکی یہ تاویل ہے اور اس کا یہ مطلب ہے۔وہ چیز کہ ان سے غلطی نہیں ہوسکتی۔ورنہ غلطی ہر انسان کرتا رہتا ہے۔بات بڑی آسان سی تھی کہ ٹھیک ہے سہو ہوگیا۔

دین میں شخصیت پرستی ایک خطرناک موذی مرض ہے

میں یہ عرض کررہا ہوں جب کسی کے متعلق یہ عقیدہ ہوجائے کہ وہ مامور من اللہ ہے تو اس کے متعلق کوئی پھر یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ غلطی بھی کرسکتا ہے۔شخصیت پرستی کی یہ انتہا ہوتی ہے۔ یہاں ہے فرقے کی بنیاد۔ جسے بھی آپ نے اپنے فرقے کا بانی Head تصور کرلیا' مان لیا اس کے کسی قول کے خلاف آپ نہیں کچھ کہہ سکتے اس کو غلطی سے منزہ' مبرا آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا۔قرآن وہ سمجھاتے ہیں یعنی جو کچھ وہ کہہ دے قرآن کے متعلق وہ قرآن ہوجائے گا۔عقیدہ ہے کہ اب دین یا قرآن ان کی وساطت سے سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ ہے جہاں فرقہ پرستی شروع ہوئی شخصیت پرستی اور ایک ایک شخصیت ہے جس کے ساتھ وابستگی کا نام فرقہ ہے وہاں سے نہیں ہٹ سکتے آپ۔اور

قرآن اسی چیز کو کاٹنے کے لیے آیا تھا۔اس نے کہا کہ دین میں سند اور حجت خدا کی کتاب ہے رسول کا ارشاد جو بحیثیت بشر کے آپ ﷺ دیں گے وہ بھی سند اور حجت نہیں ہے۔اور قرآن کی وہ شہادت موجود ہے حضرتِ زیدؓ کا قصہ۔چہ جائیکہ اس کے بعد کسی کے متعلق تسلیم یہ ہو اس کے بعد نبوت یا خدا کی طرف سے کسی علم کا ملنا وہ قصہ ختم ہوا۔اب خدا کی کتاب' انسانی فکر' عملی طور پہ اسلامی مملکت کی طرف سے نفاذ یہ ہے۔

دین اور تفرقہ تو دو متضاد چیزیں ہیں تفرقہ کی بنیاد اس شخصیت پرستی پر ہے جو وراثتاً چلی آرہی ہے

صحیح دین۔ملت میں کوئی تفرقہ نہیں ہوسکتا کوئی فرقہ نہیں اس سے پیدا ہوسکتا۔اسلامی مملکت ختم ہوئی انفرادیت آ گئی قوم کے اندر۔اب مختلف مراکز بنے شخصیتوں کے' ہر شخصیت سے وابستگی کا نام فرقہ۔اور اسی کو قرآن نے شرک کہا ہے جو سند قولِ خدا نے بننا تھی اس کی بجائے انسان سند اور حجت بن گئے اسے شرک کہتے ہیں۔یہ مٹ نہیں سکتی صورت۔کہا گیا کہ اب تو اتنے فرقے موجود ہیں اور کوئی شخص یعنی پورا فرقہ چھوڑنا تو ایک طرف رہا اپنے فرقے کے کسی ایک عقیدے کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔اس نے جو جزئیات اور فروعات دی ہیں ان کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔وہ کہتے ہیں کہ پھر اس کی شکل کیا ہے۔سوال پوچھنے کا یہ ہے کہ پہلے طے کیجیے کہ یہ شکل جو ہے امت کے اندر یہ فرقے' قرآن کی رو سے یہ شرک ہے یا نہیں۔اگر یہ آپ سمجھتے ہیں کہ نہیں مٹ سکتے تو پھر کہیے کہ اسلام اس امت میں نہیں آ سکتا۔کہاں آئے گا؟ وہاں آئے گا کہ جہاں طریق جو قرآن کا ہے کہ قرآن سند اور حجت ہے اور ان کا نظام اس کو رائج کرے گا جو اس چیز کو لیں گے' وہاں اسلام آ سکے گا۔ٹھیک ہے جیسے مذہب ہے یہودیوں کا عیسائیوں کا ہندوؤں کا مسلمانوں کا ایک مذہب ہے چلتے جایئے دین تو نہیں ہے۔دین ہوگا تو امت میں فرقہ نہیں ہوسکتا۔اور اس کی شکل ہے عملی' یہ وہاں قائم ہوگا اس لیے کہ یہ جو ہمارے ہاں وراثتاً عقیدے چلے آتے ہیں شخصیتوں کے متعلق وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ (2:93) قرآن کہتا ہے گئوسالہ کی محبت بنی اسرائیل کے دل کی گہرائیوں میں جا چکی تھی۔وہ تو بچھڑا تھا یہاں تو پھر بڑے بڑے انسان ہیں اور ان کا مرتبہ ذہنوں کے اندر یہ ہے ان کو کیسے یہ چھوڑ دیں۔

اپنے نسلی اور خاندانی عقائد کو طلاق دینا بڑی جرأت کا کام ہے

تو سوال تو یہ ہے کہ جب تک لا الہ نہیں ہوگا عزیزانِ من! الا اللہ تو نہیں آئے گا۔حقیقت تلخ تو بڑی گذرتی ہے۔عقیدہ انسان کی عزیز ترین متاع ہوتا ہے اس کو یہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔یہ تو اتنی گہرائیوں میں گیا ہوا ہوتا ہے کہ ہپناٹزم کے ذریعے سے جو معمول ہے جس کے اوپر یہ اثر کرتے ہیں ہپناٹزم کا' اس کے تابع یہ شخص جو ہپناٹائز اسے کر رہا ہے' جو بات چاہے اس سے کہلواتا چلا جاتا ہے' منواتا چلا جاتا

ہے وہ جو یہ کہتا' ہے کہتا چلا جاتا ہے۔لیکن اس پوری مدہوشی کے عالم میں بھی اس کے عقیدے کے خلاف اگر یہ کوئی بات کہے تو وہ یہ نہیں کہتا۔ یہ تو ایسی چیز ہے یہ عقیدہ۔اس کے لیے بڑی جرأت کی ضرورت ہے۔لا الہ واقعی

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے

بڑے بڑے معبود اس سے پہلے کے جو ہیں ان کو ذبح کرنا پڑتا ہے۔احترام اور چیز ہے ٹھیک ہے ان کی عزت اور چیز ہے یہ کیجیے۔سند اور حجت ماننا یہ دوسری چیز ہے۔یہ ہے اصل طریقہ۔بہرحال ہر فرقے کا کہنا ہے کہ میں نے تو نہیں یہ فرقے پیدا کیے میرا کیا اس میں جرم ہے۔

نوعِ انسانی کا تیرہ سو سال کا طویل سفر قدم بقدم قرآن کی جانب اٹھ رہا ہے

ٹھوکریں کھا کے پتھریں مار کے اس کے ایک ایک جز و کو قبول کر رہی ہے اس کے بعد آہستہ آہستہ اس طریقے سے اہتماماً بھی پھر یہ قبول کیا جائے گا لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ(9:33) اس نے جو کہا ہے ہمارا ایمان ہے۔اور ایمان یونہی اندھا ایمان نہیں ہے علیٰ وجہ البصیرت ایمان ہے میں تو تاریخ کی رو سے یہ بتا سکتا ہوں کہ اس تیرہ سو سال کے اندر انسانی فکر اور تجربے کے بعد جو قدم اٹھا ہے انسان کا' جس نے پہلے سے عقیدہ ذہن میں نہیں وضع کیا' خالص فکرِ انسانی اور تجربے کے بعد جو قدم اٹھا ہے انسانیت کا' وہ قرآن کی طرف اٹھا ہے۔مسلمان کا جو قدم اٹھا ہے اس کے خلاف گیا ہے اس لیے کہ اس کی بنیاد شخصیت پرستی پہ تھی۔انسانی فکر کی بنیاد شخصیت پہ نہیں تھی۔انہوں نے لا الہ کی منزل طے کرلی ہوئی ہے۔ان کے ہاں بھی جہاں الہ تھے مذہب پرست طبقہ نہیں آیا۔الٰہوں کو چھوڑنے والا جو طبقہ تھا فکر کی رو سے جس نے ان چیزوں کے اوپر غور کیا انسانی تجربے سے جس نے مطالعہ اور مشاہدہ کیا' ان کا ہر قدم اس کی طرف اٹھا ہے۔

دین کو قبول کرنے کے لیے قریش جیسی جرأت کی حامل قوم کا ہونا ضروری ہے

مذہب پرست تو کوئی آ نہیں سکتا دین کی طرف۔یہودی نہیں آئے تھے نصرانی نہیں آئے تھے مجوسی نہیں آئے تھے۔یہود و نصاریٰ کو تو جزیرۃ العرب سے نکالنا ہی پڑا تھا اور ایران کے مجوسی وہ فتح ایران کے بعد اس حیثیت سے جیسے بدوؤں نے کہا تھا کہ اَسْلَمْنَا(49:14) انہوں نے سرنڈر کیا تھا۔مذہب والا تو دین نہیں قبول کرتا۔اس کے لیے تو واقعی قریش جیسی جرأت اور بصیرت کے جو انسان تھے وہ دین کو قبول کرتے۔انہوں نے واقعی اپنے ہاتھوں سے اپنے معبودوں کو ذبح کر دیا پھر آئے دینِ خالص کی طرف' پھر آئے وہ الا اللہ کی طرف۔یہ الہ ہیں یہ جو شخصیتیں کھڑی ہیں جن کی بناء پر فرقہ قائم ہوتا ہے' یہ الہ ہیں۔الہ کے معنی کیا ہیں؟ اس کی بات کو سند اور حجت قرار دیا جائے۔یہ ہے فرقے کی بنیادیں یہ ہے اسکی تاریخ مجمل سی جو میں نے عرض کی ہے۔اور یہ ہے اس کا مٹنے کا طریقہ جو مذہب میں تو نہیں مٹ سکتا دین کی طرف جو کوئی قوم آئے گی وہاں یہ امت' امتِ واحدہ بنے گی۔یہ تھا جو پچھلی دفعہ میں نے کہا۔اگلی آیت قرآن کی آتی

ہے۔مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا وَ مَنۡ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجۡزٰٓى اِلَّا مِثۡلَهَا وَ هُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ (6:160)۔

قرآن حکیم نے ہر حسنہ عمل کی مثال ثمر بار کھیتی سے دی ہے

ایک اور اصول آیا۔ٹھیک ہے اچھا کام کیجیے اس کے نتائج اس کام کے مقابلے میں دس دس گنا زیادہ بن کے آپ کو ملیں گے۔بڑی صحیح بات ہے۔قرآن نے ہمیشہ اس کی مثال کھیتی سے دی ہے۔کسان ایک دانہ بیج کا ڈالتا ہے سات سات سو دانے اس سے ملتے ہیں۔یہ نیکی ہے نا۔آپ نے سمجھ لیا نیکی کسے کہتے ہیں۔خدا کے قانون کے مطابق تمام اسباب وذرائع جمع کر کے اس طریق کے مطابق محنت جو کی جائے گی' اس کا جو ماحصل ہوتا ہے اسے نیکی کہتے ہیں۔نیکی کا تو لفظ ہی فارسی کا ہے۔قرآن نے تو حسنہ کہا ہے جس میں خالص توازن رہے ان چیزوں میں۔کھیتی اگتی اس صورت میں ہے جب کہ ہر شے کا توازن صحیح ہوتا ہے۔پانی زیادہ دید یجئے اگی ہوئی کھیتی مر جاتی ہے' دھوپ زیادہ پڑ جائے مرجھا جاتی ہے' کھاد زیادہ ڈال دیجیے' دیکھئے کھیتی کا کیا حشر ہوتا ہے۔صحیح توازن: کیا بات ہے قرآن کی اس کے لیے وہ لفظ ہی حسنہ استعمال کرتا ہے۔اور اس کے مقابل میں سوء کا لفظ استعمال کرتا ہے جہاں توازن بگڑ جائے۔لیکن اگر توازن بگڑ جائے وہ نہ اگے' تو ایک دانہ ضائع ہوتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ اس کے کوٹھی میں جو دانے رکھے ہوئے ہیں وہ بھی ضائع ہو جائیں۔یہ ہے عدل۔اسی کے اوپر قرآن نے اس کے عدل کا اصول یہ بتایا کہ وَ اِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِهٖ (16:126)

تمدنی زندگی میں جرم کی سزا کی نوعیت عدل کے مطابق قرار پاتی ہے

یہ آپ کی تمدنی زندگی کا قانون ہے کہ جرم کی سزا اتنی ہی دی جائے جتنا جرم کیا گیا ہے اس سے زیادہ سزا نہیں دی جاسکتی۔انعام دیتے وقت جتنا جی چاہے انعام دید یجیے لیکن جرم کی سزا اتنی ہی ملے گی جرم کے مطابق سزا۔ وَ مَنۡ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجۡزٰٓى اِلَّا مِثۡلَهَا (6:160) جرم کی سزا اتنی ہی' وَ هُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ (6:160) اگر اس سے زیادہ دیدی گئی تو یہ خود ظلم ہو جائے گا۔یعنی عدل کی کرسی پہ بیٹھا ہوا اگر سزا جرم کی اس سے زیادہ دیتا ہے تو یہ ظالم ہو جائے گا عادل نہیں رہے گا۔یہ اصول بیان کیے یہ ان اصولوں کی ان اقدار کی آخری آیت تھی جو میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن ارتکاز کی حیثیت سے بیان کرتا چلا آ رہا ہے۔اور اس کے بعد پھر یہ دہرایا قُلۡ اِنَّنِىۡ هَدٰٮنِىۡ رَبِّىۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ (6:161) ان سے کہو یہ ہے وہ سیدھا ہموار راستہ جس کی طرف خدا نے میری راہنمائی کی ہے یہ ہے میرا راستہ۔یہ کیا راستہ ہے؟ چند اصول' چند اقدار کچھ قوانین غیر متبدل سند آخر۔میں جو کہہ رہا تھا کہ ساری دنیا تجارب کے بعد ادھر آئے گی ان قوانین کو آپ لے کے ساری دنیا کو پوچھئے کہ ان میں سے کسی سے بھی وہ انکار کرتے ہیں۔

U.N.O کے چارٹر میں نسلی تعصّبات کی بنا پر باہمی تفریقات کی حالت کا نتیجہ اور اس کا حل

ساری دنیا کی قوموں نے اکٹھے ہو کے جو اپنے ہاں چارٹر بنایا ہے یو این کے اس چارٹر کا %75 قرآن کی آیتوں پہ مشتمل ہے 25 اور جمع کر دیں تو قرآن ہو جاتا ہے۔ وہ جمع نہیں ہونے دیتے ان کے یہ نسلی تعصّبات' قومی تفریقات' وہی فرقہ بندی۔ یہ آیتیں قرآن کی آئی ہیں۔ کہو کسی سے ہے انکار کہ جرم کی سزا اس جرم کے مطابق دی جائے اس سے زیادہ نہ دی جائے۔ ساری دنیا مان رہی ہے یا نہیں۔ پھر بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ لیکن جب شخصیت پرستی میں آپ فقہ کے اندر آئیں گے تو وہ اس قرآن کے اصول کے خلاف جائے گا۔ قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (6:161) صراط: سیدھی راہ ہے' مستقیم: متوازن ہے۔ عجیب قوم تھی یہ۔ اس نے دیکھا کہ کھڑا وہ رہ سکتا ہے جس کا توازن صحیح ہو ذرا انسان کے جسم کا توازن خراب ہو جائے ذرا پاؤں میں اونچ نیچ ہو جائے کھڑا نہیں رہ سکتا۔ میز کھڑی نہیں رہ سکتی' کرسی کھڑی نہیں رہ سکتی۔ جہاں توازن کسی چیز کا بگڑے' کھڑا نہیں رہ سکتا۔ لفظ ان کے ہاں قیام ہی تھا۔ قیام سے انہوں نے کہا کہ قیام کی بنیاد توازن کے اوپر ہے اس لیے متوازن شے جو خود کھڑی ہو سکے مستقیم اسے کہتے تھے۔ اس کے بعد تشریح کر دی دِیْنًا قِیَمًا (6:161) یعنی وہ نظامِ زندگی جو خود بغیر کسی دوسرے کے سہارے پہ اپنے زور دروں سے قائم ہے اور انسانیت کے قائم رکھنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ دونوں معنی اس کے اندر آجاتے ہیں خود اپنے مقام پہ قائم اور جو بھی متمسک ہو اس سے اس کے قیام کا ذریعہ۔ کہا یہ ہے دین۔ مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا (6:161) یہ مسلک ہے ابراہیمؑ۔

قرآنِ حکیم نے ملتِ ابراہیمی کے لیے قندیلِ آسمانی میں حنیفاً کا لفظ استعمال کیا ہے

حَنِیْفًا (6:161) کی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے خدا کے سوا ہر ایک گوشے سے منہ موڑ لیا تھا۔ حنیف کہتے ہیں ناک کی سیدھ میں جانے والا' چلتے ہوئے اِدھر اُدھر جسے دیکھنے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ منزل ہو متعین اور راستہ ہو اس کی طرف جانے والا سیدھا تو پھر اس مسافر کو ضرورت پڑتی ہے کہ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا پھرے؟ ضرورت ہی نہیں پڑتی نہ کسی سے پوچھنے کی نہ کچھ اور دیکھنے کی۔ اسے حَنِیْفًا کہتے ہیں تعینِ منزل کے بعد راستہ متعین جس پہ چلا جا رہا ہے کسی دوسری طرف دیکھ بھی نہیں رہا۔ حَنِیْفًا (6:161) کہہ کے کہا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (6:161) وہ مشرک نہیں تھا مشرک وہ ہوتا ہے جس کی منزل متعین نہ ہو اور راستہ سیدھا نہ ہو اور ادھر اُدھر دیکھتا جائے ہر چوراہے پہ پوچھے'' پئی ہن میں کدھرنوں جاواں''۔ وہ ایک کہتا ہے' اِدھر جاؤ اِدھر چلا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد دیکھا کہ غلط راستہ ہے کہ جی اب میں کدھر جاؤں۔ ہر ایک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو' یہ ہے شرک۔ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (6:161) کسی اور کو وہ سند اور حجت نہیں مانتا۔ متعین منزل صراطِ مستقیم اس پہ ایمان یقینِ کامل' سیدھا اس کی طرف

چلا جاتا تھا۔ یہ ہے جی ملتِ ابراہیمؑ' یہ ہے دین' یہ ہے قرآن آپ کو جو دینے کے لیے آیا تھا۔ اوراس کے لیے قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (6:162) ان سے کہدو۔ عام ترجمے میں آپ دیکھیں گے تو آپ کو ملے گا کہ ان سے کہدو کہ میری نماز اور پھر نُسُکِیْ (6:162) کے معنی میری قربانیاں وہ کہیں گے میری زندگی میرا مرنا اللہ کے لیے ہے۔

میری نماز اور میری قربانیوں سے مراد اور جامعیت پر مبنی مفہوم نیز قرآنی فرائض کی ادائیگی کے لیے جزئیات کی وضاحت

'میری نماز اور میری قربانیاں' میں ان دولفظوں کے اوپر آ رہا ہوں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ٹھیک ہے صلوٰۃ کا لفظ قرآنِ کریم میں اجتماعِ صلوٰۃ کے لیے بھی آتا ہے۔ لیکن اسکے یہی معنی نہیں ہیں ورنہ یہاں یہ نظر آتا کہ جو کہا گیا میری صلوٰۃ اور میری قربانیاں آگے انہوں نے کہا خدا کے لیے ہیں تو یہ جو باقی ارکان ہیں دین کے ان کا تو ذکر ہی نہیں آیا۔ نماز اور قربانیوں کا ہی ذکر آیا ہے۔ باقی آپ کے ہاں یہ روزے ہیں' زکوٰۃ ہے' حج ہے انہی کو آپ دین کے ستون بتا رہے ہیں۔ یعنی ان کا تو کوئی ذکر نہیں یہ تو صرف صلوٰۃ اور نُسُکِیْ (6:162) آیا ہے۔ یہ دو ہی کیوں ذکر کیے گئے؟ رسول سے کہا گیا کہ اعلان کر دو اس چیز کا۔ بڑی عظیم جامعیت ہے اس کے اندر عزیزانِ من! صلوٰۃ کہتے ہیں زندگی کے تمام فرائض جو انسان کو ادا کرنے پڑیں قانونِ خداوندی کی رو سے تمام فرائض جو میری ڈیوٹی جتنی عائد کی گئی ہے۔ نُسُکْ کہتے ہیں وہ طور طریقے جن کے مطابق ان چیزوں کو ادا کیا جائے۔ یہ نُسُک ساتھ طور طریقے بھی کیوں کہنے کی ضرورت پیش آئی؟ اس لیے کہ یہ جو میکیاؤلی سیاست ہے اس میں کہا یہ جاتا ہے۔

The means are justified by the ends achieved.

جو مقصد حاصل کرنا ہے اس کے لیے جونسا جی چاہے طریقہ اختیار کر لیجیے جائز ناجائز ہر قسم کا طریقہ صحیح ہے مقصد حاصل ہو جائے کسی طرح سے۔ قرآن اس چیز کی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مقصد کا صحیح ہونا' حصولِ مقصد کے طریقوں کا صحیح ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ غلط راستہ صحیح مقام کی طرف پہنچا ہی نہیں سکتا۔ طریقہ خود جزو ہو جاتا ہے اس مقصد کا۔ کتنا بڑا اعلان ہے ان سے کہہ دیجیے کہ میرے فرائضِ حیات اور ان کے ادا کرنے کے طور و طریقے یعنی میری زندگی میری موت یہ سب کی سب لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (6:162)۔ اب یہ چیز آئی بڑی غور طلب ہے' اللہ کے لیے ہے'۔ رب العالمین تو آگے بات آئے گی۔ یہ سب کچھ اپنی پوری زندگی میں جو کچھ میں کرتا ہوں حتٰی کہ میری موت بھی اللہ کے لیے ہے۔ بات یہ سمجھنے کی ہے یہ ہے دین حقیقت میں کہ جو کچھ کیا جائے اللہ کے لیے کیا جائے۔

خُدا کے لیے یا فی سبیل اللہ قرآن حکیم کی یہ عظیم اصطلاح بڑی غور طلب ہے

ہمارے ہاں صبح سے شام تک زبان پہ آتا ہے'اللہ کے لیۓ' فی سبیل اللہ یہ کیا جائۓ'۔ پوچھیۓ گا کسی سے کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ اللہ کے لیے کیا' کوئی اس کے کام ایسے رہے ہوئے تھے جس کو تم کر رہے ہو اس کے لیے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ میں یہ کام تو سارا روپیہ اکٹھا کرنے کے لئے کرتا ہوں اس سے مکان بنا رہا ہوں ان بچوں کے لیۓ' ان بچوں کو اس کی ضرورت ہے اس لیے ان کی ضرورت پوری کرنے کے لیے میں یہ مکان بنا رہا ہوں ان بچوں کے لیے۔ یہ بھاگ دوڑ کاہے کے لیے کرتا ہوں؟ فلاں دوست کے لیے اس کا کوئی کام رکا ہوا ہے اس کے لیے کر رہا ہوں۔ یہ اللہ کے لیۓ' یہی بات سمجھ میں نہیں آتی' اس کا تو کوئی کام نہیں رکا ہوا۔ یعنی وہ تو تمہیں یہ کہتا ہے وہ جو اِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (3:97) ہے ارے ہم مستغنی ہیں ان تمام چیزوں سے۔ وہ دوست کہہ رہا ہے''مینوں بالکل لوہڑ نئیں ہیگی اے' کہن لگا لے! تینوں نئیں لوہڑ ہیگی اے تاں کی ہویا میں فیر وی کراں گا''۔ یہ معنی نہیں اس کے ہوتے۔ اور آگے چلے جناب۔ اُنہوں نے کہا کوئی انسان کی غرض نہیں ہونی چاہیے اس میں جو کچھ کرے۔ اپنی طرف سے بڑی دور کی کوڑی لائۓ' کوئی غرض دل میں نہیں ہونی چاہیۓ۔ کچھ نہ سمجھے کہ اگر کوئی غرض یا کوئی مدعا یا کوئی مقصد یا کوئی آرزو ہی نہ ہو تو انسان کوئی کام کر ہی نہیں سکتا۔ ہر کام کا ابتدائی جذبۂ محرکہ آپ کا کوئی ایک مدعا ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کہا دلِ بے مدعا جو ہے صاحب یہ ہے بڑی نشانی۔

انسانی آرزو کے تصور کے متعلق بدھ کی تعلیم اور ہمارے ہاں تصوف کا نظریہ اور اس کا نتیجہ؟

کچھ نہ سمجھے کہ کہاں سے یہ شرارت آئی ہوئی ہے۔ بدھ ازم کی طرف سے یہ بات آئی کہ جب اس نے یہ بات کہی کہ ہر آرزو ایک تکلیف کا پیش خیمہ ہے ساری انسان کی زندگی تکالیف سے بھری پڑی ہے اور تکلیف کی ابتداء ہوتی ہے آرزو سے۔ تکلیفوں سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی آرزو پیدا ہی نہ ہونے دیجیے دل میں اور کرتے جایئے۔ جوں جوں آرزوئیں ترک کرتے چلے جائیں دلِ بے مدعا ہوتا جائے گا۔ خود انہوں نے کہا کہ پھر آخر ہوگا کیا جب کوئی آرزو ہی دل میں پیدا نہ ہوگی۔ انہوں نے کہا بالکل فنا' نروان جسے کہتے ہیں۔ یہ ان کے ہاں کا ایک فلسفہ ہے' چھا گیا ہر جگہ۔ آپ کے ہاں بھی تصوف والوں نے اس چیز کو لیا۔

دل بے مدعا کا نظریہ کیونکر ثمر بار ہوگا علامہ اقبال کا سوال

تصوف والوں کی بات تو ہمارے ہاں بڑی مقدس ہو جاتی ہے۔'دلِ بے مدعا' بظاہر بات بڑی اچھی نظر آئی کوئی غرض اپنی نہیں۔ کوئی کام ممکن بھی ہے دنیا میں جس میں کوئی غرض تمہاری نہ ہو۔ حتیٰ کہ جو کام مجبوراً آپ سے کرایا جاتا ہے تھانے میں بلا کے اس ٹار چر سۓ آخر میں جب آپ کہہ دیتے ہیں کہ اچھا جیسا آپ کہتے ہیں میں کر دونگا اس میں بھی غرض یہ ہوتی ہے کہ اس مار سے تو بچ جاؤں۔ غرض'

کے بغیر کوئی قدم ہی نہیں اٹھا سکتا انسان۔ اور یہ جو تصور ہے کہ کوئی مدعا کوئی آرزو ہی پیدا نہ ہو دل کے اندر' موت ہے۔ زندگی کا سارا کاروبار آرزوؤں کے اوپر ہے ایک مدعا دل میں پیدا ہوتا ہے ایک آرزو پیدا ہو رہی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں' وہ نہایت عمدگی سے رموزِ خودی میں کہتا ہے۔

زندگانی را بقاء از مدعا است

بڑی صحیح بات ہے۔ زندگی کی بقاء کا راز مدعا کے اندر ہے آرزو کے اندر ہے۔

کاروان ؟؟ درا از مدعا است

اس کا کارواں بیٹھے کا بیٹھا رہ جائے اگر یہ آرزو یہ مقصد دل میں نہ ہو کہ میں نے منزل پہ پہنچنا ہے۔ منزل پہ پہنچنے کی آرزو کارواں کے لیے بانگِ درا ہوتی ہے۔ کیا بات ہے اس شخص کے کہنے کی۔

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم

از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

مقاصد کی تخلیق یہ ہے زندگی' یہ ہے وہ شعاع کہ جس سے ہمارے اندر بھی روشنی ہوتی ہے۔ بلکہ آگے چل کے تو بڑے زور سے اس نے کہا ہے کہ

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست

نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

جس کے اندر کسی چیز کے Create کرنے کی ایک آرزو ایک قوت نہیں ہے نئی تخلیق کرنے کی جس کے اندر قوت نہیں ہے وہ کہتا ہے ہمارے نزدیک کافر و زندیق ہے وہ شخص۔

دراصل بات بے مدعا کی نہیں بلکہ صحیح مدعا کو پیش نظر رکھنے کی ہے' جذبہ محرکہ کی ہے

یہ دلِ بے مدعا کو بہت بڑا مقصدِ حیات بتا رہے ہیں نہیں سمجھتے کہ کہاں سے یہ کفر آیا ہے ہمارے ہاں۔ اب مدعا مدعا میں فرق ہے۔ بے مدعا نہیں' صحیح مدعا۔ صحیح مدعا کیا ہے؟ للہ۔ کیا بات ہوئی۔ اس کے معنی ہیں میری زندگی میری موت میرا کاروبارِ حیات میرا ایک ایک سانس اس پروگرام کی تکمیل کے لیے ہے جو خدا نے متعین کیا ہے۔ بات صاف ہوگئی خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے۔ اس میں اپنی ذات کا مدعا اور مقصد تو پہلے آ گیا وہ پروگرام یہ ہے کہ انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی چلی جائے۔ طریق یہ ہے کہ پوری انسانیت کے لیے منفعت بخش کام کرتے چلے جاؤ۔ وَ اَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ (13:17) پوری انسانیت کے لیے منفعت بخش

کام کرتے چلے جاؤ تمہاری اپنی ذات کی نشو ونما ہوتی جائے گی۔ اور نشو ونما یافتہ ذات زندگی کی اگلی ارتقائی منزل میں پہنچنے کے قابل ہو جائے گی۔ یہ تو ہو گئی میری غرض۔

خودغرضی، قوموں کی موت کا سب سے بڑا سبب ہوتا ہے

Selfishness برے معنوں میں ہمارے ہاں استعمال ہوتی ہے۔ اگر تو اس کا مقصد یہ کہ دوسروں کی اغراض سے بے پرواہ صرف اپنی غرض کو ہر طریقے سے حاصل کرنا اگر تو اس کے یہ معنی ہونگے تو پھر تو وہ معیوب بات ہے۔ لیکن یہ جو Selflessness کہتے ہیں یہ تو موت ہے۔ ارے Self کی نشو ونما کے لیے تو یہ سارا کاروبارِ حیات ہو رہا ہے اور Selflessness جو ہو گیا وہ Self ہی ختم کر دیا تم نے اندر سے اپنا' بدھ ازم ہے۔ اس لیے Selflessness آپ نے دیکھا الفاظ کے گورکھ دھندوں میں قوموں کے اوپر کیا جادو کیے جاتے ہیں۔ ہم ایسے لفظ کو بولتے ہیں جیسے بڑی بات ہے۔ یہ ہے تصوف' مار دیا جائے گڑ دے دے کے' زہر دینے کی ضرورت ہی نہیں اس قوم کو۔ Selflessness ہو جائے انسان تو بس معاملہ ختم ہو گیا۔ یہ تو Self ہی ہے جس کے لیے یہ سب کچھ ہو رہا ہے یہ Self کی Development کے لیے سب کچھ ہو رہا ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ (6:162) میری زندگی میری موت کاروبارِ حیات اس کے طور طریقے' کتنے جامع چار لفظ ہیں سارے کاروبارِ حیات کے لیے جو طور طریقے اختیار کیے ہیں میری زندگی' حتیٰ کہ میری موت' خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لیے ہے۔ پروگرام کیا ہے؟ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (6:162) ربوبیتِ عالمینی کے لیے ہے یہ سارا کچھ' یہ ہے پروگرام خدا کی عالمگیر ربوبیت۔ نہ کوئی ایک فرد آسمان کے نیچے رات کو بھوکا سوئے نہ کوئی ایک فرد ایسا رہ جائے جس کی ذات کی نشو ونما کے لیے تم نے کچھ خود نہ کیا ہو۔ تم دوسروں کے لیے کچھ کرو' تمہاری اپنی ذات کی نشو ونما ہوتی چلی جائے گی۔ پروسیس یہ ہے نُسُکِیْ یہ ہے۔

قرآنی تعلیم نے انسانی زندگی کی کامیابی کے لیے ایک جذبہ محرکہ عطا کیا ہے

طور طریقہ جسے کہا ہے مقصد ہے اپنی ذات کی نشو ونما' اس کے لیے نُسُکِ یہ طریقے ہیں انسانیت کی نشو ونما کے لیے تم جو کچھ کرو۔ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (6:162) خدا کی مقرر کردہ ربوبیتِ عالمینی کے پروگرام کی تکمیل کے لیے میری ایک ایک سانس وقف ہے حتیٰ کہ میری موت بھی اسی مقصد کے لیے ہے۔ کیا ہے یہ موت؟ لَا شَرِیْکَ لَہٗ (6:163) جس مقصد میں میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا شامل ہی نہیں کرتا' شرک ہو جائے گا۔ ضمناً ایک بات پچھلی دفعہ درس میں ذرا سی غلطی ہو گئی تھی اس کی تصحیح ضروری سمجھتا ہوں صلوٰۃ کے لفظ میں آ گیا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ وہ سَاھُوْنَ (107:5) میں سُھُوْ جو ہے جب وہ کمان سے تانت الگ کر دی جائے اسے کہتے ہیں۔ دو لفظ قرآن میں آئے ہیں ایک دفعہ آیا ہے اِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی (4:142) اور دوسری جگہ ہے ھُمْ عَنْ

صَلاتِہِمْ سَاھُوْنَ (107:5) یہ جولفظ ہے نا تانت کا کمان سے الگ ہوجانا وہ کُسَالٰی کے اندر ہے۔ سَاھُوْنَ(107:5) جہاں آیا ہے اَلسَّھْوَۃُ کے معنی ہوتا ہے ڈھیلی سی کمان' تانت اور دونوں الگ جب ہوں تانت اور کمان الگ الگ ہوجائیں' ہوں دونوں موجود' بیکار۔ وہ لفظ کُسَالٰی تھا اتنی سی تصحیح کردیجیے گا۔ خیر! رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. لَا شَرِیْکَ لَہٗ(6:162-163) اس مقصد میں میں کسی اور مقصد کی شرکت نہیں گوارا کرتا۔

رسول اکرم ﷺ کی زبان سے ایک بامقصد زندگی کا اعلان

دیکھا یہ مقصد کیا ہوا۔ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ (6:163) رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے اعلان کرایا جارہا ہے' مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے' میں مامور ہوں اور یہ حکم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔ یہ تو کہلا دیا۔ ہمارے ہاں تو یہ بات ختم ہوتی ہے دوسرے سے کہہ دیا کہ بس ٹھیک ہے جی میرا فریضہ جو تھا وہ پورا ہوگیا۔ کہہ دیا فریضہ ختم ہوگیا' کہا نہیں۔ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (6:163) میرا کام کہنا ہی صرف نہیں ہے میں سب سے پہلے اس کے سامنے جھکتا ہوں۔ اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (6:163) کہہ کے یہ بھی کہا کہ یہ ایک جماعت بننے والی ہے مسلمانوں کی جس کی ابتداء یہاں سے ہوتی ہے جو میں کررہا ہوں۔ انفرادی نہیں ہے انا مسلم کہا جاتا تو ٹھیک ہے صاحب میں تو اس کے سامنے جھک گیا تھا۔ نہ جی! پہلے دن پہلی آواز میں اسے بتا دیا کہ یہ بات انفرادی نہیں جو میری ذات تک رہنی ہے یہاں سے تو ابتداء ہوئی ہے اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (6:163)۔ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْغِیْ رَبًّا (6:164) کہو اس قسم کے خدا کو چھوڑ کے کسی اور کو خدا بناتے ہو۔ پھر رب ہے یہاں' نشوونما دینے والا' اس کے سوا کسی اور کو رب بناتے ہو۔ وَّ ھُوَ رَبُّ کُلِّ شَیْءٍ (6:164) اور اس میں کوئی میری خصوصیت نہیں کہ میں نے بڑی کاریگری کی ہے۔ وہ تو ہر شے کا رب ہے۔

انسانی ذات کا جوہر ہر شخص کو ایک خام مال کی شکل میں ملتا ہے اور زندگی کا مقصد اس کی نشوونما کرنا ہے

رب کے معنی آپ کو معلوم ہیں کسی شے کے نقطۂ آغاز سے اسے اس کی پرورش اور نشوونما کے سامان بہم پہنچاتے ہوئے بتدریج اس کے نقطۂ تکمیل تک لے جانا' اسے ربوبیت یا تربیت کہا جاتا ہے۔ رب وہ ہے جو رَبُّ کُلِّ شَیْءٍ (6:164) وہ تو کائنات کی ہر شے کے متعلق یہ کچھ کررہا ہے ۔ اب یہی فریضہ میرے ذمے عائد ہوا میں اپنی ذات کی نشوونما کے لیے بھی یہ کروں ۔ ذات Undevelped Form میں ملتی ہے ہر فرد کو' ملتی ہے ہر انسانی بچے کو' ملتی ہے غیر نشوونما یافتہ شکل میں۔ زندگی کا فریضہ ہے اس کی نشوونما کرکے اس کو اگلی زندگی اگلی ارتقائی منزل کے قابل بنا دینا۔ طریقہ اس کا یہ ہے ربوبیتِ عالمینی کے لیے جو کچھ کرتے چلے جاؤ گے تمہاری ذات اس سے تکمیل کی طرف بڑھتی چلی جائے گی۔ رَبُّ کُلِّ شَیْءٍ ہر شے کی ربوبیت اس نے اپنے ذمہ لی ہے۔ انسانوں کی ربوبیت اس نظام کے ذریعے ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔ اس نظام کے قیام اور تکمیل کے لیے اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (6:163)

لیجیے صاحب! میں بسم اللہ کرتا ہوں۔ کہو کیا میں اس کے علاوہ کسی اور کو اپنا رب تسلیم کرلوں؟ اور کس کو کروں؛ ہر شے کا رب تو وہ ہے کوئی پھر باقی شے رہ جاتی ہے جس کے لیے کسی اور رب کی ضرورت ہے۔ اگر وہاں کائنات میں دس بیس پچاس سو کروڑ رب ہوں تو ٹھیک ہے کہ تم اس رب کو تجویز کرلو مجھے یہ کچھ زیادہ پسند نہیں ہے میں آگے دیکھ لیتا ہوں اگلی دکان پہ کوئی دوسرا رب۔

ہندو مذہب میں بتیس کروڑ دیوتا کے تصور کی بنا پر تنگ نظری اور متضاد فکری کی کیفیت عام ہے

یہ جو بتیس کروڑ دیوتا تجویز کیے تھے ہندو نے، وہ یہ تھی کہ ہر شے کا رب الگ الگ تھا۔ اس کے ذہن میں اتنی جامعیت آ ہی نہیں سکتی تھی بڑا تنگ نظر واقع ہوا ہے وہ۔ اور یہی تنگ نظری ہے جو ہمیں قدم قدم پہ نظر آتی ہے۔ جو ایک محیطِ کل خدا کا تصور نہیں کرسکتا تھا، محیطِ کل نظام کا کیسے تصور کرسکتا تھا۔ بتیس کروڑ دیوتا۔ ہر شے کا رب تو وہ ہے تو اور کونسا پھر رب رہ گیا ہر شے کا تو وہ رب ہو گیا۔ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ (6:164) اشیاء کا رب وہ ہے انسانوں کی ربوبیت کے لیے اس نے ایک نظام دیا ہے۔ سنئے طریق ربوبیت کا۔ وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا (6:164) کیا اصول ہیں سنتے جایئے۔ ذات کی خصوصیت انفرادیت ہوتی ہے جسے Individuality آپ کہتے ہیں، میری ذات میری ذات۔ سمجھنے کے لیے یہ کہ میرے دانت میں جو درد ہو رہا ہے مجھے ہی وہ درد ہوگا کسی دوسرے کو وہ درد نہیں ہوتا۔ ٹھیک ہے اس سے وہ ہمدردی کرسکتا ہو حتیٰ کہ اگر اسے کبھی درد ہوا نہیں تو اسے پتہ بھی نہیں چل سکتا جب میں کہوں کہ درد ہوتا ہے، اسے معلوم بھی نہیں ہوسکتا کہ درد ہوتا کیا ہے۔ میری ذات کا درد، میرا درد ہے جیسے میں اگر حفظانِ صحت کے مطابق چلوں تو میری، صحت میری صحت ہے، میں اس صحت میں سے اپنے عزیز تریں بیٹے بھائی باپ کو بھی نہیں کچھ بانٹ سکتا۔ یہ ہے انفرادیت۔ جو میں کرونگا اس کا ہی اثر میری ذات پہ ہوگا۔ دو چیزیں: جو میں کرونگا اس میں سے بانٹ کے دوسرے کو نہیں دے سکتا، دوسرے کا غلط کام جو ہے وہ میری ذات کو متاثر نہیں کرسکتا۔ ذمہ داری کی کتنی بڑی چیز یہ بتادی۔ وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا (6:164)

ہر انسانی ذات انفرادیت کی خصوصیات کی بنا پر اپنے کیے کی خود ذمہ دار ہوگی اور کوئی کسی کی جگہ جواب دہ نہ ہوگا

ہر ذات جو وہ کرے گی اس کا خمیازہ اسی کو بھگتنا پڑے گا، کوئی دوسرا بٹا ہی نہیں سکتا، کوئی دوسرا اس کے لیے کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ شفاعت کے عقیدے، کفارے کے عقیدے، فدیے کے عقیدے، صدقے کے عقیدے سارے کے سارے ذبح کر کے رکھ دیے ایک لفظ نے۔ وہ جو دوسرے مقام پہ امم سابقہ کہتا چلا آ رہا ہے قرآن، اقوامِ گذشتہ کا، انبیائے سابقہؑ کا بھی۔ دیکھئے تاریخ میں گذشتہ اقوام کے ساتھ تعلق کیا ہے، اسلاف کے ساتھ ہمارا تعلق کیا ہے۔ جنہیں ہم بزرگ کہتے ہیں ان کے ساتھ ہمارا تعلق کیا ہے۔ عظیم اصول ہیں

زندگی کے جوقرآن دے رہا ہے۔تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ(2:141) کہ تمام انبیائے سابقہؑ کا اقوامِ سابقہ کا چلا آ رہا ہے ذکر پیچھے سے اورآخر میں یہ آیت آئی ہے کہ یہ تھی وہ اقوام' یہ تھے وہ اسلاف قَدْ خَلَت گذر گئے اپنے اپنے وقت میں۔لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ (2:141) جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کے لیے' جو کچھ تم کروگے وہ تمہارے لیے کوئی' حصہ نہیں اس میں کسی کا۔وہ ان کے لیے' جوتم کروگے تمہارے لیے ہوگا۔اب یہ بحث شروع ہوجائے کہ وہ جو تھے وہ صحیح تھے یا غلط تھے وہ جنت میں جائیں گے دوزخ میں جائیں گے وہ گنہگار تھے یا صحیح راستے پہ چلتے تھے۔چلی بحث۔کہا: وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (2:141) ہم تم سے یہ پوچھیں گے بھی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔اور ہماری ساری زندگی اس میں گذر جاتی ہے کہ!''اوہدا اعتبار ہی کی ہیگا پہلا سوال ای او تھے ای کردے دسو جناب امیر معاویہؓ تے علیؓ دے وچوں کون سچا سی' مارے گئے نا جناب''۔وہ کہتا ہے ہم نہیں پوچھیں گے۔ہماری ہزار سال کی تاریخ اسی میں گذر گئی کہ سوال ہی یہ ہونا ہے وہاں۔تو اس نے کہا کہ یہ تو تمہارے Syllabus میں نصاب میں نہیں ہے' کہنے لگا جی ممتحن کا کیا ہے وہ نصاب سے باہر بھی سوال دے دیا کرتا ہے۔ہزار برس سے اسی سوال کے جواب میں لگے ہوئے ہیں۔یہ جتنے اسلاف اور بزرگ ہیں ان کے متعلق اسی لیے بحثیں چھڑی ہوئی ہیں کہ انہیں ہم اپنی سند مانے ہوئے ہیں' حجت مانا ہوا ہے۔چلے ہوئے ہیں ہم اسلاف کے پیچھے۔وہ کہتا ہے وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (2:141) ہم پوچھیں گے بھی نہیں تم سے کہ انہوں نے کیا کیا تھا' پوچھیں گے یہ کہ تم نے کیا کیا ہے۔انسانی ذات کے متعلق اس نے دوسری جگہ کہا ہے سورۃ بقرۃ کی آخری آیت لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (2:286)۔انسانی ذات کے لیے (یہ عربی جاننے والے جانیں گے لَهَا اور عَلَيْهَا) ٹھیک کام کیا درست کام کیا اس کا اچھا فائدہ بھی اس کے لیے ہوگا' جو غلط کام کیا اس کا نقصان بھی اس کے لیے۔یہ زبان ہے یہ ل اور عَلَيْهَا جو ہے اس کے امتیاز سے یہ دونوں فرق آجاتے ہیں۔

قرآن حکیم کے لفظ کسبت اور اکتسبت میں ایک معنی خیز فرق

بات میں سے بات نکلتی ہے زبان کی' یہاں ہے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (2:286) کسب اور اکتسب ایک ہی آیت میں دو لفظ آئے ہیں' لَهَا ہے اس کے لیے جو کسب ہے' اس کا فائدہ اسے پہنچے گا' نقصان اس کو پہنچے گا مَا اكْتَسَبَتْ (2:286) ۔ہونا یہ چاہیے تھا کہ جو غلط کیا ہے اس کا نقصان پہنچے گا یہ كَسَبَتْ اور مَا اكْتَسَبَتْ (2:286)' لَهَا (2:286) اور عَلَيْهَا(2:286) تو ہم نے بات سمجھ لی ان کی۔عجیب بات ہے عزیزانِ من! اس کی۔لَهَا مَا كَسَبَتْ (2:286) اس کا فائدہ اس کو پہنچے گا۔کسب کے معنی ہوتا ہے وہ کام جو اپنے فائدے اور کسی دوسرے کے ساتھ فائدے کے لیے بھی کیا جائے اور اكْتَسَبَتْ(2:286) ہوتا ہے جو صرف اپنے ہی لیے کیا جائے۔آہاہا!! قرآن تو اسی زبان میں نازل ہوسکتا تھا لا

رَیۡبَ (2:2) ۔اب ترجمہ کیا کرے گا کوئی ان لفظوں کا۔یعنی باب کے فرق سے کہاں فرق جا پڑا ہے۔مَا کَسَبَ(111:2) جو ہوگا اس کے تو خوشگوار نتائج ہونگے اور جس میں کسی دوسرے کا فائدہ نہیں ہوگا اپنی ذات کے لیے کرتے چلے جاؤ گے عَلَیۡھَا مَا اکۡتَسَبَتۡ (2:286)۔بہرحال اصول یہ تھا وَ لَا تَکۡسِبُ کُلُّ نَفۡسٍ اِلَّا عَلَیۡھَا (6:164) ایک اصول۔وَ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی (6:164)۔

انسانی اعمال کے سلسلہ میں ظہورِ نتائج کا ذکر

دوسرا اصول آ گیا۔کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔اور غلط معاشرے کے اندر لادنے والے اپنا سارا بوجھ دوسرے پہ لادتے چلے جائیں گے۔کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ذمہ داریاں کسی کی لادی جاتی ہیں کسی پہ، جرم کسی کا بھگت کوئی رہا ہے سارا معاشرہ، پریشانی میں ہے اس ایک چیز کے اوپر۔اگر یہ ہو کہ بوجھ اپنا اپنا ہی اٹھانا ہے اور اپنا اپنا ہی اٹھا کے لے جانا ہے۔اور پھر یہ سارا کچھ نتائج اس کے ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمۡ مَّرۡجِعُکُمۡ (6:164) ہر کام کے لیے اس کے قانونِ مکافات کی طرف تمہارا قدم اٹھ رہا ہے کوئی کام بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا کَسَبَ والا بھی اور اکۡتَسَبَ والا بھی، ہر کام کا نتیجہ نکلے گا۔فَیُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ فِیۡہِ تَخۡتَلِفُوۡنَ (6:164) اور یہ جو تم اختلافات آپس میں کرتے ہو وہ بزرگ بڑے تھے اور ہمارے ہاں کے یہ ٹھیک ہیں وہ امام ٹھیک تھے اور یہ غلط ہیں، کیا آیت کے اندر تمہارے اختلافات ہیں؟ اس کے متعلق تو بات بتا دی جائے گی واضح کر کے۔کیسے واضح ہو جاتی ہے بات؟

نظامِ قدرت انسانی اعمال کے نتائج ساتھ کے ساتھ بینک اکاؤنٹ کی طرح مرتب کرتا چلا جاتا ہے لفظ سریع العقاب کے یہی معنی ہیں

Pragmatic Test سے جب نتائج سامنے آتے ہیں ان نتائج کی رو سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ بات صحیح تھی یا غلط تھی۔اور اگر نتائج یہاں سامنے نہ آئیں تو پھر قیامت پہ اٹھا رکھنا پڑتا ہے آپ کو۔اور قرآن تو یہ کہتا ہے کہ یہیں نتائج سامنے آجاتے ہیں۔قیامت کی زندگی برحق ہے لیکن یہیں نتائج سامنے آجاتے ہیں جو پتہ چل جاتا ہے کہ غلط قدم تھا یا صحیح قدم تھا۔اور اس کے لیے وَ ھُوَ الَّذِیۡ جَعَلَکُمۡ خَلٰٓئِفَ الۡاَرۡضِ (6:165) لو بھئی اے قوم! بڑے خوش ہو رہے تھے تم کہ بادشاہت مل گئی، مملکت مل گئی پاکستان بن گیا۔ ٹھیک دیا ہم نے تمہیں۔وَ رَفَعَ بَعۡضَکُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ (6:165) ٹھیک ہے ان کے مقابلے میں تمہاری حیثیت اونچی بھی ہوگئی، وہ غلام رہے تم آزاد ہو گئے، وہاں کا مسلمان محبوس رہا، تم حریت پرست ہو گئے۔الگ مملکت مل گئی تمہیں، جانشین بنا دیا تمہیں یہاں صاحبِ اقتدار بنا دیا، کاہے کے لیے؟ لِّیَبۡلُوَکُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰکُمۡ (6:165) تاکہ دیکھا جائے کہ جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے اس میں تم کیا

کرتے ہو۔دوسری جگہ ہے **ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ** (10:14) تمہیں اس لیے یہ مملکت ہم نے پھر دیدی تھی تا کہ ہم دیکھیں کہ تم کیا کرتے ہو۔اور پھر دیکھ لیا اس نے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔اور **فَیُنَبِّئُكُمْ**(6:164) جو کہا تھا قیامت پہ نہیں اس نے تاریخ اس کی ڈالی۔دیکھا کیسے بتا دیا' کسی کو بھی شک اور شبہ رہا ہے اس کے اندر۔تا کہ ہم دیکھیں کہ تم کیا کرتے ہو۔ہم سمجھتے تھے کہ یہ ایک بڑی نعمت مل گئی ہے موج اڑانے کے لیے' اتنی بڑی مملکت جس میں سب کچھ ہے۔ملی اس لیے تھی کہ **لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ** (6:164) تا کہ ہم دیکھیں کہ تم کیا کرتے ہو۔**اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ**(6:165) دیر نہیں ہم لگایا کرتے۔ **عِقَاب** کے معنی ہوتا ہے کسی مجرم کے پیچھے دوڑ کے ان کو پکڑ لینا ''نٹھ کے کتھے جائیں گا''۔**سَرِیْعُ الْعِقَابِ** (6:165) ہے۔یہ بھی نہیں ہے کہ جرم ہو گیا ہے' اس کے تین برس کے بعد کہیں جا کے رپورٹ ہو رہی ہے اور اس کے بعد جا کے تفتیش ہو رہی ہے' جی نہیں بس وہ جو جرم ہوا ہے۔ **سَرِیْعُ الْعِقَابِ** (6:165) ہے' فوراً ہی اس کے پیچھے لگ جاتا ہے ہمارا سپاہی تو پکڑتا ہے جا کے۔پوچھو نہیں پھر وہ کس طرح سے پکڑتا ہے۔

انسان اگر اپنی کوتاہی کا احساس کر لے تو قدرت پھر اس کو مایوس نہیں ہونے دیتی

لیکن عزیزانِ من! مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔اگر اس پہ بھی یہ بات ذہن میں آ جائے کہ غلطی ہوئی تھی اس کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔مایوس وہ ہوتا ہے جس کے سامنے راستہ کوئی نہ رہے۔قرآن کو ماننے والے پر کوئی مقام ایسا نہیں آ سکتا جہاں اس کے سامنے کوئی راستہ نہ رہے۔وہ کہتا ہے **وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا** (29:69) جو بھی کوشش کرتا ہے ہمارے بتائے ہوئے طریق کے مطابق ہم اس کے سامنے کئی راستے کھول دیتے ہیں۔اس لیے مایوس نہیں ہونے دیتا۔اگر تمہاری کسی غلطی سے ایک راستہ بند ہو گیا' کوئی بات نہیں ہے اور راستے ہیں بشرطیکہ تمہاری نیت ہو منزل تک پہنچنے' کی راستے بہت ہیں۔تو اس کے بعد کہا **وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ** (6:165) مایوس نہ ہو خطرات سے حفاظت بھی بہم پہنچے گی' جو چھن گیا ہے اس کی بازیابی بھی ہو جائے گی۔یہ کہ قرآن تمہارے سامنے زندہ اور پائندہ موجود ہے۔سورۃ الانعام عزیزانِ من! آج ختم ہو گئی آئندہ ہم سورۃ الاعراف لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے' وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔

(پرویز۔ معراجِ انسانیت)